سچی کہانیاں آپ بیتیاں، جگ بیتیاں
ماہنامہ
سرگزشت
کراچی
اکتوبر 2013
نگران اعلیٰ
معراج رسول
پاک سوسائٹی ڈاٹ کام
متاعِ کارواں: اس مجاہدِ آزادی کا احوالِ زیست جسے ہم بھول رہے ہیں
گیت گاتا چل: ایک معروف موسیقار کی داستان جس کی زندگی میں اندھیرا ہے
میرا بھائی: کراچی کی دہشت گردی کا ایک نیا رخ، دل دکھانے والی سچ بیانی
www.paksociety.com

قرآن حکیم کی مقدس آیات و احادیث نبوی آپ کی دینی معلومات میں اضافے اور تبلیغ کے لئے شائع کی جاتی ہیں۔ ان کا احترام آپ پر فرض ہے لہٰذا جن صفحات پر آیات درج ہیں ان کو صحیح اسلامی طریقے کے مطابق بے حرمتی سے محفوظ رکھیں۔

جلد 23 ❖ شمارہ 11 ❖ اکتوبر 2013ء

ماہنامہ سرگزشت کراچی

مدیرہ اعلیٰ : عذرا رسول

مصور : شاہد حسین

شعبۂ اشتہارات

منیجر اشتہارات	محمد شہزاد خان	0333-2256789
نمائندہ کراچی	محمد رضوان خان	0333-2168391
	رانا محمد حمید	0323-2895528
نمائندہ لاہور	فراز علی جترش	0300-4214400

❖❖❖

قیمت فی پرچہ 60 روپے ❖ زرِ سالانہ 700 روپے

پبلشر و پروپرائٹر: عذرا رسول

مقام اشاعت: C-63، فیز II ایکس ٹینشن، ڈیفنس کمرشل ایریا مین کورنگی روڈ، کراچی 75500

پرنٹر: جمیل حسن

مطبوعہ: ابنِ حسن پرنٹنگ پریس، ہاکی اسٹیڈیم کراچی

خط کتابت کا پتا ● پوسٹ بکس نمبر 982 کراچی 74200

Phone :35804200 Fax :35802551
E-mail: jdpgroup@hotmail.com

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

قارئین کرام!

السلام علیکم!

اس وقت پورے عالم اسلام میں ایک عجیب سا خلفشار پھیلا ہوا ہے۔ ایک کے بعد ایک ملک کھنڈر میں تبدیل ہوتا جا رہا ہے۔ سب سے پہلے ایدی امین کو نشانہ بنایا گیا۔ اس پر الزام لگایا گیا کہ وہ آدم خور تھا اور دشمنوں کا گوشت پکا کر کھاتا تھا پھر نمبر آیا افغانستان کا جہاں پہلے روس نے مداخلت کی اور اس کے چنگل سے چھڑانے کے نام پر امریکا آ گیا۔ پھر جو دہشت گردی شروع ہوئی وہ ہنوز جاری ہے۔ عراق پر الزام لگا کیمیائی ہتھیار دشمنوں پر آزمائے جا رہے ہیں۔ دشمن بھی کون وہی کلمہ گو بھائی۔ امریکا نے مداخلت کی اور کئی سال سے دہشت گردی عروج پر ہے۔ وہاں بھی آئے دن دھماکے ہوتے ہیں۔ ہنستے بستے گھر اجڑتے ہیں بالکل افغانستان جیسا ماحول ہے۔ بحرین میں جمہوریت لانے کے نام پر ہر روز اموات ہو رہی ہیں لیبیا کے صدر کو سڑکوں پر گھسیٹ گھسیٹ کر موت کے گھاٹ اتارا گیا۔ لبنان پر بار بار حملے کر کے جگمگاتے شہر کو کھنڈر میں کئی بار بدلا گیا۔ اب باری ہے شام کی اور وہاں بھی ریاستی اور عوامی قوتیں ٹکرا رہی ہیں۔ راکٹ فائر ہو رہے ہیں۔ گولیاں برس رہی ہیں۔ خودکش دھماکے عروج پر ہیں۔ مصر میں عوامی منتخب نمائندوں نے حکومت سنبھالی تھی کہ حکومت برخواست کر دی گئی۔ سیکڑوں لوگ موت کی نیند سلا دیے گئے۔ کُل ملا کر یہ بات روزِ روشن کی طرح عیاں ہے کہ ہر مسلمان ملک انتشار کے گرداب میں آ چکا ہے اور ہر ملک میں ایک ہی فارمولے کو آزمایا گیا ہے اور وہ ہے عصبیت، تعصب، نفرت گویا ایک خنجر ہر ملک کی شہ رگ پر چل رہا ہے اور ہم ان نادیدہ ہاتھوں سے نظریں چرائے بیٹھے ہیں جو اس سازش کے پسِ پردہ ہیں۔ اس لیے ہم علامہ اقبال کا ایک شعر مسلسل گنگنا رہے ہیں

یوں تو سید بھی ہو مرزا بھی ہو افغان بھی ہو
تم سبھی کچھ ہو بتاؤ تو مسلمان بھی ہو؟

معراج رسول

نورِ مشرق

سرگزشت

ریاست رامپور اپنی اہمیت، جاہ و حشمت کی وجہ سے ہند بھر میں ایک اہم مقام کا حامل تھا۔ اس ریاست میں امرا و رؤسا کے بے شمار خانوادے تھے۔ ان خانوادوں میں نواب دولھا کی خوب شہرت تھی۔ ان کا اصل نام تجمل شاہ خاں تھا۔ وہ ریاست بھر میں اعلیٰ ذوق کی وجہ سے عزت کی نظر سے دیکھے جاتے تھے۔ نواب دولھا کی شادی قدوسی بیگم سے ہوئی تھی۔ ان کے گھر 1908ء میں ایک بچی نے جنم لیا۔ اس بچی کی ولادت اذانِ فجر سے ذرا قبل ہوئی تھی۔ اس لیے اسی مناسبت سے اس کا نام تجویز ہوا۔ جب وہ ذرا بڑی ہوئی تو اس کی کھلکھلاہٹ، شوخیاں دیکھ کر نواب دولھا کہتے کہ یہ ہمارے گھر کا نور ہے۔ بغیر اس کے یہ گھر اندھیرا ہے۔ بچی ذرا اور بڑی ہوئی تو اس کی تعلیم و تربیت کے لیے ایک اچھے اتالیق کی تلاش شروع ہوئی۔ کافی تلاشِ بسیار کے بعد مظفر نگر کے ایک استاد مصباح الدین ہاتھ آئے۔ انہیں اس بچی کا اتالیق مقرر کیا گیا۔ اٹھنے بیٹھنے باتیں کرنے کا سلیقہ سکھانے کی ذمے داری انہیں سونپی گئی۔ تعلیم و تربیت کا انتظام کر کے نواب دولھا مطمئن ہو گئے اس لیے کہ مصباح الدین ایک نرم مزاج مگر اچھے استاد کی شہرت رکھتے تھے۔ وہ بچی کو قرآن پاک کی تعلیم دینے کے ساتھ فارسی اور اردو بھی پڑھاتے، حساب اور انگریزی کی تعلیم بھی دیتے۔ ان کی بھرپور توجہ کی وجہ سے بچی نے کم عمری میں ہی بہت کچھ سیکھ لیا۔ فارسی اور انگریزی پر تو اسے عبور حاصل ہو گیا تھا۔ اس زمانے کا دستور تھا کہ بچیوں کو کم عمری میں ہی رخصت کر دیا جاتا تھا۔ 25/26 دسمبر 1920ء کو وہ ریاست شیر پور کے چشم و چراغ محمد ظہیر الدین خان کے ساتھ شادی کے بندھن میں بندھ گئیں۔ اس وقت ان کی عمر صرف بارہ سال تھی اور تیرہویں میں قدم رکھا تھا۔ نواب شیر پور کا شمار یوپی کی اہم شخصیت میں ہوتا تھا۔ وہ 1911ء سے کانگریس کے پلیٹ فارم سے سیاست میں کلیدی رول ادا کر رہے تھے۔ تحریکِ آزادی میں ان کو ایک خاص اہمیت حاصل تھی۔ شوہر کی وجہ سے وہ بھی سیاست میں دلچسپی لینے لگیں۔ 1922ء میں ان کی زندگی میں ایک اہم موڑ اس وقت آیا جب وہ شوہر کے ہمراہ خلافت موومنٹ کی جانب راغب ہوئیں اور ان کی ملاقات بی اماں سے ہوئی۔ مولانا محمد علی جوہر کی والدہ نے ان کی زندگی گویا بدل کر رکھ دی۔ ماضی میں ان کے کپڑے، جوتے، خوشبویات وغیرہ لندن سے آتے تھے اور وہ شیر پور میں شہزادیوں جیسی زندگی گزارتی تھیں مگر بی اماں سے ملاقات کے بعد انہوں نے سب کچھ غربا میں تقسیم کر دیا اور معمولی سوتی کپڑے زیب تن کرنے لگیں۔ 1937ء میں تحریکِ پاکستان کی گونج شیر پور پہنچی تو انہوں نے آل انڈیا مسلم لیگ میں دلچسپی لینی شروع کر دی۔ بچوں کی پڑھائی کی وجہ سے وہ 1941ء میں دہلی منتقل ہوئیں اور وہاں خواتین کی معاشرتی سرگرمیوں میں حصہ لینے لگیں۔ 1945ء میں قائداعظم نے ان سے ملاقات کی اور انہیں مسلم لیگ دہلی کی پہلی سیکریٹری پھر صدر بنا دیا۔ یہ ان کے لیے بہت اہمیت کی بات تھی کیونکہ بیگم مولانا محمد علی جوہر کے بعد وہ ہی ایک ایسی خاتون تھیں جو مسلم لیگ ورکنگ کمیٹی میں شامل تھیں، انہوں نے مسلم امرا و رؤسا اور افسران کی بیگمات کو مسلم لیگ میں شامل کرانے کی مہم شروع کی۔ وہ دور کچھ ایسا تھا کہ مسلمان افسران بھی تحریکِ پاکستان کے نام سے گھبراتے تھے مگر وہ بے خوف ہو کر ان کی بیگمات کو جلسوں میں کھینچ لاتیں پھر انہوں نے پرانی دلی کا رخ کیا اور روایت کی پابند عورتوں کو جلسوں میں لانے کا انتظام کرنے لگیں۔ فروری 1947ء میں وہ خضر حیات ٹوانہ کی حکومت کے خلاف چلائی گئی مہم میں حصہ لینے کے لیے لاہور آئیں تو انہیں گرفتار کر لیا گیا۔ 1945ء میں بیگم مولانا محمد علی جوہر نے مسلم لیگ شعبہ خواتین کل ہند بنیاد پر تشکیل دی تو وہ مرکزی کمیٹی کی ممبر منتخب ہو گئیں۔ بالآخر ان کی اور ان جیسی ہزاروں دیگر خواتین اور مردوں کی کوششیں رنگ لائیں۔ پاکستان کے قیام کا اعلان ہو گیا۔ وہ ریاست شیر پور کی جائداد، خزانہ سب کچھ پاکستان کے نام پر قربان کر کے 17 ستمبر 1947ء کو پاکستان منتقل ہو گئیں۔ پاکستان بننے کے بعد انہیں مسلم لیگ سندھ ورکنگ کمیٹی اور کاؤنسل آف آل پاکستان مسلم لیگ کا ممبر بنا لیا گیا۔ لیکن جب 1958ء میں مارشل لا نافذ ہوا تو انہوں نے سیاست سے کنارہ کشی اختیار کر لی اور لکھنے لکھانے کا شوق پورا کرنے لگیں۔ 14 جولائی 1978ء کو اپنے سات بچوں کو روتا بلکتا چھوڑ کر شیر پور ہاؤس کراچی میں انتقال کر گئیں۔ بعد از مرگ 14 اگست 1992ء کو وزیراعظم نے انہیں گولڈ میڈل دیا۔ اس محسنِ پاکستان خاتون کا نام نور الصباح بیگم تھا۔ ✪

☆ رانا محمد شاہد، بورے والا سے لکھتے ہیں ''اداریے میں معراج رسول صاحب سیلاب کی تباہ کاریوں کو احاطۂ تحریر میں لائے۔ دنیا میں جہاں کہیں بھی سیلاب آتے ہیں، اس کی بنیادی وجہ بارشوں کا مسلسل ہونا ہے کہ دریاؤں میں پانی کی سطح بلند ہو جاتی ہے۔ بند ٹوٹ جاتے ہیں اور ہنستے بستے خاندانوں کا سب کچھ سیلاب کی نذر ہو جاتا ہے۔ پاکستان کے طول و عرض میں 100 سے زائد دریا بہتے ہیں جو تمام کے تمام دریائے سندھ کے معاون دریا ہیں۔ پاکستانی حکمران بھی عجیب لوگ ہیں، چند ماہ پہلے تک یہ پانی کی وجہ سے ایک دوسرے سے لڑ رہے تھے لیکن جب پانی آیا تو اسے سنبھال بھی نہیں پائے، محکمہ موسمیات شدید بارشوں اور سیلابی صورتِ حال سے انتظامیہ کو آگاہ کر دیتا ہے مگر حکمران عوام کو اس ناگہانی آفت سے بچانے کی بجائے اسے ایشو بنا کر سیاست چمکانے لگتے ہیں لیکن وہ یہ نہیں جانتے اور شاید نہ ہی جاننا چاہتے ہیں کہ اس آفت کے بعد نہ صرف کروڑوں لوگ متاثر ہوتے ہیں بلکہ پاکستان بھی معاشی لحاظ سے 50 برس پیچھے چلا جاتا ہے۔ آفتاب احمد نصیر کا تبصرہ اچھا تھا، مطالعہ کا شائق ہر شخص ہی کتابوں سے محبت کرتا ہے۔ ڈاکٹر آر ایم ای کا سارا تبصرہ پڑھا کہ شاید وہ دلیپ صاحب کے رشتے دار ہیں۔ اداکار کی ذاتی زندگی اس لیے کچھ اہمیت نہیں رکھتی کہ وہ پبلک پراپرٹی ہوتا ہے۔ لوگ اپنے پسندیدہ اداکار کے بارے میں پل پل کی خبر جاننا چاہتے ہیں، پھر کاہے کی ذاتی زندگی...... اعجاز حسین سحار! بینا نابینا نمبر در حقیقت ان ناشکرے انسانوں کو بھی سمجھانے آیا تھا کہ پڑھوان انسانوں کے متعلق جن سے زندگی کی سب سے بڑی نعمت چھین لی گئی مگر وہ پھر بھی کامیاب و کامران ٹھہرے۔ اس عظیم نعمت سے محرومی کے باوجود ان میں مایوسی یا احساسِ محرومی نہیں آیا۔ شاہد جہانگیر! دلیپ کمار کی آج کی حالت کو دیکھ کر زمانے کی ناقدری کا احساس ہوتا ہے۔ آپ دیکھتے ہی ہوں گے کتنے بڑے بڑے فنکار اپنی زندگی کے آخری دنوں میں کسمپرسی کی حالت میں رہے...... ان کے آخری ایام میں کوئی آیا اور نہ ہی جنازے پر۔ خالدہ ریاست پاکستان ٹیلی وژن کی ایک بڑی اداکارہ تھیں۔ خالدہ ریاست نے اداکاری کے علاوہ کسی شہرت کے لیے کسی اور کا سہارا نہ لیا یعنی نہ فلم کی طرف آنے کا اشارہ دیا اور نہ انٹرویوز کے دوران گلوکاری کا ڈھونگ رچایا۔ انہوں نے کہا تھا کہ میرے جنازے میں شوبز کا کوئی بندہ نہ آئے۔ وہ تو اخبارات و رسائل کو انٹرویوز دینے سے بھی ہچکچاتی تھیں۔ شوکت رحمٰن خٹک کے بارے میں پڑھ کر دکھ ہوا۔ اللہ انہیں صحت کے ساتھ طویل عمر دے۔ (آمین) بشریٰ افضل شہرِ خیال میں اتنی دیر سے مت آیا کریں کہ دوڑ کر آنا پڑے پھر اس عمر میں دوڑ لگانے سے سانس بھی پھول جاتی ہے۔ دوسرا شادی کے فوراً بعد ہم نے اپنی بیوی سے کہہ دیا تھا کہ ہماری پہلی شادی انہی کتابوں رسالوں سے ہوئی ہے۔ شادی کے حوالے سے تو یہی کہیں گے کہ سائنسدانوں نے انسانی دماغ کے حوالے سے ایک اہم بات کہی ہے کہ دماغ جسم کا سب سے اہم حصہ ہے۔ یہ 24 گھنٹے ایکٹو رہتا ہے۔ پیدائش سے لے کر اس وقت تک کام کرتا ہے جب تک انسان کی ''شادی نہیں ہو جاتی'' عبدالروف عدم! شہرِ خیال کی یہ نوک جھونک ہی دراصل زندگی کا نام ہے۔ ڈاکٹر روبینہ نفیس ثاقب! یہ سچ ہے کہ شادی کے بعد عورت کی اپنی پسند ختم ہو کر رہ جاتی ہے اور اسے ساری زندگی کمپرومائز کرنا ہوتی ہے۔ لیکن کسی ایسے دکھ کا شکار عورت کے لیے ایک بات کہنا چاہوں گا جو کہیں پڑھی تھی کہ یہ بات ہی دراصل زندگی کو سمجھنے اور اسے بہتر بنانے کے لیے کافی ہے۔ ''جب آپ کسی دکھ سے نجات حاصل کرنے کا فیصلہ کریں تو ایک سادہ کاغذ پر لکیر کھینچ لیں۔ لکیر کے ایک جانب وہ مسائل اور مشکلات تحریر کریں جو فی زمانہ چل رہی ہیں اور لکیر کے دوسری جانب وہ مشکلات اور مسائل تحریر کریں جو فیصلہ کر لینے کے بعد ہوں گے۔ صحیح فیصلہ کرنا آپ کے لیے آسان ہو جائے گا۔'' ارے واہ! پروفیسر ڈاکٹر شیخ اقبال، جن پر گزشتہ ماہ ڈاکٹر ساجد امجد نے لکھا تھا، ان کا تبصرہ بھی شہرِ خیال میں...... ڈاکٹر صاحب کی زندگی یقیناً لائقِ تحسین ہے۔ ہماری تو حکومتِ وقت سے گزارش ہے کہ ان کی قدر ان کی زندگی میں ہی کی جائے۔ ایاز راہی کی تجویز سے اتفاق ہے کہ جو صحابہ کرامؓ و مزید شخصیات بینا

نابینا نمبر کا حصہ نہیں بن سکیں، انہیں آیندہ شماروں کی زینت بنایا جا سکتا ہے۔ اس دفعہ ڈاکٹر ساجد امجد تحریکِ پاکستان کی ایک بڑی شخصیت راجا صاحب محمود آباد کا زندگی نامہ بیان کر رہے تھے۔ راجا صاحب کے بارے میں پڑھا تو بے اختیار دل سے ان کی مغفرت کے لیے دعا نکلی۔ انہوں نے اپنا سب کچھ اس وطن کی خاطر قربان کر دیا۔ وہ حقیقی معنوں میں ہمارے محسن ہیں۔ مگر شاید ہم نہیں جانتے کہ جو قومیں اپنے محسنوں کو فراموش کر دیں، وہ مٹ جاتی ہیں۔ ایسی عظیم ہستیوں کو یاد کرنے میں ہی ہماری بقا ہے کہ جنہوں نے اپنی جان و مال اس قوم، اس وطن کے لیے قربان کر دیا۔ الجھی ڈور، ابن کبیر کی گتھیوں کو سلجھاتی ایک دلچسپ تحریر تھی۔ زندگی جیت گئی، امیمہ سلیم کی ایک منفرد اور ایڈونچر سے بھرپور تحریر تھی۔ اللہ جب اپنے بندے پر مہربان ہوتا ہے تو وہاں سے مدد آ پہنچتی ہے کہ جہاں سے انسان کے وہم و گمان میں بھی نہیں ہوتا۔ ترکی کی تہذیب و ثقافت کو اجاگر کرتا علی سفیان آفاقی کا سفرنامہ بہترین جا رہا ہے۔ مختار آزاد نے ایک مٹتی ہوئی قوم ''سامی'' معلوماتی مضمون تحریر کیا۔ قلم کے حوالے سے مجھے معلومات درکار تھیں۔ محمد ایاز راہی نے یہ مشکل آسان کر دی۔ نہایت تفصیل سے تحریر کیا۔ فلمی الف لیلہ میں اس دفعہ آفاقی صاحب نے بالی وڈ، ہالی وڈ میں خودکشی کرنے والے اداکاروں پر خصوصی طور پر لکھا۔ اس میں معروف اداکارہ پروین بوبی کا ذکر نہیں تھا، حالانکہ ان کی موت کے حوالے سے بھی مشہور ہے کہ خودکشی تھی۔ اختر شہاب نے خوشبو کے حوالے سے ایک معلوماتی تحریر لکھی۔ سلیم فرخی نے ہالی وڈ کے ایک اداکار کا تعارف دیا جو کہ دلچسپ تو ضرور تھا مگر مختصر بالکل نہ تھا۔ سچ بیانیاں سب سے آخر میں پڑھتے ہیں مگر ہم یقین سے کہہ سکتے ہیں کہ سرگزشت کے شایانِ شان ہی ہوں گی۔''

☆ اعجاز حسین سحار، نور پور تھل سے لکھتے ہیں ''میں ستمبر کے دوسرے ہفتہ میں انشاء اللہ تعالیٰ حج کی سعادت کے لیے روانہ ہو جاؤں گا (بہت بہت مبارک! ہم سب کو بھی دعاؤں میں یاد رکھیے گا) ایک ماہ کی دوری آئے گی لیکن یہ محفل آباد و شاد رہے گی اور جہاں سے سلسلہ ٹوٹ رہا ہے یہیں سے جڑے گا، تمام دوست میری صحت و سلامتی کی دعا کریں میں وہاں سب کی نیک حاجات پوری ہونے کے لیے دعا کروں گا۔ عرب اور خوشبو، میں عطر بنانے کے لیے کتنے پاپڑ بیلنے پڑتے ہیں، ہم تو کوئی آسان عمل سمجھتے رہے۔ واقعی خوشبو تحفہ دینا اور دوسروں کو لگانا عربوں کی ثقافت ہے۔ ''فلمی الف لیلہ'' میں دلچسپی کے تمام لوازمات موجود ہیں۔ جہاں خودکشی کے رجحانات پر تفصیلی روشنی ڈالی گئی ہے یہ کافی بحث طلب معاملہ ہے اس سے ہٹ کر یہ سانحہ پورے خاندان کی شرمندگی اور اذیت کا باعث بنتا ہے خاص طور پر عورت کے ایسے اقدام پر لوگ کہانیاں گھڑتے ہیں، یہ قریبی لوگوں کے لیے دوہرا صدمہ بن جاتا ہے۔ وقت کی کمی کو مدِنظر رکھتے ہوئے ''سراب'' کو چھوڑ کر آگے سچ بیانیوں کی طرف بڑھتے ہیں۔ ''ڈیٹ'' موجودہ دور کی عکاس کہانی ہے، دکھایا گیا ہے سب دوسروں کو نصیحت کرتے ہیں جبکہ وہ خود تو جوانی میں ایسی غلطی کر چکے ہوتے ہیں یوں نئی نسل سے کیسے امید رکھی جا سکتی ہے کیونکہ آج کی آزادی، رابطوں میں آسانی اور وقت سے پہلے ذہنی نشوونما کے سارے لوازمات موجود ہیں اس لیے ٹھوکر لگنے کے بعد ہی سبق ملتا ہے لیکن تب پچھتاوے کے سوا کچھ بس میں نہیں ہوتا۔ ہاں جو شروع سے سنبھل گیا وہ آج مطمئن اور بے فکر زندگی گزار رہا ہے یہاں جنس کی تفریق نہیں ہے۔ جس نے صحیح راستہ چنا وہ آسودگی کے ساتھ منزل تک پہنچ جاتا ہے۔ ''پیاسا'' کا ماجد کنویں کے پاس پہنچ کر پیاسا رہا۔ ''دلبر'' کے دلبر صاحب کو خوشی کا سجدہ کرنا چاہیے کہ وہ آلۂ کار بننے سے بچ گئے ورنہ حالات واقعی ایسے بن گئے تھے کہ وہ برے پھنسنے والے تھے پھر امیر لوگوں کو اس حد تک دل لگی کی چھوٹ حاصل ہے۔ کچھ گنوائے بغیر جان بخشی ہو گئی ہے تو شکر ادا کریں۔ ''پیرجی'' شائع کر کے ادارہ نے بے شمار گھرانوں کا بھلا کیا ہے لیکن جو اندھی اور غیر مشروط عقیدت کے مارے ہوئے ہیں۔ ''آنکھیں'' میں مجھے سارہ کا فیصلہ ظالمانہ لگا ہے۔ قدرت کی طرف سے معجزہ ہو رہا تھا لیکن وہ رکاوٹ بن کر کھڑی ہو گئی۔ جیسی چوٹ فیاض کھا چکے تھے گویا یہ ان کا نیا جنم تھا لیکن سارہ نے اس کی بے بسی کا فائدہ اٹھایا بھلا دوسری شادی جرم کیسے ہے۔ ''مجبور'' پڑھ کر بھی شاید ہمارے احساسات سرد رہیں کیونکہ ہم آپ سب بھی دنیاوی رواج میں بندھے ہوئے اور مجبور ہیں۔''

☆ بشریٰ افضل کی بہاولپور سے تشریف آوری ''یک صفحی سرگزشت ''ناخدا'' پڑھی معلومات میں اضافہ ہوا محفل میں حاضری دی۔ آفتاب احمد کرسیٔ صدارت پر براجمان تھے خاصا تفصیلی تجزیہ تھا۔ مدیرِ اعلیٰ! میں آپ سے متفق ہوں عوام ہی کو ہر مسائل کا سامنا کرنا پڑتا ہے خٹک صاحب کے لیے دعاگو ہوں خدا ان کو صحت کاملہ عطا کرے۔ طارق عزیز اور ناہید اختر کی زندگی کے بارے میں تفصیلی تحریر لکھیں۔ ڈاکٹر روبینہ، لگتا ہے آپ کافی پریشان ہیں کسی دوست کے ساتھ جو قابلِ اعتماد ہو مل کر دل کا بوجھ ہلکا کریں۔ حالات کا ڈٹ کر مقابلہ کریں یہی زندگی ہے۔ رانا محمد شاہد لوگ واقعی مذاق تو اڑاتے ہی ہیں۔ ڈاکٹر۔ آر۔ ایم۔ ای کا تبصرہ بہترین تھا وہ دلیپ کمار کے بارے میں کافی معلومات رکھتے ہیں۔ ''ڈیٹ'' میں بیٹی کے مقابلے میں سنبل نے سمجھداری کا ثبوت دیا اگر بیٹی اس کی بات مان جاتی تو آج خوشحال زندگی گزار رہی ہوتی۔ جو لوگ پہلے سوچتے ہیں کہ ان کی بدنامی ہوگی وہ کبھی غلط راستے پر نہیں چلتے ''پیاسا'' میں اگر ماجد عارضی طور پر ہی ابتلا کی بات مان لیتا تو ان کے درمیان جدائی نہ ہوتی وہ بھی ماجد کی جدائی میں جان سے گئی اور بے چارہ ماجد! ثمینہ نے شوہر کے ''اعتماد'' کو ٹھیس پہنچائی۔ شہزاد کو بھی لاپرواہی نہیں کرنی چاہیے تھی۔ نظام نے صحیح سرزنش کی اگر بیوی پر توجہ دیتا تو وہ نہ بھٹکتی حالانکہ ثمینہ کو بھی پھنسانے کی پوری کوشش کی۔ باپ اتنا مجبور ہو گیا کہ بیٹی کو خود ہی اجازت دے دی۔ جہیز واقعی لعنت ہے۔ ''آنکھیں'' میں اچھی اور نیک بیوی جو فرمانبردار بھی تھی اس کی حق تلفی کرنے چلا تھا۔ نزہت نے بھی بغیر آنکھوں والے کو چھوڑ دیا۔ سارا نے اس ڈر سے یہ فیصلہ کیا کہ دوبارہ شوہر کو کھو نہ دوں واقعی دودھ کا جلا چھاچھ بھی پھونک پھونک کر پیتا ہے۔ سارا پر یہ مثال صادق آتی ہے۔ پیرجی، کے چنگل سے نکلنے کا کریڈٹ ماہ نور کو جاتا ہے اویس نے بیوی کا پورا ساتھ دیا تو مسئلہ حل ہوا ''فرشتہ'' اختر ... اپنے نانا کی کہانی مزاح کے انداز میں احاطۂ تحریر میں لایا۔ روبینہ نفیس انصاری، آپ تو بہت اچھی لکھاری بھی ہیں، مبارک ہو اعتراف بہت خوبصورت تحریر تھی۔ ''قلم کہانی'' ہر اطوار سے قلم کے بارے میں مکمل

اور جامع تحریر تھی، پڑھا تو معلوم ہوا کہ قلم کیسے وجود میں آیا۔ معلوماتی تحریر "عرب اور خوشبو" مکمل کوائف کے ساتھ خوشبو کے بارے میں تفصیل سے بیان کیا۔ یہ ہماری سرگزشت کی شان ہے ہر چیز کو مکمل پیش کرتے ہیں حالانکہ لوبان، چنبیلی، صنوبر، گلاب کا پھول، یہ سب تو ہماری دھرتی پر بھی کھلتے ہیں اور لیمن گراس، اس کا قہوہ ہاضمے کو درست کرنے کے لیے استعمال ہوتا ہے۔"

☆ رانا حبیب الرحمان، کوٹ لکھپت لاہور سے لکھتے ہیں "اس دفعہ سرگزشت جلوہ گر ہوا تو سوچا کہ زندگی جتنی ہے اس کو غنیمت سمجھو اور اپنے دوستوں سے ملاقات کرلو۔ پھر کیا تھا قلم پکڑا اور لکھنا شروع کردیا۔ کیونکہ انسان کی آنکھ بند ہوتے ہی یہ سب نظارے ختم ہوجائیں گے۔ دنیا میں ہر انسان ضرورت مند ہے اور انسان کی کس کس ضرورت کو پورا کرے اور دوسرے کی حاجت روائی کی جائے کس کس کے درد کا درماں بنا جائے۔ لیکن یہاں بات سوچنے کی ہے ہر کوئی تو ضرورت مند ہے تو وہ کسی دوسرے کی ضرورت پوری کیسے کرے گا۔ ہمیں تو کسی سے بھلائی کی امید نہیں ہے۔ اسی لیے اس کا شکوہ کرنا ہی بے کار ہے، شہر خیال میں کچھ دوست احباب بھی شکوہ شکایت کرتے نظر آئے۔ دوستو شکوہ یا شکایت ان سے کرنی چاہیے جن کو ہم سے کچھ ہمدردی ہو۔ دیکھیں نا! جب اسے ہمارا احساس ہی نہیں تو پھر اس سے ہمیں شکوہ کرنا بھی روا نہیں اور یہی حال اپنے ملک کا ہے۔ پاکستان ہو یا کوئی اور اس کی قدر صرف وہی کرتا ہے جسے اس سے محبت ہو۔ انسان کو وطن کی قدر کا اندازہ اسی وقت ہوتا ہے جب وہ پردیس میں رہنے پر مجبور ہوجائے۔ انسان کاروبار یا تعلیم کے سلسلے میں خواہ کہیں بھی چلا جائے وہ اپنے وطن کی یاد کو اپنے دل سے محسوس کرسکتا ہے۔ پردیس میں وہ دولت کما لیتا ہے لیکن اس کا دل ہر وقت اپنے ملک کی سلامتی کے لیے دھڑکتا رہتا ہے۔ وطن کی یاد رہ رہ کر اسے ستاتی ہے۔ شہر خیال میں تمام دوستوں کے تبصرے پڑھے، ڈاکٹر روبینہ نفیس مانتا ہوں کہ غم بھی زندگی کا حصہ ہے اس سے انسان بچ نہیں سکتا۔ انسان کو چاہیے کہ وہ ہمت کرکے غموں اور مصیبتوں کو شکست دے ان کا ڈٹ کر مقابلہ کرے اور مشکلات پر قابو پا کر حوصلے سے دن گزارے۔ باہمت لوگ غموں کو خاطر میں نہیں لاتے اور زندگی کے روشن پہلو کو نظر میں رکھتے ہیں۔۔۔۔ وہ غم کے آگے ہتھیار نہیں ڈالتے۔ بلکہ ہنسی خوشی مشکلات کا مقابلہ کرتے ہیں اور یہ خط لکھنے میں آپ کی باتوں نے مجھے مجبور کیا ہے۔ ورنہ ہم تو ایک سال کے بعد دوبارہ شہر خیال میں نظر آرہے ہیں جیسے اجنبی اپنی منزل تلاش کرتا ہے اسی طرح ہم بھی شہر خیال میں بیٹھنے کی جگہ تلاش کررہے ہیں۔ شاید انکل اور مدیرہ آنٹی کو ہمارے حال پر رحم آجائے۔ اقتباس اور مراسلے ارسال کیے تھے لیکن ایک سال گزر جانے کے باوجود ہمیں انتظار ہے۔ کہانیوں میں تمام سچ بیانی کے علاوہ عرب اور خوشبو، اعتراف، سامی، ہردل عزیز، لارڈ ڈفرن، الجھی ڈور، مجبور۔۔۔ زندگی جیت گئی پسند آئیں (مراسلے سرگزشت کے مزاج کے نہیں تھے)۔"

☆ انجم فاروق ساحلی کا مکتوب لاہور سے "کراچی کے حالات بگڑنے کے ساتھ تشویش لاحق ہوجاتی ہے۔ ستمبر کا سرگشت ملا۔ اعتراف، لارڈ ڈفرن جیسی تحریریں خوب تھیں۔ ہردل عزیز میں جیمس ہیڈلے چیز کے بعد ایک اور شہرۂ آفاق مصنف کے حالات سے آگاہی ہوئی۔ سامی اور قلم کہانی مضامین معلومات سے بھرپور ہیں۔ موجودہ مدیر سرگزشت جدت اور تنوع کا بڑا خیال رکھتے ہیں۔ لاہور سے بھائی آفتاب احمد نصیر اشرفی کا پہلا تبصرہ جامع اور بھرپور تھا۔ تذکرہ قلمبند کرنے کا شکریہ، بھائی رانا محمد سجاد صاحب یادآوری کا شکریہ، صفحہ نمبر 91 پر آغا اشرف کا اقتباس دیکھا جو دلچسپی کا مرکز بن گیا۔ آغا اشرف ہمارے محلے دار تھے اور لڑکپن میں ان سے ملاقات ہوتی رہتی تھی۔ مکانوں کی اسی لائن کے دوسرے سرے پر اب ڈاکٹر انور سدید رہائش پذیر ہیں۔ فلمی الف لیلہ کا ابتدائی حصہ کافی فکر انگیز تھا۔ سراب خوب چل رہی ہے۔ نارمن وزڈم، زندگی جیت گئی بھی معیاری تحریریں ہیں۔ ایک تھا راجا زیر مطالعہ ہے۔ ایجنٹ، آنکھیں اور مجبور اچھی اور منفرد آپ بیتیاں ہیں۔ (آپ کی تحریریں موصول ہوگئیں۔ اکرم الہ آبادی آئندہ ماہ لگنے کی امید ہے)۔"

☆ محمد عمران جونانی کا خلوص نامہ کراچی سے "اب تو جناب کسی شخصیت کے بارے میں مضمون کی فرمائش کرتے ہوئے بھی دل ڈرتا ہے کیونکہ جواب عموماً بجا طور پر یہی ہوتا ہے کہ یہ مضمون پہلے لگ چکا ہے۔ اس حوالے سے تجویز یہ ہے کہ سال میں ایک اور خاص نمبر اسی حوالے سے بھی ترتیب دیا جاسکتا ہے۔ جس میں یادگار تحاریر جن کی دوبارہ فرمائش بھی آرہی ہو شامل کی جائیں۔ شیر آیا شیر آیا کے نعرے تو بہت لگ رہے تھے مگر محسوس ہوتا ہے کہ شیر پر غنودگی طاری ہے کچھ عوامی سطح کے کام تھے جن کے بارے فوری احکامات کی امید تھی جیسے ڈبل سواری پر کراچی میں پابندی جو آب طویل عرصہ بعد جاکر ختم ہوئی اور یوٹیوب کی فلٹریشن کا معاملہ۔ بارشوں اور سیلاب نے عوام کی کمر توڑی ہوئی ہے۔ ذرا تیز ہوا چلے تو بجلی ایسے غائب ہوتی ہے جیسے کبھی اس کا وجود ہی نہ تھا۔ معراج صاحب کی تحریر ایک نئے زاویہ سے سوچنے پر مجبور کرتی ہے کہ ایک طرف تو بہت سے مخلص لوگ بحالی کے کاموں میں مصروف ہیں اور دوسری طرف ہمارے وہ بھائی بھی ہیں جو عجیب وغریب گری ہوئی حرکتیں کرکے اسلام اور پاکستان کا نام بدنام کررہے ہیں۔ سیلاب ہو، زلزلہ ہو یا کسی قومی رہنما کا قتل ہمارا یہ چہرہ بھی ضرور ابھر کر سامنے آتا ہے۔ پچھلے دنوں اخبار میں یہ بھی پڑھا کہ وزیراعظم کے دورہ سندھ کے موقع پر انہیں جعلی امدادی کیمپ کا دورہ کروادیا گیا جنہوں نے ایسا کیا وہ تو ہیں ہی قابلِ مذمت لیکن کیا ہم اتنا معصوم پرائم منسٹر افورڈ کرسکتے ہیں؟ شہر خیال میں آفتاب احمد نصیر صاحب کو ان کی منفرد بذلہ سنج تحریر بخوبی کرسی صدارت تک لے آئی۔ آپ نے منفرد انداز میں مجھے سراہا مبارکباد دی شکریہ قبول کریں۔ غلام عباس جتوئی وعلیکم السلام۔ آپ کو اور عامر شہزاد کو دل سے خوش آمدید، شاہد جہانگیر صاحب نے خاص نمبر پر تبصرہ کا حق ادا کردیا اور خاص نمبر تھا بھی ایسا کہ اس پر کیے گئے تبصرے بھی مزہ دے رہے ہیں۔ شوکت رحمن صاحب کی بیماری کا سن کر افسوس ہوا اللہ صحت کاملہ عطا فرمائے آمین۔ محمد ایاز راہی صاحب تبصرہ ہمیشہ کی طرح گہرے مطالعہ کی

عکاسی کرتا نظر آیا۔ آپ نے بالکل بجا فرمایا مذکورہ صحابیؓ کا تذکرہ ضرور ہونا چاہیے تھا۔ طاہر گلزار صاحبہ کا نام تاخیر سے آنے والے خطوط میں دیکھ کر افسوس ہوا اور اعجاز حسین اور رانا محمد شاہد صاحبان کے تبصروں پر خاکسار کیا بات کرے، بہت خوب! اسدرہ بانو صاحبہ کا خط مختصر اور جامع ہے۔ ان تمام صاحبان کا تہ دل سے شکریہ جنہوں نے کرسی صدارت کے حوالے سے حوصلہ افزائی کی۔ ستمبر کا پورا شمارہ ایک طرف اور "قلم کہانی" ایک طرف۔ جیسے جیسے آگے بڑھے علم کے در وا ہوتے چلے گئے۔ محمد ایاز بھائی نے حقِ قلم ادا کردیا۔ مضمون میں استعمال ہونے والی ٹھیٹ تاریخی اردو، قرآن وحدیث کے حوالہ جات اور برمحل اشعار کا خوبصورت انتخاب کیا گیا۔ چند صفحات میں قلم کی پوری کائنات سمیٹ دی۔ چاہے وہ لفظ "قلم" کے استعمال کی بات ہو یا پھر لکھنے والے قلم کی۔ 80 کی دہائی کے بعد پرانی ایجادات کی ترقی اور نئی ایجادات کے طوفان نے بہت کچھ بدل دیا۔ قلم کا استعمال بھی چاہے رفتہ رفتہ مزید کم ہوجائے لیکن انسانی زندگی پر اس کے احسانات واثرات بھلائے نہیں جاسکتے۔ "اعتراف" ڈاکٹر روبینہ کی سوچ کے عین مطابق ہے، رقابت کی آگ میں قتل کی حد تک جانے کے واقعات کم لیکن ملتے ضرور ہیں ہاں مگر شک کرتے ہوئے تکلیف دہ نفسیاتی حرکتیں کرنے والوں کی کوئی کمی نہیں۔ خوشبوؤں میں بسی تحریر "عرب اور خوشبو" آنکھوں کے راستے دل ودماغ میں اتر گئی، مسحور کن معلومات نے انگ انگ مہکادیا، ایسی اشیاء استعمال کرتے وقت ان کی تیاری کی طرف کم ہی دھیان جاتا ہے، برصغیر پاک وہند میں بھی عطریات کے چاہنے والوں کی کمی نہیں گرمیوں میں "روح الخس" اور سردیوں میں "شمامۃ العنبر" آج بھی بقول میرے نانا جان روح خوش کردیتا ہے۔"

☆ بشیر احمد بھٹی بلوچی بستی بہاولپور سے لکھتے ہیں "ستمبر 2013 کا سرگزشت 31 اگست کے بعد مارکیٹ میں جلوہ نما ہوا۔ یعنی اب جاسوسی کی آمد کی تاریخ بھی قریب تھی۔ دونوں کا ایک ساتھ مارکیٹ میں آنا قارئین کے لیے اینٹھنے والی بات ہوجاتی ہے۔ دونوں کو ایک ساتھ مطالعے میں لانا ذرا مشکل ہوجاتا ہے۔ سرگزشت کو پچیس تاریخ تک مارکیٹ کی زینت بن جانا چاہیے! پہلی کہانی "ایک تھا راجا" دلربا تحریر تھی۔ فلمی الف لیلہ کی قسط نمبر 219 نے معلومات میں اضافہ کیا۔ سراب کی ڈبل سیون قسط ولولہ انگیز رہی۔ راوی شہباز ملک کو باہر آنے کا چیلنج ہے۔ دیکھو اگلی قسط میں کیا ہوتا ہے۔ سچ بیانیوں میں پیرجی، سبق آموز کہانی ہے۔ پیروں فقیروں کے چکر میں ہماری قوم برباد ہورہی ہے۔ خدا جانے لوگوں کو کب عقل آئے گی۔ ہر ماہ اسی طرح کی کہانی دیا کریں۔ آپ کو ایک مشورہ ہے کہ 9 سچ بیانیوں پر تین سچ بیانیوں پر اول، دوئم، سوئم کا انعام ہے۔ باقی چھ کہانیاں لکھوکھاتے۔ برائے مہربانی باقی چھ لکھاریوں کو انعام کے اعلان کے بعد نیا سرگزشت اعزازی بھیج دیا کریں۔ یہ ان کا حق ہے۔ اعزازی شمارہ حاصل کرنا بھی بڑے اعزاز کی بات ہوتی ہے۔ شمارہ دیکھ کر مصنفین کو خوشی ہوگی۔ مزید لکھنے کا جذبہ تقویت پکڑے گا۔ (اعزازیہ بھی تو اسی وجہ سے دیا جاتا ہے)"

☆ صوبی شاہ ہری پور ہزارہ سے لکھتی ہیں "ستمبر کا شمارہ یکم کو مل گیا تھا۔ خط بھیجنے میں تاخیر ہوجاتی ہے کیونکہ پرچہ اکثر لیٹ ملتا ہے۔ سراب پڑھی، شہباز بے چارے کو کاشف زبیر صاحب نے پھر انڈیا کی ہوا لگوادی۔ سچ بیانیوں میں ابھی صرف ڈیٹ پڑھی ہے۔ یعنی اپنی بے وقوفی کے ہاتھوں مار کھا گئی جبکہ سنبل نے بیٹی کی بے وقوفی سے سبق حاصل کیا۔ اسی طرح تمام بچیوں کو بھی سبق حاصل ہوگا۔ باقی شمارہ ابھی زیر مطالعہ ہے۔ ڈاکٹر روبینہ نفیس سے گزارش ہے کہ وہ اتنی مایوس بھی مت ہوں۔ انکل ہمیں پراسرار نمبر کا بے چینی سے انتظار ہے کب شائع کررہے ہیں۔ سفرنامہ بہت پہلے کا ہے کوئی تازہ اور آج کل کے حساب سے معلوماتی سفرنامہ شائع کریں۔"

☆ طاہر الدین بیگ کی میرپور خاص سے تحریر "پہلے آپ سب کو اتنا شاندار بینا / نابینا نمبر نکالنے پر مبارکباد بہت ہی شاندار اور یادگار ایک تاریخی نمبر ہے۔ بہت بہت مبارک باد۔ محترم آفاقی صاحب "یارو مجھے معاف رکھو" طالش مرحوم نے ہوٹل میں ہمالیہ والا، نصرت کا کردار اور سنتوش کمار (مرحوم) کے ساتھ ایک ٹیبل پر کھڑے کھڑے گایا تھا (پلے بیک سلیم رضا مرحوم) اور خوب اداکاری کی تھی اور فلم وعدہ میں سنتوش مرحوم نے نابینا کا کردار بڑے ہی دل کش انداز میں کیا تھا خاص طور پر "تیری رسوائیوں سے ڈرتا ہوں" اس گانے پر اس کا ذکر آپ نظر انداز کرگئے بلاشبہ یہ چھپا اور جمیلی آسیہ کی اداکاری کا دلکش نمونہ تھی۔ اب کچھ ستمبر کے سرگزشت پر آپ بیتیاں اپنا اپنا رنگ لیے ہوئے ہیں اور خوب ہیں ایجنٹ اور پیرجی پڑھیے اور لطف اٹھایئے مگر پیرجی سے ذرا دور رہیں۔ نارمن وزڈم پڑھ کر مزہ آگیا اچھی تحریر تھی مگر جناب ہمارے لہری (مرحوم) منور ظریف اور ننھا مرحوم کا بھی جواب نہیں تھا جواب تو نذر اور رنگیلے صاحب کا بھی نہیں۔ سامی مختار آزاد کی ایک معلوماتی تحریر اور لارڈ ڈفرن ایک دلچسپ تحریر پڑھنے میں مزہ دے گئی۔ ابن کبیر صاحب کی الجھی ڈور کہانی میں کئی موڑ۔ مگر ایک دلچسپ موڑ جب رولیم دین سن کی سابقہ محبوبہ نے اس کی بے گناہی کا بیان داغ دیا اچھی اور دلچسپ کہانی ہے۔"

☆ منظر علی خان کا خلوص نامہ لاہور سے "ستمبر 2013 کا شمارہ زیرِ نظر ہے۔ شہر خیال میں اپنے خیال کے ساتھ حاضر ہوں۔ راجا صاحب محمود آباد کا تذکرہ خوب تھا۔ قائداعظم کے ساتھیوں کا اس خوبصورتی سے تذکرہ ڈاکٹر ساجد امجد کے اسلوب تحریر کا خاصہ ہے۔ گاہے گاہے بازخواں اس قصۂ پارینہ 2014ء کا سال ان کی یاد کے طور پر منایا جائے گا۔ مبہم جملہ ہے (جی ہاں 2014ء راجا صاحب کے نام سے منانے کی تیاری ہے) ابن کبیر نے قتل کیس کی الجھی ڈور کو خوب سلجھایا ہے۔ تراجم میں اصل کا حوالہ نہایت ضروری ہوتا ہے۔ زندگی جیت گئی بھیانک تحریر تھی صحرا کے بارے میں معلومات اور فریب اس جلتی ریت کے سفر میں ہمت واستقامت کی کہانی ہے۔ قلم کہانی تحریر کی کہانی ہے۔ یہ ادب کا ذخیرہ ہی نہیں بلکہ انسان کے اگلے مرحلہ تحریر کی روداد بھی ہے۔ ایاز راہی صاحب اللہ کرے زورِ قلم اور زیادہ۔ سراب تو بہرحال

سراب ہے۔ مگر اتنا دلکش کہ ایک منٹ کے لیے بھی توجہ کو ہٹنے نہ دے۔ ایک ماحول بنانا یہ کاشف زبیر صاحب کے قلم کا خاصّہ ہے۔ سچ بیانیوں میں ڈیٹ، سبق آموز ہے۔ کب تک ہماری قوم یورپ کی خرابیوں کی نقل میں خود کو برباد کرتی رہے گی۔ کاش کہ اچھی چیزوں کو بھی اختیار کیا جاتا۔ ”فرشتہ“ وقت پیری گرگِ ظالم می شود پرہیزگار۔ ”پیرجی“ مذہب تعویذ دھاگا کے نام پر فراڈ کرنے والوں کی کہانی ہے۔ وصولی میں صرف رقم ہی نہیں اینٹھتے بلکہ عزت بھی برباد ہو جاتی ہے۔ کاش لوگوں میں عقل آجائے مگر یہاں تو ہر شخص انتہا کے رخ پر ہے۔ بعض لوگ رشد و ہدایت کے مراکز کو بھی چھوڑ دیتے ہیں اور بعض رشد و ہدایت کے نام پر گمراہی اور تباہی کو اختیار کر لیتے ہیں۔“

☆ احمد خان توحیدی نے کراچی سے لکھا ہے ”سرگزشت ستمبر 29 اگست صبح ملا۔ برادر معراج رسول صاحب سیلاب کی تباہ کاریوں پر اتنا کہوں گا کہ دشمن جب چاہے روک کر پیاسا اور پانی چھوڑ کر سیلاب میں ڈبو دے۔ آبی ذخائر کے ہمارے پاس وسائل نہیں۔ نہیں نہیں ہرگز نہیں اور نہ ہم بنائیں گے۔ 1948ء میں ہمارے پاس کیا وسائل تھے جو آزاد کشمیر کو آزاد کرا لیا؟ میرے خاندان کے باہمت غریب زمیندار خاندان نے صرف بیلوں کی مدد سے 160 ایکڑ بنجر اراضی بارش کا پانی روک کر لہلاتے فارم میں تبدیل کر دیا۔ PIA ریلوے، اسٹیل مل ملک کا کون سا ادارہ باقی ہے جو ترقی تو دور کی بات ملازمین کو تنخواہ ادا کر سکے؟ ادھر بڑا شیطان ہم مسلمانوں کی نا اتفاقی سے شام پر دانت گاڑنے کو تیار انڈیا و اسرائیل جیسے ناجائز تخم کی سینہ زوری اسے نظر نہیں آتی۔ ناخدا ان م راشد کے کالم بہت پڑھے۔ بچپن کی شرارتوں کا علم نہ تھا۔۔۔۔ آفتاب نصیر اشرفی کرسی صدارت پر طویل نام طویل تبصرہ کے ساتھ اچھا تھا۔ ڈاکٹر آر ایم ای ریاض سعودی عرب۔ دلیپ کمار (یوسف خان) کے نجی حالات کا محفل شہر خیال میں تذکرہ مت کریں۔ شہر خیال اور رسالہ پر تبصرہ نوک جھونک تک منحصر ہے۔ رانا شاہد بورے والا، ادھر پہلے ہی کیا بم دھماکے کم ہیں، جو حکومت ہر دوسرے دن گیس، بجلی، پیٹرول بم عوام پر گراتی ہے۔ بڑا شیطان اپنے ناجائز تخم کو پالنے سے کیوں باہر نکالے؟ تبصرہ اچھا مگر بہت طویل تھا۔ شاہد جہانگیر پشاور، اپنے والدین و بزرگوں کی خدمت نہ کرنا اولاد سے توقع رکھنا کیا مطلب؟ شوکت خٹک صاحب کی معذوری کا سن کر افسوس ہوا اللہ صحت دے۔ خدا کے خوف ساتھ تبصرہ مختصر دوسروں کا بھی حق ہے۔ اعجاز سٹھار، رانا سجاد، سدرہ ناگوری، عمران جونانی، قیصر عباس بھکر، ایاز راہی اچھے تبصرے کے ساتھ حاضر تھے۔ اب کہانیوں پر بات ہو جائے۔ ایک تھا راجہ، ڈاکٹر ساجد امجد صاحب اس سے قبل بھی التجا کی تھی کہ سرگزشت کی طرح سسپنس میں بھی قریبی تاریخی کہانیاں لائیں۔ یوں بھی نزدیکی تاریخ سقوط ڈھاکا سے کب ہم نے سبق سیکھا؟ باقی ماندہ کے بھی ٹکڑے کرنے کے درپے ہیں۔ راجا صاحب محمود آباد جیسے عظیم رہنما قائداعظم کے بعد ساری مفاد پرستی سقوط ڈھاکا کے غم ہیں 59 سال کی عمر میں چل بسے حالانکہ یہ کوئی زیادہ عمر نہیں ہے۔ اعتراف، ڈاکٹر روبینہ انصاری بیوٹی فل اسٹوری لائی ہیں۔ آیندہ بھی لکھا کریں۔ واہ واہ ایاز راہی صاحب عظیم لوگوں کے حوالہ سے خوبصورت اشعار قلم کہانی بہت اچھی رہی۔ فلمی الف لیلہ، آفاقی صاحب عمر تو آپ بتاتے نہیں۔ خودکشی کے حوالہ سے ایسے فنکاروں کا تذکرہ ہم لاعلم تھے رفیع خاور (ننھا) اور لہری عظیم اداکار تھے۔ 1979-80 جیکب آباد جمعہ والے دن ایک گھنٹا پہلے الف نون پروگرام سال بھر کی تھکاوٹ دور کرنے والا ثابت ہوتا تھا۔ دونوں کی وڈیو اب بھی دیکھتا ہوں۔ پنجاب حکومت کو عیدالفطر پر خاص فلم نمائش نہ ہونے پر فلم انڈسٹری کا خیال آیا۔ اچھی معیاری فلم ذہنی تفریح کا باعث بنتی ہے۔ صابری برادران اور اقبال بانو کو اب ٹی وی پر ہی دیکھتے ہیں۔

☆ طاہرہ گلزار کی ناراضگی پشاور سے ”انکل معراج رسول آپ پہلے یہ بتائیں کہ اب آپ کی طبیعت کیسی ہے اور اس کے بعد میرے غصے کے لیے تیار ہو جائیں۔ میں بہت سخت غصہ اور اذیت میں ہوں مسلسل مجھے آٹھ مہینوں سے سسپنس، جاسوسی اور سرگزشت میں B.List کیا جا رہا ہے آخر کیوں؟ میرا قصور کیا ہے۔ ستمبر کے شمارے میں بھی بلیک لسٹ میں میرا نام شامل ہے میں اس زیادتی پر احتجاج کرتی ہوں۔ (اگر وقت پر خط مل جائے تو پھر چھپنے سے کیسے رہ گیا کیونکہ صفحات پُر کرنے کے لیے خطوط کی ضرورت ہوتی ہے) رانا محمد شاہد بورے والا اور رانا سجاد آصف مظفر گڑھ دونوں کو شادی کی بہت بہت مبارک۔ دونوں کنجوس بھائیوں نے دعوت تک نہیں دی۔ شہر خیال میں جانے سے پہلے یک صفحی میں جدید اردو کا ناخدا ن۔ م۔ راشد صاحب کے بارے میں پڑھا جن کا اصل نام نذر محمد تھا۔ ان کے بارے میں پہلے بھی کہیں پڑھا تھا کہ یہ بہت شریر واقع ہوئے تھے۔ واقعی مولوی صاحب کو خوب تنگ کیا۔ ویسے کمال کیا۔ ان کے بارے میں تحریر کر کے گویا سمندر کو کوزے میں بند کیا گیا۔ زبردست تحریر تھی۔ پھر دوستوں کے خطوط ملاحظہ کیے۔ واہ کیا قسمت پائی ہے آفتاب احمد نصیر اشرفی نے۔ پہلی انٹری میں No1۔ آفتاب صاحب یہ جادو مجھے بھی سکھا دیں۔ ویسے سچ بتاؤں تبصرہ زبردست تھا۔ میرے بھائی کا نام بھی آفتاب احمد جان ہے۔ ڈاکٹر آر ایم ای ریاض سعودیہ والے تو ہر خط میں شکایتوں کا ڈھیر لے کر آتے ہیں۔ بھائی یہ کوئی اچھی بات نہیں۔ اعجاز حسین سٹھار نور پور تھل بھائی بہت مختصر لیکن جامع تبصرے کے ساتھ حاضر تھے۔ واقعی بھائی ہمیں مضبوط سہارے کی ضرورت ہے اور یہ سہارا اللہ کے سوا کسی اور کا نہیں ہو سکتا۔ واقعی بینا نابینا بہت زبردست شمارہ تھا۔ مجھ سے ایک چھوٹے بھائی عادل خان آف چارسدہ نے سرگزشت پڑھنے کے لیے مانگا ہے۔ میں ہر خط میں شاہد جہانگیر شاہد بھائی سے پوچھتی ہوں کہ وہ پشاور میں کہاں رہتے ہیں لیکن میرا خط شائع ہی نہیں ہوتا تو وہ بے چارے کیا جواب دیں گے۔ میں ایف سی ڈبلیو پشاور میں جاب کرتی ہوں۔ جہاں شہید بے نظیر ایف سی ڈبلیو یونیورسٹی بھی قائم ہے۔ آپ کا خط بہت دلچسپ اور معلوماتی ہوتا ہے۔ میری دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ محترم شوکت رحمان خٹک کو صحت عطا کرے۔ رانا محمد سجاد دولھا بھائی کیسے ہیں آپ ٹھیک تو ہیں نا۔ شادی کا ایک نقصان تو ہوا کہ اتنا لمبا چوڑا خط اب 9 لکیر میں رہ گیا۔ اللہ اللہ آگے کی خیر ہو۔ بشریٰ افضل جی آپ کو میں کیا کہوں 10 لکیروں کا خط ہمارے منہ مبارک پہ کھینچ کے مار دیا۔ بری بات آیندہ خیال رکھیں۔ بشریٰ جی کم از کم خط 30 لکیروں کا ہو۔ سدرہ بانو ناگوری کا تبصرہ بھی مختصر لیکن اچھا تھا۔ عبدالرؤف عدم کی تشریف آوری راولپنڈی سے۔ آپ کافی عرصے سے غائب ہیں کوئی خاص وجہ۔ آپ کا تبصرہ بہت شاندار ہے۔ ویسے بھائی آپ اتنے ہی قدیم ہیں جتنا خط میں اظہار کیا؟ عدم بھائی کبھی آپ اپنی اس پشاور والی بہن کو بھی یاد کیا کریں دو لفظ تعریف یا تنقید میں۔ پروفیسر ڈاکٹر شیخ اقبال آف سرگودھا آپ نے تو خط میں ادارے، انکل معراج اور ڈاکٹر ساجد امجد کی تعریف کی اور ان کا شکریہ ادا کیا۔ واقعی یہ اعزاز سرگزشت نے حاصل کیا ہیں اپنی طرف سے اور سرگزشت کے تمام دوستوں کی طرف سے انکل معراج کو اس بینا نابینا کے خصوصی شمارے کے لیے مبارک باد دیتی ہوں۔ ایاز راہی آف مانسہرہ کا خط بہت دلنشیں تحریر میں تھا۔ دل پر اثر انداز ہوا واقعی عبداللہ بن مکتوم بہت قابل قدر اور خوش قسمت ترین صحابہ ہیں جن کا ذکر قرآن مجید میں موجود ہے۔ اگر ان کا ذکر بھی سرگزشت کے بینا نابینا کے شمارے میں ہو جاتا تو یہ شمارہ اور بھی جگمگا اٹھتا۔ پلیز ہمارے وہ تمام قاری واپس آجائیں۔ احمد جاوید کادوانی، ابن مقبول، انجم فاروقی، راجا ثاقب نواز ثاقب، تفسیر عباس بابر، معراج الدین آف پشاور، چاند پورا نام یاد نہیں آرہا اور آغا فرید احمد خان آف سکھر وغیرہ (اف یہ خط ہے کہ ناول، بھئی اتنا طویل تبصرہ لوگ پڑھنے سے اکتا جائیں گے)“

☆ وحید ریاست بھٹی کی راولپنڈی سے تشریف آوری ”سب سے پہلے میں آپ کو اور سرگزشت کی پوری ٹیم کو خاص نمبر ”بینا نابینا“ نمبر ہم آنکھ والوں کے لیے شائع کرنے پر تہ دل سے مبارک باد پیش کرنا چاہوں گا۔ ایک ایسا خاص نمبر جو مدتوں اپنی اہمیت کے حوالے سے یادگار رہے گا، ہر سطر ہر لفظ اور ہر تحریر اپنی جگہ امرِ مسلم کا درجہ رکھے ہوئے ہے۔ سب سے زیادہ جاذب نظر تحریر ہمیشہ کی طرح ڈاکٹر ساجد امجد صاحب کی ”دیدہ ور“ قرار پائی، ڈاکٹر صاحب کو مجھ ناچیز کی طرف سے ڈھیروں مبارک باد عرض کر دیجیے گا اس کے بعد ابن کبیر صاحب کی ”مشعلِ راہ“ تھی۔ دلوں کو روشن کرتی ہوئی تحریر تھی حافظ نسیم صاحب کو جب ہم میٹرک میں پڑھ رہے تھے تو بڑے شوق و جذبے کے ساتھ نیلام گھر پہ دیکھتے اور ان کی ذہانت کی داد دیے بغیر نہیں رہتے تھے۔ باغی شاعر، بھی تاریخ کے جھروکوں میں جھانکتے ہوئے آصف ملک نے لکھی لطف ہی آگیا۔ معراج رسول صاحب پورے خاص نمبر میں اگر کچھ کمی محسوس ہوئی تو بھارت کے عظیم موسیقار، شاعر اور گلوکار، رویندر جین، کا تذکرہ نہ ہونے کے برابر تھا حالانکہ وہ ایک ایسے موسیقار تھے۔ (ابھی بقید حیات ہیں) جو کہ آنکھوں سے محروم تھے۔ اگست 2013ء کا بینا نابینا نمبر 29 جولائی کو ملا جب ورق الٹے تو اپنی تحریر ”مغنی ہند“ کے نام سے دیکھ کر ایک انجانی سی خوشی محسوس ہوئی اور ساتھ میں فخر بھی۔ خوشی تو اپنی تحریر کے اس عظیم نمبر میں شاملِ اشاعت ہونے پر اور فخر آپ کے ادارے پر کہ آپ نے اس گئے گزرے دور میں بھی ”میرٹ“ کو مدِنظر رکھتے ہوئے اور بنا سفارش ”شہر خیال“ کے باسی کی تحریر کو شرفِ اشاعت بخشا یہ میرے لیے کم اور شہر خیال میں بسنے والوں کے لیے زیادہ باعثِ فخر ہے کہ ان میں سے ہی ایک ذرہ ناچیز کو آپ نے اس قابل سمجھا کہ K.C.Dey کے حوالے سے ٹوٹے پھوٹے الفاظ کو اپنے ایک بین الاقوامی ڈائجسٹ میں شامل فرمایا۔ میں نے پورے پندرہ عدد ڈائجسٹ خریدے اور اپنے دوستوں کو گفٹ کیے اور کہا کہ لو پڑھو میرے بھائیو سب نے دل کھول کر پورے خاص نمبر کی تعریف کی اور مستقل قاری بننے کا وعدہ کیا۔ ماہ ستمبر کا ”سرگزشت“ 2 ستمبر کو ملا اور تاخیر سے ملنے کی وجہ ابھی تک سمجھ نہیں آسکی۔ معراج صاحب! دشمن کیا عالم اسلام کو بدنام کرے گا میں آپ کو کچھ عرض کرتا ہوں اختلاف کا حق بہرحال آپ کے پاس ہے۔ بین الاقوامی شہرت یافتہ اسکالر، روزنامہ جنگ اور جیو ٹیلی ویژن نیٹ ورک سے وابستہ ڈاکٹر عامر لیاقت حسین، نے ایک مضمون بعنوان ”زمسیس اسکوائر“ روزنامہ جنگ 19 اگست 2013ء میں لکھا اور مصر کے بے گناہ مسلمانوں پر ڈھائے جانے والے ستم کے حوالے سے یہود و ہنود اور امریکا و برطانیہ کو خوب کھری کھری سنائیں میں اپنے محترم ڈاکٹر عامر صاحب سے عرض گزار ہوں کہ اس اخبار جنگ کے اس روز کے صفحہ نمبر 3 پر ایک شائع خبر پر کیا تبصرہ فرمائیں گے کہ ایک بڑے اسلامی ملک سعودی عرب کے شہزادے نے ایک عالم دین کو سرکاری ٹی وی کی چیئرمین شپ سے فارغ کر دیا۔ اس عالم دین کا قصور یہ تھا کہ اس نے مصر کی ظالم فوج کو مظلوم اخوان المسلمون پر ظلم کرنے سے باز رہنے کے لیے کہا تھا۔ یہ بھی چھوڑیں۔ 20 اگست 2013ء کے روزنامہ جنگ کے صفحہ تین پر ایک خبر شائع ہوئی کہ اسی بڑے اسلامی ملک نے یورپی یونین کو دھمکی دی کہ اگر اس نے مصر کی فوجی امداد روکی تو وہ مصر کی فوجی امداد کرے گا تاکہ بزورِ طاقت مظلوم مصری مسلمانوں کو آسانی کے ساتھ ذبح کیا جا سکے اور اب تازہ ترین اطلاعات آرہی ہیں کہ چند عرب مسلمان ممالک سرزمینِ شام کی مقدس سرزمین کو خاک و خون میں غلطاں کرنا چاہتے ہیں۔ میں ڈاکٹر عامر لیاقت سے عرض کرنا چاہوں گا جناب امریکا و برطانیہ و فرانس کو چھوڑیں وہ تو ہیں ہی ہمارے فطری اور ظاہری دشمن آپ مقدس مسلمان ممالک کے کالے کرتوت ملاحظہ فرمائیں کہ مسلک کی بنیاد پر پورے ملک کو ہی تخت و تاراج کرنے کے لیے کفار کو دعوتِ قتل و غارت گری دے رہے ہیں جبکہ اقبال نے کہا تھا۔ ”جنگ پادشاہانِ جہاں غارت گری است۔ جنگِ مومن سنت پیغمبری است۔“ ہم پاکستانی عوام و حکمران تو عراق و افغانستان کے بعد اب شام کے حوالے سے ایک نیا ڈراما دیکھنے کے لیے بے تاب ہیں۔ بقول احمد ندیم قاسمی ”دل گیا تھا، یہ آنکھیں بھی کوئی لے جاتا! میں ایک ہی تصویر فقط کہاں تک دیکھوں۔“ ہماری تو یہ حالت ہو چکی ہے کہ روزانہ ٹارگٹ کلنگ اور دھماکوں میں 50 سے زیادہ بے گناہ ابدی نیند نہ سلائے جائیں تو ہم اسے ٹارگٹ کلنگ اور دھماکا ہی تسلیم نہیں کرتے۔ بے حسی کی اگر کوئی آخری حد ہے تو وہ حد ہمارے پیارے پاکستان کے ساتھ ضرور ملتی ہوگی۔ الامان والحفیظ۔ معراج صاحب کاش ہمارے مسلمان حکمرانوں کو اس بات کا یقین ہو جائے کہ 60 اسلامی ممالک کے مسلمان چاہے وہ کسی بھی مسلک سے تعلق رکھتے ہوں ان کا خدا، رسولؐ، کعبہ، قرآن ایک ہی ہے تو پھر جھگڑا کس بات پر۔ اللہ پاک اپنے حبیبؐ کے مبارک وسیلے کی برکت سے ہم گناہ گاروں پر رحم فرمائے آمین۔ ثم آمین۔ باقی معراج صاحب وقت کی قلت اور دیر سے سرگزشت ملنے کی وجہ سے ماہ ستمبر کا شمارہ نہیں پڑھ سکا لیکن ڈاکٹر روبینہ نفیس کی تحریر ”اعتراف“ پڑھی بہت پسند آئی۔ مجھ ناچیز کی طرف سے ڈاکٹر صاحبہ کو مبارک باد قبول ہو۔ میری تحریر ”مغنی ہند“ کو آفتاب احمد نصیر اشرفی اور جناب عمران جونانی صاحب نے پسند کیا ان احباب کا بہت بہت

شکریہ۔"

☆ڈاکٹر روبینہ نفیس ثاقب نے بھکر سے لکھا ہے "سرگزشت کے شروع میں معراج رسول پاکستان کے حالات پر دکھی نظر آئے۔ واقعی پاکستان میں کچھ گروہ ایسے ہیں جو پاکستان کے نام پر دھبا ہیں۔ سیلاب، زلزلہ یا دیگر آفات ٹوٹ پڑے یہ لوگ ایسے واقعات کے منتظر رہتے ہیں کہ لوٹ مار کرسکیں۔ مرتے ہوئے کو لوٹ کر ماردیں ایسے بے غیرت لوگوں نے ہی پاکستان کا نام بدنام کیا ہوا ہے۔ موڈ بہت خراب ہوگیا تو موڈ کو بہتر بنانے کے لیے پہنچے شہرِ خیال میں۔ رانا محمد شاہد، میں تو طویل تبصرے لکھتی ہوں مگر مدیر صاحب کی قینچی کام دکھادیتی ہے۔ لگتا ہے ادارے سے قینچی کم کرنی پڑے گی۔ پیاری مسز بشریٰ افضل اللہ پاک سے امید ہے۔ آپ بھی دعا کریں کہ مجھے اولاد نصیب ہو تو 70 فیصد پریشانیاں ختم ہوجائیں گی۔ رعنا محمد ساجد ووٹ دے کر غلط نہیں کیا۔ نواز شریف بھی کیا کریں لوگوں نے خزانے میں کچھ چھوڑا ہے؟ ارے یہ کیا، عبدالرؤف شہرِ خیال میں، واہ، بہت خوشی ہوئی کہ آپ اتنے عرصے بعد پٹنے بل سے نکل آئے۔ آپ کو ویل کم۔ مجھے دیکھ کر آپ کا دل خوش ہوا مگر مجھے تو پوری کی پوری خوشی ہوئی۔ عمران جونانی، اس بار تبصرہ طویل لکھا ہے۔ یاد کروگے کہ کسی تخی سے پالا پڑا تھا۔ قیصر عباس خان، کہانی پسند کرنے کا شکریہ۔ تین تبصرے بھکر والوں کے تھے۔ گویا اس بار شہرِ خیال میں بھکر والے بازی لے گئے۔ کہانیوں میں سنیل کی ڈیٹ نے کوئی خاص تاثر نہیں چھوڑا۔ یہ تو بہت عام بات ہوگئی ہے کہ لڑکے لڑکیوں کو محبت کے نام پر دھوکا دیتے ہیں اور نہ جانے یہ سلسلہ کب تک چلے گا۔ دلبر ایک دلچسپ کہانی تھی۔ دولت تو اچھے بھلے انسان سے اپنا آپ بھلا دیتی ہے۔ پتا نہیں کب لوگوں کو عقل آئے گی کہ انسان اور جانور میں تمیز کرسکے۔"

☆رانا محمد سجاد کا مکتوب شاہ جمال مظفر گڑھ سے "یک نمی سرگزشت میں اردو ادب کی جانی پہچانی شخصیت ن م راشد کا تعارف پسند آیا۔ سرگزشت کا یہ خاصہ ہے کہ وہ شخصیات کا تعارف اچھوتے انداز میں پیش کرتا ہے۔ ویسے یہ تجویز پیش کی گئی تھی کہ ان صفحات کو کسی کتابی شکل میں اکٹھا کردیا جائے تو زیادہ بہتر ہوگا۔ آفتاب احمد نصیر اشرفی کا تبصرہ پسند آیا۔ محترم آفتاب احمد آپ کی سب باتیں اپنی جگہ لیکن جاسوسی ڈائجسٹ کا ساتھ ابھی تک نہیں بن سکا ہے۔ پرانے ساتھیوں کی یاد تو ہمیشہ آتی ہے۔ ڈاکٹر ایم آر اے کافی دنوں بعد آئے ہمیشہ کی طرح تبصرہ خوبصورت تھا۔ اعجاز حسین سخار صاحب آپ تو صدارت پر نظر آتے تھے کیا ریٹائرمنٹ لے لی۔ رانا محمد شاہد صاحب آپ بجا فرمارہے ہیں۔ "شاہد جہانگیر" صاحب کا تبصرہ بھی جاندار رہا۔ دلیپ صاحب کے حوالے جو کہا وہ بالکل سچ ہے۔ عمران جونانی کا تبصرہ شاندار رہا۔ طاہرہ گلزار صاحبہ کہیں نظر نہ آئیں۔ بہت تلاش کیا۔ روبینہ نفیس ثاقب بھی اور شمارے کا بہترین خط پروفیسر ڈاکٹر اقبال شیخ نے اپنے تاثرات رقم کیے۔ یہ تاثرات شمارے کے لیے اعزاز کی حیثیت رکھتے ہیں۔ ایاز راہی مانسہرہ سے آئے۔ جو چیزیں رہ گئیں کیا اگلے شمارے میں پیش کی جاسکتی ہیں (وقتاً فوقتاً لگے گی) ایک تھا راجا، ڈاکٹر ساجد امجد کی دلکش تحریر، کیا عمدہ لکھا برمحل شعر نے تو اور خوبصورت بنادیا تحریر کا پتا بھی دے دیا۔ آپ کی خدمات تو بس ایسی ہیں کہ جن کا ہم تصور بھی نہیں کرسکتے۔ وہ کیا کسی شاعر نے کہا ہے کہ سدا روپوش رہتے ہیں وہ پتھر، عمارت جس کے کاندھوں پہ کھڑی ہو' الجھی ڈور' ابن کبیر کی اچھی تحریر ثابت ہوئی۔ امیمہ سلیم کی تحریر ایک انتہائی سنسنی خیز تحریر ثابت ہوئی۔ سفرنامہ اسی شاندار طریقے سے جاری ہے ترکوں کی محبت دیکھ کر خوشی ہورہی ہے۔ "سامی" مختار آزاد ایک تحقیقی تحریر، بس ٹھیک ہی تھی۔ قلم کہانی کے بارے میں کہوں گا کہ ایاز راہی صاحب کا اندازِ تحریر الجھاؤ تھا۔ فلمی الف لیلہٰ تو اب کی بار خودکشی نمبر لگا۔ جیا خان کی خودکشی کافی افسوسناک۔ آفاقی صاحب سے کافی مرتبہ درخواست کی ہے کہ موجودہ اداکاروں کے بارے میں بھی کچھ لکھیں "عرب اور خوشبو" اچھی تحریر ثابت ہوئی۔"

☆محمد عامر ساحل...... رقمطراز ہیں "بینا نابینا کے بعد ستمبر کا شمارہ پڑھا جس میں ابھی کافی رسالہ زیرِ مطالعہ ہے۔ میں نے پہلے بھی 3 مرتبہ خط لکھنے کی جسارت کی ایک دفعہ میرا خط شہرِ خیال میں شامل ہوا اس کے بعد تو جیسے ہم کو بھول ہی گئے۔ 2 بار اپنی آپ بیتی لکھ کر بھیجی لیکن اس پر بھی ادارہ نے غور نہیں فرمایا۔ ہماری آپ بیتی ہمارے لیے اہم ہے ضروری نہیں کہ ادارے کے لیے بھی اہم ہو تبھی تو 2 بار بھیجنے کے بعد بھی شامل ہی نہیں کی۔ چلو خیر ہے ادارے والوں کی اپنی مرضی۔ مس قیصر عباس خان بھکر کی بات سے اتفاق کرتا ہوں کہ ڈیرہ اسماعیل خان جیل پر حملہ ہماری خودمختاری اور ہمارے وقار پر حملہ ہے۔ میں بھی ڈیرہ اسماعیل خان کا شہری ہوں جیل حملے کی رات 11 بجے میں اپنے کزنوں کے ساتھ جیل کے ساتھ واقع بھاٹیہ بازار سے عید کی شاپنگ کرکے لوٹا تو فوراً جیل پر حملہ ہوگیا اور میرا گھر جیل سے 1 کلومیٹر کے فاصلے پر ہے اور ساری رات فائرنگ راکٹ حملے ہوتے رہے اور دہشت گرد عناصر نے اپنے گھناؤنے مقاصد کی آڑ میں معصوم لوگوں کا بھی خون بہایا اور جرم زدہ افراد بھی اتنی آسانی سے جیل سے فرار ہونے میں کامیاب ہوگئے۔ یہ ہماری پولیس کی ناکامی اور نااہلی ہی تو ہے کہ آئے دن یہ سب کچھ ہم اپنے پیارے پاکستان میں دیکھ رہے ہیں۔ کبھی کسی شہر اور کبھی کسی شہر۔ نہ جانے کب ان دہشت گردوں سے ہمارے پاک وطن کی جان چھوٹے گی۔"

☆احسان سحر کی آمد میانوالی سے "ناخدا، میں نذیر محمد کے بارے میں پڑھا۔ شرارتیں تو بچوں کا بنیادی حق ہیں چاہے وہ بڑے ہوکر کچھ بھی بن جائیں یہ سنہری دور تو ہر اک کو نصیب ہوتا ہے۔ کیونکہ اس میں بے فکری کوئی پریشانی نہیں سب شامل ہوتی ہے۔ شہرِ خیال میں آفتاب احمد نصیر صاحب نے اپنا خیال پیش کیا بالکل بینا نابینا سب ایک سے بڑھ کر ایک تھے کسی کو کسی پہ فوقیت نہیں دی جاسکتی ہے۔ اور خوشی بھی ہوئی کہ آپ یہاں بھی مل گئے۔ سامی قبیلے کے حوالے سے داستان نے بہت متاثر کیا جو اپنے قبیلے چھوڑ کر سکون کی زندگی کو چھوڑ کر سراب میں گم ہوتے جارہے ہیں۔ قلم کے حوالے سے معلوماتی ادب پڑھا اور چونک کر اپنے قلم کو دیکھا جس کے بیچ میں واقعی ایک ننھا سا بال بیرنگ نظر آیا تو ہنسی نکل آئی۔ فلمی میلہ اس دفعہ کافی

متاثر کن لگا خودکشی کے حوالے سے بھی مضمون نظروں سے گزرا۔ واقعی ایک ایسا عمل جس سے انسان دین سے بھی ہاتھ دھو بیٹھتا ہے اور دنیا سے بھی اور واقعی یہ ایک وقتی جذبہ ہوتا ہے منہ زور جسے برداشت کرنا بہت مشکل ہوتا ہے۔ برداشت کرلیا تو انسان بہت کچھ پالیتا ہے ورنہ سب کچھ ہاتھ سے چلا جاتا ہے۔ خوشبو کے حوالے سے معلومات اچھی لگی۔ سراب بھی اچھی جارہی ہے۔ بیت بازی اور چھوٹے معلوماتی پارے اچھے لگے۔ سچ بیانیوں میں دلبر میں کافی متاثر کیا۔"

☆عبدالرؤف آدم کا مکتوب راولپنڈی سے "ریلوے اسٹیشن پر جہاں لوگ اپنے عزیزوں کو لینے آتے ہیں وہاں کے اسٹال سے ہم اپنے عزیز ترین سرگزشت کو لے کر آئے۔ معراج انکل نے مسلمانوں کی حقیقت بڑے درد بھرے انداز میں بیان کی۔ ہمارا ملک اس وقت زوال کی جانب گامزن ہے اس کی واحد وجہ یہ ہے کہ ہم نے اس کی قدر نہیں کی اور اب حد تو یہ ہے کہ 14 اگست یوم آزادی منانے والے دن بھارتی فلم دیکھ کر گزارتے ہیں۔ یہ ہے ہماری حب الوطنی۔ اب اس سے بڑھ کر وطن عزیز کی اور ناقدری کیا ہوگی۔ شہرِ خیال میں پروفیسر اقبال کی موجودگی نے چار چاند لگادیا۔ صدرہ بانو نے مختصر مگر خوبصورت تبصرہ کیا۔ بشریٰ افضل بھی اپنی موجودگی کا ثبوت اچھے تبصرہ کے ساتھ دے رہی تھیں۔ راجا صاحب محمود آباد کی داستانِ حیات ایک پُرعزم شخص کی کہانی ہے جس کے سامنے بڑے طوفانوں نے سر جھکایا۔ لیکن ہم لوگوں کی قدر مرنے کے بعد کرتے ہیں۔ ڈاکٹر روبینہ نفیس خوبصورت "اعتراف" لے کر آئیں۔ لارڈ ڈفرن عجیب کردار ہے تاریخ کا۔"

☆شاہد جہانگیر شاہد کی پشاور سے تشریف آوری "جدید اردو نظم کے بانی نذر محمد المعروف "ن م راشد" سے متعلق یک صفحی تحریر دلچسپ اور معلوماتی تھی۔ ایک تھا راجا، ڈاکٹر ساجد امجد صاحب کی تحریر کردہ راجا صاحب محمود آباد کے حالاتِ زندگی سے متعلق بہت اچھی تحریر ہے۔ تحقیق و جستجو کے نئے پہلوؤں سے آشنا کیا ہے۔ ڈاکٹر صاحب نے کئی برس قبل فارسی زبان کی مشہور شاعرہ قرۃ العین طاہرہ پر ایک بہت خوبصورت تحقیقی مضمون تحریر کیا تھا۔ مجھ سے وہ شمارہ کہیں گم ہوگیا ہے۔ میں خود تاریخ اور فارسی کا ایک ادنیٰ طالب علم ہوں۔ اگر کسی دوست کے پاس مذکورہ مضمون موجود ہو یا خود ڈاکٹر صاحب کی نظر سے یہ تحریر گزرے تو براہ کرم مضمون کی کاپی مجھے بھجوادیں۔ (یہ مضمون جنوری 1999ء میں دشمنِ ایمان کے عنوان سے شائع ہوا تھا) اعتراف، ڈاکٹر روبینہ انصاری صاحبہ کی سسپنس سے بھرپور لیکن مختصر کہانی پسند آئی۔ قلم کہانی، محمد ایاز راہی نے قلم کے تقریباً ہر پہلو پر روشنی ڈالی ہے۔ یہ ایک معلومات افزا اور تحقیقی مضمون ہے جسے راہی صاحب نے اپنے خوبصورت انداز میں تحریر کیا ہے جسے پڑھ کر مجھے اپنا کہا ہوا ایک قطع یاد آرہا ہے جو نظرِ قارئین ہے۔ "یہ داستانِ عشق میں کیسے رقم کروں، لازم ہے پہلے سر کو میں اپنے قلم کروں۔" "اپنے ہی خوں میں ڈوب کر جب کرچکوں وضو، تب آئے گا ہنر کہ بیاں سر حق کروں۔" "ترکی نمی دانم، محترم آفاقی کی فلمی کہانیوں کی طرح ان کے سفرنامے بھی دلچسپ ہیں۔ ترکی نمی دانم پڑھ پڑھ کر تو اب دل میں یہ شوق پیدا ہوگیا ہے کہ زندگی میں کم از کم ایک بار تو ترکی یاترا ضرور کرنی چاہیے جہاں کے عوام ہم پاکستانیوں کی تمام تر کوتاہیوں کے باوجود ہم پاکستانیوں اور ہمارے پیارے ملک کے لیے بے پناہ عقیدت احترام اور محبت کے جذبات رکھتے ہیں۔ پیر جی، ماہ نور صاحبہ کی لکھی ہوئی سچ بیانی اس ماہ کی سب سے خوبصورت کہانی ہے اور ہماری آنکھیں کھولنے کے لیے کافی ہے انہوں نے جھوٹے، فریبی، نام نہاد اور بدکردار جعلی پیروں کے مکروہ چہروں کو بے نقاب کرکے بڑی خدمت کی ہے اولیائے کرام تو وہ پاک ہستیاں ہیں جن کے مبارک قدموں کی آمد سے برصغیر پاک و ہند کے لوگوں کو کفر کی تاریکیوں سے نجات اور اسلام کی دولتِ لازوال نصیب ہوئی اور انہی کی دعاؤں اور محنت سے بتکدہ ہند میں اسلام کی روشنی پھیلی۔ یہ جعلی پیر ان پاک ہستیوں کے نام پر بدنما دھبا ہیں۔ اگر مجھ سے پوچھا جائے تو میں تو یہی کہوں گا کہ "پیر جی" ہی سرورق کی کہانی کہلانے کی مستحق تھی۔ شہرِ خیال میں سب سے پہلے محترم پروفیسر ڈاکٹر شیخ محمد اقبال کا مختصر اور خوبصورت تبصرہ پڑھا، بے حد پسند آیا۔ ان کا شعر بھی بہت خوبصورت اور دل کو چھو جانے والا تھا۔ اللہ تعالیٰ انہیں طویل، خوشگوار اور صحت مند زندگی عطا فرمائے۔ کرسی صدارت اس بار آفتاب احمد نصیر اشرفی کو نصیب ہوئی بہت بہت مبارک ہو۔ ان کا تبصرہ واقعی کرسی صدارت کا حق دار تھا۔ اسلام میں حکم ہے کہ کسی بھی معاملے میں بے مقصد کسی کی عیب جوئی یا کسی کی غلطیوں کی تلاش میں نہ رہا کرو۔ میں نے صرف اتنی سی بات کو سمجھانے کی کوشش کی تھی اور ڈاکٹر صاحب بات کو کہاں سے کہاں کھینچ کر لے جارہے ہیں اور اب تو سوال نامہ بھجوادیا ہے۔ میں نے پہلے بھی عرض کیا تھا کہ میں کسی بحث میں پڑنا نہیں چاہتا۔ سرگزشت کے صفحات ہمیشہ سے دوستوں کی آپس کی نوک جھوک اور سرگزشت میں چھپنے والے مضامین پر اپنی رائے کے اظہار کے لیے مخصوص ہیں۔ ڈاکٹر صاحب سے میری گزارش ہے کہ اب یہ سلسلہ بند کردیا جائے تو بہتر ہوگا۔ رانا محمد شاہد (بورے والا) محمد عمران خان بھکر، احمد خان توحیدی، عبدالرؤف عدم، عمران خان جونانی کے تبصرے خوب تھے۔"

تاخیر سے موصول خطوط:

آفتاب احمد نصیر اشرفی، (لاہور) چوہدری احمد خان (چکری راولپنڈی) صدرہ بانو ناگوری (کراچی) انور مجذوب (پنجاب) شاہد احمد خان (پشاور) غلام عباس جتوئی (محمد پور) اثر ہاشمی، سبط حسن، نورعین فاطمہ (کراچی)، اشعر احمد (فیصل آباد) ضیا الحسن (سیالکوٹ) احمد جاوید (سکھر) فہد مصطفیٰ (جہلم) قیصر خلیل فاروقی (میانوالی) ارشد محمود واسطی (ملتان) خاقان خان (جھنوٹ) ارشد علی (جھنگ) نسیم اللہ نیازی (حاصل پور) کائنات فاطمہ (لاہور) زاہد علی (وہاڑی) زبیر اللہ (یو اے ای)۔ ڈاکٹر ایم آر اے (جدہ) سہیل ابن یوسف (سیالکوٹ)۔

ڈاکٹر ساجد امجد

پاکستان ایک ملک ہی نہیں ایک مکمل تاریخ بھی ہے۔ قربانیوں کی تاریخ، جہدِ مسلسل کی تاریخ۔ اس کاروانِ جہدِ مسلسل میں بے شمار افراد نے اپنا اپنا کردار اپنے اپنے طریقے سے ادا کیا۔ ایسے بے شمار مجاہدینِ آزادی ہیں جنہوں نے قربانیوں کی فصیل کھڑی کی اور وطن کو جب آزادی نصیب ہوئی تو اپنا حصہ بھی طلب نہ کیا بلکہ خاموشی سے کنارہ کش ہوگئے۔ ایسے ہی لوگوں میں ایک اہم نام چوہدری رحمت علی کا ہے جن کے سرخیز ذہن نے وطنِ عزیز کا نام پاکستان تجویز کیا تھا لیکن قیامِ پاکستان کے بعد انہوں نے وطنِ عزیز سے کچھ بھی طلب نہ کیا۔ نہ جاہ و اقتدار نہ دولت و حشمت۔ وہ گوشۂ گمنامی میں خاک اوڑھے سو رہے ہیں۔

ایک بے لوث مجاہدِ آزادی کا احوالِ زیست

مشرقی پنجاب (بھارت) کے ضلع ہوشیار پور کی تحصیل گڑھ شنکر کے گاؤں موہران میں اس وقت لوگ بڑی پریشانی سے دوچار تھے چوہدری شاہ محمد کی بیوی کی حالت بگڑ گئی تھی اور چوہدری صاحب گھر پر نہیں تھے۔

چوہدری صاحب متوسط درجے کے زمیندار تھے۔ زمیندار کسی بھی درجے کا ہو اس کے مزارع اس سے تھر تھر کانپتے ہیں۔ جس علاقے میں اس کی زمینداری ہوتی ہے وہاں بس اس کا حکم چلتا ہے۔ وہ حاکم ہوتا ہے، باقی سب اس کی رعایا لیکن چوہدری صاحب کا معاملہ اس کے برعکس تھا۔ وہ نہایت خدا ترس انسان تھے۔ ان کی دینداری اور صالح کردار کی بدولت پورا گاؤں ان کا احترام کرتا تھا۔ خوف سے نہیں، عقیدت سے۔ وہ ایک چھوٹے زمیندار تھے لیکن اتنی آمدنی تو ضرور تھی کہ ان کا حویلی نما مکان دوسرے زمینداروں کی طرح عیاشی کا گڑھ بنا رہتا لیکن ان کا حال تو یہ تھا کہ جب مکان سے نکلتے تھے گاؤں کے عام آدمی سے زیادہ نظر نہ آتے تھے۔ ان کی کم آمدنی کی وجہ بھی یہ تھی کہ انہوں نے دھونس دھمکی کے ذریعے دوسروں کی زمینوں پر قبضہ نہیں کیا۔ جو آمدنی ہوتی اس کا بھی بڑا حصہ راہِ خدا میں خرچ کر دیتے۔

ان کی اس نیکی کا صلہ تھا کہ پورا گاؤں ان کے لیے پریشان ہو گیا تھا۔ چوہدری صاحب کے گھر بچے کی ولادت ہونے والی تھی لیکن کیس بگڑ گیا تھا۔ گاؤں کی عورتوں سے سنبھل نہیں رہا تھا۔ چوہدری صاحب ہوتے تو شہر سے کسی ڈاکٹر کو بلاتے۔ یہ کام گاؤں کے لوگ خود بھی کر سکتے تھے لیکن چوہدری صاحب کی اجازت ضروری تھی۔ چوہدری صاحب انگریزی علاج کے سخت خلاف تھے اور وہ زمینوں پر گئے ہوئے تھے لہٰذا کچھ نوجوان زمینوں کی طرف دوڑے تاکہ انہیں بلا کر لائیں۔

چوہدری صاحب گھوڑے پر سوار سرپٹ دوڑے ہوئے آئے۔ گاؤں والوں نے ڈاکٹر بلانے کا مشورہ دیا تو بھڑک اٹھے۔

”سرخ منہ والے انگریزوں کے علاج کا میں بالکل قائل نہیں۔“

”کئی مسلمان ڈاکٹر بھی ہیں انہیں بلایئے۔ چوہدرائن کی جان پر بنی ہوئی ہے۔“

”یہ مسلمان ڈاکٹر بھی کریں گے تو انگریزی طریقے ہی سے علاج۔“

”جان بچانے کے لیے کوئی علاج برا نہیں ہوتا

چوہدری صاحب۔"

"جان بچے یا رہے۔ میں ڈاکٹر نہیں بلاؤں گا۔ میرے رب نے چاہا اور اسے میری نسل برقرار رکھنی ہوگی تو مجھے اولاد کا پھل بھی ملے گا اور چوہدرائن کی جان بھی بچے گی۔"

ادھر یہ باتیں ہو رہی تھیں کہ چوہدری صاحب کی دعا کا تیر نشانے پر لگا۔ اندر سے خبر آئی کہ بیٹا ہوا ہے اور چوہدرائن کی طبیعت بھی بالکل ٹھیک ہے۔

چوہدری شاہ محمد شکرانے کے نفل پڑھنے مسجد چلے گئے۔ عجیب سماں تھا۔ پورے گاؤں کے مرد اُن کے ساتھ مسجد میں جمع تھے اور ان کے ساتھ نوافل ادا کر رہے تھے۔ اس کے بعد اجتماعی دعا ہوئی۔

"اے پروردگار! چوہدری صاحب کا بیٹا قسمت والا ہو۔

وہ ہمیشہ دین و دنیا کی دولت سے مالا مال رہے۔

دنیا میں اس کا نام اور شہرت ہو۔

اپنے ماں باپ کی آنکھوں کی ٹھنڈک ہو۔

اپنے وطن کے کام آئے۔

اے اللہ اسے مجاہد بنا۔

سب نے آمین کہا۔ چوہدری صاحب نے مٹھائی کے ٹوکرے منگوا لیے تھے۔ مٹھائی تقسیم کی گئی۔

نومولود کو غسل دیا جا چکا تھا۔ چوہدری صاحب کو گھر میں بلایا گیا تاکہ نومولود کے کان میں اذان دیں۔ ستواں ناک، ذرا دبیز ہونٹ، چوڑی پیشانی، گھنے بال۔ یہ تھا ان کا نومولود بیٹا۔ گھر کی عورتوں نے بچے کو اٹھا کر چوہدری صاحب کی گود میں دے دیا۔ چوہدری صاحب نے کان میں اذان دی پھر چوہدرائن سے مخاطب ہوئے۔

"تمہاری طبیعت اب کیسی ہے۔"

"اب تو اللہ کا شکر ہے۔ تمہارے بیٹے نے مجھے بہت ستایا۔"

"اس پاجی کو جتنا ستانا تھا ستا لیا۔ اب یہ تمہارے لیے آرام ہی آرام ہوگا۔"

"آپ نے کوئی نام سوچا ہے؟"

"چوہدری رحمت علی۔ کیسا لگا یہ نام تمہیں۔"

"ہاں، اللہ کی رحمت سے کسے انکار۔ اللہ کی رحمت کبھی اس کا ساتھ نہ چھوڑے۔"

چوہدری صاحب کی خوشی میں پورا گاؤں شریک تھا۔ شام تک پورے گاؤں کو جھنڈیوں سے سجا دیا گیا۔ یہ جشنِ مسرت کئی دن جاری رہا۔

ہندوستان کی جنگِ آزادی کو ابھی صرف چالیس سال گزرے تھے۔ گاؤں میں بہت سے لوگ ابھی ایسے موجود تھے جنہوں نے 1857ء کی تباہ کاریاں اپنی آنکھوں سے دیکھی تھیں۔ انگریزوں کی طرف سے نفرت کا جذبہ بھی سینوں میں سلگ رہا تھا البتہ نوجوان دنیاوی مصلحتوں کے پیشِ نظر انگریزی تعلیم کی طرف راغب تھے۔

چوہدری حاجی شاہ محمد کا شمار بھی انہی لوگوں میں ہوتا تھا جن کے دل میں اسلامی حمیت کا جذبہ کروٹیں لے رہا تھا۔ یہ احساس ہر وقت رہتا تھا کہ انگریز طاقت کے زور پر ہمارے ملک پر قابض ہو گئے ہیں۔ کوئی ایسی صورت ہو کہ ہمارے ملک کو جلد از جلد آزادی نصیب ہو جائے۔

بیگم حاجی شاہ محمد کی طبیعت ایک مرتبہ پھر خراب ہو گئی تھی۔ گاؤں کا واحد حکیم ان کا علاج کر رہا تھا۔ حالت روز بروز بگڑتی چلی گئی۔ کئی مہینے بستر پر پڑے رہنے کے بعد ان کا انتقال ہو گیا۔ رحمت علی عہدِ طفولیت میں ماں کی شفقت سے محروم ہو گیا۔

چوہدری صاحب کے لیے اس صدمے سے بڑا صدمہ کیا ہو سکتا تھا۔ رحمت علی کا بڑا بھائی چوہدری محمد علی بھی ابھی چھوٹا تھا۔ دو بچوں کی نگہداشت کرنے والی چلی گئی تھی۔

بیوی کی موت کا صدمہ اپنی جگہ لیکن دو بچوں کی پرورش کا بھی مسئلہ تھا۔ چوہدری صاحب کو دوسری شادی کرنی پڑی کہ سوتیلی ہی سہی ماں کی صورت میں ایک عورت تو ہوگی جو ان بچوں کی پرورش کرے گی۔

نئی آنے والی کو انہوں نے پہلے ہی دن بتا دیا کہ انہوں نے اپنی ضرورت کے لیے اس سے شادی نہیں کی ہے بلکہ دو معصوم بچوں کی پرورش کا مسئلہ ہے۔ ان پر توجہ دینا اور انہیں کبھی یہ احساس نہ ہونے دینا کہ تم ان کی سوتیلی ماں ہو۔ وہ بھی اللہ کی بندی ایسی سعادت مند ثابت ہوئی کہ چوہدری صاحب کی یہ نصیحت گرہ میں باندھ لی۔ کبھی یہ ظاہر نہیں ہونے دیا کہ وہ ان بچوں کی سوتیلی ماں ہے۔

رحمت علی ابھی تین سال کا ہوا تھا کہ باپ کے ساتھ مسجد جانے کی ضد کرنے لگا۔ چوہدری صاحب پانچوں وقت مسجد جاتے تو رحمت علی کو بھی اپنے ساتھ لے جاتے۔ انہیں یہ دیکھ کر حیرت بھی ہو رہی تھی اور خوشی بھی کہ وہ اپنی کم سنی کے باوجود مسجد میں نہایت ادب سے داخل ہوتا ہے۔ دوسرے بچوں کی طرح اِدھر اُدھر دوڑتا بھاگتا نہیں۔

ایک روز وہ جلدی سو گیا۔ چوہدری صاحب عشا کی نماز کے لیے جانے لگے تو انہوں نے سوچا سوئے ہوئے بچے کو کیا جگائیں، اکیلے ہی نماز پڑھنے چلے گئے۔ فجر کی نماز کے لیے جب انہوں نے رحمت علی کو بیدار کیا تو اسے شاید عشا کی نماز کا خیال آیا۔

"بابا، کیا عشا کی نماز ہو گئی۔"

"ہاں بیٹا، اب تو فجر کی نماز کا وقت ہے۔"

"عشا کی نماز تو میں نے پڑھی ہی نہیں۔"

"تم سو رہے تھے اس لیے میں اکیلا ہی مسجد چلا گیا تھا۔"

"آپ نے مجھے اٹھایا کیوں نہیں۔" اس نے کہا اور بے اختیار رونے لگا۔

"روتے کیوں ہو۔ ابھی تم پر نماز فرض نہیں ہوئی۔ پھر بھی آئندہ تمہیں اٹھا دیا کروں گا۔"

باپ نے وعدہ کر لیا تھا اس کے باوجود وہ مسجد تک روتا ہوا گیا کہ میری عشا کی نماز نکل گئی۔ چوہدری صاحب نے اس کے اس ذوق وشوق کو دیکھتے ہوئے اسے اسکول کے مدرسے میں بٹھا دیا تاکہ وہ دینی تعلیم حاصل کرے۔ یہ مدرسہ سید تابع حسین کی نگرانی میں چل رہا تھا۔ انہوں نے بھی اس کے ذہن رسا اور تعلیم حاصل کرنے کے شوق کو دیکھا۔

جب اسے مسجد میں پڑھتے ہوئے ایک سال ہو گیا اور اس کی عمر چار سال سے کچھ زیادہ ہو گئی تو سید تابع حسین چوہدری صاحب کے پاس حاضر ہوئے۔ "چوہدری صاحب، ایک بات کہنے کی جسارت کروں۔"

"سید صاحب آپ مجھے کیوں شرمندہ کرتے ہیں۔ کہیے کیا بات ہے۔"

"میں چھوٹے چوہدری کے بارے میں کچھ کہنا چاہتا تھا۔"

"کیا کوئی شرارت کی ہے اُس نے۔"

"توبہ کیجیے۔ شرارت اور رحمت علی۔ ایسا خلیق بچہ تو میں نے دیکھا ہی نہیں۔ میں تو یہ عرض کر رہا تھا کہ رحمت علی کا ذہن بہت اچھا ہے۔ اسے پڑھنے کا شوق بھی ہے۔ اگر آپ اسے دینی تعلیم کے ساتھ ساتھ دنیاوی تعلیم بھی دلوائیں تو بہت اچھا ہوگا۔"

"بھائی یہ اپنی آخرت سنوار لے تو بہت ہے۔ باقی اللہ کا دیا سب کچھ ہے۔ بڑا ہو کر زمینداری سنبھال لے گا۔"

"چوہدری صاحب، گستاخی معاف اب زمانہ بہت بدل گیا ہے۔ انگریزی راج ہے اور انگریز اب کہیں نہیں جانے والے، سنا ہے بڑے شہروں میں انگریزوں کو نکالنے کی کوششیں ہو رہی ہیں۔ معاف کیجیے گا یہ کوششیں کرنے والے جب تک پڑھے لکھے نہیں ہوں گے انگریزوں کو نہیں نکال سکتے۔ رحمت علی کو تعلیم دلوائیے۔ کیا خبر یہ بھی پڑھ لکھ کر انگریزوں کو نکالنے والوں کا ساتھ دینے کے قابل ہو جائے۔ ہمارے پیغمبرؐ کا تو حکم ہے تعلیم حاصل کرو چاہے تمہیں چین جانا پڑے۔ رحمت علی اگر انگریزی تعلیم حاصل کرے گا تو انگریز نہیں بن جائے گا۔ اس کی تربیت مذہبی ماحول میں ہوئی ہے۔ بچپن کے یہ اثرات ہمیشہ اس کے ذہن میں رہیں گے۔ انگریزی تعلیم حاصل کرنے کے باوجود یہ مغرب کے سانچے میں نہیں ڈھل سکے گا۔ کل نہ جانے کیا حالات ہوں سرکاری نوکری کرنے کے قابل تو ہو سکے گا۔ ویسے آپ کی مرضی۔"

سید تابع حسین یہ کہہ کر چلے گئے۔ چوہدری صاحب ان کے سامنے تو نہیں بول سکے تھے لیکن وہ سوچنے پر مجبور ضرور ہو گئے تھے۔ وہ کئی دن برابر سوچتے رہے۔ ایک طرف بیٹے کے مستقبل کا سوال تھا، دوسری جانب ان کے اپنے اصول تھے۔ کبھی انہیں تابع حسین کی باتوں میں وزن نظر آنے لگتا تھا کبھی اپنے اصول بھاری لگنے لگتے تھے۔

انڈین نیشنل کانگریس وجود میں آ چکی تھی۔ اس میں شامل رہنماؤں کے قصے اکثر سنتے رہتے تھے۔ یہ بھی معلوم تھا کہ یہ سب انگریزی تعلیم یافتہ ہیں۔ اس کے باوجود اپنے حقوق کی جنگ لڑ رہے ہیں تو انہیں بھی خیال آیا کہ تابع حسین کچھ ایسا غلط نہیں کہہ رہے ہیں، رحمت علی نے اگر تعلیم حاصل کر بھی لی تو وہ اپنے دین سے نہیں پھرے گا۔

گاؤں میں ایک ہی پرائمری اسکول تھا۔ چوہدری صاحب نے رحمت علی کو اس اسکول میں داخل کرا دیا۔ وہ گاؤں کے سب سے رئیس آدمی کا بیٹا تھا لیکن گھر کی تربیت ایسی تھی کہ اس نے اپنی حیثیت کا کبھی ناجائز فائدہ نہیں اٹھایا۔ عام بچوں کی طرح اسکول جاتا، زمین پر بیٹھتا۔ کلاس میں خاموشی اختیار کیے رہتا۔ اسکول کا کام پابندی سے کرتا۔ گھر آنے کے بعد بھی کھیل کود سے گریز کرتا۔ کوئی نہ کوئی کتاب لے کر بیٹھ جاتا۔ اسے زمینداری کے کام سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ وہ چوہدری صاحب سے ہزاروں سوال کرتا لیکن کبھی اپنی زمینوں کے بارے میں اس کی زبان پر کوئی

سوال نہیں آیا۔ اکثر سوال وطن اور اسلام کے بارے میں ہوتے۔ ہمارے ملک پر انگریزوں نے قبضہ کیوں کیا؟ انگریزوں کو نکالنے کے لیے ہمیں اب کیا کرنا ہوگا؟ وغیرہ وغیرہ۔

ان سوالوں سے اس کی ذہنی ساخت کا اندازہ ہوتا تھا۔ چوہدری صاحب نہایت خاموشی سے اس کے ذہنی رویّوں کا مشاہدہ کررہے تھے۔ ابتدا میں وہ بھی سمجھ رہے تھے کہ اس کا رجحان مذہب کی طرف ہے لہٰذا اسے مسجد میں پڑھنے کے لیے بٹھادیا تھا۔ پھر استاد کے کہنے سے اسکول میں داخل کرادیا کہ تھوڑا بہت پڑھ لکھ جائے گا۔ خط لکھنے لگے گا۔ زمینوں کا حساب کتاب رکھنے کے قابل ہوجائے گا لیکن اب وہ کچھ اور سوچنے لگے تھے۔ اسے اعلیٰ تعلیم دلانی چاہیے چنانچہ جب اس نے پرائمری تعلیم مکمل کرلی تو اسے موضع راہوں کے ایک اسکول ایم بی مڈل اسکول میں داخلہ دلادیا۔ یہ اسکول مڈل تک تھا۔ یہاں سے آٹھویں پاس کرنے کے بعد اب سوال یہ تھا کہ اگر اسے آگے تعلیم جاری رکھنی ہے تو میٹرک کرنے کے لیے کس اسکول میں داخل کرایا جائے۔ اس کے لیے اسے جالندھر بھیجنا پڑرہا تھا۔ چوہدری صاحب ایک مرتبہ پھر سوچ میں پڑگئے۔ اسے گھر سے دور جانا پڑرہا تھا۔ انہیں مسجد کے استاد تابع حسین کا کہنا یاد آگیا۔ انہوں نے حدیث دہرائی تھی کہ علم حاصل کرو چاہے اس کے لیے چین جانا پڑے۔ انہوں نے یہ بھاری پتھر اپنے سینے پر رکھ لیا۔ اسے جالندھر بھیج دیا۔ اس نے ہاسٹل میں رہ کر اینگلو سنسکرت ہائی اسکول سے میٹرک پاس کرلیا۔

اس کے گاؤں کا یہ ایک غیر معمولی واقعہ تھا لیکن ابھی اس سے بھی زیادہ ایک اور غیر معمولی واقعہ رونما ہونے کو تھا۔

میٹرک پاس کرنے کے بعد اس کے شوقِ تعلیم میں مزید اضافہ ہوا۔ اب اسے گریجویشن کرنا تھا۔ سوال یہ تھا کہ وہ کس تعلیمی ادارے کا رخ کرے۔ اس کا ذہن نہ جانے کہاں کہاں بھٹک رہا تھا کہ اچانک اسے احساس ہوا کہ دریا تو برابر میں بہہ رہا ہے اور وہ نہ جانے کہاں کہاں بھٹک رہا ہے۔ پڑوس میں لاہور شہر آباد تھا اور یہاں اسلامیہ کالج اپنی پوری تابناکی سے چمک رہا تھا۔

انجمن حمایتِ اسلام کے تحت قائم یہ کالج علی گڑھ یونیورسٹی کے خطوط پر جاری کیا گیا تھا اور پنجاب کے پسماندہ مسلمانوں کو زیورِ تعلیم سے آراستہ کرنے میں گرانقدر خدمات انجام دے رہا تھا۔ لاہور میں اس وقت ہندوؤں کا سناتن دھرم کالج، عیسائیوں کا کرسچین کالج اور سکھوں کا سکھ نیشنل کالج فرقہ وارانہ بنیادوں پر قائم تھے۔ گورنمنٹ کالج لاہور سرکاری سرپرستی میں چلنے والا کالج تھا۔ اس فضا میں اسلامیہ کالج (ریلوے روڈ لاہور) خالصتاً مسلمانوں کا کالج قرار دیا جاتا تھا۔

لاہور کی اسی تعلیمی اور ثقافتی اہمیت کے پیش نظر چوہدری رحمت علی بھی اپنا آبائی شہر چھوڑ کر لاہور چلا گیا اور مسلمانوں کی اس سب سے بڑی دانش گاہ میں داخلہ لے لیا۔

اس ادارے کی فضا مذہبی بھی تھی اور وطن پرست بھی۔ یہی دو خوبیاں وہ اپنے ساتھ بھی لے کر لاہور آیا تھا۔ یہاں تک آتے آتے اسے اپنے قومی مقاصد و افکار کا شعوری ادراک حاصل ہوگیا تھا۔ وہ عام طالب علموں کی طرح بے مقصد اور حیوانی سطح کی زندگی بسر کرنے کے بجائے اپنے مسلمان بھائیوں کی فلاح اور وطن کی آزادی کے جذبات سے سرشار ہوکر اپنے قلم اور اپنی زبان سے جہاد کرنے کا تہیہ کرکے آیا تھا لیکن اس کے لیے اسے ایسے دوستوں کی تلاش تھی جو اس کارِ خیر میں اس کا ساتھ دے سکیں اور اس کے لیے ضروری تھا کہ وہ اس کالج میں نصابی اور غیر نصابی سرگرمیوں کے حوالے سے اپنی اہمیت کو منوائے تاکہ اس کے دوستوں میں اضافہ ہو۔

انٹرمیڈیٹ تک کا زمانہ اس کی تیاری کا زمانہ تھا۔ اس کے بعد اس نے کالج میں ہونے والے تقریری مقابلوں میں حصہ لینا شروع کردیا۔ چند مقابلوں میں حصہ لینے کے بعد ہی اسے اندازہ ہوگیا کہ وہ تقریر کرنے کے بہترین جوہر رکھتا ہے۔ انگریزی اور اردو دونوں زبانوں پر اسے یکساں قدرت حاصل تھی۔ تھوڑے دن نہیں گزرے تھے کہ وہ کالج کا بہترین مقرر سمجھا جانے لگا۔

اس کی اسی خوبی کے پیشِ نظر اس کے دوستوں نے اسے مشورہ دیا کہ وہ اسٹوڈنٹس یونین کے جنرل سیکریٹری کے انتخاب میں حصہ لے۔ اس کالج میں اب وہ کسی کے لیے بھی اجنبی نہیں رہا تھا۔ اساتذہ سے لے کر طلبہ تک سب ہی اس کی صلاحیتوں کے معترف ہوچکے تھے۔ اس کے مداحوں کی کمی نہیں تھی۔ جو اس کے ہم خیال نہیں بھی تھے انہیں اس نے اپنی انتخابی تقریروں سے اپنا ہم خیال بنالیا۔ ایسی شعلہ بار تقریریں کیں کہ کالج کے الیکشن ملکی الیکشن نظر آنے لگے۔ اس کے مدِمقابل امیدوار نے اس کی گرم بازاری کو دیکھتے ہوئے اس کے حق میں دستبرداری کا اعلان

کردیا۔ وہ بلامقابلہ جنرل سیکریٹری منتخب ہوگیا۔

یہ اس کا پہلا قدم تھا جو سیاست کی طرف بڑھا تھا۔

کالج کا ادبی مجلہ ”کریسنٹ“ تھا۔ اساتذہ کے گروپ نے متفقہ فیصلہ کیا کہ اس مجلّے کی ایڈیٹر شپ اس کے سپرد کردی جائے۔

ابھی تک یہ سمجھا جارہا تھا کہ وہ صرف اچھا مقرر ہے لیکن ”کریسنٹ“ کے اداریوں اور مضامین سے یہ بات پایۂ ثبوت کو پہنچ گئی کہ وہ ایک شاندار قلم کار بھی ہے اور ادب پر اس کی گہری نظر ہے۔ اس کی زیرِ ادارت نہایت شاندار مجلّے شائع ہوئے۔

کالج سے باہر سیاسی ماحول نہایت گرم تھا۔ ملکی لیڈر انگریزوں سے سیاسی جنگ لڑرہے تھے۔ مسلمانوں کی مسلم لیگ قائم ہوچکی تھی۔ ہندو اور مسلمان آمنے سامنے تھے۔ سول نافرمانی کی تحریکیں زوروں پر تھیں۔ فرقہ واریت بھی عروج پر تھی۔ چوہدری رحمت علی ان حالات کا بہ غور مشاہدہ کررہا تھا۔ وہ اس نتیجے پر پہنچا تھا کہ اگر انگریز چلا بھی گیا تو ہندو ہمیں چین سے نہیں رہنے دیں گے اور اکثریت میں ہونے کی وجہ سے ہمیشہ ہم پر حکومت کریں گے۔ وہ کوئی ایسا پلیٹ فارم تیار کرنا چاہتا تھا جسے موثر ہتھیار بنا کر اپنی آواز بلند کرے اور اہلِ وطن کو بتائے کہ مسلمانوں کی بقا آزادیِ ہند میں نہیں تقسیمِ ہند میں ہے۔ دونوں قومیں ایک ریاست میں نہیں رہ سکتیں۔

ایسا نعرہ اس وقت تک کسی نے نہیں لگایا تھا۔ اس نے اپنی اس آواز کو موثر بنانے کے لیے اپنے چند ساتھیوں کے ساتھ مل کر ”بزمِ شبلی“ کی بنیاد رکھی۔ اس وقت اس کی عمر صرف اٹھارہ سال تھی۔

بزمِ شبلی کی بنیاد رکھتے ہی اس نے افتتاحی خطبے میں اپنے ان خیالات کا اظہار کردیا۔

”انڈیا کا شمالی علاقہ مسلمانوں پر مشتمل ہے اور ہم اسے مسلم علاقہ ہی رکھیں گے۔ نہ صرف یہ بلکہ ہم اسے ایک مسلمان ریاست بھی بنائیں گے۔ ایسا کرنے کے لیے سب سے پہلے ہمیں اور شمالی علاقے کے مسلمانوں کو انڈین کہلانے سے باز رہنا ہوگا۔ اس مقصد کے حصول کے لیے یہ اولین شرط ہے۔ اس لیے ہم جتنی جلدی ہندوستانیت سے چھٹکارا پائیں اسی قدر یہ اسلام اور ہم سب کے لیے بہتر ہوگا۔“

اس کالج میں اسلام پرستوں کی اکثریت تو تھی مگر چند طلبہ اسلامی نظریۂ قومیت کی بجائے مغربی اور کانگریسی ذہنیت کے حامی تھے۔ انہوں نے رحمت علی کے نظریہ تقسیمِ ہند سے شدید اختلاف کیا۔ اختلاف کرنے والے بھی اس کے ساتھی ہی تھے۔ ان کی مخالفت کو دیکھتے ہوئے وہ اپنے نظریات میں تبدیلی نہیں لاسکتا تھا۔ اس نے واشگاف الفاظ میں کہا۔ ”دوستو! اگر میرے نظریات تمہارے لیے قابلِ قبول نہیں تو پھر بہتر ہے کہ ہم جدا ہوجائیں...... ہم میں سے ہر ایک کو یہ اجازت ہے کہ وہ اپنے عقیدے کے مطابق آزادی کے حصول کے لیے ملک کی خدمت کرے۔ تم اپنے راستے پر چلتے رہو اور میں اپنی راہ پر گامزن رہوں گا۔ تم اپنے انڈین انقلاب کے لیے کام کرو لیکن میں اپنے اسلامی انقلاب کی خاطر کام کرتا رہوں گا۔ انجام کار ہم یہ دیکھیں گے کہ انڈیا میں تخلیقی انقلاب کون پیدا کرتا ہے۔

اپنی اقلیتوں کو ہندو سرزمین پر چھوڑنا اس ساری ملتِ اسلامیہ کی ایک تہائی آبادی رکھنے والے مسلمانوں کو ہندوؤں کی قیادت میں دینے کے مترادف ہے جو اپنی آزادی کے لیے براعظم میں کوئی ساتھی نہیں رکھتی۔

ہمیں اپنی اقلیتوں کو ہندو ممالک میں ہرگز نہیں چھوڑنا چاہیے خواہ برطانوی لوگ اور ہندو ہمیں نام نہاد آئینی تحفظات کی پیش کش ہی کیوں نہ کریں کیونکہ حفاظت کی کوئی یقین دہانی بھی اس قومیت کا بدل نہیں ہوسکتی جو قومیت ان کا پیدائشی حق ہے۔“

یہ اس وقت تک ایسے انوکھے خیالات تھے جو کسی کو ہضم نہیں ہورہے تھے اور شدت سے مخالفت ہورہی تھی لیکن اسے اپنی رائے کی درستی پر مکمل یقین تھا اور سمجھتا تھا کہ آگے چل کر بہت سے لوگ اس کی تائید کریں گے۔

اس کے تعلیمی اخراجات بڑھتے جارہے تھے اور والد مالی تنگدستی کا شکار تھے۔ وہ زمیندار ضرور تھے لیکن ان معنی میں کہ ”ہاری“ نہیں تھے ورنہ زمینوں سے اتنی آمدنی نہیں ہورہی تھی کہ دیگر اخراجات کے ساتھ ساتھ اس کی ضروریات احسن طریقے سے پورا کرسکیں۔ رحمت علی حساس بھی بہت تھا۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ باپ پر بوجھ بنے۔ اس نے اپنے اخراجات پورے کرنے کے لیے کسی ملازمت کی تلاش شروع کردی۔ وہ ایسی ملازمت چاہتا تھا جس سے اس کی تعلیم کا حرج نہ ہو۔ ملازمت کی نوعیت ایسی ہو کہ کالج کے اوقات کے بعد ملازمت کا وقت شروع ہوتا ہو۔ ایسی ملازمت کسی اخبار ہی میں ہوسکتی تھی۔ اسے اپنے قلم پر بھروسا

تھا۔ اخبار کی ملازمت اسے اپنے مزاج سے ہم آہنگ نظر آئی۔ ایک مشہور کشمیری صحافی اور سیاسی شخصیت محمد دین فوق ایک اخبار ''کشمیر'' نکال رہے تھے۔ اس اخبار کا لب و لہجہ نہایت انقلابی تھا۔ سیاسی معاملات پر کھل کر گفتگو کی جاتی تھی۔ وہ محمد دین فوق کے پاس پہنچ گیا اور ان سے ان کے اخبار میں ملازمت کی خواہش ظاہر کی۔

''میاں ترجمہ کر لیتے ہو۔''

''جی ہاں۔''

انہوں نے ایک انگریزی تراشہ اس کے سامنے رکھ دیا۔ ''اس کا ترجمہ اردو میں کیجیے۔''

اس نے ایک نظر اس تراشے پر ڈالی اور کسی وقت کے بغیر اس کا ترجمہ نہایت شستہ اردو میں کر ڈالا۔ محمد دین فوق نے اس ترجمے پر ایک نظر ڈالی اور زیادہ تعریف کرنا مناسب نہ سمجھا۔ صرف اتنا کہا۔ ''ٹھیک ہے، ترجمہ کر لیتے ہو۔''

''کچھ طبع زاد بھی لکھنا جانتے ہو؟''

''کالج میگزین میں میرے کئی آرٹیکل شائع ہوئے ہیں۔''

''میاں کالج میگزین کا مقابلہ اخبار سے کرتے ہو۔ پھر بھی اگر میگزین لائے ہو تو دکھاؤ۔''

اس نے میگزین میں چھپا ہوا اپنا آرٹیکل آگے کر دیا۔ فوق صاحب نے اسے کہیں کہیں سے پڑھا اور تعریف کیے بغیر نہ رہ سکے۔

''میاں ہو تو قلم کے دھنی۔ خیالات بھی انقلاب آفریں ہیں۔ اگر محنت کرو گے تو میرے اخبار کے لیے مزید اچھا لکھ سکتے ہو۔ چاہو تو ابھی جوائن کر لو، چاہو تو کل سے آ جاؤ۔''

تنخواہ وغیرہ طے ہوئی اور اس نے ''کشمیر'' جوائن کر لیا۔

دن کالج میں گزارتا اور رات کو اخبار کے دفتر چلا جاتا۔

اسے ایک میدان ہاتھ لگ گیا تھا۔ اس اخبار کے ذریعے وہ اپنے خیالات کو عام کرتا رہا۔ یہ مضمون پسند کیے جا رہے تھے لیکن ایجنسیوں کی نظروں میں بھی آ رہے تھے۔ سرکار انگریزی اس پر پابندی لگانے کے بہانے ڈھونڈ رہی تھی۔ انہی دنوں اس نے ایک انقلابی مضمون لکھا۔ ''مغرب کی کورانہ تقلید'' اس مضمون میں اس نے انگریزی حکومت پر سخت تنقید کی تھی۔ حکومت نے اخبار کے نام نوٹس جاری کر دیا۔ محمد دین فوق اس کا سامنا نہ کر سکے اور رحمت علی کو ملازمت سے برخاست کر کے حکومت کو مطمئن کر دیا۔

اس کی ملازمت چھوٹ گئی تھی لیکن اب امتحان سر پر تھے اس لیے کسی اور ملازمت کی تگ و دو کرنے کی بجائے وہ امتحان کی تیاری میں مشغول ہو گیا۔

امتحان سے فارغ ہونے کے بعد اسے پھر ملازمت کی تلاش ہوئی تا کہ وہ زیر بار باپ کی کچھ مالی اعانت کر سکے۔ لاہور کی وسیع دنیا سے نکل کر وہ کہیں اور جانا بھی نہیں چاہتا تھا۔ اسے چیفس کالج (موجودہ ایچی سن کالج) لاہور میں ٹیوٹر کی حیثیت سے کام کرنے کا موقع مل گیا۔ اس ملازمت کی نوعیت یہ تھی کہ کالج کی طرف سے امرا کے بچوں کو پڑھانے کے لیے ٹیوٹر مقرر کیے جاتے تھے۔ اسے نواب آف بہاولپور کے بیٹے کا ٹیوٹر مقرر کیا گیا۔

وہ اس ٹیوشن کو بہ احسن و خوبی انجام دیتا رہا۔ نواب صاحب اس سے بہت خوش تھے اور وقتاً فوقتاً اس کی مالی امداد کرتے رہتے تھے۔

اس کی انگریزی بہت اچھی تھی۔ گریجویشن کر چکا تھا۔ اسے سرکاری ملازمت بہ آسانی مل سکتی تھی لیکن وہ انگریز کی ملازمت کے حق میں نہیں تھا۔

زندگی کے پانچ سال اور گزر گئے۔

اب اسے پنجاب کے ایک ممتاز جاگیر دار گھرانے، مزاری خاندان کے بچوں کا ٹیوٹر مقرر کر دیا گیا۔ اس ملازمت کے ساتھ ساتھ اس نے پنجاب یونیورسٹی لا کالج میں داخلہ لے لیا۔

ملازمت کے ساتھ ساتھ تعلیم بھی جاری رکھی لیکن بعد میں یہ فرصت عنقا ہو گئی۔ اس کی قابلیت اور دیانت داری کو دیکھتے ہوئے مزاری خاندان کے سردار دوست محمد خان نے پہلے اسے اپنا پرائیویٹ سیکریٹری بنایا اور پھر قانونی مشیر مقرر کر دیا۔ اسے لا کالج میں داخل ہوئے دو سال ہو چکے تھے لیکن اب مصروفیات اتنی بڑھ گئیں کہ وہ تعلیم جاری نہ رکھ سکا۔

تعلیم ادھوری رہ گئی۔

انہی دنوں سردار دوست محمد خان کو خاندانی جائداد کے جھگڑے میں الجھنا پڑا۔ انہیں اپنا حق وصول کرنے کے لیے قانونی راستہ اختیار کرنا تھا۔ اس کے لیے انہوں نے چوہدری رحمت علی کا سہارا ڈھونڈا۔ ''میں قانونی پیروی کے

لیے آپ کو اپنا نمائندہ مقرر کرتا ہوں۔''

''نواب صاحب یہ بہت نازک معاملہ ہے اور میں نے اس سے پہلے کسی کیس کی پیروی بھی نہیں کی۔ اگر کیس ہار گیا تو الزام میری ناتجربہ کاری کو جائے گا۔''

''مجھے آپ کی قابلیت پر مکمل اعتماد ہے۔ جو بھی نتیجہ ہوگا مجھے قبول ہوگا۔ لاہور میں ایک سے ایک وکیل موجود ہے لیکن جس خلوص سے آپ میرے لیے کام کریں گے کوئی اور نہیں کر سکے گا۔ عموماً اس قسم کے جھگڑوں میں وکیل فروخت ہو جاتے ہیں۔ دوسری پارٹی سے پیسے لے کر کیس کمزور کر دیتے ہیں۔ آپ کی دیانت داری سے مجھے ایسا کوئی خدشہ نہیں ہے۔''

رحمت علی ان کے اصرار پر قانونی چارہ جوئی کا مختارِ کُل بن گیا۔ اس نے شب و روز محنت کی اور اپنی خداداد صلاحیت سے کام لے کر ان کی جائداد بحال کرا دی۔

نواب صاحب نے بھی احسان شناسی کا بھرپور ثبوت دیا اور رحمت علی کی محنتِ شاقہ کا معاوضہ ساٹھ ہزار کی معقول رقم کی شکل میں دیا۔ اس وقت یہ رقم معمولی نہیں تھی۔

☆☆☆

چوہدری رحمت علی نے اپنی تعلیم انجمن حمایتِ اسلام کے تحت قائم ہونے والے اسلامیہ کالج سے مکمل کی تھی۔ علی گڑھ کالج کے بعد اسلامیہ کالج مسلمانوں کی تعلیمی سرگرمیوں کا عظیم ترین مرکز تھا۔

انجمن حمایتِ اسلام لاہور کے سالانہ اجلاسوں میں متحدہ ہندوستان کے نامی گرامی مسلمان شریک ہو کر انجمن کی مالی اور اخلاقی معاونت کا ذریعہ بنتے تھے۔ ملتِ اسلامیہ کے ممتاز افراد مسلمان عوام اور طلبہ کے ثقافتی، علمی اور سیاسی فلاح کی خاطر یہاں آتے اور سامعین کو اپنے افکار عالیہ سے روشناس کراتے تھے۔ مفکرِ اسلام علامہ اقبال ان جلسوں میں نہ صرف اپنا کلام سناتے تھے بلکہ انجمن کے کاموں میں عملی حصہ بھی لیا کرتے تھے۔ رحمت علی ان افکار عالیہ سے متاثر ہوتا رہا تھا۔ یہاں بیان ہونے والے ارشادات اس کے سینے میں محفوظ ہو رہے تھے۔ وہ ایک انقلابی تصورِ اسلام لے کر یہاں آیا تھا، کالج کے علمی اور اسلامی ماحول نے اس کے نظریات کو مزید مستحکم بنا دیا۔

وہ اپنی مالی پریشانیوں کی وجہ سے ملازمت کے بکھیڑوں میں پڑ ضرور گیا تھا لیکن چاہتا یہی تھا کہ ملک و قوم کے کام آئے۔ اس خواب کو شرمندۂ تعبیر کرے جو اس نے

1915ء میں دیکھا تھا۔ یہ خواب تھا تقسیمِ ہند کا۔ 1915ء سے اب تک بہت وقت گزر چکا تھا۔ ہندوستان کی آزادی کی کوششیں اب عروج پر تھیں۔ انگریزوں کے مظالم وہ اپنی آنکھوں سے دیکھ رہا تھا۔ سرکردہ لیڈرانِ قوم کی عملی جدوجہد بھی دیکھ رہا تھا۔ کانگریس اور مسلم لیگ کے مناقشوں کا عینی شاہد بھی تھا۔ مسلمانوں کی سادگی اور ہندوؤں کی قلابازیوں کا مطالعہ بھی کررہا تھا۔ وہ سیاست میں اپنا حصہ ڈالنے کا خواہاں تھا۔ دو مثالیں اس کے سامنے تھیں۔ علامہ اقبال اور قائداعظم نے بھی اعلیٰ تعلیم انگلستان سے حاصل کی تھی اور ملتِ اسلامیہ کی خدمت کا فرض ادا کیا تھا۔

مزاری خاندان کی ملازمت نے جہاں رحمت علی کو مالی خوش حالی عطا کی تھی وہیں پنجاب کے امرا اور معروف زمینداروں سے دوستانہ مراسم بھی ہوئے تھے۔ اگر اس نے مزاری خاندان کی ملازمت نہ کی ہوتی تو ان بااثر افراد تک اس کی رسائی ممکن نہیں تھی۔ یہ سب وہ افراد تھے جن کا پنجاب کی سیاست میں بڑا عمل دخل تھا۔ ان کی دوستی نے اسے سیاست کی طرف راغب کیا۔ اس نے قائداعظم اور علامہ اقبال کے نقشِ قدم پر چلتے ہوئے انگلستان جانے کا ارادہ کرلیا۔ امرا اور معروف لوگوں سے دوستی اس وقت کام آئی۔ ان لوگوں نے اسے انگلستان جانے کے لیے مالی سہارا فراہم کیا۔

وہ انگلستان روانہ ہونے لگا تو چوہدری سر شہاب الدین نے اسے لورنگ ریستوران لاہور میں شاندار الوداعی پارٹی دی۔ یہ گویا اس احسان کا ازالہ تھا جو رحمت علی نے ان پر کیا تھا۔ چوہدری شہاب الدین اپنے علاقے سیالکوٹ سے الیکشن لڑنا چاہتے تھے۔ جب چوہدری سر ظفر اللہ خان ان کے مقابلے پر آئے تو چوہدری شہاب الدین کو سیالکوٹ میں اپنی کامیابی مشکل نظر آئی۔ اس وقت چوہدری رحمت علی نے انہیں اپنے شہر ہوشیار پور سے الیکشن لڑوا کر کامیاب کرایا تھا۔ یہ واقعہ 1926ء کا تھا۔ شہاب الدین کو اب اس کے ازالے کا موقع مل رہا تھا۔

چوہدری رحمت علی نے ہندوستان کو خیرباد کہا اور نومبر 1930ء کے وسط میں انگلستان پہنچ گیا۔ نواب سر عمر حیات خان ٹوانہ اس کے استقبال کے لیے موجود تھے۔ نواب صاحب اس وقت انڈین کونسل کے رکن تھے۔ رحمت علی نے انہی کے مکان واقع لندن میں قیام کیا۔

اس نے 22 نومبر کو عمانوئیل کالج، کیمبرج میں داخلے کے لیے درخواست دے دی اور 26 جنوری 1931ء کو اسے داخلہ مل گیا۔ اس نے داخلہ ملتے ہی کیمبرج یونیورسٹی کے قریب ہی رہائش اختیار کرلی اور یکسوئی کے ساتھ تعلیم کے حصول میں منہمک ہوگیا۔

جب اس نے کیمبرج یونیورسٹی میں داخلہ لیا تو یہ زمانہ انڈین سیاست کا نہایت پُرآشوب دور تھا۔ انڈین وفاق اور دیگر ہندو مسلم تنازعات کے حل کے لیے لندن میں گول میز کانفرنس کا سلسلہ شروع ہوچکا تھا۔ برطانیہ نے لندن میں متحدہ ہندوستان کے ممتاز اور بااثر ہندو اور مسلمان قائدین کو بلا کر پہلی مرتبہ ان کی گول میز کانفرنس کروائی تاکہ انہیں سیاسی مسائل خصوصاً تقسیمِ ہند کے نزاع کو سلجھانے کا موقع دیا جائے۔

آخری گول میز کانفرنس 1932ء میں منعقد ہوئی۔ رحمت علی اس وقت طالب علم تھا۔

اس آخری میٹنگ میں مسلمانانِ ہند کے لیے ایک الگ ریاست کا مسئلہ کسی قدر طے ہوا۔ انگریز اور ہندو سیاست داں، ہندوستان کے مسلمانوں کو ہندوستان کا حصہ بن کر رہنے پر مجبور کررہے تھے۔ زیادہ تر مسلمان قائدین اس برٹش پلان کے لیے رضامند ہورہے تھے۔

اس گول میز کانفرنس سے باہر چوہدری رحمت علی ہندوؤں اور انگریزوں کی اس چال سے آگاہ ہوکر اس کی شدید مخالفت کررہا تھا۔ اس کا نظریہ انڈین وفاق کی بجائے مختلف اسلامی ریاستوں کے وفاق کا نظریہ تھا۔ وہ اپنے نظریے کو عملی شکل دینے کے لیے متحرک ہوگیا۔ اس نے برطانیہ میں تحریکِ پاکستان کی بنیاد رکھ دی۔ جو مسلم رہنما اس وقت لندن میں تھے ان سے ملاقاتوں کا سلسلہ دراز کردیا خصوصاً قائداعظم اور محمد علی جوہر سے ملاقات کرکے ان پر اپنا موقف واضح کیا اور ان پر زور دیا کہ وہ انڈین وفاق کے فارمولے کو قطعی اہمیت نہ دیں۔

شاید اس کی ہی کوششوں کا نتیجہ تھا کہ یہ گول میز کانفرنس کسی نتیجے کے بغیر ختم ہوگئی۔

چوہدری رحمت علی نے اسلامیہ کالج لاہور کے طالب علمی کے زمانے ہی میں تقسیمِ ہند کو بروئے کار لانے کی تجویز پیش کردی تھی اور جب شاعرِ مشرق علامہ اقبال نے خطبہ الہ آباد کے ذریعے اسلامیانِ ہند کے لیے الگ خطہ زمین کا مطالبہ پیش کردیا تو رحمت علی کے پرانے نظریہ تقسیمِ ہند کی توثیق ہوگئی لہٰذا رحمت علی بے دھڑک ہوکر مکمل طور پر آزاد مسلم سلطنت کے قیام کی تبلیغ کے لیے سرگرم ہوگیا۔ وہ مسلمان نمائندوں سے ملا اور انہیں خدا اور رسولؐ کا واسطہ دیتے ہوئے اسلام کو ہندو اور تمام برٹش سازش سے بچانے کے لیے زور دیا لیکن جب کوئی نتیجہ برآمد نہ ہوا تو اس نے ایک انقلابی پمفلٹ شائع کیا اور اس کی کاپیاں گول میز کانفرنس کے تمام شرکا کو دیں۔ اس پمفلٹ کی اہم خصوصیت تاریخ میں یہ ہے کہ اس میں پہلی مرتبہ لفظ "پاکستان" استعمال کیا گیا جو خالصتاً چوہدری رحمت علی کی ذہنی تخلیق تھی۔ اس سے پہلے اگر مطالبہ کیا جاتا تھا تو ایک آزاد مسلم ریاست کا نام لیا جاتا تھا۔ چوہدری رحمت علی نے اس مسلم ریاست کا نام "پاکستان" تجویز کیا۔ یہ پمفلٹ 1933ء قیامِ پاکستان سے بہت پہلے شائع ہوکر تقسیم ہوا۔

چوہدری رحمت علی کا یہ کتابچہ چند صفحات پر مشتمل ہے مگر اس میں بے حد اہم اور عہد آفریں باتیں درج ہیں۔ اس میں انہوں نے انڈین فیڈریشن کی شدید مخالفت کی اور اس کی جگہ انڈیا کے مسلم اکثریت کے حامل پانچ علاقوں یعنی پنجاب، شمالی مغربی سرحدی صوبہ، کشمیر، سندھ اور بلوچستان پر مشتمل فیڈریشن کا نظریہ پیش کیا۔ اس طرح انہوں نے متحدہ انڈین قومیت کو رد کرتے ہوئے مسلم قومیت کی حمایت کی اور اس کے جواز میں متعدد ٹھوس دلائل پیش کیے۔

"انڈیا کی موجودہ ساخت کسی ایک ملک یا کسی ایک قوم کے وطن کا نام نہیں۔ دراصل یہ ایک اسٹیٹ کا نام ہے جسے تاریخی طور پر سب سے پہلے برطانوی حکمرانوں نے تخلیق کیا۔ اس میں وہ اقوام شامل ہیں جنہوں نے تاریخ کے کسی دور میں اس سے پہلے کبھی بھی انڈیا کے حصے کی تشکیل نہیں کی لیکن اس کے برعکس انہوں نے آغازِ تاریخ سے لے کر برطانوی حکومت کے ظہور تک اپنی اپنی قومیتوں کو برقرار رکھا تھا۔

انڈیا کے پانچ شمالی صوبوں میں تقریباً چار کروڑ کی کل آبادی میں ہم تین کروڑ مسلمان شامل ہیں۔ ہم اپنے مخصوص مذہب، کلچر، تاریخ، روایات، اقتصادی نظام، وراثت اور شادی بیاہ کے قوانین کی رُو سے انڈیا کے باقی حصے میں مقیم لوگوں سے بنیادی طور پر مختلف ہیں۔ ہم ہندوؤں کے ساتھ مل کر کھانا نہیں کھاتے اور نہ ہی ان کے ساتھ شادیاں کرتے ہیں۔ ہماری قومی رسومات، ہمارے کیلنڈر، ہماری خوراک اور لباس بھی مختلف ہیں۔

اگر مسلمانوں کو اپنے واضح قومی نشانات کے باوجود ہمارے دوستوں اور دشمنوں نے ہمیں سبز باغ دکھا کر مجوزہ انڈین فیڈریشن میں شامل کرلیا تو پھر ہم ایک چوتھائی اقلیت میں تبدیل ہوجائیں گے۔

ہمارے سروں پر منڈلانے والی اس عظیم آفت کو محسوس کرتے ہوئے ہم آپ کو یاد دلاتے ہیں کہ ہم تین کروڑ انسان سارے عالمِ اسلام کا دسواں حصہ بنتے ہیں۔

یہ ہیں وہ ٹھوس حقائق جنہیں جھٹلانے کے لیے ہم ہر ایک کو دعوت دیتے ہیں۔

ہماری یہ اپیل صرف مسلمانوں تک محدود نہیں بلکہ دوسرے دو بڑے مفادات یعنی برطانوی حکمرانوں اور ہندوؤں سے بھی ہے جو انڈیا کے مستقل کے حل میں شامل ہیں۔

آل انڈیا فیڈریشن میں ہماری پانچ عظیم شمالی ریاستوں کی شمولیت نہ صرف ہمارے لیے بلکہ انڈیا کی ہر ایک دوسری قوم اور گروہ کے لیے بھی تباہ کن ہوگی۔ اس سے انگریز اور ہندو بھی نہ بچ سکیں گے۔

سرزمینِ ہند میں امن اور سکون کا وجود نہیں ہوسکتا اگر ہم مسلمانوں کو ہندوؤں کی اکثریت پر مبنی اس فیڈریشن میں دھوکے سے شامل کیا جائے۔ کیا آئین میں دیے گئے تحفظات ہمیں اپنے لائحہ عمل کے مطابق اپنی نجات کے لیے کام کرنے کی گنجائش مہیا کرسکتے ہیں۔ ذرا بھی نہیں۔ انڈین وفاق کی صورت میں تینوں افواج (آرمی، نیوی، فضائیہ) خارجہ تعلقات، تجارت و معیشت، مواصلات، ڈاک، محصولات وغیرہ وفاق کے ہاتھوں میں ہوں گے جو زیادہ تر ہندوؤں پر مشتمل ہے لہٰذا ہم مسلمان اپنے نصب العینی امور کو کیسے حاصل کرسکتے ہیں۔

ہمیں بتایا جائے کہ کس غرض کے لیے ہمیں یہ کہا جاتا ہے کہ ہم اپنی قومیت، اپنے آپ اور اپنی آیندہ نسل کو غیر مسلم غلبے کے حوالے کرنے کی عظیم قربانی دیں۔

کیا ہمیں فیڈرل آئین کے حامی سب مسلمان، انگریز اور ہندو سیاست دانوں سے یہ سوال پوچھنے کی اجازت ہے۔ کیا واقعی مناسب ہے کہ انڈیا کو ایک قوم بنانے کے لیے ہم اپنی قوم سے وہ سب کچھ قربان کروادیں جو اسلام نے ہمیں گزشتہ چودہ سو سال میں عطا کیا ہے؟ کیا اس عظیم قربانی سے فی الحقیقت انسانیت کو کچھ فائدہ پہنچے گا؟

ایک اور جگہ اس نے اپنے تخلیق کردہ لفظ پاکستان کی تشریح اس طرح کی تھی۔

"پاکستان کا لفظ فارسی اور اردو کا مرکب ہے۔ یہ لفظ ان تمام حروف سے مل کر بنا ہے جو ہمارے تمام انڈین اور ایشیائی وطنوں کے نام سے ماخوذ ہے یعنی پنجاب، افغانیہ (شمالی مغربی سرحدی صوبہ) کشمیر، ایران، سندھ، تورخارستان، افغانستان اور بلوچستان۔

اس کا مطلب ہے پاک لوگوں کی سرزمین جو روحانی طور پر پاک صاف ہوں۔"

اس پمفلٹ کی اشاعت کے بعد وہ کسی جنونی شخص کی طرح سرگرداں تھا۔ برطانیہ میں مقیم مسلمان دیکھ رہے تھے کہ ایک نوجوان شخص کتابچوں کا بنڈل ہاتھ میں لیے ہر قابلِ ذکر آدمی کے پاس جارہا ہے۔ اسے یہ کتابچہ پیش کرتا ہے۔ کچھ دیر اس کتابچے کے مندرجات پر بحث کرتا ہے اور درخواست کرتا ہے کہ اس پمفلٹ میں بیان کردہ عظیم انڈین مسئلے کے مجوزہ حل کے بارے میں مجھے اپنی قیمتی رائے سے آگاہ فرمائیں گے۔

اس نے برطانوی ارکان پارلیمنٹ سے بھی ملاقاتیں کیں اور انہیں اپنے موقف سے آگاہ کرکے انہیں قائل کرنے کی کوشش کی۔ ان کتابچوں کی کاپیاں اس نے عام مسلمانوں تک بھی پہنچانے کی کوشش کی۔ وہ دن بھر بازاروں اور ریستورانوں کے چکر کاٹتا رہتا جہاں کوئی مسلمان نظر آتا وہ اسے کتابچہ پیش کرتا اور اس اسلامی ریاست کا خاکہ اس کے سامنے پیش کرتا جو اس کے ذہن میں تھا۔ یوں معلوم ہوتا تھا کہ تقسیمِ ہند کا جذبہ اس کی زندگی کا نصب العین بن گیا ہے۔ اس کے سوا دنیا میں کچھ بھی نہیں ہے۔

اس جدوجہد کا اثر اس کی تعلیم پر بھی پڑ رہا تھا۔ ڈگریوں کے حصول کا دورانیہ بڑھتا جارہا تھا لیکن اس سے بھی زیادہ اہم مراحل اس کے سامنے تھے۔ وہ سمجھتا تھا کہ "اب یا کبھی نہیں۔" اگر یہ وقت گزار دیا اور برطانوی حکومت اور ہندوؤں کا داؤ چل گیا تو پھر ہاتھ ملنے کے سوا کچھ باقی نہیں رہ جائے گا۔ اسی لیے اس نے اپنے پمفلٹ (کتابچہ) کا نام "اب یا کبھی نہیں" (Now or Never) رکھا تھا۔

اپنے خیالات کو عملی شکل دینے کے لیے وہ پورے جوش وخروش کے ساتھ آمادۂ جہاد ہوگیا۔ اس نے تحریر و تقریر کے ذریعے اپنے تصورِ ریاست کو عام کرنا شروع کردیا۔ برطانوی سیاست دانوں اور صحافیوں کو لفظ پاکستان سے نہ صرف آشنا کیا بلکہ ہندوستان کے چنگل سے مسلمانوں کو نکالنے کے لیے ان عوامل کو بے نقاب کیا جو قیامِ پاکستان کے لیے بے حد ضروری تھا۔

ان کوششوں کی صورت میں وہ پہلا شخص تھا جو برطانیہ میں تحریکِ پاکستان کی مہم چلا رہا تھا۔

اس نے اس مہم کا آغاز 1915ء میں بزم شبلی کے پلیٹ فارم (لاہور) سے کردیا تھا بعدازاں سرحد کے ایک شخص سردار گل محمد خان صدر انجمن اسلامیہ، ڈیرہ اسماعیل خان نے 1923ء میں اس قسم کے خیالات کا اظہار کیا۔ ایک سال بعد مولانا حسرت موہانی نے بھی ہندوستان کے اندر مسلمانوں کے تحفظ کی ایک اسکیم کا اعلان کیا۔ علامہ اقبال نے دسمبر 1930ء میں الہ آباد میں مسلم لیگ کے ایک اجلاس میں ایک تاریخی اور طویل خطبۂ صدارت دیا جس میں انہوں نے مسلم ریاست کی اہمیت کو اپنے مفکرانہ انداز میں بیان کیا۔ اور اب چوہدری رحمت علی برطانیہ میں رہتے ہوئے ایک آزاد مسلم ریاست کی مہم چلا رہا تھا۔ اپنی اسی تجویز کو آگے بڑھا رہا تھا جو کبھی محض ایک اٹھارہ سالہ طالب علم کی آواز تھی۔

ہندو اور انگریز لیڈر اور سیاست داں اس کے نظریے کو اپنے مخصوص مفادات کے لیے زبردست خطرہ محسوس کرتے تھے۔ اسے بدنام کرنے کے لیے اس پر طرح طرح کے الزام عائد کیے جانے لگے۔ اس نے ان الزامات کا ایسا دفاع کیا کہ مخالفین کے پرخچے اڑا دیے۔ اس زبانی جہاد کے دوران وہ اس نتیجے پر پہنچا کہ اپنے نظریات کی نشرواشاعت کے بغیر کوئی بھی انسان اپنے مقصد میں کامیاب نہیں ہوسکتا اور اس کے لیے ایک مضبوط پلیٹ فارم کی ضرورت ہے۔

اس کے کچھ ہم خیال ساتھی برطانیہ میں اسے میسر آچکے تھے۔ ان ساتھیوں کے ساتھ مل کر ہی اس نے پمفلٹ "اب یا کبھی نہیں" شائع کیا تھا۔ ان ہی لوگوں کو شامل کرکے اس نے یہاں ایک تنظیم قائم کی جس کا نام "پاکستان نیشنل موومنٹ" رکھا گیا۔ اس تنظیم کے قیام کے ساتھ ہی برطانوی حلقوں میں یہ بحث چھڑ گئی کہ اس تنظیم کے مقاصد کیا ہیں۔ اسے پاکستان دوستی نہیں ہندوستان دشمنی سے تعبیر کیا جارہا تھا۔

اس کے لیے ضروری ہوگیا کہ وہ اس تنظیم کی غرض و غایت پر بھرپور روشنی ڈالے۔ اس کے لیے اس نے ایک پمفلٹ شائع کیا۔ "اسلامی آبائی وطن اور انڈین وفاق۔"

اس پمفلٹ میں اس نے زور دیا کہ مسلمان اور ہندو دو الگ قوم ہیں۔ اس لیے مسلمان ایک جداگانہ مسلم ریاست کا مطالبہ کرنے میں حق بجانب ہیں۔ اس میں انڈین فیڈریشن کے نظریے کی تردید میں ہندوؤں اور مسلمانوں کے سماجی، ثقافتی، تاریخی اور مذہبی اختلافات کا حوالہ دیا گیا تھا۔

تحریک کے بنیادی اغراض ومقاصد یوں بیان کیے۔

1۔ ہندوستانیت کے نظریے کی مذمت
2۔ انڈین نیشنل فیڈریشن کے تصور کی مخالفت
3۔ روحانی، ثقافتی، سماجی، اقتصادی اور قومی آزادی کی اہمیت کی وضاحت
4۔ وسیع تر پاکستان اور عالمِ اسلام کے اتحاد پر زور
5۔ دیگر اہم قومی اور ملی مسائل کا حل

ان اغراض ومقاصد کا اعلان کرتے ہی اس نے جدوجہد پاکستان کے لیے انتھک محنت شروع کردی۔ وہ تقسیم ہند کے ایک خاموش سپاہی کی طرح ان مقاصد کو عام کرنے اور تفصیلات فراہم کرنے میں مگن ہوگیا۔ رائے عامہ کو ہموار کیے بغیر وہ اپنے مشن میں کامیاب نہیں ہوسکتا تھا۔ وہ اپنی کوششوں کو لندن سے باہر بھی پھیلانا چاہتا تھا تاکہ قیام پاکستان کی منزل جلد سے جلد قریب تر آسکے اور اس کے نقطۂ نظر سے دنیا واقف ہوجائے۔ اس نے اپنے موقف کی گٹھری سنبھالی اور جرمنی پہنچ گیا۔ کئی شہروں میں جاکر وہاں کے طلبہ اور اساتذہ سے ملاقاتیں کیں اور انہیں اپنے تصورِ پاکستان سے روشناس کیا۔

"مغربی تصورِ قومیت کی رُو سے ایک خاص خطۂ زمین میں رہنے والے تمام انسان بلاامتیاز ثقافت اور مذہب ایک قوم ہیں۔ ہندو لیڈر اور بعض مسلمان بھی ہندوستان میں بسنے والے تمام لوگوں کو ایک ہی قوم تسلیم کرتے ہیں لیکن میں اس نظریۂ قومیت کا سخت مخالف ہوں۔ میرے نزدیک ہندوستان میں ایک قوم یعنی ہندوؤں کے علاوہ دیگر قومیں بھی آباد ہیں۔ ان میں ایک کثیر تعداد مسلمانوں کی ہے۔ میں اسلامیانِ ہند کی مذہبی اور ثقافتی قدروں کی حفاظت کے لیے مکمل آزادی کے حق میں ہوں۔"

قیامِ پاکستان کا مطالبہ اس کی تنظیم "پاکستان نیشنل موومنٹ" کا اولین مرحلہ تھا۔ وہ سب سے پہلے مسلم اکثریت کے حامل پانچ صوبوں کو ملا کر ایک جداگانہ اور خودمختار مسلم ریاست بنانے کے لیے کوشاں تھا جس کا نام اس نے "پاکستان" تجویز کیا تھا۔

انڈیا میں مقیم باقی ماندہ مسلمانوں کو وہ بے یارومددگار چھوڑنے کے لیے تیار نہیں تھا۔ اس کے لیے وہ انڈیا کے باقی علاقوں میں بھی آزاد اور خودمختار مسلم ریاستوں کی تشکیل کرنے کا منصوبہ بھی رکھتا تھا۔

یہ اس کے تصورِ پاکستان کا دوسرا مرحلہ تھا۔

جرمنی کے قیام کے زمانے میں اس نے ان تصورات پر کھل کر روشنی ڈالی۔

اس نے ایک عرب اسکالر شکیب ارسلان سے بھی ملاقات کی۔ یہ عرب اسکالر جنیوا سے ایک رسالہ نکالتا تھا۔ رحمت علی نے اس سے درخواست کی کہ وہ اپنے رسالے میں پاکستان سے متعلق ایک مقالہ شائع کرے۔ رحمت علی نے اس کے لیے ضروری مواد بھی فراہم کیا۔ یہ مقالہ شائع ہوا اور بیرونی دنیا لفظ "پاکستان" سے آشنا ہوئی۔

وہ لندن واپس آیا تو معلوم ہوا ترک ادیبہ "خالدہ ادیب خانم" لندن آئی ہوئی ہے۔ اس نے حال ہی میں انڈیا کے سیاسی حالات کو جاننے کے لیے وہاں کا دورہ کیا تھا اور اب اپنے تاثرات کو ایک کتاب کی صورت میں مرتب کررہی تھی۔ رحمت علی کو معلوم تھا کہ وہ جو کچھ انڈیا میں دیکھ کر آئی ہے یا وہاں کے رہنماؤں سے جو کچھ سن کر آئی ہوگی اسی کو اس کتاب میں بیان کرے گی۔ اسے معلوم تھا کہ انڈین وفاق کے مسئلے پر مسلم رہنماؤں کا رویّہ بھی لچک دار ہے۔ وہ مسلم ریاست کے تو قائل ہیں لیکن وہ اسے ہندوستان کے اندر رکھنے کے بھی خلاف نہیں یا وہ اس پر زور نہیں دے رہے ہیں۔ اسے یہی اختلاف تھا جسے وہ زیادہ سے زیادہ ہوا دے رہا تھا۔ اس نے ضروری سمجھا کہ وہ خالدہ ادیب خانم سے ملاقات کرے اور اسے تصویر کا دوسرا رخ بھی دکھائے۔

وہ ایک ہوٹل میں ٹھہری ہوئی تھی۔ ادیب، شاعر، صحافی سب ہی اس سے ملاقات کو پہنچ رہے تھے۔ اس لیے بھی کہ وہ شہرت یافتہ صحافی اور ادیبہ تھی اور اس لیے بھی کہ خوبصورت تھی۔ رحمت علی کو اس سے جو باتیں کرنی تھیں اس کے لیے فرصت درکار تھی اور یہاں یہ حال تھا کہ ملنے والوں کی بھیڑ لگی ہوئی تھی۔ اس نے فون پر اس سے رابطہ کیا پہلے تو وہ زیادہ وقت دینے پر تیار نہیں تھی لیکن جب اس نے اپنے مقاصد کی نزاکت کا احساس دلایا تو وہ وقت دینے پر تیار ہوگئی۔

"یہ ملاقات ڈنر پر ہو سکتی ہے کیونکہ لوگ اس وقت مجھ سے ملنے نہیں آتے۔"

"یہ تو میری خوش قسمتی ہوگی کہ آپ کے ساتھ ڈنر کرنے کا موقع بھی ملے گا بشرطیکہ یہ ڈنر میری طرف سے ہو۔"

"یہ کیسے ہو سکتا ہے۔ آپ میرے مہمان ہوں گے۔"

"آپ لندن آئی ہیں اور میں یہاں بہت عرصے سے ہوں۔ اس لیے میزبان میں ہوا آپ نہیں۔"

"چلیے یہ فیصلہ ڈنر کی ٹیبل پر ہو جائے گا۔ آپ تشریف تو لائیں۔"

چوہدری رحمت علی اس کے دیے ہوئے وقت پر ہوٹل پہنچ گیا۔ خالدہ کمرے سے نکل کر کوریڈور میں آگئی تھی اور اس کا انتظار کر رہی تھی۔ اس کے پہنچتے ہی وہ اسے ڈائننگ ہال میں لے گئی۔ ان کی میز الگ تھلگ ایک گوشے میں تھی۔

"میں نے اگر درست سنا ہے تو آپ انڈیا کے سیاسی حالات پر اپنے تاثرات قلم بند کر رہی ہیں۔"

"جی ہاں۔ اسے آپ تاثرات بھی کہہ سکتے ہیں اور مشاہدات بھی۔"

"کیا آپ نے تمام لوگوں کے خیالات معلوم کر لیے ہیں۔"

"میں تمام قابلِ ذکر لوگوں سے مل کر آئی ہوں۔ وہاں ان دنوں ایک مسلم ریاست کا وجود زیرِ بحث ہے۔ ہندوؤں کا خیال ہے کہ انگریز ہندوستان چھوڑ کر چلے جائیں۔ بس یہی بہت ہے جبکہ مسلمانوں کو آزادیِ ہند کے اس تصور میں کچھ تحفظات ہیں۔ مختلف باتیں ہو رہی ہیں جو میں سن کر آئی ہوں۔"

"آپ تمام لوگوں سے مل کر آئی ہوں گی لیکن ایک شخص کے خیالات جاننے کی کوشش نہیں کی اور وہ میں ہوں۔ میں ہندوؤں کی اقتصادی برتری اور انگریزوں کی سیاسی فوقیت کو اسلامیانِ ہند کے خلاف برطانیہ اور غیروں کی سازش سمجھتا ہوں۔ ایک وفاق کے تحت مسلم ریاست کا قیام مجھے قطعی منظور نہیں۔ مسلم ریاست اسی وقت سود مند ہوگی جب ہم اور شمالی ہند میں رہنے والے مسلمان انڈین قومیت کو ختم کر دیں۔

اس نے تاریخی حوالوں سے ثابت کیا کہ انڈیا میں صرف ہندو قوم ہی آباد نہیں بلکہ یہاں دیگر مذاہب کے ماننے والے مثلاً مسلمان، سکھ، عیسائی وغیرہ بھی بستے ہیں اس لیے اسے ہندوستان یعنی ہندوؤں کی سرزمین کہنا غلط ہے۔ میں اسے کئی ممالک پر مشتمل ایک براعظم تصور کرتا ہوں۔ اگر ہندوؤں کے رہنے سے "ہندوستان" ہو سکتا ہے تو جہاں مسلمان ہوں گے اسے "پاکستان" کہنے میں کیا حرج ہے۔ میں پاک آئیڈیالوجی اور پاک نیشن کا قائل ہوں۔ اسی کا مجموعہ پاکستان ہوگا۔ آپ جب کتاب مرتب کر رہی ہیں تو اس نظریۂ پاکستان کا بھی اس میں ذکر ہونا چاہیے جس کا میں قائل ہوں۔ آپ کو اس کی جھلک علامہ اقبال کے نظریے میں بھی ملے گی۔

ابھی ملک تقسیم نہیں ہوا۔ وہ نظریات مرتب ہو رہے ہیں، وہ بحثیں گردش کر رہی ہیں جن کی بنیاد پر یہ ملک تقسیم ہوگا لہٰذا انصاف کا تقاضا یہ ہے کہ اس میں میرے نظریے کو بھی جگہ دی جائے۔"

"آپ کا نظریہ کیا ان سب سے مختلف ہے جو باتیں ہندوستان میں ہو رہی ہیں۔"

"میں ایک وسیع تر پاکستان کا منتظر ہوں۔"

"یہ لفظ "پاکستان" میں نے وہاں نہیں سنا۔"

"میں اس کا خالق ہوں۔ آپ جلد ہی دیکھیں گی کہ یہ نام سب کی زبان پر ہوگا۔"

"آپ کے ذہنی تصور کو میں کس طرح کتاب میں منتقل کروں۔ اس کے لیے تو بڑی تفصیلی بیٹھک کی ضرورت ہوگی۔"

"میں نے ایک پمفلٹ تحریر کیا تھا۔ "اب یا کبھی نہیں" اس کے علاوہ بھی میری کئی تحریریں ہیں۔ اس کے علاوہ پاکستان نیشنل موومنٹ کے اغراض و مقاصد ہیں۔ ان سب کا مطالعہ کر لیجیے، آپ کو میرے نظریۂ پاکستان سے آگاہی ہو جائے گی۔ میں یہ تمام مواد آپ کے لیے لے کر آیا ہوں۔ اور یاد رکھیے کوئی تصنیف اس وقت تک انصاف پر مبنی نہیں کہلاتی جب تک اس میں اختلافی نقطہ نظر بھی نہ دکھایا جائے۔ اگر میرا نقطہ نگاہ آپ کی کتاب میں شامل نہ ہوا تو یہ کتاب تصویر کا ایک رخ دکھائے گی۔ دوسرا رخ دکھانے کے لیے کسی اور کو ایک اور کتاب لکھنی پڑے گی۔"

"میں آپ سے متفق ہوں۔ آپ کا نقطہ نگاہ اس کتاب میں ضرور شامل کروں گی۔ بس ایک وعدہ کیجیے۔ اس کتاب کو لکھتے وقت اگر مجھے آپ کی ضرورت پڑی تو آپ مجھ سے ملاقات کے لیے ضرور وقت نکالیں گے۔"

یہ ملاقات نہایت خوشگوار لمحات کو سمیٹتے ہوئے ختم ہوئی۔

چند مہینے بعد پیرس میں اس کی ملاقات خالدہ سے پھر ہوئی۔ وہ اس کے نظریات پر مشتمل کتاب کا بہت سا حصہ مرتب کر چکی تھی۔ خالدہ نے اس ملاقات کا فائدہ اٹھا کر اس کا انٹرویو کیا تاکہ لکھتے وقت جو سوالات اس کے ذہن میں اٹھتے رہے تھے ان کا تسلی بخش جواب حاصل کر سکے۔

اس انٹرویو میں رحمت علی نے خالدہ ادیب خانم کو مطالبۂ پاکستان کے تاریخی، سیاسی، ثقافتی، مذہبی، اقتصادی اور آئینی پس منظر اور اس کے پیش منظر سے روشناس کرایا اور اسے بتایا کہ پاکستان کی تشکیل مسلمانوں کے علاوہ ہندوؤں اور انگریزوں کے لیے بھی مفید اور پُرامن تعلقات کا باعث ہوگی۔ اس نے اپنی سیاسی تنظیم "پاکستان نیشنل موومنٹ" کے اغراض اور ان کی اہمیت و افادیت پر بھی روشنی ڈالی اور اسے آزادیِ ملت کی ترجمان قرار دیا۔ مختصر الفاظ میں اسے بتایا "1857ء کی جنگِ آزادی میں مسلمان زوال آمادہ ہوئے لیکن انہوں نے اسلام کا عطا کردہ نظریۂ حیات تو نہیں چھوڑا تھا۔ یہی اسلامی تشخص قیامِ پاکستان کا جواز ہے۔

خالدہ ادیب خانم کی یہ کتاب "اندرونِ ہند" (Inside India) کے نام سے منظرِ عام پر آئی۔ اس میں مصنفہ نے اپنے تاثرات کے علاوہ چوہدری رحمت علی کے تصورِ پاکستان پر مشتمل ایک باب کو انٹرویو کی شکل میں بھی پیش کیا تھا۔

پاکستان کے بارے میں اس باب کا اردو ترجمہ لاہور کے روزنامہ احسان اور روزنامہ انقلاب میں شائع ہوا تو عام مسلمان اس کے اس انقلابی تصور سے آگاہ ہوئے۔

☆☆☆

پنجاب میں اتحاد پارٹی قائم ہو چکی تھی جس کا بنیادی مسلک یہ تھا کہ ہندوؤں، سکھوں اور مسلمانوں کو ملا کر ایک پارٹی خالص معاشی و اقتصادی مصالح کے مطابق بنائی جائے جو صوبے کی تمام جماعتوں کے مظلوم اور حاجت مند طبقات کے لیے کام کرے۔

نواب شاہ نواز خان ممدوٹ کے دولت کدے پر اتحاد پارٹی کا افتتاحی جلسہ ہوا اور وہیں پارٹی کا صدر دفتر بھی تجویز کیا گیا۔

اب لاہور میں چار پارٹیوں کے صدر دفتر تھے۔ اول احرار، دوم اتحاد ملت، سوم اتحاد پارٹی، چہارم مسلم لیگ۔ ان سب میں مستحکم ترین اتحاد پارٹی تھی۔

قائداعظم نے لاہور آ کر بہت کوشش کی کہ کسی طرح اتحاد پارٹی مسلم لیگ میں شامل ہو جائے لیکن اتحاد پارٹی والوں کا یہ کہنا تھا کہ پنجاب میں چونکہ مسلمانوں کی اکثریت نہیں اس لیے اگر ہم مسلم لیگ کے ٹکٹ پر منتخب ہوں اور مسلم لیگ کی وزارت بنانے کی کوشش کریں تو ہمیں کامیابی نہیں ہو سکتی۔ بہتر طریقہ یہ ہے کہ ہم اتحاد پارٹی کے غیر فرقہ وارانہ ٹکٹ پر کامیاب ہوں اور غیر فرقہ وارانہ جماعت کی وزارت بنائیں تاکہ ہماری اکثریت بھی باقی رہے اور صوبے کا کام بھی چلتا رہے۔ یہ اتحاد اس طرح ممکن نہ ہو سکا۔

میاں فضل حسین کے اچانک انتقال کے بعد پارٹی کی سربراہی سردار سکندر حیات کے ہاتھ میں آ گئی۔ انگریزوں نے ہندوستانیوں کو نمائندگی دینے کے لیے انتخابات کرائے۔

اس انتخابات کے نتیجے میں معلوم ہوا صرف اتحاد پارٹی کے کامیاب ممبروں کی تعداد ننانوے ہے۔ غیر مسلم پارٹیوں نے اتحاد پارٹی کے پروگرام میں تعاون کا عہد کیا تو یہ تعداد 135 تک پہنچ گئی جبکہ پورا ایوان 175 کا تھا۔ لہٰذا وزارت سردار سکندر حیات کے حصے میں آئی۔

انہی دنوں لکھنؤ میں "میثاق سکندر و جناح" ہوا۔ سر سکندر حیات نے عہد کیا کہ ہر وہ مسلمان جو اتحاد پارٹی میں شامل ہے، مسلم لیگی ہوگا اور جناح صاحب نے اقرار کیا کہ وہ اتحاد پارٹی کے ہر مسلمان کو مسلم لیگی تسلیم کریں گے اور وہ دوسرے مسلم لیگیوں سے ہرگز کم نہ سمجھا جائے گا۔ اس "پیکٹ" سے وہ لوگ بے حد مایوس ہوئے جو سردار سکندر حیات کی پارٹی اور مسلم لیگ کے درمیان تصادم پیدا کرنے کی سازشیں کر رہے تھے۔

☆☆☆

ہندو اور سکھ اپنے والنٹیئروں کے "دل" تیار کر رہے تھے جو دن رات بازاروں میں مارچ اور میدانوں میں پریڈ کرتے پھر رہے تھے۔ سردار سکندر حیات نے ان پر پابندی عائد کرنے کا فیصلہ کر لیا لیکن وہ "خاکسار تحریک" سے خوفزدہ تھے جس کے سربراہ عنایت اللہ مشرقی تھے۔ انہیں خدشہ تھا کہ ہندو اور سکھ تو اس پابندی پر عمل کریں گے لیکن عنایت اللہ مشرقی اس حکم پر عمل نہیں کریں گے اس لیے ضروری ہے کہ انہیں پہلے اعتماد میں لے لیا جائے۔ انہوں نے اپنے کئی نمائندے ان کے پاس بھیجے لیکن کوئی فیصلہ کن بات نہیں

ہوئی۔ اس کے بعد سردار صاحب نے انہیں چائے پر بلایا اور انہیں حالات کی نزاکت کا احساس دلایا۔ علامہ مشرقی نے چند شرطوں کے ساتھ اس حکم امتناعی پر عمل کرنے کا وعدہ کیا۔

"ہم قطار بندی کر کے سڑکوں پر تو نہیں نکلیں گے لیکن ہمیں بیلچہ برداری اور وردی پوشی کی اجازت دی جائے (خاکسار ایک خاص قسم کی خاکی وردی پہنتے تھے اور بیلچے اٹھا کر چلتے تھے)

سردار سکندر نے اس شرط کو منظور کرلیا بلکہ یہ بھی کہا "میں آپ کو خاکساروں کی ریلی کی بھی اجازت دے دوں گا بشرطیکہ ایسی ریلی کسی محدود احاطے کے اندر منعقد کی جائے۔"

خیال یہی تھا کہ علامہ صاحب کا اطمینان ہوگیا اور اب کسی گڑبڑ کا اندیشہ نہیں لیکن غالباً وہ پوری طرح مطمئن نہیں ہوئے تھے اور وائسرائے تک بات پہنچانا چاہتے تھے۔ وہ دہلی چلے گئے اور وائسرائے سے ملنے کی کوشش کی لیکن پرائیویٹ سیکریٹری تک پہنچ سکے اور اس نے بھی یہ کہہ کر جان چھڑالی۔

"یہ لا اینڈ آرڈر کا معاملہ ہے جس کا پورا اختیار صوبائی حکومت کو ہے۔ وائسرائے اس میں مداخلت نہیں کرسکتے۔"

یہ جواب سن کر علامہ مشرقی مشتعل ہوگئے۔ اپنے اخبار "الاصلاح" میں دو تین مضامین حکومت پنجاب اور سردار سکندر حیات کے خلاف لکھے اور ایک مضمون میں خاکساروں سے کہا تھا کہ ہزارہا کی تعداد میں لاہور میں جمع ہوجائیں اور سکندر کے بستر کے گرد لاشوں کے انبار لگادیں۔ حکومت پنجاب سے ٹکراؤ ہوگا اور ضرور ہوگا۔

علامہ مشرقی کی یہ بے جا تنقید اور حکومت کو تشدد کی دھمکی اس تناظر میں اور بھی خطرناک ہوگئی تھی کہ آل انڈیا مسلم لیگ کا سالانہ اجلاس (مارچ 1940ء) لاہور میں منعقد ہوتا تھا۔ چونکہ ایک علیحدہ وطن پر مسلمانوں کا اتفاق ہوچکا تھا اس لیے اس اجلاس کی اہمیت مسلّم تھی۔ اس اجلاس میں علیحدہ وطن کی قرارداد پیش کی جانی تھی۔ اس وقت تک "لفظ پاکستان" استعمال نہیں ہوا تھا۔

☆☆☆

چوہدری رحمت علی عرصہ دراز سے انگلستان میں مقیم تھے۔ وہ 1930ء میں یہاں آئے تھے اور 1940ء آ گیا تھا۔ اس دوران انہوں نے اعلیٰ تعلیمی ڈگریاں حاصل کرلیں۔ کیمبرج اور ڈبلن کی دانش گاہوں سے ماسٹر آف آرٹس (ایم۔اے) اور بیچلرز آف لا (ایل۔ایل۔بی) کی ڈگریاں لینے کے بعد لندن کی ایک مشہور قانونی درس گاہ "مڈل ٹمپل ان" سے بیرسٹری کا امتحان پاس کیا۔

اپنے اس تعلیمی مقصد کے ساتھ ساتھ وہ مسلمانانِ ہند کی مکمل آزادی اور چند آزاد مسلم ریاستوں کے قیام کے لیے دن رات کام کرتے رہے تھے۔ اب وطن کی یاد ستانے لگی تھی۔ اپنے مقاصد کی تکمیل کسی حد تک کرلی تھی۔ اب ان کے مجوزہ پاکستان کی قرارداد پیش کی جانے والی تھی۔ مسلم لیگ کا اجلاس دہلی میں ہورہا تھا۔ انہوں نے وطن جانے کی ٹھان لی تاکہ اس اجلاس میں شریک ہوسکیں۔ وہ براستہ جاپان، ہانگ کانگ اور سری لنکا بمبئی پہنچے اور وہاں سے کراچی آئے۔

مسلم لیگ کے اجلاس میں ابھی دو تین روز باقی تھے۔ منٹو پارک لاہور میں (جہاں اب مینار پاکستان ہے) پنڈال تیار کیا جارہا تھا کہ خاکساروں کا پولیس سے تصادم ہوگیا۔

ڈپٹی کمشنر مسٹر بورن کے مطابق خاکساروں کا ایک گروہ ہیرا منڈی سے مسلم لیگ کے پنڈال کی طرف جانا چاہتا تھا۔ جانے کو سب جارہے تھے لیکن ان کے تیور بتا رہے تھے کہ ان کی نیت ٹھیک نہیں۔ پولیس نے انہیں روکا۔ انہوں نے بیلچے لہرائے اور پولیس کا حکم ماننے سے انکار کر کے آگے بڑھتے رہے۔ پولیس نے پھر روکنے کی کوشش کی تو انہوں نے بیلچوں سے پولیس پر حملہ کردیا۔ بہت سے پولیس والے اس وقت شدید زخمی ہوگئے۔ ایک بیلچے نے ڈپٹی کمشنر کا بھی چہرہ بگاڑ دیا۔ ایک پولیس افسر مارا گیا۔ پولیس نے گولی چلادی۔ کچھ خاکسار مارے گئے۔

یہ واقعہ ایسا تھا کہ اگر مزید پھیلتا یا اس کی بڑھا چڑھا کر شہرت کی جاتی تو مسلم لیگ کے اجلاس کے ملتوی ہونے کا خدشہ پیدا ہوجاتا۔ حکومت نے صحافیوں کو طلب کیا۔ جتنے قابلِ ذکر اخبارات لاہور سے نکلتے تھے ان کے ایڈیٹر صاحبان آئے۔ انہیں وقت کی نزاکت کا احساس دلایا گیا اور ان سے درخواست کی گئی کہ اس واقعے کی خبریں اور تبصرے شائع کرتے ہوئے احتیاط سے کام لیا جائے۔ ہندوستان بھر کے نمائندہ مسلمان جمع ہورہے ہیں۔ خود قائد اعظم تشریف لارہے ہیں (محمد علی جناح اب مسلمانانِ ہند کے قائد اعظم بن چکے تھے) اگر اس واقعے کو اچھالا گیا تو فضا مکدّر ہوسکتی ہے۔

علامہ مشرقی کو حکومتِ ہند نے دہلی لاکر جنوبی ہند میں نظر بند کردیا اور غالباً اس رازداری سے کہ کسی کو کانوں کان خبر نہ ہوسکی۔

یہ حالات تھے جب چوہدری رحمت علی کراچی پہنچے۔ ابھی لاہور جانے کی تیاری کررہے تھے کہ پنجاب حکومت نے ان کی لاہور آمد پر پابندی عائد کردی۔ اس وقت حکومت پنجاب کے وزیرِ اعلیٰ سر سکندر حیات تھے۔ چند روز پہلے ہی خاکساروں پر گولی چلائی گئی تھی۔ چوہدری رحمت علی کی حق گوئی، بے باکی اور انقلابی نظریات کے پیشِ نظر حکومت پنجاب نے ان پر پابندی عائد کی تھی۔

ایک ایسا محسن جس نے اپنی پوری جوانی تحریکِ پاکستان پر نچھاور کردی۔ جو عین عالم شباب میں انگلستان گیا اور وہاں کی رنگین زندگی کا شکار ہونے کی بجائے جدوجہدِ پاکستان کا علم بلند کیے رکھا۔ اس نے دیارِ غیر میں "پاکستان" کا نام متعارف کرایا اور اپنے دیار میں اس کے ساتھ یہ سلوک کیا گیا کہ ایک طرح سے ایک ہی شہر میں نظر بند کردیا گیا۔ جو آزادی کے لیے لڑتا رہا، قید ہوگیا۔

چند میل کے فاصلے پر مسلم لیگ کا تاریخ ساز اجلاس ہورہا تھا لیکن وہ شریک نہیں ہوسکتا تھا۔ اس کے لبوں پر شکایت ضرور تھی لیکن یہ اطمینان بھی تھا کہ اس کی کوششیں بار آور ہوئی ہیں۔ اس کی خواہش کے مطابق نہ سہی لیکن تقسیمِ ہند کی منزل قریب تو آگئی۔

"میرا دیا ہونام "پاکستان" بھی اس قرارداد میں ضرور شامل ہوگا۔" اس نے اپنے قریبی ساتھیوں سے کہا تھا۔

اس مایوسی کے عالم میں بھی وہ اپنے مشن کو نہیں بھولا۔ وہ فوراً واپس نہیں چلا گیا کراچی ہی میں ٹھہرا رہا۔ اس نے پہلی بار انگلستان سے باہر اپنی تنظیم "پاکستان نیشنل موومنٹ" کی سپریم کونسل کا اجلاس مسلم لیگ کے اجلاس سے ایک روز قبل کراچی میں طلب کیا اور اس سے خطاب کیا۔

اس کی تقریر کا مرکزی خیال یہ تھا کہ ہندوستانیت اور وطنیت کی بنیاد پر متحدہ انڈین نیشنلزم کا پُرفریب نظریہ اب اسلامیانِ ہند کے لیے بالعموم اور بنگال اور حیدر آباد دکن کے مسلمانوں کے لیے بالخصوص زندگی اور موت کا مسئلہ ہے۔ اگر وہ ہندوستانیت یعنی متحدہ انڈین وطن اور مشترکہ انڈین قومیت کے جال سے باہر نہ نکلے تو وہ ہندوؤں کے غلام بن جائیں گے۔ اس لیے انہیں حقِ خود ارادیت کا مطالبہ کر کے آزادی حاصل کرنی چاہیے۔

میں کتابیں پڑھتا ہوں

یہ غالباً 1962ء کا واقعہ ہے۔ راجا صاحب راولپنڈی میں صدر ایوب کے مہمان تھے، صبح کا وقت تھا، مسٹر منظور قادر بھی وہاں موجود تھے، ایوب خان کے سامنے فائلیں پڑی تھیں اور تینوں کافی پی رہے تھے۔ ایوب خان کو نجانے کیا سوجھی، موضوع گفتگو سے ہٹ کر کہا۔ "ہمارے ملک میں سارا فساد ان لوگوں نے پھیلایا ہے جو کتابیں پڑھتے ہیں۔" راجا صاحب کو یہ بات بہت ناگوار گزری لیکن خاموش رہے۔ مسٹر منظور قادر نے موضوعِ گفتگو بدلتے ہوئے راجا صاحب سے پوچھا "آج کل آپ کا اصل مشغلہ کیا ہے؟" راجا صاحب نے ایوب خان کی طرف دیکھتے ہوئے جواب دیا "کتابیں پڑھتا ہوں۔"

ایوب خان نے سر جھکالیا اور خود کو فائلوں میں محو کردیا۔

اقتباس: راجا صاحب محمود آباد از جمیل الدین عالی

اس خطاب میں انہوں نے بنگال اور آسام کی مسلم آبادی پر مشتمل علاقے کو "بانگِ اسلام" قرار دیتے ہوئے "بانگستان" کا نام دیا۔ اسی طرح حیدر آباد دکن کی مسلم آبادی والے علاقے کو "عثمانستان" کا نام دیا۔

لاہور میں اجلاس کا دن آگیا۔ قائد اعظم تشریف لائے۔ سر سکندر حیات نے ان کا شایانِ شان استقبال کیا۔ لاہور کی فضا خصوصاً مسلم لیگ کے اجلاس کی فضا تازہ حادثے کی وجہ سے سخت مکدّر ہورہی تھی لیکن قائد اعظم کے تدبر اور سر سکندر کی دردمندی نے تمام تکدّر کو صاف کردیا۔

اجلاس نہایت کامیابی سے منعقد ہوا اور وہ قرارداد اتفاق رائے سے منظور ہوئی جس کو قراردادِ پاکستان کہتے ہیں۔ قائد اعظم ابھی تک لفظ پاکستان سے مانوس نہیں ہوئے تھے لہٰذا قراردادِ لاہور میں پاکستان کا لفظ تو استعمال نہیں کیا گیا البتہ مطالبے کی شکل وہی رکھی گئی جس سے پاکستان کے سوا کچھ اور مقصود نہیں تھا۔

چوہدری رحمت علی نے "پاکستان" کا لفظ بڑے غور و فکر کے بعد تجویز کیا تھا۔ جب انہوں نے سنا کہ قراردادِ لاہور میں ان کا تجویز کردہ یہ نام شامل نہیں کیا گیا ہے تو انہیں سخت مایوسی ہوئی۔ اس مایوسی کے عالم میں وہ کسی سے ملاقات کیے بغیر انگلستان کی طرف واپس چلے گئے۔ اپنے بھائی

چوہدری محمد علی کے سوا کسی رشتے دار سے بھی ملاقات نہ ہو سکی۔ ہوا کا ایک جھونکا تھا جو آیا اور گزر گیا۔

چوہدری رحمت علی نے تو اس سلسلے میں کوئی مخالفانہ بیان نہیں دیا۔ چند قریبی لوگوں کے سوا کسی سے کوئی گلہ نہیں کیا اور گلہ بھی کیا تو صرف یہ کہ دشمنوں کو باتیں بنانے کا موقع ملے گا۔

ہندو پریس ان خبروں سے بھر گیا۔ طنز کے تیر برسنے لگے۔ طنزاً قیامِ پاکستان کو ناممکن قرار دیا گیا۔ خدا کی قدرت دیکھیے کہ بعد میں یہی نام نہ صرف مسلم قائدین کو اپنانا پڑا بلکہ مخالفین پر بھی اس کی عملی حقیقت ظاہر ہو گئی۔ وہی ہندو صحافی اور سیاست داں جو اس نام کو ہدفِ طنز و تنقید بناتے تھے انہیں اب یہ نام قیامِ پاکستان کے لیے تسلیم کرنا پڑا۔ بانیِ پاکستان قائداعظم محمد علی جناح نے بھی ہندوستان میں دو بڑی قوموں ہندوؤں اور مسلمانوں کے وجود کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے دو قومی نظریے کی بنیاد پر مسلمانوں کے لیے جداگانہ مسلم ریاست کا مطالبہ کیا تھا۔ جب پاکستان کے لفظ کی خوب تشہیر ہو گئی تو مسلمانوں کے اس بلند ہمت لیڈر یعنی محمد علی جناح نے جون 1947ء میں تقریر کرتے ہوئے پہلی بار اپنی تقریر کے اختتام پر لفظ ''پاکستان'' استعمال کیا۔

چوہدری رحمت علی کا کام ابھی ختم نہیں ہوا تھا۔ ان کا تجویز کردہ نام ''قراردادِ لاہور'' میں استعمال نہیں کیا گیا تھا لیکن وہ بھی اس کے قائل تھے کہ نام سے کیا ہوتا ہے کام تو کرنا ہے۔ ابھی صرف قرارداد پیش ہوئی تھی۔ اسے منظور کرانے بلکہ منظور کرنے کے لیے بڑی تگ و دو کی ضرورت تھی۔ انہیں ان لوگوں کے ہاتھ مضبوط کرنے تھے جو اس جدوجہد میں شریک تھے۔

اس وقت کے ہندوستان اور آج کے پاکستان میں ان کے ساتھ جو سلوک ہوا۔ جس طرح ان پر پابندی عائد کی گئی جس طرح انہیں مسلم لیگ کے اجلاس سے دور رکھا گیا وہ مایوس کن تھا لیکن انہوں نے اس مایوسی کو خود پر طاری نہیں کیا۔ قافلے سے الگ نہیں ہو گئے۔ تھک کر بیٹھ نہیں گئے بلکہ تحریر و تقریر کا سلسلہ پھر شروع کر دیا۔ وہ برابر پمفلٹ لکھتے رہے اور انہیں شائع کر کے پھیلاتے رہے تاکہ ان کے نظریات دوسروں تک پہنچیں اور بیرونی دنیا قیامِ پاکستان کی ضرورت کو محسوس کرے اور ان لوگوں کا کام آسان ہو جو ہندوستان میں رہ کر برطانوی حکومت سے اپنا حق منوانے کے لیے کوشاں تھے۔ انہیں معلوم تھا کہ اتنے بڑے بڑے کام کوئی ایک آدمی نہیں کرتا۔ اس میں سب کو اپنا حصہ ڈالنا پڑتا ہے۔ وہ اپنا حصہ ڈالتا رہا اور وہ بھی اس جذبے کے ساتھ کہ نہ ستائش کی تمنا نہ صلے کی پروا۔

اس نے ایک پمفلٹ (کتابچہ) ''ملت اور نصب العین'' کے عنوان سے کیمبرج سے شائع کیا۔ اس میں ملتِ اسلامیہ کے اتحاد اور استحکام کے بارے میں سات رہنما اصول بیان کیے گئے تھے تاکہ پاکستان، بانگستان اور عثمانستان کے مسلمانوں کے علاوہ براعظم انڈیا کے بقیہ مسلمان بھی اپنی سیاسی آزادی حاصل کر کے ملتِ اسلامیہ کے اتحاد اور طاقت کا ذریعہ بنیں اور اپنی ایک تنظیم ''پاک کامن ویلتھ آف نیشنز'' بنا سکیں۔ اس پمفلٹ میں مسلمانوں کو یہ بھی مشورہ دیا کہ وہ انڈیا کو ''دینیہ'' (بہت سے مذاہب اور ادیان کی سرزمین) میں تبدیل کر کے اپنے علیحدہ اسلامی تشخص کی حفاظت کریں۔''

اس کے ٹھیک ایک سال بعد ہی ایک پمفلٹ ''ملت اور اس کی اقلیتیں'' جاری کیا۔ اس پمفلٹ میں بہار اور اڑیسہ کے مسلمانوں کو اپنا آزاد اور خود مختار علاقہ بنانے کا مشورہ دیا گیا تاکہ وہ متحدہ انڈین نیشنل میں مدغم ہو کر اپنا ملی اور اسلامی تشخص نہ کھو دیں۔

ایک اور پمفلٹ اسی سال شائع کیا۔ اس پمفلٹ میں حیدر آباد دکن کے مسلمانوں کے لیے ایک خود مختار ریاست کی تشکیل کی تجویز پیش کی گئی اور اسے ''حیدرستان'' کا نام دیا گیا۔

ایک کتابچہ ساؤتھ انڈیا کے مسلمانوں کے لیے ایک آزاد ملک کے قیام کی تجویز پیش کرنے کے لیے لکھا۔ اس ریاست کے لیے ''ماپلستان'' یعنی موپلہ مسلم لوگوں کی سرزمین کا نام دیا گیا۔

ایک کتابچہ راجستھان کے مسلمانوں کے لیے بھی لکھا۔ اس میں انہوں نے راجستھان کے مسلمانوں کو اپنا ایک الگ آزاد مسلم وطن بنانے پر ابھارا تھا تاکہ وہ ہندوؤں کی غلامی کے چنگل سے محفوظ ہو سکیں۔ اس آزاد ملک کا نام انہوں نے خواجہ معین الدین چشتی کی نسبت سے معینستان رکھا تھا۔

ایک اور پمفلٹ 1943ء میں جاری کیا۔ اس میں سینٹرل انڈیا کے مسلمانوں کے لیے ایک آزاد وطن ''صدیقستان'' کے قیام کی تجویز پیش کی گئی تھی۔

1943ء ہی میں ایک اور پمفلٹ جاری کیا۔ اس پمفلٹ میں مغربی سیلون کے مسلمانوں کو اپنے آزاد وطن کی تشکیل پر ابھارا گیا جس کا نام ''صافستان'' رکھا (حضرت آدم علیہ السلام کا لقب ''صفی اللہ'' ہے) روایت ہے کہ حضرت آدم علیہ السلام جب زمین پر اترے تو انہوں نے سب سے پہلے سیلون میں رہنا شروع کیا تھا۔ اس پاک نسبت کی وجہ سے چوہدری رحمت علی نے اسے ''صافستان'' کا نام دیا۔

مشرقی سیلون کے مسلمانوں کی ایک علیحدہ مسلم ریاست کی تخلیق کے لیے ''ناصرستان'' نام تجویز کیا۔

1944ء میں ایک کتاب شائع کی ''ملت اور اس کی دس اقوام۔'' اس کتاب میں انہوں نے انڈیا کو ''دینیہ (بہت سے ادیان کے ماننے والوں کی سرزمین) کہا ہے تاکہ ہندوؤں پر واضح کیا جائے کہ اسے ہندوستان یا انڈیا کہنا غلط ہے کیونکہ اس براعظم میں مسلمان، سکھ، عیسائی، بدھ مت کے پیروکار اور اچھوت بھی رہتے ہیں۔ اسے براعظم کہنے کی ایک اہمیت یہ بھی ہے کہ انڈیا واحد ملک نہیں بلکہ یہ دیگر اقوام کے ممالک بھی اپنے اندر رکھتا ہے۔ اس لیے دیگر قومیں ہندوؤں سے الگ خود مختار علاقوں کی تشکیل کی حق دار ہیں۔ چوہدری رحمت علی اپنے پاک پلان کے تحت انڈیا کے دس مختلف علاقوں میں مقیم مسلمانوں کے دس آزاد علاقوں کو متحد اور مضبوط بنانے اور ان کی پاک کامن ویلتھ میں شمولیت کے حامی تھے۔ اس مسلم اتحاد کا مقصد ہندوؤں کے مجوزہ راج کے قیام کی سازش کو ناکام بنانا تھا۔

انڈیا: دینیہ کا براعظم یا تباہی کا ملک

یہ پمفلٹ 1946ء کو کیمبرج سے جاری کیا گیا۔ اس پمفلٹ کا مرکزی تصور یہ تھا کہ انڈیا ایک براعظم ہے جسے ہندوؤں نے بڑی چالاکی سے صرف اپنا ہی وطن قرار دے لیا ہے اور دوسری قوموں کو متحدہ وطنیت اور مشترکہ انڈین قومیت کے جال میں پھنسا کر انہیں اقلیتیں کہا اور اس طرح ان کی ثقافتی، تمدنی اور مذہبی روایات کو ختم کر کے انہیں اپنے اندر ضم کرنے کی کوشش کی تھی۔ انگریزوں نے بھی اپنا حکومتی نظام چلانے کے لیے اسے ایک مرکز کے تحت کر دیا اور یوں مصنوعی انڈین وحدت کو جنم دیا۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ یہ بدنصیب ملک بن گیا ہے۔ اب اگر یہ مظلوم اقلیتیں اپنی آزادی حاصل کرنے کے لیے جدوجہد کریں تو یہ غلط نہ ہوگا۔

برطانوی حکومت نے کانگریس اور مسلم لیگ کے باہمی تنازعہ کے حل کے لیے کابینہ کے ارکان پر مشتمل ایک وفد انڈیا بھیجا تھا۔

اس مشن نے اپنی تجاویز پیش کرتے ہوئے مطالبۂ پاکستان کو رد کر دیا اور انڈین یونین کی حمایت کی۔ چوہدری رحمت علی نے اپنے اس پمفلٹ میں ان تجاویز پر سخت نکتہ چینی کی اور اسے پاکستان اور انڈیا کے بقیہ علاقوں کے مسلمانوں کے مفادات کے خلاف ایک سازش قرار دیا۔

اسی سال ایک اور پمفلٹ جاری کیا اس میں انہوں نے پاکیشیا کے روحانی اور اخلاقی کارناموں، ذات پات کے حامل ہندوؤں کے اسلام کش مذموم عزائم سے بچاؤ کی اہمیت اور اس وسیع خطے میں مقیم تمام انسانوں کے حقِ خود ارادیت کے جواز کا تذکرہ کیا۔

پاکیشیا سے ان کی مراد جنوبی ایشیا کا وہ وسیع اور مختلف النوع علاقہ تھا جہاں گزشتہ تیرہ صدیوں میں اسلام اپنی تابانیوں کا حامل رہا ہے۔

وہ ان دنوں سخت محنت کر رہے تھے۔ شبانہ روز کی محنت کے بعد ایک کے بعد ایک پمفلٹ دنیا کے سامنے لا رہے تھے تاکہ برطانوی حکومت پر زیادہ سے زیادہ دباؤ ڈالا جا سکے اور دوسری طرف ہندوؤں کے خلاف اسلام کا مقدمہ قائم کیا جائے۔

ایک پمفلٹ 'دینیہ، دنیا کا ساتواں براعظم لکھا۔ انہوں نے ہندوستان کا نام بدل کر اسے ''دینیہ'' یعنی بہت سے ادیان کے ماننے والوں کی سرزمین قرار دیا۔ اسے دنیا کا ساتواں براعظم قرار دینے کی جغرافیائی، تاریخی، ثقافتی اور مذہبی وجوہات کا تذکرہ کیا۔ ان کا کہنا تھا کہ روس کو نکال کر بقیہ یورپ کی طرح یہ علاقہ رقبہ کی وسعت، آبادی کی کثرت اور مختلف قوموں کے جداگانہ ثقافتی اور سیاسی تشخص کی اہمیت کا مظہر ہے۔ اس لیے یہ براعظم کا درجہ رکھنے کا حقدار ہے اور اس میں رہنے والے جداگانہ اور خود مختار نئے علاقوں کے قیام کا مطالبہ کرتے ہیں۔

ایک پمفلٹ آسام اور بنگال کے حق میں لکھ کر اس کا نام ''بانگستان'' رکھا۔ ان کی رائے میں آسام اور بنگال دونوں ''بانگِ اسلام'' کا درجہ رکھتے ہیں۔ پاکستان کی طرح یہ علاقہ بھی مسلم اکثریت پر مشتمل ہے مگر ہندوؤں اور انگریزوں نے مل کر اپنی سازش سے اس اکثریت کو سیاسی اقلیت میں تبدیل کر رکھا تھا اس لیے انہوں نے آسام اور بنگال کے مسلمانوں سے کہا کہ وہ حقِ خود ارادیت کا اعلان کر کے ایک خود مختار اور الگ مسلم مملکت کی تشکیل کر لیں۔ اس کا نام انہوں نے ''بانگستان'' رکھا۔

اسی طرح ایک کتابچے کے ذریعے انہوں نے حیدر آباد دکن کے مسلمانوں کی آزادی پر روشنی ڈالی اور ان کی ثقافتی، تاریخی اور مذہبی روایات کی حفاظت کے لیے ان کی آزادی کو لازمی قرار دیا۔

جنگِ عظیم تمام محاذوں پر نہایت شدت سے جاری تھی اور اب جاپانی بھی برما پر قابض ہوکر ہندوستان کے دروازے پر دستک دے رہے تھے۔ چونکہ مشرقی کمان کو فوج کے لیے چاولوں کی نہایت کثیر تعداد مطلوب تھی اور حکومتِ ہند کے محکمۂ خوراک نے خاطر خواہ انتظام نہ کیا تھا۔ اس لیے فوجی حکام نے بنگال سے اندھا دھند بہت زیادہ نرخوں پر چاول خریدنا شروع کردیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ چند ہفتوں میں چاول کے نرخ پندرہ روپے من سے بڑھ کر ایک سو بیس روپے تک پہنچ گئے۔ دیہات میں چاول کا ایک دانہ نہ رہا۔ لاکھوں انسان بھوک سے مرنے لگے۔

ایک روایت کے مطابق اس قحط میں پچیس لاکھ بنگالی لقمۂ اجل بن گئے۔

سر سکندر حیات کا انتقال ہوچکا تھا۔ ان کی جگہ خضر حیات کے ہاتھ وزارت آئی تھی۔

سیاست کی کشتی اب کچھ اور آگے بڑھ گئی تھی۔ قائد اعظم چاہتے تھے کہ اتحاد پارٹی توڑ دی جائے کیونکہ مسلمانوں کی نمائندہ جماعت مسلم لیگ ہے۔ انہوں نے خضر حیات کو یہ پیش کش بھی کی کہ اگر ہندوؤں اور سکھوں کو ساتھ ملانا ہی چاہتے ہو تو اپنی پارٹی کا نام مسلم لیگ کولیشن پارٹی رکھو۔ خضر حیات کی دلیل یہ تھی کہ آپ نے جو سردار سکندر سے معاہدہ کیا تھا اس کے تحت اتحاد پارٹی کے سب مسلمان ممبر مسلم لیگی ہیں اور ان کی علیحدہ پارٹی موجود ہے۔

غرض کئی مرتبہ کے مذاکرات کے بعد بھی خضر حیات اتحاد پارٹی توڑنے پر رضامند نہ ہوئے۔

جنگِ عظیم دوم کا خاتمہ ہوگیا۔ اس کا خاتمہ نہایت افسوسناک حرکت سے ہوا۔ جاپان کے محاذ پر جنگ ہورہی تھی لیکن امریکا نے اس کو مختصر کرنے کے لیے ہیروشیما اور ناگاساکی پر ایٹم بم گرادیا جس سے لاکھوں انسان لقمۂ اجل بن گئے۔ دنیا بھر میں ہیبت چھاگئی۔ جاپان نے ہتھیار ڈال دیے۔ برطانیہ کے کل پرزے بھی ڈھیلے پڑ گئے۔

46ء کا سال سیاسی اعتبار سے نہایت ہنگامہ پرور تھا۔ پنجاب میں مسلم لیگ نے کامیابی حاصل کی لیکن مسلم لیگ کی بجائے کولیشن کی وزارت بن گئی کیونکہ اتحاد پارٹی نے کانگریس اور اکالی دل سے اتحاد کرلیا۔ وہ یہ ثابت کرنا چاہتے تھے کہ پنجاب کسی طور مسلم لیگ کا صوبہ نہیں ہے۔

برطانیہ کی طرف سے وزارتی مشن تصفیہ کی نئی اسکیم لے کر آیا۔ اس مشن نے مختلف سیاسی جماعتوں اور رہنماؤں سے گفت و شنید کی۔

اس مشن نے جو تجاویز دیں اس کے دو حصے تھے۔ ایک کا تعلق مرکز میں عبوری حکومت سے تھا۔ دوسرے حصے کا تعلق انتظامات سے تھا۔

آخری حصے کا خلاصہ یہ تھا کہ ہندوستان کے صوبوں اور ریاستوں کی ایک یونین قائم کی جائے جس کے سپرد صرف دفاع، امور خارجہ اور خزانہ ہوں۔ صوبوں کو کامل اندرونی خود مختاری دی جائے اور انہیں تین گروہوں میں منقسم کردیا جائے۔ ایک میں پنجاب، سندھ، سرحد اور بلوچستان ہوں، دوسرے میں بنگال اور آسام، اور تیسرے میں باقی تمام صوبے۔

ان تجاویز میں چونکہ پاکستان کے مطالبے کی تکمیل نہ ہوئی تھی اس لیے مسلمانوں نے اسے مسترد کردیا اور راست اقدام کا عزم کرلیا۔ اس کی شق اول کے تحت مسلم لیگیوں نے خطابات ترک کرنے شروع کردیے۔ ہندوؤں کے کان کھڑے ہوئے۔ انہوں نے مسلمانوں سے لڑنے کا عزم کرلیا۔ کلکتہ میں ہولناک فساد ہوا جس میں ہزاروں ہلاک اور ہزاروں مجروح ہوئے۔ پھر بمبئی، کوئٹہ، الہ آباد، نواکھلی اور صوبہ بہار میں وہ خوں ریزی ہوئی کہ انسانیت شرما گئی۔

حالات اس مقام پر پہنچ گئے کہ ہندوؤں اور مسلمانوں کا یکجا زندگی بسر کرنا غیر ممکن ہوگیا اور پاکستان کا قیام اس برصغیر کی سب سے بڑی شرط حیات قرار پا گیا۔

کابینہ مشن اس صورتِ حال کو دیکھتے ہوئے واپس چلا گیا اور ہندوستان میں ایک عبوری وزارت قائم کردی گئی جس میں کانگریس اور مسلم لیگیوں کو دعوت دی گئی۔ مسلم لیگ نے ابتدا میں اس وزارت کو ٹھکرادیا لیکن بعد میں شرکت کا فیصلہ کرلیا اور نوابزادہ لیاقت علی خان، اسماعیل چندریگر، سردار عبدالرب نشتر، راجا غضنفر علی خان مسلم لیگ کی طرف سے وزیر قرار پائے۔

فسادات کی آگ کچھ سرد ہوگئی تھی لیکن اس قسم کی اطلاعات برابر موصول ہورہی تھیں کہ فرقہ پرست جماعتیں اندر ہی اندر فساد کی تیاریاں کررہی ہیں۔ ملک خضر حیات

ان کی روک تھام کے لیے حکومتِ ہند سے مشورہ کرنے وہاں گئے ہوئے تھے کہ گورنر اور انسپکٹر جنرل پولیس نے کارروائی کرنے کا فیصلہ کرلیا۔ مسلم نیشنل گارڈ کے صدر مقام پر چھاپا مارا اور اس کی تلاشی لینے کا ارادہ کیا۔ اس پر مسلم لیگ کے اکابر وہاں جمع ہوگئے۔ پولیس نے ان سب کو گرفتار کرلیا۔ نہ صرف یہ بلکہ پنجاب اسمبلی کے سولہ مسلم لیگی ارکان بھی گرفتار کرلیے۔ یہ خبر جنگل کی آگ کی طرح پھیل گئی۔ دفعہ 144 نافذ کردی گئی۔ مسلم لیگ نے اس کی خلاف ورزی کا فیصلہ کیا اور صوبے بھر میں جلسے جلوسوں کا سلسلہ شروع ہوگیا۔ پولیس نے جابجا لاٹھی چارج کیے۔

لاہور کے کوچہ و بازار میں مظاہرے کیے جارہے تھے۔ خضر حیات دہلی سے واپس آگئے اور گورنر سے ملاقات کی۔ یہ بیان بھی دیا کہ تلاشی لینے کا عمل محض فسادات روکنا تھا ورنہ پابندی کا ارادہ نہیں۔ تمام گرفتار شدگان کو رہا کرنے کا حکم دیا۔ مقدمات واپس لے لیے۔ صرف یہ شرط رکھی کہ جلوس نہ نکالے جائیں صرف جلسے منعقد کیے جائیں۔

ابھی اس واقعے کو ایک مہینا گزرا تھا کہ مارچ 47ء میں مسٹر ایٹلی وزیراعظم برطانیہ نے یہ اعلان کردیا کہ حکومتِ برطانیہ اختیاراتِ حکومت عنقریب ہندوستانیوں کی طرف منتقل کرنے والی ہے۔ ملک خضر حیات نے اس اعلان کے ساتھ ہی مسلم لیگ کے راستے سے ہٹ جانے کا فیصلہ کرلیا اور استعفیٰ دے دیا اور یہ بیان بھی جاری کیا۔ ”میں اب تک پنجاب میں کولیشن وزارت کے قیام کا حامی ہوں اور جہاں تک ملتِ اسلامیہ کا تعلق ہے میں اس کے مطالبات کی پوری پوری تائید کرتا ہوں لیکن چونکہ انتقالِ اختیارات ہونے والا ہے اس لیے میں مسلم لیگ کے لیے میدان خالی کررہا ہوں تاکہ وہ حتی الامکان وزارت مرتب کرسکے۔“

ان کے استعفے پر جہاں مسلمان خوش تھے اور ان کے لیے خیر مقدمی کلمات ادا کررہے تھے وہیں ہندوؤں اور سکھوں میں شدید غم و غصہ پھیل گیا۔ لاہور میں ماسٹر تارا سنگھ دونوں قوموں کے لیڈر بنادیے گئے۔ فرقہ وارانہ کشیدگی نے سر ابھارا۔ صوبے بھر میں فسادات شروع ہوگئے۔ امرتسر میں ہندوؤں اور سکھوں نے قیامت مچادی۔

ماؤنٹ بیٹن ہندوستان کے نئے وائسرائے مقرر ہوئے تھے۔ انہوں نے آتے ہی گاندھی جی اور قائداعظم کے دستخطوں سے ایک اعلان شائع کرایا جس میں اہلِ ملک کو امن و امان سے رہنے کی نصیحت کی گئی تھی اور کہا گیا کہ سیاسی مطالبات کی تکمیل کے لیے کسی تشدد کی ضرورت نہیں۔ آئینی ذرائع کامیابی کے لیے بالکل کافی ہیں۔

14 اگست کو پاکستان کا قیام یقیناً عالمِ اسلام کے لیے خوشی اور مسرت کا موقع تھا لیکن اس تقسیم نے جس قتل و غارت گری کو عام کیا تھا اس پر نہ تو عالمِ اسلام نے کسی خوشی و مسرت کا اظہار کیا اور نہ تحریکِ پاکستان کے ان رہنماؤں نے کسی نمایاں خوشی کا اظہار کیا جو ایک طویل عرصے سے قیامِ پاکستان کے لیے جدوجہد کررہے تھے۔ رسمی طور پر انتقالِ اقتدار کی تقاریب منعقد تو ہوئیں مگر حالات کی اذیت ناکی اور سرحد پار سے فسادات کی اطلاعات نے سراسیمگی اور بے یقینی نے یہ سوچنے پر مجبور کردیا کہ ہندوستان کی تقسیم کیا واقعی انہی اندوہ ناک واقعات کی متقاضی تھی۔

سات سمندر پار بیٹھا ہوا چوہدری رحمت علی ان واقعات کی خبریں پڑھ رہا تھا۔ اس کا دل خون کے آنسو رو رہا تھا۔ بندھی ہچکی نے کچھ دیر کا وقفہ لیا تو وہ یہ کہنے پر مجبور ہوگیا۔ ”میں نے اپنے تصورات میں کتنی ہی دنیائیں سر کیں، کتنے ہی مسائل کے حل تلاش کیے، کتنے ہی سوال اٹھائے، کتنے ہی اندیشوں کی گرہ کشائی کی لیکن ایک سوال اٹھانا بھول گیا کہ تقسیم ہند کی صورت میں اگر گھر اجڑے، عصمتیں لٹیں، بدن کٹے تو کیا کرنا ہوگا حالانکہ ہندو ذہنیت کو سامنے رکھتے ہوئے مجھے یہ سوال کرنا چاہیے تھا۔ مجھے تو اب ان مسلمانوں کی فکر ہے جو زندہ ہیں اور ہندوستان میں رہ گئے ہیں۔ وہ نہ جانے کس غلامی سے دوچار ہوں گے۔

”پاکستان تو بن گیا اور شکر ہے میرا دیا ہوا نام اس نئی مملکت کو نصیب ہوا لیکن یاد رہے یہ آزادی کا پہلا مرحلہ ہے۔ دوسرے مرحلے میں اس کے استحکام کی طرف توجہ دینی ہے اور تیسرے مرحلے میں ہندوستانی مسلمانوں کو غلامی سے نجات دلانی ہے۔“

اس کے لیے اس نے وسیع تر پاکستان کی اصطلاح استعمال کی تھی اور ہندوستان میں مختلف مسلم ریاستوں کا خاکہ پیش کیا تھا۔

بے چینی کے دنوں کو گن گن کر کاٹتا رہا اور بالآخر اپریل 1948ء کو دوبارہ وطن واپس آیا تاکہ وہ اپنے خوابوں کی تعبیر کو اپنی آنکھوں سے دیکھ کر خدائے ذوالجلال کا شکر ادا کرسکے۔ اور آزادانہ ماحول میں اسلامی زندگی بسر کرے۔

اس مرتبہ اس پر کوئی پابندی نہیں لگائی گئی تھی لہٰذا لاہور کے ہوائی اڈے پر اترا۔ یہاں اس کا استقبال کرنے

والے اس کے دودیرینہ دوست تھے۔ ڈاکٹر یار محمد خان اور چوہدری سر شہاب الدین۔ ڈاکٹر یار محمد خان اسے اپنی کوٹھی پر لے کر آئے جہاں قیام کرنا تھا۔

”میری دربدری کے دن ختم ہوئے۔ پاکستان بن چکا ہے۔ اب تعمیر کی نہیں اصلاح کی فکر ہے۔ میں اب پاکستان میں رہوں گا اور اس کی خدمت میں زندگی گزاروں گا۔“

یہ وہ الفاظ تھے جو اس نے اپنی عارضی قیام گاہ پر پہنچتے ہی ڈاکٹر یار محمد خان سے کہے تھے۔

دوسرے دن وہ شہر کی سیر کو نکلا تو یہ وہ لاہور ہی نہیں تھا جسے وہ چھوڑ کر گیا تھا۔ تمام سڑکوں پر ہزاروں لوگ مختلف چیزوں کے خوانچے لگائے بیٹھے تھے۔ یہ سب مہاجرین تھے جن کا سب کچھ برباد ہو چکا تھا اور جو محض اپنے اور اپنے اہل وعیال کے لیے روزانہ روپیا دو روپیا کمانے پر مجبور تھے۔ جگہ جگہ جلی ہوئی عمارتوں کے نشانات اب بھی موجود تھے۔ ہر صورت اجنبی، ہر چہرہ پریشان، پرانا لاہور کہیں گم ہو گیا ہے۔ اس ہوشیار پور پر کیا گزری ہو گی جہاں میں پیدا ہوا تھا۔ وہ تو اب غیروں کے پاس ہے اسے تو میں دیکھ بھی نہیں سکتا۔ دیکھا تو یہ بھی نہیں جاتا۔ یہی کچھ سوچتا ہوا وہ واپس آ گیا۔

اس نے 9 صفحات کا طویل خط اقوام متحدہ کے سیکریٹری جنرل کے نام لکھا جس میں مہاجرین کی حالتِ زار سے آگاہ کیا گیا تھا۔

اب وہ کم عمر نوجوان نہیں بردبار، زیرک دماغ والے بن چکے تھے۔ وہ کئی مہینے یہاں ٹھہرے رہے اور دیکھتے رہے کہ اختیارات پر وہ قابض ہیں جن کا تحریکِ پاکستان سے واسطہ تک نہیں تھا۔ درخت کسی نے لگائے ثمر کوئی اور کھا رہا تھا۔ ان کی خدمات کسی کو یاد تک نہیں۔ وہ خدمت کرنا بھی چاہیں تو کس کی کریں اور کیونکر کریں۔

کہا یہ جاتا ہے کہ چوہدری رحمت علی نے یو۔ این۔ او میں کشمیر کی نمائندگی کے لیے اپنی خدمات پیش کی تھیں مگر اس پیش کش کو قبول نہ کیا گیا۔

یہاں رہنے کے خواب چکنا چور ہو گئے اور وہ بددل ہو کر ایک مرتبہ پھر دیارِ غیر کو لوٹ گئے۔ لیکن ان کا شمار ان لوگوں میں نہیں ہوتا تھا جو بددل ہو کر مایوسی کے اندھیروں میں گم ہو جاتے ہیں۔ وہ تو ان لوگوں میں تھے جنہیں ناکامیاں اور بھی سرکش بنا دیتی ہیں۔ ان کے لیے آسمان تنگ کر دیا گیا تھا لیکن پر نہیں چھنے تھے۔ ایک مرتبہ پھر انہوں نے مراسلت اور مضامین کا سلسلہ شروع کر کے دنیا کی توجہ ان اکثریتی مسلم علاقوں کی طرف مبذول کرانی شروع کی جو ہندوستان میں رہ گئے تھے اور ان کی آزادی اسلام اور مسلمانوں کی بقا کے لیے ضروری تھی خصوصاً کشمیر۔

جموں اور کشمیر کے بغیر پاکستان ”پاستان“ بن کر رہ جائے گا۔ اسی طرح پاکستان کے بغیر جموں اور کشمیر ہندوؤں کی سرزمین ہو جائیں گی۔ ان دونوں کے اتحاد کو انہوں نے تقدیر سازی اور ان کی علیحدگی کو شکست و ریخت کے مترادف قرار دیا۔

جسمانی عدم سکون اور دماغی کثرتِ کار نے انہیں بے خوابی کا شکار بنا دیا جس سے ان کی صحت پر اثر پڑنے لگا۔ مالی وسائل الگ داؤ پر لگ چکے تھے۔ شب و روز محنت اب بھی جاری تھی جو انہیں روز بہ روز موت کے قریب لے جا رہی تھی۔

اس روز شدید بارش ہو رہی تھی۔ سردی بھی بہت بڑھ گئی تھی۔ وہ گھر سے ڈاک لینے کے لیے نکلے اور جلدی میں چھتری اور اوورکوٹ لانا بھول گئے۔ انہیں سردی لگ گئی۔ سردی ایسی تھی کہ ہڈیوں تک میں اتر گئی۔ انہیں ایولن نرسنگ ہوم کیمبرج میں علاج کے لیے داخل کر لیا گیا۔ علاج کامیاب نہ رہا اور صرف چند روز بعد 3 فروری 1951ء کو ایک بجے بعد دوپہر اپنے خالقِ حقیقی سے جا ملے۔

ان کے کفن دفن کے پیسے ان کے ایک پرانے ٹیوٹر مسٹر ویل بورن نے دیے۔ ایک مسلمان برطانوی نے ان کی نماز جنازہ کا اہتمام کیا اور کیمبرج یونیورسٹی کے قبرستان میں دفن کر دیا گیا۔

ان کے بھائی چوہدری محمد علی نے ان کی لوحِ قبر پر یہ الفاظ تحریر کروا کے ان کی قبر کو تلاش کرنے والوں کے لیے آسان بنا دیا۔

چوہدری رحمت علی، ایم اے، ایل ایل بی، بار ایٹ لا کیمبرج

ولد چوہدری شاہ محمد مرحوم گوجر

عمر 54 سال

تاریخ وفات: فروری 1951ء

بانی تحریک پاکستان۔ خالق لفظ ”پاکستان“

ماخذات

چوھدری رحمت علی، محمد شریف بقا

سرگزشت، عبدالمجید سالک

ابن کبیر

اس نے بچپن میں جو خواب دیکھا تھا اس کی تعبیر اسے برسوں بعد ملی اور وہ کھیل کے میدان کا جادوگر کہلایا۔ بال اس کے پاس آکر گویا اس کے پیروں سے چپک جاتا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ اس پر ہر طرف سے دولت کی بارش ہوتی تھی۔ وہ عالمی طورپر سب سے زیادہ معاوضہ وصول کرنے والا کھلاڑی کہلایا۔

فٹ بال کی دنیا کے ایک نامور کھلاڑی کا احوالِ زیست

آسمان بادلوں سے ڈھک گیا۔ لندن پر تاریکی چھانے لگی۔ اچانک بادل گرجا۔ کروڑوں قطروں نے زمین کی سمت جست لگائی اور شہر افراتفری کی لپیٹ میں آ گیا۔

یہ لمحوں کا معاملہ تھا۔ وہ بھیگ چکا تھا۔ لمبے گیلے بال ماتھے پر بکھرے تھے اور وہ ہر احساس سے ماوراء بالکل خاموش کھڑا تھا۔

چند میٹر دور گول پوسٹ تھی۔ سامنے کھڑے آدمی کا عکس بارش سے دھندلا گیا تھا۔

یہ کنگ فورڈ کے علاقے میں واقع رڈ گیوے پارک تھا۔ اُس کا من پسند مقام، جہاں قدم رکھتے ہی اس کی دھڑکن تیز ہو جاتی۔

اُس نے نظر اٹھا کر اپنے باپ کو دیکھا۔ وہ مستعد تھا پھر فٹبال پر نگاہ کی۔

بادل گرجا۔ اُس نے جست لگائی۔ سر آگے کو جھکا پیر بلند ہوا، بجلی کڑکی، گیند کو زوردار ٹھوکر لگی۔

آدمی نے پھرکی کی مانند گھومتی گیند نظریں لگائیں اور کسی پھرتیلے گول کیپر کی مانند چھلانگ لگا دی۔

ٹھیک اس لمحے... کچھ انوکھا رونما ہوا۔ کچھ ایسا جس میں عظمت گندھی تھی۔

اپنے محور پر گھومتی گیند نے رخ بدل لیا تھا۔ زمین کی سمت آتی ہوئی گیند جال کا بوسہ لے چکی تھی۔

اس نے خاموشی سے گیند اٹھائی۔ اِس امید پر چاروں طرف دیکھا کہ شاید کوئی اور بھی اِس حیرت انگیز منظر کا گواہ بنا ہو۔ نہیں... وہاں کوئی نہیں تھا۔ بوڑھا جیک بھی نہیں، جو اُس وقت تک بینچ پر بیٹھا رہتا، جب تک باپ بیٹا پریکٹس ختم نہیں کر لیتے۔

"شاید وہ گھر چلا گیا۔" وہ بڑبڑایا۔ پھر گیند اپنے سات سالہ بیٹے کی سمت اچھال دی۔

"ایک اور شاٹ۔ پھر گھر چلیں گے۔" وہ چلّایا۔ "اندھیرا ہو گیا ہے۔"

بچے نے گیند دبوچ لی۔ اسے زمین پر جمایا۔ دوڑتا ہوا آیا۔ پیر بلند ہوا۔ گیند سانپ کی طرح بل کھاتی ہوئی نیٹ میں پہنچ چکی تھی۔ اس کا باپ جہاں تھا وہیں کھڑا رہا۔ اس نے حرکت نہیں کی۔ بس نظریں گیند پر ٹکائے رکھیں، جو کسی زندہ شے کی مانند حرکت کر رہی تھی۔

باپ بیٹے کی آنکھیں چار ہوئیں۔ بارش نے درمیان میں چادر سی تان دی تھی، مگر بیٹا اپنے باپ کی چمکتی ہوئی آنکھیں دیکھ سکتا تھا۔ آج سے قبل اُس نے کسی انسان کی آنکھوں میں ایسی چمک نہیں دیکھی تھی۔

"چلو رابرٹ گھر چلیں۔" آواز میں مسرت تھی۔ "ماں انتظار کر رہی ہو گی۔"

بچے نے گیند اٹھائی اور اپنے باپ کے پیچھے ہو لیا۔ اِس بات سے لاعلم کہ ایک جہاں دیدہ شخص کی نظریں اس پر ٹکی ہیں۔

وہ ستر سالہ جیک تھا، جو شیڈز کے نیچے کھڑا تھا۔ بالکل خاموش، کسی بت کی مانند۔ کیونکہ آج سے قبل اس نے کسی بچے کو گیند کو یوں ٹھوکر لگاتے نہیں دیکھا تھا، مگر آج وہ ایک جادوئی منظر کا گواہ بن چکا تھا۔ ایسا منظر... جو چند برس بعد پوری دنیا کو ورطۂ حیرت میں ڈالنے والا تھا۔

آسمان پوری قوت سے برس رہا تھا۔

☆☆☆

2 مئی 1975 کو لندن کے ایک چھوٹے سے اسپتال میں آنکھ کھولنے والا وہ بچہ جسے ماں باپ نے ڈیوڈ رابرٹ جوزف بیکھم کا نام دیا، قسمت کا دھنی تھا۔ شہرت وہ تقدیر میں لکھوا کر لایا تھا۔ قدرت اُسے دنیا کا مقبول ترین انسان بنانے کا فیصلہ صادر کر چکی تھی... مگر اِن انوکھے واقعات کا ظہور کچھ برس بعد ہونا تھا۔ اس وقت تو وہ فقط ننھا رابرٹ تھا۔ ماں کا لاڈلا۔ باپ کی امیدوں کا محور۔

اُس نے ایک غریب گھرانے میں آنکھ کھولی جہاں خوشیاں ٹھنڈ سے سکڑ جاتی تھیں۔ اُس کا باپ ایڈورڈ بیکھم گزر بسر کے لیے باورچی خانوں میں لگی اشیا کی مرمت کیا کرتا تھا۔ ایڈورڈ کی بیوی سینڈرا ایک خوبصورت عورت تھی مگر غربت نے اُس کا حسن گہنا دیا تھا۔ وہ ایک سیلون میں ملازم تھی۔ ان کی ملاقات 60 کی دہائی میں ہوئی تھی اور جلد ہی وہ محبت نامی آفاقی زبان میں گفتگو کرنے لگے۔ شادی کے بعد خدا نے اُنہیں دو بیٹیوں لوئی اور جوائنی اور ایک بیٹے رابرٹ سے نوازا۔

اُنہیں قطعی اندازہ نہیں تھا کہ اُن کے بیٹے کے ہاتھ کی لکیریں ایک حیران کن کہانی سناتی ہیں۔ سچ تو یہ ہے کہ انہیں اِس سے غرض بھی نہیں تھی۔ وہ تو بس اپنے بچوں سے محبت کرتے تھے۔

محبت کے علاوہ جو دوسری شے اُنہوں نے اپنی اولاد کو وراثت میں دی، وہ تھی فٹبال کا عشق۔ یہ جوڑا معروف فٹبال کلب مانچسٹر یونائیٹڈ کا دیوانہ تھا۔ دونوں باقاعدگی سے اولڈ ٹریفڈ جایا کرتے۔ اکثر بچوں کو بھی ساتھ لے جاتے۔ الغرض جس ماحول میں رابرٹ نے آنکھ کھولی، فٹبال کا جنون اُس میں تیر رہا تھا۔

قدرت نے اپنے منصوبے کی تکمیل کے لیے معقول انتظام کر رکھا تھا!

☆☆☆

وہ کرسمس کی رات تھی۔ لندن میں برف گر رہی تھی۔ چھتیں برف سے ڈھک گئیں۔ گلیوں میں پُرسکون ٹھنڈ اتر آئی

اور گھروں میں پکوانوں کی خوشبو پھیلنے لگی۔

ننھا رابرٹ آنکھوں میں مسرت لیے تحائف کی جانب بڑھ رہا تھا۔ سب سے پہلے جو تحفہ اس کے ہاتھ آیا، وہ ایڈورڈ اور سینڈرا کی طرف سے تھا۔ وہ جانتا تھا کہ اس میں کیا ہے، مگر تجسس اس وقت تک چہرے پر قائم رہا جب تک اُس نے ڈبہ کھول نہیں لیا۔

وہاں ایک گیند تھی۔ ساتھ میں ایک سرخ جرسی۔ مانچسٹر یونائیٹڈ کی جرسی۔

یہ پہلا موقع نہیں تھا، جب ڈیوڈ کو ایک جرسی اور فٹبال کا تحفہ ملا۔ ہر برس اُسے یہی تحفہ ملا کرتا۔ اور وہ اسی میں مطمئن تھا۔

اس نے فوراً شرٹ زیب تن کر لی اور آئینے کے سامنے جا کھڑا ہوا۔ آئینے میں اسے اپنے باپ کا عکس نظر آیا۔

ایڈورڈ دروازے پر کھڑا تھا۔

"تھینک یو ڈیڈ۔" وہ دوڑتا ہوا اپنے باپ سے جا لپٹا۔

"پرسوں یونائیٹڈ کا میچ ہے۔ کیا ہم اولڈ ٹریفڈ جا رہے ہیں؟" اس نے پوچھا۔

"بالکل۔" باپ نے اس کے بالوں پر ہاتھ پھیرا۔ دونوں کے چہرے دمک رہے تھے۔

وہ کرسمس کی رات تھی، گھروں میں پکوانوں کی خوشبو پھیلی تھی۔

☆☆☆

"اب باری باری تمام بچے بتائیں کہ وہ بڑے ہو کر کیا بننا چاہتے ہیں؟"

یہ چیس لین پرائمری اسکول کی کلاس تھی۔ استانی یہ جاننے کی خواہش مند تھی کہ اُس کے طلبا مستقبل میں کس شعبے کا چناؤ کرنا چاہتے ہیں۔

"انجینئر۔" ایک بچے نے جواب دیا۔

"میں تو ڈاکٹر بنوں گا۔" دوسرے نے کہا۔

اور پھر رابرٹ کی باری آئی۔ "میں بڑا ہو کر..." آواز میں اعتماد تھا۔ "فٹبالر بنوں گا۔"

تمام بچوں نے گھوم کر دیکھا۔ استانی کی آنکھوں میں حیرت سمٹ آئی۔ اس نے کھنکھار کر گلا صاف کیا۔ "بہت خوب رابرٹ! ہم سب فٹبال کے شائق ہیں۔ مگر میں یہ جاننا چاہتی ہوں کہ وہ کون سا کام ہے، جو تم بڑے ہو کر کرنا چاہتے ہو؟"

سکوت تھا۔ تمام نظریں اس پر ٹکی تھیں۔ اس کے لب وا ہوئے۔ "میں بڑا ہو کر فٹبال کھیلنا چاہتا ہوں۔"

یہ واقعہ فقط پرائمری اسکول میں پیش نہیں آیا۔ اس نوع کا سوال کنگ فورڈ فاؤنڈیشن اسکول میں بھی کیا گیا اور اِس بار بھی اس کا جواب وہی تھا۔ "فٹبالر۔ بس!"

وہ کبھی اچھا طالب علم نہیں رہا۔ اسکول کی فٹبال ٹیم کے کوچ کو شاید وہ پسند ہو، مگر اساتذہ نے اُسے اپنے من پسند طلبا کی فہرست میں جگہ دینے سے اجتناب برتا۔ اسے پروا بھی نہیں تھی۔ اسکول کے دوران وہ چھٹی کے بارے میں سوچتا رہتا۔ گھر پہنچتے ہی بستہ پھینک کر کھانے کی میز پر جا بیٹھتا۔ چند لقمے حلق میں اتارتا اور قریبی پارک کی جانب دوڑ پڑتا جہاں بچے فٹبال کھیلا کرتے تھے۔ اُن بچوں کے لیے رابرٹ ایک اسٹار تھا۔ اس کے جان دار شاٹس اور حیران کن رفتار کے وہ مداح تھے۔ ہر کسی کی خواہش ہوتی کہ رابرٹ اس کی ٹیم کا حصہ بنے۔

شام میں وہ اپنے باپ کے ساتھ پریکٹس کیا کرتا۔ ایڈورڈ خود بھی اچھا کھلاڑی تھا۔ اگر معاشی مسائل رکاوٹ نہیں بنتے تو شاید وہ گھریلو اشیا کی مرمت کرنے کی بجائے کسی اچھے کلب میں کھیل رہا ہوتا۔ مگر اب بھی کچھ نہیں بگڑا تھا۔ وہ اپنا خواب رابرٹ کو منتقل کر چکا تھا اور اُسے بڑے میدانوں کے لیے تیار کر رہا تھا۔

سینڈرا بھی فٹبال کی دیوانی تھی، مگر تھی تو ایک ماں ناں!

امتحانات میں بیٹے کی اوسط درجے کی کارکردگی نے اُسے فکر میں مبتلا کر دیا تھا اور ایک شام، جب شمال سے چلنے والی ہواؤں میں موسم بہار کی مہک تھی، اس نے اپنے خدشات کا اظہار کر ہی دیا۔

"ٹیڈ۔" وہ اپنے شوہر کو پیار سے ٹیڈ کہا کرتی تھی۔ "میں رابرٹ کے لیے پریشان ہوں۔"

"کیا ہوا، خیریت؟" وہ سیدھا ہو کر بیٹھ گیا۔

"ویسے تو سب ٹھیک ہے، مگر اس کے گریڈ گرتے جا رہے ہیں۔" اس نے ایک لمحے کا توقف کیا۔ "اس کی توجہ فٹبال پر مرکوز ہے۔ خطرہ ہے کہ کہیں..."

"تم فکر مت کرو۔" ایڈورڈ نے قہقہہ لگایا۔ "اس نے اپنی صلاحیتیں فٹبال میں جھونک دی ہیں۔ شاید وہ اچھا طالب علم نہ ہو، مگر شان دار فٹبالر ہے۔"

"مجھے ڈر لگتا ہے۔" سینڈرا کی آواز میں خوف تھا۔ "اچھے کھلاڑی تو تم بھی تھے ٹیڈ، مگر مقابلہ بہت سخت ہے۔ کیا ہو گا اگر وہ فٹبال کی دنیا میں جگہ نہیں بنا پایا۔ اگر وہ تعلیم نہیں

حاصل کرسکا تو اُسے بھی ہماری جیسی زندگی...'' وہ چپ ہوگئی۔
ایڈورڈ آگے بڑھا۔ اس نے اپنی بیوی کے کندھوں پر ہاتھ رکھا۔ سینڈرا کی آنکھوں میں آنسو تھے۔
اُس نے دھیرے سے کہا۔ ''ایسا نہیں ہوگا۔ کیونکہ وہ ایڈورڈ بیکھم نہیں۔ وہ مجھ سے کئی گنا بہتر کھلاڑی ہے۔ وہ... انگلینڈ کے باسیوں کے لیے تحفہ ثابت ہوگا۔'' اس کی آواز لرزنے لگی۔ ''وہ اس سے محبت کریں گے۔ اس کی پرستش کریں گے۔''
''کیا تمہیں یقین ہے؟'' سینڈرا نے دھیرے سے کہا۔
''اتنا ہی یقین جتنا مجھے اپنے ہونے کا یقین ہے۔''
ہواؤں میں موسم بہار کی ابتدائی چُبھن تھی اور امید سے لبریز دو دلوں نے ایک دوسرے کو تھام رکھا تھا۔

☆☆☆

کہتے ہیں، پوت کے پاؤں پالنے ہی میں نظر آجاتے ہیں۔ رابرٹ کے ساتھ بھی کچھ ایسا ہی ہوا۔ دیگر عظیم کھلاڑیوں کی مانند کم عمری میں اس کی انوکھی صلاحیتیں ظاہر ہونے لگیں۔
پہلی صلاحیت اُس صبح ظاہر ہوئی، جب ایڈورڈ اسے معروف انگلش فٹبالر سر بوبی چارلٹن کے نام سے موسوم فٹبال اسکول میں داخل کروانے لے کر گیا۔
جس کوچ نے رابرٹ کا ٹرائل لیا، اس نے ایڈورڈ کے کاندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا تھا۔ ''تم تو ایک ہیرا لے آئے ہو۔ یہ مستقبل میں تمہارا نام روشن کرے گا۔''
اِن الفاظ نے جتنی خوشی ایڈورڈ کو دی، اس کا اندازہ ایک باپ ہی لگا سکتا ہے۔
رابرٹ نے اسکول کے مقابلوں میں شان دار کارکردگی کا مظاہرہ کیا۔ کورس کے اختتام پر ایک ناقابلِ فراموش ٹریننگ سیشن کا انتظام کیا گیا، جس میں مشہور زمانہ اسپینش کلب بارسلونا کے کھلاڑیوں نے حصہ لیا۔ انہوں نے تمام بچوں کو مفید مشوروں سے نوازا، البتہ رابرٹ کو کوئی مشورہ نہیں دیا۔
''اسے کسی مشورے کی ضرورت نہیں۔'' اسپینش کوچ نے کاندھے اچکاتے ہوئے کہا تھا۔ ''قدرت اُس کی رہنمائی کررہی ہے۔''
علاقائی ٹیموں تک رسائی میں بھی زیادہ وقت نہیں لگا۔ سب سے پہلے اُسے رڈگیوے رویرز کی نمائندگی کا موقع ملا، جس کا کوچ کوئی اور نہیں، اس کا باپ تھا۔ مگر باپ کی موجودگی نے آسانیاں پیدا نہیں کیں۔ ایڈورڈ نے انتظامیہ سے صاف کہہ دیا۔ ''اگر آپ کو اس میں صلاحیت نظر آئے تب ہی اسے منتخب کریں۔ ورنہ...''
منتخب تو اسے ہونا تھا کہ صلاحیت اس میں کوٹ کوٹ کر بھری تھی..... اُس نے حیران کن گول داغ کر اپنے انتخاب کو درست ثابت کیا۔ پھر اُسے اسٹورٹ اینڈ وڈ کلب کی نمائندگی کا موقع ملا۔ وہ اُس ٹیم کا کم عمر ترین کھلاڑی تھا، مگر قابلیت کے معاملے میں اوروں سے میلوں آگے تھا۔ مخالف کھلاڑیوں کو اس مہارت سے چکما دیتا کہ دیکھنے والے ششدر رہ جاتے۔ سچ تو یہ ہے کہ جب سے وہ کلب کا حصہ بنا تھا، ٹیم کی کارکردگی میں بہتری نظر آنے لگی۔ مقابلوں کے دوران اسٹینڈز بھرے ہوئے نظر آتے۔
اِن ہی باتوں نے اسٹیوکربی نامی کلب کے سیاہ فام کوچ لیولیس جونس کو اُس کی جانب متوجہ کیا۔ وہ ایک اچھا جوہری تھا۔ اس نے فوراً ایڈورڈ سے رابطہ کیا۔ ایک ریسٹورنٹ میں معاہدے پر دستخط ہوئے اور ننھا رابرٹ ایک نئی ٹیم کا حصہ بن گیا۔
اور پھر ایک یادگار لمحہ اُس کی زندگی میں وارد ہوا۔ یہ 1986 کی بات ہے۔ اولڈ ٹریفڈ میں مانچسٹر یونائیٹڈ اور ویسٹ ہم کے درمیان میچ کھیلا جانا تھا۔ مانچسٹر انتظامیہ نے ایک دلچسپ مقابلہ کا اہتمام کیا۔ انہیں اپنے آفیشل ماسکوٹ کے لیے چند بچے درکار تھے جنہیں دورانِ میچ ٹیم کی حوصلہ افزائی کرنی تھی۔ مقابلے والے روز جو پہلا لڑکا گراؤنڈ میں داخل ہوا، وہ گیارہ سالہ رابرٹ ہی تھا۔
اس کے معصوم چہرے، سنہرے بالوں اور دراز قد کو دیکھتے ہوئے فوراً منتخب کرلیا گیا۔
میچ والے روز اس کی خوشی دیدنی تھی۔ اس کے آئیڈیل کھلاڑی سرخ جرسی میں ملبوس میدان میں دوڑ رہے تھے اور وہ ان کا حوصلہ بڑھا رہا تھا۔
اُس شام... قدرت مسکرا رہی تھی۔ اُس کی مسکراہٹ شفیق ماں جیسی تھی۔

☆☆☆

بلا کا حبس تھا۔ اندھیرا اتنا کہ ہاتھ کو ہاتھ سُجھائی نہ دے۔ وحشت ایسی کہ دل دھڑکنا بھول جائے۔
وہ ایک تاریک سرنگ تھی۔ رابرٹ کھردری دیواروں کو ٹٹولتے ہوئے آگے بڑھ رہا تھا۔ ہر گزرتے لمحے کے ساتھ خوف بڑھ رہا تھا۔ سرنگ اب غیر مختتم معلوم ہونے لگی تھی۔
اُسے روشنی دکھائی دی۔ دل میں امید نے انگڑائی لی۔ اس نے رفتار تیز کردی۔ اچانک بادلوں کی چنگھاڑ نے سماعتوں پر حملہ کیا۔ اندھیرا گہرا ہوگیا اور کرن تاریکی میں گم ہوگئی۔
صدمے سے وہ زمین پر گر گیا۔ چہرہ ڈھانپ لیا اور ہچکیاں لینے لگا۔
دکھ کے ان لمحات میں اسے مکھیوں کی بھنبھناہٹ سے مشابہ ایک آواز سنائی دی۔ اس نے سر اٹھایا۔ سامنے سرنگ کا دہانہ تھا جہاں سے روشنی کی کرنیں اندر داخل ہو رہی تھیں۔
وہ امید بخش روشنی کو تکتا رہا۔ پھر کھڑا ہوا اور آگے بڑھنے لگا۔ جیسے جیسے وہ آگے بڑھ رہا تھا، بھنبھناہٹ واضح ہوتی جارہی تھی۔ اب اُس نے انسانی آوازوں کی شکل اختیار کرلی۔
اُس نے رفتار بڑھا دی۔ بھنبھناہٹ نعروں کے قالب میں ڈھل گئی۔ اُسے لگنے لگا جیسے اسے کوئی پکار رہا ہے۔
سرنگ کے دہانے پر پہنچ کر اس کی نظر سبز گھاس پر پڑی۔ وہ آگے بڑھا اور طلسم کے زیر اثر آگیا۔
وہ ایک اسٹیڈیم میں تھا، تماشائیوں سے کھچا کھچ بھرا ہوا اور وہاں اس کا نام گونج رہا تھا۔ اس نے چاروں طرف نظر دوڑائی۔ ہزاروں افراد تھے جن کے چہرے دمک رہے تھے جو مسرت سے لرز رہے تھے۔ گیت گا رہے تھے۔
اچانک کسی نے اس کے کان کے پاس تیز سیٹی بجائی۔ رابرٹ ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھا۔ وہ اپنے کمرے میں تھا، جہاں سکوت چھایا تھا۔
''میں خواب دیکھ رہا تھا۔'' وہ بڑبڑاتے ہوئے بستر سے باہر آگیا اور کھڑکی کے سامنے جا کھڑا ہوا۔
نظریں آسمان پر ٹکی تھیں جہاں تاریکی چھائی تھی۔ اچانک بادلوں کے درمیان خفیف سی روشنی کا جنم ہوا۔ وہ سورج کی پہلی کرن تھی، ٹھیک ویسی ہی کرن جو اس نے خواب میں دیکھی تھی۔

☆☆☆

''اور انڈر 15 کے بہترین کھلاڑی کا ایوارڈ جاتا ہے... ڈیوڈ رابرٹ جوزف بیکھم کو!''
تالیوں کا شور بلند ہوا۔ اگلی قطار سے سنہرے بالوں والا ایک لڑکا کھڑا ہوا۔ اسٹیج کی سمت جاتے ہوئے اُس نے مڑ کر باپ کی جانب دیکھا جس کی آنکھوں میں مسرت تھی۔
یہ 1990 کا ذکر ہے۔ وہ زمانہ جب رابرٹ ٹوٹنہم ہوٹسپر نامی کلب کے لیے کھیلا کرتا تھا۔ ٹوٹنہم ہوٹسپر پریمیئر لیگ (انگلینڈ کے 20 پیشہ ورانہ کلبس کے درمیان ہونے والا سالانہ مقابلہ) میں حصہ لینے والا وہ پہلا کلب جس نے اس کی صلاحیتوں سے استفادہ کرنے کا فیصلہ کیا اور کلب انتظامیہ آنے والے برسوں میں اُس فیصلے پر فخر کرنے والی تھی۔
اُسی کلب کے لیے کھیلتے ہوئے اس نے برمس ڈاؤن روور کی یوتھ ٹیم میں جگہ بنائی، جہاں اس کی حیرت انگیز ٹھوکروں نے کئی بار گیند نیٹ میں پہنچائی۔ اُس کی پھرتیوں نے میڈیا کو بھی متوجہ کیا۔ ''ننھا جادوگر'' کے زیرِ عنوان اِس کی بابت اخبار میں ایک آرٹیکل بھی شائع ہوا۔
اس مضمون کی اشاعت بیکھم خاندان کے لیے ایک پُرمسرت واقعہ تھا۔ باپ نے آرٹیکل فریم کروا کے دیوار پر آویزاں کردیا۔ وہ ہر مہمان کو بڑے فخر کے ساتھ یہ آرٹیکل دکھایا کرتا، اِس بات سے لاعلم کہ اس کا سپوت چند برسوں میں اتنے اعزازات اپنے نام کرلے گا کہ اُنہیں سنبھالنے کے لیے گھر کا ایک کمرا وقف کرنا پڑے گا۔

☆☆☆

وہ یکم مئی کا دن تھا۔ اگلے روز رابرٹ کی سالگرہ تھی۔ ایڈورڈ تحفہ خریدنے کے لیے گھر سے روانہ ہونے کو تھا کہ فون بجنے لگا۔
''ہیلو۔'' لہجے میں عجلت تھی۔
''کیا میں مسٹر ڈیوڈ ایڈورڈ بیکھم سے بات کرسکتا ہوں؟'' آواز دور سے آتی محسوس ہوئی۔
''بات کر رہا ہوں۔'' اس نے دستی گھڑی کی طرف دیکھا۔
اگلے جملے نے اس کی دھڑکن تیز کردی۔ ''میں مانچسٹر یونائیٹڈ اسکول کا پرنسپل بول رہا ہوں۔ انتظامیہ نے آپ کے بیٹے کو داخلہ دینے کی سفارش کی ہے۔ کیا آپ ملاقات کے لیے وقت نکال سکیں گے؟''
''اوہ... جی بالکل۔'' اُس نے خود پر قابو پاتے ہوئے کہا۔ ''بتائیے کس وقت حاضر ہوں؟''
''میرے سامنے آپ کے بیٹے کے کوائف پڑے ہیں۔'' پرنسپل نے کہا۔ ''اگر میں غلط نہیں، تو کل اس کی سالگرہ ہے۔ میرے خیال میں مانچسٹر یونائیٹڈ اسکول کا داخلہ فارم اس کے لیے اچھا تحفہ ثابت ہوگا۔''
سالگرہ کی صبح رابرٹ کے لیے پُرتجسس ثابت ہوئی۔ خلافِ توقع اس کا باپ گھر پر تھا۔ دراصل ایڈورڈ نے کل شام ہی چھٹی لے لی تھی۔
''ہمیں ایک کام سے جانا ہے۔'' اس نے بیوی کو مطلع

کیا اور رابرٹ کو تیار ہونے کا اشارہ کیا۔
"مگر کہاں؟" سینڈرا کی آواز میں حیرت تھی۔
وہ اطمینان سے ٹیبل بجاتا رہا۔ سینڈرا سمجھ گئی کہ اس نے اپنے چہیتے کے لیے کسی سرپرائز کا انتظام کیا ہے۔
وہ رابرٹ کو لے کر بس میں سوار ہوگیا، جو کشادہ راستوں سے ہوتے ہوئے ایک ایسی عمارت کے سامنے جا کر رکی، جو قدیم طرزِ تعمیر کا شان دار نمونہ تھی۔ گو رابرٹ نے اس کے ماتھے پر لکھے الفاظ "مانچسٹر یونائیٹڈ اسکول" پڑھ لیے تھے، مگر وہ یہاں آمد کا مقصد سمجھنے سے تاحال قاصر تھا۔
اس پل بھی وہ اپنے ساتھ رونما ہونے والے واقعے کا ادراک نہیں کرسکا، جب باپ کے کہنے پر وہ ایک فارم پُر کررہا تھا۔
رخصتی کے وقت اسکول کے پرنسپل نے اس سے ہاتھ ملاتے ہوئے کہا۔ "درس گاہ میں خوش آمدید نوجوان! تم اپنے خواب کے نزدیک پہنچ چکے ہو۔" پورے راستے وہ خاموش رہا۔ وہ حیرت کے زیرِ اثر تھا۔ یہی حیرت اس کی ماں اور بہنوں کے چہروں پر ظاہر ہوئی۔ یہ واقعہ کسی عجوبے سے کم نہیں تھا۔ مگر جلد ہی حیرت کی جگہ جشن نے لے لی۔ شام کی رکھی جانے والی سالگرہ کی تقریب نے اس جشن کو چار چاند لگا دیے۔
کچھ ہی عرصے بعد وہ ایک اور فارم بھر رہا تھا۔ یہ ایک معاہدہ تھا۔ مانچسٹر یونائیٹڈ نے ننھے جادوگر کو اپنی یوتھ ٹریننگ اسکیم کے لیے سائن کرلیا تھا۔

☆☆☆

شاید وقت کو پر لگ گئے۔ خصوصاً بیکھم خاندان کے لیے تو اِس کی رفتار زیادہ ہی تیز تھی۔ ہفتے کیسے مہینوں میں بدلے اور مہینے کیسے سالوں میں تبدیل ہوئے، پتا ہی نہیں چلا۔
شاید یہ خوشی کا بے پناہ احساس تھا جس نے انہیں سرشار کررکھا تھا۔ یہ سرشاری اس وقت اپنی اوج پر پہنچ گئی، جب 1992 میں ایف اے یوتھ کپ کے لیے یونائیٹڈ کی ٹیم کا اعلان ہوا۔ رابرٹ... اُس میں شامل تھا۔ اور یہ کرشما ایک جوہری کے طفیل ممکن ہوا، جسے دنیا سر ایلکس فرگوسن کے نام سے جانتی ہے۔
ماضی میں اسکاٹ لینڈ کی نمائندگی کرنے والا یہ اصول پسند آدمی 1986 سے یونائیٹڈ کا منیجر تھا۔ یہ ایلکس ہی تھا، جس نے یونائیٹڈ کو صفِ اول کی ٹیموں میں لا کھڑا کیا۔ اور یہ ایلکس ہی تھا، جس کی نظر 1990 کے موسم سرما میں ایک ہیرے پر پڑی۔
ایلکس عظیم کھلاڑیوں کو ٹیم میں شامل کرنے کی بجائے عظیم کھلاڑی تخلیق کرنے میں دلچسپی رکھتا تھا۔ اسے نوجوانوں پر بھروسا کرنے کا ہنر آتا تھا۔ 91-90 میں اس نے نوجوان کھلاڑیوں پر مشتمل ایک گروپ تشکیل دیا، جس میں رابرٹ بھی شامل تھا۔ ستاروں پر کمند ڈالنے کے آرزو مند ان نوجوانوں نے اُس کے زیرِ نگرانی چند ماہ مشق کی۔ گو بعد میں دیگر کوچز انہیں سنبھالتے رہے، مگر ایلکس کی نظریں ان پر لگی رہیں۔ خصوصاً رابرٹ پر جو چمکنے کو تیار تھا۔
ایلکس کی سفارش پر اسے 1992 یوتھ کپ کی ٹیم میں شامل کیا گیا، جس کے بعد واقعات کی رفتار یکدم بڑھ گئی۔
یونائیٹڈ کے پُرجوش کھلاڑی یوتھ کپ اپنے نام کرنے میں کامیاب رہے۔ اِس کامیابی میں کرسٹل پیلس کے خلاف داغے جانے والے رابرٹ کے گول نے کلیدی کردار ادا کیا۔ اُس میچ کے اختتام پر آٹوگراف لینے کی خواہش مند لڑکیوں کے گروہ نے اُس پر حملہ کردیا تھا۔ نتیجتاً بہ مشکل اُسے حسیناؤں کے جھنڈ سے نکال کر لایا۔
اُسی برس اسے اپنے کلب کی اے ٹیم کے لیے کھیلنے کا نادر موقع ملا، جس سے فائدہ اٹھانے میں اس نے کسی قسم کی غفلت نہیں برتی۔ جم کر کھیلا۔ کئی سینئر کھلاڑی میچ کے اختتام پر رابرٹ کا کاندھا تھپتھپا رہے تھے۔ البتہ ایلکس فرگوسن ان میں شامل نہیں تھا۔ وہ دور کھڑا اس منظر سے محظوظ ہورہا تھا۔
اگلے برس نے اس کی شہرت کے لیے مہمیز کا کام کیا۔ ایف اے یوتھ کپ کے دوران رابرٹ بھرپور فارم میں تھا اور تماشائی اس کے لیے نعرے لگانے کو تیار تھے۔ اس کی برق رفتاری اور جادوئی ٹھوکروں نے یونائیٹڈ کو فائنل تک پہنچا دیا۔ بدقسمتی سے اس بار ٹیم کامیابی اپنے نام نہیں کرسکی، مگر نوجوانوں کے حوصلے پست نہیں ہوئے۔ 1994 میں جب یہ ٹیم میدان میں اتری تو ٹرافی لے کر ہی لوٹی۔
ایلکس کی بھرپور حمایت کے باوجود اس عرصے میں اے ٹیم کے دروازے اس پر بند رہے۔ اس فیصلے پر میڈیا کی جانب سے شدید ردِعمل آیا۔
ایک اسپورٹس رپورٹر نے سوال اٹھایا "ڈیوڈ بیکھم کو آخر کس لیے سنبھال کر رکھا جارہا ہے؟"
ایک اور اخبار میں مضمون شائع ہوا "ابھی نہیں تو کبھی نہیں!"
ایک ناقد تو یہ تک کہہ گیا کہ شاید یونائیٹڈ انتظامیہ کلب سے مخلص نہیں۔

میڈیا میں آنے والی خبروں نے رائے عامہ ہموار کی اور اولڈ ٹریفڈ میں بیٹھے افراد پر دباؤ بڑھنے لگا۔
بورڈ آف ڈائریکٹرز اسے موقع دینے کے مخالف تھے مگر انہیں رابرٹ کی بڑھتی مقبولیت اور ایلکس کے دلائل کے آگے ہتھیار ڈالنے پڑے۔
جب یورپین چیمپیئنز لیگ کے لیے ٹیم کا اعلان ہوا، لندن کی لڑکیوں میں تیزی سے مقبولیت حاصل کرنے والا رابرٹ اس میں شامل تھا جسے اب ڈیوڈ بیکھم کہہ کر پکارا جانے لگا تھا۔

☆☆☆

مہمانوں کا تانتا بندھ گیا۔ فون خاموش ہونے کا نام ہی نہیں لے رہا تھا۔
ہر شخص بیکھم خاندان کو مبارک باد دینے آیا تھا۔ ہر ایک کی زبان پر دعائیں تھیں۔
خوشی سے سرشار ایڈورڈ ہر مہمان کی محبت کا گرم جوشی سے جواب دے رہا تھا۔ سینڈرا اپنی بیٹیوں کے ساتھ باورچی خانے میں مصروف تھی۔ کافی کے ساتھ بسکٹ اور مٹھائیوں سے بھری پلیٹ ہر کچھ دیر بعد مہمان خانے کی سمت جاتی جہاں سے لطیف قہقہے بلند ہورہے تھے۔
سینڈرا مسرور تھی، کیونکہ اس کا بیٹا اپنے سپنے کی تعبیر پا چکا تھا۔
جشن پورے دن جاری رہا۔ رات کے کھانے کے بعد تھکے ہارے ایڈورڈ نے خود کو صوفے کے حوالے کردیا۔

☆☆☆

وہ ایک تاریک سرنگ تھی۔ دیواریں سیلن زدہ۔ وقت ٹھہرا ہوا۔
وہ سرنگ سے گزر رہا تھا مگر چہرے پر اندیشے نہیں تھے۔ دہانہ سامنے ہی تھا، جہاں روشنی تھی۔
اس نے سرنگ عبور کی۔ اب وہ تماشائیوں سے بھرے ہوئے اسٹیڈیم میں تھا اور اس کے بدن میں بجلی دوڑ رہی تھی۔
وہ یورپین چیمپیئنز لیگ کا مقابلہ تھا۔ یونائیٹڈ کا ٹکراؤ ترکی کے صفِ اول کے کلب سے تھا۔
سیٹی بجی۔ نعرے بلند ہوئے۔ گیتوں کا آغاز ہوا۔ مستری کے بیٹے نے گہرا سانس لیا۔ گیند پر نظریں ٹکائیں اور دوڑ پڑا۔ اس کی رفتار چیتے سی تھی اور نظریں عقاب سی۔
مقابلہ برابر جارہا تھا۔ مخالف ٹیم مضبوط تھی۔ مگر پھر... ایک انوکھے لمحے کا ظہور ہوا۔ اس نے جست لگائی۔ جھکا، پیر اٹھایا۔ گیند کو ٹھوکر لگی۔ وہ فضا میں بلند ہوئی۔ مخالف ٹیم کے کھلاڑیوں کے سر سے گزرتے ہوئے گیند نے حیران کن موڑ کاٹا۔ گول کیپر ششدر رہ گیا۔ گیند نیٹ میں پہنچ چکی تھی۔
اسٹیڈیم میں ہزاروں افراد تھے جن کی زبان پر ایک ہی نام تھا: "بیکھم، بیکھم!" وہ اس کے نام کی مالا جاپ رہے تھے۔
یہ ایک شان دار آغاز تھا۔ مگر بدقسمتی سے اس ٹورنامنٹ میں وہ مزید پرفارم نہیں کرسکا، اس کا کلب دوسرے ہی راؤنڈ میں باہر ہوگیا۔
یونائیٹڈ کو شکست ہوئی، مگر مداح مایوس نہیں تھے۔ انہیں نیا ہیرو جو مل گیا تھا۔

☆☆☆

"کیا کارنر لینے والا کھلاڑی گیند نیٹ میں پہنچا سکتا ہے؟ ناممکن! وہ تو فقط اپنے ساتھیوں کو اچھا پاس دے سکتا ہے بس۔ ہاں، چند کھلاڑی کارنر کک سے براہِ راست گیند نیٹ میں پہنچا چکے ہیں مگر ان کا شمار تو عظیم کھلاڑیوں میں ہوتا تھا۔ یہ ڈیوڈ بیکھم... انیس سالہ لڑکا... بھلا اس نے گیند کیسے جال میں پہنچا دی؟"
پرسٹن میں ہر دوسرا شخص یہی سوال کررہا تھا۔ کافی ہاؤس، ریسٹورنٹ اور بسوں میں لوگ حیرت سے ایک دوسرے سے پوچھتے۔
"اس لڑکے کے بارے میں سنا؟ لوگ کہتے ہیں، اس نے کارنر سے سیدھی گیند نیٹ میں پہنچا دی۔ بھلا کیا یہ ممکن ہے؟"
اور وہ لوگ جو اس واقعے کے گواہ بنے تھے، جواب دیتے۔ "اوہ ہاں... ناممکن تو ہے، مگر ایسا ہوا ہے۔"
اور پھر وہ ماضی قریب میں پہنچ جاتے۔ "غضب کا منظر تھا وہ بھی۔ اس کی ٹھوکر لگاتے ہی گیند فضا میں بلند ہوئی۔ وہ پھرکی کی طرح گھوم رہی تھی۔ اور پھر اچانک اس نے اپنا رخ بدلا..."
یہ اس زمانے کی بات ہے جب پریمیئر لیگ کے آغاز سے قبل یونائیٹڈ کے کھلاڑی آرام کرنے کے موڈ میں تھے مگر رابرٹ جو اَب ڈیوڈ بیکھم کے نام سے معروف تھا، اس دورانیے کو کارآمد بنانے کے لیے پرسٹن نارتھ اینڈ فٹبال کلب چلا آیا جس کی جانب سے اس نے فرسٹ لیگ کے پانچ میچز کھیلے۔ دو گول داغے، جن میں سے ایک گول، عجوبہ تھا۔
بیکھم تو لندن لوٹ گیا مگر پرسٹن کے باسی آنے والے

کئی سیزن تک اس ناممکن گول کی بابت استعجابی لہجے میں بات کرتے رہے۔

☆☆☆

لندن منتظر تھا۔ پریمیئر لیگ کا آغاز ہونے کا تھا اور یونائیٹڈ اپنا نیا ہتھیار آزمانے کا فیصلہ کر چکی تھی۔

2 اپریل 1995 کو جب وہ میدان میں اترا تو اسٹیڈیم نعروں سے گونج اٹھا۔

ایلکس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ کھیل رہی تھی۔ "یہ مقبولیت میں سب کو پیچھے چھوڑ دے گا۔" اس نے اپنے ساتھی سے کہا۔

مقبولیت اپنی جگہ، مگر بہر حال وہ ابھی نیا تھا۔ اسے سنبھالنا، اس کی راہ نمائی کرنی تھی۔ ایلکس جانتا تھا کہ شہرت اس نوجوان کو تباہ کر سکتی ہے۔ سو اس سیزن کے فقط چار مقابلوں میں اسے موقع دیا گیا۔

سیزن کے اختتام پر اس کی ٹیم دوسرے درجہ پر کھڑی تھی۔ آگے ایف اے کپ جیسا بڑا ٹورنامنٹ تھا۔ ایلکس نوجوان کو آزمانا چاہتا تھا، مگر بورڈ آف ڈائریکٹرز اس کے حق میں نہیں تھے۔

"ابھی نہیں ایلکس۔ تھوڑا انتظار کر لو۔" ایک سینئر رکن نے کہا۔ "ہمارے بیش تر کھلاڑی ریٹائرمنٹ کے قریب ہیں۔ شاید یہ ان کا آخری ٹورنامنٹ ہو۔ انہیں موقع دینا چاہیے۔"

انتظامیہ کے اس فیصلے کے انتہائی منفی نتائج سامنے آئے۔ یونائیٹڈ کو ٹورنامنٹ کے فائنل میں شکست کا سامنا کرنا پڑا۔ یہ 1989 کے بعد پہلا موقع تھا، جب دنیائے فٹبال میں نمایاں مقام کا حامل یہ کلب سال میں کوئی ایک ٹائٹل بھی اپنے نام نہیں کر سکا۔

مداح شدید غصے میں تھے اور اولڈ ٹریفڈ میں انتظامیہ سر جوڑے بیٹھی تھی۔

"ہم پال اینس، مارک ہیگس اور اینڈری کنکیلسی جیسے کھلاڑیوں کو کھو چکے ہیں۔" ایک رکن نے سنجیدگی سے کہا۔ "ہمیں عظیم کھلاڑیوں کی ضرورت ہے۔"

"ہم اٹلی اور نیدرلینڈ کے چند بڑے کھلاڑیوں سے رابطے میں ہیں۔" ایک اور صاحب بولے۔ "اگرچہ ہمیں بھاری معاوضہ ادا کرنا پڑے گا، مگر ہمارے پاس کوئی چارہ نہیں۔"

"میں کچھ کہنا چاہوں گا۔" ایلکس نے کھنکھار کر گلا صاف کیا۔

سب نے اس کی سمت دیکھا۔

"بے شک ہم بڑے کھلاڑیوں سے محروم ہو گئے ہیں، مگر ہمارے پاس صلاحیت کی کمی نہیں۔ ہمارے نوجوان تیا[ر] ہیں۔" اس نے ایک لمحے توقف کیا۔ "میں دیگر کلب[وں کے] کھلاڑیوں سے معاہدے کی مخالفت کرتے ہوئے یہ تجویز پیش کروں گا کہ زیر تربیت کھلاڑیوں کو آزمایا جائے۔"

"کیا وہ بڑے مقابلوں کے لیے تیار ہیں؟" سوال ک[یا] گیا۔ "یہ فیصلہ خطرناک ثابت ہو سکتا ہے۔"

"وہ تیار ہیں۔" ایلکس نے ٹھوس لہجے میں کہا۔

جب اولڈ ٹریفڈ سے جاری ہونے والی پریس ریلی[ز] میں کسی نئے کھلاڑی سے معاہدہ نہ کرنے کا اعلان کیا گیا، [تو] ماہرین ششدر رہ گئے۔ بیش تر نے اسے احمقانہ فیصلہ قرا[ر] دیا۔ مداحوں کے لیے بھی اِسے قبول کرنا دشوار تھا۔

تنقید کے طوفان میں اس وقت شدت آ گئی، جب سیزن کے پہلے ہی میچ میں یونائیٹڈ کو شکست کی ہزیمت اٹھا[نی] پڑی۔

کیا تنقید نے ایلکس کو پریشان کیا؟ قطعی نہیں۔ اس کی نظریں تو بیکھم پر ٹکی تھیں، جس نے اس میچ میں یونائیٹڈ کی طرف سے اکلوتا گول داغا۔ نوجوانوں پر بھروسا کرنے کا نس[خہ] کارگر ثابت ہوا۔ مانچسٹر نے اگلے پانچ مقابلوں میں کامیا[بی] اپنے نام کی۔

جوں جوں سیزن آگے بڑھتا گیا، شہرت کی دیوی بیکھم پر مہربانی ہوتی گئی۔ اُسے ایک منفرد مڈفیلڈر کی حیثیت سے شناخت کیا جانے لگا۔ شاٹس کی قوت میں بھی یکدم اضافہ ہو گیا۔ پاسز میں بھی پختگی در آئی اور یوں فتوحات کا ایک نہ رکنے والا سلسلہ شروع ہوا۔

یہ بیکھم کا جادو ہی تھا، جس نے کئی برسوں کی ناکامی کے بعد یونائیٹڈ کو ایک بار پھر پریمیئر لیگ کا فاتح بنا دیا۔ اس کی فسوں گری یہیں تمام نہیں ہوئی۔ ایف اے کپ کی ٹرافی بھی ایلکس فرگوسن کے کلب کے نام ہو گئی۔

سیزن کے اختتام پر بیکھم پُرامید تھا، کیونکہ اس کا ایک اور خواب سچ ہونے کو تھا۔

ان دنوں یورو 96ء کا ٹورنامنٹ موضوعِ بحث بنا ہوا تھا۔ سولہ بین الاقوامی ٹیموں کے درمیان گھمسان کا رن پڑنے کو تھا۔ انگلینڈ ٹورنامنٹ کی میزبانی کر رہا تھا اور ڈیوڈ اس مقابلے میں اپنی صلاحیتوں کے جوہر دکھانا چاہتا تھا... مگر یہ نہیں ہو سکا۔ سلیکٹرز نے اسے منتخب کرنے کی ضرورت محسوس نہیں کی وہ بیکھم کے بنا مطمئن تھے۔

اس فیصلے نے جہاں اس نوجوان کھلاڑی کو توڑ ڈالا، وہیں انگلینڈ کے لیے یہ بھاری ثابت ہوا۔ سیمی فائنل میں انگلینڈ کو روایتی حریف جرمنی کے ہاتھوں شکست کھانی پڑی۔

اس روز انگلینڈ کے مداحوں کو بڑی شدت سے اُس کی کمی محسوس ہوئی۔

☆☆☆

آسمان پر مایوسی چھائی تھی۔ سڑکوں پر اداسی رقص کناں تھی اور ڈیوڈ شکستگی کی تصویر بنا بینچ پر بیٹھا تھا۔ سامنے ساحل تھا، جو ویران پڑا تھا، ٹھیک اس کے دل کی مانند۔ سلیکٹرز کی جانب سے نظر انداز کیے جانے کے بعد وہ یاسیت میں اتر گیا تھا۔

اچانک جیب میں پڑا موبائل فون تھرتھرایا۔ دوسری طرف ایلکس فرگوسن تھا۔

"ایک اہم خبر ہے۔" آواز میں جوش تھا۔

ڈیوڈ سیدھا ہو کر بیٹھا گیا۔ ایلکس نے بات جاری رکھی۔ "انتظامیہ نے تمہیں دس نمبر کی جرسی دینے کا فیصلہ کر لیا ہے۔"

"دس نمبر کی جرسی؟" اس کی خوابناک آواز سناٹے میں گونجی۔ "یہ جرسی تو عظیم مارک ہیگس پہنا کرتا تھا۔"

"ہاں اور اب یہ تمہارے حوالے کی جا رہی ہے۔" ایلکس نے کہا۔

خاموشی کا مختصر وقفہ آیا، پھر ایلکس کی آواز سماعتوں سے ٹکرائی۔ "میں جانتا ہو کہ تم مایوس ہو۔ مگر ایک بات یاد رکھنا، مشکلات ہی انسان کو جینے کا ڈھنگ سکھاتی ہیں۔ تمہیں بیتے ہوئے کل کو بھلا کر آنے والے کل کے لیے خود کو تیار کرنا ہوگا۔"

"میں کوشش کروں گا۔" اس نے دھیرے سے کہا۔

"مجھے تمہاری کوششیں درکار نہیں۔ مجھے تمہارا عہد چاہیے۔" اس کا لہجہ واضح تھا۔

کیا مانچسٹر یونائیٹڈ کا لاڈلا ڈیوڈ بیکھم اپنے استاد کے اعتماد پر پورا اترا؟

اس کا جواب ایک واقعے میں پوشیدہ ہے، جس کا سرسری ذکر ممکن نہیں۔ یہ ذرا تفصیل طلب ہے، کیونکہ یہ ایک ایسا واقعہ ہے، جو فٹبال کی تاریخ میں کبھی پیش نہیں آیا۔

☆☆☆

17 اگست 1996۔ مانچسٹر یونائیٹڈ بمقابلہ ومبلڈن۔ پریمیئر لیگ کا پہلا دن تھا۔ وہ سحر انگیز شام تھی۔

اسٹیڈیم میں تل دھرنے کو جگہ نہیں تھی۔ ہزاروں پُرجوش نگاہیں میدان پر ٹکی تھیں۔ نعروں اور گیتوں نے سماں باندھ دیا تھا۔ میدان میں دونوں ٹیموں کے کھلاڑی جان مار رہے تھے اور ان میں سے ایک... آج نئی تاریخ رقم کرنے والا تھا۔

مقابلہ روایتی رفتار سے آگے بڑھ رہا تھا کہ ایک ناممکن لمحے کا جنم ہوا... گیند بیکھم کے قدموں میں آئی۔ اُس نے نظر اٹھائی۔ وہ مخالف ٹیم کی گول پوسٹ سے بہت دور تھا۔ حقیقت تو یہ ہے کہ وہ اپنے ہاف میں کھڑا تھا۔ نشانہ باندھنا ایک غیر منطقی فیصلہ ہوتا۔ اس نے خود کو قدرت کے حوالے کیا۔ جو عظمت اس سے منسوب ہونے کو تھی، اس کی حدت کو محسوس کیا اور گول پوسٹ پر نگاہ کی۔

مخالف ٹیم کا گول کیپر خاصا باہر تھا۔ ظاہری بات ہے، وہ امید نہیں کر رہا تھا کہ سینٹر ہاف سے کوئی گول پوسٹ پر حملہ کر دے گا، مگر وہ مظلوم نہیں جانتا تھا کہ ایک حیرت انگیز لمحے کا جنم ہو چکا ہے۔ بیکھم کے پٹھے اکڑ گئے۔ ٹانگ فضا میں بلند ہوئی۔ گیند کو ٹھوکر لگی۔ وہ ہوا میں بلند ہوئی۔ گھومتی ہوئی گول پوسٹ کی سمت بڑھی۔ میدان میں موجود ہزاروں افراد نے گیند کا تعاقب کیا۔ حیرت نے انہیں آ لیا۔

مخالف گول کیپر نے اپنے سر کے اوپر سے جاتی ہوئی گیند کو دیکھا اور اس احساس کی گرفت میں آ گیا کہ بیکھم کا نشانہ اپنے ہدف پر بیٹھا ہے۔ اس سے قبل کہ وہ مڑ کر گیند کو روک پاتا، طلسماتی واقعہ اپنے انجام کو پہنچ چکا تھا۔ گیند نے جال کا بوسہ لے لیا۔

ڈیوڈ بازو کھولے کھڑا تھا۔ یونائیٹڈ کے مداحوں نے آسمان سر پر اٹھا لیا۔ وہ جشن منا رہے تھے۔

آنے والے کئی ماہ تک یہاں تک پریمیئر لیگ کے اختتام تک یہ ٹھوکر شائقین اور ماہرین کے درمیان زیرِ بحث رہی۔

ہاں، دنیا میں کئی عظیم کھلاڑی گزرے ہیں۔ پیلے اور میراڈونا نے بھی ناقابلِ یقین گول کیے، مگر کیا کبھی کسی کھلاڑی نے سینٹر ہاف سے گول داغا ہے؟ کیا کوئی اتنا اچھا نشانہ باندھ سکتا ہے؟

17 اگست سے پہلے تو کسی کو اس کا یقین نہیں تھا مگر اب یقین کرنے کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا۔ ڈیوڈ بیکھم اپنا جادو دکھا چکا تھا۔ وہ راتوں رات سپر اسٹار بن گیا۔ سیزن کے اختتام پر اسے بہترین نوجوان کھلاڑی کے اعزاز سے نوازا گیا۔ اور جہاں تک اس گول کا تعلق ہے... ماہرینِ فٹبال آج اسے دنیا

کے پچیس بہترین گولز میں شمار کرتے ہیں۔

☆☆☆

ہر شخص پُراعتماد تھا۔ ہر کوئی پُرجوش تھا۔ ایڈورڈ اور سینڈرا بھی خوشخبری کے منتظر تھے۔ اگر کوئی ناامیدی میں گھرا تھا تو وہ تھا ڈیوڈ بیکھم۔

یہ 1996 کے ماہ اگست کا ذکر ہے۔ دو برس بعد فرانس میں فٹبال کا عظیم الشان میلا لگنے والا تھا۔ کوالیفائنگ راؤنڈز شروع ہوچکے تھے۔۔۔۔ لوگوں کو یقین تھا کہ اس بار قومی ٹیم کے سلیکٹرز ڈیوڈ کو نظر انداز نہیں کریں گے۔ مگر بیکھم کا معاملہ ذرا مختلف تھا۔ یورو کے تجربے نے اسے تھوڑا قنوطی بنا دیا تھا۔ احباب کے لاکھ سمجھانے کے باوجود وہ یاسیت میں گھرا رہا، مگر جب مشرقی یورپ کے ملک مالدووا کے خلاف یکم ستمبر کو ہونے والے مقابلے کے لیے ٹیم کا اعلان ہوا، وہ خوشی سے اچھل پڑا۔ اُس کا نام ٹیم میں شامل تھا۔

اس خبر نے بیکھم کی روح کو مسرت سے بھر دیا۔ وہ کبھی الفاظ میں بیان نہیں کرسکا کہ انگلینڈ کی جرسی پہن کر میدان میں اترنے کا احساس کس قدر پُرقوت تھا۔ مگر میدان میں اترتے ہی اُسے اندازہ ہوگیا کہ یہ آگ کا دریا ہے جسے عبور کرنا آسان نہیں۔

واضح رہے کہ انگلینڈ گزشتہ ورلڈ کپ مقابلوں میں رسائی حاصل نہیں کرسکا تھا اور شائقین اس بار کوئی رعایت نہیں دینے والے تھے۔ بیکھم اپنے کاندھوں پر ذمے داریوں کو بوجھ محسوس کر رہا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ انگلینڈ کی امیدیں اس سے وابستہ ہیں۔

سنہری بالوں والے بیکھم نے جس کا ہیئر اسٹائل نوجوان نسل میں تیزی سے مقبول ہورہا تھا، کوالیفائنگ راؤنڈز کے تمام میچوں اپنی صلاحیتوں کا بھرپور اظہار کیا۔ گول بھی داغے۔

ان مقابلوں نے پہلی بار بین الاقوامی میڈیا کو اس کھلاڑی کی جانب متوجہ کیا جس کے جوتوں کی رگڑ سے کرشمے رونما ہونے کو تھے۔

کلب فٹبال کا سلسلہ بھی زور شور سے جاری رہا۔ پریمیئر لیگ کا اگلا سیزن شان دار رہا۔ دس نمبر کی جرسی کی بجائے اب اسے سات نمبر کی جرسی تھما دی گئی تھی۔ اور یہ تبدیلی نیک شگون ثابت ہوئی اُس کے کھیل میں مزید نکھار آگیا۔

بیکھم کی نظریں مستقبل پر لگی تھیں۔ ورلڈ کپ کا آغاز ہونے کو تھا اور وہ فرانسیسی سرزمین پر اپنے ملک کا نام روشن کرنے کے لیے پُرعزم تھا۔

☆☆☆

کہتے ہیں، بدقسمتی تنہا نہیں آتی۔ وہ ہم جولیاں سا[illegible] لاتی ہے۔

حمایتی تو اُسے عہد ساز کھلاڑی قرار دے رہے تھے، [illegible] انگلینڈ کی ٹیم کا کوچ گلن ہوڈل اسے قطعی پسند نہیں کرتا تھا۔ [illegible] بیکھم کی مقبولیت سے خائف تھا۔ جب ورلڈ کپ کے [illegible] کیمپ لگا، تناؤ عروج پر پہنچ گیا۔ کوچ نے یہ بیان داغ دیا [illegible] نوجوان کھلاڑی ٹورنامنٹ کے لیے سنجیدہ نہیں۔

ورلڈ کپ کے ابتدائی دو میچز میں بیکھم کو نظر انداز کیا [illegible] مگر شدید عوامی دباؤ کے باعث کوچ کو بادلِ ناخواستہ اسے [illegible] سے اٹھا کر کولمبیا کے خلاف میدان میں اتارنا پڑا۔ اس [illegible] کولمبیا کے خلاف ایک شان دار گول داغا اور اگلے مقابلے میں [illegible] جگہ پکی کر لی۔

اور اُسی مقابلے میں بدقسمتی نے حملہ کیا۔ ناک آؤ[illegible] مرحلے میں انگلینڈ کو روایتی حریف ارجنٹینا سے دو دو ہاتھ کر[illegible] تھے، جس کے شاطر کھلاڑی ایک خوفناک منصوبہ ترتیب د[illegible] چکے تھے۔ منصوبے کو پایۂ تکمیل تک پہنچانے کی ذمے دار[illegible] ڈیگو سیمی اونی کو سونپی گئی، جس کا نشانہ تھا... ڈیوڈ بیکھم!

”اس پر قابو پاتے ہی انگلینڈ کی کمر ٹوٹ جائے گی۔“ ارجنٹینا کے کپتان کے چہرے پر شاطر مسکراہٹ تھی۔ ”پانس[illegible] پلٹ جائے گا۔“

بہ ظاہر وہ ایک شان دار مقابلہ تھا۔ دونوں ٹیمیں بھرپ[illegible] حملے کر رہی تھیں، مگر بیکھم کو کھل کر کھیلنے کا موقع نہیں مل رہا تھا۔ ڈیگو جیسے اس سے چپک گیا تھا اور اسے روکنے کے لیے اپ[illegible] صلاحیتوں سے زیادہ مکوں اور دھکوں سے کام لے رہا تھا۔ مقصد فقط یہ تھا کہ بیکھم جواب میں کچھ کر بیٹھے۔

اور وہ اپنے مقصد میں کامیاب رہا۔ یہ پریشان ک[illegible] واقعہ اس وقت رونما ہوا، جب کھیل اپنے عروج پر تھا۔ گی[illegible] بیکھم کے قدموں میں آئی۔ ڈیگو نے اُسے زوردار دھکا دیا[illegible] بیکھم زمین پر آرہا۔ ڈیگو اپنے زور میں خود بھی بیکھم پر گر پڑا[illegible] اور اُس موقع پر درد سے کراہتے ڈیوڈ کے کان میں اس [illegible] سرگوشی کی۔ ”ڈرامے بازی بند کرو۔ فراڈیے۔“

درد تو بیکھم برداشت کرلیتا، مگر دھوکا دہی کا الزا[illegible] برداشت نہیں کرسکا۔ گرم خون گردش میں آگیا۔ اس نے لی[illegible] لیٹے اپنی ٹانگ گھمائی۔ نشانہ ڈیگو کی ران تھی۔ ڈیگو کمال [illegible] اداکار ثابت ہوا۔ ٹھوکر لگتے ہی وہ چلاتا ہوا زمین پر لیٹ گیا۔

ڈیوڈ کی بدقسمتی کہ ریفری قریب ہی کھڑا تھا۔ اس نے [illegible]

منظر دیکھ لیا۔ اگلے ہی لمحے اس کے ہاتھ میں ریڈ کارڈ تھا۔

انگلینڈ کی امید تصور کیے جانے والے کھلاڑی کو میدان سے باہر بھیج دیا گیا تھا۔ ڈیگو سستے میں چھوٹ گیا۔ اُسے فقط یلو کارڈ ملا۔

انگلینڈ کی کمر ٹوٹ گئی۔ اُس کے کھلاڑی دفاعی پوزیشن میں چلے گئے۔ میچ پینالٹی شاٹس تک چلا گیا جہاں انگلش ٹیم کو شکست کا ذائقہ چکھنا پڑا۔

انگلش میڈیا سب کچھ برداشت کرسکتا تھا مگر ارجنٹینا سے شکست نہیں۔ کوچ نے پورا ملبا ڈیوڈ بیکھم پر ڈال دیا۔ غصیل میڈیا نے بھی ساتھ دیا۔ یوں راتوں رات لندن کا شہزادہ ناپسندیدہ ترین شخص بن گیا۔ لوگ اس سے نفرت کرنے لگے۔ جرائم پیشہ گروہوں کی جانب سے اعلان کیا گیا کہ انگلینڈ پہنچتے ہی بیکھم کو قتل کر دیا جائے گا۔

اس ردِعمل سے اُسے شدید صدمہ پہنچا۔ وہ الزامات کا جواب دینا چاہتا تھا مگر خیرخواہوں نے اُسے وطن سے دور رہنے کا مشورہ دیا، جس پر اسے چاروناچار عمل کرنا پڑا۔

ادا سی کے ان ہی دنوں میں یہ افواہ گردش کرنے لگی کہ بیکھم اب کبھی انگلینڈ نہیں لوٹے گا۔ اور پھر خبر آئی کہ کسی اسپینش کلب نے اس سے رابطہ کیا ہے۔ یہی وہ موقع تھا، جب ایلکس فرگوسن حرکت میں آیا۔

☆☆☆

وہ ایک تاریک اور سرد رات تھی۔ لندن نیند میں ڈوبا ہوا تھا۔ صحافی بھی غنودگی میں تھے۔ ایسے موسم میں کسی بڑی خبر کی امید نہیں کی جاسکتی تھی، مگر ایک بڑی خبر تھی۔ بیکھم لوٹ آیا تھا۔

جب وہ ائیرپورٹ سے باہر آیا، برف گرنے لگی تھی۔ وہاں اس کا باپ موجود تھا، جس نے آگے بڑھ کر اسے گلے لگایا۔ باہر ایک جیپ کھڑی تھی جس میں ایلکس فرگوسن بیٹھا تھا۔

”میں تمہاری حوصلہ افزائی کرنے نہیں آیا۔“ اس نے ٹھوس لہجے میں کہا۔ ”بلکہ تمہیں یہ بتانے آیا ہوں کہ سیزن شروع ہونے والا ہے۔ جو بیت گیا، اسے بھول کر مستقبل پر توجہ مرکوز رکھو۔“

1998-99 سیزن کا مثبت آغاز اور یونائیٹڈ کی کامیابیوں کے طفیل دھیرے دھیرے زخم بھرنے لگے۔ پھر ڈیگو کا بیان بھی سودمند ثابت ہوا، جس نے اعتراف کیا کہ انگلینڈ کو شکست دینے کے لیے ارجنٹینا نے اُن کے اہم ترین کھلاڑیوں کو نشانہ بنانے کا فیصلہ کیا تھا۔

یونائیٹڈ نے اس برس نہ صرف پریمیئر لیگ میں کامیابی حاصل کی، بلکہ ایف اے کپ اور چیمپئنز لیگ جیسے اہم ٹائٹل بھی اپنے نام کرلیے۔

چیمپئنز لیگ کا فائنل تو یادگار رہا۔ اُس میچ میں یونائیٹڈ کو اپنے اہم ترین کھلاڑیوں کی خدمات حاصل نہیں تھیں اور آخری لمحات تک ٹیم ایک گول کے خسارے میں تھی۔ پھر بیکھم حرکت میں آیا۔ اس کے جوتے کی رگڑ سے فتح کا جن زمین سے برآمد ہوا اور کرشمے ظاہر ہونے لگے۔

میدان کے کنارے سے اس نے گیند کو ٹھوکر لگائی، جو اتنی پختہ تھی کہ گول کرنے والے کو کوئی دشواری پیش نہیں آئی۔ مقابلہ برابر ہوگیا۔

چند منٹ بعد یہی منظر دہرایا گیا۔ ایک اور گول۔ جب اختتامی سیٹی بجی، ٹیم کے کھلاڑیوں نے بیکھم کو کاندھوں پر اٹھا لیا۔

سیزن کے بعد جب وہ گھر لوٹا، اُسے ایک غیر متوقع فون کال موصول ہوئی۔ فون کرنے والے کے پاس اُس کے لیے ایک پیش کش تھی۔

☆☆☆

سنسان سڑک پر بارش کا پانی کھڑا تھا۔ دوڑتے قدموں کی آواز رات کو ہیبت ناک بنا رہی تھی۔

وہ ایک خوبرو لڑکی تھی، مگر اس وقت اس کا چہرہ اندیشوں میں ڈوبا تھا۔ وہ پوری قوت سے دوڑ رہی تھی۔ دو آدمی اس کا تعاقب کر رہے تھے۔ ان کے چہروں سے سفاکی ٹپک رہی تھی۔

اچانک لڑکی کا پاؤں رپٹا۔ وہ زمین پر آرہی۔ اس سے قبل کہ وہ کھڑی ہو پاتی، بدمعاش اس کے سر پر پہنچ گئے۔ سناٹے میں چاقو کھلنے کی آواز گونجی۔ لڑکی نے آنکھیں بند کر لیں۔ موت سامنے تھی۔

اچانک ایک شور سنائی دیا۔ سڑک روشنی میں نہا گئی۔ دونوں بدمعاش لڑکی کو بھول کر اس سمت دیکھنے لگے۔ وہ ایک سیاہ جیپ تھی، جو تیزی سے ان کی سمت آرہی تھی۔ بریک چرچرائے۔ جھٹکے سے دروازہ کھلا۔

کرشماتی شخصیت کا حامل ایک دراز قد آدمی جیپ سے برآمد ہوا۔

”اوہ ڈیوڈ بیکھم۔“ لڑکی کے منہ سے نکلا۔ وہ کھڑی ہوگئی۔ اندیشوں کی جگہ امید نے لی لے۔

ایک بدمعاش نے آگے بڑھ کر بیکھم پر حملہ کر دیا۔ اُس نے کمالِ مہارت سے غچہ دیتے ہوئے اس کی کمر پر لات رسید

کی۔ اب دوسرے کی باری تھی۔ چند ساعتوں بعد وہ بھی زمین پر پڑا کراہ رہا تھا۔

لڑکی بیکھم کے نزدیک آئی۔ آنکھوں میں احساسِ تشکر تھا۔ بیکھم جواباً مسکرایا۔ جانے کے لیے مڑا، پھر پلٹا۔ جیب سے ایک چاکلیٹ نکالی اور لڑکی کی طرف بڑھائی۔ لڑکی کی خوشی دیدنی تھی۔ اس نے چاکلیٹ لی لے۔

بدمعاش زمین پر پڑے تھے۔ جیپ کی ہیڈ لائٹس روشن تھیں اور بیکھم کے ہاتھ میں چاکلیٹ تھی۔

یہ اس اشتہار کا تذکرہ ہے، جس میں بیکھم پہلی بار جلوہ گر ہوا۔ اس ایک اشتہار نے اسے سپر ماڈل بنادیا۔ حالانکہ ماڈلنگ کی پیش کش قبول کرنے سے قبل وہ خاصا متذبذب تھا۔ ماضی میں ہمیشہ اس نے ایک فٹبالر کے طور پر کیمرے کا سامنا کیا تھا، یہ پہلا موقع تھا، جب اسے ایک مسیحا کے طور پر پیش کیا گیا۔ مگر یہ فیصلہ دُرست ثابت ہوا۔ بیکھم کی فسوں گری کے طفیل اس چاکلیٹ کی مقبولیت میں یکدم اضافہ ہوگیا۔ بعد میں فرانسیسی زبان میں بھی اس اشتہار کی ڈبنگ ہوئی۔

اب تو آفرز کا تانتا بندھ گیا۔ ہر کوئی اسے کاسٹ کرنا چاہتا تھا۔ سچ تو یہ ہے کہ اس اشتہار نے اس کی زندگی بدل دی اور اسی اشتہار سے خرابی کا آغاز ہوا۔

☆☆☆

عوام اس کے سحر میں مبتلا تھے، مگر چند حلقوں کے لیے وہ اب بھی ناقابلِ قبول تھا۔ وہ اس پر تنقید کرنے سے نہیں چوکتے۔ بار بار یاد دلاتے کہ اس کی غفلت کی وجہ سے انگلینڈ کو ارجنٹینا کے ہاتھوں شکست کا کرب سہنا پڑا۔ پھر ورلڈ کلب چیمپین شپ کے ایک مقابلے نے دشمنوں کو بھڑاس نکالنے کا بھرپور موقع فراہم کیا، جہاں بیکھم کو ریفری کی جانب سے ریڈ کارڈ سے نوازا گیا۔

ان ہی دنوں اس کے سر میں جسم گُدانے کا سودا سمایا۔ چند روز بعد اس کے بدن پر ”ٹیٹو“ نظر آنے لگے، جن میں سے چند انتہائی ہیبت ناک تھے۔ گو مغرب میں ٹیٹو بنانے کا رجحان پرانا ہے، مگر آج بھی کئی حلقے اسے شیطانی عمل قرار دیتے ہیں۔ خصوصاً اگر کوئی مشہور آدمی ایسا کرے، تو انہیں اپنے گراں قدر خیالات کے اظہار کا اچھا موقع مل جاتا ہے۔ بیکھم کے معاملے میں بھی کچھ ایسا ہی ہوا۔ اسے شیطان کا پجاری تک کہہ دیا گیا۔

اُسے تنقید کی تو پروا نہیں تھی، مگر مخالفین نے اُس کے رویے اور رجحان میں آنے والی تبدیلی کی جو وجہ بیان کی، اُس سے بیکھم کو شدید صدمہ پہنچا۔

وہ وکٹوریا کو قصوروار ٹھہراتے تھے۔ اُس عورت کو جسے وہ ٹوٹ کر چاہتا تھا۔

☆☆☆

تیکھے نقوش اور سانولی رنگت والی وکٹوریا سے بیکھم کی پہلی ملاقات 1997 میں ہوئی۔ جلد ہی دونوں میں دوستی ہوگئی جو بدلتے موسموں کے ساتھ محبت کے قالب میں ڈھل گئی۔

وہ ایک باصلاحیت گلوکارہ تھی۔ اُس نے میوزیکل بینڈ اسپائس گرلز کے طفیل شہرت حاصل کی۔ کچھ عرصے بعد وہ بینڈ سے الگ ہو کر سولو پرفارم کرنے لگی۔ حصولِ کامرانی کے بعد اب وہ عشق لڑانے کے لیے تیار تھی اور بیکھم اس کے لیے آئیڈیل مرد تھا۔

میڈیا کی جانب سے اس معاشقے کو خصوصی توجہ دی گئی۔ وکٹوریا باقاعدگی سے یونائیٹڈ کے میچز کے دوران اسٹیڈیم میں نظر آنے لگی۔ ایک جانب فٹبال کے میدانوں میں وکٹوریا کے چرچے ہو رہے تھے، دوسری جانب شوبز کی دنیا بیکھم کی پکار رہی تھی۔

پہلے چاکلیٹ کے اشتہار کی مقبولیت، پھر وکٹوریا جیسی شوبز پرسنالٹی کا ساتھ تمام اشتہاری کمپنیوں کو بیکھم میں ایک ماڈل نظر آرہا تھا۔

مختلف ایجنسیاں اس سے رابطہ کرنے لگیں۔ بیکھم نے پس و پیش سے کام لیا۔

”جناب وہ اشتہار فقط تجربے کے طور پر کیا گیا تھا۔ میرے پاس وقت ہی کہاں ہے!“ وہ ہر ایک کو یہی جواب دیتا۔

جب اشتہاری کمپنیاں اسے قائل کرنے میں ناکام رہیں تو انہوں نے وکٹوریا سے رابطہ کیا۔

”تم میں ایک اسٹار ہے۔“ وکٹوریا کی آنکھوں میں محبت تھی۔ ”لوگ تمہیں ٹی وی پر دیکھنا چاہتے ہیں۔“

معاملہ خاصا سہل ثابت ہوا۔ خونخوار کھلاڑیوں کا مقابلہ کرنے والا بیکھم وکٹوریا کو ٹوٹ کر چاہتا تھا۔ وہ اس کی بات نہیں ٹال سکتا تھا۔ اس نے ہامی بھر لی۔ اور ساتھ ہی معاہدے کرنے کا اختیار بھی وکٹوریا کو سونپ دیا۔

یہ اختیار ملتے ہی وکٹوریا یکسر بدل گئی۔ اُس کی جانب سے جو تقاضا کیا گیا، اُسے سن کر کمپنیاں چکرا گئیں، مگر بیکھم کی مقبولیت سے استفادہ کرنے کے لیے اُنہیں وکٹوریا کی ہر شرط قبول کرنی پڑی۔

یوں ایک مستری کے گھر پیدا ہونے والے نوجوان نے شوبزنس کی دنیا میں قدم رکھا اور چند ہی ماہ میں سب سے زیادہ معاوضہ وصول کرنے والا ماڈل بن گیا۔

بیکھم وکٹوریا کو خوش قسمتی کی علامت تصور کرنے لگا تھا۔ وکٹوریا بھی مسرور تھی۔ اس کا عاشق دنیا کا مقبول ترین آدمی تھا۔ اس رشتے نے 1998 کے اواخر میں قانونی حیثیت اختیار کرلی۔ بیکھم اور وکٹوریا رشتۂ ازدواج میں بندھ گئے۔

وہ شادی کی انوکھی تقریب تھی۔ کچھ حلقوں نے تو اُسے شاہی تقریب کے مماثل قرار دیا۔ ایک اندازے کے مطابق اس پر پانچ لاکھ پونڈز جیسی خطیر رقم خرچ ہوئی۔

ٹی وی چینلز... اُسے براہِ راست نشر کرنا چاہتے تھے مگر وکٹوریا نے کسی کو اندر قدم رکھنے کی اجازت نہیں دی۔ تقریب کے رائٹس ایک معروف میگزین کو بھاری داموں فروخت کیے گئے تھے۔

شادی کے بعد بیکھم نے اپنی بیوی کو جو محل تحفے میں دیا، اس کی لاگت 7.5 ملین پونڈز تھی۔

اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ مخالفین اس کی بیوی کو تنقید کا نشانہ کیوں بنا رہے تھے۔ لوگوں کو لگنے لگا تھا کہ وکٹوریا نے ایک محنت کش کے بیٹے کو جو حقیقتاً فٹبال کھیلنے کے لیے پیدا ہوا تھا، ایک ماڈل بنا دیا ہے۔ ایک ایسا ماڈل، جس پر دولت کمانے کی دھن سوار ہے۔

یہ تھے وہ الزامات جنہوں نے بیکھم کو دُکھی کردیا تھا۔ اُس نے اخبارات کے خلاف ہتک عزت کا دعویٰ کرنے کا فیصلہ کرلیا تھا مگر ایلکس فرگوسن کے سمجھانے پر وہ اس سے باز رہا۔

”شہرت کبھی تنہا نہیں آتی میرے بچے۔“ اس نے کسی فلسفی کے انداز میں کہا تھا۔ ”ہمیں اس کی قیمت ادا کرنی پڑتی ہے۔“

بیکھم نے اس کی نصیحت پر بلاچون و چرا عمل کیا۔ ایلکس اس کے لیے باپ کی مانند تھا۔

اُس وقت کوئی سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ ایلکس اور بیکھم کے رشتے میں جلد دراڑ پڑنے والی ہے اور اس کی وجہ کوئی اور نہیں... بلکہ وکٹوریا ہوگی۔

☆☆☆

نیا ہزاریہ ڈھیروں خوشیاں لایا۔

خدا نے بیکھم کو بیٹے سے نوازا جسے بروکلن جوزف کا نام دیا گیا۔ میدانوں میں اس کی کارکردگی شاندار رہی۔ اس کے جادوئی گولز کے طفیل یونائیٹڈ نے پریمیئر لیگ کا ٹائٹل اپنے نام کرلیا۔

موسم خزاں میں تو مسرت اوج پر پہنچ گئی۔ اسے انگلینڈ کی کپتانی سونپ دی گئی۔ عہدہ سنبھالنے کے بعد بیکھم نے اپنے بیان میں کہا۔ ”ہمارا اکلوتا مقصد ورلڈ کپ 2002 تک رسائی ہے۔“

اپنے مقصد پر نظریں جمائے وہ آگے بڑھ رہا تھا۔ کوالیفائنگ راؤنڈز میں انگلینڈ کی کارکردگی متاثر کن رہی۔ انہوں نے جرمنی جیسی ٹیم کو پانچ۔ ایک سے شکست دی اور پھر وہ واقعہ پیش آیا، جس نے اس کے بارے میں پائے جانے والے منفی تاثر کو زائل کردیا۔

یہ 6 اکتوبر 2001 کا ذکر ہے۔ انگلش ٹیم یونان سے برسرِ پیکار تھی۔ ورلڈ کپ تک رسائی کے لیے شکست ٹالنا اکلوتی شرط تھی۔ مگر مسئلہ یہ تھا کہ انگلینڈ ایک گول کے خسارے میں تھا اور ظالم وقت تیزی سے گزر رہا تھا۔

آخری لمحات میں انگلینڈ کو فری کک ملی۔ ٹھوکر لگانے کی ذمے داری کپتان نے خود اٹھائی۔ اس کی نظریں گیند پر لگی تھیں۔ گیند جو اس کی زندگی تھی، جس سے وہ محبت کرتا تھا۔ اچانک اسے لگا جیسے آسمان بادلوں سے ڈھک گیا ہو۔ جیسے ہوا نے یلغار کردی ہو۔ تخیل نے جست لگائی۔ اب وہ اپنے بچپن میں تھا۔ اس زمانے میں جب وہ سات برس کا تھا، جب برستا آسمان اس کی جادوئی ٹھوکروں کا گواہ بنا تھا۔

وہ بھید بھرے لمحات تھے۔ اس نے جست لگائی۔ ٹھوکر لگائی۔ گیند ہوا میں بلند ہوئی۔ مخالف کھلاڑیوں کے سروں سے ہوتی ہوئی گول پوسٹ کی سمت بڑھی اور پھر انتہائی پُراسرار انداز میں اس نے رخ بدلا اور جال میں پہنچ گئی۔

اب اسٹیڈیم میں جشن کا سماں تھا۔ میچ برابر ہوچکا تھا۔ بیکھم کی ٹیم نے ورلڈ کپ کے لیے کوالیفائی کرلیا تھا۔

سال کے اختتام پر جب بی بی سی نے اسے 2001 کا اہم ترین کھلاڑی قرار دیا، تو کسی کو حیرت نہیں ہوئی سب اس کی توقع کر رہے تھے۔ البتہ ایک بات کی کوئی توقع نہیں کر رہا۔ ایلکس فرگوسن بیکھم سے کھچا کھچا رہنے لگا تھا۔

☆☆☆

موسم سرما برفانی طوفانوں کے ساتھ آیا۔ زندگی سمٹ گئی۔ ہر سو اداسی چھا گئی۔ اور ٹھیک تب... ایلکس اور بیکھم کے رشتے میں سرد مہری نے جنم لیا، جس کا سبب نہ تو بڑھتی ٹھنڈ تھی، نہ ہی وکٹوریا۔ درحقیقت یہ بیکھم کی بڑھتی مصروفیات تھیں،

جنہوں نے ایلکس کو پریشان کردیا۔

بیکھم کی جانب سے معاوضے میں اضافے کی درخواست تو اُسے ناگوار نہیں گزری، مگر جب وہ ٹریننگ سیشن میں غیر حاضر رہنے لگا تو ایلکس میں اضطراب جنم لینے لگا۔ اور پھر ایک روز اس اضطراب نے آتش فشاں کی شکل اختیار کرلی۔

نیا ٹریننگ سیشن شروع ہونے کو تھا۔ ایسے میں ایلکس کو بیکھم کی کال موصول ہوئی۔ ”میرے بیٹے کی طبیعت کچھ ناساز ہے۔ میری سیشن میں شرکت مشکل ہے۔“

”اچھا۔“ منیجر نے گہرا سانس لیا۔ ”کوئی مسئلہ نہیں۔ تم چھوٹے کا خیال رکھو۔“

وہ دن تو خاموشی سے نکل گیا مگر اگلے دن کے اخبارات دیکھ کر ایلکس آگ بگولا ہوگیا۔ اخبارات میں وکٹوریا کی لندن فیشن ویک کے دوران لی جانے والی تصاویر شائع ہوئی تھیں۔

”بیمار بچہ شوہر کو سونپ کر بیگم صاحبہ گھومتی پھر رہی ہیں۔“ وہ دہاڑتے ہوئے فنانس منیجر کی جانب مڑا۔ ”بہت عیاشی ہوگئی۔ اس پر پچاس ہزار پونڈز کا جرمانہ عائد کردو۔“

”پچاس ہزار پونڈز؟“ منیجر نے دھیرے سے کہا۔ ”کیا یہ کچھ زیادہ نہیں؟“

”قطعی نہیں۔“ ایلکس سخت غصے میں تھا۔ ”میں اُسے اگلے میچ میں ڈراپ کرنے کے احکامات بھی صادر کرتا ہوں۔ شادی نے اُسے تباہ کردیا ہے۔“

ایلکس کے فیصلے سے بیکھم کو شدید صدمہ پہنچا مگر وہ حرفِ شکایت زبان پر نہیں لایا۔ اپنے استاد سے ٹھیک ویسے ہی ملا جیسے ماضی میں ملا کرتا تھا مگر سچ تو یہ ہے کہ اس کا دل ٹوٹ گیا تھا۔

اُن دنوں وکٹوریا نے اُسے ایک خطرناک مشورہ دیا۔ ”مانچسٹر یونائیٹڈ چھوڑ کیوں نہیں دیتے؟“

بیکھم کی آنکھوں میں حیرت سمٹ آئی۔

”بھلا یہ کیسے ممکن ہے؟“ اس نے تیزی سے کہا۔ ”یہ کلب میری پہلی محبت ہے۔“

”جذبات بھی یکساں نہیں رہتے۔ حالات بدل جاتے ہیں۔“ وکٹوریا نے سمجھایا۔ ”کیوں ناں ہم اسپین چلیں۔ مجھے امید ہے کہ اسپینش کلب سے معاہدہ سودمند ثابت ہوگا۔ انگلش پریس سے بھی جان چھوٹ جائے گی۔“

”نہیں۔“ اس نے نفی میں سر ہلا۔ ”میں مانچسٹر یونائیٹڈ نہیں چھوڑ سکتا۔“

وکٹوریا خاموش تو ہوگئی، مگر وہ ہار ماننے والی عورت نہیں تھی۔ سچ تو یہ ہے کہ وہ انگلینڈ چھوڑنے کا ذہن بنا چکی تھی۔

☆☆☆

2000-01 کا سیزن یادگار رہا۔ ایلکس فرگوسن کی ٹیم نے ایک ہی برس میں تین ٹائٹل اپنے نام کیے۔ بیکھم نے نو گول داغے۔ مگر پھر مداحوں کو ایک افسوسناک خبر ملی۔

اسپینش کلب سے ہونے والے ایک مقابلے میں بیکھم اپنا گھٹنا تڑوا بیٹھا اور فٹبال سے دور ہوگیا۔

اس واقعے سے انگلش میڈیا آگ بگولا ہوگیا۔ دراصل جس کھلاڑی کی ٹکر سے بیکھم زخمی ہوا تھا، اس کا تعلق ارجنٹینا سے تھا اور آنے والے ورلڈ کپ میں ارجنٹینا اور انگلینڈ مقابل ہونے والے تھے۔

حقائق کیا تھے؟ اس بابت حتمی طور پر کچھ نہیں کہا جاسکتا تھا، مگر بیکھم کھیل سے باہر ہوچکا تھا اور یونائیٹڈ نے اس کی کمی شدت سے محسوس کی۔ انہیں پے درپے شکست کا سامنا کرنا پڑا، جس کے بعد واضح ہوگیا کہ کلب اس کے بغیر ادھورا ہے۔

انتظامیہ نے فوراً ہی اسے نئے معاہدے کی پیش کش کردی۔

وکٹوریا اس کی مخالف تھی، لیکن بیکھم کلب چھوڑنے کو تیار نہیں تھا۔ بالآخر وکٹوریا نے معاوضے کی رقم میں بڑھوتی کا تقاضا کرتے ہوئے چند شقوں کا اضافہ کردیا۔ جب ان ترامیم کی اطلاع ایلکس کو ملی تو اس نے سرد آہ بھری۔ ”وہ اپنی تباہی کی سمت بڑھ رہا ہے۔“

بیکھم کی شرائط پر معاہدہ طے پا گیا۔

جب میڈیا نے اس معاہدے اور اشتہارات سے ہونے والی آمدنی کا تخمینہ لگانا شروع کیا تو انکشاف ہوا کہ مستری کا بیٹا آج دنیا میں سب سے زیادہ معاوضہ وصول کرنے والا کھلاڑی بن چکا ہے۔ اب وہ ایک امیر کبیر شخص ہے۔

کچھ تجزیہ کاروں کا خیال تھا کہ یونائیٹڈ انتظامیہ کو اپنے فیصلے پر پچھتانا پڑے گا، مگر ایسا نہیں ہوا۔ زخم مندمل ہونے کے بعد وہ پوری قوت سے میدان میں اترا۔ سیزن کے اختتام تک وہ سولہ گول داغ چکا تھا۔ وہ اپنے کیریئر کے عروج پر تھا۔

☆☆☆

دنیا کی نظریں جنوبی کوریا پر ٹکی تھیں۔ گھمسان کا رن پڑنے کو تھا۔ بگل بجا اور ورلڈ کپ 2002 کا آغاز ہوگیا۔

سوئیڈن کی ٹیم سے نمٹنے کے بعد بیکھم روایتی حریف ارجنٹینا کی جانب متوجہ ہوا۔ وہ میچ سخت ثابت ہوا۔ چند ماہرین اُسے فٹبال کی تاریخ کا سب سے کڑا مقابلہ قرار دیتے ہیں۔

اس روز بیکھم شدید دباؤ میں تھا، جو اُس لمحے دوچند ہوگیا، جب انگلینڈ کو پینالٹی کک ملی اور گیند کو نیٹ میں پہنچانے کی ذمّے داری اُسے سونپی گئی۔ گزشتہ ورلڈ کپ کا تلخ واقعہ ذہن میں تھا مگر اس نے بری یادوں کو خود پر حاوی نہیں ہونے دیا۔ اس نے شان دار گول داغا۔ چار برس قبل ولن ٹھہرایا جانے والا بیکھم اب ہیرو بن چکا تھا۔

میچ کے اختتام پر انگلینڈ میں جشن کا آغاز ہوا۔ ارجنٹینا یاسیت میں ڈوب گیا۔ پھر انگلینڈ نے کوارٹر فائنل تک رسائی حاصل کی، جہاں اسے برازیل کے ہاتھوں شکست کا سامنا کرنا پڑا مگر گھر لوٹنے پر شان دار استقبال ہوا۔ خصوصاً بیکھم کو سر بٹھایا گیا جس نے ارجنٹینا کا غرور خاک میں ملا دیا تھا۔

ورلڈ کپ میں تو اُس نے اچھا پرفارم کیا مگر اب وہ پھر زخموں میں گھر چکا تھا، جو اسے میدانوں سے دور لے گئے۔ البتہ اشتہارات کا سلسلہ جاری رہا۔۔۔۔ ایلکس کے لیے یہ صورتِ حال انتہائی تکلیف دہ تھی۔ وہ اکثر بڑبڑاتا۔ ”ٹیم مشکلات میں گھری ہے اور جسے سب سے زیادہ معاوضہ مل رہا ہے، وہ ماڈلنگ کر رہا ہے۔“

چند اخبارات میں اس نوع کی خبریں بھی آئیں کہ بیکھم ڈھونگ کر رہا ہے۔ درحقیقت وہ مکمل طور پر فٹ ہے۔ ان افواہوں کو اُس اشتہار نے تقویت پہنچائی، جس میں بیکھم ٹریک پر دوڑتا ہوا نظر آیا۔

میدانوں میں لوٹنے کے بعد بھی وہ مسائل میں الجھا رہا۔ کارکردگی مایوس کن رہی۔ ٹریننگ سیشن سے غیر حاضری کا سلسلہ پھر شروع ہوگیا، جس کے لیے وہ ہمیشہ کوئی نہ کوئی جواز پیش کردیتا۔ غیر حاضری کے دنوں میں جب اس سے رابطے کی کوشش کی جاتی تو اس کا نمبر بند ملتا۔

ایلکس فرگوسن کی برداشت اب جواب دے گئی تھی۔ بالآخر 15 فروری 2003 کو آرسنل کے خلاف شکست کے بعد ڈریسنگ روم میں آتش فشاں پھٹ پڑا۔

اس روز کیا واقعہ ہوا؟ اس بابت حتمی طور پر کچھ کہنا مشکل ہے۔ فریقین نے اس پر کبھی لب کشائی نہیں کی، مگر افواہوں کے مطابق میچ کے اختتام پر جب بیکھم ڈریسنگ روم میں پہنچا، ایلکس نے پوری قوت سے اسے اپنا جوتا دے مارا۔ جوتا بیکھم کے ماتھے سے ٹکرایا۔ خون رسنے لگا۔ بعد میں زخم پر ٹانکے لگانے پڑے۔ بیکھم اتنے گہرے صدمے میں تھا کہ وکٹوریا کو اسے لینے گراؤنڈ آنا پڑا جو مسلسل بڑبڑا رہی تھی۔

گدو

دریائے سندھ کے دائیں کنارے پر جیکب آباد ضلع کشمور سے 12 کلومیٹر کی دوری پر واقع ہے۔ صوبہ سندھ، صوبہ بلوچستان اور صوبہ پنجاب کی سرحدیں یہیں آکر ملتی ہیں۔ یہ انڈس ہائی وے اور ریل کے ذریعے ملک کے دوسرے علاقوں سے ملا ہوا ہے۔ 1963 میں یہاں بیراج کی تعمیر مکمل ہوئی۔ جسے گدو بیراج کہا جاتا ہے۔ 1968ء میں واپڈا نے یہاں ایک تھرمل پاور اسٹیشن تعمیر کرنے کا منصوبہ بنایا۔ 1974ء میں 110 میگاواٹ کے دو یونٹوں نے کام شروع کردیا۔ یونٹ نمبر 3 نے 1980 میں کام شروع کردیا اس کی بجلی پیدا کرنے کی استعداد 640 میگاواٹ ہے۔

مرسلہ: احمد شاہ، حیدرآباد

انتظامیہ کی جانب سے اس واقعے کو من گھڑت قرار دیا گیا مگر کہتے ہیں ناں، دھواں وہیں سے اٹھتا ہے، جہاں آگ لگی ہو۔

اگلے دن ایک موقر اخبار نے سرخی لگائی ”دو ٹائی ٹینک ڈریسنگ روم میں ٹکرا گئے!“

ایک اور اخبار نے لکھا ”بیکھم اور ایلکس میں سے کوئی ایک رخصت ہونے کو ہے!“

عام خیال تھا کہ بیکھم کی مقبولیت کے سامنے ایلکس کو ہتھیار ڈالنے پڑیں گے مگر مینجمنٹ نے معاملات سنبھال لیے۔ مانچسٹر نے خاموشی سے سیزن پورا کیا۔ اگر یہ کہا جائے تو غلط نہیں ہوگا کہ اس واقعے کے بعد ٹیم کی کارکردگی میں بہتری آگئی۔ شاید کھلاڑیوں نے سوچا ہو، ڈریسنگ روم میں جوتے کھانے سے بہتر ہے کہ میدان میں جان مار لی جائے۔

دُور سے تو حالات ٹھیک ہی لگ رہے تھے، مگر اولڈ ٹریفڈ کے نزدیک جانے پر لاوے کی دہک واضح محسوس ہوتی تھی۔

کچھ ایسی ہی صورتِ حال اس محل میں بھی تھی جہاں دنیا کا مقبول ترین جوڑا مقیم تھا۔

وکٹوریا مسلسل بڑبڑا رہی تھی اور محل کی چمنی کسیلا دھواں اگل رہی تھی۔

☆☆☆

لندن کا شہزادہ اسپین کیسے پہنچا؟ ریال میڈرڈ انتظامیہ نے کس گھڑی اس سے رابطہ کیا؟ چار سال کے عوض 35 ملین ادائیگی کے معاملات کہاں طے پائے؟ ان سوالات کا جواب تلاش کرنا زیادہ دشوار نہیں۔

معاملے کا آغاز ڈریسنگ روم کے واقعے سے ہوا۔ پھر موسم گرما میں یہ خبر گردش کرنے لگی کہ یونائیٹڈ نے اُسے اسپینش کلب بارسلونا کو فروخت کرنے کا فیصلہ کرلیا ہے۔

''فروخت؟'' وکٹوریا آگ بگولا ہوگئی۔ ''کیا تم کوئی شے ہو۔ان کی ملکیت ہو؟''

بیکھم چپ رہا۔ وہ شدید صدمے میں تھا۔

''اب ان کی مرضی نہیں چلے گی۔'' وکٹوریا نے ٹھوس لہجے میں کہا۔ ''فیصلے ہماری مرضی سے ہوں گے۔''

یہ وکٹوریا ہی تھی جس نے ریال میڈرڈ کے صدر سے رابطہ کیا۔ فرانس کے ایک ہوٹل میں چند میٹنگز ہوئیں اور جون کے وسط میں وکٹوریا کی جانب سے اعلان کردیا گیا کہ اس کا خاندان انگلینڈ چھوڑ رہا ہے۔

اس فیصلے کو آڑے ہاتھوں لیا گیا۔ بیکھم کو شدید تنقید کا نشانہ بنا گیا، مگر وہ خاموش رہا۔ بھلا وہ کیسے بتاتا کہ اس کا دل تو آج بھی اولڈ ٹریفڈ میں دھڑکتا ہے مگر اب کلب کو اُس کی ضرورت نہیں رہی۔

جولائی میں وہ اسپین میں تھا۔ 25 ممالک سے تعلق رکھنے والے 500 صحافی وہاں موجود تھے۔ مداحوں کی تعداد تو ہزاروں میں تھی۔ کسی شہزادے کی مانند اس کی آؤ بھگت کی جارہی تھی۔

بیکھم سات نمبر کی جرسی پہننے کا عادی تھا، مگر ریال میڈرڈ میں یہ ممکن نہیں تھا۔ یہ نمبر اسپین میں دیوتا کی طرح پوجے جانے والے راؤل کے پاس تھا۔ سوائے 23 نمبر کی جرسی پر اکتفا کرنا پڑا۔

نئی زمین، نئی زبان، نئے لوگ۔ سب کچھ بدل گیا تھا مگر اسپین کی مہمان نوازی کے طفیل اسے ماحول سے ہم آہنگ ہونے میں زیادہ وقت نہیں ہوئی۔

جب کلب نے ٹریننگ سیشن کے لیے مشرق بعید کا رخ کیا تو بیکھم پر یہ انکشاف ہوا کہ جتنا وہ یورپ میں مقبول ہے، ایشیا بھی اُسے اتنا ہی چاہتا ہے۔ اب اسے سمجھ میں آیا کہ تجزیہ کار کیوں اُس کے اثرات کو ''ایک جنون، ایک دیوانگی'' کہا کرتے تھے۔

وکٹوریا بھی خوش تھی۔ ہر عورت کی طرح وہ شاپنگ کرنا چاہتی تھی، نیا گھر خریدنا چاہتی تھی اور پیسے کی کوئی کمی نہیں تھی۔

ریال میڈرڈ کے لیے کھیلنا انوکھا تجربہ رہا۔ اور کیوں نہ ہو۔ جس ٹیم کا کپتان راؤل ہو، جس میں مایۂ ناز فرانسیسی کھلاڑی زیڈان کھیل رہا ہو، جس کی جرسی برازیل کھلاڑی رونالڈو اور رابرٹو کارلوس نے پہن رکھی ہو، پرتگالی اسٹار فیگو جس کا حصہ ہو، اس ٹیم سے کھیلنا انوکھا تجربہ ہی تو ہے۔

بیکھم کی شمولیت کے بعد جیسے ریال میڈرڈ کو پر لگ گئے۔ انہوں نے اسپینش سپر کپ میں کامیابی حاصل کی۔ بیکھم کی ٹھوکروں نے ہسپانوی عوام کو سحر میں لے لیا۔ ایک کے بعد ایک اُس نے شان دار گول داغے۔

موسم بدل رہے تھے۔ اسپین اِس جوڑے کو راس آگیا۔ بیکھم نے ایک شان دار گھر خریدا۔ بیٹے کا داخلہ ایک اچھے اسکول میں کروایا۔ اشتہاری کمپنیوں کی جانب سے فون کال موصول ہونے لگیں۔ انگلش میڈیا کے برعکس اسپین والے مہربان ثابت ہوئے۔ وہ اس کی بابت اچھی خبریں چھاپنے میں دلچسپی رکھتے تھے۔ جس ریسٹورنٹ میں وہ کھانا کھانے جاتا، وہاں کے مالکان اس سے پیسے وصول نہیں کرتے۔

یوں لگتا تھا جیسے زندگی پر سکون اتر آیا ہو۔ ہر شے ترتیب میں تھی۔ ہر لمحہ خوشی کا لمحہ تھا۔ لندن کا یہ فسوں گر اب ہسپانویوں کے دل میں دھڑک رہا تھا لیکن صورت حال ہمیشہ ایسی نہیں رہنے والی تھی۔ اسپین میں بھی بیکھم کے لیے مشکلات کھڑی ہوتی تھیں۔

☆☆☆

مقبول ہونے کا مطلب نیک نام ہونا نہیں۔ شہرت تو ایک ایسا مقناطیس ہے، جس کی کشش سے تنازعات کھنچے چلے آتے ہیں۔

یوں تو تنازعات کا آسیب برسوں سے اس کے تعاقب میں تھا، مگر اپریل 2004 میں جنم لینے والے اسکینڈل نے اُس کی ازدواجی زندگی میں زہر گھول دیا۔

مسالے دار خبروں کے لیے معروف ایک برطانوی جریدے میں بیکھم سے متعلق ایک تہلکہ خیز اسٹوری شائع ہوئی۔ جس میں اس کے اپنی سابق سیکریٹری رابیکا سے جسمانی تعلقات کا انکشاف کیا گیا تھا۔ اسٹوری کے ساتھ خوبرو رابیکا کی تصاویر بھی تھیں۔ جن میں نم آنکھیں لیے وہ اس معاشقے کی تفصیلات فراہم کررہی تھیں۔

پریس کے سامنے اس اسکینڈل کو سستی شہرت حاصل کرنے کی کوشش قرار دینے والے بیکھم کے لیے وکٹوریا کو سمجھانا کسی طور سہل نہیں تھا۔ اس کی بیوی شدید صدمے سے دوچار تھی۔

ابھی اس واقعے کی گرد نہیں بیٹھی تھی کہ سارا ماریک نامی ایک شوخ ماڈل سامنے آگئی، جس نے قہقہے لگاتے ہوئے دنیا کے مقبول ترین شخص سے اپنے تعلقات کی جزئیات بیان کرنی شروع کردیں۔

اسکینڈلز کی اس بھرمار نے بیکھم کی شہرت کو شدید نقصان پہنچایا۔ اسے ایک بے وفا شوہر کے طور پر پیش کیا جانے لگا۔

میاں بیوی کے رشتے میں بھی سرد مہری در آئی۔ وہ ایک چھت کے نیچے دو اجنبیوں کی طرح رہنے لگے۔ بیکھم کو تو لگنے لگا تھا کہ ان کا رشتہ اپنے اختتام کو پہنچ چکا ہے، مگر پھر چند دوستوں کی مدد سے اس نے اپنی بیوی کو قائل کرلیا کہ مقبول شخصیات پر اس قسم کے الزامات نئی بات نہیں، انہیں دل سے لگا کر بیٹھنا جان لیوا ثابت ہوسکتا ہے۔

بات وکٹوریا کی سمجھ میں آگئی۔ الزامات کا سلسلہ آنے والوں برسوں میں بھی جاری رہا، مگر وکٹوریا نے اپنے رشتے کو ایک ذہین عورت کی طرح سنبھالے رکھا۔ اور ویسے بھی علیحدگی سراسر گھاٹے کا سودا ہوتا۔ ایسے مقبول اور امیر کبیر شوہر کا حصول لک بھگ ناممکن تھا۔ فقط بیکھم ہی اس کے مہنگی گاڑیوں کے شوق کو پورا کرسکتا تھا۔

☆☆☆

مانچسٹر یونائیٹڈ سے تو ناتا ٹوٹ گیا مگر انگلینڈ کی قومی ٹیم کا تو وہ کپتان تھا ناں، جس کی ناقص کارکردگی کی ذمے داری اُسی پر عائد ہوتی تھی۔

2004 کا یورو کپ ڈراؤنا خواب ثابت ہوا۔ کوارٹر فائنل میں پرتگال نے انگلینڈ کو نکال باہر کیا۔ اس ناکامی کے لیے بیکھم ہی کو ذمے دار ٹھہرایا گیا اور ہونا بھی یہی چاہیے تھا۔ وہ گول داغنے کے معاملے میں بدبخت ثابت ہوا۔

اس شکست کے بعد کئی بڑے برانڈز نے اس سے معاہدے کینسل کردیے۔

انٹرنیشنل کیریئر میں بدقسمتی آنے والے دنوں میں بھی تعاقب کرتی رہی۔ 2005 میں آسٹریا کے خلاف میچ میں اسے ریڈ کارڈ کا تحفہ ملا۔ یوں وہ انگلینڈ کی تاریخ کا پہلا کپتان ٹھہرا جسے میدان بدر کیے جانے کی ذلت برداشت کرنی پڑی۔ ساتھ ہی انگلینڈ کی تاریخ کا پہلا بدبخت بھی قرار پایا جسے دوبار ریڈ کارڈ سے نوازا گیا۔

اس واقعے نے اس کی شہرت کو داغ دار کردیا۔ اسے کپتانی سے برخاست کرنے کا مطالبہ زور پکڑنے لگا مگر ورلڈ کپ سر پر پہنچ چکا تھا۔ انگلینڈ کسی بڑی تبدیلی کا متحمل نہیں ہوسکتا تھا۔ اُسے کپتان برقرار رکھا گیا۔

ورلڈ کپ کا آغاز مثبت رہا۔ انگلینڈ نے تینوں میچز میں مخالف ٹیم کو خاک چٹائی۔ بیکھم کی کارکردگی بھی اچھی رہی۔ مگر ناک آؤٹ مرحلے کا آغاز ہوتے ہی اس کی طبیعت بگڑ گئی۔

یہ ایک بڑا دھچکا تھا۔ گو وہ میچ کھیلنے کے قابل نہیں تھا مگر اپنی ٹیم کی حوصلہ افزائی کے لیے میدان میں اتر آیا جہاں اس نے فری کک پر ایک جادوئی گول داغ کر انگلینڈ کو کوارٹر فائنل میں پہنچا دیا۔

اب مقابلہ پرتگال سے تھا اور بیماری بیکھم کو نقاہت کی کھائی میں دھکیل چکی تھی۔ میچ کا بڑا حصہ اس نے باہر بیٹھ کر گزارہ۔ میدان میں اترنے کے بعد وہ پرفارم نہیں کرسکا۔ اُس سے چلا بھی نہیں جارہا تھا۔ بے بسی کی اس کیفیت نے اسے توڑ دیا۔ آنکھوں میں نمی اتر آئی، جسے ٹی وی کیمروں نے قید کرلیا۔

اپنے عہد کا مقبول ترین کھلاڑی رو رہا تھا اور میچ کے اختتام تک پورا انگلینڈ آنسوؤں میں بھیگ چکا تھا۔ پینالٹی شاٹس پر انگلینڈ کو شکست کا سامنا کرنا پڑتا۔

مداحوں کا غم اس وقت دوچند ہوگیا جب شکست کے بعد بیکھم نے نم آنکھوں کے ساتھ کپتانی چھوڑنے کا اعلان کر دیا۔

''قومی ٹیم کی قیادت کرنا ایک اعزاز ہے۔ میں نے اپنی بھرپور کوشش کی اور اب...'' اس کی آواز لڑکھڑا رہی تھی۔ ''میں سمجھتا ہوں کہ دوسروں کو موقع ملنا چاہیے۔''

صدمے سے نڈھال مداحوں کی جانب سے فیصلہ واپس لینے کا پُرزور مطالبہ کیا گیا، مگر بیکھم حتمی فیصلہ کرچکا تھا۔

اور یہ فیصلہ خطرناک ثابت ہوا۔ قومی ٹیم کو نئے کوچ اسٹیو میکلرین کے حوالے کردیا گیا تھا، جو بیکھم کی مقبولیت اور اثر ورسوخ سے خاصا متنفر تھا۔ بیکھم کا فیصلہ اس کے لیے کسی نعمت سے کم نہیں تھا۔ لوہا گرم دیکھ کر اس نے چوٹ کرنے کا فیصلہ کیا اور انتظامیہ پر دباؤ ڈال کر اس عظیم کھلاڑی کی ٹیم سے چھٹی کروادی۔ ساتھ ہی یہ بیان بھی داغ دیا۔ ''انگلینڈ کو آگے بڑھنے کے لیے اپنے ماضی سے جان چھڑانی ہوگی۔''

اگلی بار جب انگلینڈ کی ٹیم میدان میں اتری، اس میں بیکھم شامل نہیں تھا۔ وہ میلوں دور اسپین میں بیٹھا تھا اور اس کے کمرے میں اداسی رینگ رہی تھی۔

☆☆☆

اداسی کی دبیز چادر نے بیکھم کے انٹرنیشنل کیریئر کو ڈھانپ رکھا تھا۔ گو مئی 2007 میں برازیل کے خلاف دوستانہ میچ میں اسے قسمت آزمانے کا موقع ملا اور اس نے پرفارم بھی کیا مگر اگلے موقع کے لیے پھر کئی ماہ انتظار کرنا پڑا۔

یاسیت سے تنگ آکر وکٹوریا نے یہ مشورہ دے ڈالا کہ اب اُسے انٹرنیشنل فٹبال سے ریٹائرمنٹ کا اعلان کر دینا چاہیے۔

فٹبال کے عشق میں مبتلا بیکھم کے لیے یہ مشورہ قبول کرنا سہل نہیں تھا۔ اس بات پر میاں بیوی کا جھگڑا بھی ہوا۔

یورو 2008 کا آغاز ہونے کو تھا۔ بیکھم کو ٹیم میں شامل کرنے کا مطالبہ زور پکڑنے لگا۔ عوامی دباؤ کے پیش نظر اسے اسکواڈ میں تو شامل کر لیا گیا، مگر ٹورنامنٹ میں صلاحیتوں کے جوہر دکھانے کا موقع فراہم نہیں کیا گیا۔

متعصب کوچ کو اپنے اس فیصلے کا خمیازہ بھگتنا پڑا۔ انگلینڈ فائنل تک رسائی میں ناکام رہا۔ ٹیم کو منہ لٹکائے گھر لوٹنا پڑا۔

ڈیوڈ بیکھم اپنے 100 ویں میچ سے فقط ایک قدم دور تھا اور تب یہ خوش کن خبر آئی کہ فیبیو کاپالو کو انگلینڈ کا کوچ مقرر کیا جا رہا ہے۔ ماضی میں ریال میڈرڈ کے لیے فرائض انجام دینے والا فیبیو ایک سخت گیر شخص تھا مگر وہ صلاحیت کی قدر کرتا تھا اور اُسے یقین تھا کہ بیکھم میں ابھی بہت کمال باقی ہے۔

اسپین پر اترنے والی ایک خنک شام بیکھم کو فیبیو کا بلاوا موصول ہوا۔ اسے سوئٹزرلینڈ کے خلاف میدان میں اتارا گیا اور یوں اُس نے میچز کی سنچری مکمل کرنے کا اعزاز اپنے نام کیا۔

بلاشبہ وہ ایک خوشگوار دن تھا مگر اس میچ کے دوران پہلی بار یہ احساس بیکھم کے دل میں جڑ پکڑنے لگا کہ شاید اب وہ انٹرنیشنل فٹبال کھیلنے کے قابل نہیں رہا۔ شاید وہ اپنی رفتار کھو چکا تھا۔ شاید اس کا سحر ٹوٹ رہا ہے۔

☆☆☆

جب اپنے ہی ساتھ نہ دیں، تو غیروں سے کیا شکوہ۔

اسپین بیکھم کی جادوئی ٹھوکروں کا مداح تھا لیکن ریال میڈرڈ کی نئی انتظامیہ کو اس کی مقبولیت ایک آنکھ نہیں بھاتی تھی۔ وہ اس سے جان چھڑانے کا سوچ رہی تھی۔

اسے ڈراپ کرنے کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ ڈھکے چھپے الفاظ میں تنقید بھی کی گئی اور بیکھم کو محسوس ہونے لگا تھا کہ اسپین سے اس کا تعلق ٹوٹنے کو ہے۔

2007 کے موسم سرما میں کلب کے نئے اسپورٹس ڈائریکٹر نے یہ بیان داغ کر کہ انتظامیہ بیکھم کے معاہدے میں توسیع کا ارادہ نہیں رکھتی، ایک تنازعہ کھڑا کر دیا۔

اس بیان پر شدید تنقید کی گئی۔ بعد میں ڈائریکٹر صاحب اس بیان کو زبان کی لغزش قرار دیتے نظر آئے۔

بہ ظاہر معاملہ دب گیا مگر بیکھم زیرِ زمین موجود لاوے کی حدت محسوس کر رہا تھا۔ اپنی بیوی سے مشورہ کیے بغیر، اپنے منیجر کی صلاح لیے بغیر اس نئے زمینوں کی سمت سفر کا فیصلہ کیا اور اس بار اس کی منزل خوابوں کی سرزمین امریکا تھی۔

امریکا میں فٹبال کا کھیل زیادہ مقبول نہیں۔ عام طور سے وہ ہی بین الاقوامی فٹبال پلیئر امریکا کا رخ کرتے ہیں، جن کا کیریئر اختتام کو پہنچ چکا ہو، لیکن بیکھم تو ابھی فقط 32 سال کا تھا، انتہائی پھرتیلا، انتہائی مقبول۔ تو آخر اس نے ایسا فیصلہ کیوں کیا؟

اس سوال کا جواب اس نے کبھی نہیں دیا اور اس کی خاموشی نے مخالفین کو زبان درازی کا موقع فراہم کر دیا۔

انگلش پریس تو یہ تک کہہ گیا کہ امریکا کا رخ کرنے کا فیصلہ دراصل ریٹائرمنٹ کا فیصلہ ہے۔ ”جادوگر تھک چکا ہے!“

جب ریال میڈرڈ کے کوچ سے بیکھم کے لاس اینجلس گیلکسی کا حصہ بننے کی بابت سوال ہوا، اس نے استہزائیہ مسکراہٹ کے ساتھ جواب دیا۔ ”شاید وہ ہالی ووڈ میں قسمت آزمانے جا رہا ہے۔ خیر، ہم معاہدے کی توسیع کا ارادہ نہیں رکھتے تھے۔ بیکھم لاس اینجلس کو مبارک ہو۔“

یہ بات تو طنزاً کہی گئی تھی، مگر لاس اینجلس کے لیے بیکھم کسی تحفے سے کم نہیں تھا۔ جس روز اسے کلب کی جرسی پیش کی گئی، اسٹیڈیم تماشائیوں سے بھرا ہوا تھا۔ وہاں کئی بین الاقوامی شخصیات موجود تھیں۔ دنیا بھر کا میڈیا تقریب کو کور کر رہا تھا۔

عہد کے مقبول ترین کھلاڑی کی موجودگی نے یکدم امریکا میں فٹبال کو جنون کی شکل دے دی۔ اشتہاری کمپنیوں کو بھی ایک سپر ماڈل مل گیا، جسے دنیا بھر میں پہچانا جاتا تھا۔ 32.5 ملین کے عوض اس نے پانچ برس کے لیے اس کلب سے معاہدہ کیا تھا۔

ناقدین کو لگتا تھا کہ یہ بیکھم کا آخری پڑاؤ ہے۔ مگر وہ غلط تھے۔ وہ ہنوز کچھ انوکھا کرنے کے لیے تیار تھا۔

☆☆☆

وہ ایک چھوٹا سا قصبہ تھا۔ صبح کا وقت تھا۔ ایک بچی اپنی ماں کا ہاتھ تھامے سڑک سے گزر رہی تھی۔ بارش کو تھمے کچھ ہی وقت ہوا تھا۔ سڑک تا حال گیلی تھی۔ بایاں کنارہ نشیب میں تھا جہاں قطار سے درخت تھے۔ درختوں کے پہلو سے دریا بہتا تھا۔

سڑک لگ بھگ سنسان تھی۔ ماں بیٹی کے علاوہ فقط ایک آدمی وہاں جاگنگ کر رہا تھا۔

اچانک ایک تتلی منظر میں داخل ہوئی۔ بچی کے چہرے پر تجسس کا جنم ہوا۔ وہ ماں کا ہاتھ چھوڑ کر آگے بڑھی۔ تتلی درختوں کی سمت مڑ گئی۔ بچی کا توازن بگڑا۔ اس کا پیر پھسلا اور وہ گیلی گھاس سے ہوتی ہوئی درختوں کے سمت بڑھنے لگی، جس کے ساتھ دریا بہہ رہا تھا۔

عورت کے چہرہ کا رنگ بدل گیا۔ منظر میں اس کی چیخ منجمد ہو گئی۔

بچی نے ایک درخت کی شاخ تھام رکھی تھی۔ اس کے پیروں پر سے دریا کا پانی گزر رہا تھا جس کا بہاؤ تیز تھا۔

سڑک پر موجود آدمی نے جست لگائی۔ اگلے ہی پل وہ درخت کا تنا تھامے کھڑا تھا۔ اس نے بچی کو گود میں اٹھا لیا اور دھیرے دھیرے اوپر آ گیا۔

عورت نے بچی کو گلے لگا لیا۔ اس کی آنکھوں میں نمی تھی۔ بچی بھی رو رہی تھی۔ اچانک عورت کو اجنبی کا شکریہ ادا کرنے کا خیال آیا۔ اس نے سر اٹھایا۔ اجنبی آگے بڑھ گیا تھا۔

”آپ کا بہت بہت شکریہ۔“ وہ چلّائی۔

وہ مڑا اور مسکرایا۔ اس کے سنہرے بالوں میں بارش کی نمی تھی۔ چہرہ دیوتا سا تھا۔

پورے راستے عورت یہ سوچتی رہی کہ شاید وہ اس شخص کو پہلے بھی دیکھ چکی ہے۔

اجنبی کون تھا؟ یہ عقدہ میز پر پڑے اخبار سے کھلا، جس پر اس کی تصویر تھی نیچے جلی حروف میں لکھا تھا۔ ”دنیا کے مقبول ترین فٹبالر کی قصبے میں آمد، مداحوں کا جشن!“

ہاں وہ اپنے عہد کا عظیم فٹبالر ڈیوڈ بیکھم تھا، مگر اس.... عورت کے لیے وہ ایک مسیحا تھا، جس نے اس کی بیٹی کو موت کے منہ سے نکالا۔

بیکھم تو اگلے ہی دن لاس اینجلس لوٹ گیا، مگر یہ واقعہ کافی عرصے قصبے میں زیر بحث رہا اور پھر اس علاقے کی سادہ زندگی کا حصہ بن کر خاموش ہو گیا۔

☆☆☆

”ڈیوڈ بیکھم ریکارڈز کے آئینے میں“

عظیم بیکھم نے اپنے چودہ سالہ انٹرنیشنل کیریئر میں 115 مقابلوں میں انگلینڈ کی نمائندگی کی۔ 59 میچوں میں قیادت کے فرائض سرانجام دیے۔ اس سفر میں اس نے 17 گول داغے جن میں سے ہر ایک اپنی مثال آپ تھا۔

انٹرنیشنل کیریئر کے بعد بات ہو جائے پروفیشنل فٹبال کی۔ وہ مانچسٹر یونائیٹڈ کی جانب سے پریمیئر لیگ کے 265 مقابلوں میں اترا، جہاں اس نے 61 گول داغ کر چھ بار اپنی ٹیم کو ٹائٹل جتوایا۔ یونائیٹڈ کی طرف سے کھیلتے ہوئے اس نے چیمپیئنز لیگ کے 81 مقابلوں میں جادو جگایا، جہاں اس نے 15 گول اسکور کیے۔

وہ چار ممالک (انگلینڈ، اسپین، امریکا اور فرانس) کی طرف سے کھیلتے ہوئے لیگ ٹائٹل جیتنے والا پہلا انگریز اور لگاتار تین ورلڈ کپ میں گول اسکور کرنے والا اپنے ملک کا پہلا کھلاڑی ہے۔ وہ ان پانچ منفرد کھلاڑیوں میں شامل ہے، جن کی فری کک نے دورانِ ورلڈ کپ دو بار گیند کو نیٹ میں پہنچایا۔ ساتھ ہی وہ پہلا برٹش فٹ بالر ہے، جس نے 100 چیمپئن لیگ میچز کھیلے۔ کارکردگی کے نقطۂ نگاہ سے اس کا شمار انگلش فٹبال کے مہان کھلاڑیوں میں ہوتا ہے اور جہاں تک مقبولیت کا تعلق ہے، کوئی اس کا مقابلہ نہیں کر سکتا۔

ہالی وڈ امکانات کی دنیا تھی اور وہ امکانات کا تعاقب کرنا جانتا تھا۔ شاید مخالفین ٹھیک کہتے تھے، وہ امریکا میں فلم اسٹار بننے آیا تھا!

جلد ہی وکٹوریا اور بیکھم نے ہالی ووڈ میں جگہ بنا لی۔ کسی تقریب میں وہ ٹام کروز کے ساتھ نظر آتا، کسی میں جولیا رابرٹس اس کے پہلو میں کھڑی ہوتی۔

ماڈلنگ اسائنمنٹ بھی دھڑا دھڑ ملنے لگے، جس کے لیے بھاری معاوضہ ادا کیا جاتا۔ لاس اینجلس گیلکسی کے میچز میں مداحوں کی تعداد بھی اب خاصی بڑھ گئی تھی۔ انگلینڈ سے بھی اچھی خبریں ملیں۔ نیا کوچ اسے ورلڈ کپ کے کوالیفائنگ راؤنڈز کھیلنے والے اسکواڈ میں دیکھنا چاہتا تھا۔

مقابلوں کے آغاز سے قبل اُس کے لیے خصوصی تقریب کا اہتمام کیا گیا۔ حاضرین نے کھڑے ہو کر اسے داد دی۔ لیجنڈ تصور کیے جانے والے بوبی چارلٹن کے ہاتھوں اس نے شیلڈ وصول کی۔

کوالیفائنگ راؤنڈز میں اس کی کارکردگی شان دار

رہی۔ کوچ کی جانب سے اُسے ایک دوستانہ میچ کی کپتانی بھی سونپ دی گئی۔ یہ ایک بڑا واقعہ تھا۔ کہاں اسے ٹیم سے ڈراپ کردیا گیا تھا اور کہاں اب وہ کپتانی کا فریضہ نبھا رہا تھا۔

جب اس بابت صحافیوں نے سوال کیا، وہ مسکرا کر رہ گیا۔ اب وہ کڑھنا چھوڑ چکا تھا۔ خود کو سمجھا لیا تھا کہ جتنا وقت بچا ہے، ہنستے مسکراتے گزار لو۔

ورلڈ کپ 2010 کے اسکواڈ میں بیکھم شامل نہیں تھا۔ مگر اس کا سبب اختلافات نہیں تھے، بلکہ انجری تھی۔ کوالیفائنگ راؤنڈ کے ایک مقابلے میں وہ شدید زخمی ہوگیا۔ البتہ اپنے ساتھیوں کا حوصلہ بڑھانے کے لیے ورلڈ کپ اسکواڈ کے ساتھ جنوبی افریقا ضرور گیا۔

مقابلے میں انگلینڈ نے ناقص کارکردگی کا مظاہرہ کیا۔ حسبِ روایت شکست کے بعد کوچ نے تمام ملبا سینئر کھلاڑیوں پر ڈال دیا۔ بیکھم بھی جو پہلے ہی زخموں کی وجہ سے ٹیم سے باہر تھا، اس کی زد میں آیا۔ جب کوچ نے ٹیم میں نیا خون شامل کرنے کا اعلان کیا، تو ساتھ ہی بیکھم کی بابت بھی تبصرہ کرنا ضروری جانا۔

"اب وہ پینتیس برس کے ہوگئے ہیں۔ ان کا وقت پورا ہوگیا ہے۔ اگر وہ فٹ ہوئے۔ تو ہم انہیں ایک دوستانہ میچ میں اتار سکتے ہیں، تاکہ مداح انہیں الوداع کہہ سکیں۔"

اس تلخ بیان کے جواب میں بیکھم نے فقط اتنا کہا۔ "میرا ریٹائرمنٹ کا کوئی ارادہ نہیں۔ میں قومی ٹیم کی خدمت کے لیے ہمیشہ تیار ہوں۔"

کیا بیکھم واقعی تیار تھا؟ شاید نہیں۔ شاید اس کا انٹرنیشنل کیریئر اختتام کو پہنچ چکا تھا۔ سچ تو یہ ہے کہ وہ لاس اینجلس گیلکسی سے بھی الگ ہونے کا سوچ رہا تھا۔

موسم خزاں میں بیکھم نے یہ اعلان کر کے کہ وہ فرانسیسی کلب پیرس سینٹ جرمین کا حصہ بننے جارہا ہے، دنیا کو ورطۂ حیرت میں ڈال دیا۔

وہ ایک بار پھر نئی زمین پر تھا جہاں اس کی آمد نے جشن برپا رکھا تھا، مگر بیکھم خاموش تھا۔ بالکل خاموش۔

ہاں... یہ آخری پڑاؤ تھا۔

☆☆☆

اسٹیڈیم میں تل دھرنے کی جگہ نہیں تھی۔ تماشائیوں کا جوش عروج پر تھا۔ وہ نعرے لگا رہے تھے، اس عظیم کھلاڑی کے لیے جو آج آخری بار ایکشن میں نظر آرہا تھا۔

وہ 18 مئی 2013 کی شام تھی۔ آخری شام جب گیند کو جادوئی ٹھوکر لگانے والا ڈیوڈ بیکھم میدان میں ہمیشہ کی طرح ایک بار پھر اس نے اپنی بھرپور صلاحیت مظاہرہ کیا۔ اس کے حیرت انگیز پاس پر فارورڈ نے شان گول داغا۔ جشن میں بھی وہ شامل ہوا، مگر جوں جوں وقت رہا تھا، اختتامی لمحات قریب آرہے تھے، وہ ست پڑتا جس کا سبب تھکن نہیں تھی، بلکہ وہ صدمہ تھا، جس نے اس روح کو دہلا ڈالا تھا۔

وہ اپنی محبوبہ سے دور جارہا ہے۔ آج فٹبال کے مید سے رشتہ ٹوٹنے کو تھا۔

جوں ہی اختتامی سیٹی بجی، اسٹیڈیم میں اُس نام کا نعرہ بلند ہوا۔ ٹیم کے کھلاڑیوں نے آگے بڑھ اسے گلے لگالیا۔

اس کی آنکھوں میں آنسو تھے۔ وہ ہچکیاں لے رہا وی آئی پی انکلوژر میں بیٹھی وکٹوریا بھی رو رہی تھی... اور کروڑوں افراد کی آنکھوں میں بھی نمی تھی، جو اس سے م کرتے تھے۔

وہ جذبات سے لبریز دن تھا۔ اپنے عہد کے مق ترین کھلاڑی کا کیریر اپنے اختتام کو پہنچ چکا تھا۔ اور یہ بہت اچانک ہوا۔ بس ایک دن اس نے اعلان کردیا ک ریٹائرمنٹ کا فیصلہ کرچکا ہے۔

18 مئی 2013 کو بیکھم نے اپنا آخری میچ کھیلا۔ یوں ایک عہد تمام ہوا۔

☆☆☆

ڈیوڈ بیکھم... اپنے زمانے کا امیر ترین فٹبالر، اپنے کا مقبول ترین کھلاڑی، کروڑوں دلوں کی دھڑکن، معروف اور متنازعہ بھی... کیا ایسا کھلاڑی خبروں سے دور رہ سکتا۔ شاید نہیں!

اشتہاری کمپنیاں تاحال اس کے تعاقب میں ہیں درجنوں پبلشرز اس کے خیالات کو کتابی شکل دینے خواہش مند ہیں۔ ساتھ ہی یہ اطلاعات بھی ہیں کہ انڈ فٹبال لیگ کی انتظامیہ نے اسے دوبارہ میدان میں قدم رکھنے دعوت دے ڈالی ہے۔

اپنے کسرتی بدن کو ٹیٹوز سے سجانے والے اس فسوں کا مستقبل کیا ہوگا؟ یہ جاننے کے لیے تھوڑا انتظار کرنا پڑے مگر یہ طے ہے کہ وہ جلد ایک دھماکا کرے گا۔ دنیا کو دو حیرت میں ڈال دے گا کہ یہی اس کی عادت ہے۔

آوازوں کا خزینہ

شکیل صدیقی

اس کا شوق جداگانہ تھا۔ اس نے پاکستان کی تاریخ میں ایک ایسا کارنامہ انجام دیا ہے کہ آنے والی پود بھی ممنون ومشکور رہے گی۔ اس نے صرف اپنے زورِ بازو پر آوازوں کا ایک ایسا خزانہ جمع کررکھا ہے جس کی طرف ہر کوئی للچائی نظروں سے دیکھ رہا ہے۔ برٹش براڈ کاسٹنگ کارپوریشن تک منہ مانگی قیمت دینے پر تیار ہے۔

ایسے قابلِ فخر انسان کا تذکرہ جس کا تعلق اسی شہر کراچی سے ہے
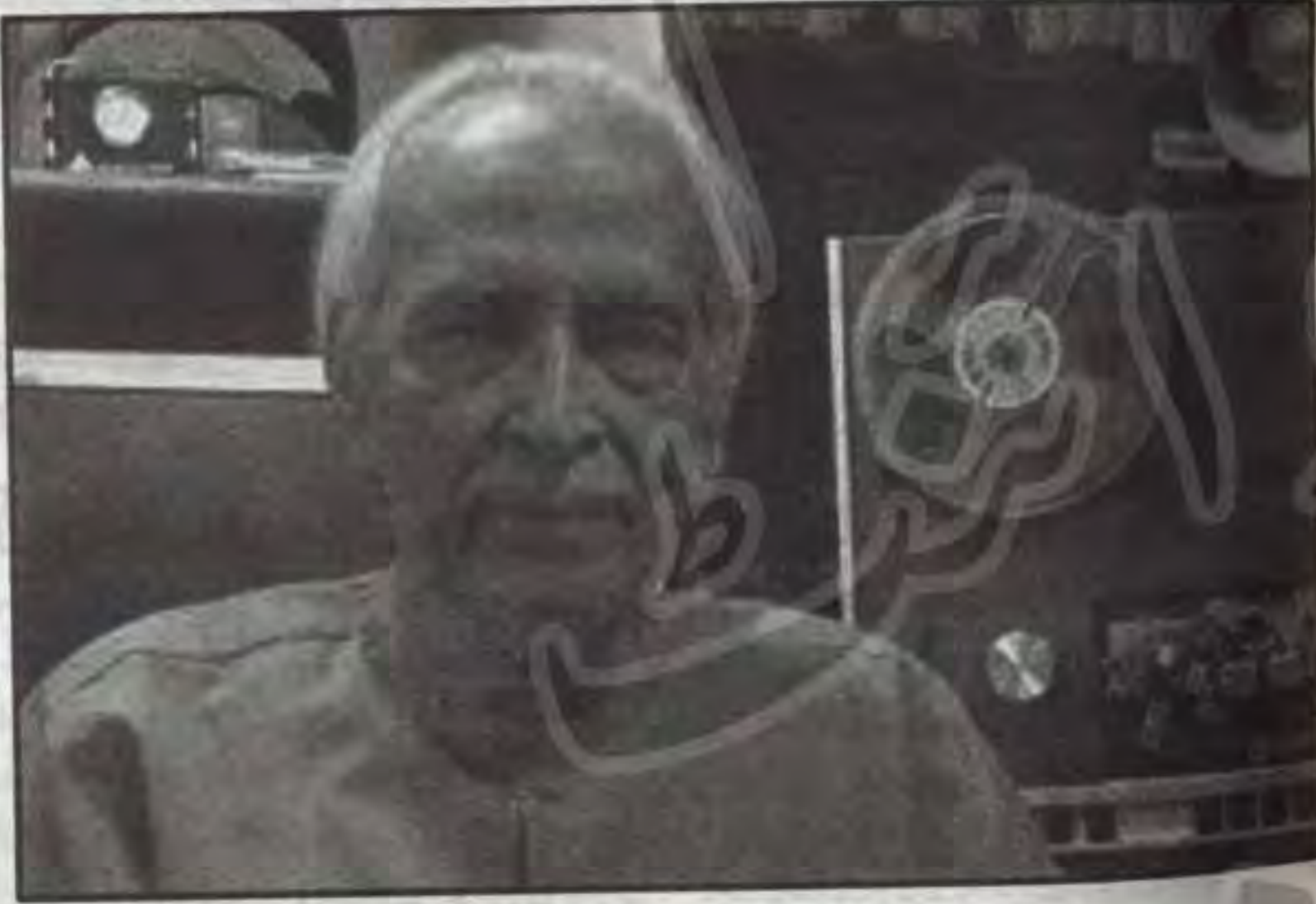
وہ 25 نومبر 1916ء میں چنائی، مدراس میں پیدا ہوئے۔ والدین نے ان کا نام لطف اللہ رکھا۔ انہیں بچپن ہی سے موسیقی اور گائیکی کا شوق تھا۔ دوستوں اور واقف کاروں نے ان کی آواز سن کر حوصلہ افزائی کی تو انہوں نے باقاعدہ موسیقی کی تعلیم حاصل کی، ورنہ اس سے پیشتر وہ مشہور کلاسیکی گلوکاروں کی نقل اتارا کرتے تھے۔ ۱۹ برس کی عمر میں انہوں نے انڈیا اسٹیٹ براڈ کاسٹنگ سروس کے تحت عوامی سطح پر اپنے فن کا مظاہرہ بھی کیا۔ اس سروس کا نام بعد میں تبدیل کر

کے آل انڈیا ریڈیو رکھ دیا گیا۔ انہیں مضامین بھی لکھنے کا شوق تھا۔ چنانچہ ان کے کئی مضامین رسائل اور روزناموں میں شائع ہوئے۔ جب ان مضامین کی تعداد میں اضافہ ہوگیا تو وہ مجموعے کی شکل میں بھی شائع ہوا۔ اس مجموعے کا نام ''پہلو'' تھا۔ وہ فروخت کے اعتبار سے کوئی ریکارڈ تو قائم نہیں کرسکا، لیکن اس پر نیاز فتح پوری کے ماہنامے ''نگار'' میں تبصرہ ضرور شائع ہوا۔ لطف اللہ کا خیال تھا کہ ایک بڑے ادبی پرچے نے اس کو تبصرے کے قابل سمجھا، یہ بڑی بات تھی۔ جب لطف اللہ کو فلمیں دیکھنے کا شوق ہوا تو انہوں خوب فلمیں دیکھیں، لیکن اس کے ساتھ ہی انہوں نے فلموں پر تبصرے بھی لکھنا شروع کر دیے اور فلموں کے نقاد بن گئے۔ اسی زمانے میں فوٹوگرافی کا شوق ہوا تو انہوں نے ایک کیمرا خرید لیا اور اپنے شوق کی تکمیل کرنے لگے۔ ان کے تمام شوقوں کا سنجیدگی سے جائزہ لیا جائے تو ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ان کے سامنے کوئی واضح منزل نہیں تھی۔ ابھی تک انہیں خود نہیں معلوم تھا کہ کرنا کیا ہے اور کیسے کرنا ہے۔

ان کے والد ریلوے گارڈ تھے اس لیے لوگ انہیں ''گارڈ صاحب'' کہا کرتے تھے۔ جب وہ ریٹائر ہوئے تو چیف گارڈ کے عہدے تک پہنچ چکے تھے۔ وہ پٹھان خاندان سے تعلق رکھتے تھے جو شمالی علاقے سے ہجرت کر کے مدراس میں سکونت پذیر ہوگیا تھا۔ ان کے والد کو سماجی طور پر کوئی اعلیٰ وارفع مقام حاصل نہیں تھا۔ انہیں صرف دو چیزوں سے محبت تھی، نماز اور مطالعۂ قرآن۔ وہ جماعت کے ساتھ نماز پڑھتے تھے اور گھر میں بیٹھ کر قرآن مجید کا مطالعہ کرتے تھے۔ ان کے پاس مذہبی کتابوں کا اچھا خاصا ذخیرہ تھا۔ وہ طبعاً سخت گیر تھے اور اپنے اصولوں پر کوئی مصالحت نہیں کرتے تھے۔ ان کے اصول پتھر پر لکیر کی مانند تھے اور کوئی ان سے روگردانی نہیں کرسکتا تھا۔ لطف اللہ ان کی ساتویں اولاد تھے، ان سے پیشتر چھ بچے جانبر نہ ہوسکے۔ وہ لطف اللہ کو سخت نگرانی میں رکھتے تھے۔ وہ جب اسکول جاتے تھے تو انہیں ہدایت تھی کہ سیدھے گھر آئیں اور اِدھر اُدھر وقت ضائع نہ کریں۔ مغرب کے بعد انہیں گھر سے باہر رہنے کی اجازت نہیں تھی۔ انہیں انگریزی طرز کے بال رکھنے کی بھی ممانعت تھی۔ وہ لطف اللہ سے محبت تو کرتے تھے، لیکن اس کا والہانہ اظہار نہیں کرتے تھے۔

جب وہ سات برس کے تھے تو ان کے والد جو ریلوے میں گارڈ تھے، کا تبادلہ تجاور نامی شہر میں ہوگیا۔ وہ شہر مدراس کے جنوب میں 242 میل کے فاصلے ہے۔ تجاور نہ صرف ایک تجارتی مرکز ہے، بلکہ بزرگان کی سرزمین بھی۔ اسی لیے یہ مرکز تجلیات کے نام سے موسوم ہے۔ ایک طرف اولیا کرام کے مزارات ہیں تو کے ساتھ ہی دیوہیکل مندروں کی بھی بہتات ہے۔ اسی دور ونزدیک سے نفس کی ریاضتیں کرنے والے اور مجاہد کے طلب گار وہاں جاتے ہیں۔ جو مراقبہ کرتے ہیں ان ذکر کرنے کی گونج دور تک سنائی دیتی ہے۔ وہاں تین ان کا قیام رہا اور اس عرصے میں انہوں نے پرائمری اسک کی تعلیم حاصل کی اور روحانی طور پر بھی فیض یاب ہو رہے۔ ان کے والدین کا مسلک اور تھا، لیکن لطف مزارات کے چکر کاٹا کرتے تھے۔ ان کے مکان مالک ایک مزار کے مجاور تھے، وہ ان کے ساتھ کشف وکرا سے بہرہ ور ہوتے رہتے۔ مزے کی بات یہ کہ ان کے وا لطف اللہ کے رجحان کا علم تھا، مگر انہوں نے روک نہیں کی کہ جب وہاں سے تبادلہ ہوجائے گا تو بیٹے رجحان میں تبدیلی آجائے گی۔ ابھی بچہ ہے، اس لیے ا شعور بالغ نہیں ہوا ہے۔ پھر یہ کہ مکان کے مالک خوش اخلاق تھے، اس لیے ان کے والد ان سے اختلا نہیں رکھنا چاہتے تھے۔ تجاور چھوڑنے کے بعد وہ دس مدراس میں رہے اور اس کے بعد ایک برس تک ممبئی میں نصف صدی سے کراچی میں قیام پذیر رہے، لیکن ان کا مرتے دم تک اسی حرارت سے موجزن رہا اور اس کا نقش دل پر ثبت رہا۔

لطف اللہ کی رسم ختنہ 7 اگست 1925ء کو ادا کی جب وہ نو برس کے ہو چکے تھے۔ بہت سے تحفے تحائف ان کے چچا نے بھونپو والا گراموفون تحفے میں دیا، جو ا بہت پسند آیا۔ ریکارڈ بازار سے خریدے اور گھر میں طو مچا دیا۔ کسی قرأت کا ریکارڈ انہیں پسند آگیا تو اس قاری آواز کی نقالی کر کے قرأت کرنے لگے۔ وہ سورۂ رحمٰن ابتدائی آیات تھیں۔ جس نے بھی سنا سراہا۔ یہ بات میں مشہور ہوگئی کہ یہ لڑکا اچھی قرأت کرتا ہے۔ چنانچہ بھی محلے میں وعظ کی کوئی محفل ہوتی تو اس کی ابتدا ان قرأت سے ہوتی۔

کلاسیکی موسیقی سننے کے بعد اس کا شوق پیدا چنانچہ بڑے گائیکوں کی نقالی کرنے لگے۔ گائیکی سیکھنے بہت آرزو تھی، دل اس کے لیے مچلنے لگا لیکن اس کو سکھا

والا کوئی نہیں ملا۔ اسی اثنا میں دیگر اصناف کی طرف توجہ دی۔ انہی دنوں مدارس میں ایک قوال کا آنا ہوا۔ یہ شخص تیسری دہائی میں شہرت کے سنگھاسن پر بیٹھ چکا تھا اور اس کی شہرت ریاست کے گوشے گوشے میں پھیل چکی تھی۔ اس کی قوالی کے سیکڑوں ریکارڈ فروخت ہو چکے تھے۔ خاص وعام اس کی قوالی کے ریکارڈ سنتے تھے اور سر دھنتے تھے۔ اس نے ایک محفل میں علامہ اقبال کا شکوہ تحت اللفظ میں اتنے دل نشیں انداز میں سنایا کہ لطف اللہ کے دل میں اتر گیا۔ وہ گھر واپس آئے تو اس قوال کی نقالی کرنے بیٹھ گئے۔ ایک رشتے دار کے گھر سے ہارمونیم مل گیا تو اسی پر طبع آزمائی شروع کر دی۔ ایک روز ان کے والد باہر سے آئے تو انہوں نے قوالی سن لی۔ لطف اللہ کی ماں سے کہا کہ مبارک ہو ان کا پوت قوال بن گیا ہے۔ یہ تعریف سن کر لطف اللہ کا حوصلہ پست ہوگیا۔ ان کے الفاظ میں ''کون بے غیرت ہوگا جو یہ تعریف سننے کے بعد یہ شغل جاری رکھتا۔ مجھے مجبوراً کلاسیکی موسیقی کی طرف جانا پڑا۔''

اسی زمانے میں مدراس ریڈیو کارپوریشن نے ان کے اسکول کے ہیڈ ماسٹر کو مراسلہ روانہ کیا کہ وہ اسکاؤٹ تحریک کے لیے ایک تقریب منعقد کررہے ہیں۔ اگر ہوسکے تو کسی ایسے طالب علم کو بھیج دیں، جو فنِ موسیقی سے بھی دلچسپی رکھتا ہو۔ سب کی نگاہ ان پر پڑی۔ امیدواروں کا انتخاب ہو چکا تھا اور صرف ایک امیدوار مزید درکار تھا۔ وہ چونکہ ہر صبح اسمبلی میں ترانہ 'چین وعرب ہمارا' 'ہندوستاں ہمارا' لہک لہک کر پڑھتے تھے، اس لیے سب نے ان کے حق میں ووٹ دیا۔ وہ ریڈیو پر اپنا فن دکھانے کے لیے پہنچ گئے۔ ہر فن کار کو صرف تین منٹ دیے گئے تھے کہ اس عرصے میں اپنے جوہر دکھا دے۔ پیارے صاحب کی ان دنوں دھوم تھی، لطف اللہ نے ان کی ہی ایک چیز یاد کر رکھی تھی، وہی گا دی۔

اسے ریڈیو پر ان کے والد صاحب نے سن لیا تو اپنی بیگم سے کہا۔ ''سنتی ہو، تمہارا لڑکا گانے لگا ہے۔ مبارک ہو!''

جب ان کی والدہ نے یہ بتایا تو لطف اللہ خوشی سے نہال ہوگئے۔ اس لیے کہ والد صاحب نے مبارک باد دی تھی اور ایسا وہ شاذ ہی کرتے تھے۔ بہرحال لطف اللہ کا ناتا گلوکاری سے جڑ گیا۔ ایسا جڑا کہ زندگی کے آخری لمحات تک جڑا رہا۔ اسی دوران ایک صاحب فن عبدالحفیظ کی شاگردی اختیار کی۔ لطف اللہ نے اپنے والد صاحب کے علم میں لائے بغیر ہی حفیظ صاحب سے گائیکی سیکھنا شروع کر دی۔ وہ اسکول کی چھٹی کے بعد ڈرل کا پیریڈ چھوڑ کر حفیظ صاحب کے پاس پہنچ جاتے۔ ان کی قیام گاہ اسکول سے کوئی ایک میل کے فاصلے پر تھی۔ جب کہ اسکول سے گھر پانچ میل کے فاصلے پر تھا۔ گویا جب وہ گھر واپس ہوتے تو چھ میل کا فاصلہ طے کرتے اور مغرب کے وقت گھر پہنچتے۔ جو کچھ سیکھا ہوتا، اس کی راستے میں ریاض کرتے رہتے۔ وہ گھر میں ایسا نہیں کر سکتے تھے، اس لیے کہ پھر راز افشا ہو جاتا اور ابا جان ظالم سماج بن کر ان کے شوق کی راہ میں حائل ہو جاتے۔

سلسلہ جاری رہا۔ وہ نقالی تو کرلیا کرتے تھے، لیکن جب گائیکی میں ایک مشکل مقام آیا تو راگ ان کے حلق سے ادا نہ ہوسکا۔ ان کے استاد حفیظ نے بہت کوشش کی، مگر لطف اللہ اس کی ادائی نہ کرسکے۔ کافی دن اس کی مشق کرنے میں گزر گئے۔ انہیں اپنی نااہلی پر بہت غصہ آیا۔ دوسری طرف حفیظ صاحب میں بھی اضطراب کی لہریں کروٹیں لے رہی تھیں۔ ایک ہفتے بعد ان کے چہرے کے تاثرات تبدیل ہونے لگے۔ ایسا لگتا تھا کہ ان کے ضبط کا پیمانہ لبریز ہو چکا ہے۔ چنانچہ انہوں نے غصے میں آکر ایک روز لطف اللہ کے منہ پر تھوک دیا۔ لطف اللہ نے شوق کے ہاتھوں اسے برداشت کرلیا اور زبان سے اف تک نہ کی۔

ریاضت ہوتی رہی۔ ایک سال کی شاگردی کے بعد حفیظ صاحب نے ان کے گلے میں چند راگ بٹھا دیے۔ جس نے بھی سنا، حفیظ صاحب کی تعریف کی۔ 1936ء میں جب آل انڈیا ریڈیو نے مدارس ریڈیو کو اپنی تحویل میں لے لیا تو انہیں موسیقاروں کی ضرورت پڑی۔ انہوں نے طریقہ یہ بنا رکھا تھا کہ مہینے میں ایک یا دو بار آڈیشن لیتے تھے تاکہ نئے لوگوں کی حوصلہ افزائی اور گلوکاروں کی کھپت ہوتی رہے۔ حفیظ صاحب نے لطف اللہ کو ہدایت دی کہ وہ آڈیشن کے لیے تیاری کریں، تاکہ اب تک جو کچھ سیکھا ہے، اس کا استعمال کریں۔ انہوں نے ہدایت پر عمل کیا اور سوال وجواب کے بعد آڈیشن پاس کر لیا۔ انہیں 'سی' کلاس میں رکھا گیا اور دو گھنٹے کے تیس روپے دینا منظور کیے۔ اس زمانے میں 'اے' والوں کو پچاس اور 'بی' والوں کو چالیس روپے ملا کرتے تھے۔ ریڈیو بہت کم گھرانوں میں تھا، اس لیے مدراس میں جگہ جگہ لاؤڈ اسپیکر لگا دیے گئے تھے تاکہ موسیقی کے شائقین انہیں سن کر اپنی شامیں

مُرور انگیز بنا سکیں۔ جب اس گائیکی کا پہلی مرتبہ معاوضہ ملا تو لطف اللہ نے وہ معاوضہ حفیظ صاحب کی خدمت میں ریڈیو کی عمارت ہی میں پیش کر دیا، جسے انہوں نے کمال بے اعتنائی سے اپنی جیب میں رکھ لیا اور لطف اللہ کی کمر بھی نہ ٹھونکی۔ تین مہینے کے بعد دوسرا پروگرام تھا۔ اس سے ایک ہفتہ پیشتر حفیظ صاحب نے ہدایت دی کہ اب وہ ممبئی جا رہے ہیں، لہٰذا پروگرام کا معاوضہ وہیں بھیج دیا جائے۔ یہ سننا تھا کہ لطف اللہ کے پاؤں تلے سے زمین نکل گئی۔ ایک بار پھر وہ عالم بالا میں معلق ہو گئے۔

جن پہ تھا تکیہ وہی پتے ہوا دینے لگے

حفیظ صاحب کا کہنا تھا کہ پرنٹنگ کا کام صحیح نہیں چل رہا ہے، اس لیے وہ واپس ممبئی جا رہے ہیں۔ ان کے جانے کے بعد لطف اللہ نے دو پروگرام مزید کیے، لیکن اس کے بعد ان کا دل اچاٹ ہو گیا۔ اس کا نتیجہ ان کی نصابی پڑھائی پر پڑا اور وہ میٹرک کے امتحان میں فیل ہو گئے۔ کیسے؟ اس کی کہانی بھی دل چسپ ہے۔ جب وہ اسکول میں زیرِ تعلیم تھے تو جاسوسی ناولوں کی چاٹ لگ گئی۔ انہوں نے معلوم نہیں کتنے ناول پڑھ ڈالے۔ اس کے بعد ادب کی دوسری اصناف کی طرف مائل ہوئے۔ جنوبی ہند کے بارے میں انہوں نے انکشاف کیا کہ وہاں کے لوگ 'نے' کا استعمال نہیں کرتے، اس لیے جب کلاس میں کوئی استاد مضمون لکھنے کی ہدایت کرتا تو یہ تاکید بھی کرتا کہ 'نے' کا استعمال ضروری ہے۔ وہ کوئی مضمون لکھتے تو استادوں کو بہت پسند آتا۔ وہ ان کی عزت افزائی کے لیے مضمون کو کلاس کے لڑکوں کو سناتے اس کے بعد بڑی کلاس کے لڑکوں کو سنانے کے لیے بھیج دیتے۔ بڑی عمر کے لڑکے آدھی چھٹی میں آ کر پوچھتے تھے کہ لطف اللہ کون ہے؟ بھئی اس نے تو کمال کر دیا۔ یہ واقعات ظاہر کرتے ہیں کہ انہیں اردو سے خاص شغف تھا اور وہ دوسرے لڑکوں پر فوقیت رکھتے تھے۔

شعری ادب سے ان کا تعارف اس وقت ہوا جب وہ میٹرک کے امتحان میں فیل ہوئے اور انہوں نے دوسرے اسکول میں داخلہ لیا۔ امتحان میں فیل ہونے کے متعدد اسباب تھے جن میں سے ایک یہ تھا کہ ان کے اسکول کا معیار بہت گھٹیا تھا۔ فیس چونکہ بہت کم تھی، اس لیے انہیں وہاں داخل کرایا گیا تھا۔ انہوں نے 1933ء میں میٹرک کا امتحان دیا تھا، جس میں 34 لڑکے شریک ہوئے۔ ہیڈ ماسٹر صاحب نرم مزاج اور مشفق تھے، اس لیے انہوں نے کشادہ دلی سے سارے لڑکوں کو پری میٹرک میں پاس کر کے بورڈ کے امتحان میں بھیج دیا۔ جب رزلٹ آیا تو سارے شہر میں اضطراب کی لہر دوڑ گئی۔ ہر شخص پریشان تھا۔ اس لیے کہ 34 طالب علموں میں سے صرف ایک طالب علم ہی پاس ہوا تھا۔ اس صورتِ حال سے نالاں ہو کر ان کے والد نے انہیں سینٹ پال ہائی اسکول میں داخل کرا دیا۔ یہ مشنری اسکول تھا اور وہاں کا ذریعۂ تعلیم انگریزی تھا اور اردو کو ثانوی درجہ حاصل تھا۔ وہاں عادل نامی استاد مل گئے جنہیں اردو شاعری سے شغف تھا۔ انہوں نے لطف اللہ کو شعری ادب کی طرف مائل کیا۔ وہ تک بندی تو کرنے لگے، لیکن پختہ شعر گوئی تک نہ پہنچ سکے۔ چند لچر اور گھٹیا شعر وضع کر کے چلتے پھرتے مشاعروں میں پڑھ دیا کرتے اور داد حاصل کر لیتے۔ اسی سے دل کو تسکین ہو جاتی۔

عادل صاحب نے جب دیکھ لیا کہ ان کا شاگرد نثر و نظم میں ہاتھ پاؤں مارنے لگا ہے تو ایک ماہنامے کا اجرا کر بیٹھے جس کا نام انہوں نے 'ادیبِ اردو' رکھا۔ دل چسپ بات یہ کہ پرچے کا منتظم لطف اللہ کو بنا دیا۔ اس ماہنامے کی قیمت ایک آنہ تھی۔ لطف اللہ نے اپنی سے لاکھ کوشش کی لیکن پرچے کے لیے بڑی اشاعت حاصل کرنا تو دور کی بات اس کی اشاعت کو قائم ہی نہ رکھ سکے۔ تین پرچوں کے بعد ہی اسے بند کر دینا مناسب سمجھا گیا۔ بہرحال انہیں یہ اعزاز حاصل ہو گیا کہ وہ 'ایک آنہ' رسالے کے منتظم بھی رہ چکے ہیں۔ جب ان کی عمر سترہ برس کی ہوئی تو ان کے والد کا انتقال ہو گیا۔ ان پر پورے خاندان کا بوجھ آن پڑا۔

ایک دل چسپ بات یہ معلوم ہوئی کہ اگر طالب علم ضمنی امتحان پاس کر لے تو اسے کالج میں داخلہ تو نہیں مل سکتا البتہ وہ حکومت کی ملازمت کر سکتا ہے۔ چنانچہ ان کی والدہ نے ریلوے کے محکمے کو درخواست بھیجی، جس کا متن کچھ یوں تھا: "میرے شوہر نے 32 برس بڑی جاں فشانی اور دیانت داری سے اس محکمے کی خدمت کی ہے، جس کا اعتراف آپ نے اپنے سرٹیفکیٹ میں بھی کیا ہے۔ مہربانی ہو گی اگر آپ میرے بیٹے کو کلرک کی جگہ دے کر میری مالی اعانت فرمائیں۔ میں تاعمر شکر گزار رہوں گی۔"

اس کا جواب کچھ یوں آیا کہ جب بھی اسامیاں خالی ہوتی ہیں، ہم اخبارات میں مشتہر کر دیتے ہیں۔ اگر اس وقت آپ یہ عرضی گزاریں تو مناسب ہو گا۔ اس پر ہمدردی سے غور کیا جا سکتا ہے۔" ایسا کورا جواب سن کر ان کے آٹھ

اہلِ خانہ بہت مایوس ہوئے اور امید بھری نظروں سے لطف اللہ کی طرف دیکھنے لگے۔ اب وہی تھے جو اس نیا کو سنبھال سکتے تھے۔

بیس برس کی عمر میں مدراس سے ہجرت کر کے وہ حیدرآباد دکن آئے اور وہاں انہوں نے ایک برس گزارہ۔ ریاست حیدرآباد کے ضلع ورنگل میں 'بلندو' نامی ایک تحصیل تھی۔ وہاں انگریزوں کے زمانے میں کوئلے کی ایک کان دریافت ہوئی تھی۔ چنانچہ ایک بڑی کمپنی نے اس کی کھدائی کا ٹھیکا لے لیا۔ عملہ انگریزوں پر مشتمل تھا۔ کمپنی نے اپنے عملے کی تفریح کے لیے وہاں ایک کلب بھی بنا لیا تھا۔ وہاں چند مقامی عہدے دار بھی ممبر بنا لیے گئے تھے۔ کلب میں پنگ پانگ اور تاش وغیرہ کھیلے جاتے۔ بعد مغرب بال روم کی لائٹیں آن ہو جاتیں اور جسے رقص کا شوق ہوتا وہ فلور پر چلا جاتا۔ بوتلوں کے کاگ اُڑتے اور ناؤ نوش کی محفل بھی جمتی۔ ان کے چھوٹے ماموں بھی کلب کے ممبر تھے، اس لیے لطف اللہ بھی ان کے ساتھ کلب چلے جاتے۔ ان دنوں ان کی عمر اکیس برس کے لگ بھگ تھی۔ جب جگر مرادآبادی وہاں آئے تو ان کے ایک واقف کار انہیں کلب میں لانے لگے۔ لطف اللہ کا کہنا تھا کہ صورت شکل تو اللہ تعالیٰ نے جیسی بھی بنائی تھی ویسی ہی تھی، مگر وضع قطع انہوں نے ایسی بنا رکھی تھی کہ چہرے کی طرف دوسری بار دیکھنا گوارا نہ ہوتا۔ البتہ جب وہ دانتوں کو بھینچ کر ترنم سے شعر پڑھتے تھے تو دل کش دکھائی دینے لگتے تھے۔

ایک روز سہ پہر کے وقت جگر اس کلب میں آ گئے۔ چاہنے والوں نے گھیر لیا اور گفتگو کا سلسلہ چل پڑا جس میں وقت گزرنے کا احساس ہی نہیں ہوا۔ پھر غروبِ آفتاب کے بعد ناؤ نوش کا دور شروع ہوا۔ کھانا بھی کلب میں کھایا گیا۔ جگر نے رغبت سے نہیں کھایا۔ اس کے بعد شعر گوئی کی محفل جمی۔ لطف اللہ کے ماموں کو نہ جانے کیا سوجھی کہ ان کی طرف اشارہ کر کے بولے کہ اس سے بھی کچھ سنو۔ مدہوشوں نے 'ہاں سناؤ' کہہ کر اصرار کرنا شروع کر دیا۔ خود جگر نے بھی فرمائش کر ڈالی۔ لطف اللہ نے شاعری ترک کر دی تھی اور یہ سوچ کر شعر گوئی سے کنارہ کشی اختیار کر لی تھی یہ ان کے بس کی بات نہیں ہے۔ اس وقت انہیں کوئی شعر یاد نہیں آ رہا تھا، لیکن انہوں نے محفل کی مناسبت سے یہ شعر پڑھ ڈالا:

گر یہ مزہ نہ آئے، شراب طہور میں
جنت میں بھی لگائیں گے، بھٹی شراب کی

لوگوں نے داد دی اور کئی صاحب ذوق تو اچھل اچھل پڑے۔ جگر نے شعر کے گھٹیا پن پر کوئی بات نہیں کی لیکن کرخت آواز میں بولے۔ "یہ ترنم آپ کا اپنا نہیں ہے سہگل کا ہے۔ آپ نے اسے کیوں اپنایا؟ جوان ہیں اور آواز بھی اچھی پائی ہے، اپنا الگ راستہ اختیار کیجیے۔"

لطف اللہ پر گھڑوں پانی پڑ گیا اور وہ خاموشی سے سر جھکا کر بیٹھ گئے۔

وہ اس شہر میں روزگار کی تلاش میں آئے تھے، وہاں بھی اس کا کال تھا۔ صرف مقامی افراد کو ملازمت ملتی تھی۔ لطف اللہ کا جی اکتا گیا۔ انہوں نے ماموں سے اجازت چاہی اور ممبئی کی راہ لی۔ وہاں ایک ادارے میں ملازم ہو گئے جو پٹرول کی راشننگ کے لیے قائم کیا گیا تھا۔ اس کے بعد وہ سنیما کی ایک لیبارٹری میں بطور اسسٹنٹ کام کرنے لگے، تاکہ اپنے اخراجات پورے کر سکیں۔ اسی اثنا میں انہوں نے اپنے استاد عبدالحفیظ کو تلاش کر لیا۔ انہوں نے خیریت پوچھی اور ایک وقت کا کھانا بھی کھلایا۔ اس کے بعد وعدہ کیا کہ انہیں لے کر ریڈیو ممبئی جائیں گے جہاں ان دنوں ذوالفقار علی بخاری اسٹیشن ڈائرکٹر ہوا کرتے تھے۔ ممبئی میں ایک علاقہ بیلاڈ کے نام سے مشہور ہے۔ جہاں پتھریلی عمارات کا ایک سلسلہ ہے۔ وہاں تجارتی دفاتر قائم ہیں۔ انہی میں ریڈیو اسٹیشن ممبئی بھی قائم تھا۔ بخاری صاحب نے پہلے تو زیادہ لفٹ نہیں کرائی مگر جب انہیں پتا چلا کہ ان کے سامنے مدراس کا ایک منجھا ہوا موسیقار بیٹھا ہے تو ذرا چوکنا ہو گئے۔ وہ بہرحال اسٹیشن ڈائرکٹر تھے، اس لیے ان کے اندر بیٹھے ہوئے عالم نے سر اٹھا لیا اور وہ ان کا امتحان لینے کے موڈ میں آ گئے۔ انہوں نے موسیقی پر طویل گفتگو چھیڑ دی۔ حفیظ صاحب اس کا معقولیت سے جواب دے رہے تھے، لیکن ایسا معلوم ہو رہا تھا جیسے زیڈ اے بخاری انہیں نیچا دکھانے کی کوشش کر رہے ہوں۔ تھوڑی دیر بعد انہوں نے قریب کھڑے لڑکے کو ہدایت دی کہ وہ پیٹی اٹھا کر لے آئے، لڑکا دوڑ کر لے آیا۔ پھر انہوں نے اسے ہدایت دی کہ وہ طبلہ سنبھال لے۔ وہ ادب سے بیٹھ گیا تو بخاری صاحب نے حفیظ صاحب سے فرمائش کی کہ وہ کچھ سنائیں۔ حفیظ صاحب نے پیٹی اپنی طرف کھینچ لی اور ایک 'گت' سنا دی۔ بخاری صاحب نے ٹیڑھے میڑھے سوالات کا سلسلہ جاری

لطف اللہ نے بلاشبہ اپنی زندگی میں اتنا کام کر ڈالا کہ بہت سے لوگ انہیں آدمی کے بجائے جن سمجھنے لگے تھے۔ برصغیر کی شاید ہی کوئی قابلِ ذکر آواز ہوگی جو ان کے کلکشن میں شامل نہ ہو۔ کلکشن بھی ایسا کہ جس کی مثال برصغیر میں صدیوں تک شاید ہی کوئی قائم کر سکے۔ اس لیے کہ جو آوازیں ان کے کلکشن میں شامل ہیں وہ دنیا میں کسی اور کے پاس نہیں ہیں۔ موسیقاروں، گلوکاروں، شاعروں اور مشہور گلوکاروں نے ان کی فرمائش پر جو کچھ ریکارڈ کرایا وہ انہوں نے جاں فشانی سے محفوظ کرلیا۔ وہ اب اس دنیا میں نہیں رہے، لیکن جب تک زندہ رہے اپنا احساس دلاتے رہے۔ 95 برس تک اپنے اس دل چسپ اور فقید المثال منصوبے پر کام کرنے کے بعد وہ اس دنیا سے سدھار گئے۔ آوازوں کے اس عظیم سرمائے کو محفوظ رکھنا کوئی آسان بات نہیں تھی، مگر انہوں نے اپنی دانائی سے اس اثاثے کو نہ صرف محفوظ کیا بلکہ آنے والی نسلوں کے لیے راہ نما بھی بنا دیا۔

اس عظیم ذخیرے کو محفوظ کرنے کے بعد یہ یاد رکھنا کہ کون سی آواز کہاں محفوظ ہے، کارِ دارد ہے، لیکن ان کے حسنِ سلیقہ کے باعث یہ ممکن ہو گیا ہے کہ آپ آوازوں کے لامتناہی جنگل میں سے اپنی من پسند آواز تلاش کرلیں اور اس سے محظوظ ہو سکیں۔ یہ ذخیرہ نفیس اور دیدہ زیب الماریوں میں محفوظ کیا گیا اور ہر الماری کی چابی پر نمبر ڈالے گئے ہیں تاکہ انہیں حسبِ ضرورت استعمال کیا جاسکے۔ ان چابیوں کے علیحدہ کیٹلاگ تک بنائے گئے (ان کیٹلاگ کو بنانے کے لیے لطف اللہ نے خاص طور پر جلد بنانا سیکھی۔ اس میں انہوں نے صرف ایک طریقے پر اکتفا نہیں کیا، بلکہ ڈچ، جرمنی، برطانوی طریقوں کی جلد سازی سیکھی۔) لطف اللہ اس من پسند شغل کے علاوہ ایک اشتہاری ایجنسی بھی چلاتے تھے۔ اپنے بھائی کے ساتھ انہوں نے یہ کام 52 برس تک کیا۔

اب اس ذخیرے کی ان کی بیوی زاہدہ نگرانی کر رہی ہیں۔ وہ ہر ملاقاتی کی تواضع کرتی اور شائقین کو ان فن پاروں کا دیدار بھی کراتی ہیں جو ان کے شوہر نے نہایت عرق ریزی کے ساتھ جمع کیے۔ اب لطف اللہ ہم میں نہیں رہے ہیں، لیکن اپنے پیچھے اتنا سرمایہ چھوڑ گئے ہیں کہ ہم رہتی دنیا تک اس سے فیض یاب ہوتے رہیں گے۔ بلاشبہ وہ جنوبی ایشیا کے سب سے بڑے کلکٹر تھے۔ آوازوں کا مشغلہ اپنی جگہ، اس کے علاوہ انہیں فوٹو گرافی اور لکھنے سے بھی دل چسپی تھی۔ وہ آٹھ کتابوں کے مصنف ہیں، جن میں سُر کی تلاش، زندگی ایک سفر، تماشائے اہلِ قلم اور ہجرتوں کے سلسلے شامل ہیں۔ 80 برس کی عمر میں انہوں نے کمپیوٹر سیکھا اور اپنے فن پاروں کو ڈیجیٹل میڈیا پر محفوظ کرنے لگے۔ ان کا سرمایہ میگنٹک آڈیو ٹیپ پر محفوظ کیا گیا تھا۔ ان کی کوشش تھی کہ اب اسے سی ڈی پر منتقل کیا جائے۔

انہیں بچپن سے ہی سے کچھ نہ کچھ جمع کرنے کا شوق تھا۔ مثلاً وہ ڈاک کے ٹکٹ جمع کیا کرتے تھے۔ اس کے بعد انہیں سینما کے ہینڈ بل اور پوسٹر، ماچسیں، فاؤنٹین پین جمع کرنے کا بھی شوق ہوگیا۔ (یہ چیزیں اب ان کی رہائش گاہ کی اوپری منزل میں سجی ہوئی ہیں) صرف امریکی اور برطانوی فلموں کے ہینڈ بلوں کی تعداد 600 ہے۔ اس کے علاوہ ان کے ذخیرے میں نایاب کتب کی ایک بڑی تعداد بھی شامل ہے۔ اس عظیم الشان ذخیرے کو انہوں نے اس طرح سے محفوظ کیا کہ منٹوں میں معلوم کرلیا کرتے تھے کہ کون سی چیز کہاں رکھی ہے۔ کلکشن کا شوق انہیں بارہ برس کی عمر سے ہوگیا تھا جب لڑکے بالے گلیوں میں گولیاں کھیلتے ہیں یا کرکٹ کی گیند پر ہٹ لگایا کرتے ہیں۔

رکھا۔ حفیظ صاحب ان کے جوابات تحمل سے دیتے رہے۔ پھر بخاری صاحب نے لطف اللہ کی طرف اشارہ کر کے پوچھا کہ یہ کون ہے۔ حفیظ صاحب تو اسی مقصد کے تحت وہاں گئے تھے، انہوں نے اپنے شاگردِ رشید کے بارے میں تفصیل سے بتایا اور گزارش کی کہ ان کے پاس کوئی پروگرام ہو تو لطف اللہ کو دے دیا جائے۔ بخاری صاحب نے دو روز بعد آڈیشن کے لیے بلالیا۔ لطف اللہ آڈیشن میں کامیاب ہوگئے اور انہیں ہفتے میں ایک آدھ پروگرام بھی ملنے لگا، لیکن ایک سانحہ یہ ہوا کہ حفیظ صاحب جس عجلت سے مدراس سے ممبئی آئے تھے اسی تیز رفتاری سے ممبئی سے واپس مدراس چلے گئے۔ لطف اللہ ایک بار پھر ایک ایسی بند گلی میں آکر کھڑے ہوگئے جہاں سے آگے جانے کا کوئی راستہ نہیں تھا۔ وہ کلاسیکی موسیقی تو کیا سیکھتے، نیم کلاسیکی موسیقی بھی نہ سیکھ سکے۔ پھر زیڈ اے بخاری سے بھی ایک طویل عرصے تک ملاقات نہ ہوسکی۔ 1946ء میں لطف اللہ نے گلیکسو لیبارٹریز میں ملازمت کرلی۔ اس ادارے نے ایشیا میں سب سے پہلا ائرکنڈیشنڈ اسٹوڈیو بنایا تھا۔

لطف اللہ نے دس برس ممبئی میں گزارے، اس دوران برصغیر کی تقسیم ہوگئی۔ چنانچہ وہ 17 اکتوبر 1947ء کو پاکستان چلے آئے۔ چند مہینے تنگ دو دو میں گزارنے کے بعد انہوں نے اشتہاری ایجنسی کا کام شروع کر دیا۔ پھر اس کاروبار میں وہ پچاس برس تک اپنے فن کا جادو جگاتے رہے۔

1963ء سے لے کر 88ء تک (یعنی 26 برس تک) وہ عبدالشکور سے راگ درباری کے اسرار و رموز سیکھتے رہے۔ مگر عبدالشکور سے ملاقات کیسے ہوئی یہ بھی ایک دل چسپ کہانی ہے۔ لطف اللہ کا کہنا تھا کہ مسلم فن کاروں میں رفیق غزنوی جیسا موسیقار انہوں نے کہیں نہیں دیکھا۔ وہ ایک زمانے میں ''امروز'' میں فنِ موسیقی پر ایک کالم بھی لکھا کرتے تھے۔ ریس اور شراب کے شوقین تھے۔ انہوں نے بہت سی شادیاں کیں جن میں ایک مغنیہ انوری بائی تھیں جنہیں لوگ ''پاروجی'' بھی کہتے تھے۔

جب پاروجی کو معلوم ہوا کہ لطف اللہ کے پاس ریکارڈ شدہ موسیقی کا خزانہ ہے تو انہوں نے فون کیا اور معلوم کیا کہ ان کے پاس عبدالوحید خان کی ریکارڈنگ ہے۔ اثبات میں جواب پاکر سننے کے لیے اپنے خاندان والوں کے ساتھ آگئیں۔ ریکارڈنگ سن کر ان کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔ ان کے ساتھ ایک بزرگ بھی تھے جو اس دوران سر جھکائے خاموش بیٹھے رہے۔ لطف اللہ کو الجھن ہونے لگی کہ یہ کون صاحب ہیں؟ جب پاروجی نے ان کا تعارف نہیں کرایا تو انہوں نے از خود پوچھ لیا۔ پتا چلا کہ وہ کیرانہ

گھرانے سے تعلق رکھتے ہیں اور خان صاحب عبدالکریم کے بھانجے ہیں۔ موسیقی کی تعلیم اپنے دادا سے حاصل کی تھی، لیکن عملی طور پر اس تعلیم کو استعمال نہیں کیا۔ ہمیشہ دینی کاموں میں مصروف رہے۔ بچوں کو قرآن و حدیث کی مفت تعلیم دیتے تھے۔ ڈرائنگ بھی سیکھی تھی۔ جب پاکستان آگئے تو ایک اسکول میں ڈرائنگ ماسٹر کی حیثیت سے بھی ملازمت کی۔ دور کے کسی عزیز کے ہاں رہتے تھے۔ موسیقی سے کوئی واسطہ نہیں تھا، لیکن جب کوئی مشکل مقام آتا تھا تو بچپن کی حاصل کی ہوئی تعلیم کی بنا پر اسے حل کر دیتے تھے۔ وہ موسیقی سکھانے کے لیے شاگرد بھی نہیں بناتے تھے۔ ان کے کچھ رشتے دار جے پور اور ممبئی میں تھے، جن سے ملاقات کرنے دوسرے تیسرے مہینے چلے جایا کرتے تھے۔ سامانِ حیات بے حد مختصر تھا۔ کپڑوں کے چند جوڑے ساتھ رکھتے تھے۔ جہاں گئے وہیں تبدیل کرلیے۔ کسی کے معاملات میں دخل نہیں دیتے تھے اور زیادہ تر خاموش رہتے تھے۔ لوگ ان کی بہت عزت کرتے تھے۔ انہیں دیکھ کر اپنے گھر کے دروازے ان پر وا کر دیتے تھے۔

چند ملاقاتیں مزید ہوئیں تو لطف اللہ ان کی علمیت سے متاثر ہوگئے۔ پھر کہہ سن کر ان کے باقاعدہ شاگرد بن گئے۔ مولانا عبدالشکور شاگرد نہیں بناتے تھے، لیکن واقف کاروں کے اصرار کرنے پر انہوں نے لطف اللہ کو شاگرد بنا لیا۔ شاگردی کی رسم ہوئی۔ گنڈا باندھا گیا، سورۂ فاتحہ پڑھی گئی، جو لوگ حاضر تھے ان کے سامنے ابتدائی تعلیم دی گئی۔ اس کے بعد مٹھائی تقسیم ہوئی۔ یوں مولانا کے آگے انہوں نے زانوئے تلمذ تہ کیا۔ درسِ موسیقی کا سلسلہ چل پڑا تو مولانا نے انہیں ہدایت کی کہ اب تک جو کچھ سیکھا ہے وہ حرفِ غلط کی طرح مٹا دیا جائے، یہ سوچ لیا جائے کہ اب تک کچھ نہیں سیکھا۔ موسیقی کی تعلیم کی ابتدا تو گویا اب ہو رہی ہے۔ لطف اللہ نے بیس پچیس برس تک موسیقی کی تعلیم حاصل کی تھی۔ ربع صدی کی اس تپسیا کو کسی کے کہنے سے یکسر مٹا دینا کیسے ممکن تھا، لیکن انہوں نے ایسا کرنے کی ہامی بھر لی۔ اس لیے کہ اس کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا۔

مولانا نے ان سے کہا کہ تم نے اب تک جو کچھ سیکھا ہے وہ سراسر غلط ہے۔ کیسے؟ وہ بعد میں بتاؤں گا۔ سرِدست اتنا بتا دوں کہ تمہیں آواز لگانا نہیں آتی۔ پہلے اس کا سبق لو۔ لطف اللہ کا کہنا ہے کہ یورپ میں ''وائس کلچر'' کا کورس چار یا پانچ برس پر مشتمل ہے، لیکن ہمارے ہاں کسی کو اس کے بارے میں.... کچھ نہیں معلوم، انہوں نے اس بارے میں کوئی کتاب بھی نہیں دیکھی۔ عملی طور پر برصغیر کے صرف چند گھرانوں کو اس کا علم ہے۔ اللہ اللہ خیر سلا۔

مولانا نے انہیں تلقین کی کہ وہ اس بات کو ذہن نشین کرلیں کہ آواز ناف سے نکالی جاتی ہے۔ اس طرح کہ وہ

تالوسے جا کر ٹکراتی ہے اور منہ سے نکل جاتی ہے۔ لطف اللہ کہتے ہیں۔ ''ایک محفلِ موسیقی میں میری ملاقات ایک مغربی گلوکارہ سے ہوئی تو میں نے اس سے سوال کیا کہ گاتے وقت آواز جسم کے کس حصے سے نکلنا چاہیے؟ اس نے اپنے پیٹ پر ہاتھ مار کر کہا کہ یہاں سے۔ اس جواب کی روشنی میں مولانا بالکل درست کہہ رہے تھے۔''

آواز لگانے کے ضمن میں مزید یہ ہدایت ملی کہ جب آواز لگائی جائے تو منہ زیادہ نہ کھلا ہوا، صرف انگوٹھے کی موٹائی کے برابر کھولنا چاہیے۔ وہ آواز جو سینے سے نکالی جاتی ہے اور جس میں منہ کو چبایا جاتا ہے یا نتھنوں سے آواز خارج کی جاتی ہے، سراسر غلط ہے۔ گانے کے دوران جسم ساکت ہونا چاہیے اور کسی بھی حصے میں حرکت نہ ہو۔ گویا اگر کوئی گائیک کو پیچھے سے دیکھے تو یہ محسوس کرے کہ یہ زندہ نہیں ہے۔ لطف اللہ کا کہنا ہے انہوں نے صرف عبدالکریم کو اس طرح سے گاتے سنا تھا اور یہ 1934ء یا 35ء کی بات تھی۔

بہرحال چند ماہ کی محنت و مشقت کے بعد لطف اللہ کو محسوس ہونے لگا کہ ان کی کوششیں رنگ لا رہی ہیں۔ یعنی انہیں سُروں کی پہچان ہونے لگی ہے اور مخرج بھی صحیح طور پر ادا ہو رہا ہے۔ داد مولانا کو بھی دینی چاہیے جو انہیں درس دے رہے تھے۔ وہ یقیناً ماہرِ فن تھے۔ لطف اللہ اس ضمن میں ایک واقعہ بیان کرتے ہیں۔ ''آواز کے معاملے میں مولانا باریک بیں اور دور رس تھے۔ ایک صبح میں ان کے سامنے بیٹھا ریاض کر رہا تھا کہ انہیں کھانسی آنے لگی۔ وہ اس خیال سے باہر چلے گئے کہ کھانسی ریاض میں خلل نہ پیدا کرے۔ بہرحال اشارے سے مجھ سے کہہ گئے کہ میں مشق جاری رکھوں۔ میری پیٹھ دروازے کی طرف تھی۔ چنانچہ کمرے میں داخل ہونے والا میری صورت نہیں دیکھ سکتا تھا۔ اس اثنا میں مولانا کب کمرے میں آئے، مجھے خبر نہ ہو سکی۔ میں ریاض میں مشغول تھا کہ انہوں نے دروازے سے ڈانٹا۔ ''زبان نکال کر کیوں گا رہے ہو؟''

یہ بات کچھ عجیب سی لگی، پہلے تو یہ سمجھ ہی میں نہیں آیا کہ مولانا کیا کہہ رہے ہیں۔ غور کیا تو معلوم ہوا کہ گانے کے دوران میری زبان کا کچھ حصہ (غالباً نصف انچ کے قریب) باہر نکل آیا ہے۔ ظاہر ہے کہ مولانا نے میرا چہرہ نہیں دیکھا تو یہ کیسے اندازہ لگا لیا کہ زبان باہر نکلی ہوئی ہے؟ زبان کوئی گز بھر تو باہر نکلی ہوئی نہیں تھی کہ وہ پیچھے ہونے کے باوجود اندازہ لگا لیتے۔ صرف زبان کی نوک باہر نکلی تھی۔ قسم خدائے ذوالجلال کی، ایسا آواز شناس کم از کم میں نے اپنی طویل زندگی میں دیکھا نہ سنا۔ حیران ہوں کہ سُر کا ایسا فہم و ادراک رکھنے والا اس شور و غل کی دنیا میں اور کہاں کہاں موجود ہوگا۔''

ان کا کہنا ہے کہ پندرہ برس اسی انداز سے گزر گئے۔ رفتہ رفتہ محسوس ہونے لگا کہ وہ سُروں کو اس طرح سے برت رہے ہیں کہ ان پر ایک کیفیت طاری ہو جاتی ہے۔ انہوں نے اس کا تذکرہ مولانا سے کیا تو وہ بولے ''ہاں، اب بات بننے لگی ہے۔'' پھر دوسرے ہی سانس میں کہہ دیا۔ ''مگر ابھی مزید ریاض کی ضرورت ہے۔'' یہ زیادہ دل خوش کن بات نہیں تھی، لیکن وہ اس پر بے حد مسرور ہوئے۔ ریاض کرتے ہوئے انہیں چار پانچ برس اور گزر گئے، مگر مولانا پھر بھی یہی کہتے رہے کہ مزید ریاض کی ضرورت ہے۔ مولانا مستقل وہاں نہیں رہتے تھے، اس لیے لطف اللہ ان کے تعاقب میں رہتے تھے۔ وہ جب بھی کراچی میں آ کر ٹھہرتے تو وہ سبق لینے کے لیے انہیں اپنے گھر لے آتے۔ یہ سلسلہ 26 برس تک جاری رہا اور انہوں نے درباری راگ کو اچھی طرح سے سیکھ لیا۔ انہیں موسیقی کا ادراک خاصا ادراک ہو گیا۔ اتنا ادراک کہ انہوں نے ایک بار استاد امانت علی خاں کو بھی مشورہ دے ڈالا۔

لطف اللہ کہتے ہیں۔ ''امانت علی خاں نے آخری دنوں میں شائقین کے اصرار پر غزل گانا شروع کر دی تھی۔ پہلی غزل آتش کی تھی ''یہ آرزو تھی تجھے گل کے روبرو کرتے، ہم اور بلبلِ بے تاب گفتگو کرتے۔'' موسیقی کی دنیا میں دھوم مچ گئی۔ اس غزل کو جس خوب صورتی سے گایا تھا وہ امانت ہی کا حصہ تھا۔ ایک تو کمپوزیشن کا انوکھا پن، دوسرے الفاظ کی واضح ادائی، تیسری خصوصیت ان کی بھرپور آواز، یوں کہیے کہ غزل کی گائیکی میں ایک نئی روح پھونک دی گئی۔ جہاں تک مجھے یاد پڑتا ہے لاہور کے پروڈیوسر اعظم نے اس کی پہلی ریکارڈنگ کی تھی۔ اس میں گلوکار اور آرکسٹرا کا ایسا حسین امتزاج رکھا کہ پروگرام میں چار چاند لگ گئے۔ عوام نے اس غزل کو بے حد پسند کیا اور جب بھی امانت علی کسی محفل میں جاتے تو اس کی فرمائش کی جاتی۔ امانت علی نے بڑھتی ہوئی مقبولیت کے پیشِ نظر رفتہ رفتہ اس میں تبدیلیاں کرنا شروع کر دیں۔

غزلوں کا سلسلہ کامیاب ہوا تو امانت علی نے بعد دیگرے کئی غزلیں کمپوز کرا ڈالیں۔ ابن انشا کی غزل ''انشا جی اٹھو، اب کوچ کرو، اس شہر میں دل کا لگانا کیا'' عوامی پسندیدگی کے سارے ریکارڈ توڑ گئی۔ ظاہر ہے کہ مجھے بھی وہ غزلیں پسند آئیں، لیکن میری بھی چند ترجیحات ہیں۔ ایک دن میں نے امانت علی سے کہا۔ ''میری نظر میں جس سُر سے آپ غزلیں گا رہے ہیں وہ صنفِ غزل اور آپ کی آواز سے مطابقت نہیں رکھتے۔'' وہ اس ریمارک پر چونکے۔ اس سے پہلے کہ کچھ کہیں، میں نے کہا۔ ''مجھے یقین ہے کہ اگر صرف ایک سُر اونچا کر کے آپ گائیں تو غزل کی گائیکی میں ناقابلِ بیان بہتری پیدا ہوگی۔'' یہ سن کر ان کے چہرے سے ناراضی کے بادل چھٹ گئے، مگر کہا کچھ نہیں۔ افسوس کہ انہوں نے میرے مشورے پر عمل نہیں کیا۔

☆☆☆

یہ 1951ء کی بات ہے کہ اشتہاری ایجنسی کے حوالے سے لطف اللہ خان کے ایک کلائنٹ نے ان سے فرمائش کی کہ وہ ان کے لیے ریڈیو پر نشر ہونے والا اشتہار بنا دیں۔ اس کام کے لیے انہوں نے باقاعدہ ایک ٹیپ ریکارڈر خریدا۔ اس کے ساتھ انہوں نے 22 ٹیپ مارکیٹ سے 1146 روپے میں خریدے۔ اس کلائنٹ کا کام تسلی بخش ہو گیا تو ایک ٹیپ پر انہوں نے آوازوں کو ریکارڈ کرنا شروع کر دیا۔ ابتدا انہوں نے اپنی والدہ کی آواز سے کی۔ اس کے بعد کوئی تخصیص نہ رکھی، جتنے بھی شناسا دستیاب ہوئے انہوں نے ان کی آوازوں کو ریکارڈ کر ڈالا۔ وہ ٹیپ ریکارڈر اور اس کی رسید ان کے کلکشن میں محفوظ ہے۔ بہرحال یہ ایک بڑے شوق کی ابتدا تھی۔ ایک روز انہوں نے صبح ریڈیو لگایا تو اس پر ایک پروگرام آ رہا تھا۔ دل چسپ پروگرام تھا، انہوں نے اسے ریکارڈ کر ڈالا۔ اس کے بعد جب ریکارڈنگ کا شوق فزوں تر ہوا تو انہوں نے ریڈیو سے نشر ہونے والے بیشتر پروگرام ریکارڈ کر ڈالے۔

صرف موسیقی کے انہوں نے 42 والیوم ترتیب دیے۔ اس کے علاوہ شاعروں کے کلام کے 800 والیوم ہیں۔ انہوں نے مشہور و معروف پینٹروں اور مصنفوں کے انٹرویو لیے ہیں۔ ایک طرح سے ان کے اسٹوڈیو (جسے آوازوں کی لائبریری بھی کہا جا سکتا ہے) میں ہندو پاک کی آوازوں کی تاریخ موجود ہے۔ موسیقار، گلوکار، شاعر، سیاسی رہنما، ادیب، مذہبی مبلغین اور آرٹسٹ سب ہی کچھ تو ان کی لائبریری میں موجود ہے۔ گویا انہوں نے ایک کائنات کو اپنے ہاں سمیٹ لیا تھا۔ بلاشبہ وہ عظیم وائس کلکٹر تھے۔ کلاسیکی گلوکاروں میں استاد بڑے غلام علی خاں، امانت علی، نصرت فتح علی اور روشن آرا بیگم کی گائیکی کے نمونے ان کے ہاں محفوظ ہیں۔ شاعروں میں فیض احمد فیض اور جوش ملیح آبادی کا کلام انہی کی آواز میں محفوظ کیا۔ سیاسی رہنماؤں میں قائد اعظم، لیاقت علی، خواجہ ناظم الدین، نہرو، مہاتما گاندھی، مولانا ابوالکلام آزاد کی آوازیں اتنی صاف اور واضح انداز میں ریکارڈ کی گئی ہیں جیسے وہ براہِ راست آپ سے مخاطب ہیں۔ ایک محتاط اندازے کے مطابق ان کے پاس تقریباً پانچ ہزار شخصیات کی آوازوں کا ریکارڈ محفوظ ہے۔ موجودہ دور کی شخصیات جن میں ذوالفقار علی بھٹو، ضیاء الحق اور بے نظیر بھٹو شامل ہیں، ان کے ذخیرے میں جگہ پا چکی ہیں۔ ان کے ذخیرے میں قائد اعظم کا ایک ایسا انٹرویو بھی شامل ہے جو اُن کی لندن روانگی سے پیشتر لیا گیا تھا اور جو دنیا میں کسی اور کے پاس نہیں ہے۔

1977ء میں انہوں نے اپنی یادداشتیں ''ہجرتوں کے سلسلے'' کے عنوان سے قلم بند کی۔ وہ کتاب ایک سویا ہوا جن تھی۔ جس کا اس وقت نوٹس نہیں لیا گیا۔ البتہ جب اس کتاب کو 90ء میں پرائم منسٹر ایوارڈ دیا گیا تو دھوم مچ گئی۔ لطف اللہ کا دل بڑھ گیا۔ انہوں نے کئی کتابیں اور لکھ ڈالیں، جو مختلف موضوعات کا احاطہ کرتی ہیں۔

ان کے پاس قرآن پاک کی مولانا طیب کی بیان کی ہوئی تفسیر بھی ہے جو سو گھنٹے کی ہے۔ ان ساری آوازوں کو جمع کرنا بھی کار دارد تھا۔ یہ یوں ہی جمع نہیں ہو گئیں۔ ان کے لیے لطف اللہ نے کافی بھاگ دوڑ کی ہے، ان لوگوں کے پیچھے مارے مارے پھرے ہیں جو اہلِ قلم کہلاتے ہیں۔ ادیبوں نے اپنی کتابوں کے اقتباسات کی خود ریکارڈنگ کرائی ہے۔ لطف اللہ انہیں اپنی گاڑی میں بٹھا کر اپنے اسٹوڈیو تک لاتے اور آوازوں کی ریکارڈنگ کراتے اور ان ہستیوں کی خاطر مدارات میں کوئی کسر نہ اٹھا رکھتے۔ کام میں ربط اور سلیقہ پیدا کرنے کے لیے انہوں نے ایسے ادیبوں اور شاعروں کی فہرست بنالی جنہیں وہ ریکارڈ کرنے کے متمنی تھے۔

فیض احمد فیض نے بیس برس میں اپنا سارا کلام ان کے اسٹوڈیو میں جا کر ریکارڈ کرایا جس کی روداد بے حد دل چسپ ہے۔ لطف اللہ نے اپنے ایک دوست سے تذکرہ کیا

جن کی فیض سے رشتے داری تھی۔ انہوں نے کہا کہ اگلے دن بیگم مجید کے ہاں چلے جائیے اور جا کر فیض کو ریکارڈنگ کے لیے لے آئیے۔ وہ وہاں پہنچے اور بیگم مجید سے اپنا تعارف کرایا تو انہوں نے تاکید کی کہ فیض کو زیادہ دیر نہ روکا جائے۔ فیض اس اثنا میں نزدیک ہی بیٹھے سگرٹ پی رہے تھے۔ انہوں نے رسمی طور پر پوچھنے کی زحمت گوارا نہ کی۔ اشارہ ملنے پر اٹھے اور ان کی گاڑی میں جا بیٹھے۔ راستے میں وہ چپ سادھے رہے۔ لطف اللہ وہاں سے بمشکل ڈیڑھ فرلانگ کے فاصلے پر رہتے تھے۔ جب وہ بے اعتنائی برت رہے تھے تو لطف اللہ نے اپنے تعارف کرانا بھی مناسب نہ سمجھا۔

اسٹوڈیو میں ریکارڈنگ کا انتظام انہوں نے کر رکھا تھا۔ میز پر مائک رکھ دیا گیا تھا اور ان کے تین دیوان اور قلم تھا، تاکہ وہ دیوانوں پر آٹوگراف دے سکیں۔ ان کے بیٹھتے ہی انہیں کافی پیش کی۔ لطف اللہ نے اپنا تعارف کرایا، لیکن مجال ہے جو فیض نے ہاں، ہوں بھی کی ہو۔ وہ عالم بے اعتنائی میں بیٹھے رہے۔ لطف اللہ کو شرمندگی سی ہوئی کہ اپنے بارے میں اتنا بکنے کی کیا ضرورت تھی؟ فیض نے اتنا تک نہیں پوچھا کہ وہ کیا ریکارڈ کرانا چاہتے ہیں۔ فیض نے کافی کی چسکیاں لینا شروع کر دیں اور پیکٹ سے سگرٹ نکال کر پینا شروع کر دی۔ اپنے دیوان پر وہ دستخط کر ہی چکے تھے۔ فیض سپاٹ انداز میں پڑھتے ہیں اور ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے کوئی ڈنڈا لے کر پیچھا کر رہا ہے اور جو کچھ انہیں کرنا عجلت اور شتابی سے کرنا ہے۔ ان کی شعر گوئی سے سامع خراشی کا تاثر ابھرتا ہے۔ مگر لطف اللہ کی رائے اس بارے میں مختلف ہے۔ ان کا خیال ہے کہ فیض پھیکے انداز سے کلام پڑھتے ہیں، لیکن وہ سننے والے کے دل پر اثر کرتا ہے۔ پہلی ریکارڈنگ کے دوران ہی بیگم مجید کا فون آ گیا کہ جلدی سے فیض کو چھٹی دے دیں۔

فیض جب کراچی آتے تھے تو اپنے دوست عبدالشکور کے ہاں ٹھہرتے تھے۔ لطف اللہ وہاں پہنچ جاتے۔ فیض جب بیدار ہوتے تو کپڑے تبدیل کر کے ناشتے کی میز پر آ کر بیٹھ جاتے۔ لطف اللہ دور سے سلام کرتے گویا اپنی موجودگی کا احساس دلا رہے ہوں۔ فیض ناشتے کے بعد سامنے صوفے پر آ کر بیٹھ جاتے اور پھر اخبار پڑھنا شروع کر دیتے۔ اس دوران بالکل مخاطب نہ ہوتے۔ پھر یار دوست آنے لگتے۔ ان کا موڈ بن جاتا تو لطف اللہ کے ساتھ چل پڑتے ورنہ اپنے کسی دوست کے گھر روانہ ہو جاتے اور اس میں معذرت قطعی نہ کرتے۔

ریکارڈنگ کا طریقہ یہ تھا کہ لطف اللہ ان کے سا سارے دیوان رکھ دیتے۔ فیض ایک دیوان اٹھاتے پھر جو نظم مناسب لگتی، وہ ریکارڈ کرا دیتے۔ پھر یہ ہو کہ ایک نظم کئی بار ریکارڈ ہونے لگی۔ لطف اللہ اس اند سے کچھ نہ بولے کہ کہیں ناراض نہ ہو جائیں۔ بہر حال ا دن دل کڑا کر کے مدعا بیان کر ڈالا۔ فیض نے لمبی سے ہ کہی جس کا مطلب یہ تھا کہ ہاں۔ لطف اللہ نے وہ کلام ریکارڈ ہو چکا تھا، دیوان میں تلاش کر کے نشان زد کر دیا جو ریکارڈ ہونا تھا اس پر سوالیہ نشان بنا دیا۔ تاکہ جو رہ گیا فیض اسے ہی ریکارڈ کرائیں۔ بعض اوقات ریکارڈنگ اس طرح سے ہوتی کہ لنچ ٹائم ہو جاتا۔ لطف اللہ، فیض کو واپس چھوڑنے کے بجائے بوٹ کلب لے جاتے، وہاں دنوں پینے کی کوئی پابندی نہیں تھی، فیض دو چار جام فیض یاب ہو جاتے اور موڈ میں آ جاتے۔

ان کی خاموشی کو رفتہ رفتہ زبان مل رہی تھی۔ اب لطف اللہ کے شوق کو تحسین کی نظروں سے دیکھنے لگے تھے اس طویل دورانیے میں فیض نے کبھی ان سے کوئی فر نہیں کی۔ جیسا کہ ادب کے دوسرے شعرا اور ادبا کیا کر تھے۔ ریکارڈنگ کے لیے آنے والے شعرا اور ادبا۔ لطف اللہ گزارش کرتے کہ وہ اپنی سوانح حیات کا کوئی واقعہ بھی ریکارڈ کرائیں جو اس سے پیشتر نہ شائع ہوا ہو ا ریکارڈ۔ فیض نے اس فرمائش پر فی البدیہہ چند اشعار قلم کر ڈالے جو لطف اللہ کی تعریف و توصیف پر مبنی تھے۔ لط اللہ انہیں دیکھ کر کھسیانے اور شرمندہ سے ہوئے۔ فیض نے لکھا تھا:

ذکر پھر کیجیے اس گوشۂ تنہائی کا
جس میں ہر لحہ بپا رہتی ہے ایک محفلِ لطف
منزلِ نغمہ گراں، خانۂ شیریں سخناں
سربسر منبع سو لطف ہے یہ منزلِ لطف

جب ریکارڈنگ کا بڑا حصہ پایۂ تکمیل کو پہنچ گیا تو تجویز پیش کی گئی کہ ان کا کلام چند گلوکاروں کی آوازوں میں ریکارڈ کر کے کلامِ فیض کا لانگ پلے تیار کیا جائے، جس فیض کے چار دواوین کا منتخب کلام فیض خود ان کی آواز اور چند گلوکاروں کی آواز میں ریکارڈ کیا جائے۔ پہلے منصوبہ زیڈ اے بخاری کے سپرد تھا، مگر نہ جانے کیا بات کہ وہ اس منصوبے سے علیحدہ ہو گئے اور ایسا معلوم ہونے لگا جیسے سب چیزوں پر راکھ پڑ گئی ہو۔ ایسے میں لطف اللہ نے پھر سے بیڑا اٹھایا اور ای ایم آئی کے انچارج نے منصوبہ ان کے سپرد کر دیا۔ انہوں نے فیض کی آواز میں ان کی نظمیں ریکارڈ کر لیں مگر جب گلوکاروں کے انتخاب کا مرحلہ آیا تو انہیں بے حد دشواری کا سامنا کرنا پڑا اس لیے کہ اس وقت (1970ء) میں انہیں ایسے سولو گلوکار نہیں ملے جن سے کلام فیض گوایا جا سکتا۔ ایک دشواری یہ بھی تھی کہ جو نظمیں پہلے ہی مشہور گلوکاروں کی آواز میں شہرت پا چکی تھیں انہیں کسی دوسرے گلوکار سے نہیں گوایا جا سکتا تھا۔

بہر حال کسی نہ کسی طرح سے گلوکاروں کا انتخاب ہوا اور گائیکی کا مرحلہ طے ہوا۔ پلے کا سرپوش بنا اور لانگ پلے مارکیٹ میں آیا تو زیادہ پذیرائی نہ ہوئی۔ اس لیے کہ ای ایم آئی نے اس کی کوئی پبلسٹی ہی نہیں کی تھی۔ رائلٹی کے طور پر لطف اللہ کو بھی کچھ نہ ملا۔ لطف اللہ کا کہنا ہے کہ چند برس پہلے انہوں نے حفیظ جالندھری کا لانگ پلے تیار کیا تھا جس کی رائلٹی انہیں صرف چودہ روپے ملی تھی۔ اس صورتِ حال میں، میں کیا مطالبہ کرتا۔

وہ صرف آوازوں کی ریکارڈنگ تک ہی محدود نہیں رہے ہیں، بلکہ انہوں نے بہت سے شاعروں اور ادیبوں کو دوست بنایا اور ان کی زندگیوں میں جھانک کر بھی دیکھا ہے۔ انہیں اس سلسلے میں بے حد دلچسپ تجربات ہوئے ہیں۔ مثلاً اختر حسین رائے پوری کی زندگی کو لے لیجیے۔ لطف اللہ کہتے ہیں۔ ”وہ بہت اچھے افسانہ نگار تھے۔ دنیائے ادب میں انہوں نے شہرت کے جھنڈے گاڑ رکھے تھے۔ ’ہندوستان لغت کمیٹی‘ کے صدر رہے۔ امرتسر کے ایک کالج میں وائس پرنسپل رہے۔ پاکستان بنا تو یہاں ثانوی تعلیمی بورڈ کے صدر بنے۔ پھر یونیسکو سے وابستہ ہو کر پیرس چلے گئے۔ وہاں سے کچھ عرصہ صومالیہ اور ایران میں تعینات رہے۔ فنِ گفتگو میں انہیں مہارت حاصل تھی۔ جب بھی گفتگو کرتے کچھ نہ کچھ انکشاف ضرور کرتے۔ میں ان کی آواز کی ریکارڈنگ کرنا چاہتا تھا کہ ایک روز رات کو گھر آ گئے۔ میں نے انہیں بٹھایا۔ چائے بنوائی۔ انہوں نے چائے پینے کے بعد اپنی آمد کا مقصد بیان کیا۔ ان کے پانچ بیٹے تھے، جن میں سے چار تو برسرِ روزگار تھے۔ مگر سب سے چھوٹا امریکا میں تعلیم حاصل کر کے لوٹا تھا، یہاں اس کا دل نہیں لگا تو واپس جانے کے لیے پر تولنے لگا۔ ڈاکٹر اختر حسین نہیں چاہتے تھے کہ ان کا چھوٹا بیٹا واپس جائے۔ ان کی خواہش تھی کہ اسے کراچی میں کوئی موزوں ملازمت مل جائے۔ انہیں پتا چل گیا تھا کہ صاحب زادے ایڈورٹائزنگ سے دل چسپی رکھتے ہیں۔ میں چونکہ ایک ایجنسی چلا رہا تھا، اس لیے وہ میرے پاس چلے آئے۔ پہلے تو دریافت کیا کہ میرا دفتر کہاں ہے، کب سے قائم ہے، وغیرہ۔ میں نے تفصیل سے بتا دیا کہ میری ایجنسی چھوٹی سی ہے۔ وہ بولے۔ ”لطف اللہ میں ایک تجویز لے کر آپ کے پاس آیا ہوں۔“

میں نے کہا۔ ”حکم دیجیے۔“

وہ بولے۔ ”میں چاہتا ہوں کہ شاہد آپ کے دفتر میں کام کریں۔“

میری ایجنسی چھوٹی سی تھی اور اس بھرتی کی متحمل نہیں ہو سکتی تھی۔ شاید اسی لیے میرے چہرے پر تشویش سی ابھر آئی جسے انہوں نے پڑھ لیا۔ بولے۔ ”میں آپ کی مشکل سمجھ رہا ہوں، میں نہیں چاہتا کہ مالی اعتبار سے آپ زیرِ بار ہوں۔“

مجھے حیرت ہوئی کہ وہ کیا چاہتے ہیں۔ میں سوالیہ نشان بنا ہوا تھا کہ انہوں نے ہچکچاتے ہوئے کہا۔ ”آپ شاہد کی فنی مہارت کا امتحان لے کر یہ طے کریں کہ اس کا ماہانہ مشاہرہ کتنا ہونا چاہیے، جو مشاہرہ آپ طے کریں گے، وہ میں آپ کو ہر ماہ دے دیا کروں گا، لیکن شاہد کو اس کا پتا نہ چلنے پائے۔“

میں نے اس تجویز سے اتفاق نہیں کیا، لیکن یہ سن کر حیرت سے دوچار ہوا کہ وہ اپنے بیٹے کے لیے اس حد تک اپنے دل میں نرم گوشہ رکھتے ہیں۔

☆☆☆

1995ء میں انہوں نے بیشتر امریکی ریاستوں کی گرے ہاؤنڈ بس سروس کے ذریعے سے نوے دن تک سیر کی وہ بھی صرف چھیانوے ڈالر میں! اس بس سروس کا ٹکٹ بے حد سستا ہے اور اس کے مخصوص اسٹیشن ہیں، اس لیے بہت سے لوگ اسے نظر انداز کرتے ہیں۔ امریکا انہیں زیادہ پسند نہیں آیا۔ ان کے تاثرات تھے کہ وہاں ہر شخص جلدی میں رہتا ہے (نہ جانے کیوں)، جب کہ وہ یورپ کی کسی بھی ریاست میں ہر وقت جانا پسند کریں گے۔ اس لیے کہ وہاں وقت کی قدر ہے۔ صرف آدھے گھنٹے پیشتر یورپ کے کسی بھی ملک میں جانے کا ارادہ کر لیجیے، ٹکٹ بک کر لیجیے، اپنا سامان لے کر ائرپورٹ پہنچ جائیے۔ اس کے سوا

آپ کو کچھ نہیں کرنا ہوگا۔ سارا کام وہاں کے لوگ کریں گے۔ ان کا کہنا تھا کہ سیر و سیاحت ان کی روح میں بسی ہوئی ہے۔ بہت سے شوق انہوں نے پال پوس کر چھوڑ دیے لیکن سیاحت ان کے دامن سے چمٹی رہی۔ دراصل سیاحت کا انہیں بچپن ہی سے شوق تھا۔۔۔۔۔۔ ان کے والد ریلوے میں ملازم تھے جس کے فری پاس انہیں سال میں دو بار ملتے تھے۔ اس کے ذریعے سے انہوں نے سارا انڈیا گھوم لیا۔ بعد میں انہوں نے طیارے کے ذریعے بھی سیر کی، لیکن ریل کے سفر کو زیادہ رومینٹک پایا۔ اس لیے کہ ریل رکتی ہوئی چلتی ہے اور پلیٹ فارم پر اتر کر شہر کا نظارہ کیا جاسکتا اور لوگوں کے رہن سہن کا مطالعہ کیا جاسکتا ہے۔ ان کی ملاقات ایک بار اختر حسین رائے پوری کے بھائی شمیم اختر سے چرچ گیٹ کے ریلوے اسٹیشن پر ہوئی۔ (شمیم صاحب اردو ادب پر گہری نظر رکھتے تھے۔ وہ عام شعرا کی طرح مفلوک اور مفلس تھے۔ لطف اللہ کا کہنا ہے کہ انہیں برسر روزگار کبھی نہیں دیکھا) وہاں بجلی سے چلنے والی ٹرینیں مناسب وقفوں سے چلتی تھیں اور ممبئی کے اندرونی حصوں میں جاتی تھیں۔ شام کا وقت تھا اور لوگ پاس دکھا کر ڈبوں کی طرف جا رہے تھے۔ شمیم صاحب لطف اللہ کو بازو سے پکڑ کر ایک طرف لے گئے اور سرگوشی میں بولے۔ ''مجھے ملاڈ جانا ہے۔ آپ کے پاس چھ آنے ہوں گے؟'' لطف اللہ بھی انہی کی طرح سے بے روزگار تھے اس لیے انہوں نے معذرت کرلی۔ وہ جب بھی اس واقعے کو یاد کرتے تو ازحد رنجیدہ ہوجاتے۔

ریل سے زیادہ کار کا سفر پسند تھا، اس لیے کہ کار کو اپنی مرضی سے جہاں چاہے روکا جاسکتا ہے اور مناظر کی تصویر کشی بھی کی جاسکتی ہے۔ انہوں نے بال بچوں کے ساتھ وطنِ عزیز اور دوسرے ممالک کے متعدد سفر کیے۔ جس میں وسط ایشیا کے ممالک شامل ہیں۔ عراق، لبنان، شام، افغانستان، ایران، اور ترکی کے تمام گوشے ان کے دیکھے ہوئے تھے۔

☆☆☆

پاکستان اکیڈمی آف لیٹرز نے 2010ء میں لطف اللہ خاں کو 2009ء کے کمالِ فن ایوارڈ سے نوازا۔ ٹیلی وژن کے لیے سانیا سعید نے ان کے انٹرویو لائیو پروگرام میں ریکارڈ کیے جنہیں ناظرین نے نہایت شوق سے دیکھا۔ 14 اگست 2011ء میں انہیں پرائڈ آف پرفارمنس ملا۔ انہوں نے 3 مارچ 2012ء کو ہفتے کے روز صبح کراچی میں انتقال کیا۔ اس سے پیشتر ان کے دل کا آپریشن ہوچکا تھا اور ان کی سماعت بھی متاثر تھی۔ انہوں نے اپنے پیچھے ایک بیوی دو بیٹے اور تین بیٹیاں چھوڑیں۔ ان کی ایک بیٹی سندھ کے ایک سابقہ وزیر اعلیٰ سے بیاہی ہوئی ہیں۔

عمر کے آخری حصے میں ان کی سب سے بڑی خواہش تھی کہ حکومت وہ سارا ذخیرہ، جو انہوں نے 68 برس تک محفوظ کیا ہے ان سے لے کر اس کام کو سائنسی بنیادوں پر کرے۔ اس لیے کہ ان کے پاس ایسی آوازوں کا ذخیرہ ہے، جن سے موسیقی کی تاریخ مرتب کرتے وقت بڑی مدد ملے گی۔ ان کا کہنا ہے کہ ان کا میوزیم نہ تو فائر پروف ہے، نہ چوری چکاری سے محفوظ، پھر یہ کہ ان چیزوں کا بیمہ بھی نہیں ہے۔ ایک اطلاع کے مطابق بی بی سی نے ان کے میوزیم کو خریدنے کے لیے بھاری رقم کی پیشکش کی تھی، لیکن انہوں نے اسے قبول نہیں کیا۔ ان کی خواہش تھی کہ ان کا اثاثہ وطنِ عزیز میں ہی رہے اور یہاں کے لوگوں کے کام آئے۔

لطف اللہ کی شخصیت ہشت پہلو تھی۔ ان کی اہلیہ زاہدہ کا کہنا ہے کہ وہ چیزوں کے معیار پر مصالحت نہیں کرتے تھے۔ جب ایک کام کو کرنے کی ٹھان لیتے تھے تو اس کی باریکیوں کو سمجھ لیتے تھے اور پھر آستینیں چڑھا کر کام شروع کردیتے تھے۔ انہیں ہر کام خود کرنا پسند تھا۔ البتہ زاہدہ ان کا ہاتھ بٹاتی تھیں تو وہ کچھ نہیں کہتے تھے۔ زاہدہ ان کی دوسری بیوی ہیں جن سے انہوں نے پہلی بیوی کے انتقال کے بعد عقد کیا تھا۔ گھٹیا پن سے انہیں نفرت تھی۔ وہ خوش لباس اور سرو قامت تھے۔ مجمع میں انہیں شناخت کرنے میں کوئی دشواری نہیں ہوتی تھی۔ وہ نرم لہجے میں بات کرتے تھے اور نرم دل بھی تھے۔ مہمان نواز تھے اور خاطر تواضع کے بغیر ملاقاتیوں کو گھر سے نہیں جانے دیتے تھے۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ انہوں نے کبھی کوئی کاغذ ضائع نہیں کیا۔ حد یہ کہ وہ خریداری کی رسیدیں تک محفوظ کرلیا کرتے تھے۔ جب کہ لوگ انہیں بے کار سمجھ کر پھینک دیتے ہیں۔ ہفتے میں پانچ دن وہ اپنی اشتہاری ایجنسی پر بیٹھا کرتے تھے جو ویسٹ وہارف پر تھی۔ ان کا ڈرائیور ڈیفنس سوسائٹی سے انہیں لاتا لے جاتا تھا۔

مسکراہٹوں کا عکاس

شکیل ادریس

وہ ایک ایسا اداکار تھا جس کا نام سنتے ہی لوگوں کے ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیل جاتی تھی۔ اس کا نام سن کر لوگ سنیما ہالز کا رخ کرتے تھے۔ ایسے جدت بھرے انداز میں وہ خود کو پیش کرتا تھا کہ لوگ اس کے دیوانے ہوجاتے تھے۔

ایک بے مثال اداکار کا تذکرۂ خاص

ابن صفی نے 1956ء کے لگ بھگ عمران سیریز کے ناول لکھنا شروع کیے۔ یہ کردار ان کے دو سابقہ کرداروں سے زیادہ پسند کیا گیا۔ عمران ایک اسمارٹ، خوش پوش اور زیرک کردار تھا، مگر ہمہ وقت خود پر حماقت طاری رکھتا تھا۔ تقریباً اسی زمانے میں وطنِ عزیز میں مزاحیہ اداکار جیری لوئس کی فلمیں بھی سینما ہالوں میں چلا کرتی تھیں۔ وہ قارئین جو عمران سیریز کے ناول پڑھا کرتے اور جیری کی فلمیں بھی دیکھا کرتے تھے ان کا کہنا تھا کہ اگر عمران سیریز پر فلمیں بنائی جائیں تو ابن صفی کو

چاہیے کہ وہ اس اداکار کو عمران بنادیں۔ فلمیں ہٹ ہو جائیں گی۔ اس لیے کہ جیری عمران کے کردار پر بالکل فٹ ہے۔

جیری لوئس تک یہ خبر نہیں پہنچی ورنہ وہ پاکستان ضرور آتا اور اپنی اداکاری کے جوہر دکھاتا۔ بہر حال اس نے ہالی ووڈ میں جب 15 برس سے فلموں میں کام کرنا شروع کیا تو چند برسوں ہی میں ناظرین کی آنکھوں کا تارہ بن گیا۔ اتنی جلدی فلموں میں کام کرنے کی وجہ یہ تھی کہ چودہ برس کی عمر میں اس نے اپنے ایک استاد کو برا بھلا کہا اور اسے زدوکوب بھی کیا تھا۔ اسکول سے فرار ہو کر اسے اور کچھ نہ سوجھا تو اس نے اسٹوڈیو کا رخ کیا اور چھوٹے موٹے کردار ادا کرنے لگا۔

جب اس کی فلمیں امریکا کے علاوہ دوسرے ملکوں میں ریلیز ہوئیں تو وہ چھوٹے بڑے سب ہی کا پسندیدہ بن گیا۔ ناظرین اس کی صورت دیکھتے ہی ہنسنا شروع کر دیتے تھے۔ جیری نے اپنی فلموں کی کہانیاں خود لکھیں، خود پروڈیوس کیں، خود ہی گیت گائے اور خود ڈائرکٹ بھی کیں۔ یوں وہ کہانی نویس، فلمساز، گلوکار اور ہدایت کار کہلایا۔ وہ حقیقی معنوں میں ایک جینئس تھا۔ اس نے امریکا کے نوصدور سے مصافحہ کیا اور چار کے لیے خصوصی شوز منعقد کیے۔

وہ 16 مارچ 1926ء میں پیدا ہوا اور اس نے فلم، ریڈیو اور ٹیلی وژن پر مزاحیہ اداکار کی حیثیت سے جو نام پیدا کیا اور جو شہرت حاصل کی وہ کسی اور کے حصے میں نہیں آئی۔ اس نے 1946ء میں اداکار ڈین مارٹن کے ساتھ اپنی جوڑی بنائی تھی جو لوگوں میں بے حد مقبول ہوئی۔ جوڑی بنانے کا رواج ماضی میں بھی رہ چکا ہے۔ اس سے پہلے لارل اور ہارڈی نے بھی جوڑی بنائی تھی اور لوگوں کو ہنسا ہنسا کر پیٹ میں بل ڈال دیے تھے۔ پاکستان میں الن اور ننھا کی جوڑی بھی بہت پسند کی گئی۔ چند فلموں میں رنگیلا اور منور ظریف کی جوڑی بھی کامیابی سے ہمکنار ہوئی۔

وہ نیو جرسی میں پیدا ہوا تھا۔ اس کی ماں ریڈیو پر مغنیہ تھی اور مذہب کے لحاظ سے یہودی تھی، جب کہ باپ ڈینئل لیوچ روسی تھا اور مزاحیہ اداکار کی حیثیت سے لوگوں کا دل بہلایا کرتا تھا، اس کا نام ڈینی لوئس تھا۔ جیری لوئس نے پانچ برس کی عمر ہی سے اپنے والدین کے ساتھ اداکاری شروع کر دی تھی۔ یہ 1931ء کا زمانہ تھا۔ وہ نیویارک میں پیش کیے جانے والے شوز میں ان کے ساتھ رہتا تھا۔ اس نے گلوکاری کی طرف بھی توجہ دی اور لوگوں کو اپنا گرویدہ بنالیا۔

ابتدا میں اس نے اپنا نام جوئی لوئس رکھا تھا لیکن بعد میں معلوم ہوا کہ جوئی نام کا ایک پہلوان ہے۔ چناں چہ اس نے جیری لوئس بن جانا بہتر سمجھا اور یہ نام اب تک اختیار کیے ہوئے ہے۔ اس کی پڑھائی نامکمل تھی، لہٰذا اس نے نیوجرسی کے آروِنگٹن ہائی اسکول سے گریجویٹ کیا۔ دوسری جنگ عظیم کے دوران جب وہ فوج میں گیا تو ڈاکٹر نے اسے مسترد کر دیا کیونکہ اس کا دل کم زور تھا۔

اداکاری تو اس کے خمیر میں شامل تھی، لہٰذا اس نے اسٹیج یا فلم کے لیے کام دلوانے والے ایک ایجنٹ کے آفس کے چکر کاٹنا شروع کر دیے۔ اس نے ایک ہوٹل کے اسٹیج پر لوگوں کا دل بہلانے کے لیے اس کی بکنگ کر لی۔ ہوٹل میں بیٹھنے والوں کو اس کی مزاحیہ حرکتیں اتنی پسند آئیں کہ انہوں نے اس سے کہا کہ وہ مستقل اس ہوٹل میں آیا کرے۔

صرف اسی ایک ہوٹل میں نہیں بلکہ جیری نے ایسے متعدد ہوٹلوں میں کام کیا۔ اس کے بعد عام پبلک کے لیے شو کرنے لگا۔ اس وقت اس کے ساتھ ڈین مارٹن ہوا کرتا تھا۔ ان کے شو بے حد مقبول ہوئے۔

پیراماؤنٹ فلمز کے ایک ہدایت کار ہال والس نے ان کا شو ہوٹل کوپا کبانا میں دیکھا تو انہیں اپنی فلم "مائی فرینڈ ارما" میں کام کرنے کی پیشکش کی جسے انہوں نے منظور کر لیا۔ فلم ریلیز ہوئی اور اس جوڑی کی مزاحیہ حرکتوں پر باکس آفس پر کامیاب ہوئی۔ نیویارک ٹائمز نے اس فلم پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا کہ اس فلم کو دیکھ کر پیٹ میں بل پڑ جاتے ہیں۔ اس نئے اداکار جیری لوئس میں اداکاری کے بہت جوہر ہیں۔ وہ نوجوان ہے، اس کے چہرے پر ہر وقت مزاح کا نقاب پڑا رہتا ہے۔ وہ آوازیں بھی تبدیل کر سکتا ہے۔ اگر اسے چانس ملتا رہا تو یہ ایک روز بڑا اداکار بنے گا۔ اس کا ساتھی اداکار ڈین مارٹن بھی باصلاحیت ہے۔

ایک ہدایت کار نے جیری لوئس کی جوڑی ڈین مارٹن کے ساتھ بنا دی اور ان سے کئی فلموں میں کام کرایا۔ اس کے ساتھ ہی ان دونوں نے نائٹ کلبوں میں ساتھ گانا شروع کر دیا اور ریڈیو پر بھی پروگرام کرنا شروع کر دیے جس سے انہیں پونے دو سو ڈالر فی ہفتہ کی آمدنی ہونے لگی۔

اسی اثنا میں انہیں کچھ ٹیلی وژن پر لائیو پروگرام بھی مل گئے۔ ان کا پہلا پروگرام 20 جون 1948ء کو پیش کیا گیا تھا۔ جس کا نام ٹوسٹ آف ٹاؤن تھا۔ اس کے بعد انہیں سیلوان شو میں مستقل کام مل گیا۔ شہرت، عزت اور دولت کی دیوی ان پر مہربان تھی۔ دو چار ٹیلی وژن شوز میں انہیں کام مل گیا تو انہوں نے کچھ وقت ٹیلی وژن پر کاٹا مگر پھر اس کے بعد پیراماؤنٹ پکچرز نے اس جوڑے کو کاسٹ کر کے پھر فلمیں بنانا شروع کر دیں۔ سب تفریحی فلمیں تھیں اس لیے انہوں نے خوب بزنس کیا۔ یوں اس جوڑی نے یکے بعد دیگرے سولہ فلمیں مکمل کیں۔

فلموں کے علاوہ ان دونوں نے براڈوے تھیٹرز میں بھی کام کیا۔ جب ڈراما ختم ہو جاتا تھا تو وہ شائقین کی طرف اپنی تصویریں پھینکتے تھے۔ ایک اندازے کے مطابق انہوں نے پچھتر ہزار ناظرین پر دس لاکھ تصویریں پھینکیں تھیں۔ ان تصویروں کو حاصل کرنے میں شائقین آپس میں لڑائی جھگڑے بھی شروع کر دیتے تھے۔

فلموں میں ڈین مارٹن کا کردار بہر حال اضافی ہوا کرتا تھا جب کہ مرکزی کردار جیری لوئس ادا کیا کرتا تھا۔ چنانچہ ان دونوں میں کھنچاؤ پیدا ہونے لگا۔ اسی اثنا میں ایک رسالے نے ان کی تازہ فلم کی تصاویر سرورق پر شائع کیں تو ڈین مارٹن کی تصویر غائب کر دی۔ یہ بات ڈین کو بہت ناگوار گزری، لہٰذا ان دونوں میں علیحدگی ہو گئی۔ یہ علیحدگی 24 جولائی 1956ء میں ہوئی، ٹھیک دس برس بعد جبکہ وہ اکٹھا ہوئے تھے۔ اس علیحدگی میں جیری لوئس کا کوئی قصور نہیں تھا۔ وہ اکٹھا سولہ فلموں میں پیش ہوئے تھے۔

ڈین مارٹن اوہایو میں 7 جون 1917ء کو پیدا ہوا تھا۔ پیدائش کے بعد اس کا نام ڈیانو پال رکھا گیا تھا۔ اس کا باپ گیٹانو اور ماں انجیلا کوروشی اٹلی سے ہجرت کر کے امریکا آئے تھے۔ ڈین کا صرف ایک بھائی تھا ئبل۔ اس وقت دونوں صرف اٹالین بولا کرتے تھے۔ اسکول میں داخلہ لینے کے بعد ڈین نے اپنے شوق کی خاطر ایک ریستوراں میں ڈرم بجانا شروع کر دیا۔ اپنی ٹوٹی پھوٹی اٹالین کی وجہ سے اسے ساتھیوں کے مذاق کا نشانہ بننا پڑتا تھا۔ تاہم وہ خود کو انگریزی کے ٹیچر سے زیادہ اسمارٹ سمجھتا تھا۔ اس لیے اسکول سے اس کا نام خارج کر دیا گیا۔ وہ ایک ڈیلر کے ہاں ملازم ہو گیا جو غیر قانونی طور پر اس سے شراب فروخت کراتا تھا۔ چند ماہ تک ڈین نے یہ کام کیا پھر ایک مل میں ملازم ہو گیا اور محنت کشی کرنے لگا۔ اسی اثنا میں اسے باکسنگ کا شوق ہو گیا تو وہ اس کی تربیت حاصل کرنے لگا۔ 15 برس کی عمر میں وہ باکسر بن گیا اور پیسوں کے لیے ہونے والے مقابلوں میں حصہ لینے لگا۔ ان مقابلوں میں حصہ لینے سے اس کی ناک ٹوٹی، ہونٹ پھٹ گئے اور چہرے پر سیکڑوں زخم آئے۔ تاہم اس نے گیارہ مقابلے جیت لیے۔ وہ ایک اور باکسر کنگ کے ساتھ رہتا تھا اور گھر کو چھوڑ چکا تھا۔ دونوں اس وقت تک اپنے فلیٹ میں مقابلہ کرتے تھے جب تک ان میں سے ایک ناک آؤٹ نہ ہو جاتا۔

پھر اس کو باکسنگ سے اکتاہٹ ہو گئی اس لیے کہ اس میں کچھ مل نہیں رہا تھا۔ ان ہی دنوں اسے کسی نے بتایا کہ فلاں تمباکو کی دکان کے پیچھے ایک شراب خانہ کھلا ہے۔ وہاں ویٹر کی جگہ خالی ہے۔ مارٹن نے وہاں ملازمت کر لی۔ جب موقع ملتا وہ اسٹیج پر چڑھ کر گانے لگتا۔ پھر ایک ہوٹل میں تین لڑکوں کے بینڈ میں شامل ہو گیا۔ انہوں نے اس کا نام تبدیل کر کے ڈین مارٹن رکھ دیا۔

1941ء میں اس نے الزبتھ نامی ایک سنگر سے شادی کر لی جس کے نتیجے میں ان کے چار بچے ہوئے۔ ڈین کی اب پرسنالٹی بن چکی تھی۔ وہ جہاں بھی کام ملتا سنگر کی حیثیت سے گانے لگتا۔ پہلے وہ معروف اداکاروں کی نقل کرتا تھا۔ اس کے بعد رفتہ رفتہ اس نے اپنا علیحدہ اسٹائل بنالیا۔ اس سے یہ ہوا کہ اسے ہائی کلاس ہوٹلوں میں بلایا جانے لگا۔

1944ء میں جب دوسری عالمی جنگ چھڑی تو وہ فوج میں چلا گیا۔ گانا اس نے اب بھی نہ چھوڑا۔ وہ فوجیوں کے نائٹ کلبوں میں گایا کرتا تھا، لیکن کوشش کے باوجود اسے فرینک سناترا جیسی مقبولیت حاصل نہ ہو سکی۔ (فرینک سناترا کی گڈی اس زمانے میں چڑھی ہوئی تھی اور لوگ اسے اسٹیج پر دیکھتے ہی سیٹیاں بجانے لگتے تھے)۔ جنگ ختم ہوئی تو اسے فلموں میں گلوکاری کا شوق ہوا۔ وہ میٹرو گولڈن میئر اور کولمبیا پکچرز میں ملازمت کا خواہاں تھا۔ لیکن انہوں نے اسے گھاس نہ ڈالی اس لیے کہ وہاں بہت سے سنگر پہلے سے ہی اپنے فن کا جوہر دکھا رہے تھے۔

بالآخر اس کی ملاقات ایک ہوٹل میں مزاحیہ گلوکار اداکار جیری لوئس سے ہو گئی۔ دونوں مل کر گانے بجانے لگے اور فلموں تک پہنچ گئے۔ پبلک میں اس جوڑے کی مقبولیت کا اندازہ اس سے لگایا جا سکتا ہے کہ ایک رسالے ڈی سی کامکس نے ان کے کارٹونوں پر مبنی کہانیاں 1952ء سے 57ء تک شائع کیں۔ جب ان میں علیحدگی ہو گئی تو اس رسالے نے صرف جیری لوئس ایڈونچرز 1971ء تک شائع کیے۔ ان ایڈونچر کہانیوں میں سپر مین اور بیٹ مین کو بھی جیری کے ساتھ شامل کیا جاتا تھا۔

اس علیحدگی کے بعد ان دونوں نے علیحدہ فلموں میں

کام کرنا شروع کردیا۔ ان کی فلمیں اب بھی مقبول ہو رہی تھیں مگر انہوں نے دوبارہ یکجائی کی بات نہیں کی۔ وہ عوامی پارٹیوں میں بھی یکجا نہیں دیکھے گئے۔ البتہ 1976ء میں جب فرینک سناترا نے ایک پارٹی دی تھی تو دونوں نے اس میں شرکت کی۔ پھر ڈین مارٹن کے بیٹے کی وفات پر جیری نے تدفین میں شرکت کی۔

دونوں کی یکجائی 1981ء میں اس وقت بھی ہوئی جب ایک چھوٹی سے تقریب میں جیری نے ڈین کی سالگرہ کے موقع پر کیک کاٹا اور اس سے مصافحہ کر کے اسے مبارکباد دی۔ جب 2005ء میں جیری نے اپنی یادداشتوں پر مشتمل کتاب لکھی تو اس میں ڈین کا تذکرہ خصوصیت سے کیا۔

اس نے لکھا "جب ڈین سے میری ملاقات ہوئی تو مجھے ایسا لگا کہ میں نے اپنے بھائی کو پالیا ہے۔ مجھے ایسا شخص مل گیا تھا جو میرے لیے ایک ہیرو کی حیثیت رکھتا تھا۔ اس کا رویہ میرے لیے مؤدبانہ تھا لیکن وہ مجھے احساس دلاتا رہتا تھا کہ میں اس کے سامنے بچہ ہوں .... ایک شرارتی بچہ! وہ مجھے چھوڑ کر چلا گیا، مجھے اعتراف ہے کہ وہ ایک جینئس آرٹسٹ تھا۔ اس کا نام رہتی دنیا تک اس کے مداحوں کے دلوں میں محفوظ رہے گا۔ قادر مطلق اسے خوش رکھے۔"

ڈین نے 1995ء میں انتقال کیا اور اپنے لاکھوں شائقین کو مایوس چھوڑ کر دوسری دنیا کے لامتناہی سفر پر روانہ ہوگیا۔

مارٹن کے بغیر جیری نے 1957ء میں تنہا ایک فلم "دی ڈیلیکیٹ ڈیلیجیوئنٹ" مکمل کی اس کے بعد اس کی جوڑی فرینک تاشلین کے ساتھ بن گئی اور انہوں نے پانچ فلمیں مکمل کیں جو ناظرین نے پسند کیں۔

1958ء میں اس کے گیتوں کا ایک البم "جیری لوئس نے ابھی ابھی گایا" مارکیٹ میں آیا جس سے لوگوں نے جان لیا کہ وہ محض اداکار ہی نہیں گلوکار بھی ہے۔ ہر چند کہ اسے بڑے گلوکاروں میں شامل نہیں کیا گیا، لیکن اس نے خود کو منوا لیا۔ اس نے 1959ء میں "گیشا بوائے" پیش کیا۔

جیری کو اپنے اوپر اعتماد ہو چکا تھا۔ اس لیے اس نے پیراماؤنٹ پکچرز سے معاہدہ کیا کہ وہ آیندہ سات برس میں چودہ فلموں میں کام کرے گا اور اس کے لیے ایک کروڑ ڈالر اسے ادا کیے جائیں گے اور منافع میں سے ساٹھ فی صد رقم اسے ادا کی جائے گی۔ اس کے علاوہ وہ تمام فلموں میں کوئی بڑا اداکار نہیں لیا جائے گا۔ وہ فلمیں "ون اسٹار" ہوں گی۔

1960ء میں جب اس نے "وزٹ ٹو ایک اسمال پلینٹ" مکمل کی تو اس کے بعد معاہدہ ختم کر دیا۔ جب کہ پیراماؤنٹ کرسمس کے لیے ایک مزاحیہ فلم ریلیز کرنا چاہتا تھا۔ اس نے جیری سے معاہدہ کیا کہ وہ اس کے لیے فلم بنائے، سرمایہ پیراماؤنٹ لگائے گا۔

جیری نے منظور کرلیا اور فلم کا نام "بیل بوائے" رکھا۔ فلم کی شوٹنگ کے لیے اس نے فاؤنٹین بلو ہوٹل کا انتخاب کیا۔ کہانی کا صرف خاکہ اس کے ذہن میں تھا، اس لیے اس نے اسکرپٹ لکھنے کی زحمت گوارا نہیں کی۔ فلم کی شوٹنگ دن میں کی جاتی تھی اور ریہرسل رات میں۔ پیراماؤنٹ کو جب پتا لگا کہ وہ خاموش فلم بنا رہا ہے تو انہوں نے معاہدے کو ختم کر دیا۔ جیری نے فلم کو ساڑھے نو لاکھ ڈالر میں مکمل کیا اور اپنے طور پر ریلیز کیا۔ اس فلم میں اس نے ایک نیا تجربہ کیا تھا کہ ٹیلی وژن کا کیمرا اور بہت سے مونیٹر استعمال کیے، تاکہ وہ جو کچھ کر رہا ہے۔ اسے فوری طور پر مونیٹر پر دیکھ سکے۔ فلم کامیاب ہوئی تو جیری کو حوصلہ ہوا اور اس نے رچمنڈ نامی مصنف کے ساتھ مل کر پانچ فلموں کی کہانیاں لکھیں اور انہیں پکچرائز کیا۔ 1961ء میں دی لیڈیز مین۔ 1962ء میں اریند بوائے۔ 1963ء میں نائی پروفیسر۔ 1964ء میں دی پیسٹی۔ 1965ء میں اس نے دی فیملی جیولز ڈائرکٹ کی جس کی کہانی کچھ یوں تھی کہ ایک لڑکی کو ورثے میں لاکھوں کی جائداد مل جاتی ہے جب کہ اس کے چھ چچا اس کی دولت پر نگاہ رکھتے ہیں۔ لڑکی کا باڈی گارڈ اسے ہر مصیبت سے بچاتا ہے، اس لیے کہ چھ چچا اس کی جان کے لاگو ہو جاتے ہیں۔ آخر میں وہ باڈی گارڈ سے شادی کر لیتی ہے۔

جیری نے نہ صرف یہ کہ چھ چچاؤں بلکہ باڈی گارڈ کا کردار بھی ادا کیا۔ اس کی یہ فلم بے حد پسند کی گئی۔

1967ء سے لے کر 1969ء تک ٹیلی وژن نے اس کی فیچر فلموں پر کارٹون فلمیں بنائیں جنہیں بچوں نے بہت پسند کیا۔ وہ بڑوں کے ساتھ بچوں کا بھی پسندیدہ اداکار تھا۔

1966ء میں جب لوئس کی عمر چالیس برس ہوگئی تو اس کے چہرے پر بڑھاپا نمایاں ہوگیا۔ پیراماؤنٹ کے نئے سربراہ نے 1959ء میں ہونے والا معاہدہ منسوخ کر دیا جس کی رو سے جیری کو فلموں میں سے ساٹھ فی صد منافع مل رہا تھا۔ اس کا کہنا تھا کہ بچے یا بوڑھے اتنے عمر رسیدہ شخص کو بطور مزاحیہ اداکار قبول نہیں کر سکتے۔ اس کے علاوہ جیری میں پہلے جیسی پھرتی اور چلت پھرت بھی نہیں رہی ہے۔

لوئس نے ان باتوں کو فضول ثابت کرنے کے لیے کولمبیا پکچرز سے معاہدہ کرلیا اور بہت سی فلمیں مکمل کرائیں۔ اسی اثنا میں اس نے پروفیسر کی حیثیت سے لاس اینجلس کی ایک یونی ورسٹی میں چند برس تک فلم ڈائرکشن پر لیکچر بھی دیے۔ اس کے ہونہار شاگردوں میں اسٹیون اسپلبرگ اور جارج لوکس بھی شامل تھے جنہوں نے ہالی ووڈ کے لیے بڑے بجٹ کی فلمیں بنائیں اور دنیا بھر میں شہرت کے جھنڈے گاڑ دیے۔ جیری کے ان لیکچروں کو یکجا کر کے ایک بڑے پبلشر نے کتابی صورت میں بھی شائع کیا، جو نو آموز ہدایت کاروں کے لیے رہنما کتاب ہے۔ اس کے ہاتھ کے لکھے ہوئے بہت سے اسکرپٹ نیویارک کی لائبریری میں محفوظ ہیں۔ یہ بڑے اعزاز کی بات ہے، ورنہ عام آدمیوں کے کاغذات لائبریریوں میں محفوظ نہیں کیے جاتے۔

جیری نے اسٹیج پر بھی اپنے فن کے جوہر دکھائے ہیں۔ اس نے 1976ء میں براڈوے کے ایک ڈرامے "ڈیم یانکی" میں کام کیا جس کا معاوضہ اس نے تمام اداکاروں سے بڑھ کر لیا۔ اس ڈرامے کا ہدایت کار باب مارشل تھا جو اس سے پیشتر کئی اور ڈراموں کی ہدایت دے چکا تھا اور مقبولیت حاصل کر چکا تھا۔ اس ڈرامے کے 185 شوز ہوئے۔ اس کے بعد براڈوے نے اس شو کو دنیا بھر میں دکھانے کا پروگرام بنایا۔ دوسرے برس انہوں نے آٹھ ملکوں میں.... کامیابی سے شو کیے۔ کئی ممالک نے ایڈوانس بکنگ کے لیے اتنی درخواستیں دیں کہ اگر وہ سب کی سب قبول کر لیتے تو پوری عمر ڈراما ہی دکھاتے رہ جاتے۔ جب براڈوے اپنا یہ تھیٹر لے کر آسٹریلیا گئی تو لوگوں نے اس قدر والہانہ انداز میں استقبال کیا کہ جیری متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکا۔ اس نے اعلان کیا کہ وہ ہر سال آسٹریلیا ضرور آئے گا۔ اس کے علاوہ جب اس نے یورپ میں اسٹیج ڈرامے کیے تو اس کی شہرت کو دوام حاصل ہوا۔ فرانس میں جب اس نے اولمپیا تھیٹر میں اپنا ایک ڈراما پیش کیا تو اس کے سارے ٹکٹ آدھے گھنٹے میں فروخت ہو گئے۔

1981ء میں اس نے "ہارڈلی ورکنگ" میں اداکاری کے جوہر دکھائے اور دوبارہ فلمی دنیا میں آگیا۔ جیری نے اس فلم کی کہانی لکھی اور ہدایت بھی خود ہی دی تھی۔ ہر چند کہ وہ چالیس سے اوپر ہو گیا تھا، لیکن اس کی فلمیں اب بھی پسند کی جا رہی تھیں۔ مذکورہ فلم نے 5 کروڑ ڈالر کا بزنس کیا۔

اس کے بعد اس نے تلے اوپر کنگ آف

کامیڈی، ایری زونا ڈریم، فنی بونز میں کام کیا۔ 1994ء میں کولمبیا پکچرز نے ایک کلاسیک فلم "نارتھ" بنائی جس میں جیری نے کھرب پتی شہزادے کا کردار ادا کیا۔ اس فلم نے بھی باکس آفس پر بھاری بزنس کیا۔

1963ء میں اس کی فلم ناٹی پروفیسر بہت پسند کی گئی تھی، لہٰذا اس نے اس کا دوسرا حصہ بنایا جس میں اس کے بھتیجے کی آواز ڈالی گئی تھی، اس لیے کہ ان دنوں جیری کا حلق خراب تھا اور آواز کے لحاظ سے اسے شناخت کرنا دشوار تھا۔

امریکا سے زیادہ جیری کو فرانس میں پسند کیا جاتا تھا، اس لیے کہ اسے الفرڈ ہچکاک کی طرح سے فلم کے ہر شعبے پر عبور حاصل تھا۔ مارچ 2006ء میں جب کہ وہ اسّی برس کا ہو چکا تھا، فرانس کے ثقافت کے وزیر نے اسے لیجن آف آنر کا تمغا پہنایا اور "فرانسیسیوں کا ہر دل عزیز کامیڈین" کا خطاب دیا۔

اس سے پیشتر ائیرپورٹ پر اس کا استقبال کرنے کے لیے اس کے مداحوں کی ایک بڑی تعداد جمع ہو گئی جس میں پولیس سے تعلق رکھنے والے بھی موجود تھے۔

جیری نے اس موقع پر معذرت کی کہ وہ فرانسیسی نہیں بول سکتا۔ لیکن فرانس کے لوگوں کو میرے دل کی آواز ضرور سنائی دیتی ہے۔ میں اس تقریب کی مناسبت سے اس وقت ایک لطیفہ ضرور سنانا چاہتا ہوں کہ جب ٹانگ میں درد کی وجہ سے میں ایک ڈاکٹر کے پاس گیا تو اس نے میرا معائنہ کرنے کے بعد بتایا کہ میں دہری شخصیت کا مالک ہوں۔ فیس کے طور پر اس نے اسّی ڈالر طلب کیے۔ میں نے اسے چالیس ڈالر دیے اور کہا کہ چالیس ڈالر دوسرے جیری لوئس سے لے لیتا۔

اس تقریب میں اس کی فلم "دی ناٹی پروفیسر" دکھائی گئی۔ ایک آرٹ فلم تھیٹر نے تین دن تک اس کی فلموں کی لگاتار نمائش کی۔ فرنچ فلم لائبریری نے اس پر ایک سیمینار کیا۔ پھر فرانسیسی ٹی وی نے دو گھنٹے کے شو کے لیے اسے بلایا اور اس کا انٹرویو کیا۔

ایک بار ایسا موقع بھی آیا کہ اسے اپنے حلق کی خرابی کی وجہ سے فلم سے دور رہنا پڑا۔ اس دوران اس نے اسٹیج کے لیے اپنی فلم کی کہانی "دی ناٹی پروفیسر" کا انتخاب کیا۔

وہ تیرہ برس تک فلم سے غائب رہا۔ پھر اس نے کینس کے فلمی میلے میں شرکت کی اور وہاں اعلان کیا کہ وہ فلموں میں دوبارہ جلوہ گر ہو رہا ہے۔ 2011ء میں اس نے ایک فلم کمپنی "ان ٹیلی جنس انٹرٹینمنٹ" سے معاہدہ کیا کہ وہ اس کی تین پرانی فلموں کو ری میک کرے جن میں بیل بوائے، سینڈریلا اور فیملی جوئل شامل ہیں۔ ان فلموں میں اس کی حیثیت معاون پروڈیوسر کی تھی۔

فلمیں کامیابی سے ہم کنار ہوئیں۔ جیری نے اسی پر بس نہیں کیا بلکہ ناٹی پروفیسر کو غنائیہ انداز میں اسٹیج پر بھی پیش کیا۔ براڈوے پر ناٹی پروفیسر 7 ہفتے تک دکھایا گیا۔ 2013ء میں اعلان کیا گیا کہ جیری ایک فلم "میکس روز" میں کام کرے گا۔

جیری نے پہلی شادی ایک گلوکارہ پیٹی پالمر سے اکتوبر 1944ء میں کی تھی۔ جسے اس نے 1980ء میں طلاق دے دی۔ اس سے جیری کے چار بیٹے ہوئے۔ اس کی دوسری شادی ایک رقاصہ سان ڈی پٹنگ سے فروری 83ء میں ہوئی، جب کہ جیری کی عمر 56 برس تھی۔ وہ عمدہ کپڑے پہننے کا شوقین ہے۔ عموماً وہ سوٹ پہنتا ہے، لیکن اسے دھلواتا نہیں ہے۔ مسلسل پہننے کے بعد وہ اسے اتار کر کسی غریب کو دے دیتا ہے۔ اسے نئے موزے پہننے کا بھی شوق ہے۔ وہ روزانہ اپنے موزے تبدیل کرتا ہے۔ جب بہت سے موزے اکٹھا ہو جاتے ہیں وہ انہیں کسی خیراتی ادارے کو بھجوا دیتا ہے۔

جیری کو کسی زمانے میں بیس بال کھیلنے سے بھی دلچسپی تھی۔ 1950ء سے لے کر 60ء تک وہ فرسٹ کلاس کھلاڑیوں میں شامل تھا۔

جیری بہت سی بیماریوں میں بھی مبتلا رہا اور نشہ آور ادویہ کا شکار رہا۔ مارچ 1965ء میں جب وہ لاس ویگاس میں اسٹیج پر کام کر رہا تھا تو اس کی کمر میں چوٹ لگ گئی تھی، جس کی وجہ سے اس کے ہاتھوں پیروں میں رعشہ ہو گیا تھا۔ چنانچہ اس نے مسکن ادویہ کا استعمال کرنا شروع کر دیا۔ رفتہ رفتہ وہ ان ادویہ کا عادی ہو گیا۔ اس نے بتایا کہ وہ تیرہ برس تک ان ادویہ کا عادی رہا۔ بہرحال 1978ء سے اب تک اس نے مسکن ادویہ نہیں کھائیں۔

اپریل 2002ء میں اس کی کمر کے چند پٹھے اکڑ گئے جس کی وجہ سے اسے ایک آپریشن بھی کرانا پڑا۔ 1960ء میں جب وہ فلم سینڈریلا میں کام کر رہا تھا تو اسے پہلا ہارٹ اٹیک ہوا تھا۔ دسمبر 1980ء میں جب وہ نیویارک سے اپنے گھر سان ڈیاگو جا رہا تھا تو اس پر دوسرا دورہ پڑا۔ علاج کی خاطر اسے کئی روز تک اسپتال میں گزارنا پڑے۔ پھر 1983ء میں اس کی اوپن ہارٹ سرجری بھی ہوئی۔ اس کے علاوہ 1992ء

میں اسے پروسٹیٹ کینسر کی وجہ سے زیر علاج رہنا پڑا۔

جون 2006ء میں اسے ایک ہلکا سا دورہ پڑا۔ وہ اسپتال گیا تو معلوم ہوا کہ اس کی دل کی حالت ناگفتہ بہ ہے۔ اس کے علاوہ اسے نمونیہ بھی ہو گیا ہے۔ اس کے دل کی دو شریانیں بند ہو چکی تھیں۔ چنانچہ اس کا بائی پاس آپریشن کیا گیا۔

1999ء میں جب وہ آسٹریلیا کے دورے پر تھا تو ایک وبائی بیماری کا شکار ہو گیا۔ چنانچہ وہ "ڈارون" اسپتال میں پانچ ماہ تک زیر علاج رہا۔ 2000ء میں ایک بیماری سے اس کا وزن بڑھنا شروع ہو گیا اس کے چہرے میں بھی نمایاں تبدیلی پیدا ہو گئی لہٰذا لندن کے ایک چیئرٹی شو میں وہ شریک نہ ہو سکا۔ چنانچہ اسپتال میں داخل ہو کر اس نے باقاعدہ علاج کرایا تو صحت مند ہو گیا۔

فن کی دنیا سے وابستگی سے لے کر اب تک وہ باقاعدگی سے اسپتالوں کے لیے رقم اکٹھا کرتا رہا۔ ایک محتاط اندازے کے مطابق اس نے اب تک دو کھرب ڈالر اسپتالوں کو دیے ہیں۔

لوگ اب بھی اس کے دیوانے ہیں اور اس کی فلموں سے محظوظ ہوتے ہیں جس کے نتیجے میں امریکا کی مختلف ریاستوں میں چھوٹے چھوٹے سینما گھر بنائے گئے جہاں جیری کی فلمیں دکھائی جاتی ہیں۔ یہ سینما گھر 200 سے لے 350 افراد کے لیے ہوتے ہیں۔ یہ سلسلہ دس برس کامیابی سے چلا اس کے بعد بند کر دیا گیا۔

1997ء میں اسے امریکن کامیڈی ایوارڈز کی طرف سے لائف اچیومنٹ ایوارڈ سے نوازا گیا۔ امریکا میں اس کی فلموں نے خوب بزنس کیا اور اس کی ہدایت کارانہ صلاحیتوں کا اعتراف بھی کیا گیا، لیکن اس کے اصل مداح یورپ میں تھے، اس لیے کہ بہترین ہدایت کار کی حیثیت سے جیری کو آٹھ ایوارڈ ملے۔ تین فرانس میں، ایک بیلجیئم ایک اٹلی، ایک نیدرلینڈ، ایک اسپین اور ایک جرمنی میں۔ ایک فرانسیسی ہدایت کار کا کہنا ہے کہ وہ چارلی چپلن سے بڑا ہدایت کار تھا۔ 2009ء میں اس کا نام نیو جرسی کے ہال آف فیم میں درج کیا گیا۔

قانون کی یونی ورسٹی نے اسے اعلاترین ایوارڈ دیا۔ اس کے ڈین نے مائک پر آکر کہا کہ یہ ایوارڈ ان افراد کو دیے جاتے ہیں جو اپنے شعبوں میں نمایاں کارکردگی کا مظاہرہ کرتے ہیں اور انسانیت کی خدمت کرتے ہیں۔ جیری نہ

ثابت بن ضحاک

صحابی تھے۔ ابوزید ان کی کنیت تھی اور وہ قبیلہ اشہل سے تھے۔ آپ بعثت نبوی کے تیسرے سال پیدا ہوئے۔ آپ نے غزوہ حمراء الاسد اور خندق میں حصہ لیا اور چودہ احادیث کی روایت کی۔ آنحضورؐ کے وصال کے بعد آپ نے شام میں سکونت اختیار کر لی۔ پھر شام سے بصرہ منتقل ہو گئے اور وہیں پر مستقل سکونت رکھی۔ حضرت عبداللہ بن زبیرؓ کے زمانے میں وفات پائی۔

مرسلہ: زاہد ہمدانی، لاہور

آلرائیٹ میڈلین: (5 مئی 1937)

امریکی سیاست دان اور وزیر خارجہ۔ وہ چیکوسلواکیہ میں پیدا ہوئیں، ان کا خاندان چیکوسلواکیہ سے نقل مکانی کر کے امریکا میں آباد ہو گیا۔ انہوں نے 1959ء میں ویلزلے کالج سے گریجویشن، 1967ء میں کولمبیا یونیورسٹی سے بین الاقوامی تعلقات میں ایم اے اور 1976ء میں اسی یونیورسٹی سے پی ایچ ڈی کی ڈگری لی۔ 1978ء سے 1981ء تک صدر امریکا کی قومی سلامتی کونسل کی رکن رہیں۔ ...... 1982ء سے وہ جارج ٹاؤن یونیورسٹی اور دیگر اداروں میں استاد کی حیثیت سے خدمات سرانجام دیتی رہیں۔ فروری 1993ء سے 1996ء کے اواخر تک اقوام متحدہ میں امریکا کی مستقل مندوب رہیں۔ انہیں 23 جنوری 1997ء کو امریکا کا وزیر خارجہ مقرر کیا گیا۔ وہ متعدد کتب کی مصنف بھی ہیں۔ امریکا کی خارجہ پالیسی، روس کے بین الاقوامی تعلقات اور مشرقی یورپ کی سیاسیات ان کے اہم موضوعات ہیں۔

1 _Poland, The Role of Press in Political Changes
2 _The Role of Press in Political Changes in Czechoslovakia-
3 _The Soviet Diplomatic Service Profile of An Elite_

وہ متعدد زبانیں جانتی تھیں، جن میں انگریزی، فرانسیسی چیک، روسی اور پولش شامل ہیں۔

مرسلہ: زاہدہ پروین، میاں چنوں

صرف لوگوں کا دکھ درد بانٹتا ہے اور لوگوں میں خوشیاں تقسیم کرتا ہے، بلکہ اس کے سینے میں سنہرا دل بھی ہے۔ اس نے معاشرے اور پھر دنیا کو بدل ڈالا ہے۔

جیری شوبزنس میں اعلا مقام رکھتا ہے۔ اس کی فلموں نے مجموعی طور پر 8 کروڑ ڈالر کا بزنس کیا۔ یہ اس زمانے کی بات ہے جبکہ سنیما کا ٹکٹ 25 یا 50 سینٹ کا ہوا کرتا تھا۔ فلم، اسٹیج اور ڈراموں میں کام کرنے کے دوران ہی اس نے وقت نکال کر اپنی سوانح حیات "جیری لوئس ایک شخص کی حیثیت سے۔" یہ سوانح اس نے ہرب گلوک کے اشتراک سے لکھی تھی۔

بچوں کی فلاح و بہبود کی خاطر اس نے اقوام متحدہ کے لیے ایک فلم "یواے" بھی بنائی تھی۔ اس فلم کی نمائش دنیا بھر کے فلمی میلے میں کی گئی اور اسے سراہا گیا۔ ہالی ووڈ میں ایک ایسی سڑک ہے جہاں مشہور فن کاروں کے نام لکھے جاتے ہیں جسے "ہالی ووڈ واک آف فیم" کہتے ہیں۔ اس واک آف فیم پر جیری کا نام دو بار درج کیا گیا۔ فلمی اداکار اور ٹی وی اداکار کی حیثیت سے بھی۔

جیری کا فلسفۂ حیات ہے کہ میں دنیا میں آیا ہوں، مگر صرف ایک بار کے لیے تو کیوں نہ اس روتی سسکتی دنیا کو ہنساتا ہوا جاؤں۔ لوگوں کے غموں میں شریک رہوں۔ مجھے ایسا کرنے کی اجازت دیجیے۔ مجھ سے تعاون کیجیے۔ مجھے اس کی اجازت نہ دیجیے کہ میں آپ کو نظر انداز کردوں۔ اس لیے کہ میں تو اس دنیا کی شاہراہ پر صرف ایک بار سفر کرنے آیا ہوں۔

صدر جان ایف کینیڈی اسے اتنا پسند کرتے تھے کہ اسے اپنا دوست کہتے تھے۔ انہوں نے ایک سادہ سی تقریب میں اسے سونے کی ایک تختی دی تھی جس پر لکھا تھا۔ "تین چیزیں مسلمہ حقیقت ہیں: خدا، انسانی حماقت اور قہقہہ۔ ابتدائی دو چیزیں ہماری فہم و ادراک سے بالاتر ہیں، لیکن تیسری پر ہمیں اختیار ہے تو کیوں نہ ہم اسی کو عام کریں۔"

اب وہ بے حد مال دار ہے، لیکن اب بھی اسے تنخواہ کے دن کا انتظار رہتا ہے۔ وہ اس وقت ساری دنیا میں لیکچر بھی دیتا ہے اور ایک دن کے لیے پچھتر ہزار ڈالر وصول کرتا ہے۔

جب اس سے پوچھا گیا کہ کیا وہ موت سے خوف زدہ ہے تو اس نے جواب دیا "ایسی کوئی بات نہیں، میں نے ابھی مرنے کے بارے میں کچھ سوچا ہی نہیں ہے۔ مجھے ابھی بہت سے ادھورے کام نمٹانا ہیں۔ میں 12 برس مزید جینا چاہتا ہوں تاکہ جارج برنس کو شکست دے سکوں۔ وہ مکمل سو برس تک جیا تھا، میں ایک سو ایک برس تک جینا چاہتا ہوں۔ جہاں تک میری پسند اور ناپسند کا تعلق ہے تو میں جوا کھیلنا پسند کرتا ہوں۔ ہارنا کسے پسند نہیں اور اگر قسمت ساتھ دے رہی ہے تو انسان جیت جاتا ہے۔ جیتنا ہارنا سب مذاق ہے، انسانی تفریح ہے۔ بھئی زندہ رہنے کے لیے کوئی نہ کوئی کھیل تو چاہیے۔ لوگ شطرنج کھیلتے ہیں، میں دل بہلانے کے لیے جوا کھیلتا ہوں۔ میں ایک کامیڈین ہوں اور لاکھوں لوگوں کو ہنساتا ہوں مگر میں خود اس وقت ہنستا ہوں جب میری بیٹی ہنستی ہے۔

اس کی وہ فلمیں جو اس نے ڈین مارٹن کے ساتھ مکمل کیں:

Living It Up (1954)
You're Never Too Young (1955)
Hollywood or Bust (1956)
Artists and Models
The Caddy (1953)
Scared Stiff (1953)
At War With the Army (1950)
Partners (1956)
My Friend Irma (1949)

اس کی وہ فلمیں جن میں اس نے تنہا کام کیا:

The Delicate Delinquent (1957)
Rock-A-Bye Baby (1958)
The Geisha Boy (1958)
Itchy McRabbitt in Lil Abner (1959)
Visit to a Small Planet (1960)
The Bellboy (1960)
The Ladies Man (1961)
The Errand Boy (1961)
It's Only Money (1962)
The Nutty Professor (1963)
Who's Minding the Store? (1963)
The Patsy (1964)
The Day the Clown Cried (1972)

قسط: 220

فلمی الف لیلہ

علی سفیان آفاقی کی یادداشتیں

یہ اجنبی سی منزلیں اور رفتگاں کی یاد
تنہائیوں کا زہر ہے اور ہم ہیں دوستو!
آنکھوں میں اڑ رہی ہے لٹی محفلوں کی دھول
عبرت سرائے دہر ہے اور ہم ہیں دوستو!

ایسے نادر روزگار خال خال ہی نظر آتے ہیں۔ جو نصف صدی سے علم وادب، صحافت و فلم کے میدان میں سرگرم عمل ہیں اور اپنے روز اول کی طرح تازہ دم بھی۔ ان کے ذہن رسا کی پرواز میں کوئی کمی واقع ہو، نہ ان کا قلم کبھی تھکن کا شکار نظر آئے۔ آفاقی صاحب ہمارے ایسے ہی جواں فکر و بلند حوصلہ بزرگ ہیں۔ وہ جس شعبے سے بھی وابستہ رہے، اپنی نمایاں حیثیت کی نشان اس کی پیشانی پر ثبت کردیے۔ مختلف شعبہ ہائے زندگی سے وابستگی کے دوران میں انہیں اپنے عہد کی ہر قابل ذکر شخصیت سے ملنے اور اس کے بارے میں آگاہی کا موقع بھی ملا۔ دید و شنید اور میل ملاقات کا یہ سلسلہ خاصا طولانی اور بہت زیادہ قابل رشک ہے۔ آئیے ہم بھی ان کے وسیلے سے اپنے زمانے کی نامور شخصیات سے ملاقات کریں اور اس عہد کا نظارہ کریں جو آج خواب معلوم ہوتا ہے۔

ادب وصحافت سے فلمی دنیا تک دراز ایک داستان درداستاں سرگزشت

عصمت چغتائی کے نام سے کون اردو داں ناواقف ہے۔ وہ برصغیر کے عظیم ترین افسانہ نگاروں میں شمار ہوتی ہیں لیکن ان کی ذاتی زندگی بھی کسی افسانے سے کم نہ تھی۔ انہوں نے بڑی بھرپور زندگی گزاری۔ ان کا تعلق تو علی گڑھ کے ایک تعلیم یافتہ اور معزز گھرانے سے تھا جو روشن خیال بھی تھا اور ادب ذوق بھی۔ ان کے چار بھائی اور چار بہنیں تھیں۔ وہ اپنے بہن بھائیوں میں سب سے چھوٹی تھیں اس لیے بہت لاڈلی اور گھر والوں کی آنکھ کا تارا تھیں۔

ذہانت خاندان کی میراث تھی۔ جس کسی نے بھی کسی شعبے سے وابستگی اختیار کی کامیابی شہرت اور کامرانی نے اس کے قدم چومے۔ اردو کے ایک اور عظیم ترین مصنف، مزاح نگار اور ناول نگار عظیم بیگ چغتائی ان کے بڑے بھائی تھے۔ ادب سے لگاؤ تو تھا ہی لیکن عظیم بیگ چغتائی کے مشوروں اور ہدایات نے انہیں کندن بنادیا تھا۔ افسانہ نگاری کا فن سیکھنے سے نہیں آتا اس کے لیے فطری صلاحیت درکار ہوتی ہے لیکن اگر صحیح رہنمائی حاصل ہوجائے تو بھی صلاحیتیں نکھر کر سامنے آجاتی ہیں۔

علی گڑھ سے یہ خاندان جودھپور منتقل ہوگیا جہاں ان کے اور بھی بہت رشتے دار تھے۔ قیام پاکستان کے بعد کچھ رشتے دار ہندوستان میں رہ گئے، کچھ پاکستان آگئے۔ عصمت چغتائی نے ہندوستان ہی میں قیام کرنا پسند کیا۔ ایک دوبار پاکستان کے دورے پر آئیں جہاں ان کے مداحوں کی کمی نہ تھی۔ شب و روز لوگوں سے ملاقاتوں میں ہی گزرتے تھے۔ لیکن پاکستان کا ماحول انہیں پسند نہیں آیا۔ ایک تو یہ کہ وہ جس انداز میں اور جن موضوعات پر افسانے لکھتی تھیں، ان پر ہندوستان میں بھی اعتراض اور نکتہ چینی کی جاتی تھی۔ ان کی تحریروں میں جو بے باکی اور موضوعات میں جو آزاد خیالی تھی اسے ایک طبقہ پسند نہیں کرتا تھا۔ پاکستان کے ماحول میں تو اس قسم کی تحریریں اور وہ بھی ایک عورت کی لکھی ہوئی کسی طور بھی پسند نہیں کی جاسکتی تھیں۔ وہ سعادت حسن منٹو کی ہم عصر تھیں۔ ان دونوں کی پہلی ملاقات ایک جھڑپ سے ہوئی تھی لیکن بعد میں تعلقات گھریلو قسم کے... اور حد سے زیادہ بے تکلفانہ ہوگئے۔ انہیں عورتوں کا منٹو اور منٹو کو مردوں کا عصمت چغتائی کہا جاتا تھا۔ کسی زمانے میں یہ مسئلہ بھی زیرِ بحث رہا کہ اگر منٹو اور عصمت چغتائی کی شادی ہوجائے تو کیا ہو؟ اس قسم کی باتیں سن کر دونوں ہنستے تھے۔

اس سلسلے میں ایک پرانا لطیفہ یاد آگیا۔ انگریزی کے معروف ڈراما نویس اور مصنف جارج برنارڈ شا کی ایک حسین فلم ایکٹریس سے ملاقات ہوئی جو ان کی بہت زیادہ مداح تھیں۔ انہوں نے جارج برنارڈ شا سے کہا کہ اگر میری آپ سے شادی ہوجائے تو ہمارے بچے قابلِ تعریف ہوں گے۔ میری صورت اور آپ کا ذہن رکھنے والے بچوں کے بارے میں سوچیے کہ وہ کس قدر جینئس ہوں گے۔

جارج برنارڈ شا بہت حاضر جواب اور فقرہ باز تھے۔ انہوں نے سنجیدگی سے کہا ”میڈم آپ کی تجویز تو بہت اچھی ہے لیکن ذرا سوچیے کہ اگر ہمارے بچوں کی صورت شکل مجھ جیسی اور ذہن آپ جیسا ہوگا تو کیا ہوگا؟“

وہ بے چاری شرمندہ اور لاجواب ہوکر رہ گئیں۔

عصمت چغتائی کا تعارف تو ہوگیا حالانکہ وہ کسی تعارف کی محتاج نہیں تھیں اب کچھ تذکرہ لطف اللہ خان کا ہوجائے۔ لطف اللہ خان ایک تعلیم یافتہ اور خاندانی گھرانے سے تعلق رکھتے تھے۔ ابتدائی زندگی کراچی میں گزاری۔ قیام پاکستان کے بعد مالی حالات خراب ہوگئے تو قسمت آزمائی کے لیے ممبئی چلے گئے اور دس سال ممبئی میں گزارے جہاں انہوں نے سخت محنت کی۔ قسمت نے بھی ساتھ دیا۔ جب مالی حالات درست ہوئے تو پھر کراچی کی یاد آئی۔ واپس لوٹ آئے اور بقیہ زندگی کراچی ہی میں گزاری۔ ان کا پیشہ ایڈورٹائزنگ تھا جس میں انہوں نے بہت کامیابی حاصل کی اور خوش حال زندگی گزاری۔

لکھنے پڑھنے کا شوق ابتدائی عمر سے تھا۔ عصمت چغتائی اس زمانے میں نامور ہوچکی تھیں اور لڑکیوں کے مدارس کی سپرنٹنڈنٹ تھیں۔ لطف اللہ خان نظم و نثر دونوں اصناف میں طبع آزمائی کرتے تھے۔ عدیل ان کا تخلص تھا۔ لطف اللہ خان نے ایک دوست کے ذریعے اپنا افسانہ عصمت چغتائی کو رائے زنی کے لیے بھیجا۔ ایک گھنٹے کے اندر ہی افسانہ واپس آگیا اور کہا۔ لو، میں نے افسانہ پڑھ لیا ہے۔ مسودے کے آخر میں انگریزی میں ان کی رائے درج تھی۔ ان کا خیال تھا کہ مرکزی خیال اچھا ہے لیکن افسانے کا آخری حصہ دوبارہ لکھا جائے۔ ان کا دوسرا مشورہ یہ تھا کہ ”عدیل“ اچھا اور مکمل تخلص نہیں ہے۔ انہوں نے مشورہ دیا تھا کہ ایک لفظی تخلص مقبول نہیں ہوتا۔ لطف اللہ خان نے غور کیا تو عصمت چغتائی کا مشورہ انہیں درست لگا۔ غور کیا تو معلوم ہوا کہ اردو کے ہر شاعر اور افسانہ نگار نے اپنے نام یا تخلص کے ساتھ کوئی اور لفظ بھی ٹانک رکھا ہے۔ مثلاً حفیظ جالندھری، احمد ندیم قاسمی، قتیل شفائی، جگر مراد آبادی، جوش ملیح آبادی، حسرت موہانی وغیرہ۔ اس کا فائدہ یہ تھا کہ شاعر یا افسانہ نگار اپنے نام کے دوسرے حصے سے پہچانا جاتا تھا۔ مثلاً حسرت موہانی چراغ حسن حسرت، حسرت لکھنوی، جگر مراد آبادی، اصغر گونڈوی، اگر یہ حضرات ایک لفظی تخلص اختیار کرتے تو ان کے درمیان فرق محسوس کرنا مشکل تھا۔

اس طرح انہوں نے لطف اللہ خان منتخب کرلیا۔ انہوں نے اپنے نام کے حوالے سے بھی دلچسپ واقعات درج کیے ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ محمد لطف اللہ خان کے نام سے کبھی انہیں کسی نے مخاطب کیا اور نہ ہی ان کا تذکرہ کیا۔ واقفوں کی اکثریت انہیں لطیف اللہ خان کے نام سے پکارتی تھی۔

انہوں نے ایک بار اپنے دوست جمیل جالبی کے گھر فون کیا۔ ملازمہ نے ٹیلی فون اٹھا کر پوچھا۔ ”کون بول رہا ہے؟“

انہوں نے جواب میں کہا۔ ”لطف اللہ خان۔“

ملازمہ نے جل کر کہا۔ ”مجاک مت کرو“ اور فون بند کردیا۔

ایک اور لطیفہ بھی سن لیجیے۔ ابراہیم غزنوی صاحب سے ہمارے گہرے مراسم تھے۔ ان کی عادت تھی کہ کوئی فون کرتا تھا تو وہ جواب میں السلام علیکم رحمتہ اللہ و برکاتہ“ کہا کرتے تھے۔ ہماری بیٹی پارو نے ایک بار ان کا فون اٹھایا اور پوچھا ”کون صاحب بول رہے ہیں؟“

پارو اس زمانے میں ”چوچلی“ تھی یعنی ک کی جگہ ”چ“ استعمال کرتی تھی۔ مثلاً کتاب کو جتاب کانٹے کو جانٹا کہتی تھی۔

اس نے سوال کیا ”چون صاحب بول رہے ہیں؟“

جواب میں غزنوی صاحب ”السلام علیکم ورحمتہ اللہ برکاتہ“ کہا تو پارو نے فون بند کردیا۔ پوچھا کہ کس کا فون تھا۔ بولی چوئی (کوئی) مذاق کرر ہا تھا، ہم نے یہ لطیفہ ابراہیم غزنوی صاحب کو سنایا تو وہ بہت لطف اندوز ہوئے۔

اسی طرح ایک بار دہلی سے ایک صاب کراچی آئے اور لطف اللہ خان کے بارے میں دہلی جاکر مضمون لکھا جس میں ان کا نام ”لطیف اللہ خان“ لکھ دیا۔ لطف اللہ خان نے بچپن میں شاعری بھی کی۔ ان کے استاد نے ان کا تخلص عدیل منتخب کیا۔ کچھ عرصے تک شاعری کے نام سے تک بندی کرنے کے بعد انہیں محسوس ہوا کہ شاعری کے لیے ان کی طبیعت موزوں نہیں ہے۔ اسی دن سے شاعری کو خیر باد کہہ دیا اور نثر نگاری پر توجہ مرکوز کردی۔

لطف اللہ خان نے پاکستان میں اپنے ذاتی خرچے پر وہ کارنامہ سرانجام دیا جس کا پہلے کسی کو خیال تک نہ آیا تھا۔ علم دوست اور ادب دوست تو تھے ہی انہیں خیال آیا کہ ایک ایسی آڈیو لائبریری بنائی جائے، (اس زمانے میں ویڈیو کا رواج نہ تھا) جس میں اردو کے ممتاز شعرا، افسانہ نگاروں اور

سعادت حسن منٹو

قابلِ ذکر ہستیوں کی باتیں اور کلام خود ان ہی کی زبان میں ریکارڈ کیا جائے۔ چنانچہ انہوں نے شوق کی تکمیل کے لیے کراچی میں ذاتی ساؤنڈ پروف اسٹوڈیو بھی تعمیر کیا۔ طریقہ یہ تھا کہ جس ہستی سے انٹرویو کیا جانا تھا اس سے بدقت وقت لے کر وہ مقررہ وقت پر انہیں اپنے اسٹوڈیو میں لے کر آتے تھے اور انٹرویو ختم ہونے کے بعد بصد احترام انہیں بذاتِ خود ان کے گھر چھوڑ آتے تھے۔

اس سے پہلے یہ خیال کسی اور کو نہیں آیا تھا کہ شاعروں، نثر نگاروں اور معروف ہستیوں کے کلام اور بیان کو خود ان کی آواز میں ریکارڈ کیا جائے۔ کہہ سکتے ہیں کہ بعض لوگوں کو نوادرات، کتب اور دوسری چیزیں جمع کرنے کا شوق تھا لیکن لطف اللہ خان کو قابلِ ذکر ہستیوں کی آوازیں جمع کرنے کا دیوانگی کی حد تک شوق تھا۔ اسی سلسلے میں کئی بار انہیں مشاورت کا شکار بھی ہونا پڑا مگر انہوں نے ہمت نہ ہاری۔ نتیجہ یہ کہ کراچی میں ان کی آڈیو لائبریری میں آوازوں کا ایک نادر مجموعہ موجود ہے۔ جو اُن کی زندگی بھر کا سرمایہ ہے۔

انہوں نے یہ داستانیں بڑے دلچسپ انداز میں اس طرح ریکارڈ کی ہیں کہ زندگی اس کے لیے وقف کردی۔ اپنا ایڈورٹائزنگ کا کاروبار انہوں نے اپنے بیٹے کے حوالے کردیا اور آوازیں جمع کرنے کے لیے کمر کس لی۔

اس زمانے میں نہ ویڈیو تھا نہ ٹیلی ویژن۔ البتہ آل انڈیا اور مقامی مشاعرے باقاعدگی سے منعقد ہوتے تھے جن میں ہندوستان بھر کے شعرا شرکت کرتے تھے۔ لطف اللہ خان نے اس موضوع پر جو کتاب شائع کی ہے اس کا عنوان "تماشائے اہلِ قلم" تجویز کیا۔ جو کہ موضوع کے اعتبار سے نہایت موزوں ہے۔ ان واقعات کے سلسلے میں انہوں نے مختلف مشاہیر کی عادات واطوار اور طرزِ کلام کے خاکے بھی پیش کیے ہیں جن کی وجہ سے وہ شخص آنکھوں کے سامنے چلتا پھرتا اور باتیں کرتا ہوا نظر آتا ہے۔

ریڈیو پاکستان سے جو مشاعرے نشر کیے جاتے تھے ان میں شاعروں کی آوازیں تو سنائی دیتی تھیں لیکن واہ واہ، مرحبا، مکرر ارشاد کی فرمائشوں کے باعث وہ ماحول ہی مختلف ہو جاتا تھا۔ پھر ریڈیو سے نشر کیے گئے شعرا کی آوازیں صاف اور واضح نہیں سنائی دیتی تھیں۔ سب سے اہم بات یہ کہ ایک اسٹوڈیو کی تنہائی میں بہت صاف اور واضح آواز کے ساتھ مشاہیر کے ساتھ سوالات کا سلسلہ بھی جاری رہتا تھا۔ ظاہر ہے کہ ریڈیو کے مشاعروں سے تراش کر لیے گئے کلام میں وہ گہرائی، گیرائی اور خوبصورتی پیدا نہیں ہو سکتی تھی جو گوشہ تنہائی میں نصیب ہو جاتی تھی۔ لطف اللہ خان کے ہندوستان کے قریب قریب بھی مشہور شعرا سے مراسم تھے لیکن ایسے بھی تھے جو کہ ان کے لیے اجنبی تھے اور جن کا انٹرویو حاصل کرنے کے لیے انہیں بہت رکاوٹیں اور دشواریاں پیش آتی تھی لیکن یہ انٹرویوز درحقیقت اردو زبان میں اپنی نوعیت، اہمیت اور بے تکلفی کے باعث یادگار رہیں گے۔ اس پر لطف اللہ خان کی طرزِ تحریر، وہی معاملہ تھا کہ "ذکر اس پری وش کا اور پھر بیاں اپنا۔"

اس طویل تمہید کے بعد اب ضروری ہے کہ قارئین کو مزید تشنہ اور منتظر نہ رکھا جائے۔ آمدم برسرِ مطلب اب لطف اللہ خان کی زبان اور تحریر سے عصمت چغتائی کا تذکرہ کیا جائے۔ بے تکلف اور بے دھڑک لکھنے اور بولنے والی تو وہ تھیں ہی مگر اس انٹرویو میں ان کی زبانی ایسے واقعات بھی علم میں آتے ہیں جن کی دلچسپی کے علاوہ ادبی اہمیت بھی ہے۔

عصمت چغتائی کی تحریر کی طرح ان کی گفتگو بھی ہمہ گیر اور بے تکلفانہ تھی۔ لطف اللہ خان کے بقول وہ بہت سادہ اور نرم دل (حساس) تھیں۔ عصمت چغتائی سے اس انٹرویو کا اہتمام اردو کی معروف افسانہ نگار ہاجرہ مسرور کے توسط سے ہوا تھا۔ جن کے شوہر احمد علی خان بذاتِ خود ایک نامور صحافی تھے اور سالہا سال تک انگریزی اخبار "ڈان" کے ایڈیٹر بھی رہے۔ ہمیں بھی ان سے بارہا ملاقات کا شرف حاصل ہوا۔ نہایت شریف النفس اور وضعدار انسان تھے۔ عصمت چغتائی کی نرم دلی کا ایک واقعہ انہوں نے یہ لکھا ہے کہ جب ان سے اسٹوڈیو میں ایک افسانہ ریکارڈ کرنے کی فرمائش کی گئی تو تھوڑے سے تردد کے بعد وہ رضامند ہو گئیں۔ حالانکہ بعض ادیبوں اور شعرا نے لطف اللہ خان کو ناکوں چنے چبوا دیے۔

عصمت چغتائی کا انٹرویو کئی نشستوں پر پھیلا ہوا ہے۔ ہاجرہ مسرور عصمت چغتائی کو لے کر لطف اللہ خان کے اسٹوڈیو میں آئیں تو ان کی تجویز یہ تھی کہ سوالات وہ کریں گی اور جوابات لطف اللہ خان ریکارڈ کریں گے لیکن لطف اللہ خان صاحب نے یہ طریقہ مناسب نہ سمجھا اور اپنے رواج کے مطابق بذاتِ خود انٹرویو لیا۔ ان کی ایک شرط یہ بھی ہوتی تھی کہ انٹرویو کے وقت مہمان اور خود ان کے سوا کوئی تیسرا اسٹوڈیو میں موجود نہ ہو بالآخر یہ طے پایا کہ ہاجرہ مسرور انٹرویو کریں گی اور عصمت چغتائی جوابات دیں گی۔ یہ نشست چالیس منٹ تک جاری رہی اور بہت کامیاب انٹرویو ہو گیا۔ عصمت چغتائی نے انٹرویو کا آغاز ہی بہت دلچسپ انداز سے کیا۔

انہوں نے کہا "میں اچانک پیدا ہو گئی تھی یعنی وقت مقررہ سے پہلے میں دیکھ رہی تھی کہ میں اپنی ماں کے پیٹ میں گلابی گلابی پانی میں غوطے کھا رہی ہوں۔ میں بڑی تگڑی پیدا ہوئی تھی۔ لوگ سمجھے کہ بیٹا پیدا ہوا ہے۔ پیار سے سب مجھے چنی کہہ کر پکارتے تھے کیونکہ میں دس بہن بھائیوں میں سب سے چھوٹی تھی۔ جوں جوں عمر بڑھتی گئی میری شرارتوں میں اضافہ ہونے لگا۔ گھر والے میری پٹائی بھی کرتے تھے مگر شرارتوں پر وہی لوگ جو مجھے چنی کہہ کر بلایا کرتے تھے مجھے "بھتنی" کہہ کر پکارنے لگے۔ سخت جان ایسی کہ کبھی بیمار نہیں ہوئی، مجھے بخار تک نہ آیا۔"

ان کی ذہنی تربیت علی گڑھ میں شیخ عبداللہ کے خاندان نے کی۔ اس کے بعد... ڈاکٹر رشید جہاں کے زیرِ اثر آ گئیں اور ان سے بہت متاثر ہوئیں۔ بڑے بھائی عظیم بیگ چغتائی نے ان کے نام سے تحریروں کا مجموعہ شاہد احمد دہلوی کو بھیج کر شائع کرایا۔ جب دس روپے کا منی آرڈر آیا تو یہ راز کھلا۔ انہوں نے ایک کاپی اپنے فیملی ڈاکٹر کو پانچ روپے میں فروخت کردی۔ مٹھائی منگا کر خود بھی کھائی

عصمت کو بھی کھلائی۔ وجہ پوچھنے پر انہوں نے طبع شدہ کتاب حوالے کردی۔

عظیم بیگ چغتائی خود بہت اچھے مزاح نگار، ناول نگار اور کہانی نویس تھے۔ وہ صرف چالیس سال کی عمر میں طویل بیماری کے بعد وفات پا گئے۔ عصمت چغتائی نے وفات کے بعد ان کے بارے میں بہت اچھا اور یادگار مضمون لکھا جس کا عنوان "دوزخی" تھا۔ یہ کتاب اور نام کافی عرصے تک متنازعہ بنا رہا۔ انہوں نے اپنا شجرۂ نسب بتایا جو چنگیز خان سے جا کر ملتا ہے۔ ان کے ایک بھائی وسیم بیگ چغتائی لندن میں رہتے تھے مگر ان کی سوچ انتہائی عجیب تھی۔ انہوں نے عصمت کے فلم اسٹوڈیو جانے کا سنا تو انہیں گھر سے نکل جانے کا حکم دیا۔ وہ بھی ضد میں تکیہ اور چادر لے کر چلی گئیں۔ اتفاق سے اس وقت شاہد لطیف عصمت چغتائی سے ملنے آئے ہوئے تھے۔ وہ کار میں بٹھا کر انہیں اپنے ساتھ لے گئے۔ بعد میں شاہد لطیف کے اصرار پر دونوں کی شادی ہو گئی ورنہ بہت بڑا اسکینڈل بن جاتا۔ عصمت نے اس کے بعد سارے کام چھوڑ کر فلمیں شروع کردیں اور دونوں نے مل کر ضدی، آرزو اور بزدل جیسی فلمیں بنائیں۔ یاد رہے کہ عصمت شادی پر یقین نہیں رکھتی تھیں۔ مگر شاہد کے اصرار پر شادی کرنے پر رضامند ہو گئیں۔ اچانک ہارٹ فیل کی وجہ سے شاہد لطیف کا انتقال ہوا تو انہوں نے فلموں سے قطع تعلق کرلیا۔ انہیں حیدرآباد سے غالب ایوارڈ اور سوویت یونین سے پندرہ ہزار روپے کا نہرو ایوارڈ دیا گیا... ان سے پوچھا گیا کہ وہ سوویت یونین کا کون سا حصہ دیکھنا چاہتی ہیں۔

جواب دیا۔ "سائبیریا، میں اس روایتی خطے کو دیکھنا چاہتی ہوں جہاں شہری سردی سے مرجاتے ہیں۔"

ان کے سفر کا اہتمام کردیا گیا۔ سائبیریا کو دیکھ کر وہ حیران رہ گئیں کیونکہ وہاں کا نقشہ ہی بدلا ہوا تھا۔ کشمیر سے بڑھ کر خوبصورت مقام ہے جہاں غربت کا نام ونشان تک نہیں ہے۔ خوشحالی کا دور دورہ ہے۔ عورتیں کھا کھا کر موٹی تازی ہوتی جا رہی ہیں۔

دوسری نشست میں انہوں نے بتایا کہ لکھنے کے لیے کوئی خاص موضوع نہ تھا۔ جن لوگوں کی شکلیں دیکھ دیکھ کر سوچتی تھی کہ ان کے خلاف کیا لکھوں؟ ان کے خلاف لکھ لکھ کر دل کی بھڑاس نکالتی رہی۔

سعادت حسن منٹو سے ان کی پہلی ملاقات تلخ کلامی سے ہوئی۔ تو تو میں میں بڑھی تو وہ باورچی خانے میں منٹو کی بیگم کے پاس چلی گئیں۔ منٹو بھی پیچھے پیچھے وہیں آ گئے کہا۔ "ہاں، یہی تمہارا مقام ہے۔"

انہوں نے کہا۔ "ستو منٹو، لکھتے تم بھی ہو لکھتی میں بھی ہوں مگر تم میری طرح کھانا پکاؤ تو جانوں۔" منٹو زچ ہو کر اپنے کمرے میں چلے گئے۔ یہ پہلی ملاقات آئندہ کی خوشگوار ملاقاتوں کا پیش خیمہ ثابت ہوئی۔

ہاجرامسرور

1943ء میں شاہد لطیف اور عصمت دہلی گئے تو وہاں ان کی ملاقات کرشن چندر اور راجندر سنگھ بیدی سے ہوئی۔ وہیں فیض احمد فیض سے ملاقات ہوئی جو کپتان کی وردی میں بجے سجائے آئے تھے۔ فیض کے اس روپ کو دیکھ کر انہیں 43 کے سیاسی ہنگامے یاد آ گئے جب عوام کو چھڑیوں سے مارا جا رہا تھا۔ فیض احمد فیض انہیں بالکل نہیں بھائے۔ انہیں یوں محسوس ہوا جیسے وہ انہیں مسحور کرنا چاہتے ہیں۔ غور سے دیکھا تو ان کی آنکھیں خوبصورت نظر آئیں۔ رفتہ رفتہ دونوں میں دوستی استوار ہونے لگی۔ ایک شام ممبئی میں فلم کے تمام مشہور فلمی لوگ شریک تھے۔ راج کپور نے فیض صاحب کو اکبر کے تخت پر بٹھا دیا۔ ان دنوں کے آصف کی فلم مغلِ اعظم کا سیٹ لگا ہوا تھا، مشاعرہ شروع ہوا تو محفل دیر تک جاری رہی۔ راج کپور نے ناؤ نوش کے دریا بہا دیے۔ فیض تین راتوں سے سوئے نہ تھے۔ نیند کا ایسا غلبہ ہوا کہ عصمت کی گود میں سر رکھ کر سو گئے۔ وہ کہتی تھیں کہ ان کا سر بڑا بھی تھا اور بھاری بھی تھا۔ فیض کو قریب سے دیکھا تو ان کی خوبیاں نکھر کر سامنے آئیں اور دونوں دائمی دوست بن گئے۔ راجندر سنگھ بیدی کی علالت کا ذکر کیا تو کہنے لگیں کہ وہ بڑھاپے میں ڈاڑھی اور بالوں میں خضاب لگانے لگے تھے۔ پاس ہی ایک تصویر جوانی کی رکھی تھی۔ تصویر

دکھا کر کہتے تھے ”دیکھو بوڑھا بیدی۔“

بڑھاپے میں ایک نوعمر لڑکی نے بیدی کو خوب اُلّو بنایا۔ بیدی نے لڑکی کو ایک فلیٹ بھی خرید کر دیا تھا۔ ایک دن وہ لڑکی ایک نوجوان کے ساتھ اسپتال میں ان سے ملنے آئی اور پوچھا ”انکل آپ کیسے ہیں؟“ پھر نوجوان کی طرف اشارہ کرکے بولی ”ان سے ملیے یہ میرے شوہر ہیں۔“ بیدی لڑکی کے جانے کے بعد بہت روئے۔

کرشن چندر کے مکان کا نقشہ انہوں نے یوں کھینچا ہے۔ ”معلوم ہوتا تھا ہم ایک بڑے باتھ روم میں آگئے ہیں۔ ادھر کرشن چندر کی بیوی ملنے سے کترا رہی تھیں۔ وہ دندناتی ہوئی بیڈ روم میں چلی گئیں۔ وہ کھلے بندوں بے اعتنائی کرنے لگیں۔ اس کا انتقام انہوں نے یہ کہہ کر لیا کہ کرشن کے بچے میلے کچیلے کپڑوں میں پھر رہے تھے، سارے کمرے میں سخت بدبو پھیلی ہوئی تھی۔ کسی نے نہ کھانے کو پوچھا نہ پینے کو۔ آخر میں ... نے ڈھٹائی سے کھانا مانگا تب بازار سے کچھ منگوا کر کھلا پلا دیا۔ اس تمام عرصے میں کرشن چندر کچھ نہ بولے۔

عصمت کو بے تکلفی کا عارضہ تھا۔ ایک دن وہ راجندر سنگھ بیدی کے گھر گئیں۔ دونوں ہنسی مذاق کر رہے تھے، بیوی نے پوچھا ”تم دونوں کس بات پر ہنس رہے تھے؟“ عصمت نے جواب دیا۔ ”ہنستی نہیں تو کیا کرتی۔ تمہارے میاں کے منہ پر تو گھاس اگی ہوئی ہے۔“

ساحر لدھیانوی کے بچپن کی تلخیوں کا ذکر کیا کہ ننھیال اور ددھیال کے جھگڑوں میں ساحر کا دل پتھر ہو گیا تھا۔ بچپن میں چیچک نکل آئی مگر لڑکیاں تھیں کہ مری جاتی تھیں۔ ایک شادی شدہ عورت کے ساتھ معاشقے کا بہت چرچا ہوا جس کے پاداش میں ساحر کو کالج سے نکال دیا گیا۔ ساحر کے بارے میں کہا کہ بڑا بدقسمت تھا۔ اس نے بہت دکھ جھیلے۔ بہت دولت اور شہرت کمائی مگر خود کسی کا نہ ہو سکا۔

گاندھی جی کے قتل کے بارے میں کہا کہ مہا سبھائیوں سے میرے اور شاہد لطیف کے اچھے تعلقات تھے۔

وحیدہ رحمٰن کے بارے میں بتایا کہ وہ اچھی ڈانسر ہونے کے علاوہ نہایت گھریلو خاتون تھیں۔ شمی کپور نے شادی کا رشتہ بھیجا تو کہلوایا۔ ”مسلمان ہو جاؤ تو شادی کرلوں گی۔“

دلیپ کمار اور ان کی دوسری بیوی اسما کا ذکر آیا تو کہا کہ اس کا شوہر بیوی کو مالِ غنیمت بنا کر دولت مندوں کو پھانستا تھا۔ ایسا ہی دلیپ کمار کے ساتھ بھی کیا۔

دلیپ کمار اور کامنی کوشل کے معاشقے کا قصہ مزے لے لے کر سنایا ”دلیپ کمار بضد ہوا تو میں نے دونوں کو تنہائی میں ملنے کا بندوبست کر دیا تو دونوں پھوٹ پھوٹ کر رونے لگے تھے۔

لطف اللہ نے ہاجرہ مسرور اور عصمت چغتائی کے انٹرویو کے سلسلے میں بتایا کہ انٹرویو کی نوعیت ایسی تھی کہ بات سے بات نکلتی چلی گئی۔ گفتگو میں گرمی آئی تو دونوں نے اپنی اپنی باتیں اور اپنا اپنا حال بیان کرنا شروع کر دیا۔ اس طرح یہ ریکارڈنگ اپنی وضع کی ایک یادگار اور پرانی معلوماتی ریکارڈنگ بن گئی۔ ویسے بھی یہ ایک ذاتی قسم کا انٹرویو تھا جس میں آداب و تعلقات کا لحاظ نہیں رکھا گیا۔

عصمت چغتائی کے بیان سے محسوس ہوتا ہے کہ ایک متوسط مسلمان گھرانے کی تعلیم یافتہ لڑکی کو ”گمراہ“ کرنے میں رشید جہاں کا نمایاں ہاتھ تھا جنہوں نے پرانی اسلامی قدروں اور اخلاقیات کو خدا حافظ کہہ دیا تھا اور روشن خیالی کے نام پر مسلمان لڑکیوں میں باغیانہ جذبات پیدا کر دیے تھے۔ مثلاً دوپٹا نہ اوڑھو۔ (یہ قیامِ پاکستان سے قبل کی بات ہے) مردوں سے برابری کرو۔ بے تکلف اور بے دھڑک جو سوچو کہہ دو۔

عصمت چغتائی کی ”بغاوت“ کی انتہا یہ تھی کہ مرنے کے بعد ان کی اپنی وصیت کے مطابق انہیں دفن کرنے کی بجائے شمشان بھومی میں جلا دیا گیا۔ مذہب سے انہوں نے کبھی واسطہ نہ رکھا۔ دنیا سے مختلف راستوں پر چلنے اور ہر پرانی روایت سے بغاوت ان کے رگ و پے میں بھر گئی تھی۔ شاہد لطیف کی اچانک موت کے بعد انہوں نے دوسری شادی نہیں کی اور صحیح معنوں میں اپنی مرضی کے مطابق زندگی بسر کی۔

لطف اللہ خان پچھلے سال 2012ء میں وفات پاگئے۔ ان سے شرفِ ملاقات کا بہت شوق تھا مگر موقع نہ ملا۔ انہوں نے 1996ء میں اپنی کتاب ”تماشائے اہلِ قلم دیکھتے ہیں“ اپنی تحریر کے ساتھ مجھے ارسال کی تھی۔ بہت خوشخط اور خوبصورت اردو لکھتے تھے۔

ان کی وفات کے بعد یہ نادر سرمایہ اب کہاں، کس کی تحویل میں اور کس حالت میں ہے کوئی نہیں جانتا۔ مگر وہ ایسے انسان تھے جس نے اردو ادب اور ادیبوں کے لیے ایک ریفرنس کی کتاب چھوڑی ہے اور وہ بھی کسی لالچ یا ذاتی شہرت کے لالچ کے بغیر۔ ایسے لوگ اب کہاں؟

لطف اللہ خان (جو اب مرحوم ہو چکے ہیں) بڑی عجیب و غریب شخصیت تھے ..... شاعروں کی آوازیں اور ان کا کلام ریکارڈ کرنے کا شوق انہیں دیوانگی کی حد تک تھا۔ انہوں نے اپنی زندگی کے لگ بھگ ساٹھ سال اس شوق کی نظر کر دیے۔ بہت اچھی ریکارڈنگ کرنے کے لیے اعلیٰ درجے کے معیاری ٹیپ ریکارڈر خریدے۔ کمروں میں چونکہ آوازیں گونجتی ہیں اس لیے انہوں نے اپنے ریکارڈنگ اسٹوڈیو کو مکمل ساؤنڈ پروف بنایا۔ یہ وہ زمانہ تھا جب لاہور کے بہترین فلمی نگار خانوں میں بھی ساؤنڈ پروف کا نظام اس قدر معیاری نہ تھا، لوگوں سے رابطے کرنے کے لیے وہ بااثر افراد اور اپنے وسیع تعلقات رکھنے والے دوستوں کی تلاش میں رہتے تھے۔ پھر ریکارڈنگ کا وقت لینے کے لیے بڑی تگ و دو کرتے تھے۔ بہت سے شعرا کا کلام انہوں نے مشاعروں میں بھی ریکارڈ کیا تھا لیکن ان کا معیار اطمینان بخش نہ تھا۔ پھر مشاعروں میں حاضرین کی داد و تحسین اور، واہ، واہ، کمال کر دیا۔ پھر ارشاد فرمایئے کی آوازوں کی وجہ سے بھی پروگرام صحیح طور پر ریکارڈ نہیں ہو سکتا تھا۔ انہوں نے یہ سارے کارنامے اپنے ذاتی خرچ سے کیے تھے اور اس کے عوض کبھی پیسا کمانے کی خواہش نہیں کی۔ کئی بار ریڈیو پاکستان والے ان سے آوازیں ادھار لے لیا کرتے تھے جس کا کوئی معاوضہ انہوں نے کبھی وصول نہیں کیا۔ بعض اوقات وہ بھی بعض آوازیں ریڈیو والوں سے لے لیا کرتے تھے۔ غرضیکہ وہ ایک عجیب و غریب اور انوکھی شخصیت تھے۔ ہمیں ان سے ملاقات کا بہت شوق رہا لیکن موقع نہیں ملا۔ یہی سوچتے رہے کہ اگلی بار کراچی گئے تو ان سے شرفِ ملاقات حاصل کریں گے لیکن اس کی نوبت ہی نہ آئی۔ جب 2012ء میں ان کی وفات کی خبر اخبار میں پڑھی تو بہت پچھتاوا ہوا۔ انسان بعض اوقات بہت اہم اور ضروری کام یہ سوچ کر ٹالتا رہتا ہے کہ اگلی بار کرلیں گے حالانکہ زندگی، صحت اور حالات کا کوئی بھروسا نہیں ہوتا۔

لطف اللہ نے 94 سال کی عمر میں وفات پائی اور آخری دم تک اپنے شوق کی تکمیل میں مصروف رہے۔

ان کا طرزِ تحریر بھی بہت اچھا تھا۔ لگتا تھا کسی ادیب یا اہلِ قلم نے لکھا ہے۔ تحریر میں روانی، بے ساختگی اور بے تکلفی کا انداز نمایاں تھا۔ حیرت ہے کہ ادیب نہ ہونے کے

عصمت چغتائی

باوجود وہ اتنی اچھی تحریریں کیسے لکھ لیا کرتے تھے۔ ان کی تحریروں سے چیدہ چیدہ مشہور ہستیوں کے واقعات بیان کیے جا رہے ہیں جنہوں نے اپنا الگ راستہ اختیار کیا ہے۔

یقیناً علم و ادب اور شاعری سے رغبت کرنے والوں کے لیے یہ معلومات اور دلچسپی کا سبب ہوں گے۔

جس زمانے میں وہ اپنے ماموں کے پاس حیدر آباد دکن میں مقیم تھے جگر مراد آبادی وہاں تشریف لائے۔ لطف اللہ خان کی عمر اس وقت اکیس سال کے قریب تھی۔ جگر صاحب ہندوستان گیر شہرت حاصل کر چکے تھے۔ یوں تو ان کی شاعری بھی کمال درجے کی ہے لیکن مشاعروں کے وہ بادشاہ تھے۔ ان کے ہوتے ہوئے کسی اور شاعر کا مشاعرے میں رنگ نہیں جمتا تھا۔ جگر صاحب کا ترنم بہت اچھا تھا۔ غالباً موسیقی سے بھی شغف تھا۔ یہی وجہ ہے کہ ہر غزل کو نئے انداز میں پڑھتے تھے۔ ان کے نقادوں کا خیال ہے کہ اگر جگر صاحب کا ترنم نہ ہو تو ان کا کلام بے اثر ہے۔ نیاز فتح پوری جیسے نقادوں کا بھی یہی خیال تھا حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ انہوں نے لگ بھگ چالیس سال تک غزل سرائی کی اور بے حد معروف اور مقبول رہے۔ جگر صاحب دراصل غزل کے شاعر تھے۔ عشق و محبت، وصل، ہجران کے خاص موضوعات تھے۔

لطف اللہ خان نے جب قریب سے جگر صاحب کو

دیکھا تو بہت مایوسی ہوئی۔ گہرا گندمی رنگ، لمبوترا چہرہ۔ وضع قطع میں بھی کوئی دلکشی نہیں تھی۔ آنکھیں زردی مائل تھیں غالباً کثرتِ شراب نوشی کی وجہ سے۔

جگر صاحب مقامی کلب کے مدعو تھے۔ ان کے مداحوں اور پرستاروں کی تعداد کا اندازہ نہیں لگایا جاسکتا۔ جگر صاحب تشریف لائے تو محفل میں زندگی کی لہر دوڑ گئی۔ کھانا بھی کلب میں کھایا گیا لیکن جگر صاحب کو کھانے سے کوئی دلچسپی نہ تھی۔ جام پر جام چڑھا رہے تھے۔ اس مقام کا نام ''یلندو'' تھا لیکن اہلِ ذوق کی کمی نہ تھی۔

لطف اللہ خان کے ماموں نے بتایا کہ یہ نوجوان بھی شاعر ہے حالانکہ وہ کافی عرصے پہلے شاعری ترک کر چکے تھے۔ انہیں اندازہ تھا کہ تک بندی تو کر سکتے ہیں لیکن شعر نہیں کہہ سکتے۔ جب بہت اصرار کیا۔ جگر صاحب کی بات نہ ٹال سکے اور یہ شعر سنایا۔

گرچہ مزہ نہ آئے شرابِ طہور میں
جنت میں بھی لگائیں گے بھٹی شراب کی

جگر صاحب نے انہیں ٹوکا اور کہا۔ ''یہ ترنم آپ کا نہیں سہگل کا ہے۔ ماشاءاللہ آواز بھی اچھی پائی ہے۔''

جگر صاحب نشے میں چور تھے مگر جب غزل سرائی شروع کی تو ایک سماں سا بندھ گیا۔ اس محفل میں انہوں نے اپنی مشہورِ زمانہ غزل سنائی

شاعر ہوں میں شاعر ہوں میرا ہی زمانہ ہے
قدرت میرا آئینہ فطرت میرا شانہ ہے

اس کے بعد فرمائشوں کا تانتا بندھ گیا۔ جگر صاحب ایک کے بعد ایک غزل سناتے رہے اور یہ وہ دور تھا جب ہندوستان میں ایک سے بڑا ایک شاعر موجود تھا۔ حفیظ جالندھری، جوش ملیح آبادی، اصغر گونڈوی، فانی بدایونی، شکیل بدایونی، مگر جگر صاحب کا مقام الگ تھا۔

ایک بار لطف اللہ خان نے جرأت کر کے ان سے پوچھ لیا ''حضرت آپ نے نشے اور سُرور کے عالم میں کتنے اشعار کہے ہیں۔''

بولے ''ایک بھی نہیں۔ شعر تو میں اس وقت کہتا ہوں جب ہوش میں ہوتا ہوں البتہ سناتے وقت سُرور کی کیفیت ضروری ہے۔''

اس پر ہمیں ایک واقعہ یاد آ گیا۔ سعادت حسن منٹو سے ایک زمانے میں ہماری بہت شناسائی ہو گئی تھی اور جب مداح موجود نہ ہوں تو ہم ان سے مختلف موضوعات (بشمول فلم) کے بارے میں سوالات کیا کرتے تھے۔ ایک دن ہم نے موقع پا کر دریافت کیا ''منٹو صاحب کیا آپ نشے کی کیفیت میں بھی شعر کہتے ہیں۔''

کہا ''نشے میں لکھنا یا سوچنا ممکن نہیں ہے۔ البتہ نشے کے عالم میں بعض خیالات یا کردار ذہن میں آجاتے ہیں اور اگلے روز افسانہ لکھ لیتا ہوں۔'' آج کل تو ترنم عام ہے لیکن جگر صاحب کو اس کا موجد کہا جاسکتا ہے۔ جب عالمِ سکرات میں نہیں ہوتے تھے تو بہت علمی گفتگو کرتے تھے اور سوالات کے جواب بھی دیتے تھے لیکن نشے کے عالم میں ان کا عالم کچھ اور ہوتا تھا۔

اصغر گونڈوی کو وہ اپنا استاد تسلیم کرتے تھے۔ جب ان سے قربت بڑھی تو جگر صاحب پر ان کی وجہ سے تصوف کا رنگ غالب ہو گیا۔ مے نوشی چھوڑنے کے بعد تو وہ بالکل صوفی ہو گئے تھے۔ شراب کو ڈاکٹر کے مشورے اور اصرار پر بھی پھر کبھی نہیں چھوا۔ وقت گزاری کے لیے تاش کھیلتے تھے۔ جگر صاحب بہت خوشخط ..... اور چوڑے قلم سے لکھتے تھے جیسے کتابت کر رہے ہوں۔

لطف اللہ خان نے لڑکپن میں ایک شعر پڑھا تھا جو انہیں یاد رہ گیا۔ ان کا خیال تھا یہ جگر صاحب کا شعر ہے۔ ایک بار جگر صاحب کو یہ شعر سنا کر دریافت کیا۔ کیا یہ شعر آپ کا ہے۔

شعر یہ تھا

جنازہ روک کر میرا عجب انداز سے بولے
گلی ہم نے کہی تھی تم تو دنیا چھوڑے جاتے ہو

یہ شعر سن کر جگر صاحب کا موڈ ہی بدل گیا۔ قدرے ترشی سے بولے۔ ''اگر محبوب ایسا کہہ دے تو وہ محبوب کب رہا۔ یقیناً یہ شعر میرا نہیں ہے۔''

ان کی ایک غزل میں چار مصرعے تھے، دریافت کیا ''حضرت، ایک ہی بات دہرانے سے کیا یہ بہتر نہ ہوتا کہ کسی اور موضوع پر گہر افشانی کرتے۔''

بڑی شائستگی اور نرمی سے مسکرا کر بولے ''اگر ایک ہی دلہن کو نئے نئے لباسِ فاخرہ اور مرصع زر و جواہر سے آراستہ کیا جائے تو کیا اس کے حسن و زیبائش میں نت نئی دلکشی پیدا نہ ہوگی۔''

وہ غزل یہ تھی

اب کہاں زمانے میں دوسرا جواب ان کا
فصلِ گل ہے ان کی، موسمِ شباب ان کا

رنگ و بو کی دنیا میں اب کہاں جواب ان کا
عشق فرشِ بزم ان کا، حسن فرشِ خواب ان کا

جگر صاحب کی ذاتی زندگی کا ایک پہلو یہ تھا کہ اصغر گونڈوی کے اشارے پر ان کی شادی اصغر کی چھوٹی سالی نسیم سے ہو گئی۔ تھوڑے عرصے بعد ہی معلوم ہو گیا کہ جگر صاحب اپنی مے نوشی اور لاابالی پن کی وجہ سے گھریلو ذمے داریوں کا حق ادا نہ کر سکیں گے۔ چنانچہ اصغر نے جگر صاحب سے طلاق دلا کر نسیم سے شادی کر لی۔ جگر کو اس سانحے کا بے حد غم ہوا۔ ناکامی اور محرومی کا ایک تلخ دور پہلے ان کے سامنے نہ آیا تھا اس سے نجات پانے کے لیے وہ ایک بار آتشِ سیال میں بے خطر کود پڑے۔

ترکِ مے نوشی کے بعد ان کی اکثر غزلیں مے اور میکدے کے ذکر سے خالی ہوتی تھیں۔ شخصی طور پر وہ پہلے سے زیادہ خلیق ہو گئے تھے۔ مذہبی رنگ غالب آ گیا تھا جو ان کی نعتوں سے بھی ظاہر ہوتا ہے۔ لیکن جس حد تک غزل کا تعلق ہے دونوں زمانوں میں ان میں کوئی فرق نظر نہیں آتا تھا۔

حفیظ جالندھری کے بارے میں انہوں نے تفصیل سے لکھا ہے جستہ جستہ پیش ہیں۔ لکھا ہے کہ جب پہلی مرتبہ میرے گھر آئے تو سرمئی رنگ کی اچکن اور کالے رنگ کی قراقلی پہنے ہوئے تھے۔ حفیظ صاحب تجارتی پہلو کو بھی پیشِ نظر رکھتے تھے۔ لطف اللہ خان کے اسٹوڈیو میں ریکارڈنگ کے لیے آئے تو بہت سا کلام سنایا۔ واپسی کے وقت ان کی بیوی سے کہا، بیٹی آج میں نے آپ کے شوہر کے لیے ڈھائی ہزار روپے کی ریکارڈنگ کرائی ہے۔''

حفیظ صاحب جب بھی کراچی آتے تھے اپنی بیٹی اور داماد کے گھر قیام کرتے تھے مگر جب لطف اللہ خان سے مراسم ہوئے تو دن کا زیادہ وقت ان کے گھر میں گزارتے تھے۔ ایک بار لطف اللہ خان کے ساتھ پستے خریدنے گئے تو تین روپے خان صاحب کے حوالے کر دیے۔ انہوں نے بہت کہا کہ تین روپے کی کیا بات ہے لیکن انہوں نے تین روپے زبردستی ان کی جیب میں ٹھونس دیے۔ حفیظ صاحب اس کے بھی روادار نہ تھے۔ زندگی کے آخری حصے میں بیماریوں کے شکار ہو گئے تھے جن میں بواسیر جیسا مرض بھی شامل تھا۔

حفیظ صاحب نے زندگی بھر کام کیا۔ کمائی بھی کی لیکن مالی حالات اچھے نہ تھے۔ ماڈل ٹاؤن میں اپنی کوٹھی کے

نصرت فتح علی خان

پچھلے حصے میں رہتے تھے۔ سامنے والا حصہ کرائے پر اٹھا رکھا تھا۔ ایک بار ان سے ملاقات کے لیے گئے تو کوٹھی کسی ویرانے کا نقشہ پیش کر رہی تھی۔ نہ رنگ نہ روغن، کمپاؤنڈ جھاڑ جھنکاڑ سے اٹا ہوا تھا۔ یوں لگتا تھا جیسے برسوں سے اس بنگلے میں کوئی نہیں رہتا تھا۔ بمشکل ان کا پتا معلوم ہوا۔ کتنی بدقسمتی کی بات ہے کہ شاہنامہ اسلام کا مصنف، اتنا بڑا شاعر، پاکستان کے قومی ترانے کا خالق اپنے ہی علاقے میں اتنا گمنام تھا۔ راستہ خشک درختوں کے ایک جھنڈ سے گزرتا تھا۔ ٹوٹی پھوٹی سیڑھیاں چڑھ کر اوپر پہنچے۔ دروازہ تھپتھپایا تو ایک خاتون برآمد ہوئیں جو بظاہر جان سے بیزار نظر آ رہی تھیں۔ ہم نے حفیظ صاحب کا پوچھا تو ایک بند کمرے کی طرف اشارہ کیا۔ دروازہ کھٹکھٹایا تو بنیان پہنے لاغر و کمزور حفیظ صاحب نے دروازہ کھولا۔ دیکھ کر خوش ہو گئے۔ بھینچ کر گلے لگایا۔ ایسے دبنگ شاعر کی ایسی زبوں حالی دیکھی نہ گئی۔ جلد ہی رخصت چاہی اور بدمزہ ہو کر چلے آئے، یہ آخری ملاقات تھی۔ چند روز بعد انتقال کر گئے۔ بیاسی سال کی عمر پائی۔ یوں لگتا تھا جیسے ساری کوٹھی میں صرف ایک ہی کمرا حفیظ صاحب کی رہائش گاہ ہے۔

وہ کوئی مالدار شخص نہ تھے۔ روز مرہ کے اخراجات غالباً مشاعروں میں شرکت کر کے پورے کرتے تھے۔ یا پھر تصانیف کی رائلٹی پر گزارہ تھا۔

ان کی ذاتی زندگی کے بارے میں وقتاً فوقتاً حفیظ صاحب نے بتایا کہ تین بیویاں اور سات بیٹیاں ہیں۔ ایک صاحبزادی جو انگریز بیوی سے ہیں لندن میں رہتی ہیں۔ سنا ہے کہ انگریز میم حفیظ صاحب کا بہت خیال رکھتی تھیں جب دوست احباب کا مجمع ہوتا تو مہمانوں سے سرگوشی میں کہتے
The Poet Needs rest.
He is slep ing

انتقال سے پہلے جو بیگم ان کے ساتھ رہتی تھیں وہ کسی زمانے میں ریڈیو پاکستان کی آرٹسٹ تھیں۔

حفیظ صاحب نے بھرپور زندگی گزاری۔

میر آف خیر پور نے اقبال بیگم کے نام کی ایک طوائف سے شادی کی تھی جو انہیں لوٹنے کھسوٹنے میں لگی ہوئی تھیں۔ حفیظ صاحب ریاست میں تین سو روپے ماہوار پر ملازم ہوگئے تھے۔ سالگرہ کے جشن پر ان سے کچھ سنانے کی فرمائش کی گئی۔ حفیظ صاحب نے رات کی رات میں اپنی مشہور نظم ''رقاصہ'' لکھی اور اگلے دن سالگرہ کی محفل میں سنادی جس میں اقبال بیگم عرف بالی کے کردار کو ہدف بنایا گیا تھا۔ محفل میں میر خیر پور اور بالی کو مخاطب کر کے نظم سنادی۔ میر صاحب نے مشتعل ہوکر انہیں پابند سلاسل کردیا۔ تین دن تک جیل میں رہے پھر ریاست کے کارندے انہیں ٹرک میں ڈال کر کسی دور دراز علاقے میں بے یارومددگار چھوڑ آئے۔

حفیظ صاحب ایک صاف گو، نڈر اور بے خوف انسان تھے۔ کسی سے ڈرتے نہیں تھے خواہ ان کا باس ہی کیوں نہ ہو۔

پاکستان کے قومی ترانے کا واقعہ سب کو علم ہوگا۔ اس کی دھن عبدالخالق چھاگلہ نے بنائی تھی جو مغربی انداز میں تھی۔ کابینہ نے اسے پسند کرلیا۔ اب سوال یہ تھا کہ اس مغربی طرز کے بول کیسے لکھے جائیں۔ حفیظ صاحب نے اس ترانے کے بول بنائے اور عجیب وغریب بات یہ ہے کہ پارلیمنٹ میں بولوں کے بغیر گنگنا کر سنائی۔ انہوں نے بتایا کہ میں نے مغربی کمپوزیشن میں راگ بیلو کا ٹکڑا ڈال دیا ہے جس سے یہ دھن مشرقی ہوگئی ہے۔ ذوالفقار بخاری نے بھی اس کے بول لکھے تھے۔ کسی زمانے میں وہ حفیظ صاحب سے اصلاح لیا کرتے تھے۔ اس بات پر دونوں میں چشمک بھی ہوگئی تھی۔

چوتھی افرو ایشین کانفرنس میں (85) حفیظ صاحب بھی پاکستانی وفد کے ساتھ تاشقند گئے تھے۔ ان دنوں ایوب خان کی حکومت تھی فیض احمد فیض نے بھی اس کانفرنس میں شرکت کی تھی۔ یہاں فیض صاحب اور حفیظ صاحب کے درمیان پاکستان کے بارے میں گفتگو ہوئی تو فیض صاحب نے اپنے مخصوص خیالات کا برملا اظہار کیا۔ حفیظ صاحب نے بڑے تلخ لہجے میں کہا ''مجھے خیال نہیں تھا کہ آپ پاکستان کو ختم کرنے کی کوشش کریں گے۔'' اس بات سے حفیظ صاحب کی شدید حب الوطنی کا اظہار ہوتا ہے (میرے ذاتی خیال میں فیض صاحب بھی پکے اور محب وطن پاکستانی تھے اور جب بھی پاکستان سے باہر مجبوراً رہنا پڑا تو پاکستان آنے کی خواہش رہی۔۔۔۔ یہاں تک کہ دنیا بھر کے ممالک سے بہترین آفرز کے باوجود انہوں نے پاکستان میں ہی رہنے کو ترجیح دی۔ آفاقی)

ایک ریکارڈنگ میں (جو موجود ہے) روسی نمائندوں نے حفیظ صاحب کو اپنا ہم خیال اور ہم نوا بنانے کے۔۔۔۔ عوض تیس 30 لاکھ روپے کی پیشکش کی جو انہوں نے ٹھکرادی۔ یہ رویہ دیکھ کر روسی اہلکار حیران رہ گئے۔ اس سودے کی تصدیق اس خط سے ہوئی جو پاکستانی سفیر متعین ماسکو نے وزیر خارجہ پاکستان کو لکھا تھا جس میں کہا گیا تھا ''حفیظ نے وہ کام کیا ہے جو بارہ برس میں ہم نہ کرسکے۔''

تیس لاکھ روپے اس زمانے میں بہت بڑی رقم تھی جسے حفیظ صاحب نے حقارت سے ٹھکرادیا تھا۔

حفیظ صاحب کے دبنگ ہونے کا واقعہ بھی سن لیجیے۔ یہ واقعہ اسکندر مرزا سے متعلق ہے جب وہ محکمہ دفاع کے سیکریٹری تھے۔ ہوا یوں کہ حفیظ صاحب جو خود بھی محکمہ دفاع سے وابستہ تھے اسکندر مرزا کی پیشگی اجازت کے بغیر وزیراعظم لیاقت علی سے مل آئے جو کہ وزیر دفاع بھی تھے۔ یہ ملاقات ایک قومی شاعر اور وزیراعظم کے درمیان ہوئی تھی جو خالص ذاتی قسم کی تھی۔ اتفاقاً اس وقت اسکندر مرزا بھی استقبالی کمرے میں موجود تھے اور یہ کارروائی دیکھ رہے تھے۔ ایک بیوروکریٹ سے یہ ''بے قاعدگی'' کیسے دیکھی جاسکتی تھی۔ دوسرے دن انہوں نے حفیظ صاحب کو بلا بھیجا۔ یہ گئے تو اسکندر مرزا نے اپنے کمرے سے کرسیاں اٹھوادیں تاکہ حفیظ کو بیٹھنے کا موقع نہ دیا جائے۔

حفیظ صاحب تاڑ گئے اور ڈھٹائی سے فائلیں ہٹا کر میز کے ایک سرے پر بیٹھ گئے۔ یہ دیکھ کر اسکندر مرزا بے قابو ہوگئے، رولر لے کر مارنے کو اٹھے۔ اس سے پہلے کہ وہ کچھ

معروف اداکار سنجے دت پولیس حراست میں

کرتے حفیظ صاحب نے آگے بڑھ کر ان کا رولر پکڑ لیا اور انہیں ایک تھپڑ رسید کردیا اور کہا ''تم چاہتے تھے کہ میں تمہارے سامنے کھڑا ہوکر تمہاری بات سنوں۔۔ اور اپنی پتلون میں کانپوں'' پھر انگریزی میں کہا You Have Selected a Wrong man. I Will not Let you out from here unless I beat you for insult.

اس کے بعد کہا ''میرے پاس پتھر (میز پہ) پڑا ہوا تھا میں نے میز پر سے پیپر ویٹ اٹھا کر زور سے مارا جو اس کی چھاتی پر لگا۔''

حفیظ صاحب جیسا کہ اس واقعے سے ظاہر ہوتا ہے بہت نڈر اور بے باک انسان تھے۔ کسی بڑے سے بڑے شخص کو خاطر میں نہیں لاتے تھے۔ وزیروں یہاں تک کہ وزیراعظم کے کمرے میں بھی اجازت حاصل کیے بغیر داخل ہوجاتے تھے۔ سبھی ان کی عزت وتکریم کرتے لیکن حقیقت یہ ہے کہ وہ اس تمام احترام سے بھی بالاتر تھے۔

انہوں نے پیسے کو بھی سنبھال کر نہ رکھا۔ ہر حال میں خوش اور مطمئن رہے۔ جب مالی حالات خراب ہوئے تب بھی انہوں نے حکومت سے کچھ مانگنے کی کوشش نہیں کی حالانکہ ان کا جو مرتبہ تھا اگر وہ اشارہ کردیتے تو دنیا بھر کی نعمتیں ان کے قدموں میں ڈال دی جاتیں۔ زندگی کے آخری ایام انہوں نے گمنامی اور مالی بدحالی میں گزارے مگر نہ کسی سے شکایت کی نہ طلب۔ بے حد خوددار انسان تھے۔ اس خودداری اور خوداعتمادی نے ہی ان میں وہ حوصلہ پیدا کردیا تھا کہ کسی سے سوائے خدا کے کبھی نہ ڈرے نہ جھکے۔

اب ان کی مشہور نظم ''رقاصہ'' بھی ملاحظہ کیجیے جو انہوں نے بھرے دربار میں نواب خیر پور کو ان کی بیگم اور محبوبہ کے سامنے واضح اشارات کے ساتھ سنائی تھی۔ حفیظ جالندھری نے ایک سے بڑھ کر ایک نظم کہی جو ہر اک کی نوکِ زباں ہوگئی۔ ان کا تعلق ایک متوسط طبقے سے تھا۔ باقاعدہ تعلیم بھی حاصل نہیں کی تھی مگر تحقیق اور مطالعہ بہت گہرا تھا یہاں تک کہ انگریزی بولنے پر بھی قادر ہوگئے تھے۔ انہوں نے کبھی کسی کی تنقید کی پروا نہیں کی۔ ان کا یہ شعر ان کی زندگی کا عملی ثبوت ہے۔

حفیظ اہل زباں کب مانتے تھے
بڑی مشکل سے منوایا گیا ہوں

حفیظ جالندھری کی نظم ''رقاصہ'' ملاحظہ کیجیے۔

اٹھی ہے مغرب سے گھٹا
پینے کا موسم آگیا
ہے رقص میں اک مہ لقا
نازک ادا ناز آفریں
ہاں ناچتی جا گائے جا

لفظوں سے دل برمائے جائے
تڑپائے جا تڑپائے جا
او دشمنِ دنیا و دیں
تیرا اتھر کتنا خوب ہے
تیری ادائیں دل نشیں
لیکن ٹھہر تو کون ہے
او نیم عریاں نازنیں
کیا مشرقی عورت ہے تو
ہرگز نہیں ہرگز نہیں
تیری ہنسی بے باک ہے
تیری نظر چالاک ہے
اف کس قدر دل سوز ہے
تقریر بازاری تری
کتنی ہوس آمیز ہے
یہ سادہ پُرکاری تری
شرم اور عزت والیاں
ہوتی ہیں عفت والیاں
وہ حسن کی شہزادیاں
پردے کی ہیں آبادیاں
چشمِ فلک نے آج تک
دیکھی نہیں ان کی جھلک
سراپۂ شرم وحیا
زیور ہے ان کے حسن کا
شوہر کے دکھ سہتی ہیں وہ
منہ سے نہیں کہتی ہیں وہ
کب سامنے آتی ہیں وہ
غیرت سے کٹ جاتی ہیں وہ
میرا اعزازِ ملت ان سے ہے
نام شرافت ان سے ہے
ایمان پہ قائم ہیں وہ
پاکیزہ و صائم ہیں وہ
تجھ میں نہیں شرم وحیا
تجھ میں نہیں مہر و وفا
سچ سچ بتا تو کون ہے
او بے حیا تو کون ہے
احساسِ عزت کچھ نہیں
شرم اور عزت کچھ نہیں
یہ پُرفسوں غمزے ترے
نامحرموں کے سامنے
ہٹ سامنے سے دور ہو
مردود ہو مشہور ہو
تقدیر کی ہیٹی ہے تو
شیطان کی بیٹی ہے تو
جس قوم کی عزت ہے تو
اس قوم پہ لعنت ہے تو
لیکن ٹھہر جانا ذرا
تیری نہیں کوئی خطا
غمزوں میں عزت ہی نہیں
قومی حمیت ہی نہیں
وہ ملتِ بیضا کہ تھی
سارے جہاں کی روشنی
اب اس میں دم کچھ بھی نہیں
ہم کیا ہیں، ہم کچھ بھی نہیں
جمعیت اسلامیاں
شہنشاہ ہندوستاں
اب اس میں دم کچھ بھی نہیں
ہم کیا ہیں ہم کچھ بھی نہیں
ملی سیاست اٹھ گئی
بازو کی طاقت اٹھ گئی
شانِ حجازی اب کہاں
وہ ترک تازی اب کہاں
اب غزنوی ہمت گئی
اب بابری شوکت گئی
ایمان عالمگیر کا
مسلم کے دل سے اٹھ گیا
قوم اب جفا پیشہ ہوئی
عزت گدا پیشہ ہوئی
اب رنگ ہی کچھ اور ہے
بے غیرتی کا دور ہے
یہ قوم اب مٹنے کو ہے
یہ نزد اب ہٹنے کو ہے
افسوس یہ ہندوستاں
یہ گلشنِ جنت نشاں
طاعت گزاروں کا وطن

ایمان داروں کا وطن
رہ جائے گا ویرانہ پھر
بن جائے گا بت خانہ پھر
لیکن مجھے کیا خبط ہے
تقریر کیوں بے ربط ہے
ایسا بہک جاتا ہوں میں
منہ آئی بک جاتا ہوں میں
اتنا شرابی ہو گیا
عقل و خرد کو کھو گیا
کچھ تو زمانے سے غرض
مٹنے مٹانے سے غرض
ہندوستاں سے کام کیا
اندیشۂ انجام کیا
جینے دو جینے دو مجھے
پینے دو پینے دو مجھے
جب حشر کا دن آئے گا
اس وقت دیکھا جائے گا
ہاں ناچتی جا گائے جا
نظروں سے دل برمائے جا
تڑپائے جا تڑپائے جا
او دشمنِ دنیا و دیں
(اس وقت پاکستان قائم نہیں ہوا تھا)

ظاہر ہے کہ بھرے دربار میں ایک ریاست کے حاکم مطلق کی محبوبہ اور بیوی اور نواب کو مخاطب کرکے یہ نظم پڑھنا بڑی جرأت کا کام تھا۔ کیونکہ اقبال بیگم دربار میں رقص بھی کرتی رہی تھی۔ اس کے بعد حفیظ جالندھری کو بند کرنا اور ریاست بدر کرنا بہت کم سزا تھی لیکن مشکل یہ ہے کہ نواب صاحب خیرپور حفیظ جالندھری کا کچھ بگاڑ نہیں سکتے تھے کیونکہ اس وقت بھی وہ ہندوستان گیر شہرت کے مالک اور بے حد مقبول شاعر بن چکے تھے۔

☆☆☆

سیالکوٹ پانچ ہزار سال قدیم ایک شہر ہے جس کے وقتاً فوقتاً مختلف نام رکھے گئے۔ سیالکوٹ کے اردگرد ایک تاریخی مقام "پورن داکھوہ" واقع ہے مگر بہت کم لوگ جانتے ہیں کہ اس کا نام پورن داکھوہ کیوں رکھا گیا؟ اس کے بارے میں کئی قسم کی داستانیں موجود ہیں۔ صدیاں گزرنے کے بعد اب اس کی صورت شکل بدل چکی ہے

جگر مرادآبادی

صرف آثار باقی رہ گئے ہیں۔ دراصل یہ ایک تاریخی مقام ہے جس کی تاریخی اہمیت سے انکار نہیں کیا جاسکتا۔

قدیم داستان کے مطابق ہزاروں سال قبل یہاں ایک راجا حکومت کرتا تھا جس کا نام سالباہن تھا۔ اس کی دو رانیاں تھیں ایک کا نام رانی اچھراں اور دوسری کا نام لونان تھا۔ رانی اچھراں چمبہ ریاست جموں کشمیر) کے راجا کی بیٹی تھی۔ راجا سالباہن نے اپنی چہیتی رانی کے لیے سیالکوٹ کے قلعے کے پاس ایک نہایت عالیشان محل تعمیر کرایا تھا۔ اس محل کا نام روڈس تھا۔ ایک شاندار سڑک قلعے کے اور رانی کے محل کے درمیان تعمیر کی گئی تھی۔ ان ہی دنوں رانی کے بارے میں مشہور ہوا کہ وہ ماں بننے والی ہیں۔ اس خبر کی وجہ سے سارے ملک میں خوشی کی لہر دوڑ گئی اور چراغاں کیا گیا۔ عوام نے بھی خوشیاں منائیں۔ لیکن رانی لونان اولاد سے محروم تھی۔

راجا معمر ہو چکا تھا لیکن رانی لوناں جوان تھی۔ جب اس کا سوتیلا بیٹا پورن نوجوان ہوا تو رانی لوناں اس پر مہربان ہوگئی۔ نوجوان پورن کو مختلف طریقوں سے اپنی طرف متوجہ کیا لیکن پورن ایک پاک باز اور نیک اطوار نوجوان تھا۔ پھر اس کا ضمیر بھی یہ اجازت نہیں دیتا تھا کہ اپنی سوتیلی ماں کے ساتھ محبت کی پینگیں بڑھائے۔ جب پورن .... کی توجہ اور محبت حاصل نہ کرسکی تو رانی لونان نے اس کو بدنام کرنے کی

ٹھانی اور راجا کے سامنے اس پر الزامات عائد کر کے تہمت لگائی اور بتایا کہ وہ اپنی سوتیلی ماں پر بری نظر رکھتا ہے۔ رانی لونان نے راجا کو پورن کے خلاف اتنا بھڑکایا کہ وہ غصے میں بے قابو ہو گیا اور اس کے ہاتھ پاؤں کٹوا کر اس کو شہر کے باہر ایک اندھے کنویں میں ہی پھنکوا دیا...... راجا نے پورن کی ماں کو شہر بدر کر دیا۔ رانی اچھراں نے ملک سے باہر ایک جگہ چھوٹی سی کٹیا بنا کر اس میں رہنا شروع کر دیا اور یہ جگہ اچھرہ کے نام سے آج بھی مشہور ہے۔

اتفاق سے گورو گورکھ اور ان کے ساتھیوں کا وہاں سے گزر ہوا تو چند جوگیوں نے جب پانی نکالنے کے لیے کنوئیں میں ڈول ڈالا تو انہیں معلوم ہوا کہ اندھے کنوئیں کے اندر ایک معذور انسان موجود ہے۔ جوگیوں نے پورن کو کنویں سے نکالا اور گورو کے پاس لے گئے۔ گورو نے اپنی روحانی طاقت سے پورن کے کٹے ہوئے ہاتھ پیر جوڑ دیے اور اس کو اپنا چیلا بنا لیا اور پورن گورو کے ساتھ رہنے لگا۔ پورن ایک سال تک یہیں رہا اور عبادت میں مصروف رہا۔ وہ ساری دنیا کو چھوڑ کر اب ایک تارک الدنیا مذہبی پیشوا بن چکا تھا۔ لوگ دور دور سے پورن کے پاس آتے اور اپنی منتیں مانگتے جو عموماً پوری ہو جاتی تھیں۔ رفتہ رفتہ اس کے چرچے سارے ملک میں ہونے لگے۔ رانی لونان کی گود ابھی تک خالی تھی۔ راجا اپنے اکلوتے بیٹے سے پہلے ہی بے تعلق ہو چکا تھا۔ جب راجا کے دربار میں اس مذہبی پیشوا کا تذکرہ ہوا تو رانی لونان نہ صرف اولاد سے محروم تھی بلکہ اس کے جسم میں پیپ پڑ چکی تھی اور وہ سخت تکلیف میں مبتلا تھی۔ دوسری طرف رانی اچھراں اپنے بن باس کی مدت گزار کر راجا کے محل میں واپس آ چکی تھی۔

جب پورن کی شہرت محل تک پہنچ گئی تو راجا اپنی دونوں رانیوں کے ساتھ پورن کے پاس گیا اور درخواست کی کہ وہ راجا کے لیے اولاد کی اور رانی لونان کے لیے صحت کی دعا کرے۔ پورن نے راجا سالباہن کی طرف دیکھا اور پوچھا ”کیا تم نے اپنے پھول کی پتیاں خود نہیں نوچی تھیں؟“

راجا یہ سوال سن کر بہت شرمندہ ہوا۔ اس کے بعد پورن نے جس کا حلیہ بالکل تبدیل ہو چکا تھا رانی لونان سے سرگوشی کر کے کہا ”مہارانی آپ تندرست ہو سکتی ہیں بشرطیکہ سچ بولیں اور راجا کو بتائیں کہ حقیقت کیا تھی اور آپ نے اسے کس رنگ میں پیش کیا تھا؟“

یہ سن کر رانی لونان کے قدموں تلے سے زمین نکل گئی۔ اس نے راجا کے سامنے اعتراف کر لیا کہ اس نے پورن پر جھوٹا الزام لگایا تھا وہ معصوم اور بے گناہ تھا۔ دراصل وہی اس کو بہکانا چاہتی تھی۔

راجا یہ سن کر لرز کر رہ گیا اور اس کی آنکھیں کھل گئیں۔ اسے پہلی مرتبہ احساس ہوا کہ اس نے اپنے معصوم اکلوتے بیٹے کو کس طرح ستم کا نشانہ بنایا تھا۔ پورن نے راجا کو مخاطب کر کے کہا کہ جھوٹ زیادہ عرصے تک پوشیدہ نہیں رہ سکتا اور جھوٹ بولنے والوں کو اس کی سزا ضرور ملتی ہے۔

پورن نے رانی لونان کے اعترافِ گناہ کے بعد اس سے کہا کہ بھگوان تمہیں چاند سا بیٹا دے گا۔ اس کا نام رسالو رکھنا۔

راجا نے بہت کوشش کی کہ پورن واپس چل کر محل میں رہے لیکن اس نے کہا کہ میں دنیا چھوڑ چکا ہوں۔ راجا مایوس ہو کر واپس چلا گیا لیکن اس نے پورن کی یاد میں بہت شاندار مندر، لنگر خانے اور دھرم شالائیں تعمیر کرائیں تاکہ اس کے گناہ کی کچھ تلافی ہو سکے۔

ایک انگریز مورخ کے مطابق 1857ء تک اس محل کے کھنڈرات باقی تھے لیکن اس کے بعد یہ کھنڈر بھی بے نام نشان رہ گئے لیکن پورن کا کھوہ (کنواں) آج بھی سیالکوٹ سے دس میل کے فاصلے پر موجود ہے۔ چند کلومیٹر کے فاصلے پر موضع کھرول واقع ہے جہاں سے پورن کے کھوہ کے بارے میں معلومات حاصل کی جا سکتی ہیں۔ یہ جگہ اب ویران ہے اور بڑے بڑے سایہ دار درختوں میں گھری ہوئی ہے۔ جس کنوئیں میں پورن کو ہاتھ پیر کٹوا کر پھینکا گیا تھا اس کے چاروں طرف پختہ چار دیواری بنادی گئی ہے۔ پنجاب کے ہر خطے میں ایسے تاریخی مقامات کے کھنڈرات موجود ہیں مگر ہماری حکومت اور محکمہ سیاحت نے کبھی ان کے بارے میں تحقیق کرنے اور ان داستانوں کو عوام تک پہنچانے کی کوشش نہیں کی۔ یوں تو پاکستان کے ہر صوبے میں تاریخی یادگاریں اور عمارتوں کے کھنڈر بکھرے پڑے ہیں مگر پنجاب ایک ایسا صوبہ ہے جسے اس معاملے میں قدرت نے مالا مال کر رکھا ہے۔ یہ ایک مردم خیز خطہ ہے جہاں قدم قدم پر محبت کی داستانیں اور ان کے مقبرے یا ان کے کھنڈرات موجود ہیں۔

☆☆☆

قدرت بھی کیسے کیسے کرشمے دکھاتی ہے۔ کوئی انسان نہیں جانتا کہ اگلے لمحے کیا ہونے والا ہے۔ قدرت کے

اختیار میں ہے کہ وہ کسی بھی لمحے کسی کو فرش سے عرش تک اور عرش سے فرش تک پہنچا دے۔

بھارتی سپر اسٹار سنجے دت کوئی معمولی آدمی نہیں ہیں۔ ان کی والدہ آنجہانی اداکارہ نرگس ہندوستان کی نامور اور ممتاز ترین اداکارہ تھیں۔ انہوں نے اداکارہ کی حیثیت سے بہت شہرت حاصل کی۔ انہیں ”مدر انڈیا“ میں کام کرنے کے بعد ہندوستان کی عظیم ترین اداکارہ کہا جاتا تھا۔ وہ بھارتی لوک سبھا کی رکن بھی تھیں۔ کینسر کے مرض میں مبتلا ہونے کے بعد وہ وفات پا گئیں۔ ان کے والد فلم ساز اداکار سنیل دت بھی بڑے اداکار تھے۔ وہ بھی بھارتی لوک سبھا کے رکن رہے۔ انہوں نے ...... فرقہ واریت کے خلاف ملک بھر میں بڑے بڑے جلوس نکالے۔ سنجے دت ان کے لاڈلے بیٹے تھے۔ ایک زمانے میں وہ منشیات کی عادت میں مبتلا ہو گئے تھے اور سب کا خیال تھا کہ ان کا کیریئر ختم ہو چکا ہے اور وہ دوبارہ کبھی اداکاری کرنے کے قابل نہ ہو سکیں گے لیکن طویل علاج اور مضبوط قوتِ ارادی کی وجہ سے انہوں نے اپنی اس عادت پر قابو پا لیا اور ایک نارمل انسان بن گئے۔

اپنی زندگی کے دوسرے دور میں انہوں نے بہت عمدہ معیاری اور کامیاب فلموں میں کام کیا اور دوبارہ عروج حاصل کر لیا۔ سنجے دت نے ایکشن، رومانی، ڈرامائی اور مزاحیہ ہر قسم کے کردار بہت کامیابی سے ادا کیے۔ فلم منا ایم بی بی ایس، ان کی بہترین اداکاری کی ایک مثال ہے جس میں انہوں نے ہر قسم کی اداکاری کا بہت کامیاب مظاہرہ کیا۔ کسی جگہ وہ جارحانہ مزاج کے حامل نظر آئے تو کسی جگہ انسانی جذبات سے لبریز انسان۔ خصوصاً اسپتال کے مناظر میں جب وہ ایک نوجوان کینسر کے مریض کے بارے میں سنتے ہیں کہ اس کا مرض لاعلاج ہے اور وہ زیادہ عرصے زندہ نہیں رہے گا تو ان کے چہرے کے تاثرات اور اداکاری قابلِ دید ہے۔

سنجے دت نے بے شمار کامیاب فلموں میں کام کیا اور شہرت حاصل کی۔ چند فلموں میں انہوں نے گووندا کے ساتھ مزاحیہ کردار بھی خوبصورتی سے نبھائے۔

اس پس منظر میں وہ انڈیا کے صحیح معنوں میں سپر اسٹار نظر آئے اور تسلیم کر لیے گئے۔ ممبئی دھماکوں کے بعد سنجے دت مشکل میں پھنس گئے۔ ان کے گھر کی تلاشی لینے پر وہاں سے ایک لائسنس کے بغیر رائفل برآمد کی گئی اور پولیس نے یہ کیس بنایا کہ وہ بھی دہشت گردوں کے ساتھ ملے ہوئے تھے اور ان کی مدد کرتے رہتے تھے۔ حالانکہ حقیقت صرف یہ ہے کہ وہ ایک مسلمان ماں کے بیٹے ہیں اور ان کے والد بھی ایک بالکل غیر متعصب انسان تھے۔ یہ دونوں باتیں متعصب اور انتہا پسند ہندو تنظیموں کو بہت ناگوار گزرتی تھیں جو اکھنڈ بھارت اور ہندوستانی مسلمانوں کو ملک سے باہر نکل جانے یا ہندو ہو جانے کا مشورہ دیتے رہے ہیں۔ اس ماحول میں سنجے دت جیسے غیر متعصب اداکار کو جس کی ماں بھی ایک مسلمان تھی کیسے برداشت کیا جا سکتا تھا۔

جب ان پر مقدمہ چلا تو تمام ٹھوس دلائل کے باوجود عدالت نے ان کا نقطہ نظر تسلیم نہیں کیا اور انہیں ممبئی حملوں میں ملوث قرار دے کر طویل سزا سنا دی۔ سنجے دت اس زمانے میں متعدد بڑی فلموں میں کام کر رہے تھے اور بالی ووڈ کے انصاف پسند اور غیر متعصب لوگ بھی ان کے حق میں تھے اس کے باوجود انہیں جیل بھیج دیا گیا جہاں انہوں نے بہت مشکلات برداشت کیں۔

• ان کے علاوہ تقریباً پچاس افراد کو تین سے چودہ سال قید کی سزا دی گئی ہے۔ ان تمام ملزموں کو ایک ہی وقت میں سزا نہیں دی گئی بلکہ دس ماہ کے طویل عرصے میں انہیں باری باری مجرم قرار دیا گیا۔

سنجے دت کی عمر اس وقت 48 سال ہے۔ چھ سال جیل میں رہنے کے بعد ظاہر ہے کہ نہ تو اس کی مقبولیت رہے گی اور

نہ ہی اس کو مرکزی کرداروں میں کاسٹ کیا جائے گا۔ یہ بھی ممکن ہے کہ وہ خود ہی اداکاری ترک کردے۔ سنجے دت عموماً تنازعات اور اختلافات کا موضوع بنا رہا ہے۔ سنجے دت کی ایک فین نے کہا کہ یہ کتنی عجیب بات ہے کہ جس پر سنجے دت کو رائفل اور پستول فراہم کرنے کا الزام ہے اس کو تو صرف دو سال کی سزا ملی اور کچھ عرصے بعد اس کو ضمانت پر رہا بھی کردیا گیا۔ تو پھر سنجے دت کے ساتھ یہ امتیازی اور ظالمانہ سلوک کس لیے؟ سنجے دت کے پرستاروں کو یقین نہیں آرہا کہ اس کو چھ سال کی سزا دی گئی ہے۔ وہ پہلے ہی زندگی میں بہت سے مسائل اور مشکلات سے دوچار رہا ہے۔ عدالت کو یہ تو سوچنا چاہیے تھا کہ اب وہ ایک سدھرا ہوا شریف اور نارمل انسان بن چکا ہے۔ اور یہ کیسا انصاف ہے کہ ان حملوں کا ماسٹر مائنڈ داؤد ابراہیم آج تک گرفتار نہ ہوسکا۔ ایک 64 سالہ خاتون زیب النساء کو بھی پانچ سال قید کی سزا دی گئی ہے جس نے سپریم کورٹ میں اس فیصلے کے خلاف اپیل کردی ہے اور سپریم کورٹ نے سی بی آئی کو نوٹس جاری کردیا ہے کہ اس عورت کو سزا دینے کی وجوہات بیان کی جائیں۔ دیکھیے سپریم کورٹ کو سی بی آئی مطمئن کرسکتی ہے یا اس بوڑھی عورت کو آزادی مل جائے گی۔

اسی اثنا میں کئی فلم سازوں نے عدالت سے اپیل کی کہ سنجے دت اس وقت جن فلموں میں کام کررہے ہیں ان پر اربوں کا سرمایہ لگا ہوا ہے۔ بہرحال عدالت نے یہ رعایت کی کہ ان فلموں کی تکمیل تک ان کی سزا ملتوی کردی اور وہ دوبارہ فلموں میں کام کرنے میں مصروف ہوگئے۔

سنجے دت کو 1993 میں چھ سال کی سزا دی گئی تھی۔ ان پر الزام تھا کہ انہوں نے ممبئی کے حملوں میں حصہ لیا تھا۔ عدالت نے اپنے فیصلے میں 12 افراد کو پھانسی کی سزا سنائی اور بارہ افراد کو سزائے عمر قید سنائی گئی۔ انسداد دہشت گردی کی عدالت نے ان جرائم میں ایک سو افراد کو ملوث قرار دیا۔

سنجے دت کی باری آئی تو انہیں چھ سال قید با مشقت کی سزا سنائی گئی۔ فلم والوں کو یقین نہیں آیا کہ گھر میں ایک رائفل رکھنے کے جرم میں چھ سال کی سزا بھی دی جاسکتی ہے۔ سنجے دت کو رائفل سپلائی کرنے کے الزام میں ایک شخص کیری کو دو سال قید کی سزا سنائی گئی تھی۔

سنجے دت کے پرستار ملک بھر میں اس کے حق میں مظاہرے کررہے ہیں۔ ان کے وکیل نے کہا ہے کہ وہ کچھ عرصے بعد اس فیصلے کے خلاف اپیل بھی کریں گے کیونکہ ابھی تک سزائیں سنانے کا سلسلہ ختم نہیں ہوا ہے۔

سنجے دت کی زندگی بچپن ہی سے دکھوں سے بھرپور رہی ہے۔ جب وہ ہائی اسکول میں تھا تو منشیات کا عادی ہوگیا تھا۔ ہیرو کی حیثیت سے سنجے دت کی پہلی فلم 1981ء میں اس کی ماں کے مرنے کے بعد ریلیز ہوئی تھی..... یہ بھی اس کے لیے ایک المیہ تھا جس کی وجہ سے وہ دوبارہ منشیات کا عادی ہوگیا تھا اور ماں کے غم میں ڈوب گیا۔ دوبارہ اس کا علاج کرایا گیا اور وہ رفتہ رفتہ ماں کی موت کے غم کو بھی بھول گیا مگر ایک اور صدمہ اس کا منتظر تھا جب کچھ عرصے بعد اس کا لاڈ اٹھانے والا باپ دنیا سے رخصت ہوگیا۔ سنجے دت نے ایک حساس.... فنکار کی حیثیت سے ان تمام دکھوں اور غموں کو بھلایا۔ دوستوں اور ڈاکٹروں نے بھی اس کی مدد کی۔ اس طرح وہ اپنے غموں پر قابو پاکر ایک نارمل انسان بن گیا۔ اب وہ ایک بدلا ہوا انسان اور پہلے سے بہتر اداکار بن چکا تھا۔ اس کی کئی فلمیں یکے بعد دیگرے بہت کامیاب ہوئیں جس کی وجہ سے اس کے اندر خود اعتمادی پیدا ہوگئی۔ وہ ایک خوش اخلاق، ہنس مکھ اور ساتھیوں کے ساتھ گھل مل کر رہنے والا اداکار تھا۔ چھ سال کی قید مشقت کی سزا دینے کے بعد بھی اس کے مخالفوں کا دل ٹھنڈا نہیں ہوا۔ انہوں نے اس کی مشکلات میں اضافہ کرنے کے مختلف طریقے سوچنے شروع کردیے۔ اس کو ایک جیل سے دوسری جیل میں منتقل کیا جاتا رہا۔

گلف نیوز نے چند دن پہلے اس کے بارے میں تفصیلی واقعات درج کرتے ہوئے لکھا ہے کہ اب اس کو ممبئی کے آرتھر روڈ جیل میں منتقل کردیا گیا ہے۔ اس کو جیل کی ایک بیرک سے دوسری میں بھیج دیا جاتا ہے اور وجہ اس کا تحفظ بیان کی جاتی ہے۔ آرتھر جیل میں یہ ناز و نعم میں پرورش پانے والا اور رئیسانہ زندگی گزارنے والا فن کار کس طرح زندگی بسر کررہا ہے اس کا نقشہ گلف نیوز نے اس طرح کھینچا ہے۔

"عیش و عشرت میں زندگی بسر کرنے والا یہ سپر اسٹار آرتھر جیل میں بھیجا گیا تو نہ اس کے پلنگ پر چادر تھی اور نہ تکیہ۔ یہاں تک کہ ممبئی کی شدید گرمی میں اس کو ایک بجلی کا پنکھا تک فراہم نہیں کیا گیا۔

دوپہر کے کھانے میں اسے جیل میں پکی ہوئی دال اور سبزی کھانے کو دی جاتی ہے۔ اس نے جیل میں پہلی رات ایک عام قیدی کی طرح گزاری اور اس کے ساتھ وہی سلوک کیا گیا جو جیل کے مجرموں کے ساتھ کیا جاتا ہے۔ اسے جیل میں مشقت بھی کرنی پڑی۔ البتہ رات کے وقت اس کو ایک پھٹا پرانا کمبل دیا گیا تاکہ وہ سردی سے محفوظ رہ سکے۔ یہ کوئی خاص رعایت نہیں تھی۔ جیل کے ہر قیدی کو ایک پرانا کمبل فراہم کیا جاتا ہے۔

سنجے دت جیل کے جس کمرے میں قید ہے وہ 90 مربع فٹ ہے۔ اس کو جیل میں ذاتی لباس پہننے کی اجازت نہیں ہے اور اس کو پہننے کے لیے ویسا ہی لباس دیا جاتا ہے جیسا کہ دوسرے قیدی پہنتے ہیں۔ اس کے ساتھ کسی قسم کی رعایت نہیں کی جاتی۔ پینے کو بالٹی میں رکھا ہوا پانی اور کھانے کو دال اور بدمزہ ترکاری کے علاوہ اس کو اور کچھ نہیں ملتا۔ اس کو اپنے گھر سے قمیص اور جینز منگانے کی اجازت بھی نہیں ہے۔ اس کو شیو کا سامان، اچھا صابن اور اچھا تولیا استعمال کرنے کی بھی اجازت نہیں ہے۔ وہ جو غسل خانہ استعمال کرتا ہے وہی غسل خانہ آٹھ دوسرے قیدی بھی استعمال کرتے ہیں۔

سنجے دت کی عمر اس وقت 48 سال ہے حالانکہ وہ ایک صحت مند اور لمبا تڑنگا آدمی ہے۔ اس کو صبح ساڑھے سات بجے بسکٹ، چائے اور توس کا ناشتا دیا جاتا ہے۔ شام کو تین بجے ایک پیالی چائے کی دی جاتی ہے۔ اس کے فوراً بعد یعنی ساڑھے تین بجے اسے اسی قسم کا ڈنر ملتا ہے جیسا لنچ دیا جاتا ہے۔ اس کو ساری رات سکون سے سونا بھی نصیب نہیں ہوتا چونکہ حفاظت کے نام پر ہر رات اس کی بیرک تبدیل کردی جاتی ہے۔ بیرک نمبر دس میں مصطفیٰ روسا اور ابوسالم جیسے خطرناک مجرم اور دہشت گرد بھی رکھے جاتے ہیں، حفاظت کے نام پر۔ ان دونوں کا مقدمہ بھی سنجے دت کے ساتھ ہی چلایا گیا تھا۔ انہیں چودہ چودہ سال کی سزا سنائی گئی ہے۔ سنجے دت کی دو بہنیں ہیں۔ ایک کا نام نمرتا اور دوسری کا پریا ہے۔ بہنوں کو اپنے لاڈلے بھائی سے ملاقات کی بہت کم اجازت ملتی ہے۔"

گلف نیوز کی اس رپورٹ کے بعد اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ بالی ووڈ کا یہ سپر اسٹار کس طرح زندگی کے روز و شب گزار رہا ہے۔ اپنی ایک فلم میں وہ ہر ایک کو تسلی دیتے ہیں کہ "ٹینشن نہیں لینے کا" ہم سنجے دت سے اس کے سوا کیا کہہ سکتے ہیں کہ ٹینشن نہیں لینے کا ہے سنجو بابا۔

☆☆☆

ہارمونیم کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ ایک زمانے میں ہارمونیم کے بغیر موسیقی یا ساز مکمل نہیں سمجھے جاتے تھے۔ ہارمونیم ایک ایسا ساز تھا جس پر موسیقار اپنی دھنیں تخلیق کرتے تھے۔ شوقین شریف زادے بھی ہارمونیم بجانے کی تربیت حاصل کرتے تھے اور گھروں میں ہارمونیم کی محفلیں سجاتے تھے۔

اس کے بعد جب رفتہ رفتہ نئے ساز، خصوصاً مغربی سازوں کو مشرقی موسیقی میں شامل کیا گیا تو ہارمونیم کو رفتہ رفتہ سازوں سے خارج کردیا گیا۔ اس کی جگہ مغربی اور دوسرے سازوں نے لے لی۔ ایک وقت ایسا بھی آیا تھا جب بڑے اور نامور موسیقار موسیقی ترتیب دیتے وقت ہارمونیم کو ایک غیر ضروری ساز تصور کرنے لگے۔ گٹار اور ایسے الیکٹرک ساز ایجاد ہوگئے جن سے بیک وقت مختلف سازوں کی آوازیں نکالی جاسکتی تھیں۔ اس طرح ہارمونیم جو کسی زمانے میں ایک اہم اور لازمی ساز تصور کیا جاتا تھا بالکل متروک ہوگیا۔ لیکن قوالی کی وجہ سے اس کا وجود ختم نہیں ہوا چونکہ قوالی اور ہارمونیم کا چولی دامن کا ساتھ ہے۔ ہارمونیم کے بغیر قوالی کا تصور ہی نہیں کیا جاسکتا۔

قوالوں نے ہارمونیم کے استعمال کے جدید ترین طریقے تلاش کرلیے۔ نصرت فتح علی خان مرحوم وہ پہلے قوال تھے جنہوں نے قوالی میں نیا پن اور جدت پیدا کی اور ہارمونیم کو قوالی میں اس طرح پیش کیا کہ یہ یورپ اور امریکا میں بھی مقبول ہوگئی اور اس کے سامعین میں مغربی لوگوں کی کثرت ہوگئی۔ نصرت فتح علی خان کو قدرت نے بے شمار صلاحیتوں سے نوازا تھا صرف صحت اور لمبی عمر نہیں دی۔ اگر وہ صحت مند اور بقید حیات ہوتے تو مشرقی اور مغربی سازوں اور آوازوں کے اشتراک سے قوالی کو دنیا بھر میں مقبول کردیتے۔

بات دراصل یہ ہے کہ مغرب میں ردھم کو بہت اہمیت دی جاتی ہے اور پوپ میوزک کے علاوہ مغربی موسیقی میں ردھم ایک نئی زندگی اور ولولہ پیدا کردیتا ہے۔

نصرت فتح علی یہ راز جان گئے تھے اور انہوں نے اپنی دیسی موسیقی میں ردھم کا تڑکا لگا کر اس کو ایک دل پسند موسیقی بنادیا۔ انہوں نے نامور مغربی موسیقاروں اور گلوکاروں کے اشتراک سے بھی گانے گائے اور مشرق و مغرب کی موسیقی کے اس سنگم نے انہیں بہت شہرت اور عزت دی۔ قوالی میں ضروری ہوتا ہے کہ کئی قوال شامل ہوں جو ردھم پر تالیاں بجائیں اور موقع کی مناسبت سے اشعار بھی دہرائیں۔

مغربی اور مشرقی ماحول میں موسیقی کو اچھا نہیں سمجھا جاتا لیکن قوالی کا معاملہ الگ ہے۔ برصغیر میں قوالی کو ترویج دینے اور اسے مقبول کرانے میں صوفیائے کرام کا نمایاں حصہ رہا ہے۔ صوفی حضرات کا خیال تھا کہ قوالی سننے والوں کو اپنی طرف راغب کرتی ہے۔ اس میں وہ جوش اور ولولہ ہے جو ہندوؤں کے بھجن میں نہیں ہوتا۔ بھجن ست لے میں گائے جاتے ہیں جن میں دیوی دیوتاؤں کی تعریف شامل ہوتی ہے۔ اس کے برعکس قوالی سننے والوں کو فوراً اپنی طرف متوجہ کر لیتی ہے اور صوفیانہ کلام سننے والوں کے دلوں میں اتر جاتا ہے۔ صوفیائے کرام کی ان کوششوں کی وجہ سے ہی ہندوستان میں اسلام کو فروغ حاصل ہوا۔ قوالی کے جذبات اور عقیدت میں ڈوبے ہوئے بول سننے والوں کے دلوں میں جگہ بنا لیتے ہیں۔ اس طرح صوفیائے کرام نے برصغیر میں اسلام پھیلایا۔ جو لوگ یہ اعتراض کرتے ہیں کہ اسلام طاقت اور تلوار کے زور پر پھیلا غلط فہمی کا شکار ہیں۔ ہندوستان پر مسلمان بادشاہوں نے ایک ہزار سال کے لگ بھگ حکومت کی ہے۔ وہ زور اور لالچ سے ہندوستان میں اسلام کو پھیلا سکتے تھے اور اس وقت اسلام ہی برصغیر کا سب سے بڑا مذہب ہوتا۔ لیکن ایسا نہ ہوا۔ بادشاہ حکمرانی، عیش وعشرت اور فتوحات میں مصروف رہے جبکہ صوفیائے کرام نے ہزاروں لاکھوں غیر مسلموں کو اسلام کی طرف راغب کیا۔ صوفیانہ قوالی میں روحانیت کے ساتھ ساتھ جاذبیت بھی ہوتی ہے۔ صوفی اور درویش اپنے عمل سے بھی غیر مسلموں کو متاثر کرتے تھے جن کی وجہ سے وہ کھنچے کھنچے اسلام کی طرف چلے آتے تھے۔ صوفیائے کرام کا عقیدہ ہے کہ قوالی کے ذریعے انسان زندگی ہی میں اللہ کے قریب ہو جاتا ہے۔

کہتے ہیں کہ برصغیر میں قوالی کی بنیاد درحقیقت شیخ نظام الدین اولیاء نے رکھی تھی۔ وہ صوفیائے کرام کے چشتی فرقے سے تعلق رکھتے تھے۔ وہ اپنے اجتماعات، خطبات اور عبادت میں صوفی ازم اور موسیقی کا اہتمام کرتے تھے جو بہت موثر اور کارگر نسخہ ثابت ہوا۔

دلچسپ بات یہ ہے کہ عموماً ہارمونیم کو ایک مشرقی ساز تصور کیا جاتا ہے۔ ایک زمانے میں دیسی موسیقی میں ہارمونیم کو سازوں میں مرکزی حیثیت رہی ہے لیکن اچھے موسیقار اور گلوکار ہارمونیم کو پسند نہیں کرتے ہیں چونکہ یہ موسیقی کو سنوارنے کی بجائے بگاڑ دیتا ہے۔ کئی بار کوشش کی گئی کہ ہارمونیم کو سازوں کی فہرست سے خارج ہی کر دیا جائے جو موسیقی کی شکل وصورت بگاڑ دیتا ہے اور اس میں سُریلے پن اور موسیقی کا رنگ ڈالنے کی بجائے مسخ کر دیتا ہے۔ لیکن ایسی تمام کوششیں ناکام ہو گئیں اور ہارمونیم آج بھی موسیقی کے لیے ایک ضرورت سمجھا جاتا ہے۔

ہارمونیم پر مشرقی موسیقاروں کو یہ اعتراض رہا ہے کہ یہ دراصل مغرب سے درآمد کیا ہوا ایک ساز ہے جس کا دیسی موسیقی سے تال میل نہیں ہو سکتا۔ خیال کیا جاتا ہے کہ ہارمونیم چودھویں صدی میں ایجاد کیا گیا تھا اور عام طور پر گرجا گھروں میں دعائیں کرتے وقت اس کو استعمال کیا جاتا تھا۔ یہ عیسائیوں کے مذہبی آرکسٹرا کا ایک لازمی حصہ ہے۔ آج بھی آپ اتوار کے دن گرجا گھروں میں ہارمونیم کی آواز سنتے ہیں۔ عیسائی مشنری اور پادری اس کو اپنے مذہب کی تبلیغ کے لیے ضروری سمجھتے تھے چونکہ اس طرح سامعین پوری طرح دعائیہ خطبے کی طرف راغب ہو جاتے ہیں۔ یہ ایک ہلکا پھلکا ساز ہے جسے اٹھا کر ساتھ لے جانا آسان ہے۔ گزشتہ صدیوں میں ہارمونیم کی بناوٹ اور آواز تبدیل کرنے کی کوئی کوشش نہیں کی گئی البتہ ہارمونیم نے اسٹیج اور تھیٹر میں مقبولیت حاصل کر لی۔ اسٹیج پر گاتے ہوئے ہارمونیم ایک آسان ساز ہے جس کے لیے کسی ہنرمندی کی ضرورت نہیں ہوتی۔ اس دور کے گانے والے ہارمونیم کے بغیر کام نہیں کر سکتے تھے۔ تھیٹر دیکھنے والوں کے مزاج کے مطابق یہ ایک پسندیدہ ساز تھا۔ آل انڈیا ریڈیو میں کافی عرصے تک ہارمونیم کے استعمال پر پابندی رہی لیکن استاد اپنے شاگردوں کو ہارمونیم کے ذریعے ہی تعلیم دیتے رہے۔

ہارمونیم کو دوبارہ پذیرائی غزل کی وجہ سے ہوئی۔ غزل گانے والے ہارمونیم کو ایک ناگزیر ساز سمجھتے ہیں۔ شاید ہی کوئی غزل گانے والا ایسا ہوگا جس نے ہارمونیم کے بغیر غزل سرائی کی ہو۔ اس طرح ہارمونیم کو ایک بار پھر موسیقی اور گائیکی میں داخلے کا موقع مل گیا۔ فلمی گانوں میں ہارمونیم کے استعمال نے اس کو مزید مقبول کر دیا۔ فلمی گانے ہر جگہ اور ہر موقع پر سنے جاتے ہیں اس لیے ہارمونیم فلمی موسیقی کا لازمی حصہ بن گیا۔

اب ہارمونیم فلمی موسیقی کے ذریعے دور دور تک پھیل گیا ہے اور ایک پسندیدہ ساز سمجھا جاتا ہے۔ طوائفوں کے کوٹھوں اور ان کے رقص وسرود میں بھی ہارمونیم لازمی طور پر استعمال ہوتا ہے۔ یہ بتانا مشکل ہے کہ ہارمونیم نے قوالی میں کب جگہ بنائی۔ آغاز میں قوال ہارمونیم کو ضروری نہیں سمجھتے تھے لیکن اب یہ قوالی کا لازمی حصہ بن چکا ہے۔ مغربی ملکوں کی موسیقی میں ہارمونیم کا استعمال برائے نام ہوتا ہے۔ لیکن ایسا لگتا ہے جیسے کی بورڈ کی ایجاد اور بڑھتے ہوئے استعمال کی وجہ سے ہارمونیم کو ایک بار پھر دیس نکالا مل جائے گا۔

کہا جاتا ہے کہ قوالی کو جنم دینے اور متعارف کرانے میں حضرت امیر خسرو کا نمایاں ہاتھ ہے۔ امیر خسرو صوفی اور بزرگ تھے لیکن اس کے ساتھ ہی وہ شاعری (گیت نگاری) کے علاوہ موسیقی میں بھی ماہر تھے۔ انہوں نے ایسی موسیقی ترتیب دی جس میں ترکی، یورپ اور ہندوستان کی آمیزش تھی۔ ہندی کے بھی وہ ماہر تھے۔ ان کی پہیلیاں، کہاوتیں اور کہہ مکرنیاں سارے ملک میں مشہور تھیں۔ انہوں نے ہر موسم اور موقعے کی مناسبت سے گیت لکھے۔ انہوں نے ہندوستان میں صوفی ازم کو پھیلانے میں نمایاں حصہ لیا اور اس قدیم زمانے میں جب پبلسٹی کا کوئی ذریعہ موجود نہ تھا ان کے دوہے، گیت اور کہہ مکرنیاں سارے ہندوستان میں مشہور تھیں یہاں تک کہ ہندوستان سے باہر جنوب مشرقی ایشیا میں بھی لوگ انہیں جانتے اور ان کے فن کی عزت کرتے تھے۔

صوفی ازم اور روحانیت ایک ہی سکے کے دو رخ ہیں۔ قوالی سننے والوں کے دلوں میں ہلچل پیدا کر دیتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ مسلمانوں کے جو فرقے قوالی کو مناسب نہیں سمجھتے ان کے سوا بھی مسلمان قوالی کے دلدادہ ہیں اور انہیں سن کر سکون حاصل کرتے ہیں چونکہ قوالی کی موسیقی اور بول ان کے شعور کو جھنجوڑ دیتے ہیں۔

استاد نصرت فتح علی خان کے والد بھی ایک نامور قوال تھے مگر بیٹے نے ہنرمندی اور مقبولیت میں اپنے والد کو بھی پیچھے چھوڑ دیا۔ اللہ نے انہیں خداداد صلاحیتیں عطا کی تھیں۔ وہ صرف قوال ہی نہ تھے بہت اچھے گلوکار بھی تھے۔ ان کی آواز میں ایک عجیب سی کیفیت تھی۔ ان کی وفات کے بعد آج کل استاد مہر علی خان اور استاد شیر علی خان قوالی میں بہت نام پیدا کر رہے ہیں۔ ان دونوں بھائیوں کا تعلق بھی نصرت فتح علی خان کی طرح فیصل آباد ہی سے ہے جو قوالی کی روایت کو نہ صرف زندہ رکھے ہوئے ہیں بلکہ اسے مقبول کر رہے ہیں۔

نصرت فتح علی خان اپنی پہلی قوالی گا کر ہی شہرت

ہمت کے چراغ

یہ محض خطابت نہیں، یہ جگ بیتی نہیں، کوئی سنی سنائی حکایت نہیں بلکہ قصہ ہے میری اپنی ذات کا بھی، جب آٹھ سال کی عمر میں بینائی مجھ سے چھن گئی تو جانے کیوں ہر طرف اندھیرا نظر آنے لگا۔ گھٹا ٹوپ اندھیرا، محبتوں کے فقدان کا اندھیرا دوستوں کی دوری کا اندھیرا، ماں باپ کی یاسیت کا اندھیرا اور مستقبل کا اندھیرا۔ اندھیرا ہی اندھیرا، اس اندھیرے میں جانے کیوں مجھے زیادہ نظر آنے لگا۔ اس سے کہیں زیادہ آٹھ سال کی عمر میں نظر آتا ہے۔ شاید کہیں اندر کسی ہمت نے انگڑائی لی اور یہ ہمت وہ تھی جو تجربے نے مجھے دی۔ تجربہ یہ جو مجھے کچھ دوسرے بینائی سے محروم احباب کو مل کر ہوا۔ ہمارے محلے کی مسجد کا امام تو پریشان نہیں ہے، میں نے سوچا مجھے بھی پریشان نہیں ہونا چاہیے۔ یہ محض ایک کرن تھی پھر جب نابیناؤں کے اسکول واقع شیرانوالہ گیٹ لاہور میں داخل ہوا تو ہر طرف اجالا ہی اجالا تھا۔ سب کتنے خوش باش تھے۔ کتنے ہمت والے تھے جو مجھے بھی ہمت والا بنا گئے اور پھر زندگی کے سفر کا آغاز ہوا۔ اگر ہمت کا شناور مستقل مزاجی سے کام لیتا ہے تو سمندر بھی کنارہ بن جاتا ہے۔ موجیں کشتی کا کام دیتی ہیں لیکن ایسا اس لیے نہیں ہو پاتا کہ جس سماج میں ہم سانس لے رہے ہوتے ہیں وہ ہم سے ساری کی ساری آکسیجن چھین لیتا ہے اور ہمیں کھوکھلا بنا دیتا ہے۔ یہ سماجی اخلاقیات بھی اپنی مرضی کی تراشتا ہے۔ سارا قصور غیبی قوتوں کا ٹھہراتا ہے کیونکہ ایسے میں اسے اپنے کالے کرتوت کرنے کا جواز مل جاتا ہے۔ اگر کوئی فرد اپنی انفرادیت باقی رکھنے کی سعی کرے اور اخلاقیات کی روح میں داخل ہو کر، مذہب کی تعلیم کو ٹھیک سیاق وسباق میں دیکھے، اگر تاریخ کے صفحات کا مطالعہ کرے، ہمت والوں کی زندگی کا مطالعہ کرے تو پھر وہ عظمت کا مینار بن جاتا ہے۔ پہاڑ سا حوصلہ رکھنے والے افراد کا ظہور انہی معاشروں سے ہوا ہے، جو مایوسیوں کو جنم دیتے ہیں۔ ضرورت صرف اس امر کی ہے کہ مشکل کو اپنے سر پر سوار نہ کیا جائے، آزمائش کو آزمائش تصور کیا جائے اور بڑی سے بڑی افتاد پر بھی حوصلے کی شمع روشن رکھی جائے تو یقیناً ہمت کے چراغ زندگی کو سنبھال لیتے ہیں اور ہر فرد اپنے مقدر کا ستارہ بنتا ہے اور نئی تاریخ رقم کرتا ہے، نئی کہانیاں بنتی ہیں، لافانی انسان جنم لیتے ہیں، لاثانی شخصیتیں ابھرتی ہیں۔

اقتباس از آشوب آگہی، پروفیسر ڈاکٹر شیخ محمد اقبال

پاگئے تھے۔ بعد میں انہوں نے قوالی میں جدتیں پیدا کیں اور گائیکی میں بھی کمال حاصل کرلیا۔ یہی وجہ ہے کہ وہ مشرق اور مغرب دونوں جگہ مقبول تھے۔ انہوں نے ہی قوالی کے لیے یورپ اور امریکا کو دریافت کیا تھا۔

انہوں نے جب پہلا غیر ملکی دورہ کیا تو پیرس جنوبی افریقا کے علاوہ یورپ اور امریکا بھی گئے۔ بیلجیم، انگلستان، ملائشیا، ڈنمارک، فرانس، اٹلی، جاپان، ترکی اور سوئٹزرلینڈ میں بھی اپنی آواز کا جادو جگایا۔ جاپانی تو ان پر فریفتہ ہوگئے تھے۔ انہوں نے غیر ممالک کے لیے پچاس سے زائد کیسٹ تیار کیے تھے جو دنیا کے ہر ملک میں دستیاب ہیں۔

ان کا کہنا تھا کہ لے اور سُر ہر قوم کی قومی زبانیں ہیں۔ درمیان میں گانے والا جو بھی نثر یا شعر میں کہتا ہے اس کی وجہ سے قوالی کا تاثر بڑھ جاتا ہے۔ قوالی کے بول سمجھنے کے لیے سامعین کو ان کی اپنی زبان میں ترجمہ بھی دیا جاتا تھا۔ تاکہ وہ بولوں سے بھی لطف اندوز ہوں۔ یہی طریقہ مہر علی خان اور ان کے بھائی نے بھی اپنایا ہے۔ قوالی کے فن میں ان کے والد بخشی سلامت نے بھی بہت نام پایا تھا۔

محمد ایوب علی ـــ آج کل کے ایک اور مقبول قوال ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ موسیقی میری روح اور شاعری میرا دل ہے۔ اسی کی مدد سے میں دلوں کو متاثر کرنے والی موسیقی بناتا ہوں۔ ان قوالوں نے یورپ امریکا بلکہ ساری دنیا میں اپنا سکہ منوالیا ہے۔ بخشی سلامت کا بیٹا ندیم سلامت انگریزی سے بھی واقف ہے۔ اس کو دنیا کے بہت سے ملکوں کی یونیورسٹیوں میں لیکچر دینے کے لیے بلایا جاتا ہے۔ جو لوگ یہ سمجھتے تھے کہ قوالی موجودہ عہد میں ختم ہوجائے گی اب اپنے خیالات پر نظرثانی کررہے ہیں چونکہ اب یہ ایک بہت مقبول فن بن چکی ہے۔ یہ بات بھی قابلِ ذکر ہے کہ ہندوستان اس شعبے میں پاکستان سے بہت پیچھے ہے اگرچہ کلاسیکی دیسی موسیقی کو وہاں مذہبی اور ثقافتی روایات کی وجہ سے فروغ حاصل ہورہا ہے۔

☆☆☆

میں ان قارئین کا ممنون ہوں جو وقتاً فوقتاً مجھے غلطیوں کی نشاندہی کرکے میری تحریروں کی اصلاح کرتے رہتے ہیں۔

دوسری دلچسپ بات یہ ہے کہ آج بھی فلمی الف لیلہ کے پڑھنے والوں میں ایسے حضرات موجود ہیں جو پرانی فلموں کو دیکھ چکے ہیں اور انہیں یاد بھی رکھتے ہیں۔ درحقیقت یہ معلومات حوصلہ افزا اور ان کے حافظے کی گواہ بھی ہیں۔

اگست کے سرگزشت میں ان فنکاروں کا تذکرہ کیا گیا تھا جو نہ صرف نابینا تھے بلکہ انہوں نے نابینا کردار ادا کرنے میں ایسی اداکاری کا مظاہرہ کیا تھا کہ جنہیں دیکھ کر ان کے اصلی نابینا ہونے کا گمان گزرتا تھا۔ یہ مضمون دراصل مختصر طور پر بہت سے فنکاروں کا احاطہ کرتا تھا چونکہ اتنی گنجائش نہ تھی کہ ہر فنکار کے بارے میں تفصیل سے لکھا جائے۔ قارئین سرگزشت کو یہ اندازہ بھی کرنا چاہیے کہ یہ سلسلہ ہر ماہ باقاعدگی سے مسلسل تقریباً دو دہائی سے جاری ہے۔ ہر ماہ مختلف شعبوں، شخصیات اور فنکاروں کے بارے میں معلومات پہنچانا کتنا مشکل کام ہے اس کا اندازہ اس وقت ہوسکتا ہے جب کوئی صاحب یا صاحبہ چالیس صفحات پر مشتمل واقعات بیان کریں۔ یہ کوئی سلسلہ وار کہانی اور ناول بھی نہیں ہے جس میں مبالغہ آرائی کے ساتھ کمی بیشی کی جاسکے۔ یہ حقیقی واقعات اور ذاتی تاثرات پر مشتمل ہے۔ جس وقت یہ سلسلہ شروع کیا گیا تھا اس وقت ہر شعبے سے تعلق رکھنے والے فنکار اور شخصیات بقیدِ حیات تھیں۔ ان کی صداقت کا اندازہ اس بات سے بھی لگایا جاسکتا ہے کہ وقتاً فوقتاً فلمی الف لیلہ میں جو واقعات بیان کیے گئے اور جن شخصیات کا تذکرہ کیا گیا ان میں کسی نے کبھی کسی واقعے کی تردید نہیں کی۔ پھر یہ بات بھی ملحوظِ خاطر رکھی جائے کہ یہ تمام واقعات محض یادداشت کی بنیادوں پر تحریر کیے گئے ہیں کسی کتاب سے ترجمہ یا نقل نہیں کیے گئے۔ انسانی یادداشت پر کہاں تک بھروسا کیا جاسکتا ہے۔ جبکہ کوئی ریفرنس بک بھی موجود نہ ہو۔ چند سال قبل تک یہ چند شخصیات بقیدِ حیات تھیں جن سے واقعات، ناموں اور تاریخوں کی تصدیق کی جاسکتی تھی۔ بدقسمتی سے اب کوئی ایسی باخبر اور معلومات کے ساتھ حافظہ رکھنے والی ہستی بھی دنیا میں موجود نہیں ہے۔

اس داستانِ طولانی کو بیان کرنے کا مقصد یہ ہے کہ تحریر میں ناموں، تاریخوں اور واقعات کو بیان کرنے میں غلطیوں کا امکان بھی موجود ہے۔ موسیقار اور شاعر روینِدر جین نے واقعی بہترین موسیقی مرتب کی ہے لیکن فلم بینوں کی ایک بہت بڑی تعداد ان کے نام سے مانوس نہیں ہے نہ ان کے کارناموں کے بارے میں کچھ جانتی ہے ورنہ روینِدر جین ایک ایسے فنکار ہیں جن کے بارے میں بہت کچھ لکھا جاچکا ہے لیکن اختصار کے پیشِ نظر بہت زیادہ طویل تعارف پیش نہیں کیا گیا۔ ورنہ بے شمار مقبول اور سپرہٹ گانے انہوں نے بنائے ہیں لیکن بہت کم سامعین جانتے

ہیں کہ یہ فن پارے روینِدر جین کی تخلیق ہیں۔ راج کپور کے ساتھ موسیقار شنکر جے کشن اور لکشمی کانت پیارے لال نے جب کام کیا تو سب جانتے تھے کہ یہ موسیقی انہوں نے ترتیب دی ہے لیکن روینِدر جین کا نام اتنا اجاگر اور مشہور نہ ہوسکا۔ اسے ان کی بدقسمتی ہی کہا جاسکتا ہے۔ فلم رام تیری گنگا میلی، اور ''حنا'' (جو راج کپور کے بعد ان کے بیٹوں نے مکمل کی تھی) اپنی موسیقی کے اعتبار سے بہت پسند کی گئیں لیکن موسیقار روینِدر جین کا نام ان کے حوالے سے شہرت نہ پاسکا تھا۔

ہدایت کار راکھن کی فلم ''پیار ہی پیار'' کے معاملے میں بھی مجھ سے غلطی سرزد ہوئی۔ واقعی یہ گانا فلم انیلا کے لیے موسیقار نثار بزمی نے ترتیب دیا تھا اور امانت علی خان نے اپنے زمانہ عروج میں گایا تھا جب وہ مکمل صحت مند اور خوش رُو جوان تھے۔

سب سے بڑی کوتاہی رنگیلا کی فلموں کے بارے میں سرزد ہوئی۔ کون نہیں جانتا کہ ہدایت کار کے طور پر ان کی پہلی بلیک اینڈ وہائٹ فلم ''دیا اور طوفان'' تھی۔ جس نے درحقیقت ایک طوفان برپا کردیا تھا۔ یہ تفصیل پہلے بھی بیان کی جاچکی ہے لیکن بار بار بیان کرنے کی وجہ سے اس قسم کی غلطیاں ہوتی رہی ہیں جس کی اصلاح ضروری ہے۔

جہاں تک نابینا کرداروں کا تعلق ہے پاکستان اور ہندوستان میں بہت سے چھوٹے چھوٹے کردار ادا کرنے والے فن کاروں کو بھی فراموش نہیں کرنا چاہیے۔ کچھ فنکار ایسے ہیں جنہوں نے محض فلم کے ایک منظر میں ہی نابینا کردار کیا اور وہ یادگار بن گیا۔ علاؤ الدین، طالش اور دیگر فنکاروں نے ایسے کردار کیے ہیں۔

دراصل اس نمبر کے لیے مضمون لکھنے کے لیے وقت بہت کم میسر آیا اگر دماغ پر زور ڈال کر اور جاننے والوں سے دریافت کرکے لکھا جاتا تو اس میں مزید تفصیل درج کی جاسکتی تھی۔ کامیڈی کرداروں میں تو کئی فنکاروں نے نابینا کردار کیے جن میں منور ظریف، رنگیلا اور ننھا قابلِ ذکر ہیں۔

☆☆☆

جناب علی سفیان آفاقی صاحب!

اگست 13ء کا سرگزشت نظروں سے گزرا۔ فلمی الف لیلہ میں آپ نے آنکھوں سے محروم افراد کا ذکر کیا ہے۔ آپ نے روینِدر جین کا بھی بطور گلوکار شاعر تعارف کرایا ہے حالانکہ روینِدر جین بہت ہی اعلیٰ پائے کے شاعر اور موسیقار ہیں۔

آیئے میں آپ کو اس باصلاحیت اور نامور موسیقار کے بارے میں تفصیل کے ساتھ بتا رہا ہوں۔ روینِدر جین کی پہلی فلم کے بارے میں تو نہیں جانتا مگر 1970ء میں ریلیز ہونے والی فلم چور مچائے شور کے گانوں نے ہر طرف دھوم مچادی تھی۔ اس فلم کے چند مشہور گانوں کی تفصیل درج ذیل ہے۔

1۔ گھنگرو کی طرح بجتا ہی رہا ہوں میں...... کشور کمار

2۔ ایک ڈال پہ طوطا بولے...... لتا، رفیع

3۔ لے جائیں گے لے جائیں گے...... کشور کمار، لتا

ان کی چند فلموں کے مشہور گانے اور بھی ہیں جو کہ ستر کی دہائی میں ہر طرف دھوم مچاتے رہے ہیں۔

فلم فقیرا...... دل میں تجھے بٹھا کے...... لتا

فلم گیت گاتا چل......

گیت گاتا چل او راہی...... یسوداس

فلم اکھیوں کے جھروکوں سے......

اکھیوں کے جھروکوں سے...... ہیم لتا

فلم چت چور......

گوری تیرا گاؤں بڑا پیارا...... یسوداس

نامور فلم ڈائریکٹر راج کپور نے جب موسیقار لکشمی کانت پیارے لال کو اپنے کیمپ سے باہر کیا تو میوزک ڈائریکٹر روینِدر جین کو ان کی جگہ اپنے کیمپ میں جگہ دی۔ روینِدر جین نے راج کپور کی دو فلموں کی موسیقی ترتیب دی فلم رام تیری گنگا میلی۔ سن صاحباں سن۔ لتا۔ اور راج کپور کی آخری فلم ''حنا'' جس کا مرکزی کردار پاکستانی اداکارہ زیبا بختیار نے ادا کیا تھا۔ اس فلم کے دو گانے بڑے شوق سے سنے جاتے ہیں۔ 1۔ میں ہوں خوش رنگ حنا۔ لتا۔ میں دیر کرتا نہیں...... سریش واڈکر۔

اسی طرح آپ نے فلم ساز شازیہ اور ہدایت کار رفیق رازی کی فلم ''پیار ہی پیار'' کا ذکر کیا ہے اور اس فلم کے ایک گانے کے بول لکھے ہیں' بہت یاد آئیں گے وہ دن۔ یہ گانا فلم انیلا کا ہے جبکہ فلم پیار ہی پیار کا گانا جو کہ استاد امانت علی خان مرحوم نے گایا تھا اس کے بول یہ تھے...... میرا جیا نہ لگے بن تیرے یار۔ آپ نے فلم ''دل اور دنیا کو جو کہ سن 1970ء کو ریلیز ہوئی تھی رنگیلا کی بطور پہلی فلم کہا ہے جبکہ فلم دیا اور طوفان جو کہ 1968ء میں ریلیز ہوئی تھی رنگیلا کی بطور ہدایت کار پہلی فلم تھی۔ یہ چند گزارشات تھیں جو کہ آپ کی نذر کی ہیں۔

گیت گاتا چل

امیمہ سلیم

بینائی سے محرومی نے اسے گھر بھر میں رسوا کررکھا تھا۔ بڑے چھوٹے بھائی تک اسے اہمیت نہ دیتے، اس کے ساتھ ایسا سلوک کرتے کہ وہ اندر ہی اندر ٹوٹ پھوٹ کا شکار ہوتا لیکن اس نے سوچ لیا تھا کہ وہ کچھ ایسا کردکھائے گا کہ لوگ اش اش کراٹھیں گے۔ اس نے اپنی محنت اور لگن سے اس خواب کو سچ کردکھایا۔

اس کی بنائی دھنیں پورے برصغیر میں دھوم مچاتی ہیں

دوسری جنگِ عظیم زورشور سے جاری تھی۔ انگریزوں کو ہر محاذ پر شکست ہورہی تھی اوراب جاپانی فوجیں برما تک پہنچ گئی تھیں۔ گویا اب جنگ ہندوستان کی دہلیز تک آن پہنچی تھی۔ ہندوستان میں جاپانی اور جرمن جہازوں کی بمباری کا خطرہ دم بہ دم بڑھتا ہی جارہا تھا۔ ہندوستان کے مختلف شہروں میں بلیک آؤٹ ہوتا تھا۔

ان شہروں میں علی گڑھ بھی شامل تھا۔ ہوائی جہازوں کی گڑگڑاہٹ اور خوف وہراس کی اس فضا میں علی گڑھ کے ایک معزز اور معروف گھرانے میں ایک نئی زندگی کی آمد متوقع تھی۔

یہ گھرانا پنڈت اندر منی جین اوران کی پتنی کرن دیوی کا تھا۔ پنڈت اندر منی جین علی گڑھ کے معروف وید تھے اور آیورویدک علم میں ان کی مہارت کا طوطی بولتا تھا۔

کرن دیوی پورے دنوں سے تھیں اور پنڈت جی کو یہ فکرستارہی تھی کہ رات کے اس سمے دائی کا بندوبست کہاں سے کیا جائے۔ جو دائی شروع سے کرن دیوی کی دیکھ بھال کررہی تھیں وہ ہنگامی طور پر اپنے کسی عزیز کی موت کے باعث علی گڑھ سے کئی میل دور کسی گاؤں میں تھی۔

پنڈت جی پہلے تو اپنی ہی دوائیں اور معجونیں کھلا کر کرن دیوی کا علاج کرتے رہے لیکن جب معاملہ ان کی بس سے بھی باہر ہوگیا تو انہوں نے علی گڑھ کی ایک اور معروف دائی کو بلانے کے لیے اپنی گھوڑا گاڑی روانہ کردی۔

28 فروری 1944ء کو پنڈت جی کے گھرانے میں ایک بیٹے کی پیدائش ہوئی۔ گو یہ پنڈت جی کی پہلی اولاد نہیں تھی۔ اس سے قبل بھی وہ دو بیٹوں کے باپ بن چکے تھے لیکن اولاد پہلی ہو یا آخری، ماں باپ کے لیے تو خوشی کا باعث ہوتی ہے۔ پنڈت جی اور کرن دیوی بھی بہت خوش تھے۔ پنڈت جی نے دائی کو انعام واکرام دے کر رخصت کیا اور خود ان دوستوں میں آبیٹھے جو بیٹے کی پیدائش کی خبرسن کر ان کے گھر جمع ہوگئے تھے۔ ان میں زیادہ تعداد ان کے محلے والوں کی تھی۔ وہ سب پنڈت جی کو مبارک باد دے رہے تھے۔

دوستوں اور محلے داروں سے فارغ ہوکر پنڈت جی زنان خانے میں گئے جہاں کرن دیوی تکلیف سے گزرنے کے باوجود چہرے پر ایک آسودہ مسکراہٹ سجائے ان کی منتظر تھیں۔

پنڈت جی نے ابھی تک غور سے نومولود کا چہرہ نہیں دیکھا تھا کیونکہ کرن دیوی کے گرد محلے کی کئی عورتیں موجود تھیں۔ پنڈت جی کی آمد پر وہ بھی وہاں سے رخصت ہوگئیں۔

پنڈت جی نے پتنی کے پہلو میں لیٹے ہوئے نومولود بچے کو شفقت سے گود میں اٹھالیا لیکن اس کا چہرہ دیکھ کرانہیں دھچکا سا لگا۔ وہ کالی رنگت اور بھدے نقوش کا بچہ تھا۔ پنڈت جی کے دونوں بڑے بیٹے خوب رو اور گورے چٹے تھے۔ پنڈت جی خود بھی خاصے خوب رو، جامہ زیب اور سرخ

رویندر جین اپنی دھرم پتنی دیویا جین کے ساتھ

وسفید رنگت کے مالک تھے اور ان کی پتنی کرن دیوی بھی خاصی حسین تھیں۔ یہ بچہ نہ جانے کس پر پڑ گیا تھا۔ گھر کی تو کوئی ملازمہ بھی ایسی نہیں تھی۔

اولاد خوب صورت یا کم صورت ہو بہر حال والدین کے جگر کا ٹکڑا ہوتی ہے۔ نومولود کی تمام تر بدصورتی کے باوجود پنڈت جی نے اسے سینے سے لگا لیا۔

اس کا نام رکھنے کے لیے انہوں نے علی گڑھ کے معروف جیوتشیوں کی خدمات حاصل کیں۔ پنڈت کو خود بھی علم جیوتش سے دلچسپی تھی۔ بالآخر سب کی متفقہ رائے سے نومولود کا نام رویندر تجویز ہوا۔

رویندر کے دونوں بڑے بھائی اسے بالکل منہ نہیں لگاتے تھے۔ ان دونوں کو پہلے ہی دن سے اپنا وہ کالا کلوٹا اور بدصورت بھائی پسند نہیں آیا تھا۔

رویندر بہت صابر و شاکر بچہ تھا۔ وہ صرف اس وقت روتا تھا جب اسے بھوک لگتی تھی۔ دوسرے بچوں کی طرح چیخ پکار اور واویلا کر کے اس نے کبھی ماں کو پریشان نہیں کیا۔

کرن دیوی کے رشتے کے ایک بھائی اسے دیکھنے آئے تو اس کے لیے ایک ہفت رنگ جھولنے والا کھلونا بھی لے آئے۔ اس طرح کے جھنجنے عموماً بچوں کے سامنے لٹکا دیے جاتے ہیں۔ وہ ان کے رنگ دیکھ کر خوشی سے کلکاریاں مارتے ہیں۔ مگر رویندر پر اس کھلونے کا کوئی اثر نہیں ہوا۔

پنڈت جی ان دنوں ہر وقت کسی گہری سوچ میں گم رہتے تھے۔ وہ شام کو مطب بند کر کے آتے تو کھانا کھا کر خاموشی سے لیٹ جاتے۔ وہ کرن دیوی سے زیادہ باتیں تو پہلے بھی نہیں کرتے تھے لیکن اب تو ان کی باتوں کا جواب بھی ہوں، ہاں میں دیا کرتے تھے۔

اس دن پنڈت جی حسب معمول بستر پر لیٹے تو کرن دیوی نے فکر مندی سے کہا۔ ”آپ کو رویندر کی بھی کچھ فکر ہے؟“

پنڈت جی نے چونک کر انہیں دیکھا پھر بولے۔ ”مجھے اس کی تم سے زیادہ فکر ہے دیوی۔“

”مجھے اس کی آنکھیں عجیب سی لگتی ہیں۔ ست پال اس کے لیے جو کھلونا لے کر آیا تھا۔ وہ اس میں بھی کوئی دلچسپی نہیں لیتا۔ آپ ذرا دیکھیے اس کی آنکھوں میں کوئی تکلیف تو نہیں ہے۔“

پنڈت جی اٹھ کر بیٹھ گئے اور بولے۔ ”کرن دیوی، میں جو بات تمہیں بتانے جا رہا ہوں، اسے بہت حوصلے سے سننا۔“

”ایسی کیا بات ہے؟“ کرن دیوی تڑپ کر بولیں۔

”ہمارا...... رویندر پیدائشی طور پر نابینا ہے۔“ پنڈت اٹک اٹک کر بولے۔ ان کے لہجے میں گہری اداسی اور دکھ تھا۔

کرن دیوی نے بے یقینی سے انہیں دیکھا اور تڑپ کر بولیں۔ ”یہ کیا کہہ رہے ہیں آپ؟ آپ اتنے بڑے وید ہیں۔ اس کا کوئی علاج تو ہوگا؟“

”پیدائشی اندھے پن کا علاج نہ آیورویدا میں ہے نہ انگریزی طریقۂ علاج میں۔ یہ بات تو میں نے پہلے ہی دن محسوس کر لی تھی کہ ہمارا رویندر پیدائشی طور پر نابینا ہے۔ تمہیں فوری طور پر بتانے کی ہمت نہ ہوئی۔ اس دن سے مجھے اس کی فکر کھائے جا رہی ہے۔“

”پنڈت جی!“ کرن دیوی آنسو بہاتے ہوئے بولیں۔ ”اس دنیا میں تو آنکھوں والوں کو زندگی گزارنے کے لیے نہ جانے کیا کیا جتن کرنا پڑتے ہیں، ہمارا رویندر اس معذوری کی حالت میں کیسے گزارا کرے گا؟“

”کرن دیوی! جس بھگوان نے اسے اس شکتی سے محروم کیا ہے وہی اس کا کوئی اپائے بھی کرے گا۔ میرے یا تمہارے فکر مند ہونے سے کیا ہوگا؟“

اس دن کے بعد سے کرن دیوی نابینا رویندر جین کا خصوصی خیال رکھنے لگیں۔

اب رویندر دو سال کا ہو چکا تھا اور پیروں چلنے لگا تھا۔ اسے اپنے اندھے پن کا ذرہ برابر بھی احساس نہیں تھا۔ اس نے دنیا دیکھی ہی نہیں تھی تو اسے احساس ہو بھی کیسے سکتا تھا۔ ہاں، وہ اپنی ماں کے لمس اور اس کی آہٹ کو خوب پہچانتا تھا۔ بہت چھوٹی عمر میں اس نے چیزوں کو چھو کر پرکھنا سیکھ لیا تھا۔

وہ جوں جوں بڑا ہو رہا تھا۔ اس کے بھائی اسے احساس دلا رہے تھے کہ وہ اندھا ہے۔

رویندر کی پیدائش کے بعد پنڈت اندرمنی جین اور کرن دیوی کے لگاتار چھ بیٹے اور ایک بیٹی مزید پیدا ہوئی۔ وہ بھی ماں باپ کی طرح انتہائی خوب رو اور گورے چٹے تھے۔

اس کے بھائی جب کوئی کھیل کھیلتے تو رویندر کو ساتھ کھلانے سے انکار کر دیتے اور کہتے۔ ”اندھے تو ہمارے ساتھ کیا کھیلے گا؟“

ایسے میں رویندر کا دل کٹ کر رہ جاتا اور وہ بے بسی سے ایک طرف بیٹھ کر اپنے ہنستے بولتے اور قہقہے لگاتے بھائیوں کی آوازیں سنتا رہتا۔

محلے کے بچوں کا بھی یہ رویہ تھا۔ وہ بھی رویندر کو اپنے ساتھ کسی کھیل میں شامل نہیں کرتے تھے۔ وہ ایک اندھے کو کھیل میں شامل کیسے کر سکتے تھے۔

رویندر گھر کے باہر چبوترے پر بیٹھا تصور کی آنکھ سے انہیں کھیلتے اور اچھلتے کودتے دیکھتا رہتا۔

اس پورے محلے میں اس کا صرف ایک دوست شمیم تھا۔ شمیم کے والد کا تالا بنانے کا چھوٹا سا کارخانہ تھا کہ علی گڑھ میں تالہ سازی کے کارخانے تو جا بہ جا کھلے ہوئے تھے۔ علی گڑھ اپنی صنعت کی وجہ سے پورے ہندوستان میں مشہور تھا۔

اسے اکیلا اور اداس بیٹھا دیکھ کر شمیم اکثر اس کے پاس آ جاتا اور اس سے ڈھیروں باتیں کرتا۔

رویندر اس سے کہتا تھا۔ ”شمیم! کیا تمہارا دل دوسرے بچوں کے ساتھ کھیلنے کو نہیں چاہتا؟“

شمیم ہنس کر جواب دیتا۔ ”مجھے تم سے باتیں کر کے زیادہ مزہ آتا ہے۔“

یوں دونوں میں گہری دوستی ہو گئی۔ اب اگر شمیم ایک دن بھی نہ آتا تو رویندر بے چین ہو جاتا۔ یہی حال شمیم کا بھی تھا۔ وہ بھی جب تک رویندر سے مل نہ لیتا اسے چین نہیں آتا۔ (یہ اس شمیم کا تذکرہ ہے جو بعد میں شمیم نوید کے نام سے معروف ہوئے۔ وہ پاکستان کے مختلف ڈائجسٹوں کے مدیر بھی رہے اور بہترین کہانی کار بھی۔ اس کے ساتھ ساتھ انہوں نے شاعری میں بھی بہت نام کمایا۔ شمیم نوید صاحب کا گھرانا قیام پاکستان کے دس بارہ سال بعد پاکستان آ گیا تھا)

رویندر اور شمیم کی دلچسپیاں بھی مشترک تھیں۔ دونوں کو شاعری کا شوق تھا۔ گو ابھی دونوں نے باقاعدہ شاعری شروع نہیں کی تھی لیکن طبع موزوں تھی۔ اس کے ساتھ ساتھ دونوں کو سُر سے لگاؤ تھا اور اکثر دونوں گھر کے چبوترے پر بیٹھ کر اس زمانے کے معروف فلمی گانے اور غزلیں گایا کرتے تھے۔

پنڈت جی نے بیٹے کے اس شوق کو دیکھا تو انہوں نے یہ سوچا کہ زندگی کے کسی اور شعبے میں تو شاید رویندر کامیاب نہ ہو سکے لیکن موسیقی کے شعبے میں ضرور کچھ نہ کچھ کر سکتا ہے۔ انہوں نے کرن دیوی سے مشورہ کیا تو کرن دیوی نے بھی اس خیال کی تائید کی۔ پنڈت جی کی اپنی برادری میں بہت سے ماہر فن گائیک تھے۔

ان کی نظرِ انتخاب اپنے ایک دوست جی، ایل جین پر پڑی۔ علی گڑھ میں اس وقت چند ہی گائیک گائیکی میں ان کا مقابلہ کر سکتے تھے۔ یوں پنڈت اندرمنی جین کی درخواست پر پنڈت جی، ایل جین، رویندر کو موسیقی کی ابتدائی تربیت دینے لگے۔ انہوں نے جلد ہی محسوس کر لیا کہ آنکھوں سے محروم یہ بچہ سُر اور سنگیت میں بہت آگے جا سکتا ہے۔ رویندر نے بھی غیر معمولی دلچسپی کا مظاہرہ کیا اور اس کے گرو نے اسے جو سبق ایک دفعہ پڑھا دیا، اس نے ہمیشہ کے لیے ذہن نشین کر لیا۔

اس نے پنڈت جی، ایل جین کی تربیت سے بھرپور فائدہ اٹھایا اور بہت کم عمری میں گلوکاری کا آغاز کر دیا۔

پنڈت جی، ایل جین کے بعد رویندر نے موسیقی کی مزید تعلیم اس دور کے دوسرے دو ماہرین فن پنڈت جنار دھن شرما اور پنڈت نتھو رام سے حاصل کی۔

بارہ سال کی عمر تک اس نے اپنے ان تینوں نامور گرو سے وہ کچھ حاصل کر لیا۔ جسے سیکھنے میں لوگ برسوں لگا دیتے ہیں۔

اس وقت تک رویندر کا ایک بڑا بھائی مہندر کمار جین باپ کا ہاتھ بٹاتا تھا اور اس کے ساتھ ہی وہ آریوویدا کی تعلیم بھی حاصل کر رہا تھا۔ باپ کی طرح اس نے بھی آریوویدا میں بہت نام کمایا اور علی گڑھ کے معروف ویدوں میں شمار ہونے لگا۔

اس کا دوسرا بھائی ڈی کے جین معروف جج اور ٹائمز گروپ آف انڈیا کا ڈائریکٹر تھا۔

دونوں بڑے بھائی معاشرے میں ایک ممتاز مقام رکھتے تھے۔ رویندر کو تو وہ خاطر میں ہی نہیں لاتے تھے۔

اس سے چھوٹا بھائی مہیندر جین دہلی میں ایک تعمیراتی کمپنی چلا رہا تھا۔ اس کے ساتھ ہی وہ جائداد کی خرید و فروخت کا کام بھی کرتا تھا۔ بھائیوں میں صرف مہیندر جین ہی ایسا تھا جو رویندر سے محبت کرتا تھا اور اس کا خیال رکھتا تھا۔ اس کے دوسرے بھائی اپنے اپنے حال میں مست تھے اور رویندر ان سب کو کچھ کر دکھانے کی دھن میں مگن تھا۔

رویندر جین نے باقاعدہ گلوکاری کا آغاز نزدیک

مندر میں ''جین بھجن'' گا کر کیا۔ وہ عموماً اس دور کے معروف شاعروں پنڈت دایانت رائے جی اور پنڈت بدھی جن جی کے بھجن خاص طور پر گایا کرتا تھا۔

اس نے دو تین سال تک مندروں میں بھجن گائے۔ اس کی گائیکی کا انداز پُر سوز آواز سننے والوں کو گویا مسحور کر دیا کرتی تھی۔ اس دور میں ہر طرف بھجن کے حوالے سے پورے علی گڑھ میں نو عمر رویندر جین کا چرچا تھا لیکن رویندر ابھی اس ابتدائی کامیابی سے مطمئن نہیں تھا۔

اس نے ایک دن اپنے باپ سے کہا۔ ''پتا جی! یہاں علی گڑھ میں تو اب کوئی ایسا قابلِ ذکر گرو نہیں ہے جس سے میں کچھ نہ کچھ سیکھوں۔''

پنڈت جی بیٹے کی اس بات پر چونک اٹھے۔ ان کا خیال تھا کہ رویندر اب اس قابل ہو گیا ہے کہ وہ بغیر کسی سہارے کے زندگی گزار سکتا تھا۔ اس کی آمدنی بہت زیادہ نہیں تو اتنی کم بھی نہیں تھی پھر وہ ابھی نو عمر تھا۔ وہ علی گڑھ میں بھی رہ کر ترقی کر سکتا تھا۔ پنڈت جی کا خیال تھا کہ دو چار برس بعد جب رویندر پوری طرح اپنے فن میں طاق ہو جائے گا تو وہ اسے علی گڑھ میں ہی موسیقی کی کوئی اکیڈمی کھلوا دیں گے جہاں وہ بچوں کو موسیقی کی تعلیم دینے کے ساتھ ساتھ اپنی گلوکاری کو بھی جاری رکھ سکے گا۔

انہوں نے حیرت سے پوچھا۔ ''پھر اب تم کیا چاہتے ہو؟''

اس موقع پر اس کے دونوں بڑے بھائی مہندر کمار اور ڈی کے جین کے علاوہ مہیندر جین اور ماں بھی موجود تھی۔

''پتا جی، میں موسیقی کی مزید تعلیم کے لیے الہ آباد جانا چاہتا ہوں۔ میں نے سنا ہے کہ وہاں موسیقی کا ایک سے ایک گرو موجود ہے اور موسیقی کی ایک معروف اکیڈمی بھی ہے۔ میں اس اکیڈمی میں داخلہ لینا چاہتا ہوں۔''

''تم...... تم الہ آباد جاؤ گے؟'' اس کے بڑے بھائی مہندر کمار نے طنزیہ لہجے میں کہا۔

''کیا یہ غنیمت نہیں ہے کہ نابینا ہونے کے باوجود تمہیں پتا جی اور ہماری وجہ سے سر سنگیت میں ایک شناخت مل گئی۔''

''میں نے جو کچھ حاصل کیا ہے اپنی محنت سے حاصل کیا ہے۔ اس میں نہ پتا جی کا کوئی ہاتھ ہے نہ آپ لوگوں کا کوئی عمل دخل ہے۔ مجھے لوگ پنڈت اندر منی جین کے بیٹے یا پنڈت مہندر ... کمار جین کے بھائی کی حیثیت سے نہیں جانتے ہیں بلکہ لوگ آپ کو میرے نام سے پہچانتے ہیں۔''

''غلط فہمی ہے تمہاری۔'' مہندر کمار بھنا کر بولا۔ ''الہ آباد جا کر دھکے کھاؤ گے تو چودہ طبق روشن ہو جائیں گے۔'' پھر وہ طنزیہ انداز میں زور سے ہنسا۔

''بھیا الہ آباد ضرور جائیں گے۔'' اس کے چھوٹے بھائی مہیندر جین نے کہا۔ ''آپ نے بھی تو آیورویدک کی تعلیم علی گڑھ سے باہر جا کر حاصل کی ہے اور منجھلے بھیا نے بھی اعلیٰ تعلیم کے لیے علی گڑھ سے باہر کا رخ کیا تھا۔ وہ اس چھوٹے سے شہر میں قانون کی اعلیٰ تعلیم حاصل کر سکتے تھے نہ ٹائمز گروپ آف انڈیا کے ڈائریکٹر بن سکتے تھے۔ رویندر بھیا بھی الہ آباد ضرور جائیں گے۔''

''ہاں، اگر رویندر الہ آباد جانا چاہتا ہے تو اسے جانے دیں۔'' کرن دیوی نے بھی اپنے چھوٹے بیٹے کی حمایت کی۔

''آپ لوگ اگر وقت اور پیسا برباد کرنا چاہتے ہیں تو ضرور کریں۔'' مہندر کمار نے کہا۔ ''ہم نے تو ایک مشورہ دیا تھا۔''

''آپ سے مشورہ مانگا کس نے تھا؟'' رویندر نے قدرے سخت لہجے میں کہا۔

پھر اس سے پہلے کہ کوئی اور بولتا پنڈت جی نے اپنا فیصلہ سنا دیا کہ رویندر الہ آباد جائے گا۔

مارے خوشی کے رویندر کی بے نور آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے۔ الہ آباد برسوں سے اس کا خواب تھا۔ اس کے دوستوں اور استادوں نے بھی اسے یہی مشورہ دیا تھا کہ تمہیں موسیقی کی اعلیٰ تعلیم کے لیے الہ آباد ضرور جانا چاہیے۔

الہ آباد میں اس وقت کلاسیکی موسیقی کی معروف اکیڈمی ''پریاگ سنگیت سمیتی'' تھی۔ اس وقت ہندوستان بھر میں کلاسیکی موسیقی کے چند ہی ایسے اعلیٰ ادارے تھے جو نہ صرف صاحب علموں کو سر سنگیت کی بہترین تربیت دیتے تھے بلکہ وہاں سے فارغ التحصیل طلبا کو سرٹیفکیٹ اور ڈگریاں بھی دی جاتی تھیں۔ یہ اعلیٰ ڈگریاں پورے بھارت کے میوزک اسکولوں میں انتہائی قدر کی نگاہ سے دیکھی جاتی تھیں۔

ایک ہفتے بعد رویندر اپنے بھائی مہیندر اور ایک دوست کے ساتھ الہ آباد روانہ ہو گیا۔ ''پریاگ سنگیت سمیتی'' میں بے شمار لوگوں کو داخلہ ملتا بھی نہیں تھا۔ ان کے داخلے کا ایک معیار تھا۔ وہاں یا تو بالکل نو آموز بچوں کو داخلہ دیا جاتا تھا یا پھر ان لوگوں کو جو ٹیسٹ کے بعد ان کے معیار پر پورے

اترتے تھے۔

اس سلسلے میں رویندر ذرا بھی فکر مند نہیں تھا۔ وہ راگ راگنیوں اور سروں میں اتنا ماہر تھا کہ اسے ٹیسٹ کا کوئی خوف نہیں تھا۔

اکیڈمی میں رویندر کا ٹیسٹ ہوا اور ابھی اس نے چند ہی سر لگائے تھے کہ اکیڈمی کے اساتذہ نے اسے داخلے کا اہل قرار دے دیا۔

وہ الہ آباد اپنے کپڑے، مختصر سامان اور اپنی جان سے زیادہ عزیز ہارمونیم لایا تھا۔ رویندر ہارمونیم بجانے میں اتنا ماہر تھا کہ بڑے بڑے ہارمونیم نواز بھی اس کی گرد کو نہیں پہنچ سکتے تھے۔

مہیندر جین اسے وہاں داخلہ دلوا کر دہلی چلا گیا اور جاتے جاتے اسے تسلی دے گیا۔ ''بھیا اگر کبھی کوئی مشکل پیش آئے تو آپ پتا جی سے پہلے مجھ سے رابطہ کیجیے گا۔''

پھر رویندر جین سر سنگیت کی اس نئی اور نرالی دنیا میں مگن ہو گیا۔ وہاں مقامی طلبا کے علاوہ بھارت کے دوسرے شہروں سے آئے ہوئے طلبا اور طالبات موجود تھے۔ ہر طالب علم ایک سے بڑھ کر ایک تھا لیکن جب رویندر جین ہارمونیم بجاتا تو پورے ہال میں گویا سکتہ طاری ہو جاتا۔ وہ خود بھی ہارمونیم بجاتے وقت اس کے سُروں میں اتنا گم ہو جاتا کہ اسے ارد گرد کا ہوش ہی نہ رہتا۔

اس کے اساتذہ کہتے تھے کہ رویندر کی انگلیوں میں جادو ہے۔ ہارمونیم کو ہاتھ لگاتے ہی اس کی انگلیوں کا جادو سننے والوں پر سوار ہو جاتا تھا۔

شروع شروع میں تو نابینا ہونے کی وجہ سے رویندر کے ساتھیوں نے اس سے ہمدردی جتائی لیکن رویندر کو اس ہمدردی سے چڑ تھی۔ وہ اس بات کو شدید ناپسند کرتا تھا کہ کوئی اس پر ترس کھائے۔

رویندر جین کو ہارمونیم کے علاوہ جو چیز اپنے ساتھیوں میں ممتاز کرتی تھی وہ تھی اس کی شاعری اور نغمہ گری۔ وہ خود ہی گیت لکھتا پھر ان کی خوب صورت دھنیں ترتیب دیتا۔

پریاگ سنگیت سمیتی کا سفر گویا پلک جھپکتے میں طے ہو گیا۔ کم سے کم رویندر جین، اس کے ساتھیوں اور اس کے اساتذہ کا تو یہی خیال تھا حالانکہ اس معروف اکیڈمی سے رویندر کو وہاں کی سب سے اعلیٰ ڈگری سنگیت پربھاکر حاصل کرنے میں پورے چار سال لگے تھے۔

اب وہ خود بھی جوان تھا اور اس کے حوصلے بھی جوان تھے۔ اس نے خوب سے خوب تر کی تلاش میں کلکتہ کا رخ کیا اور وہاں سے مزید کندن بن کر نکلا۔ کلکتہ پربھاکر کی اعلیٰ ڈگری لینے کے بعد اور کلکتہ جیسے شہر میں نامی گرامی موسیقاروں سے تعلیم حاصل کرنے کے بعد بمبئی فلم نگری میں اسے ہاتھوں ہاتھ لیا جائے گا لیکن یہ اس کی خام خیالی تھی۔

بمبئی فلم نگری میں ان دنوں نوشاد، لکشمی کانت، پیارے لال، کلیان جی، آنند جی اور آر ڈی برمن جیسے موسیقاروں کے نام کا سکہ چل رہا تھا۔ ایسے میں اسے کون پوچھتا۔ فلم انڈسٹری میں تو یہ روایت ہے کہ لوگ وہاں کسی بھی نئے شخص کو آزماتے ہوئے گھبراتے ہیں۔

وہ دور یوں بھی میوزیکل فلموں کا دور تھا۔ فلمیں عموماً اپنی جان دار موسیقی اور شان دار گائیکی سے ہٹ ہوتی تھیں۔

ان موسیقاروں کے علاوہ وہ دور محمد رفیع، لتا منگیشکر، کشور کمار، مکیش، منا ڈے اور آشا بھونسلے جیسے مایہ ناز گلوکاروں کا دور تھا۔ ان گلوکاروں میں سے کوئی بھی اس اجنبی موسیقار کو اہمیت دینے کو تیار نہیں تھا جو دل میں ہزاروں تمنائیں اور آنکھوں میں بے شمار خواب سجائے بمبئی آیا تھا۔ ہر گزرتے دن کے ساتھ اس کے خواب ایک ایک کر کے چکنا چور ہو رہے تھے لیکن رویندر ہمت ہارنے والوں میں سے نہیں تھا۔ وہ سوچتا تھا کہ کبھی نہ کبھی تو نوشاد جی، کلیان جی آنند جی، لکشمی کانت پیارے لال جی اور آر ڈی برمن جی بھی تو نئے ہوں گے۔ میری طرح انہوں نے بھی اپنے فلمی سفر کا آغاز پہلی دفعہ بمبئی ہی سے کیا ہو گا پھر میں کامیاب کیوں نہیں ہو سکتا۔

رویندر جین کے لیے سب سے بڑی آسانی یہ تھی کہ اسے مالی طور پر کوئی پریشانی نہیں تھی۔ اس کا بھائی مہیندر کمار اور باپ پنڈت اندر منی جین نے کبھی اسے پیسے کی کمی نہیں ہونے دی۔ اس کے علاوہ رویندر خود بھی اسٹیج پروگراموں اور فنکشنوں کے ذریعے اچھا خاصا کما لیتا تھا۔ اس کا خیال تھا کہ کسی اسٹیج پروگرام پر اسے سن کر کوئی فلم ساز یا ہدایت کار اسے میوزک ڈائریکٹر کی آفر کرے گا لیکن اس کا خیال، خیال ہی رہا۔ وہ بھی ہمت ہارے بغیر اپنی دھن میں لگا رہا۔ وہ اگر علی گڑھ میں ہوتا تو اسے اپنے بھائیوں کے نہ جانے کتنے طعنے سننا پڑتے۔ یہ بھی غنیمت تھا کہ وہ علی گڑھ سے سیکڑوں میل دور بمبئی میں تھا اور کسی ایسے موقع کا منتظر تھا

جس کے ذریعے اسے اپنے فن کا جوہر دکھانے کا موقع مل جائے۔

جوں جوں وقت گزر رہا تھا رویندر جین کے جنون میں اضافہ ہوتا جا رہا تھا۔

کسی نے اسے مشورہ دیا کہ تم کسی ایجنٹ سے رابطہ کرو۔ وہ تمہیں کسی معروف فلم ساز اور ہدایت کار سے ملوا دے گا۔

بمبئی فلمی دنیا میں یہ دستور عام ہے۔ وہاں ایجنٹ کمیشن پر ہر قسم کے فنکاروں، شاعروں، کہانی کاروں، اداکاروں وغیرہ کو اسٹوڈیو تک پہنچاتے ہیں اور کسی دوسرے درجے کے فلم ساز اور ہدایت کار سے ملوا بھی دیتے ہیں۔

رویندر کو اپنی صلاحیتوں پر اعتماد تھا اور وہ کسی ایجنٹ کی بیساکھی قبول کرنے کو تیار نہیں تھا۔ اس عرصے میں بہت سے ایجنٹوں نے اس سے رابطہ بھی کیا اور اسے ضمانت بھی دی کہ کسی نہ کسی معروف فلم ساز اور ہدایت کار سے آپ کی ملاقات بھی کروا دی جائے گی۔

رویندر کا ایک ہی جواب ہوتا۔ ”میں اتنے دن سے اسٹیج پر اپنے فن کا مظاہرہ کر رہا ہوں۔ کیا فلم انڈسٹری کے کسی ایک شخص نے بھی مجھے اس لائق نہیں سمجھا؟“

اسے بمبئی آئے ہوئے کافی دن ہو گئے تھے۔ وہ اسٹیج پر مسلسل کام کر رہا تھا۔ ایک میوزیکل شو میں بھارتی فلم انڈسٹری کے معروف فلم ساز این این پی بھی موجود تھے۔ انہوں نے رویندر جین کا شو دیکھا تو وہ اس کے فن سے بے حد متاثر ہوئے۔

شو کے اختتام پر انہوں نے منتظمین سے کہا کہ وہ اس نوجوان، موسیقار اور گلوکار سے ملنا چاہتے ہیں۔

رویندر جین کے لیے یہ کوئی نئی بات نہیں تھی کیونکہ ہر شو کے اختتام پر لوگ اس سے ملنے کے خواہش مند ہوتے تھے۔

جب اسے این این پی کا پیغام ملا تو وہ واپس گھر جانے کی تیاری کر رہا تھا۔

پیغام لانے والے نے اسے بتایا۔ ”رویندر جی! آپ نے شاید اس ملاقاتی کا نام غور سے نہیں سنا۔ وہ بھارت کی فلم انڈسٹری کے معروف فلم ساز این این پی ہیں۔“

لمحے بھر کو تو رویندر جین سناٹے میں رہ گیا۔ وہ این این پی کے نام سے بھی واقف تھا اور ان کے کام سے بھی۔ اس نے فوراً کہا۔ ”مجھے ان کے پاس لے چلو۔“

این این پی بہت تپاک اور محبت سے ملے اور اس سے کہا۔ ”رویندر جی! آپ بہت بڑے فنکار ہیں۔ مجھے حیرت ہے کہ اب تک میں نے آپ کو کیوں نہیں سنا؟“ پھر انہوں نے جیب سے اپنا وزیٹنگ کارڈ نکال کر رویندر کو دیا اور بولے۔ ”یہ میرا کارڈ ہے اس پر میرے آفس کا ایڈریس بھی ہے اور فون نمبر بھی۔ اگر آپ کل کہیں مصروف نہ ہوں تو ڈنر میرے ساتھ کر لیں۔“

رویندر جین اگر مصروف بھی ہوتا تو اپنی ہر مصروفیت منسوخ کر دیتا۔ تقدیر نے اس پر کامیابی کا ایک دروازہ کسی حد تک کھول دیا تھا۔ اس نے کہا۔ ”پی جی! مجھے کل ایسی کوئی خاص مصروفیت نہیں ہے اور مصروفیت ہوتی بھی تو میں اسے منسوخ کر دیتا۔ آپ جیسے بڑے آدمی سے ملاقات کی خاطر تو میں اپنی ہر مصروفیت کینسل کر سکتا ہوں۔“

رویندر جین کو اس رات نیند نہیں آئی۔ کبھی وہ سوچتا تھا کہ این این پی نے محض اس کے فن سے متاثر ہو کر اسے ڈنر کی دعوت دی ہے۔ ایسی دعوتیں وہ پہلے بھی بھگتا چکا تھا۔ شو میں شریک ہونے والے اکثر کروڑ پتی سیٹھ اسے اپنے گھر دعوت دیتے پھر کھانے کے بعد اسے اپنے گھر کی کسی تقریب میں فنکشن کے لیے مدعو کر لیتے۔ رویندر اس قسم کی بے شمار گھریلو گیدرنگ بھگت چکا تھا۔ ان تقریبات میں اسے ذرا بھی لطف نہیں آتا تھا۔ تقریب کے شرکا کلاسیکی موسیقی اور راگ راگنیوں سے یکسر نابلد ہوتے تھے اور اس سے فلمی گانے کی فرمائش کرتے تھے لیکن این این پی کی بات اور تھی۔ وہ بھارت کی فلم انڈسٹری کا ایک اہم نام تھا۔

دوسرے دن رویندر جین، این این پی کے گھر موجود تھا۔ پی کے چند قریبی دوست بھی اس ڈنر میں شریک تھے۔

ڈنر کے بعد پی نے اس سے کہا۔ ”رویندر جی! میں ایک فلم بنانے کا ارادہ رکھتا ہوں۔ میں چاہتا ہوں کہ اس کی موسیقی آپ ترتیب دیں۔“

رویندر کو اپنے کانوں پر یقین نہیں آیا۔ این این پی نے بغیر کسی سفارش اور بغیر کسی ایجنٹ کے رویندر سے براہ راست فلم کی موسیقی ترتیب دینے کی بات کی تھی۔ رویندر جین نے دل و جان سے این این پی کی پیش کش کو قبول کر لیا۔

یہیں سے رویندر جین کے فنی سفر (فلمی سفر) کا آغاز ہوا۔ این این پی کی اس فلم کا نام ”سلسلہ ہے پیار کا“ تھا۔ یہ 1972ء کی بات ہے۔

رویندر جین دل و جان سے اس فلم کی موسیقی ترتیب دینے میں مصروف ہو گیا۔ وہ اس فلم پر شدید محنت کر رہا تھا کہ اس فلم کی کامیابی پر خود اس کی کامیابی کا انحصار تھا۔ فلم انڈسٹری کی پرانی روایت ہے کہ جس نئے فنکار، اداکار، گلوکار یا موسیقار کی پہلی فلم فلاپ ہو جائے پھر وہ بھی عموماً فلاپ ہو جاتا ہے اور دوسرا فلم ساز اسے دوبارہ کام دینے کا خطرہ مول نہیں لیتا۔

یہ بھی ایک عجیب اتفاق ہے کہ سلسلہ ہے پیار کا رویندر جین کی پہلی فلم ضرور تھی لیکن بعض ناگزیر وجوہات کی بنا پر وہ ریلیز نہیں ہوئی۔

ابھی اس نے فلم مکمل ہی کی تھی کہ اسے ایک اور فلم ”کانچ اور ہیرا“ مل گئی۔ رویندر نے اس فلم میں بہت محنت اور لگن سے موسیقی ترتیب دی اور وہ فلم ریلیز بھی ہو گئی۔ فلم نے باکس آفس پر کوئی خاص کامیابی تو حاصل نہیں کی لیکن اس فلم کی ریلیز کے بعد بھارتی فلم سازوں کو احساس ضرور ہو گیا کہ صرف نوشاد، لکشمی کانت پیارے لال، کلیان جی آنند جی اور آر ڈی برمن ہی نہیں بلکہ بھارت میں ایک اور بہترین موسیقار کا وجود بھی ہے۔

فلم کے باکس آفس پر ہٹ نہ ہونے سے رویندر بہت اداس تھا۔ اس نے فلم کی موسیقی ترتیب دینے میں تو کوئی کسر نہیں چھوڑی تھی البتہ اس فلم کے مکالمے، اسکرین پلے اور ہدایت کاری میں وہ بات نہیں تھی جس سے فلم سپرہٹ ہوتی۔

اسی مایوسی کے عالم میں اسے ایک اور فلم ”سوداگر“ کی موسیقی ترتیب دینے کی آفر ہوئی۔ یہ فلم اس لحاظ سے اہم تھی کہ اس میں اپنے دور کی ایک بڑی ہیروئن نوتن تھی۔ ہیرو کا رول امیتابھ بچن نے ادا کیا تھا لیکن امیتابھ اس وقت اتنا اہم نہیں تھا۔ وہ تو خود اس دور میں اپنی شناخت بنانے کو کوشاں تھا اور اس وقت اس کے کریڈٹ پر کوئی سپرہٹ فلم نہیں تھی۔ یہ فلم 1973ء میں نمائش کے لیے پیش ہوئی تھی اور اس نے کامیابی کے جھنڈے گاڑ دیے تھے۔ رویندر جی کو تو شہرت اور مقبولیت ملی ہی تھی، امیتابھ بچن کو بھی فلم بینوں کی نظروں میں لانے والی یہی فلم تھی۔

اس کے فوراً بعد رویندر جین کی ایک اور فلم ”گیت گاتا چل“ بھی نمائش کے لیے پیش کی گئی تھی۔ اس فلم کا موسیقار بھی رویندر جین تھا اور نغمہ نگار بھی۔ فلم کا ٹائٹل سانگ ”گیت گاتا چل او ساتھی“ رویندر جین نے بہت بہترین انداز میں تحریر کیا تھا اور اس کی مناسبت سے اس کی دھن بھی ترتیب دی تھی۔ اس فلم کا ایک اور نغمہ ”شیام تیری بنسی پکارے“ بھی بہت مقبول ہوا تھا۔ یہ دونوں گانے دو غیر معروف گلوکاروں جسپال سنگھ اور آرتی مکھرجی کی آوازوں میں تھے لیکن رویندر کی موسیقی نے انہیں شہرت بخشی تھی۔ سوداگر کی طرح رویندر جین کی یہ فلم بھی کامیابی سے ہم کنار ہوئی۔

رویندر کی اس سے اگلی فلم ”چور مچائے شور“ تھی۔ اس کے فلم ساز بھی این این پی تھے۔ 1974ء میں ریلیز ہونے والی اس فلم نے تو گویا پورے ہندوستان میں دھوم مچا دی۔ یہ رویندر جین کی سپرہٹ فلم تھی اور بزنس کے لحاظ سے یہ فلم 1974ء کی دوسری بڑی فلم ثابت ہوئی تھی۔ اس کے بعد تو کامیابی کی دیوی رویندر پر ایسی مہربان ہوئی کہ اس کا نام ہی کسی فلم کی کامیابی کی ضمانت سمجھا جانے لگا۔ فلمی صنعت کی روایت کے عین مطابق رویندر جین کے دروازے پر فلم سازوں کے مجمع رہنے لگا۔ ہر فلم ساز کی خواہش تھی کہ رویندر جین اس کے لیے کام کرے پھر رویندر جین نے پیچھے مڑ کر نہیں دیکھا اور آگے ہی آگے بڑھتا گیا۔

1976ء میں رویندر جین کی ایک اور سپرہٹ فلم نے تہلکہ مچا دیا۔ یہ فلم ”فقیرا“ تھی۔ گانے تو رویندر جین نے خوب صورت تحریر کیے ہی تھے لیکن اس فلم کی موسیقی پر اس نے شدید محنت کی تھی۔ اس فلم کے گیت اتنے مدھر اور مسحور کن تھے کہ آج بھی فلم بینوں کے ذہنوں پر نقش ہیں۔ جن میں ”لے جائیں گے، لے جائیں گے، دل والے دلہنیا لے جائیں گے۔“ ”گھنگرو کی طرح بجتا ہی رہا ہوں میں“ اس گانے کی موسیقی میں ایسا درد تھا کہ سننے والے بے خود ہو جاتے تھے پھر اس پر کشور کمار کی پرسوز آواز! اس فلم کا ایک اور سدا بہار گیت ”ایک ڈال پر توتا بولے، ایک ڈال پر مینا“ بھی مشہور ہوا۔ یہ گیت محمد رفیع اور لتا منگیشکر نے گایا تھا۔ بنیادی طور پر فقیرا ایک میوزیکل فلم تھی۔ رویندر جین اس فلم کا نہ صرف موسیقار تھا بلکہ نغمہ نگار بھی تھا۔ اس کی یہ دُہری صلاحیت بعد میں بھی اس کے بہت کام آئی۔ فلم ساز این این پی کا خیال تھا کہ یہ فلم کلی طور پر رویندر جین کے گانوں اور موسیقی کی وجہ سے سپرہٹ ہوئی ہے۔ یہ رویندر جین کی بہت بڑی کامیابی تھی۔ اس فلم نے اسے صف اوّل کے موسیقاروں میں لا کھڑا کیا۔ اب وہ بھی لکشمی کانت پیارے لال اور خیام کا ہم پلہ تھا۔ اس وقت ان دونوں

موسیقاروں کا طوطی بولتا تھا۔ اس کے بعد رویندر جین نے بھارتی فلم انڈسٹری کو ایک کے بعد ایک کامیاب اور سپرہٹ فلم دی۔

1976ء میں ”چت چور“ کی نمائش ہوئی۔ اس فلم کا ایک گانا آج بھی فلم بینوں کے ذہنوں پر نقش ہے۔ ”گوری تیرا گاؤں بڑا پیارا“ یہ گانا ڈاکٹر یسوداس کی آواز میں تھا اور اس نے شہرت کے اگلے پچھلے تمام ریکارڈ توڑ دیے۔

رویندر جین کی کامیابیوں کا سلسلہ تھا کہ رکنے میں نہیں آرہا تھا۔ اس دور میں رویندر جین کی ایک اور فلم نے بھارت میں دھوم مچادی۔ فلم بینوں کے ذہنوں پر انمٹ نقوش چھوڑنے والی یہ فلم تھی ”انکھیوں کے جھروکوں سے“ اس فلم کا ٹائٹل سانگ انکھیوں کے جھروکوں سے اتنا مشہور ہوا کہ اس وقت برصغیر پاک وہند کے بچے بچے کی زبان پر یہی گانا تھا۔ اس وقت تک وی سی آر آچکا تھا اس لیے پاکستان میں اس گانے کی گونج گلی گلی میں تھی۔ فلم کے گانے حسب معمول رویندر جین ہی نے لکھے تھے اور ان کی مدھر موسیقی بھی اس نے ترتیب دی تھی۔ اس فلم کے گلوکار اور گلوکارہ ہیم لتا اور جسپال سنگھ اس وقت اتنے معروف نہیں تھے۔ یہ صرف اور صرف رویندر کی شاعری اور بے مثال موسیقی کا کمال تھا کہ اس نے ان غیر معروف گلوکاروں سے اس لافانی گیت کی گلوکاری کروائی۔

ہیم لتا اور جسپال سنگھ کو آئندہ بھی ایسی شہرت اور عزت نہیں ملی اور آہستہ آہستہ ان کا نام فلم انڈسٹری سے تقریباً معدوم ہوگیا۔

انڈسٹری میں مشہور تھا کہ رویندر جین ایسا پارس ہے جو کسی بے وقعت لوہے کے ٹکڑے کو بھی چھولے تو وہ سونا بن جاتا ہے۔

ایسی کامیابی، عزت، دولت اور شہرت سمیٹنے کے بعد کوئی بھی موسیقار مطمئن ہوجاتا ہے۔ خاص طور پر اس صورت میں کہ اس کا نام ہی فلم کی کامیابی کی ضمانت بن جائے لیکن رویندر جین کے دل میں آگے آگے اور مزید آگے بڑھنے کی لگن تھی۔ اسے کام سے جنون کی حد تک عشق تھا۔

فلم سوداگر کے ایک نغمے کی ریکارڈنگ کے دوران رویندر جین کو اطلاع ملی کہ اس کے پتا پنڈت اندرمنی جین کا دیہانت ہوگیا ہے۔

پروڈیوسر نے رویندر سے کہا کہ تم فوری طور پر علی گڑھ چلے جاؤ۔

رویندر جین نے افسردگی سے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔ ”جانے والا چلا گیا۔ اب میں وہاں آج پہنچوں یا کل اس سے کیا فرق پڑتا ہے۔ میرے جانے سے گانے کی ریکارڈنگ متاثر ہوگی اور وہ تسلسل ٹوٹ جائے گا جو میں چاہتا ہوں۔ میں اس تسلسل کو برقرار رکھنا چاہتا ہوں اس لیے فوری طور پر ریکارڈنگ نہیں چھوڑ سکتا۔“

• ایسا نہیں تھا کہ رویندر جین کو اپنے پتا پنڈت اندرمنی جین سے محبت نہیں تھی۔ وہ انہیں ٹوٹ کر چاہتا تھا۔ آج ان ہی کی بدولت وہ اس مقام پر تھا لیکن باپ کی محبت سے بھی زیادہ بڑھ کر اسے اپنا کام عزیز تھا۔

اس کی نہ رکنے والی کامیابیوں کا سفر ابھی جاری تھا کہ بھارتی فلم انڈسٹری کے ایک جہان، فلم ساز اور ہدایت کار راج کپور نے اس کی شہرت کو چار چاند لگادیے۔ راج کپور فلمز یعنی آر کے کے بینر تلے بننے والی فلم ”رام تیری گنگا میلی“ کی موسیقی ترتیب دینے کے لیے ان کی نظر انتخاب رویندر جین پر پڑی۔

یہ رویندر جین کی ایک اور شاندار کامیابی تھی۔ رویندر جین نے اس فلم میں انتہائی مسحور کن موسیقی کا مظاہرہ کیا اور جب فلم نمائش کے لیے پیش ہوئی تو سپرہٹ ہوگئی۔ گویا اور ایک بڑی کامیابی جین کا مقدر بنی۔

رام تیری گنگا میلی کے دو گانوں نے تو شہرت دوام حاصل کی۔ دونوں گانے بھارت کی سب سے بڑی گلوکارہ لتا منگیشکر کی آواز میں تھے۔ ان میں سے ایک گانا ”رام تیری گنگا میلی ہوگئی، پاپیوں کے پاپ دھوتے دھوتے“ اور دوسرا معروف اور مدھر گیت تھا ”سن صاحبہ سن، پیار کی دھن“ اس فلم کا نغمہ نگار بھی رویندر جین ہی تھا۔

فلم کی سب سے بڑی کامیابی یہ تھی کہ اسے ایک نہ دو پورے پانچ فلم فیئر ایوارڈز سے نوازا گیا۔ یہ بھارتی فلم انڈسٹری کی تاریخ میں ایک ریکارڈ ہے۔ یہ پانچ ایوارڈز بہترین فلم، بہترین آرٹ ڈائریکٹر، سریش ساونت۔ بہترین ہدایت کار، راج کپور۔ بہترین ایڈیٹر، راج کپور اور بہترین موسیقار، رویندر جین کے تھے۔

یہ فلم بزنس کے لحاظ سے بھی سپرہٹ تھی۔

راج کپور نے اس کے بعد ایک اور فلم حنا کی تیاریاں شروع کردیں۔ ان کا کمال یہ تھا کہ وہ فلم کی نمائش بلکہ فلم بندی سے بھی قبل اس کی اتنی پبلسٹی کرتے تھے کہ فلم بین بہت شدت سے اس فلم کا انتظار کرتے تھے۔

اس فلم میں انہوں نے ایک اور تجربہ کرنے کا ارادہ کیا۔ وہ بھارت کی تمام معروف اداکاراؤں کو چھوڑ کر فلم کی ہیروئن پاکستان سے لینا چاہتے تھے۔

پہلے اس سلسلے میں پاکستان ٹیلی وژن کی دو سپرہٹ اداکاراؤں مرینہ خان اور شہناز شیخ کا نام لیا گیا لیکن بعد میں جب راج کپور نے پی ٹی وی کے ایک ڈرامے میں زیبا بختیار کو دیکھا تو اس کی پرکشش شخصیت سے متاثر ہوکر اسے حنا کی ہیروئن کے طور پر منتخب کرلیا۔

فلم کی عکس بندی کی تیاریاں شروع ہی ہوئی تھیں بلکہ کچھ حصہ فلم بند بھی ہوچکا تھا کہ راج کپور اس جہانِ فانی سے کوچ کرگئے۔

فلم انڈسٹری کے بندوں کا خیال تھا کہ اب یہ فلم مشکل ہی سے مکمل ہوسکے گی۔ وہ بھی اس صورت میں کہ کپور فیملی کسی بڑے فلم ڈائریکٹر سے اسے مکمل کروائے لیکن فلم کو مکمل کرنے کا بیڑا ان کے بیٹے رندھیر کپور نے اٹھایا۔ اب یہ اس کی نااہلی تھی یا کمزور اسکرپٹ تھا یا پھر فلم کے ہیرو رشی کپور نے اس محنت سے کام نہیں کیا یا پھر نوخیز اداکارہ زیبا بختیار کی اداکاری اس کی ناکامی کا سبب بنی۔ زیبا بختیار انتہائی حسین اداکارہ تھیں لیکن ان کی بھدی آواز بہترین مکالموں کو بھی بے تاثر کردیتی تھی۔ وجہ کچھ بھی رہی ہو لیکن رویندر جین کا پلّہ اس فلم میں بھی بھاری تھا۔ ان کی موسیقی نے اس فلم میں بھی اپنا جادو جگایا اور ”میں ہوں خوش رنگ حنا“ جیسا بہترین گانا لکھ کر اپنا بھرم قائم رکھا۔ یہ گانا لتا منگیشکر کی آواز میں تھا۔ فلمی نقادوں کا خیال تھا کہ حنا کو جو تھوڑی بہت کامیابی ملی ہے وہ بھی رویندر جین کی مرہونِ منت ہے۔

رویندر جین کا کمال یہ تھا کہ وہ بصارت سے محروم ہونے کے باوجود موقع محل کے لحاظ سے ایسے ایسے نغمے تخلیق کرتا تھا، ان کی اتنی بہترین موسیقی ترتیب دیتا تھا جیسے وہ سب مناظر اس نے اپنی آنکھوں سے دیکھ رکھے ہیں۔ خاص طور پر جب وہ ڈائریکٹر کو گانے کے مطابق اس کی لوکیشن اور پس منظر کے بارے میں بتاتا تھا تو وہ بھی حیران رہ جاتا تھا کہ آنکھوں سے محروم ایک شخص کو ہری ہری شبنمی گھاس، کھائیوں اور آبشاروں کے بارے میں کیسے علم ہوسکتا ہے۔ یہ گویا اس کی خداداد صلاحیت تھی کہ وہ کسی بھی چیز کو دیکھے بغیر اس کی خوب صورتی اور خوش نمائی کو من کی آنکھوں سے دیکھ لیتا تھا۔

شہرت اور دولت ایسی چیز ہے جو انسان کو بعض اوقات اچھے برے کی پہچان بھلادیتی ہے لیکن رویندر جین ہمیشہ ویسا ہی رہا جیسے وہ علی گڑھ میں رہتا تھا۔

پنڈت اندرمنی جین کے دیہانت کے بعد اس کی ماتا جی کرن دیوی اکثر اس کے پاس رہتی تھیں۔ ان کا خیال تھا کہ رویندر نے اب سب کچھ حاصل کرلیا ہے اب اس کا گھر بسنا چاہیے۔ یہاں یہ سوال تو تھا ہی نہیں کہ ایک اندھے سے اپنی بیٹی کون بیاہے گا؟ اس اندھے کے لیے ایک سے ایک لڑکی موجود تھی لیکن رویندر جین ابھی اس بندھن میں بندھنا نہیں چاہتا تھا۔ وہ ابھی مزید آگے جانا چاہتا تھا اس لیے ہر بار بہت خوب صورتی سے وہ ماں کی بات ٹال جاتا۔

مہیندر جین .... بھی اکثر اسے سمجھاتا تھا کہ ”بھیا! اب تمہیں شادی کرلینا چاہیے۔“

رویندر ہنس کر کہتا۔ ”ماں نے مجھ سے پہلے تمہیں اس بندھن میں باندھ دیا ہے اس لیے تم چاہتے ہو کہ میں بھی شادی کی بیڑیاں پہن لوں۔ میں شادی ضرور کروں گا لیکن اس وقت جب کوئی لڑکی مجھے پسند آجائے گی۔“

”لڑکی کو کیا صرف آواز سے پسند کروگے؟“ مہیندر نے مذاق میں پوچھا۔

”ہاں۔“ رویندر نے سنجیدگی سے جواب دیا۔ ”میں آوازوں کا سوداگر ہوں۔ آواز ہی میری کائنات ہے۔ میں صرف آواز سن کر بتادیتا ہوں کہ کوئی بھی شخص کس مزاج کا ہے۔“

فلمی صنعت چاہے ہالی ووڈ کی ہو یا بالی ووڈ کی۔ اسکینڈلز سے پاک نہیں ہے۔ اس صنعت میں چند فن کار ہی ایسے ہوں گے جن کی زندگی کسی بھی قسم کے اسکینڈل سے پاک ہوگی۔ ایسے فن کاروں کی تعداد انگلیوں پر گنی جاسکتی ہے ورنہ فلمی صنعت میں اسکینڈلز کا ہونا عام بات ہے۔ بعض اوقات تو مختلف اداکار اور اداکارائیں پبلسٹی کے لیے اپنے جھوٹے اسکینڈل بھی بنواتی ہیں۔

رویندر جین نے ہمیشہ ان بڑھتے ہوئے ہاتھوں کو جھٹک دیا۔ اپنی لازوال کامیابیوں کے بعد تو فلمی صنعت میں اس کا اتنا رسوخ ہوگیا تھا کہ وہ محض اپنے ایک ٹیلی فون پر کسی بھی لڑکی کو ہیروئن بنواسکتا تھا۔ ہیروئن بننے کی خواہش مند لڑکیوں نے بھی اسے اپنے حسن کے جال میں پھانسنا چاہا لیکن وہ ہر جال سے صاف بچ نکلا۔

اس کے ابتدائی فلمی دور کے ایک دوست نے اس کا

مذاق اڑاتے ہوئے کہا۔ ”رویندر! جوانی انسان کو صرف ایک بار ہی ملتی ہے اور شہرت تو بہت کم لوگوں کے حصے میں آتی ہے۔ تمہارے اردگرد یہ جو رنگین تتلیاں تھرکتی رہتی ہیں تم ان کا دل کیوں توڑتے ہو؟“

رویندر جین نے سنجیدگی سے جواب دیا۔ ”پہلی بات تو یہ ہے کہ میں رنگوں اور روشنیوں کی شناخت ہی نہیں رکھتا۔ مجھے نہیں معلوم کہ جو لڑکی میرا ہاتھ تھام رہی ہے وہ خوب صورت اور خوش ادا ہے یا موٹی، بھدی اور کالی ہے۔“

اس کے دوست نے ہنستے ہوئے کہا۔ ”یہ تم خود اپنی ہی بات کی نفی کر رہے ہو۔ تم نے اب تک جن اداکاراؤں اور گلوکاراؤں کے ساتھ کام کیا ہے تم ان کی خوب صورتی اور حسن سے خوب واقف ہو۔ تم جانتے ہو کہ ساریکا کتنی حسین ہے یا ریکھا میں کیسی کشش ہے؟“

”ہاں، میں جانتا ہوں۔“ رویندر نے زچ ہو کر کہا۔ ”بھگوان نے اگر میرے بھاگیہ میں اندھیرے لکھے ہیں تو اس کی کمی پوری کرنے کے لیے مجھے اور بہت سی شکتی دی ہے۔“

رویندر جین نے ایک طرح سے ہیم لتا کو انڈسٹری میں متعارف کروایا اور اس سے ایسے گانے گوائے کہ اس کی دھوم پورے ہندوستان میں مچ گئی۔ خاص طور پر ”انکھیوں کے جھروکوں سے“ ہیم لتا کا ایسا نغمہ تھا جو آج بھی اتنا ہی خوب صورت اور تروتازہ ہے جیسا ستر کی دہائی میں تھا۔

جب رویندر نے لگاتار ہیم لتا کو کئی فلموں میں گانے کا موقع دیا تو فلمی صنعت کی روایت کے عین مطابق لوگوں کی زبانوں پر رویندر اور ہیم لتا کا نام آنے لگا۔

اس کے ایک بے تکلف دوست نے تو ہنستے ہوئے اس سے پوچھ بھی لیا۔ ”رویندر! تم آج کل ہیم لتا پر بہت مہربان ہو، کہیں دال میں کچھ کالا تو نہیں؟“

رویندر مسکرا کر بولا۔ ”اس کی آواز میں کوئی ایسی بات ہے جو میں بار بار اسی کو موقع دیتا ہوں ورنہ ایسی کوئی بات نہیں ہے جیسا تم سوچ رہے ہو۔ میں تو جسپال سنگھ کو بھی اتنا ہی موقع دیتا ہوں۔“

جب رویندر جین نے کامیابی کی مزید منزلیں طے کیں اور اسے دوسرے بڑے گلوکاروں کے ساتھ کام کرنے کا موقع ملا تو ہیم لتا کا نام وقت کی گرد میں کہیں چھپ گیا اور لوگوں کی زبانیں بھی بند ہو گئیں۔ اب وہ لتا منگیشکر، آشا بھونسلے وغیرہ کے ساتھ کام کر رہا تھا۔ ان کے بارے میں تو کوئی ایسا سوچ بھی نہیں سکتا تھا پھر رویندر کے رویے سے جلد ہی سب نے سمجھ لیا کہ وہ سیدھا، سچا اور اپنی دھن میں مگن رہنے والا فنکار ہے۔

اس کے پچیس سالہ فلمی کیریئر میں بہت سی سپر ہٹ اور لازوال فلمیں ہیں جن کے گیت اسے ہمیشہ زندہ رکھیں گے۔

راج کپور کے اس جہاں سے رخصت ہونے کے بعد آر کے فلمز سے اس کا ناتا تقریباً ٹوٹ گیا لیکن اب اسے سہارے، کسی بیساکھی کی ضرورت نہیں تھی۔ اس نے یکے بعد دیگرے ”سوداگر“ (یہ فلم 1991ء میں دوبارہ بنی)۔ 1991ء میں ہی اس نے ”یہ آگ کب بجھے گی“ کی گیت نگاری اور موسیقی ترتیب دی۔ فلم کے ہیرو سنیل دت اور ہیروئن ریکھا تھی۔ 1992ء میں پرنسیس فرام کھٹمنڈو کی موسیقی بھی ترتیب دی اور اس کے لیے گیت بھی لکھے۔ 1993ء میں ”تیری آن“ کا موسیقار اور نغمہ نگار رویندر جین تھا۔ اس فلم کا ہیرو سنجے دت تھا۔ اس کی فلم ”بیٹا ہو تو ایسا“ 1994ء میں نمائش پذیر ہوئی۔ موسیقار اور گیت کار حسبِ معمول رویندر جین تھا۔ 1995ء میں ایک اور ہٹ فلم ”پرم ویر چکر“ ریلیز ہوئی۔ اس کی نغمہ نگاری اور موسیقی کے فرائض بھی رویندر جین نے انجام دیے تھے۔

جب سے اس نے اپنے فلمی سفر کا آغاز کیا تھا کوئی سال ایسا نہیں تھا جس میں اس نے کوئی ہٹ یا سپر ہٹ فلم نہ دی ہو۔

ستر کی دہائی کے اواخر میں جب رویندر جین کی شہرت نصف النہار پر تھی۔ اس نے ایک مشاعرے میں ابھرتی ہوئی شاعرہ دیویا کو سنا۔ اس کی آواز میں رویندر جین کو نہ جانے کیسی کشش محسوس ہوئی کہ اسے دوبارہ سننے کی خواہش اسے دیویا کے گھر تک لے گئی۔ دیویا خود بھی اس کے فن کی مداح تھی اس لیے بہت پُرتپاک انداز میں اس کا استقبال کیا۔ دیویا سے زیادہ اس کی ماتا جی رویندر جین کو پسند کرتی تھیں۔ انہوں نے رویندر جین کو کھلے دل سے دعوت دی کہ تم جب چاہو میرے گھر آ سکتے ہو۔

یہ اس گھرانے کے لیے اعزاز کی بات تھی کہ رویندر جین جیسا مقبول و معروف نغمہ نگار اور موسیقار ان کے ہاں آتا ہے۔ دیویا خود بھی اس سے ملنے کو بے چین رہتی تھی اور جب کبھی رویندر اپنی مصروفیات کی وجہ سے ان کے گھر نہ جاتا تو وہ خود اسے تلاش کرتے ہوئے کسی نہ کسی اسٹوڈیو میں جا

جاتی۔

کام کے دوران رویندر اپنے نزدیک ترین دوستوں سے بھی نہیں ملتا تھا۔ اس کی اس عادت سے نہ صرف اس کے تمام دوست واقف تھے بلکہ فلم ساز اور ہدایت کار بھی واقف تھے۔ انہوں نے اس بات کا خاص طور پر یہ اہتمام کیا تھا کہ کوئی بھی شخص کام کے دوران رویندر کو ڈسٹرب نہ کرے۔ ایسا انہوں نے رویندر کے کہنے پر کیا تھا۔

صرف ایک دفعہ فلم سوداگر کی ریکارڈنگ کے دوران میں ایسا ہوا تھا کہ جو شخص رویندر کے باپ پنڈت اندرمنی جین کی موت کی اطلاع لے کر آیا تھا، رویندر نے اس سے ملاقات کی تھی۔

جب دیویا پہلی مرتبہ اس سے ملنے اسٹوڈیو پہنچی تو سیکورٹی نے اسے بھی روک دیا۔ وہ اس بات پر برہم ہو گئی۔ فلم ساز جانتا تھا کہ رویندر جین کے دیویا سے نزدیکی تعلقات ہیں لیکن رویندر نے تو ہدایت دے رکھی تھی کہ اگر کام کے دوران میں میرا بھائی آئے تو اسے بھی میرے فارغ ہونے تک باہر بٹھایا جائے۔

سیکورٹی کے منع کرنے پر دیویا اتنی برہم ہوئی کہ اس نے سیکورٹی گارڈ کو بے نقط سنا دیں۔ شور شرابا سن کر فلم کا ہدایت کار ریچ میں آیا تو دیویا نے اسے بھی کھری کھری سنا دیں۔

اس وقت رویندر کسی کام سے باہر آیا تو اس نے دیویا کی آواز سنی جو ہدایت کار پر برس رہی تھی۔

رویندر فوراً باہر آ گیا اور دیویا کے ساتھ کچھ دیر گزارنے کے بعد بولا۔ ”میں جلد ہی تمہارے گھر آؤں گا۔ ماتا جی کو میری طرف سے نمسکار کہنا۔“

دیویا کے جانے بعد اس نے فلساز اور ہدایت کار سے کہہ دیا کہ دیویا جب بھی آئے مجھے اطلاع ضرور دی جائے۔

دیویا کی ماتا جی کو تو رویندر بھی بہت پسند تھا۔ وہ دل سے اس کا احترام کرتی تھیں اور چاہتی تھیں کہ رویندر دیویا کی شادی ہو جائے مگر یہ بات وہ دیویا سے کہتے ہوئے جھجکتی تھیں کہ مبادا دیویا یہ سمجھے کہ میری ماں مجھے ایک اندھے کے سر تھوپنا چاہتی ہے۔

رویندر لاکھ معروف و مقبول سہی، دولت مند سہی لیکن تھا تو اندھا۔ نہ صرف اندھا بلکہ انتہائی کم صورت۔ وہ اپنی اس خواہش کا اظہار دیویا سے کیسے کر سکتی تھیں۔

ایک دن دیویا بہت خوش گوار موڈ میں تھی۔ ماں نے اس سے پوچھا۔ ”کیا بات ہے بیٹا! آج بہت خوش ہو؟“

”ماں میں شادی کرنا چاہتی ہوں۔“ دیویا نے کہا۔ ”اب نہ جانے وہ راضی بھی ہو گا یا نہیں؟ ویسے مجھے لگتا ہے کہ وہ راضی ہے۔“

”کون بیٹا، تم کس کی بات کر رہی ہو؟“ ماں کا کلیجہ دھک سے رہ گیا۔ ان ہی دنوں دیویا کا ایک نوجوان اور خوبرو شاعر سے بھی بہت ملنا جلنا تھا۔ ماں سمجھی کہ دیویا اس کے بارے میں بات کر رہی ہے۔ وہ تو اس کی شادی رویندر جین سے کرنے کے موڈ میں تھیں۔

”حیرت ہے ماں۔“ دیویا مسکرا کر بولی۔ ”تمہیں اب تک میری پسند کا احساس نہیں ہوا۔ میں رویندر سے شادی کرنا چاہتی ہوں لیکن ڈرتی ہوں کہ اگر اس نے انکار کر دیا تو......“

”تم رویندر سے شادی کرنا چاہتی ہو؟“ ماں نے غیر یقینی سے پوچھا۔ اسے یقین نہیں آ رہا تھا کہ دیویا جیسی سوشل لڑکی خود رویندر سے شادی کی خواہش مند ہو گی۔

”ہاں ماں، میں رویندر سے شادی کرنا چاہتی ہوں۔“

”تم فکر مت کرو۔“ ماں نے اسے تسلی دی۔ ”اس سلسلے میں رویندر سے میں خود بات کر لوں گی۔“ ماں کے چہرے سے بھی خوشی پھوٹی پڑ رہی تھی۔

اب اسے رویندر کی آمد کا انتظار تھا۔ انہی دنوں رویندر اپنے کام کے سلسلے میں کچھ زیادہ ہی مصروف تھا پھر ایک دن اس نے اڑتی اڑتی خبر سنی کہ رویندر آج کل ہیم لتا سے پھر ملنے لگے ہیں۔ اسے شبہ ہوا کہ رویندر کہیں ہیم لتا میں واقعی دلچسپی تو نہیں لے رہا۔

اس سے پہلے کہ پانی سر سے اونچا ہوتا اس نے ایک دن خاص طور پر رویندر کو اپنے گھر آنے کی دعوت دی۔ اپنی بے پناہ مصروفیات میں سے وقت نکال کر رویندر دیویا کے گھر پہنچا۔ دیویا کی اماں نے اس کا بہت پُرتپاک انداز میں استقبال کیا۔

پھر اس سے پہلے کہ دیویا کچھ کہتی رویندر نے کہا۔ ”ماں جی! میں آج آپ سے کچھ مانگنا چاہتا ہوں۔“

”ہاں بیٹا بولو۔“ ماں نے حیرت سے پوچھا۔

”میں دیویا سے شادی کرنا چاہتا ہوں، اگر آپ کو اعتراض نہ ہو تو......“

""اعتراض کیسا بیٹا۔" ماں نے کہا۔ "لیکن اس سلسلے میں تمام باتیں بڑے طے کرتے ہیں۔ تم کبھی اپنی ماتا جی کو ہم سے ملواؤ۔"

"ماتا جی اسی ہفتے علی گڑھ سے بمبئی آرہی ہیں۔" رویندر نے جواب دیا۔ یوں دیویا کی ماتا جی کی بھی خواہش بغیر کہے ہی پوری ہوگئی۔

کرن دیوی بھی رویندر کے اس فیصلے سے بہت خوش ہوئی اور چٹ منگنی پٹ بیاہ کے مصداق ان دونوں کی شادی ہوگئی۔

ان کی شادی بھی ایک مثالی شادی ہے۔ شادی کے بعد دیویا نے خود کو گھر کے لیے وقف کردیا۔ ان کا ایک بیٹا آیوش جین ہے۔ باپ کی طرح اسے بھی موسیقی سے لگاؤ ہے اور اس نے بھی باپ کی طرح الہ آباد کی پریاگ سنگیت سمیتی سے سنگیت پربھارکر کی ڈگری لی ہے۔

اس نے ابھی اپنا سفر شروع ہی کیا ہے۔ یہ تو وقت بتائے گا کہ باپ کی طرح اس کے مقدر میں کتنی کامیابیاں آتی ہیں۔

رویندر جین کی ایک خاص بات یہ تھی کہ اس نے کبھی اپنے کسی فیصلے پر سمجھوتا نہیں کیا۔ فلم رام تیری گنگا میلی میں ایک موقع پر راج کپور نے اس سے کہا کہ اس فلم کا ایک گانا "سن صاحبہ سن" لتا منگیشکر کے بجائے آشا بھونسلے کو دے دیا جائے۔ گانا آشا کی آواز میں زیادہ سوٹ کرے گا لیکن رویندر نے انکار کردیا کہ اس گانے کے لیے لتا جی کی آواز ہی موضوع ہے۔

اس کی جگہ کوئی اور میوزک ڈائریکٹر ہوتا تو وہ کبھی راج کپور جیسے فلم ساز اور ہدایت کار سے اس دوٹوک انداز میں بات نہیں کرسکتا تھا کہ راج کپور اپنی کسی بات کی مخالفت برداشت نہیں کرتا تھا لیکن حیرت انگیز طور پر وہ رویندر جین کی بات مان گیا۔ راج کپور کو کافی حد تک خود بھی سر سنگیت سے لگاؤ تھا اور وہ اپنی فلم کی موسیقی پر بہت محنت کرتا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ رویندر میں جو صلاحیت ہے وہ اس دور کے چند ہی میوزک ڈائریکٹر میں ہے پھر رویندر کو تو یہ آسانی بھی تھی کہ وہ خود ہی گیت نگار بھی تھا اور فلم کی ڈیمانڈ کے مطابق گانا لکھتا تھا اور اسے اسی تاثر کے ساتھ کمپوز بھی کرتا تھا۔

1980ء اور 1990 کے دوران میں رویندر جین نے مختلف ہندی دیومالائی فلموں "نوراتی، گوپال کرشن، جیے کرولی ماں، ہر ہر گنگے، درگا ماں، سولہ شکروار، راجا ہریش چندر، بولو جے چکر دھاری، بابھنی شی وشوانا تھ (تلگو) جیسی فلموں کی موسیقی بھی ترتیب دی۔ دس سال کا یہ عرصہ بھی اس کی زندگی کا بہت محنت طلب دور تھا۔ ان فلموں کی موسیقی ترتیب دیتے ہوئے اس نے شدید محنت سے کام کیا اور یہ دور بہت مصروف گزرا۔

راج شری پروڈکشن نے ہمیشہ رویندر جین کو اہمیت دی۔ ان کی پہلی فلم "انکھیوں کے جھروکوں سے" کرنے کے بعد رویندر جین راج شری پروڈکشن کے لیے بہت اہمیت اختیار کرگیا تھا لیکن درمیان میں آر کے فلم کے بینر تلے بننے والی فلموں رام تیری گنگا میلی اور حنا کی وجہ سے وہ راج شری پروڈکشن سے کچھ عرصے کے لیے دور ہوگیا تھا۔

2008ء میں اس کی ایک اور سپر ہٹ فلم "وواہ" ریلیز ہوئی۔ یہ بھی راج شری پروڈکشن کے بینر تلے بنی تھی۔ اس کے بعد 2011ء میں اس نے "جان پہچان" اور "تان سین" کی موسیقی ترتیب دی۔ تان سین اس کے لیے ایک چیلنج تھی۔ جیسا کہ اس کے نام ہی سے ظاہر ہے۔ اس سے پہلے موسیقار نوشاد بیجو باورا میں اپنے فن کے جوہر دکھا چکے تھے۔ اس کے بعد کے موسیقاروں میں سے کوئی بھی اس قسم کی فلم میں ان کے گراف کو نہ چھو سکا۔

رویندر جین نے بھی تان سین کی موسیقی ترتیب دینے میں دن رات ایک کردیے اور وہ اگر نوشاد سے آگے نہیں بڑھا تو ان سے کم بھی نہیں رہا۔ 2012ء میں اس کی آنے والی فلمیں "ہر وما اور بار بریک، شیش رانی اور مہایدھ" شامل ہیں۔

رویندر جین اپنی فلمی زندگی میں جس شخصیت سے بہت زیادہ متاثر تھا وہ ڈاکٹر کے، جے، یسوداس کی شخصیت تھی۔ ان دونوں میں بہت گہری دوستی تھی۔ 1970ء سے 1980ء تک رویندر جین نے نہ صرف یسوداس کو اپنی فلموں میں گانے کے بھرپور مواقع دیے بلکہ بہت سے گیت اس کے ساتھ مل کر گائے بھی۔ ان گانوں میں "او گوریا رے (فلم نینا)، بیتی ہوئی رات کے (فلم آپاش) اور گوری تیرا گاؤں بڑا پیارا (فلم چت چور) خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔ رویندر جین آج بھی ڈاکٹر کے، جے یسوداس کی آواز کو وائس آف انڈیا کہتا ہے۔ یسوداس سے دوستی بلکہ عقیدت کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ جب رویندر جین سے یہ پوچھا گیا کہ "اگر کبھی اسے بینائی نصیب ہو تو وہ سب سے پہلے کسے دیکھنا چاہے گا؟"

رویندر جین نے فوری جواب دیا۔ "اگر کبھی بھگوان نے مجھے اس نعمت سے نوازا تو میں سب سے پہلے اپنے پیارے دوست اور بہترین فن کار ڈاکٹر کے، جے، یسوداس کے درشن کرنا چاہوں گا۔"

یہ اس کی ڈاکٹر کے، جے، یسوداس سے محبت کا سب سے بڑا ثبوت ہے۔

1989ء میں رویندر جین نے ڈاکٹر کے، جے، یسوداس کے پروڈکشن ہاؤس "تھرنگنی آڈیو" میں بننے والی فلم "آواتی پوجنڈو" کی موسیقی بھی ترتیب دی تھی۔

ہندی فلموں کے علاوہ رویندر جین نے بہت سے تامل، تیلگو، ہریانوی، پنجابی، بھوج پوری اور بنگالی گانوں کی موسیقی بھی ترتیب دی۔

رویندر نے ڈاکٹر کے، جے، یسوداس کے ساتھ مل کر ایک پورا البم بھی تیار کیا ہے۔ یہ البم بھی بھارت کے علاوہ دنیا کے دوسرے ملکوں میں بہت مقبول ہوا۔

اسے یہ اعزاز حاصل ہے کہ اس کی کمپوز کی ہوئی دھنوں کو غیر ملکی ممالک میں بھی استعمال کیا گیا۔ اس کے علاوہ "رام تیری گنگا میلی" اس کی وہ پہلی فلم تھی جس کا انگلش ورژن بھی تیار کیا گیا۔

رویندر جین نے بہت سے معروف بھجن نہ صرف تحریر کیے بلکہ انہیں کمپوز کرکے ان کے البم بھی تیار کیے۔ یہ البم "جین بھجن" کے نام سے پورے بھارت میں معروف ہیں۔

اس کی کامیابیوں کا سلسلہ ابھی رکا نہیں ہے بلکہ وہ اب بھی اسی محنت اور تن دہی سے کام کررہا ہے جیسے اپنے فنی سفر کے آغاز میں کرتا تھا۔

اس کا ایک کارنامہ جے سریش راؤ کا البم "دی مورننگ سن (The mo rning sun) ہے۔ اس کے علاوہ اس نے سابق وزیراعظم اٹل بہاری واجپائی کی لائیو (Live) ریکارڈنگ، قدم ملاکر چلنا ہوگا، اور 2012ء گلوکارہ پروین خان کے البم کنارہ کی موسیقی ترتیب دی ہے۔

اس کے بڑے بھائی مہندر کمار جین اور ڈی، کے جین جو بچپن میں نہ صرف اسے ناپسند کرتے تھے بلکہ اسے طعنے دے کر اس کا مذاق اڑایا کرتے تھے۔ آج وہ بھی بہت فخر سے لوگوں کو بتاتے ہیں کہ معروف میوزک ڈائریکٹر رویندر جین ان کا بھائی ہے۔ یہ بھی قدرت کا عجیب نظام ہے کہ کل تک جو بھائی اسے اس بات کا طعنہ دیا کرتے تھے کہ رویندر جین شہر میں ان کی وجہ سے پہچانا جاتا ہے۔ آج اس بات کا اعتراف کرتے ہیں کہ ہمارا پورا جین گھرانا رویندر جین کی وجہ سے دنیا بھر میں پہچانا جاتا ہے۔

رویندر جین نے ٹی وی کی لاتعداد سیریلز کی موسیقی ترتیب دی ہے۔ بالخصوص ساگر فلمز پرائیوٹ لمیٹیڈ کے لیے اس نے بہت کام کیا ہے اور بہت سی معروف بھارتی دیومالائی کہانیوں کی سیریلز کی موسیقی ترتیب دی ہے۔

بنیادی طور پر رویندر جین اپنے کام سے کام رکھنے والا محنتی اور دیانت دار کمپوزر ہے۔ اسے اس بات کی کبھی پروا نہیں ہوئی کہ دوسرے اس کے بارے میں کس قسم کے خیالات رکھتے ہیں۔ وہ اپنے سینئرز کی بہت عزت کرتا ہے۔ خاص طور نوشاد، لکشمی کانت پیارے لال، کلیان جی آنند جی، شیام اور آر، ڈی برمن کا وہ دل سے احترام کرتا ہے۔ نوشاد اور آر ڈی برمن تو اس کے آئیڈیل رہے ہیں۔ وہ دونوں ہی اب اس دنیا میں موجود نہیں ہیں لیکن وہ آج بھی ان کا تذکرہ بہت ادب و احترام سے کرتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ ایک سچا فنکار کبھی نہیں مرتا۔ نوشاد نے جو امر گیت فلم انڈسٹری کو دیے ہیں وہ رہتی دنیا تک زندہ رہیں گے۔ آر ڈی برمن نے سنگیت میں جو نئے نئے تجربات کیے اور جو لازوال گیت کمپوز کیے ان کا بھی ثانی ملنا مشکل ہے۔ یہ دونوں مہان کمپوزر اپنے لازوال اور ناقابلِ فراموش گیتوں میں زندہ رہیں گے۔

ایک مرتبہ رویندر جین کی موجودگی میں نوشاد نے ایک واقعہ سنایا۔ وہ یہ واقعہ پہلے بھی سنا چکے تھے کہ ایک مرتبہ وہ اپنے کسی گیت کی ریکارڈنگ کے سلسلے میں مدراس گئے۔ وہاں شہر کی سیر کے دوران ایک بڑے سینما ہاؤس کے سامنے گاڑی رکوا کر انہوں نے پان کھانے کی خواہش کا اظہار کیا۔

..... وہ اپنے میزبان کے ساتھ گاڑی سے اتر کر پان کی دکان پر پہنچے۔ پان والا شاید نوشاد صاحب کو پہچانتا تھا۔ اس نے کہا۔ "نوشاد بابو! اس مرتبہ آپ نے کافی دن میں یہاں کا پھیرا لگایا؟"

"ہاں بھائی، جب وقت ملتا ہے تو یہاں آجاتا ہوں بلکہ یوں کہو کہ جب مجھے یہاں کوئی کام ہوتا ہے تو یہاں کا چکر لگتا ہے۔"

وہیں ایک نابینا شخص بھی کھڑا تھا۔ اس نے ٹٹول کر نوشاد صاحب کے ہاتھ پکڑے اور انہیں چوم لیا پھر بے

اختیار اس کی آنکھوں سے اشک جاری ہوگئے۔

اس کے اس طرزِ عمل سے نوشاد بھی بہت متاثر ہوئے۔ نابینا شخص نے بتایا کہ ”میں نے آپ کی فلم اڑن کھٹولا بیسیوں مرتبہ دیکھی ہے۔“

”دیکھی ہے؟“ نوشاد صاحب نے حیرت سے پوچھا۔

”میں آپ کا صرف ایک گیت سننے کے لیے سینما جاتا تھا۔ دیکھ نہیں سکتا لیکن سن تو سکتا ہوں۔ اگر وہ فلم آج بھی ریلیز ہو تو میں اسے پھر دیکھوں گا۔“

”وہ گیت کون سا ہے بھائی؟“ نوشاد نے پوچھا۔

”وہ امر گیت ہے، او دور کے مسافر ہم کو بھی ساتھ لے لے۔“ اس گیت کی موسیقی میں ایسا سحر ہے اور محمد رفیع صاحب کی آواز میں ایسا سوز ہے کہ میں جب بھی یہ گیت سنتا ہوں رونے لگتا ہوں۔“

یہ سن کر رویندر جین اپنی جگہ سے اٹھا اور اس نے بھی نوشاد صاحب کے ہاتھ چوم لیے۔ اس کی آنکھوں سے بھی آنسو جاری تھے۔ اس نے روتے ہوئے بتایا کہ لڑکپن میں مجھے اس گیت نے بہت رلایا ہے۔ بیجو باورا، میں آپ کے کمپوز کیے ہوئے لازوال بھجن ”دنیا کے رکھوالے“ کے بعد مجھے یہ گیت سب سے زیادہ پسند ہے۔ میں نے سنا ہے کہ آپ نے اس گانے میں کچھ نئے تجربات بھی کیے تھے؟

نوشاد صاحب نے بتایا کہ اس دور میں یہ سہولیات تو میسر نہیں تھیں جو آج ہیں۔ نہ اس دور میں ساؤنڈ پروف اسٹوڈیو تھے، نہ (Echo) کا کوئی بندوبست تھا۔ نہ اس دور میں کی بورڈ سے اپنے مطلب کی آوازیں نکالی جاسکتی تھیں۔ میں نے اسٹوڈیو کو ساؤنڈ پروف بنانے کے لیے اس کے دروازوں اور دیواروں پر موٹی روئی کے بے شمار گولے ڈال دیے تھے تاکہ آواز کی گونج باہر نہ جائے اس کے علاوہ میں نے رفیع صاحب کے ساتھ بیک گراؤنڈ میں کچھ الیہ آوازوں کا استعمال بھی کیا تھا۔ بھارت میں پہلی دفعہ میں نے ہی یہ تجربہ کیا اور کامیاب رہا۔

نوشاد صاحب کا کہنا بالکل درست ہے۔ آج تو محض ایک کی بورڈ سے نہ صرف مختلف سازوں طبلہ، شہنائی، ہارمونیم وغیرہ کی آوازیں نکالی جاسکتی ہیں بلکہ مختلف ساؤنڈ افیکٹس مثلاً خوف ناک چیخیں، ہنسی اور دیگر۔۔۔ آوازیں، اور بارش کے قطروں کی آوازیں بھی نکالی جاسکتی ہیں۔

رویندر جین کے عروج کے دور میں لتا منگیشکر اور محمد رفیع کے درمیان کشیدگی تھی۔ دونوں ایک دوسرے کے ساتھ نہیں گاتے تھے۔

رویندر جین چاہتا تھا کہ بھارت کے دو مہان فنکار پھر ایک مرتبہ ایک ساتھ اپنے فن کا جادو جگائیں۔ اس نے اس سلسلے میں کئی دفعہ کوشش بھی کی۔ اس نے اپنے فلم سازوں سے کہا کہ میں اپنی فلم میں لتا جی اور رفیع صاحب کے فن سے فائدہ اٹھانا چاہتا ہوں۔ ہر فلم ساز نے اس سے یہ ہی کہا کہ اس سے قبل بھی کئی میوزک ڈائریکٹر یہ کوشش کرچکے ہیں۔ کئی فلم ساز بھی ان دونوں فن کاروں سے بات کرچکے ہیں لیکن بات نہیں بنی۔ آپ بھی بے شک کوشش کرکے دیکھ لیں۔

اس سلسلے میں پہلے وہ لتا منگیشکر سے ملا۔ وہ لتا جی سے بہت جونیئر تھا اور ان کے گانے سن کر جوان ہوا تھا لیکن وہ رویندر جین کے فن کی قدر دان تھیں۔ رویندر جین نے جب ان سے کہا کہ میں اپنی نئی فلم میں آپ سے گانا گوانا چاہتا ہوں تو لتا جی مسکرا کر بولیں۔ ”رویندر! میں جانتی ہوں کہ تم بہت اچھے میوزک ڈائریکٹر ہو۔ میں تم پر بھروسا کرسکتی ہوں۔ تم جتنے گانے کہو گے میں گاؤں گی۔“

رویندر نے ڈرتے ڈرتے کہا۔ ”لتا جی! ان میں ڈوئٹ (دوگانے) بھی شامل ہیں۔“

لتا منگیشکر نے ہنس کر کہا۔ ”مجھے تم پر اعتماد ہے۔ تم کسی ایسے مرد گلوکار سے گانا نہیں گوا سکتے جو میرا ساتھ نہ دے سکے۔“

اب رویندر جین نے اپنا اصل مدعا بیان کیا۔ ”لتا جی! میں چاہتا ہوں کہ آپ...... رفیع صاحب کے ساتھ گا گائیں۔“

لتا منگیشکر ایک دم خاموش ہوگئیں پھر سنجیدگی سے بولیں۔ ”رویندر! رفیع صاحب مہان فنکار ہیں۔ میں نے ان کے ساتھ بے شمار دوگانے گائے ہیں۔ ہم دونوں میں گانے کے دوران میں کبھی اختلاف نہیں ہوتا۔ نہ ہی زیادہ ری ٹیک دینا پڑتے ہیں۔ رفیع صاحب سروں کے بادشاہ ہیں لیکن یہاں سوال اصولوں کا ہے۔“

”لتا جی!“ رویندر نے کہا۔ ”کیا فن کے لیے آپ اتنا کمپرومائز نہیں کرسکتیں؟“

لتا منگیشکر نے اسے بہت خوب صورتی سے ٹال دیا۔ لتا منگیشکر اس کی جگہ کوئی اور میوزک ڈائریکٹر ہوتا تو اچھی خاصی جھاڑ پلا دیتیں۔ اس وقت بلکہ آج بھی موسیقی کی دنیا میں ان کے نام کا سکہ چلتا ہے۔ ان کی وجہ سے بے شمار موسیقار بامِ عروج پر پہنچے ہیں۔

رویندر جین نے ہمت نہ ہاری، وہ محمد رفیع سے ملا۔ اس کا خیال تھا کہ ایک دفعہ میں محمد رفیع کو راضی کرلوں تو لتا منگیشکر بھی راضی ہوجائیں گی۔ یہ اصولوں کی نہیں بلکہ انا کی جنگ تھی۔

محمد رفیع صاحب بھی رویندر جین کے فن کے بہت بڑے قدر دان تھے۔ اس سے قبل بھی وہ رویندر جین کی موسیقی میں ”ایک ڈال پر توتا بولے، ایک ڈال پر مینا“ جیسا امر گیت گا چکے تھے۔

اس کی بات سن کر رفیع صاحب نے ہنس کر کہا۔ ”لتا منگیشکر بہت عظیم گلوکارہ ہیں۔ میں ان کے فن کی قدر کرتا ہوں لیکن انکار انہوں نے کیا تھا، میں نے نہیں۔ میں آج بھی انہیں اپنی بہن سمجھتا ہوں۔ اگر وہ راضی ہیں تو مجھے ان کے ساتھ گانے میں کوئی اعتراض نہیں ہے۔ میں محض اپنی انا کی خاطر فن کی ناقدری نہیں کرسکتا۔ ہاں تمہاری جگہ کوئی دوسرا میوزک ڈائریکٹر ہوتا تو میں صاف انکار کردیتا۔“

اب سوال تھا لتا منگیشکر کو منانے کا۔ وہ اسے بہت خوب صورتی سے ٹال چکی تھیں۔ اب وہ ان کے پاس جاتا تو ممکن ہے وہ اسے بے عزت بھی کردیتیں۔

اس کے ذہن میں کئی نام آئے نوشاد، کلیان جی آنند جی، دلیپ کمار یہ سب لوگ لتا منگیشکر سے بہت قریبی تعلقات رکھتے تھے۔ رویندر جین کو یقین تھا کہ اگر ان میں سے کسی نے لتا منگیشکر سے کہہ دیا تو وہ اپنی ضد چھوڑ دیں گی۔

لتا منگیشکر کی اس انا اور ہٹ دھرمی سے سب سے زیادہ فائدہ کشور کمار کو ہوا۔ انہیں بہت سے وہ گانے بھی مل گئے جو محمد رفیع صاحب گاتے تو زیادہ بہتر طریقے سے گاتے۔ ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے یہ بھارتی فلم انڈسٹری کی سوچی سمجھی چال تھی کہ لتا اور محمد رفیع صاحب کے تنازعے کو خوب ہوا دی جائے تاکہ ایک مسلمان گلوکار جو برسوں سے ان کے سینوں پر مونگ دل رہا ہے، وہ گمنامی کے اندھیروں میں کھو جائے۔

رویندر جین سچا فنکار تھا۔ وہ فن کو کسی مذہب کی [illegible] نہیں سمجھتا تھا۔ اسی لیے وہ لتا منگیشکر اور رفیع صاحب کو دوبارہ یک جا کرنے کا خواہش مند تھا۔ اس نے پہلے نوشاد صاحب سے اس سلسلے میں بات کی۔ انہوں نے وعدہ کیا کہ میں اس سلسلے میں لتا سے ضرور بات کروں گا پھر رویندر جین نے بھارت کے سپر اسٹار دلیپ کمار سے بات کی۔ رویندر جین کو یقین تھا کہ لتا منگیشکر دلیپ کمار کی بات ضرور مانیں گی۔ دلیپ کمار خود بھی یہ ہی چاہتے تھے کہ لتا منگیشکر اور رفیع صاحب ایک بار پھر اپنی آوازوں کا جادو جگائیں۔

اس سے پہلے کہ وہ اس سلسلے میں کوئی پیش رفت کرتے۔ محمد رفیع صاحب اس دنیا سے رخصت ہوگئے اور بھارتی فلم انڈسٹری ایک عظیم گلوکار سے محروم ہوگئی۔

اس کا سب سے زیادہ صدمہ نوشاد کو تھا۔ اس کے بعد رویندر جین کو صدمہ پہنچا تھا کہ وہ لتا منگیشکر اور رفیع صاحب کو یک جا کرنے میں کامیاب ہونے ہی والا تھا کہ موت نے رفیع صاحب کو اتنی مہلت ہی نہ دی۔ رویندر جین کو آج بھی اس بات کا قلق ہے۔ یوں اس کی یہ خواہش، خواہش ہی رہی۔

رویندر جین پاکستان کے عظیم گلوکاروں مہدی حسن، ملکۂ ترنم نور جہاں اور غلام علی کا دیوانہ تھا۔

وہ فن کا سچا قدر دان تھا اس لیے مہدی حسن صاحب اور ملکۂ ترنم کو تو پوجنے کی حد تک چاہتا تھا۔ اس کی یہ خواہش بھی تھی کہ ملکۂ ترنم اور مہدی حسن خاں صاحب اس کی فلموں کے لیے گائیں۔

مہدی حسن صاحب کے دورۂ بھارت کے دوران رویندر جین ان سے ملا اور درخواست کی کہ ”اگر آپ صرف ایک گانا میرے لیے بھی گادیں تو آپ کا مجھ پر بہت احسان ہوگا۔“

مہدی حسن صاحب ان دنوں پاکستان میں بہت مصروف تھے۔ انہوں نے اپنی مصروفیت کو آڑ بنا کر رویندر جین کو بہت خوب صورتی سے ٹال دیا۔

ملکۂ ترنم نور جہاں کے سلسلے میں بھی یہ ہی کچھ ہوا۔ وہ ملکۂ ترنم سے ملا اور اپنا تعارف کروایا۔

نور جہاں نے ہنس کر کہا۔ ”رویندر جی میں آپ کے نام کو بہت بہت اچھی طرح جانتی ہوں اور کام کو بھی، اس لیے تعارف کروانے کی ضرورت نہیں ہے۔“

رویندر جین نے اس سے بھی براہ راست گانے کی خواہش نہیں کی بلکہ لتا منگیشکر اور دلیپ کمار سے اس کا ذکر کیا۔

دونوں نے رویندر کو سمجھایا کہ نور جہاں جی کبھی اس

کے لیے راضی نہیں ہوں گی۔ اگر انہیں ہمارے ملک کے لیے گانا بھی ہوتا تو وہ بھارت چھوڑتی ہی کیوں؟

ملکۂ ترنم نور جہاں نے عین اس وقت بھارت چھوڑ کر پاکستان آنے کا فیصلہ کیا تھا جب وہ ترقی کی سیڑھیاں بہت تیز رفتاری سے طے کررہی تھیں۔ اگر وہ بھارت میں رہ جاتیں تو بہ قول لتا منگیشکر بھارت کی سب سے بڑی گلوکارہ ہوتیں۔ ہم نے بھی نور جہاں سے بہت کچھ سیکھا ہے۔ موسیقار نوشاد کا بھی یہی خیال تھا کہ نور جہاں نے اس وقت بھارت کو خیر باد کہا جب اس کے مد مقابل کوئی دوسری گلوکارہ نہیں تھی۔ شمشاد بیگم کا دوران دنوں اختتام پذیر ہورہا تھا۔ نور جہاں نے بھارت چھوڑ کر گویا لتا منگیشکر کے لیے میدان خالی کردیا۔ یہ تو ملکۂ ترنم نور جہاں کی حب الوطنی تھی کہ انہوں نے پاکستان آنے کا فیصلہ کیا۔

بات ہورہی تھی رویندر جین کی کہ اس نے ملکۂ ترنم نور جہاں اور مہدی حسن صاحب کو منانے کے لیے کیا کیا جتن کیے لیکن لتا منگیشکر اور رفیع صاحب کو یک جا کرنے کی خواہش میں ناکام ہونے کے بعد وہ ان دونوں گلوکاروں کے سلسلے میں بھی ناکام رہا۔

رویندر نے جب سے اپنی فلمی زندگی کا آغاز کیا ہے، کامیابیاں ہی سمیٹی ہیں۔ اسے ان ناکامیوں پر آج بھی قلق ہے۔ رویندر جین پاکستان کے معروف میوزک ڈائریکٹر خواجہ خورشید انور اور رشید عطرے کا بھی بہت احترام کرتا ہے اور ان کی بنائی ہوئی لازوال دھنوں کا دیوانہ ہے۔ خواجہ صاحب سے تو وہ خاص طور پر متاثر ہے۔

ان کے علاوہ اسے استاد بڑے غلام علی، استاد چھوٹے غلام علی، استاد نصرت فتح علی اور استاد امانت علی سے بھی بہت عقیدت ہے۔

بھجن کے میدان میں اس وقت پورے بھارت میں اس کا کوئی ثانی نہیں ہے۔ اس کے بھجن بھارت میں انتہائی مقبول و معروف ہیں لیکن ہندومت کا ہونے کے باوجود اسے خواجہ معین الدین چشتیؒ سے عقیدت ہے اور اس نے دل کی تمام تر گہرائیوں سے کئی قوالیاں بھی کمپوز کی ہیں۔

اس نے اپنی زندگی میں لاتعداد ایوارڈز حاصل کیے۔ ان میں لتا منگیشکر ایوارڈ، اتر پردیش پتر کار سنگر ایوارڈ اور فلم فیئر ایوارڈ سمیت مختلف ایوارڈز شامل ہیں۔ بھارت کے صدر اور صوبے کے گورنر کے علاوہ بھارتی وزیر اعظم نے بھی مختلف موقعوں پر اس کی پذیرائی کی ہے۔

اس نے اپنے فن سے نہ صرف بھارت کے شائقین کو محظوظ کیا ہے بلکہ برطانیہ، کینیڈا، جرمنی، ساؤتھ افریقا اور مشرق وسطیٰ کے کئی ممالک میں اپنے فن کا لوہا منوایا ہے۔

جب اس سے پوچھا گیا کہ اسے ہالی ووڈ کی کسی فلم میں میوزک کمپوز کرنے کا چانس ملا تو کیا وہ اس سے فائدہ اٹھائے گا؟

رویندر جین نے جواب دیا کہ جس طرح ہوا کے جھونکوں، پرندوں، سورج اور چاند کی کرنوں کا کوئی وطن، کوئی دیش، کوئی مسکن نہیں ہوتا اسی طرح فن کا بھی کوئی دیش نہیں ہوتا۔ فن نہ ہندو ہوتا ہے نہ مسلمان۔ نہ بھارتی ہوتا ہے نہ پاکستانی، نہ انگریز۔ فن صرف فن ہوتا ہے اور اگر مجھے ہالی ووڈ سے ایسی کوئی آفر موصول ہوئی تو میں وہاں ضرور جاؤں گا۔

رویندر جین کی کامیابیوں کا سفر ابھی جاری ہے۔ افسوس کہ اس کے پتاجی پنڈت اندر منی جین عروج کے اس دور میں اسے نہ دیکھ سکے۔ وہ رویندر جین کے مستقبل کی طرف سے بہت زیادہ فکر مند تھے۔ اب اگر وہ زندہ ہوتے تو اپنے اس ہونہار بیٹے پر فخر کرتے جس نے بینائی سے محروم ہونے کے باوجود ان کے تمام آنکھیں رکھنے والے بچوں کو پیچھے چھوڑ دیا۔

اس نے اپنے بیٹے آیوش جین کو موسیقی کی بہترین تعلیم دی ہے۔ اسے آیوش سے بہت سی امیدیں وابستہ ہیں۔ رویندر جین اب خود ایک اکیڈمی چلا رہا ہے جس میں وہ نو آموز بچوں کو کلاسیکی اور نیم کلاسیکی موسیقی کی تعلیم دیتا ہے۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ اس کا بیٹا آیوش جین اس کی امیدوں پر پورا اترتا ہے یا نہیں؟

آخر میں یہی کہنا ضروری ہے کہ اس کی ان تمام کامیابیوں میں اس کی بیوی دیویا جین کا بہت ہاتھ ہے۔ اس نے رویندر کو کبھی گھریلو پریشانیوں میں نہیں الجھایا اور اسے کام کرنے کا بھرپور موقع دیا۔

رویندر جین نے ثابت کردیا ہے کہ بصارت سے محروم افراد بھی وہ کارنامے انجام دے سکتے ہیں جو آنکھیں رکھنے والے انجام نہیں دے سکتے۔ اس موقع پر پروفیسر اقبال عظیم کا ایک شعر یاد آرہا ہے۔ (پروفیسر صاحب کی بینائی رفتہ رفتہ ختم ہوئی تھی)

مجھے ملال نہیں اپنی کم نگاہی کا
جو دیدہ ور ہیں انہیں بھی نظر نہیں آتا

جنگِ عظیم دوم کے وقت ظلم وجبر کے لاتعداد قصوں نے جنم لیا۔ جنگی قیدیوں کے کیمپ میں دشمن کے سپاہیوں پر کیسے کیسے مظالم توڑے جاتے تھے اس کی ہزاروں روداد منظرِ عام پر آئیں لیکن زیرِنظر واقعہ سب سے الگ اور انفرادیت کا حامل ہے۔ جاپانی فوجیوں نے انسانی جانوں کو تجربے کی بھینٹ چڑھانے کا کیسا انتظام کیا تھا کہ کئی دہائی گزرنے کے بعد بھی اس کیمپ کے قیدی اسے بھول نہیں پائے ہیں۔

جاپانی قید سے فرار کی ایک رونگٹے کھڑے کردینے والی روداد

2 مئی 1942ء کے دن میں خوش بھی تھا اور افسردہ بھی۔ خوش اس لیے کہ مجھے اپنے مادرِ وطن کی خدمت کا موقع مل رہا تھا۔ اس دن ہماری کمپنی محاذِ جنگ کی طرف روانہ ہو رہی تھی اور مجھے اپنے بیوی اور بچے سے بچھڑنے کا دکھ تھا۔ مرینا بار بار رو رہی تھی اور پھر مجھے حوصلہ دلانے کے لیے جلدی سے مسکرانے لگتی۔ خود میں بھی اپنے آنسو چھپا رہا تھا۔ ننھا آرتھر اس سے بے نیاز کہ اس کا باپ ایک ایسے سفر پر جا رہا ہے جس سے واپسی کی امید بہت کم تھی، آس پاس کی

رونق اور لوگوں کو دیکھ رہا تھا۔ دوسرے فوجیوں کی بیویاں اور اہل خانہ انہیں رخصت کرنے آئے تھے۔ ہماری کمپنی ایک بحری جہاز کے ذریعے انڈونیشیا کے جنوب مغربی جزیرے سلوویسی کی طرف جا رہی تھی۔ اس جزیرے کے شمال میں واقع صوبے گورونٹالو پر جاپانی قابض ہو چکے تھے۔ لیکن جنوبی حصہ آزاد تھا۔ انڈونیشیا کے دوسرے جزائر کی طرح سلوویسی بھی آتش فشانی عمل سے بنا تھا۔ پورا جزیرہ بے پناہ گھنے جنگلات اور اونچے نیچے پہاڑوں پر مشتمل تھا۔ یہاں ہموار زمین کم تھی اس لیے آبادی بھی جاوا یا سماٹرا کے جزیروں کے مقابلے میں بہت کم تھی۔

چھ مہینے پہلے پرل ہاربر پر جاپانی حملے نے ایشیا میں اس کے عزائم واضح کر دیئے تھے۔ اس لیے آسٹریلین حکومت نے ایشیا کی جنگ میں بھی شامل ہونے کا فیصلہ کیا۔ جاپانی بہت تیزی سے مغربی کالونیوں میں پیش قدمی کر رہے تھے۔ انہوں نے دیکھتے ہی دیکھتے چین کے بڑے حصے سمیت مشرق بعید کے بیشتر ملکوں پر قبضہ کر لیا تھا پھر وہ جنوب کی طرف بڑھے، سقوط سنگاپور نے صحیح معنوں میں خطرے کی گھنٹی بجائی۔ ملائیشیا، انڈونیشیا پر جاپانیوں کے قدم جم چکے تھے اور اب پاپوانیوگنی اور آسٹریلیا زیادہ دور نہیں رہ گئے تھے۔ جاپانیوں کی پیش قدمی روکنا بہت ضروری ہو گیا تھا۔ اسی لیے ہمارے دستے کو روانہ کیا جا رہا تھا۔ بحری جہاز کی روانگی کا وقت قریب تھا اس لیے سب جلدی جلدی اپنے پیاروں سے مل کر جہاز میں سوار ہونے لگے۔ پرنس نامی یہ بحری جہاز مال بردار تھا لیکن جنگ کے لیے آسٹریلین حکومت نے اسے کرائے پر حاصل کر لیا تھا اور اب یہ سپاہ اور اسلحے کی باربرداری کے کام آ رہا تھا۔ کیونکہ یہ جنگی بحری جہاز نہیں تھا اس لیے اس کی حفاظت کے لیے ایک فری گیٹ جنگی جہاز ساتھ تھا۔

میرا نام ولیم برینٹ ہے اور میرا تعلق جنوبی آسٹریلیا کے ایک چھوٹے سے گاؤں وٹنی پیلا سے ہے۔ دو سال پہلے میں نے آسٹریلین فوج میں شمولیت اختیار کی اور ان ہی دنوں مرینا سے شادی کی۔ اب ہمارا ایک بیٹا بھی تھا۔ ان دنوں دوسری جنگ عظیم عروج پر تھی اور مجھے لگ رہا تھا کہ جلد یا بدیر میرے یونٹ کو بھی روانگی کا حکم ملے گا اور ایسا ہی ہوا۔ کچھ دیر بعد ہم سڈنی کی بندرگاہ سے روانہ ہوئے۔ میں اس وقت تک عرشے پر کھڑا رہا جب تک مجھے بندرگاہ اور زمین نظر آتی رہی تھی۔ سپاہیوں کو جہاز کے عرشے اور درمیانی حصے پر جگہ ملی تھی۔ جنگی ساز و سامان کو سب سے نچلے حصے میں رکھا گیا تھا تاکہ کسی فضائی حملے کی صورت میں وہ محفوظ رہے۔ جیسے ہی ہم شمال کی طرف مڑے سب کے اعصاب تن گئے تھے کیونکہ سننے میں یہ آ رہا تھا کہ جاپانی نیوی اور اس کی آبدوزیں یہاں تک سرگرم عمل ہیں۔ جیسے جیسے شمال کی طرف جا رہے تھے حملے کے خطرات بڑھتے جا رہے تھے۔ 7 مئی کی رات ہم سب سو رہے تھے۔ دو بجے کا وقت تھا کہ اچانک بحری جہاز لرز اٹھا۔ فوراً ہی شدید دھماکے نے سب کو بیدار کر دیا۔ ابھی ہم بستروں سے اٹھے تھے کہ جہاز آگے کی طرف جھکنے لگا۔ کوئی چلایا۔ ”تارپیڈو..... ہم تارپیڈو کا شکار ہو گئے ہیں۔“

خطرے کا سائرن چلانے لگا اور سب افراتفری میں عرشے کی طرف بھاگے جہاں امدادی کشتیاں تھیں۔ جب ہم اوپر آئے تو پتا چلا کہ جنگی جہاز بھی نشانہ بن گیا تھا درحقیقت پہلے اسے نشانہ بنایا گیا تھا اور وہ اب ڈوب رہا تھا۔ پرنس بڑا جہاز تھا اس لیے اسے ڈوبنے میں وقت لگ رہا تھا جب کہ جنگی جہاز دیکھتے ہی دیکھتے ڈوب گیا تھا۔ اس پر موجود دو امدادی کشتیاں ہی اتر پائی تھیں اور بچ جانے والے افراد نے سمندر میں چھلانگ لگا دی تھی۔ پرنس سے کشتیاں اتاری جا رہی تھیں۔ دشمن کا کوئی بحری جہاز آس پاس نہیں تھا۔ چھٹکتی چاندنی میں سمندر دور تک واضح تھا۔ اس کا مطلب تھا کہ حملہ آبدوز نے کیا ہے۔ پرنس میں صرف ایک درجن امدادی کشتیاں تھیں اور ایک ہزار سے زیادہ افراد تھے۔ ایک کشتی میں تیس سے زیادہ افراد نہیں آ سکتے تھے۔ اس لیے پہلے جگہ حاصل کرنے کے لیے دھکم پیل ہو رہی تھی۔ میں نے لائف جیکٹ پہن لی تھی۔ ابھی آدھی کشتیاں بھی نہیں اتری تھیں کہ بحری جہاز زیادہ تیزی سے جھکنے لگا اور لوگ سمندر میں چھلانگ لگانے لگے۔

میں بھی ریلنگ پر چڑھا اور نیچے کود گیا۔ چاروں طرف شور برپا تھا۔ جو کود گئے تھے وہ مدد کے لیے چلا رہے تھے۔ جو ابھی بحری جہاز پر تھے وہ بھی موت کے خوف سے حواس کھو بیٹھے تھے۔ جو کشتیاں اتار دی گئی تھیں ان میں گنجائش سے زیادہ لوگ سوار تھے اور وہ ڈوبتے بحری جہاز سے دور جانے کی کوشش کر رہی تھیں۔ جو لوگ سمندر میں تھے وہ بھی دور جا رہے تھے۔ خوف تھا کہ ڈوبتا بحری جہاز جو بھنور پیدا کرتا ہے کہیں کشتیوں اور افراد کو کھینچ کر زیر آب نہ لے جائے۔ سارے کودنے والوں نے لائف جیکٹ بھی نہیں پہنی تھی وہ چند گھنٹے سے زیادہ نہیں تیر سکتے تھے۔ اب بحری جہاز میں موجود لوگ لکڑی کے تختے اور بلیاں پھینک رہے تھے تاکہ ان کی مدد سے جان بچائی جا سکے۔ ابھی میں بحری جہاز سے سو گز دور گیا تھا کہ وہ ایک مہیب سی آواز نکالتا ہوا پانی میں چلا گیا اور سمندر پر ایک بڑا بھنور نمودار ہوا جو آس پاس کی چیزوں کو کھینچنے لگا۔ میں بھی کھنچ رہا تھا اور جان بچانے کے لیے دیوانہ وار ہاتھ پاؤں چلا رہا تھا۔

نہ جانے کیسے میں بھنور میں جانے سے بچا اور جب بھنور ختم ہوا تو میں نے تھک کر ہاتھ پاؤں ڈال دیئے تھے۔ اس وقت میرے بہت سے ساتھی زیر آب جا چکے تھے اور وہ دوبارہ نہیں ابھرے تھے۔ کئی کشتیاں بھی بھنور کی نظر ہو گئی تھیں۔ دو گھنٹے بعد سمندر پر میرے آس پاس سوائے چند زندہ ساتھیوں کے اور کوئی نہیں تھا۔ ہم پاس آ گئے۔ ان میں سے دو میرے گروپ کے تھے۔ ایک لیفٹیننٹ جان اور دوسرا سارجنٹ ایڈم باقی افراد دوسرے گروپس سے تعلق رکھتے تھے۔ ان میں سے ایک نے انکشاف کیا کہ ڈوبنے سے پہلے بحری جہاز کے ریڈیو سے مدد کا سگنل بھیج دیا تھا۔ یہ سن کر ہم سب پُرامید ہو گئے کہ جلد یا بدیر مدد آئے گی۔ مگر جان نے یہ کہہ کر سب کو متفکر کر دیا کہ یہاں جاپانی آبدوز موجود تھی اور اس کے ہوتے ہوئے کوئی بحری جہاز یہاں قدم رکھنا پسند نہیں کرے گا۔ ہم آبدوز کو تو بھول ہی گئے تھے۔

”میرا خیال ہے جاپانی آبدوز ہم پر نظر رکھے ہوئے ہے اسے معلوم ہے ہمارے لیے مدد آئے گی اور وہ پھر حملہ کرے گی۔“

مجھے پہلی بار جاپانیوں کی جنگی مہارت دیکھنے کا موقع ملا تھا اور یہ بڑا بھیانک منظر تھا۔ دو بحری جہاز جو تقریباً چودہ سو افراد کے ساتھ تھے ایک گھنٹے کے اندر ڈوب گئے تھے اور بہت کم افراد جان بچانے میں کامیاب ہو سکے تھے۔ وقت گزرتا رہا اور صبح نمودار ہوئی تو ہم نے ایک امدادی کشتی کو قریب ہی پایا۔ لیکن اس پر پہلے ہی پینتیس افراد سوار تھے اور مزید کی بالکل گنجائش نہیں تھی اس لیے ہم اس کے ساتھ ساتھ تیرنے لگے۔ کشتی پر پانی اور خوراک کا محدود ذخیرہ تھا جو مدد آنے تک ہمیں زندہ رکھتا۔ کشتی دیکھ کر آس پاس کے بچ جانے والے بھی اس طرف کا رخ کر رہے تھے اور ایک اچھی بات ہوئی کہ کشتی میں اضافی لائف جیکٹس تھیں۔ جن کے پاس لائف جیکٹس نہیں تھیں اور وہ تھک گئے تھے ان کے لیے یہ جیکٹس زندگی کی نئی امید لائی تھیں۔ اب کشتی کے آس پاس تقریباً پچاس افراد تیر رہے تھے۔ کشتی پر میجر فرینکی موجود تھا۔ وہ سب سے سینئر رینک کا آدمی تھا اس لیے وہی اس وقت کمانڈر تھا۔ کسی نے اس سے سوال کیا۔

”اگر اتحادیوں سے پہلے جاپانی آ گئے تو.....“

”تب ہمیں سرینڈر کرنا ہو گا۔“ میجر فرینکی نے کہا۔ ”ہم مقابلہ کرنے کی پوزیشن میں نہیں ہیں۔“

چند افراد کے پاس ان کی رائفلیں اور دوسرے ہتھیار تھے لیکن وہ سب بیکار تھے۔ میجر فرینکی نے حکم دیا کہ جاپانیوں کے آنے کی صورت میں یہ ہتھیار سمندر میں پھینک دیئے جائیں۔ ہم مدد کے انتظار میں شام تک تیرتے رہے اور سب کا برا حال ہو گیا تھا۔ اب ہم جاپانیوں کی قید میں جانے کے لیے بھی تیار تھے۔ مگر جاپانیوں کا بھی نام و نشان نہیں تھا۔ تیرنے والوں نے درخواست کی انہیں کچھ دیر کے لیے کشتی میں آنے کا موقع دیا جائے اور دوسرے افراد ذرا تیراکی کر لیں مگر میجر فرینکی نے یہ درخواست مسترد کر دی اس نے کہا۔ ”اس سے انتشار پھیلے گا اس لیے جو شخص جہاں ہے صبر سے وہیں رہے۔“

میرا خیال تھا وہ ٹھیک کہہ رہا تھا کیونکہ اول تو کوئی کشتی سے اترنے کو تیار نہ ہوتا اور دوسرے چند ایک راضی ہو جاتے تو اوپر جانے کے خواہش مند سب تھے۔ اس پر لازماً جھگڑا ہوتا۔ کسی کو نہیں معلوم تھا کہ ہم سمندر کے کس حصے میں تھے۔ میجر فرینکی کا خیال تھا کہ ہم پاپوانیوگنی کے اوپر بحیرۂ بسمارک کے آس پاس تھے۔ جاپانیوں کا حملہ بھی اس کی تصدیق کرتا تھا۔ سورج ڈوبنے کے وقت مغرب سے ایک کشتی نمودار ہوئی۔ یہ زیادہ بڑی نہیں تھی شاید سو فٹ لمبی اور دو سو ٹن وزنی تھی۔ سورج اس کے پیچھے تھا اس لیے شروع میں تو ہمیں پتا ہی نہیں چلا کہ کشتی کس کی ہے اور ہم دھڑکتے دل کے ساتھ اس کے نزدیک آنے کا انتظار کر رہے تھے پھر روشنی نے اس پر لہراتے سفید رنگ کے سورج والے پرچم کو نمایاں کیا تو ہمارے دل ڈوب گئے تھے۔ وہ جاپانی تھے۔ یہ جانتے ہی سب نے عجلت میں اپنا اسلحہ سمندر میں پھینکنا شروع کر دیا۔ کشتی کی طرف سے کسی نے کڑک کر جاپانی میں کچھ کہا۔ ایک سپاہی جاپانی جانتا تھا اس نے کہا۔

”یہ ہمیں ہتھیار ڈال کر خود کو جاپانیوں کے حوالے کرنے کو کہہ رہے ہیں۔“

”ان سے کہو ہمارے پاس ہتھیار نہیں ہیں اور ہم سرینڈر کرتے ہیں۔“

سپاہی نے اپنی ٹوٹی پھوٹی جاپانی میں میجر کی بات دہرائی۔ اس پر کشتی قریب آئی۔ اس کے عرشے پر مسلح جاپانی کھڑے تھے۔ ہمیں خبردار کرنے کے لیے کہ کسی حرکت سے گریز کریں انہوں نے ایک ہوائی برسٹ مارا تھا۔ کچھ سپاہی خوف زدہ ہو گئے کہ شاید جاپانی ہمیں قتل کرنے والے ہیں۔ مگر ایسا نہیں تھا۔ آدھے گھنٹے میں ہمیں باری باری کشتی پر منتقل کیا گیا اور کشتی پر جاتے ہی ہمارے ہاتھ عقب میں کر کے باندھ دیئے جاتے تھے۔ ایک ایک کر کے ہم اسی افراد کو کشتی پر منتقل کیا گیا اور پھر ہماری مکمل تلاشی لے کر اور ہر چیز چھین کر ہمیں کشتی کے نیچے ایک تنگ خانے میں منتقل کر دیا گیا۔ اس کا سائز مشکل سے بارہ بائی پندرہ تھا اور جب ہم اسی افراد اس میں گئے تو ہمارے بیٹھنے کی جگہ بھی باقی نہیں رہی تھی۔ سب کھڑے رہنے پر مجبور تھے۔ باہر موسم خوشگوار تھا لیکن اندر کچھ ہی دیر میں اتنی گرمی ہو گئی کہ ہمارے جسموں سے پسینا پانی کی طرح بہنے لگا تھا۔ شکر ہے کہ اوپر جالی دار چھت تھی ورنہ یہ خانہ بند ہوتا تو دم گھٹنے سے سب مر جاتے۔ یہ کوئی انہونی نہیں تھی جاپانیوں اور جرمنوں نے بارہا قیدیوں کو بند گاڑیوں میں اس طرح بند کر کے منتقل کیا کہ وہ راستے میں دم گھٹنے سے ہلاک ہو گئے تھے۔

دم تو نہیں گھٹا لیکن پیاس سے سب کی جان لبوں پر آ گئی تھی اور جب جاپانی شناس سپاہی کے توسط سے سب نے شور مچایا تو بالآخر صبح کے قریب ہمیں ربر کی نلکی اور قیف کی مدد سے فی کس ایک ایک مگ جس میں مشکل سے تہائی لیٹرز پانی آتا تھا۔ اس سے پہلے چلا چلا کر ہمیں سیدھا اور ساکت کھڑے ہونے کا حکم دیا۔ اس کے بعد ایک جاپانی نلکی اندر کرتا اور جیسے ہی اسے منہ میں لیا جاتا دوسرا اگلے سے قیف میں پانی ڈالتا تھا۔ اتنے پانی سے پیاس تو نہیں بجھی تھی لیکن آسرا ہو گیا۔ ہمیں جس طرح سے رکھا گیا تھا لگ رہا تھا کہ ہمیں کسی قریبی جگہ پہنچایا جا رہا ہے۔ کشتی رات بھر سفر کرتی رہی تھی۔ اس کا انجن اس خانے کے پاس ہی تھا اور اس کا شور دماغ خراب کر رہا تھا۔ صبح سورج طلوع ہوئے کچھ دیر ہوئی تھی کہ کشتی رکی اور باہر شور سنائی دیا۔ شاید ہم کسی بندرگاہ پر پہنچ گئے تھے۔

ایک گھنٹے بعد خانہ کھلا اور ہمیں باری باری باہر آنے کا حکم ملا۔ خانے میں بند کرنے سے پہلے ہمارے ہاتھ کھول دیئے گئے تھے لیکن باہر آتے ہی دوبارہ ہمارے ہاتھ باندھ دیئے گئے۔ ہم ایک چھوٹی سی بندرگاہ پر تھے جس کے جھونپڑے نما دفتر پر جاپان کا پرچم لہرا رہا تھا۔ ساحل کی سفید ریت کے بعد بہت سرسبز ناریل اور پام کے درخت دکھائی دیئے۔ ہم کسی استوائی جزیرے پر لائے گئے تھے۔ یہاں گرمی بھی اچھی خاصی تھی بعد میں پتا چلا کہ یہ انڈونیشیا کا جزیرہ سلاویسی تھا اور ہم گورونٹالو صوبے میں تھے۔ یہاں جاپان کا قبضہ تھا۔

جیٹی سے اتر کر ریت پر تقریباً دوڑتے ہوئے ہم کوئی تین میل کے فاصلے پر ایک جنگی قیدی کیمپ تک پہنچے۔ جاپانی سپاہی مسلسل ہمیں بھگاتے رہے اور کوئی گر جاتا تو اسے ٹھڈے مار کر اٹھاتے تھے۔ بندھے ہاتھوں کے ساتھ بھاگنا نہایت مشکل کام تھا کیمپ کے چاروں طرف خار دار تار لگے تھے اور اندر بانس سے بنے احاطے تھے جن میں درجن درجن قیدیوں کو بھرا ہوا تھا۔ دس بائی دس کے ان احاطوں میں بہ مشکل بیٹھنے لیٹنے کی گنجائش تھی۔ لیکن ہمیں پہلے ایک میدان میں جمع کیا گیا اور زمین پر بٹھا دیا۔ ہمارے چاروں طرف جاپانی یوں رائفلیں تان کر کھڑے تھے جیسے حکم ملتے ہی فائر کھول دیں گے۔ کچھ دیر بعد ایک ادھیڑ عمر جاپانی کرنل وہاں آیا۔ اس نے شانِ بے نیازی سے ہمارا جائزہ لیا۔ اس کا ترجمان موجود تھا اس نے کڑک کر کچھ کہا اور ترجمان نے اس کا ترجمہ کیا۔

”تم لوگ اب جاپان کے قیدی ہو۔ اگر تم نے حکم مانا اور شرافت سے رہے تو تمہیں کوئی تکلیف نہیں ہوگی لیکن کسی نے ذرا بھی حکم عدولی کی یا گڑبڑ کی تو اس کے لیے کڑی سزائیں ہے۔ یہ سزائیں کیا ہیں؟ تم لوگ جلد جان لوگے۔“

یہ کرنل میگور تھا انا شی تھا۔ نہایت سفاک اور سنگ دل شخص تھا۔ اس کے حکم پر ہمیں بھی اسی طرح کے بانس سے بنے احاطوں میں قید کر دیا گیا۔ اس نے میجر فرینکی کی بات سننے سے انکار کر دیا تھا۔ میجر چاہتا تھا کہ اسے قیدیوں کا ترجمان اور سربراہ بنایا جائے جیسا کہ جنگی قیدی کیمپوں میں ہوتا ہے لیکن جلد ہمیں معلوم ہو گیا یہاں ایسا کوئی اصول نہیں تھا۔ کرنل میگور کا حکم ہی سب کچھ تھا۔ قیدیوں کے ساتھ جن میں اکثریت سفید فاموں کی تھی سخت سلوک کیا جاتا تھا۔ ہمیں دن میں دو بار ابلے چاول کھانے میں ملتے اور ہر بار قیدی آدھا لیٹر پانی دیا جاتا تھا۔ خوراک نہایت ناقص اور قلیل ہوتی تھی جس سے پیٹ بھرنا ناممکن تھا۔ دو دن میں سب کی حالت پتلی ہو گئی تھی۔ یہاں خوراک کی کمی نہیں تھی کیونکہ جاپانیوں نے پورے مقبوضہ علاقے کی خوراک کے ذخائر اپنے قبضے میں کر لیے تھے۔ خود جاپانی دل بھر کر کھاتے تھے۔ کرنل میگور کا دسترخوان دیکھنے والا ہوتا تھا اور قیدیوں کو صرف بدبودار چاول فراہم کیے جاتے تھے۔ یہ وہ چاول ہوتے تھے جو جاپانی نہیں کھاتے تھے۔

ہمیں صبح اور شام صرف ایک ایک گھنٹے کے لیے احاطے سے نکالا جاتا تھا۔ رفعِ حاجت کے کیمپ کے ایک حصے میں روز گڑھے کھودے جاتے تھے اور شام کو انہیں مٹی سے بھر کر بند کر دیا جاتا تھا تاکہ تعفن نہ پھیلے۔ یہ سارا کام قیدیوں سے لیا جاتا تھا۔ اس کے علاوہ کیمپ کی صفائی ستھرائی نئے احاطوں کی تعمیر اور پرانے احاطوں کی مرمت کا کام بھی ہمارے سپرد تھا۔ احاطوں کے بانس اوپر سے نوکیلے رکھے گئے تھے تاکہ ان پر چڑھ کر کوئی باہر نہ نکل سکے۔ ان کی بلندی بارہ فٹ سے زیادہ تھی۔ اگرچہ ایسی بیوقوفی کوئی نہ کرتا کیونکہ کیمپ کے اندر سو سے زیادہ مسلح جاپانی پہریدار موجود تھے اور قیدیوں کو خبردار کیا جاتا تھا کہ سوائے مخصوص اوقات کے اگر کوئی باہر نظر آیا تو اسے بلاتکلف شوٹ کر دیا جائے گا۔ کرنل میگور کی بتائی سزاؤں کا بھی جلد علم ہو گیا۔ کوئی قیدی اگر بیماری یا کمزوری کی وجہ سے بھی کسی حکم کی تعمیل نہ کر پاتا تو اسے سزا دی جاتی تھی۔ سب سے ہلکی سزا ٹکٹکی سے باندھ کر دس بید مارنے کی سزا تھی لیکن یہ دس بید قیدی کی پشت ادھیڑ دینے کے لیے کافی ہوتے تھے۔ سب سے ہولناک سزا سینے تک زمین میں دبا کر سارا دن دھوپ میں بھوکا پیاسا رکھا جاتا تھا۔ کئی قیدی ہمارے سامنے اس سزا کی وجہ سے زندگی ہار گئے۔ ایک سزا بچھو سے کٹوانا تھا۔ وہ بھی اس طرح کہ بچھو پیٹ پر رکھ کر اوپر سے ڈول الٹا کر کے رکھ دیا جاتا تھا۔ ایک منٹ تک ڈول رکھا جاتا اور اس دوران میں بچھو کئی بار اپنا ڈنک آزما چکا ہوتا تھا۔ آدمی مرتا تو نہیں تھا لیکن کئی دن تک شدید اذیت میں رہتا تھا۔

یہ صرف چند ایک سزائیں تھیں ورنہ کرنل میگور اور اس کے ماتحتوں کا دماغ اس معاملے میں شیطان سے کم نہیں تھا۔ وہ قیدیوں کو اذیت دینے کے نت نئے طریقے ایجاد کرتے رہتے تھے۔ اس کیمپ میں تقریباً ایک ہزار قیدی تھے۔ ہر دوسرے تیسرے ہفتے نئے قیدیوں کی آمد بھی جاری رہتی تھی اور کچھ قیدیوں کو یہاں سے منتقل کیا جاتا تھا لیکن ان قیدیوں کے بارے میں کبھی وضاحت نہیں کی جاتی تھی کہ انہیں کہاں لے جایا جا رہا ہے۔ پھر قیدی گروپ کی صورت میں نہیں بلکہ چن کر لے جائے جاتے تھے۔ جب قیدی منتقل کیے جانے ہوتے تھے اس سے ایک دن پہلے کوئی باہر کا شخص معائنے پر آتا اور وہ قیدیوں کا جائزہ لے کر چنتا اور اگلے روز ان قیدیوں کو کیمپ سے لے جایا جاتا تھا۔ ہم سمجھنے سے قاصر تھے کہ اس طرح قیدی چننے کا کیا مقصد ہو سکتا تھا؟ لیکن رفتہ رفتہ قیدیوں میں اس حوالے سے خوف پیدا ہو رہا تھا۔

ہمیں یہاں آئے ہوئے چھٹا مہینا تھا جب اسی طرح قیدیوں کو چنا گیا۔ آنے والا شخص..... کسی قدر طویل قامت جاپانی تھا۔ وہ مختلف احاطوں میں جا کر قیدی دیکھ رہا تھا اس کے ساتھ چار مسلح جاپانی گارڈز اور کرنل میگور کا نائب میجر یاکاشی بھی تھا۔ وہ ہمارے احاطے تک آئے۔ بانسوں کا دروازہ کھولا گیا اور طویل قامت جاپانی نے ہم سب کا معائنہ کیا پھر اس نے میجر یاکاشی کو متوجہ کر کے میری اور لیفٹیننٹ جان کی طرف اشارہ کیا۔ اس کے ساتھ ہی دروازہ بند کر دیا گیا۔ جان نے آہستہ سے مجھ سے کہا۔ ”انہوں نے ہمیں چن لیا ہے۔“

میں بھی فکرمند تھا۔ ”ہاں کل ہمیں یہاں سے لے جایا جائے گا۔“

اس سوال کا جواب میرے یا کسی کے پاس نہیں تھا کہ ہمیں کہاں لے جایا جاتا اور وہاں ہمارے ساتھ کیا ہونا تھا۔ قابلِ تشویش بات یہ تھی کہ آج تک جن لوگوں کو لے جایا گیا تھا ان میں سے کوئی بھی دوبارہ اس کیمپ میں واپس نہیں آیا۔ لیکن ہم مجبور تھے۔ اس جنگی قیدی کیمپ کا ماحول بالکل مختلف تھا۔ ہمیں یہاں سوال کرنے یا کسی بات پر احتجاج کرنے کی اجازت نہیں تھی۔ اگر کوئی ایسی جرأت کرتا تو اسے سزا ملتی تھی۔ اگلی صبح جب ہمیں رفع حاجت کے لیے نکالا گیا تو میں نے اور جان نے سب سے الوداعی ملاقات کی۔ ناشتے کے فوراً بعد ہمیں اور چنے جانے والے دوسرے افراد کو جمع کیا گیا۔ ہماری تعداد ایک درجن تھی۔ نصف درجن مسلح جاپانی سپاہیوں نے ہمیں گھیر کر پہلے ہمارے ہاتھ اور پیر اس طرح باندھے کہ ہم محدود حرکت کر سکتے تھے اور فرار کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ اسی طرح ہمیں کیمپ سے نکالا گیا اور پیدل چلاتے ہوئے بندرگاہ تک لائے۔ یہ دسمبر کی بارہ تاریخ تھی۔ جیٹی پر ایک درمیانے سائز کی بوٹ ہماری منتظر تھی۔ ہمیں اس پر سوار کرایا گیا اور عرشے کے نیچے خانے میں بند کر دیا۔ یہ بلندی کے لحاظ سے صرف چار فٹ اونچا تھا اس لیے ہم بیٹھنے پر مجبور تھے مگر جگہ خاصی تھی۔ بوٹ روانہ ہوئی۔

ہمیں جہاں رکھا گیا تھا وہ گورونٹالو صوبے کا صدر مقام مناڈو کے پاس کی ایک جگہ تھی۔ مناڈو اس علاقے میں جاپانی بحریہ اور بری فوج کا مرکز تھا۔ کشتی کا رخ مغرب کی طرف تھا، اس کا اندازہ سورج کی پوزیشن سے ہوا تھا۔ دوپہر تک سفر جاری رہا اور تقریباً چار گھنٹے بعد کشتی نے دوبارہ ساحل کا رخ کیا لیکن اب کشتی بہت سست روی سے چل رہی تھی۔ شاید یہاں چٹانیں تھیں جن کی وجہ سے رفتار سست رکھی گئی تھی۔ مزید ایک گھنٹے بعد کشتی کسی ساحل پر رکی۔ یہاں پرندوں کا شور تھا اور چٹانوں سے لہریں ٹکرانے کی آوازیں آرہی تھیں۔ اوپر جاپانی زور سے باتیں کررہے تھے۔ میں نے جان کی طرف دیکھا۔ کشتی ڈول رہی تھی کیونکہ لہروں میں زور تھا۔ میں نے کہا۔

"یہ کوئی باقاعدہ بندرگاہ یا جیٹی نہیں ہے۔"

"پھر ہمیں یہاں کیوں لایا گیا ہے؟"

"کچھ دیر میں سامنے آجائے گا۔" میں نے اوپر جھانکتے ہوئے کہا۔ ایک جاپانی عین ہمارے سروں پر کھڑا تھا۔ بالآخر اسی نے خانے کا جالی دار فولادی دروازہ کھولا اور ہمیں باہر آنے کا اشارہ کیا۔ ہم بہ مشکل توازن برقرار رکھتے ہوئے ایک ایک کرکے باہر آئے۔ کشتی ایک چھوٹی سی کھاڑی میں تھی اور یہاں ذرا سا ساحل تھا اس کے علاوہ چٹانیں تھیں جن کے اوپر پہاڑیاں بلند ہورہی تھیں اور یہ پہاڑیاں گھنے درختوں اور جھاڑیوں سے ڈھکی ہوئی تھیں۔ کشتی کے عرشے سے ساحل تک ایک تختہ لگایا گیا تھا اور جاپانی ہمیں اشارے سے اس پر چل کر ساحل پر اترنے کو کہہ رہے تھے۔ ہلتے تختے پر بندھے ہاتھ پیروں کے ساتھ یہ کرتب آسان نہیں تھا۔ ہم نے اشارے سے کہا کہ ہمیں کھولا جائے مگر جاپانی ہمیں کھولنے کے لیے تیار نہیں تھے۔ مجبوراً ہمیں اسی طرح تختے پر چل کر ساحل تک جانا پڑا۔

یہاں کچھ اور جاپانی فوجی پہلے سے موجود تھے۔ انہوں نے بازوؤں پر سفید پٹیاں باندھ رکھی تھیں۔ بوٹ والوں نے ہمیں ان کے سپرد کیا اور انہوں نے ہمیں ایک ہی رسی سے یوں باندھا کہ ہم میں سے کوئی اس سے الگ نہیں ہوسکتا تھا۔ اس کی وجہ جلد سامنے آگئی۔ بوٹ واپس چلی گئی اور ساحل پر موجود فوجی ہمیں لے کر آگے بڑھے۔ ذرا اوپر چڑھتے ہی نہایت گھنا جنگل شروع ہوگیا۔ یہاں نہ صرف بلند درخت تھے بلکہ استوائی پودے اتنی زیادہ تعداد میں تھے کہ انہوں نے راستہ نہیں چھوڑا تھا اور ہمیں ان کے درمیان سے گزرنا پڑ رہا تھا۔ آگے چلنے والے کو پیچھے چلنے والا نظر نہیں آرہا تھا اسی لیے جاپانیوں نے ہمیں رسی سے منسلک کیا تا کہ کوئی موقع پا کر فرار نہ ہوسکے۔ سایہ گھنا ہونے کے باوجود شدید گرمی تھی اور پسینا پانی کی طرح بہہ رہا تھا۔ سپاہیوں کے پاس پانی تھا لیکن وہ اس میں سے ایک گھونٹ ہمیں دینے کو تیار نہیں تھے۔ ہمیں پیاسا ہی سفر کرنا پڑا۔

ہم ساحل کے ساتھ ساتھ متوازی بلندی کی طرف جا رہے تھے۔ میں اب تک سمجھنے سے قاصر تھا کہ جاپانی ہمیں کہاں لے جارہے تھے۔ اس قدر دشوار گزار علاقے میں کسی کیمپ کا بنانا مشکل تھا اور خود جاپانیوں کے لیے اس میں رسد سمیت بہت سی مشکلات تھیں۔ دو گھنٹے کے سفر کے بعد ہم بلندی پر آگئے تھے۔ یہاں موسم کسی قدر بہتر تھا۔ درخت بڑے تھے اور ان کے درمیان فاصلہ تھا۔ اچانک ہی ہم ایک کچی سڑک پر جا نکلے جس سے یقینی طور پر ٹرانسپورٹ گزرتی تھی کیونکہ زمین پر ٹائروں کے نشانات تھے۔ اب ہم اس کچی سڑک پر سفر کررہے تھے۔ مزید آدھے گھنٹے بعد ہم ایک پہاڑی غار کے دہانے تک پہنچے جو ایک چھوٹی سی پہاڑی کی جڑ میں تھا اور اس پر جاپانی گارڈز کا پہرا تھا۔ باہر چند ٹرک اور دوسری گاڑیاں کھڑی تھیں۔ ایک طرف ایندھن کے ڈرم رکھے تھے اور پہاڑی سے کوئی دو سو گز نیچے ایک ندی کے ساتھ درجن بھر جاپانی ننگ دھڑنگ نہانے اور اپنے کپڑے دھونے میں مصروف تھے۔

"یہ کوئی کان ہے۔" جان نے عقب سے میرے کان میں کہا۔ "شاید ٹن یا میگنیز کی کان ہے۔"

"تمہیں کیسے پتا چلا؟" میں نے سرگوشی میں کہا۔

"میرے پاس جیالوجی کی ڈگری ہے۔ میں نے آسٹریلیا میں میگنیز کی کان میں کچھ عرصے کام بھی کیا ہے۔"

"اس کا مطلب ہے کہ جاپانیوں نے یہاں اپنا اڈا بنا رکھا ہے۔"

"ممکن ہے یہ بھی کوئی جنگی قیدی کیمپ ہو۔"

ہم سے کچھ دور چلتے سپاہی نے چلا کر کچھ کہا۔ وہ ہمیں خاموش رہنے کا حکم دے رہا تھا۔ ہم خاموش ہوگئے اور اس دوران میں ہمارا قافلہ غار کے سامنے پہنچ گیا۔ وہاں موجود ایک درمیانے رینک کے افسر نے روک کر ہماری تلاشی کروائی۔ حالانکہ ہمارے پاس کچھ نہیں تھا۔ پھر ہمیں اندر جانے کی اجازت ملی۔ اندر غار سرد اور تاریک تھا البتہ کچھ فاصلے پر جلنے والے بلب اس تاریکی کو دور کرنے کی کوشش کررہے تھے گویا یہاں بجلی تھی۔ جیسے جیسے آگے بڑھ رہے تھے جان کا اندازہ درست ثابت ہورہا تھا۔ یہ کوئی کان تھی۔ لیکن متروک ہوچکی تھی کیونکہ اس کے راستوں پر کہیں پٹری نہیں تھی جو کانوں میں خام مال باہر نکالنے کے لیے لازمی ہوتی ہے۔ جاپانیوں نے پٹری اکھاڑ دی تھی اور راستوں کو ہموار کرلیا تھا۔ ہم اتنی سرنگوں سے گزرے کہ اب کم از کم میں بغیر رہنمائی کے باہر نہیں جاسکتا تھا۔ بس یہ احساس تھا کہ ہم نیچے کی طرف جارہے تھے۔ ہم نے تقریباً ایک کلومیٹرز کا فاصلہ طے کرلیا تھا۔ مجھے اس سفر کے دوران چند لمحے کے لیے بھی گھٹن کا احساس نہیں ہوا تھا یعنی اندر ہوا کی آمدورفت جاری تھی اور باہر کے مقابلے میں گرمی بھی نہ ہونے کے برابر تھی۔

آخر میں ہم ایک ہال میں نکلے۔ اس ہال میں بھی چاروں طرف کئی سرنگیں نکل رہی تھیں۔ یہاں پتھر کاٹ کر فرش ہموار کرلیا گیا تھا اور دیواروں پر تیز روشنی والے بلب تھے۔ سپاہیوں نے ہمیں گھٹنوں کے بل بیٹھنے کا حکم دیا اور اس کے لیے انہوں نے خود عمل کرکے دکھایا۔ ہم گھٹنوں کے بل بیٹھ گئے۔ چند منٹ بعد ایک طرف سرنگ سے چند ڈاکٹرز نمودار ہوئے۔ انہوں نے ڈاکٹروں والا کوٹ پہن رکھا تھا۔ انہوں نے آتے ہی ہمارا معائنہ شروع کیا۔ وہ ہمیں ٹٹول رہے تھے۔ ہماری آنکھیں اور زبان نکلوا کر دیکھ رہے تھے۔ ایک ڈاکٹر نے صاف انگریزی میں ہمیں حکم دیا۔ "تمام کپڑے اتار دو۔"

ایک جاپانی کے منہ سے انگریزی سن کر مجھے خوشی ہوئی تھی۔ میں نے فوراً سوال کیا۔ "ڈاکٹر ہمیں یہاں کیوں لایا گیا ہے؟"

"تمہیں جلد پتا چل جائے گا۔" اس نے سرد لہجے میں کہا۔ "حکم کی تعمیل کرو۔"

"بندھے ہاتھوں اور پیر کے ساتھ یہ ناممکن ہے۔" جان نے کہا تو ڈاکٹر کے اشارے پر سپاہیوں نے ہماری بندشیں کھول دیں اور ہم نے اپنے کپڑے اتار دیئے۔ انہوں نے ہمارے جسموں کا معائنہ شروع کیا۔ وہ یوں ٹٹول رہے تھے جیسے ہم قربانی کے بکرے ہوں۔ پھر انگریزی شناس ڈاکٹر نے ہمیں ساتھ آنے کو کہا۔ ہم ایک قطار میں اس کے پیچھے چل پڑے۔ وہ ہمیں ایک ٹائلوں سے آراستہ شاور روم میں لایا اور شاور کے نیچے کھڑے ہونے کو کہا۔ جیسے ہی ہم شاور کے نیچے آئے اوپر سے پانی برسنے لگا۔ اس سے بو آرہی تھی شاید اس میں کوئی جراثیم کش دوا ملی ہوئی تھی۔ چند منٹ تک پانی برستا رہا اور پھر شاور بند ہوگئے۔ ہم باہر آئے تو ڈاکٹر کے ایک ساتھی نے ہمیں سفید رنگ کے سوتی پاجامے اور کرتے دیئے۔ پھر سپاہی ہمیں ہانک کر ایک سرنگ میں لائے جس کے دہانے پر لوہے کی سلاخوں والا دروازہ تھا ہمیں اس میں دھکیل دیا گیا۔

اس سرنگ کا فرش بھی پختہ تھا اور فرش پر بھورے رنگ کے فوجی کمبل اور تکیے تھے۔ میرے ساتھی خوش ہوگئے کیونکہ جنگی قیدی کیمپ میں ہمیں کچے فرش اور کھلی جگہ گزارہ کرنا پڑتا تھا۔ وہاں دن میں دھوپ ہمیں جھلساتی تھی اور رات کو اکثر بارش بھگوتی تھی۔ کیڑے مکوڑے الگ ناک میں دم کرتے تھے۔ یہاں خنکی اور خشکی تھی۔ اب تک کوئی کیڑا مکوڑا بھی نظر نہیں آیا تھا۔ لیکن میں فکرمند تھا۔ ہمیں یہاں کسی خاص مقصد کے تحت منتقل کیا گیا تھا۔ یہاں ڈاکٹرز اس لیے نہیں تھے کہ وہ بیماروں کا علاج کررہے تھے بلکہ کوئی اور مقصد تھا۔ کچھ دیر میں ہمارے لیے کھانا لایا گیا۔ یہ ذرا اچھی قسم کے چاولوں، مقامی سبزی اور گوشت پر مشتمل تھا۔ جاپانیوں کی قید میں آنے کے بعد یہ ہمارا بہترین کھانا تھا۔ اچھا کھانا ایک طرف رہا ہم تو کھانے کو ترسے ہوئے تھے۔ خوراک کی کمی سے سب کی ہڈیاں پسلیاں نمایاں ہوگئی تھیں۔ ہم سب ہی کھانے پر ٹوٹ پڑے تھے۔

میں بھی کھا رہا تھا لیکن ساتھ ہی میری فکرمندی بڑھ رہی تھی۔ ڈاکٹرز نے ہمارا معائنہ کیوں کیا تھا۔ ہمیں جراثیم کش پانی سے غسل کیوں دیا گیا تھا اور اب ہمیں بہترین خوراک کیوں دی جارہی تھی۔ جیسے جیسے میں سوچ رہا تھا میرا شک بڑھ رہا تھا۔ پیٹ بھر کر کھانے کے بعد سب ہی بے سدھ ہوکر لیٹ گئے تھے۔ صبح سے مسلسل سفر میں تھے اور تھکن سے برا حال تھا لیکن میرے ذہن میں جو خیالات آرہے تھے انہوں نے میری نیند اڑا دی تھی۔ اگر ہم سے پہلے آنے والے قیدی بھی یہاں لائے گئے تھے تو سوال یہ تھا کہ اب وہ کہاں تھے؟ جان مجھ سے کچھ دور لیٹا ہوا تھا۔ سرنگ کے عین سامنے تیز روشنی والا بلب تھا اور اس کی روشنی اندر تک آرہی تھی۔ سلاخوں سے کچھ دور ایک مسلح جاپانی دیوار سے ٹیک لگائے ہماری نگرانی کررہا تھا۔ میں سرک کر جان کے پاس آیا اور سرگوشی میں پوچھا۔

"جان سو رہے ہو؟"

"نہیں، جاگ رہا ہوں۔" اس نے جوابی سرگوشی

کی۔ ”مجھے کچھ شک ہو رہا ہے۔“

”مجھے بھی۔“ میں نے کہا۔ ”لیکن پہلے تم بتاؤ کہ تمہیں کیا شک ہے؟“

”جاپانیوں کی عنایت بلاوجہ نہیں ہے۔ پھر یہاں ان ڈاکٹر جیسے لباس والوں کی موجودگی بھی مشکوک ہے۔ تمہیں معلوم ہے تحقیق کرنے والے ماہرین بھی ایسا ہی لباس پہنتے ہیں۔“

میں چونک گیا اور ایک خوفناک خیال میرے ذہن میں آیا۔ ”جان کہیں یہ ہم پر کسی قسم کے تجربات تو نہیں کر رہے ہیں یا ہمیں کسی ہتھیار کا تختۂ مشق تو نہیں بنا رہے ہیں۔“

”کس قسم کے ہتھیار کا؟“ جان بھی گھبرا گیا۔

اس زمانے میں کیمیائی ہتھیاروں کا تصور تھا۔ کیونکہ پہلی جنگِ عظیم میں یورپ میں کیمیائی ہتھیار بڑے پیمانے پر استعمال ہوئے تھے۔ ممکن ہے جاپان نے بھی کیمیائی ہتھیار بنائے ہوں اور اب ان کا تجربہ کر رہا ہو .... تجربے کے لیے جنگی قیدیوں سے بہتر اور کون ہو سکتا تھا۔ ہم جاپان کے دشمن تھے اور پھر امریکا کے اتحادی۔ یہ چیز تو ہم کیمپ میں بھی دیکھ چکے تھے کہ جاپانی سفید فاموں سے شدید نفرت کرتے تھے اور کیمپ میں موجود چند ایک ایشیائی قیدیوں سے ان کا رویّہ اتنا خراب نہیں تھا۔ لیکن ہمیں وہ ہر ممکن تکلیف پہنچاتے تھے۔ میں نے تھوک نگل کر کہا۔ ”شاید کسی کیمیائی ہتھیار کا....“

جان کے چہرے پر بھی ہوائیاں اُڑنے لگی تھیں۔ ”اگر ایسا ہوا تو....؟“

”تب ہمیں یہاں سے فرار کی کوشش کرنا ہوگی۔“

”فرار.... نہیں۔“ اس نے گھبرا کر کہا۔ ”یہ ہمیں جان سے مار دیں گے۔“

”دیکھو اگر ہمیں ان کے کسی تجربے کا نشانہ بننا ہے تو موت تو ویسے بھی مقدر ہو گی۔“ میں نے اسے سمجھایا، اسی لمحے جاپانی پہریدار اٹھ کر ہماری طرف آیا شاید اسے شک ہو گیا تھا اس لیے میں اور جان چپ کر کے سوتے بن گئے۔ پہریدار کچھ دیر سلاخوں کے پاس کھڑا رہا پھر واپس چلا گیا۔ وہ بہت نوعمر تھا اور شاید سولہ سترہ سال کا تھا۔ میں نے جاپانی فوج میں اکثر کم عمر افراد کو دیکھا تھا۔ باقی افراد سو رہے تھے اس لیے انہیں ہماری گفتگو کا پتا نہیں چلا۔ میں نے جان سے کہا کہ ابھی اس بات کو چھپانا ہوگا ورنہ سب کو پتا چلے گا تو ایک بھگدڑ مچ جائے گی، اس سے جاپانی چوکنا ہو جائیں گے اور اگر ہم کوئی فائدہ اٹھا سکتے ہیں تو پھر اس سے محروم رہ جائیں گے۔ جان نے وعدہ کیا کہ وہ ایسا ہی کرے گا۔ اس رات بھی ہمیں اچھا کھانا فراہم کیا گیا تھا۔ اس کے بعد ہمیں رفع حاجت کے لیے ایک ایسی سرنگ میں لے جایا گیا جس میں پانی بہہ رہا تھا۔ اس جگہ کو اسی مقصد کے لیے استعمال کیا جاتا تھا کیونکہ وہاں بدبو تھی جسے فنائل سے دبانے کی کوشش کی گئی تھی۔ ہمیں بتایا گیا کہ ہمیں دن میں دو بار کھانا دیا جائے گا اور دن میں دو بار رفع حاجت کے لیے لے جایا جائے گا۔ یہ جگہ ہمارے قید خانے سے کوئی نصف کلومیٹر دور تھی اس لیے آنے جانے میں اچھی خاصی ورزش ہو جاتی تھی۔ قید خانے والی سرنگ میں بھی اچھی خاصی جگہ تھی اور ہم چاہتے تو باقاعدہ چہل قدمی کر سکتے تھے۔

چند دن میں ہماری صحت خاصی بہتر ہو گئی تھی۔ ایک ہفتے بعد ڈاکٹر نے اسی طرح لباس اتروا کر ہمارا معائنہ کیا اور پھر ہمیں جراثیم کش پانی سے غسل دیا گیا اور ہمیں دوبارہ واپس بھیج دیا۔ شاید اب بھی ہم اس کے معیار پر پورے نہیں اترے تھے۔ دوسرے ہفتے ہمیں صبح شام کھانے کے ساتھ کان سے باہر لے جا کر ورزش کا موقع بھی دیا جاتا تھا۔ اس کا ایک ہی مقصد تھا کہ ہماری صحت جلد از جلد بہتر ہو جائے۔ ہر گزرتے دن یہ احساس قوی ہوتا جا رہا تھا کہ ہمارے ساتھ جانور کا سا سلوک ہو رہا ہے۔ ہمیں موٹا تازہ کیا جا رہا ہے۔ اب جان اور میرے علاوہ یہاں قید باقی افراد بھی اس بات کو محسوس کرنے لگے تھے۔ جب پہریدار آس پاس نہیں ہوتا تو ہم سرگوشیوں میں اس موضوع پر بات کرتے تھے۔ ہمارے ساتھ نیوزی لینڈ کا فریڈ رائس تھا۔ وہ لمبا تڑنگا اور نس لکھ تو جوان تھا۔ اس نے کہا۔ ”اگر انہوں نے مجھے کسی تجربے کا نشانہ بنانے کی کوشش کی تو میں انہیں اتنی آسانی سے کامیاب ہونے نہیں دوں گا۔“

مگر موجودہ حالات میں یہ بیان ایک بڑک سے زیادہ نہیں تھا۔ اگر ہمیں اپنی جان بچانی تھی تو یہاں سے فرار ہونا تھا۔ میں اس نقطہ نظر سے کان اور اس کی سرنگوں کا جائزہ لیتا رہا تھا۔ جہاں ہمیں رفع حاجت کے لیے لے جاتے تھے وہاں پانی ایک نالی کی صورت میں سرنگ کے آخری حصے میں جا کر غائب ہو جاتا اور یہ نالی اتنی بڑی نہیں تھی کہ کوئی اس سے فرار کی کوشش کرتا۔ پھر اس دوران میں بھی ایک جاپانی سپاہی سرنگ کے دہانے پر موجود رہتے تھے۔ جب سے ہماری صحت بہتر ہوئی جاپانی ہم سے چوکنا رہنے لگے تھے۔ جب ہمیں باہر نکالا جاتا تو تین چار فوجی موجود ہوتے تھے۔ ان دو ہفتوں میں، میں نے اندازہ لگایا کہ یہ کان تین سے چار فلور پر مشتمل تھی۔ ہم اوپر سے دوسرے فلور پر تھے اور اس کے نیچے بھی ایک یا دو فلور اور تھے۔ میں نے ایک سرنگ کے سامنے مستقل پہرا دیکھا تھا یہ سرنگ رفع حاجت کے لیے جانے والے راستے پر آتی تھی۔ اس میں روشنی زیادہ تھی اور اسے بہتر انداز میں پختہ کیا گیا تھا۔ سرنگ نیچے کی طرف جا رہی تھی۔

یہ میگنیز اور ٹن کی کان تھی اور یہاں جاپانیوں کا فوجی اڈا نہیں تھا کیونکہ یہاں نہ تو بھاری ہتھیار تھے اور نہ ہی فوجوں کی آمد و رفت جاری رہتی تھی۔ بلکہ مستقل افراد تھے۔ ان کی تعداد ساٹھ سے ستّر کے درمیان تھی۔ ایک درجن سویلین تھے اور ہم نے اپنے سوا اور قیدی نہیں دیکھے تھے۔ یعنی یہاں ہم ہی اسّی نوّے افراد تھے۔ ہمارے لیے ٹرک پر سپلائی آتی ہے۔ یہ ٹرک شاید ہفتے میں ایک بار آتا تھا۔ کیونکہ دوسرے ہفتے میں ہم نے باہر جانے کے دوران صرف ایک بار ٹرک آتے دیکھا تھا۔ اگر یہ فوجی اڈا نہیں تھا تو پھر جاپانیوں کی یہاں موجودگی کا مقصد کیا تھا؟ ہمیں اس سوال کا جواب درکار تھا۔ قیدیوں میں ایک امریکی جارج ملر بھی تھا۔ وہ فلپائن میں پکڑا گیا تھا۔ اسے پہلے جنگی قیدی کیمپ اور پھر یہاں منتقل کر دیا گیا تھا جب کہ فلپائن یہاں سے پانچ سو میل دور تھا۔ ایک دن وہ باہر سے آیا۔ اب ہمیں دو گروپوں کی صورت میں لے جاتے تھے۔

”دوستو... جاپانی فوجیوں میں ایک فلپائنی بھی شامل ہے۔“

یہ ہمارے لیے انکشاف تھا کیونکہ جاپانی اپنی فوج میں دوسرے ملک کے لوگ شامل نہیں کرتے تھے۔ لیکن یہ فلپائنی شامل تھا۔ اس کا نام کارلوس بنڈینی تھا اور وہ بیرونی گارڈز میں شامل تھا۔ جارج فلپائنی زبان سے واقف تھا اور یہی چیز ان کے اور گارڈ کے درمیان دوستی کا باعث بن گئی۔ روزان کے درمیان گفت و شنید ہوتی تھی اور ایک دن فلپائنی نے موقع دیکھ کر انکشاف کیا کہ ہم سے پہلے یہاں کم سے کم سو قیدی آ چکے تھے اور ان میں سے ایک بھی واپس نہیں گیا۔ جس روز ان میں سے کسی کو آخری فلور پر لے جایا جاتا تھا اس کے بعد اس کی صورت بھی دکھائی نہ دیتی۔ اس سے دو باتوں کی تصدیق ہوئی تھی کہ یہاں کان میں تیسرا فلور بھی تھا اور اس پر اہاں... کوئی پُراسرار کام ہو رہا تھا جس کا شکار وہاں لے جانے والے قیدی ہوتے تھے۔ کیونکہ فلپائنی بھی کبھی اندر نہیں گیا تھا اس لیے اسے بھی وہاں کے حالات کا پتا نہیں تھا۔ تیسرے فلور پر عام جاپانی کو بھی جانے کی اجازت نہیں تھی اور وہاں کی ذمّے داری خاص امپریل گارڈز کے سپرد تھی۔

میرے کہنے پر جارج نے فلپائنی سے باتوں باتوں میں اس جگہ کا محل وقوع معلوم کیا۔ اس سے پتا چلا کہ یہ کان ایک پہاڑی کے اوپری حصے میں تھی اور اس کے عقب میں دو ہزار فٹ نیچے بہت ترچھی ڈھلان تھی جو سمندر تک چلی جاتی تھی اس سے اترنا ناممکن تھا۔ اس جگہ آبادی نہیں تھی۔ جب جاپانی یہاں آئے تو کچھ دور جنگل میں ایک چھوٹا سا مقامی قبیلہ آباد تھا۔ جاپانیوں نے مردوں، بوڑھوں اور بچوں کو مار دیا اور صرف جوان عورتوں کو زندہ رکھا لیکن رفتہ رفتہ وہ بھی ایک ایک کر کے ماری جاتی رہیں۔ کچھ نے تنگ آ کر خودکشی کر لی اور اب یہ قبیلہ سرے سے نابود ہو گیا تھا۔ اس کے علاوہ یہاں دور تک کوئی آبادی نہیں تھی۔ جاپانیوں نے یقیناً اپنے اس اڈے کو خفیہ رکھنے کے لیے یہ کام کیا تھا۔ فضائی نگرانی سے بچنے کے لیے انہوں نے ہر چیز کو کیموفلاج کیا ہوا تھا۔ حد یہ کہ آنے جانے کے راستوں پر گھنے درخت برقرار رہنے دیئے تھے تاکہ یہ فضا سے نظر نہ آئیں۔

دوسرے ہفتے کے خاتمے پر ہمارا چیک اپ ہوا اور میں نے محسوس کیا کہ انگریزی شناس ڈاکٹر ہم میں سے کچھ افراد کی صحت سے مطمئن نظر آ رہا تھا اور ان میں فریڈ بھی شامل تھا۔ خوش خوراکی نے اس پر بہترین اثر مرتب کیا تھا اور اسی وجہ سے وہ سب سے پہلے گیا تھا۔ اس کے علاوہ دو افراد کی صحت اور اچھی ہو رہی تھی۔ اگلے دن چار جاپانی سپاہی اچانک وارد ہوئے انہوں نے ذرا مختلف وردیاں پہن رکھی تھیں اور وہ امپریل گارڈز تھے۔ انہوں نے ہمارے قید خانے کا دروازہ کھولا اور فریڈ سمیت دو صحت مند افراد کو باہر آنے کا اشارہ کیا۔ وہ تینوں ہی سہم گئے تھے۔ فریڈ نے ہمت کر کے پوچھا۔ ”ہمیں کیوں لے جا رہے ہو؟“

اس پر جاپانیوں کا موڈ بگڑ گیا اور انہوں نے رائفلیں تان لیں۔ ان کا شور شرابا سن کر دوسرے جاپانی بھی آ گئے اور پھر ان کے حکم پر وہ اندر گھس آئے اور مزاحمت کے باوجود فریڈ اور باقی دو افراد کو ہانک کر لے گئے۔ ان کے باہر نکلتے ہی دروازہ بند کر دیا گیا اور ہم پوچھتے رہ گئے کہ ہمارے ساتھیوں کو کہاں لے جا رہے تھے؟ کچھ دیر بعد سب کا جوش ٹھنڈا ہوا تو اس کی جگہ خوف نے لے لی تھی۔ پتا نہیں

ان کے ساتھ کیا ہونے والا تھا اور آنے والے وقت میں ہمارے ساتھ کیا ہوتا۔ اول تو یہاں انگریزی جاننے والے نہیں تھے، کم سے کم میں نے سوائے اس ڈاکٹر کے اور کسی کو انگریزی بولتے نہیں دیکھا تھا پھر جاپانی صرف اپنے احکامات کی تعمیل کراتے تھے، ہم کیا کہتے تھے اس سے انہیں کوئی سروکار نہیں تھا۔ وہ ہمیں جاپانی میں حکم دیتے اور پھر اشاروں سے اس کا ترجمہ کرکے سمجھاتے تھے۔ اگر ہم کچھ پوچھتے تو وہ انجان بن جاتے یا غصے میں آکر چلّانے لگتے تھے۔ ہمارے تینوں ساتھی واپس نہیں آئے تھے۔ جب ہم پہریدار سے اس بارے میں پوچھتے تو وہ ہمیں گھورتا یا انجان بن جاتا۔ جب اسے زیادہ تنگ کرتے تو وہ رائفل ہماری طرف کرکے دھمکانا شروع کردیتا۔ جارج نے کہا۔ ”ہمیں اب عدم تعاون کرنا پڑے گا۔“

”کیا مطلب؟“ جان نے پوچھا۔

”ہمیں بھوک ہڑتال کرنا ہوگی۔“ میں نے جارج کی تائید کی۔ ”یہ ہمیں کھلا پلا کر کسی مقصد کے تحت استعمال کر رہے ہیں اس لیے اب ہم نہیں کھائیں گے۔“

کچھ افراد نے اس کی حمایت کی اور کچھ نے مخالفت کی۔ اس لیے فیصلہ ہوا کہ ووٹنگ کی جائے۔ پانچ افراد نے بھوک ہڑتال کے حق میں فیصلہ کیا اور چار نے اس کی مخالفت میں۔ یوں ہمارا موقف مان لیا گیا۔ شام کو جب کھانا آیا تو ہم میں سے کوئی کھانا لینے کے لیے نہیں اٹھا تھا۔ ایک بڑے پیالے میں ابلے چاول اور ان پر سالن ڈال کر ہر فرد کو پکڑا دیا جاتا تھا۔ چمچ نہیں ہوتا تھا اور ہمیں ہاتھ سے کھانا پڑتا تھا۔ کھانا لانے والا جاپانی درشت انداز میں ہمیں حکم دیتا رہا اور ہم سنی ان سنی کرکے بیٹھے رہے۔ اس پر اس نے پہریدار کو بھی شامل کرلیا اور وہ بھی آکر ہم پر چلّانے لگا تھا۔ اس بار بھی ہم خاموش بیٹھے رہے۔ کھانا لانے والے نے دیکھا کہ ہم اس کی بات سننے پر تیار نہیں ہیں تو جھنجھناتا ہوا وہاں سے چلا گیا۔ کچھ دیر میں جاپانی گارڈز کا انچارج آگیا اور وہ ہم پر گرجنے برسنے لگا۔ پھر اس نے اپنے سپاہیوں کو طلب کیا اور وہ دروازہ کھول کر اندر گھس آئے۔ سپاہی لاتوں، مکوں اور تھپڑوں سے ہمیں مارنے لگے۔ ہم بغیر مزاحمت کیے خاموشی سے پٹتے رہے اور خود کو بچانے کی کوشش کرتے رہے جوابی کارروائی کا مطلب ہوتا مزید سزا بھگتنا۔

چند منٹ بعد انچارج نے محسوس کیا کہ ہم کسی صورت ان کی بات نہیں مانیں گے اس لیے اس نے اپنے آدمیوں کو رکنے کا حکم دیا اور اس بار ذرا نرم لہجے میں کچھ کہنے لگا لیکن اس کی بات ہماری سمجھ میں نہیں آرہی تھی۔ اس بار بھی ہم نے ردِعمل ظاہر نہیں کیا تو وہ غراتا ہوا چلا گیا اور دروازہ بند ہو گیا۔ آدھے گھنٹے بعد سلاخوں کے باہر انگریزی شناس جاپانی ڈاکٹر آیا۔ اس نے ہمیں غور سے دیکھا۔ ”تم کھانا کیوں نہیں کھا رہے ہو؟“

”ہم نے فیصلہ کیا ہے جب تک ہمارے تین ساتھی واپس نہیں آتے ہم کھانا نہیں کھائیں گے۔“ جارج نے سب کی طرف سے جواب دیا۔

”ان تینوں کو یہاں سے منتقل کردیا گیا ہے۔“ وہ چالاکی سے بولا۔ ”اس لیے تم ان کی فکر مت کرو وہ بالکل ٹھیک ہیں۔“

”تم غلط کہہ رہے ہو۔“ جان نے غصے سے کہا۔ ”تم ہمیں کسی خاص مقصد کے تحت یہاں رکھے ہوئے ہو اور ہم پر تجربات کر رہے ہو۔ ہمارے ساتھیوں کو بھی تجربات کے لیے لے جایا گیا ہے۔“

”یہ سچ ہے۔“ ایک اور ساتھی نے چلّا کر کہا۔ ”تم ہم سے گنی پگس کا سا سلوک کر رہے ہو۔“

ڈاکٹر کے چہرے پر خطرناک تاثر نمودار ہوا تھا مگر اس نے نرم لہجے میں کہا۔ ”تم لوگ فضول خدشات کا شکار ہو۔ ان چکروں میں پڑنے کے بجائے کھانے پر توجہ دو۔“

”جب تک ہمارے ساتھی نہیں آئیں گے ہم کھانا نہیں کھائیں گے۔“ جارج نے سب کی طرف سے فیصلہ سنایا۔ ”تم لوگ جینوا کنونشن کی خلاف ورزی کر رہے ہو۔“

ڈاکٹر نے مذاق اڑانے والے انداز میں ہماری طرف دیکھا۔ ”یہ کیا چیز ہے اور اگر تم کھانا نہیں کھاؤ گے تو ہمارے پاس اس کا بھی علاج ہے، تمہیں باندھ کر ڈرپ کی مدد سے خوراک دی جائے گی اور تم مستقل بندھے رہو گے۔ تمہارے پاس فیصلے کے لیے کل تک کا وقت ہے۔“

ڈاکٹر کے جانے کے بعد ہم میں دوبارہ بحث چھڑ گئی جو بھوک ہڑتال کے خلاف تھے انہوں نے پھر اصرار کیا کہ بھوک ہڑتال سے گریز کیا جائے مگر میں اور دوسرے اپنے فیصلے پر قائم تھے۔ جب بحث بڑھ گئی تو جارج نے ان سے کہا۔ ”ٹھیک ہے تم کھانا کھالو۔ ہم بھوک ہڑتال ہی کریں گے۔“

ان لوگوں نے فوراً پہریدار کو متوجہ کیا اور اشارے سے اس سے کھانا مانگا۔ پہریدار نے کھانا دینے والے کو بلایا اور وہ کھانا لے آیا۔ ہمارے چار ساتھیوں نے ہمارے سامنے پیٹ بھر کر کھایا اور ہم دیکھتے رہ گئے۔ سچی بات تھی کہ ہمیں بھوک لگ رہی تھی لیکن اب ہم مزید جاپانیوں کے ہاتھ میں کھلونا بننے کے لیے تیار نہیں تھے۔ اگلی صبح ان چار افراد کو ہم سے الگ کرکے نزدیک ہی واقع دوسری سرنگ میں منتقل کردیا گیا۔ پہلے ہم سمجھے تھے کہ انہیں بھی تین ساتھیوں کی طرح لے جایا جارہا ہے لیکن شام کو وہ ہمارے سامنے سے گزر کر رفع حاجت والی سرنگ کی طرف گئے تھے۔ اگلے دن بھی ہم نے کچھ نہیں کھایا۔ اس شام میں نے اپنے ساتھیوں سے کہا۔ ”بھوک ہڑتال مسئلے کا حل نہیں ہے، ہمیں خود کو زندہ رکھتے ہوئے یہاں سے فرار کی کوشش کرنا ہوگی۔“

”کیسے؟“ جارج نے پوچھا۔ ”اگر کھاتے ہیں تو ان کا مقصد پورا ہوجائے گا۔“

”ہم کھائیں گے لیکن اتنا نہیں۔“ میں نے تجویز دی۔

”باقی خوراک کا کیا کریں گے؟“ جان نے پوچھا۔ ”وہ ضائع کریں گے تو ان کو پتا چل جائے گا۔“

سرنگ کا آخری حصہ کچا تھا اگر ہم وہاں گڑھا کھود لیتے تو اضافی خوراک اس میں چھپا سکتے تھے۔ مگر مسئلہ یہ تھا کہ سرنگ سیدھی تھی اور پہریدار آخر تک دیکھ سکتا تھا اس لیے زمین کھودنا ممکن نہیں تھا اور ہمارے پاس کوئی ایسی چیز نہیں تھی جس سے زمین کھودی جاتی۔ ہم آپس میں بحث کرتے اور الجھتے رہے۔ سچی بات تھی کہ جیسے جیسے وقت گزر رہا تھا اور انتڑیوں میں بھوک سے پڑنے والے بلوں کی تعداد بڑھ رہی تھی ہمارا ارادہ کمزور ہوتا جارہا تھا۔ اچانک میرے ذہن میں خیال آیا۔ ”ایک کام کرسکتے ہیں۔ ہم دو دن کھانا کھا کر تیسرے دن بھوک ہڑتال کرسکتے ہیں۔ اس طرح ہم صحت مند نہیں ہوں گے۔“

”لیکن مسئلہ تو وہیں رہے گا۔ اگر ہم صحت مند نہیں ہوں گے تو جاپانی دوسرے طریقے استعمال کریں گے۔“ جارج نے اعتراض کیا۔

”جب کریں گے تب دیکھا جائے گا۔ ابھی ہم نے بھوک ہڑتال ختم نہیں کی تو جاپانی ہمیں زبردستی ڈرپ سے خوراک دے سکتے ہیں۔“ میں نے کہا تو سب سوچ میں پڑ گئے تھے اس لیے مختصر بحث کے بعد طے ہوگیا کہ فی الحال بھوک ہڑتال ختم کردی جائے۔ بعد میں جان نے اس تجویز کو یوں بہتر کیا کہ تیسرے دن سب ہڑتال کرنے کے بجائے ایک دن ایک یا دو افراد کھانے سے گریز کریں۔ اس طرح جاپانیوں کو ہڑتال کا تاثر نہیں جائے گا۔ ہم اس پر عمل کرنے لگے۔ ہر روز ایک دو یا افراد کھانے سے گریز کرتے تھے اور باقی دن میں کھاتے تھے۔ اس طرح ہمیں بھوک ہڑتال نہیں کرنا پڑ رہی تھی اور ہماری صحت بہتر ہونا رک گئی تھی۔ دو تین دن کی اچھی خوراک کا اثر ایک پورے دن کے فاقے سے زائل ہوجاتا تھا اور پھر ہم ایکسرسائز بھی کرتے تھے تاکہ جسم گھٹتا رہے چربی جمع نہ ہو۔ دیکھا جائے تو اس مسئلے کا یہ حل نہیں تھا، جاپانی جلد یا بدیر ہماری چال سے باخبر ہوجاتے۔ وہ بااختیار تھے اس لیے ہمارے ساتھ کچھ بھی کر سکتے تھے۔ مگر ہمیں اپنی سی کوشش تو کرنا تھی۔

یہ تیسرے ہفتے کے معائنے کے بعد کی بات تھی ہمیں ایک جاپانی سپاہی رفع حاجت کے لیے لے جارہا تھا جان سب سے آگے تھا وہ جان بوجھ کر غلط سرنگ میں مڑ گیا۔ ہم نے اس کی پیروی کی اور سپاہی نے بھی دھیان نہیں دیا۔ نہ جانے جان کو کیا شرارت سوجھی تھی؟ جب تک سپاہی کو احساس ہوتا ہم خاصا آگے نکل چکے تھے۔ پھر اس نے چلّا کر ہمیں رکنے کو کہا اور واپس پلٹنے کا اشارہ کیا۔ ہم واپس پلٹے اور اس سرنگ سے نکل آئے۔ سپاہی کو اپنی غلطی کا احساس یوں ہوا کہ اس سرنگ میں روشنی نہیں تھی اور جب آگے اندھیرا آیا تو اسے پتا چلا اور اس نے واپسی کا حکم دیا۔ ہم واپس آئے اور اس بار صحیح سرنگ میں داخل ہوئے تھے۔ لیکن جان کی اس شرارت کی وجہ سے ایک اہم چیز کا پتا چل گیا۔ پتا نہیں دوسروں کو اس کا احساس ہوا تھا یا نہیں لیکن میں نے واضح طور پر محسوس کیا تھا۔ اس ہفتے دوسرے گروپ سے جس نے بھوک ہڑتال میں شرکت سے انکار کردیا تین افراد اسی طرح لے جائے گئے اور واحد بچ جانے والے فرد کو واپس ہمارے قید خانے میں دھکیل دیا گیا۔ وہ خوف زدہ تھا کیونکہ اس کے سامنے ہی اس کے ساتھیوں کو لے گئے تھے۔ اس نے تقریباً روتے ہوئے کہا۔ ”یہ باری باری اسی طرح ہمیں اپنے تجربات کی بھینٹ چڑھا دیں گے۔“

”اسی لیے ہم نے بھوک ہڑتال کی تھی۔“ جارج نے کہا۔ ”بہرحال اب ہم کوشش کر رہے ہیں کہ اتنا کھائیں کہ زندہ رہیں اور صحت بہتر نہ ہو۔“

بھوک ہڑتال کا تاثر نہ دینے کے لیے ہم نے یہ طریقہ اختیار کیا تھا کہ خوراک ایک طرف گرا دیتے تھے اور جب یہ خشک ہوجاتی تو رفع حاجت کے لیے جاتے ہوئے اسے سمیٹ کر لے جاتے اور وہاں بہا دیتے۔ اگرچہ یہ خاصا

مشکل کام تھا لیکن کسی نہ کسی طرح کر رہے تھے۔ یہ زندہ رہنے کی ہماری جدوجہد تھی۔ جب ایک مہینے بعد ہمارا پھر معائنہ ہوا تو انگریزی شناس ڈاکٹر فکرمند نظر آنے لگا اس کے خیال میں اب تک ہماری صحت ٹھیک ہو جانی چاہیے تھی۔ مگر ہماری کم خوراکی اور پھر ورزش کی وجہ سے ہمارے جسم بہ ظاہر صحت مند نظر نہیں آ رہے تھے۔ اس نے الزام لگایا۔ ''تم لوگ ٹھیک سے کھانا نہیں کھا رہے ہو۔''

''ہمیں جتنی بھوک ہوتی ہے ہم کھاتے ہیں۔'' میں نے تردید کی۔ ''پھر کھانے کا معیار پہلے جیسا نہیں ہے خاص طور سے اس میں گوشت کم ہوتا ہے اور چاول بدمزہ ہوتے ہیں انہیں کھا کر ہمارے پیٹ میں درد ہو جاتا ہے۔''

ڈاکٹر نے اسی وقت باورچی کو طلب کر لیا اور اس پر برس پڑا تھا۔ وہ بے چارہ تردید کرتا رہ گیا کہ وہ ٹھیک کھانا بناتا اور ہمیں دیتا ہے۔ لیکن ڈاکٹر نے اس سے کہا کہ وہ اب خود کھانے کا معائنہ کرے گا۔ اس کا پتا ہمیں یوں چلا کہ اگلی صبح جب کھانے کا وقت آیا تو وہ خود ہمارے سروں پر موجود تھا پہلے اس نے کھانے کا معیار چیک کیا اور پھر ہمیں کھاتے دیکھتا رہا اس کی موجودگی کی وجہ سے اس دن مجبوراً ہمیں پورا کھانا پڑا تھا۔ ہم خوراک چھپا بھی نہیں سکے تھے۔ شام میں بھی ڈاکٹر کھانے کے موقع پر موجود رہا تھا۔ اس کے جانے کے بعد ہمیں رفع حاجت کے لیے لے جایا گیا یہی ایک موقع ہوتا تھا جب ہم آپس میں کھل کر بات کر سکتے تھے۔ ایک تو وہاں سپاہی دور سرنگ کے دہانے پر کھڑے ہوتے تھے دوسرے پانی کے شور کی وجہ سے آواز دور نہیں جاتی تھی۔ سب ایک دوسرے سے بات کرنے کے لیے بے تاب تھے۔ میں نے کہا۔ ''اب وقت آ گیا ہے ہمیں کچھ کرنا ہوگا یہاں سے فرار کے لیے۔''

''لیکن کیسے..... اگر ہم نے کسی طرح اس پہریدار یا سیل والے پہریدار کو قابو کر بھی لیا تو باہر جانے تک ہمیں کئی چیک پوسٹوں سے گزرنا پڑے گا۔'' جارج نے نقطہ اٹھایا۔ ''ہم باہر بھی نہیں نکل سکیں گے۔''

''ہم دہانے کی طرف سے فرار نہیں ہوں گے۔'' میں نے جواب دیا۔ ''تم لوگوں کو یاد ہے جب جان ہمیں غلط سرنگ میں لے گیا تھا۔ وہاں میں نے تازہ ہوا کے جھونکے محسوس کیے تھے۔ اس کا مطلب ہے اس راستے سے کہیں باہر نکلا جا سکتا ہے ہم اسی سے فرار ہوں گے۔''

''لیکن اگر یہ راستہ کہیں نہ نکلا اور ہم پھنس گئے؟'' ایک ساتھی نے خدشہ ظاہر کیا۔

''تب بھی ہمیں کوشش ضرور کرنی چاہیے صرف ناکامی کے ڈر سے خود کو ان لوگوں کے رحم و کرم پر چھوڑ دینا ٹھیک نہیں ہوگا۔ جنگی قیدی تو عام کیمپوں سے بھی فرار کا حق رکھتے ہیں یہاں تو یہ سراسر خلافِ انسانیت کام کر رہے ہیں۔''

''عام جنگی کیمپوں میں فرار ہونے والوں کو ناکامی پر قتل نہیں کیا جاتا ہوگا لیکن یہاں ہم پکڑے گئے تو یہ ہمیں شوٹ کر دیں گے۔'' بوناش نامی ساتھی نے اپنی بات کی۔

''موت کا سامنا تو ویسے بھی ہے۔'' میں نے تلخی سے کہا۔ ''ہمارے چھ ساتھی ان کے نامعلوم تجربوں کی بھینٹ چڑھ چکے ہیں۔''

''اگر ہم کچھ عرصے اور یہاں رہے تو ہمارے ساتھ بھی یہی ہوگا۔'' جارج نے میری تائید کی۔

ابھی ہم بحث کر رہے تھے کہ جاپانی سپاہی نے چلانا شروع کر دیا، وہ ہمیں جلد فارغ ہونے کو کہہ رہا تھا۔ اس لیے ہم پوری بات نہیں کر سکے۔ اگلے روز ہم نے گفتگو کا سلسلہ اسی جگہ سے شروع کیا۔ ہم میں سے چار فرار کے حق میں تھے اور دو اس کی مخالفت کر رہے تھے، ان کا کہنا تھا کہ فرار کی کوشش جاپانیوں کو بھڑکا دے گی اور وہ سختی پر اتر آئیں گے۔ دوسرے وہ اس سے بھی خوف زدہ تھے کہ کہیں فرار کی کوشش میں ہی جاپانی ہمیں شوٹ نہ کر دیں۔ یہ بھوک ہڑتال کا معاملہ نہیں تھا جس میں ووٹ کی مدد سے کثرتِ رائے سے فیصلہ ہو جاتا۔ اس میں سب کی مرضی شامل ہونا لازمی تھی ایک بھی شخص انکار کرتا تو منصوبہ ناکام ہو جاتا کیونکہ فرار کی کوشش میں تو سب شامل ہوتے اور جو پیچھے رہ جاتے جاپانی ان کے ساتھ یقیناً اچھا سلوک نہیں کرتے اس لیے میں اور باقی ان دونوں کو راضی کرنے کی کوشش کر رہے تھے۔ مگر وہ تیار نہیں تھے ان کا کہنا تھا کہ اس میں رسک بہت زیادہ تھا۔

مجھے اور جارج دونوں کو ان کی بزدلی سے مایوسی ہو رہی تھی۔ شاید وہ خطرے کو پوری طرح محسوس نہیں کر رہے تھے۔ جاپانی ڈاکٹر ہر دوسرے دن آ رہا تھا اور اب وہ ہمیں اپنی نگرانی میں کھلاتا تھا یقیناً وہ تصدیق کر رہا تھا کہ ہم کم تو نہیں کھا رہے تھے؟ اس کی وجہ سے ہم پورا کھانے پر مجبور تھے اور یہ ہمارے لیے اچھی بات نہیں تھی۔ ہم خوراک ضائع بھی نہیں کر سکتے تھے۔ نتیجہ یہ نکلا کہ ہماری صحت بہتر ہونا شروع ہو گئی تھی۔ ہر روز ہم فرار کی مخالفت کرنے والوں کو

قائل کرنے کی کوشش کرتے تھے اور ہر روز ہمیں ناکامی کا سامنا کرنا پڑتا۔ خطرہ رفتہ رفتہ نزدیک آ رہا تھا، کسی دن بھی ہمیں لے جایا جا سکتا تھا کیونکہ جاپانی ڈاکٹر جس طرح بے تابی سے ہمارا معائنہ کرتا تھا اس سے لگتا تھا کہ اس کے صبر کا پیمانہ لبریز ہونے والا ہے اور جلد یا بدیر ہم میں سے کچھ افراد کو لے جایا جائے گا۔ جلد یہ خدشہ حقیقت کا روپ دھار گیا۔ ایک دن جاپانی ڈاکٹر حسبِ معمول کھانے کے وقت آیا تو میں یہی سمجھا کہ وہ انسپکشن پر آیا ہوا ہے۔

لیکن جیسے ہی ہم نے کھانا مکمل کیا اس نے سپاہی بلوا لیے اور اشارے سے فرار کے دونوں مخالفوں اور بوناش کی طرف اشارہ کر کے انہیں باہر نکالنے کا حکم دیا۔ یہ سب اتنا اچانک ہوا کہ ہمیں مزاحمت کا موقع ہی نہیں ملا۔ ان تینوں کو نکال کر دروازہ بند کر دیا گیا اور جاپانی سپاہی ان کے چلانے کی پروا کیے بغیر انہیں کھینچ کر لے گئے۔ ان کی آوازیں دیر تک ہمارے کانوں میں آتی رہیں اور ہم پھٹی پھٹی نگاہوں سے ایک دوسرے کو دیکھتے رہ گئے تھے۔ اب میں، جارج اور جان بچے تھے۔ میں نے اسی وقت سوچ لیا کہ اس سے پہلے ہماری باری آئے ہمیں یہاں سے ہر قیمت پر فرار ہو جانا تھا۔ میں بے بسی کی موت نہیں مرنا چاہتا تھا۔ اگلی صبح ہم رفع حاجت کے لیے لے جائے گئے تو جارج اور جان نے بھی ان ہی خیالات کا اظہار کیا۔ جان بولا۔ ''مجھے لگ رہا ہے ہماری باری آنے میں زیادہ دیر نہیں لگے گی۔ شاید اسی ہفتے ہمیں بھی لے جائیں گے۔''

''مجھے بھی یہی لگ رہا ہے۔'' جارج نے کہا۔ ''ہمیں جلد از جلد فرار ہو جانا چاہیے۔''

''لیکن سپاہی سے کیسے نمٹیں گے۔'' جان نے سرنگ کے دہانے پر موجود سپاہی کی طرف دیکھا۔

''یہ اکیلا ہے ہم پلان کر کے اس پر قابو پا سکتے ہیں۔'' جارج نے کہا۔

''کیسا منصوبہ؟'' جان نے پوچھا۔ جارج نے منصوبہ بتایا۔ یہ بڑا سادہ سا منصوبہ تھا۔ کل رات جب ہمیں رفع حاجت کے لیے لے جایا جاتا تو جان اپنی طبیعت خراب ظاہر کرتا اور لڑکھڑاتے ہوئے چلتا۔ سرنگ میں پہنچ کر وہ اچانک زمین پر گر جاتا اور ایسی اداکاری کرتا جیسے اس کی جان نکل رہی ہو۔ سپاہی اس کی طرف متوجہ ہوتا تو ہم اس پر ٹوٹ پڑتے۔ یہاں کچھ نہیں تھا لیکن رفع حاجت والے غار میں چھوٹے بڑے پتھر پڑے تھے۔ ہم ان پتھروں سے کام چلا سکتے تھے۔ سپاہی کو فائر سے روکنا تھا کیونکہ فائر ہوتے ہی پوری کان میں آواز پھیل جاتی اور جاپانی ہمارا راستہ روکنے کے لیے آ جاتے۔ میں نے اور جان نے جارج کے اس منصوبے سے اتفاق کیا اور اگلی صبح ہم نے رفعِ حاجت والے غار میں وہ جگہ تاڑ لی جہاں جان کو یہ ڈراما کرنا تھا۔ یہاں کچھ پتھر بھی موجود تھے۔

فیصلہ ہو جانے کے بعد آنے والا سارا دن اضطراب میں گزرا تھا۔ ہمیں خوف یہ تھا کہ کہیں آج ہی ہماری باری بھی نہ آ جائے لیکن خیریت گزری اور ایسا نہیں ہوا۔ رات کے کھانے کے بعد ہمیں نکال کر لے جایا گیا۔ اس بار بھی ایک ہی سپاہی تھا۔ شاید جاپانی مطمئن تھے کہ ہم یہاں سے فرار نہیں ہو سکتے تھے اس لیے انہوں نے صرف ایک سپاہی نگرانی کے لیے مقرر کیا تھا۔ رات کے وقت کوشش سے یہ فائدہ ہوتا کہ ہم یہاں سے نکل جاتے تو جاپانی تاریکی میں آسانی سے ہمارا پیچھا نہیں کر سکتے تھے۔ جان چلنے کے دوران لڑکھڑا رہا تھا اور سستی سے چل رہا تھا۔ اس پر سپاہی چلانے لگتا اور ہمیں تیز چلنے کا اشارہ کرتا۔ ہم رفعِ حاجت والے غار تک آئے اور جان مقررہ جگہ پر آتے ہی زمین پر ڈھیر ہو گیا اور اس کا جسم یوں جھٹکے کھانے لگا جیسے اس کی روح جسم سے نکل رہی ہو۔ میں اور جارج اس کے پاس بیٹھ گئے اور بہ ظاہر اسے سنبھالنے لگے۔ اسی دوران میں ہم نے زمین سے پتھر اٹھا کر اپنے ہاتھوں میں دبا لیے تھے۔ یہاں روشنی کم تھی اس لیے جاپانی نہیں دیکھ سکا۔ جان کے گرنے اور تڑپنے سے وہ فکرمند ہوا لیکن آگے نہیں آیا اپنی جگہ کھڑے کھڑے پوچھتا رہا۔ جارج نے اسے اشارے سے کہا کہ وہ آ کر جان کو دیکھے۔ کئی بار اشارہ کرنے پر وہ نزدیک آیا مگر بالکل پاس آنے سے گریز کیا۔ میں نے چلا کر کہا۔ ''اسے دیکھو یہ مر رہا ہے۔''

میری اداکاری مؤثر ثابت ہوئی وہ بے اختیار آگے آیا۔ ہمیں موقع ملا پہل جارج نے کی اور وہ اس پر جھپٹا..... وہ دونوں نیچے گرے۔ جارج اس سے رائفل چھیننے کی کوشش کر رہا تھا۔ میں پتھر لے کر آگے آیا اور میں نے موقع پا کر پتھر اس کے سر پر مارا۔ وہ چکرایا اور اس کی مزاحمت کمزور پڑ گئی۔ میں نے لگاتار کئی ضربیں لگائیں اور وہ بے ہوش ہو گیا۔ جارج نے اٹھ کر ہانپتے ہوئے اس سے رائفل اور گولیوں کی پیٹی لے لی۔ رائفل کے ساتھ ایک سنگین بھی تھی۔ جان بھی اٹھ گیا تھا لیکن اس کی مدد کی ضرورت ہی نہیں

پڑی۔ ہم نے جلدی سے سپاہی کی وردی اتاری اور یہ میں نے پہن لی کیونکہ یہ میرے سائز کی تھی۔ سپاہی کو گھسیٹ کر پانی کے ساتھ ڈال دیا جہاں تاریکی تھی۔ جارج نے مجھ سے کہا۔ ”تمہیں وہ سرنگ یاد ہے؟“

”مجھے بالکل یاد ہے۔“ میں نے اعتماد میں کہا۔ ہم دونوں باہر آئے۔ خوش قسمتی سے وہاں جاپانی نہیں تھا۔ سرنگ کے پاس آکر جارج نے ایک بار پھر مجھ سے کنفرم کیا۔ ”یہی سرنگ ہے؟“

”ہاں ہم آگے جائیں گے تو تازہ ہوا محسوس ہوگی۔“

ہم سرنگ میں داخل ہوئے اور تاریکی میں دیوار پکڑ کر چلنے لگے۔ جان نے خبردار کیا۔ ”یہاں گڑھے ہو سکتے ہیں ان سے ہوشیار رہنا ورنہ گرنے کے بعد پتا چلے گا۔“

یہ اس نے اچھا کیا تھا کیونکہ فوراً پہلا گڑھا آ گیا۔ یہ سرنگ کے عین وسط میں تھا اور اس کے بائیں طرف سے پتلا سا راستہ تھا۔ ہم دیوار سے لگ کر اس سے گزرے۔ میں نے جس تازہ ہوا کی بات کی تھی وہ ابھی تک محسوس نہیں ہوئی تھی۔ لیکن مجھے اچھی طرح یاد تھا کہ یہی سرنگ تھی۔ اس لیے ہم آگے بڑھتے رہے۔ ابھی تک سرنگ سیدھی تھی لیکن کچھ دیر بعد اس میں دو راستے آ گئے۔ جارج نے پوچھا۔ ”اب کس طرف جانا ہے؟“

میں نے باری باری دونوں سرنگوں کے سامنے کھڑے ہو کر محسوس کیا تو ان میں سے ایک سے تازہ ہوا آتی محسوس ہوئی۔ میں ہچکچایا لیکن پھر اسی کا فیصلہ کر لیا۔ ہمیں فرار ہوئے نصف گھنٹے سے زیادہ کا وقت گزر گیا تھا اور جاپانی یقیناً فرار سے آگاہ ہو گئے تھے۔ کیونکہ ہم باہر نہیں نکلے تھے اس لیے وہ ہمیں سرنگوں میں تلاش کر رہے ہوں گے۔ اس سرنگ میں ہم آہستہ آہستہ آگے بڑھ رہے تھے۔ میں سب سے آگے تھا، پیچھے جان تھا اور سب سے پیچھے جارج تھا۔ رائفل اس کے پاس تھی اور اگر جاپانی پیچھے سے آ جاتے تو وہی مزاحمت کرتا۔ اب سرنگ میں تازہ ہوا واضح محسوس ہو رہی تھی اور اس میں مخصوص سمندری مہک بھی شامل ہوتی جا رہی تھی۔ اس کا مطلب تھا کہ ہم درست راستے پر جا رہے تھے۔ بالآخر سرنگ کا دہانہ ایک ڈھلان پر نکلا۔ کسی زمانے میں کان کن کھودتے ہوئے یہاں تک پہنچ گئے تھے۔ مگر ڈھلان دیکھ کر ہم سب کی روح فنا ہو گئی تھی۔ یہ بہت ترچھی اور تقریباً سمندر میں گرتی ڈھلان تھی۔ اس پر چھوٹے پودے اور جھاڑیاں تھیں۔ جارج خوفزدہ ہو گیا۔

”میں اس سے نہیں اتر سکتا۔“

”ہمیں اسی سے اترنا ہوگا۔“ میں نے کہا۔

”ولیم ٹھیک کہہ رہا ہے۔“ جان نے میری تائید کی۔ ”ہمارے پاس اس کے سوا کوئی اور راستہ نہیں ہے۔“

”ہمیں جلد اترنا ہوگا ورنہ جاپانی آ گئے تو وہ اوپر سے ہمیں شوٹ کر سکتے ہیں۔“

”بس تو اترو۔“ جان نے کہا اور پہل کی۔ وہ دونوں ہاتھوں کی مدد سے نیچے لٹکا اور اس چھوٹے سے چھجے پر اتر گیا جو دہانے کے عین نیچے کوئی سات فٹ دور تھا۔ پھر میں اترا اور آخر میں جارج بھی ہچکچاتے ہوئے اتر آیا۔ چھجے کے بعد ڈھلان تھی۔ چاند نکل آیا تھا اور منظر کسی قدر واضح تھا لیکن اس کی چاندنی ہماری قاتل بھی ثابت ہو سکتی تھی اگر جاپانی آ جاتے تو ہم انہیں صاف دکھائی دیتے۔ ہمیں کوہ پیمائی کا کوئی تجربہ نہیں تھا مگر اترنا تو تھا۔ ڈھلان اتنی زیادہ تھی کہ جب ہم اس پر اترے تو صرف پیروں پر کھڑے نہ رہ سکے تھے اور سب ہاتھوں اور جسم کے ساتھ ڈھلان سے چپک گئے۔ جارج پہلے ہی ڈرا ہوا تھا پھر رائفل بھی اس کے پاس تھی۔ اس کے لیے اترنا بہت مشکل ہو رہا تھا۔ پھر یہ معمولی ڈھلان نہیں تھی دو ہزار فٹ نیچے تک چلی گئی تھی۔

”رائفل مجھے دے دو۔“ جان نے جارج سے رائفل لے لی اب وہ زیادہ آسانی سے نیچے اتر رہا تھا۔ یہاں بھی میں سب سے نیچے تھا، جان ذرا دائیں طرف اوپر تھا اور جارج اس کے اوپر تھا۔ ایک خطرہ یہ تھا کہ اگر ایک گرا تو وہ باقی کو بھی لپیٹ میں لے جائے گا اس لیے سب ایک دوسرے سے دور ہونے کی کوشش کر رہے تھے۔ ابھی ہم سو گز نیچے گئے ہوں گے کہ جاپانی آ گئے۔ ان کے چیخنے کی آواز آئی اور پھر ڈھلان پر سرچ لائٹوں کی روشنیاں لہرانے لگیں۔ جیسے ہی ہم روشنی میں آئے رائفلیں گرجنے لگی تھیں اور گولیاں ہمارے آس پاس لگنے لگیں۔ میں نے چلا کر کہا۔

”تیزی سے اترو۔“

جاپانی ہمیں اوپر سے نشانہ بنانے کی کوشش کر رہے تھے پھر سپاہی چھجے پر اتر آئے اور وہاں سے ہمیں نشانہ بنانے کی کوشش کرنے لگے۔ رائفل کی مار کئی سو گز تک ہوتی ہے اس لیے ہم خطرے کی حد میں تھے۔ جارج جو پہلے سب سے اوپر تھا اب تیزی سے نیچے آ گیا تھا لیکن قضا اسی کی آئی۔ اچانک اس کی چیخ سنائی دی اور پھر جان نے اسے گرتے دیکھا۔ میں ایسی پوزیشن میں تھا کہ اسے دیکھ نہیں سکتا تھا۔ اس

ایک لمحاتی جھلک دکھائی دی اور جارج غائب ہو چکا تھا۔ اس وقت ہم ڈیڑھ سو گز نیچے آ چکے تھے اور رائفل کی حد سے نکلنے کے لیے اتنا ہی نیچے اور جانا تھا۔ ساتھ ہی ہم کوشش کر رہے تھے کہ ایسی جگہوں سے نیچے اتریں جہاں اوپر سے نشانہ لینا دشوار ہو۔ خاردار جھاڑیوں اور پتھروں سے ہمارے کپڑے پھٹ رہے تھے اور جسم زخمی ہوتے جا رہے تھے لیکن اس وقت ہمیں صرف جان بچانے کی فکر تھی۔ کچھ دیر میں ہم رائفلوں کی مار سے نکل گئے تھے لیکن خطرہ تو ابھی باقی تھا جاپانی جان گئے تھے کہ ہم کہاں تھے وہ دوسری طرف سے آ کر ہمیں گھیر سکتے تھے۔ اس لیے نیچے اترنے کے ساتھ ساتھ میں سوچ رہا تھا کہ اب ہمیں کیا کرنا چاہیے۔ سلوویسی کا جنوبی حصہ اتحادیوں کے قبضے میں تھا اگر ہم وہاں پہنچ جاتے تو بچ سکتے تھے۔ لیکن یہ بہت طویل سفر تھا اور ہمیں تقریباً چار سو کلومیٹرز کا فاصلہ طے کرنا تھا تب ہی ہم وہاں پہنچ سکتے تھے۔

لیکن یہ سارا راستہ جاپانی فوجوں سے بھرا ہوا تھا۔ بس پر سفر کے دوران یہ اطلاعات ملی تھیں کہ سلوویسی پر قبضے کا مقصد آسٹریلیا پر حملے کے لیے میدان تیار کرنا تھا۔ اس لیے جاپانی بہت بڑی تعداد میں فوج یہاں لے آئے تھے۔ جب ہم نیچے پہنچے تو میں نے جان سے بات کی تو اس نے کہا۔ ”خشکی کے راستے ہم کسی صورت جنوب میں نہیں پہنچ سکتے۔“

”تب ہمارے پاس اور کون سا راستہ باقی رہ جاتا ہے؟“

جان بھی جانتا تھا کہ ہمارے پاس اس کے سوا کوئی راستہ نہیں ہے۔ یہاں مقامی آبادی نہیں تھی جو ہمیں پناہ اور خوراک مہیا کرتی، ہمیں اپنی جان بچانے کے لیے خود ہی کوشش کرنی تھی۔ بالآخر طے یہی ہوا کہ ہمیں سلوویسی کے جنوبی حصے تک پہنچنا ہے۔ اگر ہم روز بیس کلومیٹرز کا فاصلہ طے کر لیتے تو بیس دن میں وہاں پہنچ سکتے تھے۔ روشنی ہونے سے پہلے ہمیں اس علاقے سے نکل جانا تھا ورنہ نظروں میں آنے کے امکانات روشن تھے۔ تھکن اور زخموں کے باوجود ہم چل پڑے۔ صبح سے پہلے ہم جزیرے کے وسطی حصے میں اونچے جنگلات میں داخل ہو چکے تھے۔ یہ تہ در تہ پہاڑ تھے۔ یہاں سفر کرنا بہت مشکل تھا کیونکہ راستے ناپید تھے لیکن یہ اطمینان تھا کہ جاپانی ہمیں آسانی سے تلاش نہیں کر سکتے تھے۔ مگر شام تک ہمارا حشر ہو چکا تھا۔ یہاں کھانے کو

کچھ نہیں تھا البتہ پانی ملتا رہا اور ہماری پیاس بجھتی رہی تھی۔ چند ایک جنگلی پھل اور بیج والے پودے دکھائی دیئے لیکن ہم ان کو کھانے کی ہمت نہیں کر سکے تھے امکان تھا کہ وہ زہریلے ہوں گے۔ شام کو تھک کر ایک ندی کے کنارے پڑ گئے۔ یہاں نرم گھاس اگی ہوئی تھی اور بہ ظاہر کیڑے مکوڑے بھی نظر نہیں آ رہے تھے لیکن رات ہوتے ہی مچھروں کی یلغار ہوئی جو نصف رات تک جاری رہی اس کے بعد مچھر جیسے آئے تھے ویسے ہی چلے گئے اور ہم سکون سے سو سکے۔

اگلی صبح بھوک سے پیٹ میں چوہے دوڑ رہے تھے، میری آنکھ بھوک سے کھلی تھی۔ جان ندی کے کنارے بیٹھا ہوا کسی چیز پر غور کر رہا تھا میں نے پوچھا۔ ”کیا دیکھ رہے ہو؟“

”یہاں چھوٹی مچھلیاں ہیں لیکن ان کو پکڑیں کیسے؟“

میں بھی کنارے آ گیا واقعی پانی میں رنگ برنگی چھوٹی مچھلیاں تھیں، ان کا سائز مشکل سے دو تین انچ تھا۔ مجھے خیال آیا اور میں نے وردی کے نیچے اپنی شرٹ اتار کر پانی میں کی اور جب اس پر کچھ مچھلیاں آ گئیں تو میں نے یک دم شرٹ سمیٹ لی۔ پانی نکلنے کے بعد دیکھا تو شرٹ میں نصف درجن مچھلیاں تھیں۔ یہ تڑپ رہی تھیں۔ جان نے ایک لکڑی سے مار کر انہیں ہلاک کیا اور پھر ہم نے انہیں سالم ہی کھا لیا۔ دوبارہ شرٹ کا استعمال شروع کیا اور ایک گھنٹے میں ہم نے تقریباً دو کلوگرام مچھلی پکڑ لی تھی۔ اس میں سے کچھ کھائی اور باقی شرٹ میں لپیٹ کر ساتھ لے لی۔ اگلے روز تک ہم ان ہی مچھلیوں سے گزارہ کرتے رہے۔ یہ ختم ہو گئیں تو ایک دن ہم بھوک برداشت کرتے رہے۔ مگر اس سے اگلے دن بھوک نے پھر پیٹ میں بل ڈال دیئے تھے۔ اس بار ہمیں مچھلیاں نہیں ملیں لیکن ایک تالاب میں جمی کائی مل گئی۔ یہ بدمزہ چیز کسی نہ کسی طرح حلق سے اتار لی تھی۔ آنے والے دو ہفتے ہم اسی طرح گزارہ کرتے رہے۔

بھوک، تھکن، نیند کی کمی، کیڑے مکوڑوں کے کاٹنے اور مختلف چوٹوں سے ہمارا برا حال تھا۔ کئی بار جاپانیوں سے سامنا ہوا لیکن قسمت نے ساتھ دیا اور ہم بچ نکلے۔ پیٹ کی آگ بجھانے کے لیے چھوٹی مچھلیوں کے بعد کیڑے مکوڑے، درختوں کے پتے، بیج اور جڑیں کھاتے رہے۔ ایک موقع پر جان نے ایک بڑی چھپکلی ماری اور ہم نے دم اور سر پھینک کر اسے کچا کھایا۔ آگ جلانے کے لیے ہمارے پاس کچھ نہیں تھا۔ جھاڑیوں، کانٹوں اور پتھروں سے الجھ کر

ہمارے کپڑے پھٹ گئے تھے۔ پتلونیں گھٹنوں سے اوپر آگئی تھیں اور شرٹس کی آستینیں ہی غائب تھیں۔ جوتے پھٹ گئے تھے اور ہم ان کے اوپر بیلوں کی سوکھی ڈوریاں لپیٹ کر کام چلا رہے تھے۔ ہر دوسرے دن ہمیں ساحل یا سمندر دکھائی دیتا جس سے اندازہ ہوتا کہ ہم سفر کے کس حصے میں ہیں۔

تیسرا ہفتہ شروع ہوا تو ہم سلوویسی کے جنوبی حصے کے پاس تھے لیکن ہمارے اندر ہمت ختم ہو چکی تھی اور ہم بس مارے باندھے چل رہے تھے۔ ایک آس تھی جو ہمیں حرکت میں رکھے ہوئے تھی کہ بالآخر ہم آزاد علاقے میں پہنچ جائیں گے۔ دوسرے دن جب صبح طلوع ہوئی تو جان نے آگے جانے سے انکار کر دیا۔ ”میں بالکل ختم ہو گیا ہوں۔ اب مجھ میں چلنے کی ہمت نہیں ہے۔ تم جاؤ میں یہاں لیٹ کر اپنی موت کا انتظار کروں گا۔“

”میں تمہیں چھوڑ کر نہیں جاؤں گا۔“ میں نے کہا اور ایک بڑی ڈھلان والی پہاڑی کی طرف اشارہ کیا۔ ”اگر ہم اس کے پار پہنچ گئے تو شاید ہمیں کوئی مدد یا خوراک مل جائے۔“

”کیوں اس کے پار کیا ہے۔“ جان نے چڑچڑے انداز میں کہا۔ ”اس کے بعد ایسی ہی ایک پہاڑی اور ہوگی۔“

”نہیں مجھے امید ہے اب ایسا نہیں ہوگا۔“ میں نے اس کا حوصلہ بڑھایا اور کسی نہ کسی طرح اسے چلنے پر آمادہ کر لیا تھا۔ ہم گرتے پڑتے اس پہاڑی پر چڑھتے رہے اور جب رات ہوئی تو ہم چوٹی سے ذرا دور تھے۔ ہم اسی جگہ گر گئے اور ایسے بے سدھ ہوئے کہ رات گزرنے کا پتا ہی نہیں چلا تھا۔ صبح ہوئی تو میری حالت جان سے مختلف نہیں تھی اور میرا بھی دل چاہ رہا تھا کہ بس لیٹا رہوں اور پھر موت آ کر مجھے لے جائے۔ جان نیم غشی میں تھا۔ گزشتہ چار دن سے ہمارے پیٹ میں سوائے پانی کے اور کچھ نہیں گیا تھا۔ ہمیں لیٹے ہوئے دوپہر ہو گئی۔ اچانک مجھے خیال آیا کہ ہم نے اتنی جدوجہد کس لیے کی تھی۔ موت کو شکست دینے کے لیے نا؟ اور اب ہم نے موت کے آگے ہتھیار ڈال دیئے تھے۔ یہ خیال آتے ہی میں اٹھ بیٹھا۔ جان جاگ گیا تھا۔ اس نے پوچھا۔

”اب کیا کرو گے؟“

”ہمیں آگے جانا ہوگا۔“

”مجھ میں ہمت نہیں ہے بلکہ کچھ بھی نہیں ہے۔“

”نہیں اٹھو۔“ میں نے اسے زبردستی اٹھایا۔ وہ مجھے برا بھلا کہتا رہا لیکن میں نے اسے سفر پر آمادہ کر لیا۔ ہم چوٹی کے آخری حصے کی طرف بڑھے۔ ایک گھنٹے بعد ہم چوٹی پر تھے جس کے دوسری طرف دور تک نرم ڈھلان تھی اور سب سے اہم بات اس کے نیچے ایک فوجی کیمپ تھا جس پر اتحادی پرچم لہرا رہا تھا۔ ہم وہاں تک کیسے پہنچے یہ یاد نہیں بس اتنا یاد ہے کہ آخر میں، کچھ فوجی دوڑتے ہوئے ہماری طرف آرہے تھے اور پھر مجھے ہوش آیا تو میں فیلڈ ہاسپٹل کے ایک بیڈ پر لیٹا ہوا تھا اور مجھے ڈرپ دی جا رہی تھی۔ ایک دن میں ہماری حالت اتنی بہتر ہو گئی کہ کیمپ کمانڈر کرنل بارٹ کو اپنے فرار کی کہانی سنا سکیں۔ ہماری داستان سن کر اس نے کہا۔ ”جاپانی بڑے حملے کی تیاری کر رہے ہیں۔“

تین دن بعد ہمیں ایک چھوٹے طیارے میں پاپوا نیوگنی روانہ کر دیا گیا۔ وہاں سے مزید دو دن بعد ہم واپس آسٹریلیا پہنچ گئے تھے۔ چھ مہینے بعد میں ایک نئے دستے کے ساتھ انڈونیشیا کے لیے روانہ ہوا اور ہمارے دستے نے جاپانیوں کو شکست دینے میں اہم کردار ادا کیا تھا۔ انڈونیشیا جاپان کے تسلط سے آزاد ہو گیا۔ پھر جاپانی شکست کھاتے چلے گئے اور آخر میں امریکی فوج نے جاپان پر قبضہ کر کے ایشیا میں اس جنگ کا خاتمہ کر دیا۔ انڈونیشیا کی آزادی کے فوراً بعد مجھے اس خاص گروپ میں شامل کیا گیا جو سلوویسی کے شمالی حصے میں واقع اس کان تک جاتا اور وہاں جاپان کی سرگرمیوں کا جائزہ لیتا جو دورانِ جنگ کی جاتی رہی تھیں۔ لیکن جب ہم وہاں پہنچے تو کان تباہ ہو چکی تھی۔ جاپانیوں نے پسپائی سے پہلے اس کے سارے فلورز پر بہت بڑی مقدار میں بارود لگا کر اسے اڑا دیا تھا اور دھماکے نے کان بٹھا دی تھی۔ حد یہ کہ وہ دہانہ بھی بند ہو گیا تھا جس سے ہم فرار ہوئے تھے۔ بعد میں جاپان کی وزارتِ سائنسی تحقیق کی بعض دستاویزات سے پتا چلا کہ دورانِ جنگ جاپان نے کیمیائی اور حیاتیاتی ہتھیاروں کی تیاری کے لیے مقبوضہ علاقوں میں ایسی تجربہ گاہیں قائم کی تھیں اور یہاں جنگی قیدیوں پر ان ہتھیاروں کے تجربات کیے جاتے تھے۔ یہ بھی یقیناً ایسی ہی تجربہ گاہ تھی۔ میری اور جان کی خوش قسمتی کہ ہم تجربات کی بھینٹ چڑھنے سے بچ گئے تھے۔

ترکی نمی دانم

علی سُفیان آفاقی

سرگزشت کا خاصّہ ہے کہ دلچسپ اور انفرادیت کے حامل سفرنامے پیش کرتا ہے۔ جو صرف سفرنامہ نہیں معلومات کا خزانہ بھی ثابت ہوتا ہے۔ سرگزشت کے مستقل قلمکاروں میں علی سفیان آفاقی جیسے کہنہ مشق قلمکار بھی ہیں۔ عرصے سے قارئین اصرار کناں تھے کہ ان کے سفرنامے دوبارہ پیش کیے جائیں۔ پاک فلم نگری کو جب عروج حاصل تھا اور علی سفیان آفاقی فلم یونٹ کے ساتھ ملکوں ملکوں جایا کرتے تھے اس دور کے قصے تو وہ بیان کر ہی چکے ہیں لیکن جب جب سفر برائے شوق کیا اس دور کے قصے بھی کم دلچسپ نہیں، وہی کچھ وہ سنا رہے ہیں۔ الفاظ کی نشست و برخواست، جملوں کی خوبصورت ادائیگی اور روانی بہت کچھ آپ اس سفر کہانی میں پائیں گے۔

ترکی کے سفر کی دلچسپ روداد، سفر کہانی کی چھٹی کڑی

مرزا صاحب سویرے سویرے ہی ہمارے ہوٹل پہنچ گئے تھے اور ہوٹل کی لابی میں بیٹھے اخبار بینی کم لیکن خواتین بینی زیادہ کر رہے تھے۔ خواتین بینی ایک بالکل نئی اصطلاح تھی جو بٹ صاحب نے اختراع کی تھی۔ ہمارے ملک میں تو بے تکلف دوست احباب گزرتی ہوئی فیشن ایبل خوبصورت خواتین کو ”تاڑنا“ کہتے ہیں لیکن بٹ صاحب نے اس کی جگہ ایک مہذب لفظ ایجاد کیا تھا جسے ”خواتین بینی“ نام دیا تھا۔

خان صاحب نے فوراً اعتراض کیا "بٹ صاحب، اول تو خواتین بنی ایک لفظ نہیں ہے یہ دو الفاظ ہیں۔ ایک خواتین اور دوسرے بنی۔"

بٹ صاحب بے پروائی سے بولے۔ "میں گرامر میں ہمیشہ کمزور رہا ہوں اسی لیے تین سال کی کوشش کے بعد میٹرک پاس کیا تھا۔ والد صاحب تو کہتے تھے کہ بس بہت ہوگیا، اب اسے زمینداری پر لگا دو مگر والدہ کے پورے خاندان میں کوئی چوتھی پاس بھی نہ تھا اس لیے وہ اپنے خاندان والوں پر رعب جمانے کے لیے چاہتی تھیں کہ اگر وہ ایف ایس سی نہ کرے تو کم از کم میٹرک پاس تو کہلائے۔

خواتین جب اس قسم کے فیصلے کرتی ہیں تو ان کے ذہن میں ہمیشہ بیٹے کے رشتے کا خیال آتا ہے۔ اور یہ سچ ہے کہ چھ سال فیل ہونے کے بعد میں نے "بی اے" پاس کیا تو اس سے پہلے ہی سارے خاندان والوں کی خواہش تھی کہ میں ان کا داماد بنوں۔"

"پھر آپ نے کیا کیا؟"

"پھر میں نے خاندان میں کسی کو گھاس نہیں ڈالی اور خاندان سے باہر اپنے ایک دوست کی بہن سے شادی کرلی۔

اماں جی نے بہت برا منایا کہ "ارے کم بخت کیا تجھے رشتوں کی کمی تھی جو تو دوسروں کے کھیتوں میں چرنے پہنچ گیا۔"

میں نے انہیں سمجھایا کہ دیکھو اماں جی، ہم سارے انسان ایک ہی خاندان سے تعلق رکھتے ہیں۔ ہمارے جدِامجد آدم علیہ السلام اور اماں حوّا ہمارے بزرگ ہیں اگر وہ نہ ہوتے تو آج ہم سب بھی نہ ہوتے یا پھر ڈھور ڈنگروں کی طرح ہوتے۔

حضرت آدمؑ کا نام سنتے ہی اماں جی نے اپنی دونوں ہتھیلیوں پر پھونک کر انہیں آنکھوں سے لگایا اور حضرت آدم اور اماں حوّا کے لیے مغفرت کی دعا کرنے لگیں جو اتنی لمبی تھی کہ اگر میں انہیں نہ ٹوکتا تو صبح تک دعائے مغفرت ہی کرتی رہتیں۔

دوسرا نکتہ میں نے انہیں یہ سمجھایا کہ ہمارے رسول نے فرمایا ہے کہ تمام انسان ایک جیسے ہیں۔ ان میں کوئی چھوٹا بڑا اور امیر غریب ہو بھی تو وہ مسلمان ہونے کی حیثیت سے ہمارے برابر ہے۔

"اماں جی نے پھر دعائے مغفرت اور درود پڑھنا شروع کردیا مگر میں نے انہیں روک دیا اور کہا۔ اماں جی۔ شکر کرو کہ ہم کشمیری ہیں اور تمہاری ہونے والی بہو بھی کشمیری ہے۔ کشمیر کو دنیا میں جنت کہتے ہیں چونکہ حضرت آدم کو اللہ میاں نے کشمیر ہی میں اتارا تھا۔ خوبصورتی کے لحاظ سے ہم دوسروں سے بڑھ کر ہیں مگر انسان ہونے کے ناتے سب مسلمان ہیں۔ اماں جی شکر ادا کرو کہ اللہ نے باوا آدم کو کشمیر کی حسین جنت میں اتارا تھا۔ اگر وہ انہیں افریقا میں اتار دیتے تو آج ہم سب حبشی ہوتے۔"

اماں جی کی سمجھ میں یہ فلسفہ آگیا۔ نہ بھی آیا ہوگا تو انہوں نے مان لیا تھا اور تمہاری بھابی کو اپنی بہو تسلیم کرکے اس کی بلائیں لے کر پیشانی چومی تھی اور پھر ایک بہت پرانا کالے رنگ کا کڑا اس کے ہاتھ میں پہنا کر کہا تھا۔ "دلہن، یہ ہمارا خاندانی کڑا ہے۔ ہر ساس اپنی بہو کو یہ تحفہ دیتی ہے۔ خالص سونے کا ہے۔ تھوڑی دیر تک زمین پر یا پتھر پر رگڑو گی تو تمہیں اصلی سونا نظر آجائے گا۔"

یہ کہہ کر انہوں نے ابا جی سے کہا۔ "ارے سنتے ہو رفیع کے ابا؟"

"سن رہا ہوں۔ بہرا تو نہیں ہوں۔"

اماں اور ابا کے ڈائیلاگ ان دو فقروں سے ہی شروع ہوتے تھے۔

"تم نے میرے بیٹے کو بی اے کراکے بہت نیک کام کیا ہے اللہ تمہیں جنت نصیب کرے۔"

"اری نیک بخت ابھی میں مرا نہیں ہوں۔ زندہ ہوں۔"

"مگر کبھی تو مروگے نا، تو تم سیدھے جنت میں جاؤ گے۔"

بٹ صاحب کی یہ لمبی چوڑی تقریر سن کر ہم سب بہت لطف اندوز ہورہے تھے۔

اور مرزا اشرف تو ہنسی کے مارے لوٹ پوٹ ہوئے جارہے تھے۔

جب سب ہنس کر خاموش ہوئے تو بٹ صاحب نے مرزا صاحب سے پوچھا۔ "بولو فریادی تم کیا چاہتے ہو؟"

"ہم مسالا بازار دیکھنا چاہتے ہیں۔"

بٹ صاحب کا موڈ ایک دم خراب ہوگیا۔ ان کا خیال تھا کہ مسالا صرف کھانے کی چیز ہوتی ہے دیکھنے کی نہیں۔ کہنے لگے۔ "پاکستان واپس چلوگے تو میں تمہیں اکبری منڈی دکھادوں گا۔ وہاں ہر قسم کا مسالا ہوتا ہے۔ جتنی دیر چاہے تم لہسن پیاز کو دیکھتے رہنا۔"

مرزا نے کہا۔ "بٹ صاحب، مسالا بازار تو بس اس کا نام پڑ گیا ہے۔ اب یہاں قہوہ خانوں اور ریستورانوں کے سوا نہیں مسالا دیکھنے کو بھی نہیں ملتا۔"

بڑی مشکل سے بٹ صاحب مسالا بازار دیکھنے پر آمادہ ہوئے۔

مسالا بازار اس کا نام مشہور ہوگیا ہے حالانکہ اب یہاں مسالے فروخت نہیں ہوتے۔ عام شاپنگ سینٹرز کی طرح اس بازار میں دنیا بھر کی ہر چیز مل جاتی ہے۔ نوادرات پر غیر ملکی سیاح ٹوٹے پڑتے ہیں حالانکہ ان میں بیشتر نقلی یا جعلی ہوتے ہیں۔ کسی بھی پرانی تلوار، خنجر یا برش کو دکاندار نوادرات کہہ کر منہ مانگے دام وصول کرتے ہیں۔ غیر ملکی سیاح ان کو بڑے شوق سے خرید کر لے جاتے ہیں اور اپنے گھر جاکر انہیں فخریہ طور پر سجا کر رکھتے ہیں۔ اپنے ملاقاتیوں پر وہ یہ کہہ کر رعب ڈالتے ہیں کہ "خنجر سلطان محمد دوم کا ہے۔ یہ تلوار سلطان مراد کی ہے۔ برتن وہ ہے جس میں سلطان مراد کھانا کھایا کرتا تھا۔" مرزا اشرف نے ہمیں پہلے ہی باخبر کردیا تھا کہ ان دکانداروں کا شکار نہ بنیں۔

مسالا بازار کی تاریخی اہمیت یہ ہے کہ پہلے اس کا نام مصری بازار تھا۔ اس بازار کو سلطان مراد کی تیسری بیگم صفیہ سلطان کے حکم سے 1597ء میں تعمیر کیا گیا تھا۔ لیکن بازار میں داخل ہوں تو یہ احساس ہی نہیں ہوتا کہ یہ تین چار سو سال پرانا بازار ہے۔ اسے بہت سنبھال کر رکھا گیا ہے۔ صفائی اور خوبصورتی کا اہتمام کیا جاتا ہے۔ ترک بھی دوسری زندہ قوموں کی طرح اپنی پرانی یادگاروں کو بہت احتیاط سے رکھتے ہیں۔ ہماری طرح اپنی پرانی تاریخی یادگاروں کو مٹی کا ڈھیر یا ملبا نہیں بناتے، آج ہم شالیمار باغ لاہور کو دیکھیں تو عبرت حاصل ہوتی ہے۔ کسی زمانے میں یہ مغل بادشاہوں کی سیرگاہ تھی۔ مغل خوبصورت عمارتیں اور دلکش باغ تعمیر کرنے کے بہت شوقین تھے، کسی زمانے میں یہاں بڑی رونق ہوتی تھی۔ باغ کو بھی سجا کر رکھا جاتا تھا۔ سبزہ زاروں کے درمیان خوبصورت فوارے جب فضا میں ٹھنڈک اور حسن بکھیرتے تھے تو دیکھنے والا اندازہ کرسکتا تھا کہ شاہوں کے زمانے میں اس باغ کی کیا شان ہوگی۔ اس کی بیرونی دیواریں ٹوٹ چکی ہیں۔ سنگِ مرمر اور سنگِ سیاہ کے فرش اور راہداریاں ٹوٹے پھوٹے کھنڈر کا منظر پیش کرتی ہیں۔

شاہی قلعہ ایک نہایت پُرشکوہ اور خوبصورت یادگار ہے۔ دیکھا جائے تو یہ حسن و خوبی میں دہلی کے لال قلعے سے کہیں زیادہ خوبصورت ہے۔ جب رنجیت سنگھ کے زمانے میں (جسے اعتزاز احسن اور ان جیسے دانشور پنجاب کا بہترین فرماں روا اور ہیرو کہتے ہیں) اس ہیرو نے اپنے عہدِ حکومت میں شاہی مسجد کو گھوڑوں کا اصطبل بنادیا تھا۔ قلعے کی بلند و بالا خوبصورت محرابیں اور فرش اکھاڑ کر قیمتی پتھر نکال لیے تھے۔

شاہی قلعے کا دیوانِ عام دنیا بھر میں مشہور ہے خصوصاً اس کا شیش محل ایک حسن و تعمیر کا بہترین نمونہ تھا۔ آج یہ دیوانِ عام عبرت کی نشانی بن چکا ہے۔ کے آصف نے فلم "مغلِ اعظم" میں اس شیش محل کا شاندار سیٹ تعمیر کرایا تھا جسے فلم کی تکمیل کے بعد بھی سیاح دیکھنے آتے تھے اور اش اش کرتے ہوئے جاتے تھے۔ آج یہ شیش محل دیکھ کر آنکھوں میں آنسو آجاتے ہیں۔ قیمتی شیشے اکھاڑ لیے گئے ہیں جس کی ہماری کسی سابق حکومت نے ڈھنگ سے مرمت نہیں کرائی۔

قلعے کی بیرونی دیوار کو تلاش کرنا مشکل ہے۔ لوگوں نے شاہی قلعے کی حدود میں گھر بنالیے ہیں۔ قلعے کے اندر جاکر تو انسان کی آنکھیں کھلی کی کھلی رہ جاتی ہیں۔ یہ حصہ بالکل مسمار ہوچکا ہے۔ محکمہ آثار قدیمہ نے اس کی بحالی کے لیے چار پانچ کاریگر یا مزدور مقرر کردیے ہیں جو سارے دن بیٹھ کر "ٹھک ٹھک" کرتے رہتے ہیں۔ ذرا سوچیے کہ جو عمارت سنگ تراشوں، مزدوروں نے کئی سال کی شب و روز محنت کے بعد تعمیر کی تھی چار پانچ اناڑی سے مزدور اس کی مرمت کیسے اور کتنے مرحلے میں کریں گے؟

خیر چھوڑیے اس درد بھری داستان کو۔ ہم لوگ نہ حسن ذوق ہیں نہ خوبصورتی کے قدرداں۔ ہم ان جاہل اقوام میں شامل ہیں جو اپنے نوادرات کا تحفظ بھی نہیں کرسکتے۔ یہ حکمران شاید سارے ملک کو کھنڈر بنانے پر تلے ہوئے ہیں۔

استنبول کے مسالا بازار کو آج کا شاپنگ سینٹر بنادیا گیا ہے۔ دنیا بھر کی اشیا یہاں دستیاب ہیں۔ گھوم پھر کر تھک جائیں تو صاف ستھرے قہوہ خانے اور ریستوران ہیں۔ ہم مسلمانوں کے لیے ایک آسانی یہ ہے کہ یہاں حلال و حرام کی فکر نہیں ہے۔ خدا کے فضل سے تمام مویشی اسلامی طریقے سے حلال کیے جاتے ہیں۔ آپ بے فکر ہوکر جہاں چاہیں کھانا تناول فرمالیں۔

مرزا اشرف (اور دوسرے ترک دوستوں نے بھی)

ترکی کے قہوے کی بہت تعریف کی تھی یہاں تک کہ بٹ صاحب تنگ آکر بولے۔ ”بھائی یہ قہوہ ہے یا جنت کا میوہ؟“

یہ بازار بہت زیادہ چوڑا نہیں ہے مگر کافی کھلا ہوا اور سلیقے سے سجا ہوا ہے۔ دکانیں ایک طرف مختلف اقسام کی چیزیں فروخت کررہی ہیں۔ درمیان میں وسیع راستہ ہے جس پر بے شمار ملکی و غیر ملکی سیاح گھومتے پھرتے ہیں۔ دکان خواہ چھوٹی ہو مگر نہایت سلیقے سے ہر چیز سجا کر رکھی جاتی ہے۔ تجاوزات کا تو شاید انہیں مطلب بھی نہیں معلوم۔ کیا مجال جو دکاندار اپنی اشیا دکان کے باہر راستے یا فٹ پاتھ پر رکھ دے۔

مرزا مشرف کی کوشش تھی کہ سب سے پہلے ہم لوگ تازہ دم ہونے کے لیے ترکی قہوہ نوش کریں۔

جیسے ہی قہوہ خانے میں داخل ہوئے ایک نوجوان کہیں سے نمودار ہوا جیسے کسی نے الہ دین کا چراغ رگڑ کر بلایا ہو۔ اس نے ترکی میں جو کچھ کہا اس کا مطلب ظاہر ہے کہ یہی ہوگا ”حکم میرے آقا۔“

بٹ صاحب نے تین فنجان قہوہ لانے کا آرڈر دیا۔

ہم نے کہا۔ ”بٹ صاحب ہم چار ہیں۔ تین قہوے کی پیالیوں سے کیسے کام چلے گا۔“

بٹ صاحب نے پھر گن کر بتا دیا۔ ”ایک دو تین۔“ دراصل وہ ہر بار خود اپنے آپ کو گنتا بھول جاتے تھے۔

ہم لوگ قہوہ خانے میں بیٹھے تو قہوے کی خوشبو بہت بھلی لگی۔ بٹ صاحب حسبِ معمول ”خواتین بینی“ میں مصروف ہوگئے۔

”کتنی خوبصورت عورتیں ہیں۔“

ہم نے کہا۔ ”بٹ صاحب، شرم کرو۔ ایک مسلمان ملک کی عورتوں کو تاک رہے ہو۔“

کہنے لگے۔ ”نہیں۔ میں صرف غیر ملکی سیاح عورتوں کو دیکھ رہا ہوں اور دل ہی دل میں لاحول پڑھ رہا ہوں۔“

”مگر سب نے تو مغربی لباس، جینز اور قمیص پہن رکھی ہیں۔ آپ کو ملکی اور غیر ملکی کا فرق کیسے معلوم ہوتا ہے۔“

”دیکھو بچو، ایک بات یاد رکھو فیشن اور بے شرمی میں مسلمان عورتیں خواہ کیسی بھی ہوں ان کے چہروں پر ایک نور ہوتا ہے۔ ذرا غور سے دیکھو۔“

بہت غور سے دیکھا مگر ہمیں تو کوئی فرق محسوس نہیں ہوا۔

بٹ صاحب نے مزید فرمایا ”مسلمان ترک عورتیں بے شرم سہی مگر بے باک نہیں ہوتیں۔ وہ دیکھو سامنے دو غیر ملکی عورتیں (لاحول ولا قوۃ) کس قدر بے باکی اور بے حیائی سے چلی آرہی ہیں جیسے اپنے گھر کے ڈرائنگ روم میں بیٹھی ہیں۔ بس مسلم اور غیر مسلم عورتوں میں یہی فرق ہے۔“

مرزا مشرف نے فوراً کہا ”ہماری سمجھ میں تو کچھ نہیں آیا۔ مرزا غالب کا شعر ضرور یاد آگیا ہے کہ

دے اور دل ان کو جو نہ دے مجھ کو زباں اور

بٹ صاحب کو اللہ نے جو آنکھ دی ہے وہ ہماری قسمت میں کہاں۔“

بٹ صاحب نے فخریہ انداز میں کہا۔ ”آخر کشمیری ہوں۔“

سیاہ پینٹ اور سفید قمیص میں ملبوس انتہائی مہذب ویٹر قہوہ لے کر آگیا تھا اور اس انتظار میں ہاتھ باندھے کھڑا تھا کہ ہم لوگ ترکی قہوہ پی کر کس قدر لطف اندوز ہوئے ہیں۔

قہوے کی خوشبو سے کمرا مہک گیا۔ ہم نے فوراً فنجانوں (شیشے کے گلاس نما کپوں) میں چینی ڈالنی شروع کردی۔ ویٹر ایک دم بول پڑا۔ شاید یہ کہہ رہا تھا کہ قہوے میں چینی اور دودھ نہیں ڈالتے۔

قہوہ خاصا گاڑھا تھا۔ اتنا کہ چمچہ چلانے کے لیے زور لگانا پڑتا تھا۔ (یہ بٹ صاحب کی رائے تھی)۔

ہم سب نے گرم گرم قہوے کا ایک گھونٹ لیا تو چودہ طبق روشن ہوگئے۔ اس قدر گرم کہ ہونٹ جل گئے۔ اس کے ٹھنڈا ہونے کا انتظار کیا۔ پھر قہوے کو منہ لگایا تو یوں لگا جیسے زہر پی رہے ہیں۔ اس قدر تلخ اور بدمزہ، عرب بھی ایسا ہی قہوہ پیتے ہیں۔ ایک بار چند گھونٹ لینے کے بعد ہماری کبھی ہمت نہیں پڑی کہ عربی قہوے سے لطف اٹھائیں جسے وہ بدذوقی کہتے ہیں۔ کہتے رہیں۔ ہمارا کیا بگڑتا ہے۔

خان صاحب بولے ”میرا خیال ہے کہ لقمان کو زہر کی بجائے یہی قہوہ پلا کر مارا ہوگا، ہم یہ بھول گئے کہ ترک ویٹر بدستور ہمارے سر پر سوار تھا اور ہمارا ردِعمل دیکھنے کا منتظر تھا۔

ہم سب نے اس کا دل رکھنے کے لیے ”بے حد لطیف ویری گڈ“ کہہ کر اسے رخصت کیا۔

دیکھیے صاحب، اگر آپ کو ترکی، استنبول جانا ہو تو ہماری دو نصیحتیں ہمیشہ یاد رکھیں۔ زہر پی لیں مگر یہ تلخ کڑوا اور عجب مزے کا قہوہ ہرگز نہ پئیں۔ دوسرے کہ جب آپ کے سامنے پنیر لایا جائے تو پہلے اسے چکھ لیں۔ دیکھنے میں تو بالکل تازہ اور بہت لطیف نظر آتا ہے۔ ہم نے لالچ میں آکر تین چار بڑے چمچے پنیر کے لے لیے اور بہت خوش ہوکر ایک چمچہ کھایا تو لقمہ وہیں اٹک کر رہ گیا۔ اس قدر نمکین اور تلخ کہ نہ کھائے بنے نہ اگلے بنے۔ شکر ہے کہ کافی بھی ساتھ ہی رکھی تھی۔ ہم نے کافی کی مدد سے بڑی مشکل سے پنیر کو حلق سے اتارا اور پھر عہد کیا کہ ترک پنیر کبھی نہیں کھائیں گے۔

کم از کم ہمارا تو یہی تجربہ ہے۔ باقی آپ خود ہی آزما کر دیکھ لیں۔ ہوسکتا ہے شاید ہم غلطی پر ہوں۔ لہٰذا ہمارا مشورہ ہر ترکی جانے والے کو یہ ہے کہ اس ملک کا چپا چپا قابلِ دید ہے لیکن دو چیزوں کے نزدیک بھی ہرگز نہ جانا۔ ایک دیکھنے میں بہت تازہ اور سفید پنیر، دوسرے ترکی قہوہ۔ ترک آپ کے سامنے ان دونوں چیزوں کی اس طرح تعریفیں کریں گے جیسے یہ جنت کا میوہ ہے۔ یاد رکھیے، ترکوں کی ہر بات پر بھروسا کرلینا سوائے پنیر اور قہوہ کے۔ ان دونوں چیزوں کی تلخی اور کڑواہٹ دور کرنے کے لیے ہم نے مقامی مٹھائی کی دکان ”ٹرکش ڈیلائٹ“ سے کچھ مٹھائی خرید کر کھائی تو کچھ دم میں دم آیا۔

جیسا کہ پہلے بتایا جاچکا ہے استنبول کے مسالا بازار سے پرہیز ہرگز نہ کیجیے گا۔ کہنے کو یہ مسالا بازار ہے لیکن تمام مسالے بڑی خوبی سے شیشے کی بوتلوں میں بند کر کے رکھے گئے ہیں۔ جس کی وجہ سے بازار میں داخل ہونے کے بعد کسی قسم کی خوشبو کا احساس نہیں ہوا۔

بٹ صاحب نے معصومیت سے پوچھا۔ ”یہ مسالے کھانے کے لیے ہیں یا دکھانے کے لیے؟“

ہم نے کہا ”یہ حسبِ ضرورت دونوں کاموں کے لیے استعمال کیے جاتے ہیں۔“

مرزا مشرف فرما رہے تھے کہ اگر کسی نے استنبول آکر مسالا بازار نہیں دیکھا تو سمجھو کچھ بھی نہیں دیکھا۔ مسالا بازار دراصل صرف مسالا بازار ہی نہیں ہے۔ ایک حصے میں مسالے ہیں تو دوسرا حصہ مغربی اور مقامی سیاحوں کو للچانے کے لیے ہر قسم کی اشیا سے بھرا پڑا ہے۔

مرزا مشرف نے کہا کہ اس بازار میں آپ سوئی سے لے کر ہاتھی اور ہوائی جہاز کے علاوہ ہر چیز خرید سکتے ہیں۔ ہاتھی اس لیے کہ ترکوں نے ہندوستان میں جنگلوں کے سوا کبھی ہاتھی نہیں دیکھا تھا انہوں نے صرف تصویروں یا فلموں میں دیکھا ہے۔ ہوائی جہاز کا سائز کیونکہ بہت بڑا ہوتا ہے اس لیے

گرین لینڈ Green Land

رقبہ 840000 مربع میل یا 2175600 مربع کلومیٹر۔ شمالی امریکا کے شمال مشرق میں واقع بحر منجمد شمالی میں ایک جزیرہ ہے جس کا دارالحکومت گوڈتھاب ہے۔ انتظامی سہولت کے لیے اس کو تین اضلاع مغربی مشرقی اور شمالی حصوں میں تقسیم کردیا گیا ہے، یہاں بہت تھوڑے انگریز آباد ہیں۔ باقی اسکیمو اور ڈنمارک کے لوگ ہیں۔ 1774ء سے اس پر ڈنمارک کا قبضہ ہے۔ اس کا صرف 30 ہزار مربع میل قطعہ اراضی برف کے بغیر ہے۔ باقی علاقے کو برف نے ڈھانپ رکھا ہے۔

گرین لینڈ کے جزیرے سے قدیم سکینڈے نیویا کے لوگ آشنا تھے۔ 1585ء میں اسے جان ڈیوس نے دوبارہ دریافت کیا۔ یہاں ڈنمارک کے لوگوں نے 1721ء میں پہلی بستی بنائی۔ 19 اپریل 1941ء کو ڈنمارک کی حکومت کی مرضی سے اس جزیرے میں امریکا نے فوجی اڈے قائم کیے۔ 1979ء کے ریفرنڈم کے تحت 1981ء میں اسے اندرونی خودمختاری دے دی گئی۔

مرسلہ: نازش بخاری، جھنگ

گرینچ Greenwich

صحیح تلفظ گرین اچ یا گرین اچ۔ 1۔ لندن کا ایک شہر جو دریائے ٹیمز کے کنارے آباد ہے۔ 1675ء میں یہاں شاہی رصدگاہ قائم کی گئی۔ یہاں کا عرض بلد صفر ہے چنانچہ یہاں کے وقت کو برطانیہ کا معیاری وقت قرار دیا گیا ہے اور تقریباً تمام دنیا میں وقت کا اندازہ اسی سے لگایا جاتا ہے۔ اسے گرینچ مین ٹائم کہتے ہیں۔ شہر کی دیگر خصوصیات شاہی بحریہ کالج اور بحری عجائب گھر ہیں۔ 2۔ جزیرہ مین ہٹین (نیویارک شہر) کا ایک حصہ جہاں زیادہ تر آرٹسٹ (بوہیمین اور نان کنفارمسٹ) آباد ہیں گرینچ ولیج کے نام سے معروف ہے۔ 3۔ ریاست کانیکٹی کٹ (ریاست ہائے متحدہ کے جنوب مغرب میں ایک شہر۔

مرسلہ: فارحیہ اسلم، لاہور

اس بازار میں ہوائی جہاز بھی فروخت نہیں ہوتے۔ کاریں اور بجلی کا ہر قسم کا سامان آپ اس بازار میں دیکھ اور خرید سکتے ہیں۔ ہر قسم کا کپڑا، جوتے، سامانِ آرائش، جڑی بوٹیاں یہاں آپ کو مل جائیں گی۔

ایک اور بات یاد رکھنے کی یہ ہے کہ ترک دکاندار چرب زبانی اور قیمت بڑھا چڑھا کر بتانے کے معاملے میں ہمارے دکانداروں سے کم نہیں ہیں۔ بقول خان صاحب اگر ترک دکاندار اور پاکستانی دکانداروں کو آمنے سامنے بٹھا دیا جائے تو ہمارے دکاندار بہت جلد ہار مان جائیں گے اور انہیں اپنا استاد مان کر کان پکڑ لیں گے۔ (ان کے نہیں، اپنے) یہاں زیادہ تر دکانیں نوادرات کی ہیں۔ سلطنتِ عثمانیہ کی تاریخ اتنی پرانی اور شاندار ہے کہ اگر آپ پیتل کا کوئی برتن بھی رگڑ کر اور اس کا حلیہ بدل کر کہہ دیں کہ اس پیالے میں سلطان مراد قہوہ پیا کرتا تھا تو فوراً یقین آ جائے گا۔ کم از کم غیر ملکی سیاح تو ان چیزوں کے عاشق ہیں۔ ان بے چاروں کو تو بھاؤ تاؤ کرنا بھی نہیں آتا۔ اگر دکاندار کہے کہ یہ قالین سلطان محمد کے بیڈ روم کی زینت تھا تو غیر ملکی سیاح اس کو خریدنے کے لیے ہر قیمت ادا کرنے کو تیار ہو جاتے ہیں۔

"ہاؤ مچ؟"

"دس ہزار لیرا۔"

"نو نو۔ وہاٹ اباؤٹ نائین تھاؤزنڈ۔"

دکاندار کا سو سو احسان مانے گا اور شکریہ ادا کرنے کے بعد پچاس روپے کا یہ گھسا پٹا پائیدان بڑے فخر سے اپنے شہر جا کر دوسرے امریکنوں پر رعب ڈالے گا۔

بٹ صاحب نے پوچھا۔ "آخر یہ امریکن اتنے بیوقوف کیوں ہوتے ہیں۔"

خان صاحب بولے۔ "شاید اسی لیے ساری دنیا پر حکومت کرتے ہیں۔"

مرزا اشرف نے بتایا کہ یہ بازار 1597ء میں سلطان مراد کی بیگم نے بنوایا تھا مگر دیکھو، آج بھی بالکل نیا لگتا ہے۔"

خان صاحب نے ایک آہ بھری۔ "دنیا بھر میں ہزاروں پرانی عمارتیں بالکل اصلی حالت میں موجود ہیں مگر ہمارے ہاں دو سال پہلے بنی ہوئی عمارت بھی دو چار سو سال پرانی نظر آتی ہے۔ بلکہ بعض عمارتوں کی جگہ تو محض کھنڈرات ہی باقی رہ گئے۔"

"بھائی ہم رئیس لوگ ہیں۔ جب نئی نکور عمارتیں بنا سکتے ہیں تو ان پرانی عمارتوں کو باقی رکھنے کی کیا ضرورت ہے۔ آپ کو پتا ہے کہ آج کل پاکستان میں زمین کتنی مہنگی ہے۔"

بٹ صاحب فلسفیانہ انداز میں بولے۔ "شاید آپ لوگوں کو معلوم نہیں ہے کہ دنیا کا تیسرا حصہ سمندر ہے۔ صرف ایک حصہ خشکی کا ہے۔ آبادی روز بروز بڑھتی جا رہی ہے۔ اب نئی عمارتیں بنائیں یا پرانے کھنڈروں پر قیمتی زمین ضائع کریں۔"

مرزا اشرف بولے۔ "میں نے ایک اخبار میں پڑھا تھا کہ زمین کی کمی کی وجہ سے اب جاپان میں کئی کئی منزلہ قبریں بنائی جا رہی ہیں۔"

"یار جاپانی تو سدا کے بیوقوف ہیں ورنہ امریکیوں سے شکست کیوں کھاتے۔ ہمارے ملک میں یہ منتا ہی نہیں پالتے۔ کچھ عرصے بعد ایک پرانی قبر کھود کر دوسری قبر بنا دیتے ہیں۔ میں جب بھی قبرستان جاتا ہوں والدین اور دوسرے رشتے داروں کی قبروں کو تلاش ہی کرتا پھرتا ہوں، خود گورکن بھی نہیں جانتا کہ پرانی قبر کہاں چلی گئی۔ وہ بھی یہ کہہ کر جان چھڑاتا ہے کہ صاحب جی پہلے تو یہیں تھی۔ اب نہ جانے کہاں چلی گئی۔"

گویا ہمارے ہاں قبریں بھی چلتی پھرتی رہتی ہیں۔

"تم قبر کی بات کر رہے ہو۔ بھائی قبرستانوں کی جگہ فیشن ایبل آبادیاں بن گئی ہیں۔ ہمارا لاہور کا میانی صاحب کا قبرستان کتنا بڑا تھا۔ اب سکڑ کر پونا رہ گیا ہے۔ باقی جگہوں پر آبادیاں بن چکی ہیں۔"

خان صاحب پھر فلسفیانہ انداز میں بولے۔ "اسی لیے آنحضورؐ نے فرمایا تھا کہ قبریں کچی بناؤ تاکہ وہ جگہ دوسروں کے بھی کام آ سکے۔"

"بھئی کمال ہے۔ ساڑھے پانچ سو سال پرانے بازار میں گھوم رہے ہو اور باتیں قبروں اور قبرستانوں کی کر رہے ہو۔ یہ باتیں تو ہم لاہور میں بیٹھ کر بھی کر سکتے تھے۔ اتنا پیسا خرچ کر کے اتنی دور آنے کی کیا ضرورت تھی؟"

"ضرورت تھی۔ اس لیے کہ لاہور کے پاس کوئی سمندر نہیں ہے۔ لے دے کر ایک راوی تھا، جو پہلے بڈھا راوی بنا اور اب نالا ہی بن کر رہ گیا ہے۔"

اذان کی آواز سنائی دی تو سب نے سوچا کہ کم از کم پردیس میں تو نماز پڑھ لیں۔ شاید گناہ بخشے جائیں۔

استنبول کی اکثر مسجدوں میں نیلا پتھر استعمال کیا گیا ہے۔ انتہائی صاف ستھری اور سجی ہوئی مسجدیں ہیں۔ بعد میں مرزا اشرف نے بتایا کہ مسجدیں صرف نماز کے وقت کھولی جاتی ہیں تاکہ مُلاّ آ کر فرقہ پرستانہ تقریریں کر کے مسلمانوں کے مابین نفرتیں نہ پھیلائیں۔ ہماری مسجدوں پر مُلاّؤں کا قبضہ ہے۔ دراصل یہ ان کا ذریعہ آمدنی بھی ہیں اور اپنے مخالف فرقے کے خلاف نفرتیں پھیلانے کا سبب بھی ہیں۔ ہر مسجد کسی نہ کسی مُلاّ کی جاگیر ہوتی ہے۔ یہ جاگیریں موروثی ہوتی ہیں۔ ہم لوگ جلدی جلدی مسجد گئے۔ ہم سب نے اپنی عادت کے مطابق اپنے اپنے جوتے اتار کر بغل میں دبائے۔ عموماً ہمارے ہاں سامنے جوتے رکھ کر نماز پڑھی جاتی ہے پھر بھی نمازی کا دھیان نماز سے زیادہ اپنے جوتوں کی طرف رہتا ہے۔ اس قدر احتیاط کے باوجود مساجد سے جوتے غائب ہو جاتے ہیں اور کئی لوگ ننگے پیر ہی مسجد سے رخصت ہوتے ہیں۔

یہاں مسجد کے صاف ستھرے اندر جانے کے راستے میں دو آدمی بیٹھے ہوئے تھے۔ آپ جیسے ہی جوتا اتارنے کا ارادہ کرتے وہ ترکی زبان میں فوراً روک دیتے اور ایک سفید موزے نما چیز آپ کے حوالے کرتے کہ یہ جوتوں کے اوپر پہن لیجیے۔ مسجد بھی صاف رہے گی اور آپ کا دھیان بھی نماز کی طرف رہے گا۔

ترکی ایک ملا جلا معاشرہ ہے۔ کوئی کسی کو ٹوکتا یا اعتراض نہیں کرتا۔ جو خواتین اسکرٹ پہنے ہوتی ہیں، ایک لمبا لنگی نما صاف ستھرا کپڑا ان کے حوالے کر دیا جاتا ہے کہ اپنی ننگی ٹانگیں ڈھانپ لیں۔ سروں کو وہ اپنے رومالوں سے ڈھانپ لیتی ہیں۔ یہ ہے صحیح طریقہ مسجد میں نماز پڑھنے کا۔ ہمارا مولوی تو ماڈرن عورت کو مسجد کے اندر قدم رکھنے کی اجازت ہی نہیں دیتا یا پھر حکم دیتا ہے کہ عبایا پہن کر آؤ ورنہ کہیں اور جاؤ۔ جن لوگوں کو وضو کرنا تھا انہوں نے صاف ستھری جگہ بیٹھ کر وضو کیا اور جماعت میں شامل ہو گئے۔ امام صاحب سوٹ پہنے ہوئے تھے۔ نہ سر پر ٹوپی، نہ پگڑی، نہ عمامہ، ان کا سر بھی ننگا تھا۔ بٹ صاحب نے ہمیں کہنی ماری کہ ذرا دیکھیے یہ ترکی کے امام صاحب ہیں۔ ہمارے ملک میں تو اس لباس کے لوگوں کا داخلہ بند ہوتا ہے یا ان کو طعنے دیے جاتے ہیں کہ دیکھیے کرسٹان بھی مسجد میں آنے لگے۔

مگر جب امام صاحب نے تلاوت شروع کی تو یوں لگا جیسے کانوں میں کوئی شہد ٹپکا رہا ہے۔ جماعت ختم ہوئی تو دعا بھی اور صرف قرآن کی تلاوت کا ترجمہ سنا کر نماز ختم۔

گلبرگہ

جنوبی ہند کا ایک شہر۔ آبادی چار لاکھ کے قریب ہے۔ روئی کاتنے اور کپڑا بننے کے کئی کارخانے ہیں۔ گلبرگہ مسلمانوں کی بہمنی سلطنت کا (1347ء سے 1432ء تک) دارالحکومت رہا۔ یہاں فیروز شاہ بہمنی کا مقبرہ ہے۔ تیرہویں صدی کی مسجد جامع مسجد قرطبہ کے نمونے پر بنائی گئی ہے۔

مرسلہ: علی حسن، ساہیوال

نہ خطبہ نہ تقریر۔ نہ سیاست پر تبصرہ۔

"بھئی کمال ہے۔ ایسی نماز تو زندگی میں پہلی بار پڑھی ہے۔"

لیکن اس بات پر سب متفق تھے کہ نماز میں ایسا لطف پہلے کبھی نہیں آیا۔ شاید اس لیے کہ یہ ایک خالص نماز تھی جس میں امام صاحب کا اپنا خطبہ اور ذاتی خیالات شامل نہ تھے ورنہ ہماری مساجد میں عموماً دین اور مذہب سے زیادہ امام صاحب کی تقریریں اور سیاسی نظریات شامل ہوتے ہیں۔

بٹ صاحب کا خیال تھا کہ اب ہم اس تاریخی بازار میں آ ہی گئے ہیں تو ہمیں یہاں سے کوئی نہ کوئی آثارِ قدیمہ سے تعلق رکھنے والی یادگار ضرور ساتھ لینی چاہیے۔ مرزا مشرف نے انہیں یہ کہہ کر روکنے کی کوشش کی کہ اول آپ کو یہاں اصلی یادگار آثارِ قدیمہ ملیں گی نہیں یا پھر اگر کوئی مصدقہ چیز پسند بھی آئی تو اس کی قیمت سن کر آپ کے ہوش اڑ جائیں گے۔

"مرزا صاحب آپ ہر بار مایوس کرنے والی باتیں کر کے ہمارا دل توڑ دیتے ہیں۔ آپ چاروں طرف دیکھیے جہاں شمار غیر ملکی سیاح گھومتے پھر رہے ہیں لیکن کیا کسی کے ہوش اڑتے ہوئے نظر آ رہے ہیں۔ سب کے ہوش ٹھکانے ہیں اور وہ نایاب چیزوں کو مہنگے داموں خرید کر بھی خوش نظر آ رہے ہیں۔"

"ارے یہ تو بیوقوف ہیں۔ ان کا تاریخ سے کوئی واسطہ نہیں ہے۔ اگر آپ ان کو اپنے گھر میں کھانا پکانے والا کفگیر بھی دکھائیں اور کہیں گے کہ یہ سکندر اعظم کے زمانے کی ہے تو یہ اس پر بھی یقین کر لیں گے۔ اور ہر قیمت پر اس کو خرید کر لے جائیں گے اور اپنے گھروں میں ان کی نمائش کر کے دوسرے بیوقوفوں کو مرعوب کرنے کی کوشش کریں گے؟"

بٹ صاحب بولے "مرزا صاحب آپ یہ دل توڑنے والی باتیں کر کے مجھے متاثر نہیں کر سکتے۔ میں یہاں سے کوئی نہ کوئی چیز ضرور خرید کر لے جاؤں گا۔"

خان صاحب نے مشورہ دیا ”آپ نیلی مسجد یا توپ کاپی محل خرید لیں... اور لاہور جا کر ان پر ٹکٹ لگا دیں گے۔ مہینوں میں لکھ پتی بن جائیں گے۔“

”یہ آپ نے ٹھیک کہا۔ یہ بہت منافع بخش کاروبار ہے۔“

اسپائس بازار (اردو میں مسالا بازار) زیادہ بڑا نہیں ہے لیکن اس مختصر جگہ کے اندر ایک دنیا سمائی ہوئی ہے۔ مسالے کا حصہ ختم ہوتا ہے تو دوسرے عجائبات شروع ہو جاتے ہیں۔

اب دکانوں کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ کہنے کو یہ مسالا بازار ہے مگر دنیا کی کون سی چیز ہے جو یہاں دستیاب نہیں ہوتی۔

.... بٹ صاحب نے ایک چھوٹے سے زنگ آلود خنجر کو اٹھا کر الٹ پلٹ کر دیکھا، دکان دار بولا۔ ”یہ خنجر سلطان مراد کے اسلحہ خانے سے تعلق رکھتا ہے۔“

”کیا آپ کے پاس اس کی کوئی تاریخ یا ثبوت ہے؟“ یہ گفتگو ٹوٹی پھوٹی ترکی اور انگریزی زبان میں مرزا مشرف کے ذریعے ہو رہی تھی۔

”ہماری زبان ہی اس کی تاریخ ہے۔“

”ٹھیک ہے اس کی قیمت کیا ہے۔“

”بیس ہزار ڈالر۔“

مرزا مشرف نے سرگوشی میں کہا۔ ”یہ بات مبالغہ ہے۔“

”بھئی یہ تو آپ بہت زیادہ قیمت بتا رہے ہیں جبکہ اس کا کوئی ثبوت بھی نہیں ہے۔ ہماری بات پر کون یقین کرے گا۔ ایسے خنجر تو ہمارے ملک میں گلی گلی مل جاتے ہیں۔“

”مگر وہ سلطان مراد کے اصلی خنجر نہیں ہوتے۔ اچھا آپ بولیے۔ آپ کتنی قیمت ادا کریں گے؟“

بٹ بولے۔ ”دس لیرا۔“

”کیا کہا آپ نے؟ دس ہزار لیرا؟“

”جی نہیں صرف دس لیرا۔“

”آپ تو مذاق کر رہے ہیں۔“

”جی نہیں ہم سنجیدہ ہیں۔“

”تو پھر آپ کسی اور دکان پر جائیے۔“

”بہت بہتر، یہاں دکانوں کی تو کوئی کمی نہیں ہے۔“ کہہ کر بٹ صاحب نے وہ زنگ آلود خنجر وہیں رکھ دیا اور چل پڑے۔

”سنیے مہربان، آپ پانچ ہزار لیرا دے دیجیے۔“ دکان دار نے کہا۔ بٹ صاحب نے ان سنی کر دی۔

مرزا مشرف نے مشورہ دیا۔ ”آیئے ہم گرینڈ بازار چلتے ہیں۔ یہ دنیا کا سب سے بڑا چھت والا بازار ہے۔“

”بھائی چھت ہو یا نہ ہو ہمیں اس سے کوئی مطلب نہیں ہے۔“ ہم گرینڈ بازار میں داخل ہو گئے۔

”یہ بازار نہیں ایک تاریخ ہے۔ اس میں داخل ہونے اور باہر نکلنے کے 22 دروازے ہیں۔“

”ان دروازوں کو یاد کیسے رکھیں گے۔ ہم تو اپنا دروازہ ہی ڈھونڈتے پھریں گے۔“

”آپ کسی خوب صورت عمارت کی نشانی تو یاد رکھ سکتے ہیں؟“

ہم نے کہا۔ ”بٹ صاحب، یہاں کچھ خریدنے کی کوشش نہ کرنا یہ آپ کی اوقات سے کہیں بڑھ کر ہے۔ یہاں تاریخی اشیا کی کمی نہیں ہے۔“

”مگر ہم بھاؤ تاؤ تو کر سکتے ہیں۔“

مرزا بولے۔ ”ان سے بھاؤ تاؤ میں جیتنا آسان نہیں بلکہ ناممکن ہے۔ دراصل مغربی مالدار سیاح ہی یہاں سے خریداری کر سکتے ہیں۔ ہم اور آپ صرف ونڈو شاپنگ ہی کر سکتے ہیں۔“

”چلیں یہ بھی کم نہیں ہے کم از کم کہہ تو سکتے ہیں کہ ہم نے استنبول کا گرینڈ بازار دیکھا ہے۔“

”تو پھر بسم اللہ کیجیے۔ یہ واحد عقل مندانہ بات ہے جو آپ نے کی ہے۔“

یہ وہ شہر ہے جسے فتح کرنے کی آنحضورؐ نے دعا فرمائی تھی اور اللہ نے اپنے پیارے نبی کی دعا قبول کر لی۔

گرینڈ بازار واقعی قابلِ دید ہے۔ دکانیں قدیم یادگاروں سے بھری ہوئی ہیں۔ انہیں دیکھ کر ہی انسان حیران رہ جاتا ہے۔ ہم جیسے سیاح تو کسی قہوہ خانے یا ریستوران میں بیٹھ کر تماشا ہی دیکھ سکتے ہیں۔ قہوہ پینا ہمارے لیے ممکن نہیں ہے البتہ کوئی ٹھنڈا مشروب پی سکتے ہیں۔

ریستوران میں ایک نوجوان ترک بھی قہوہ پی رہا تھا۔ ہم نے اس سے پوچھا.... ”بھائی آپ لوگ تو بہت میٹھے اور شیریں ہوتے ہو۔ اتنی مٹھاس اور نرمی سے بات کرتے ہو کہ آواز سن کر کانوں میں شیرہ ٹپکنے لگتا ہے مگر آپ اس قدر تلخ اور کڑوا قہوہ کیسے مزے لے لے کر پیتے ہو اور سارے دن پیتے ہی رہتے ہو جیسے امریکن بلا دودھ اور چینی کے ہر وقت ابلتی ہوئی کافی پیتے ہیں۔“

بولے۔ ”برادر، شاید یہ ہماری پیدائشی عادت ہے چونکہ جب ہوش سنبھالتے ہیں تو ماں باپ اور دوسرے لوگوں کو ایسا ہی قہوہ پیتے دیکھتے ہیں پھر یہ ہماری عادت بن جاتی ہے۔ آپ تو جانتے ہیں کہ عادت کا کیا نتیجہ ہوتا ہے۔“

ہم نے کہا شکر ہے کہ ”ہمیں کسی چیز کی عادت نہیں۔ لڑکپن میں دوستوں کے ساتھ سگریٹوں کے ٹوٹے زمین سے اٹھا کر پی لیا کرتے تھے جو سگریٹ نوشی کرنے والے بیکار سمجھ کر پھینک دیا کرتے تھے۔ ذرا بڑے ہوئے تو دوستوں کی دیکھا دیکھی سگریٹ پینے لگے۔ پینا کیا تھا بس سگریٹ کا ایک کش لیا اور فوراً ہی دھواں خارج کر دیا۔ دراصل یہ شوق ہمیں دوستوں کو دھوئیں کے مرغولے اور دائرے بناتے ہوئے دیکھ کر پیدا ہوا تھا۔ سگریٹ ہم کسی خاص کیفیت یا مزے کے لیے نہیں دھوئیں کے چھلے بنانے کے لیے پیا کرتے تھے۔ کبھی اس کی عادت نہیں ڈالی۔“

خان صاحب نے اردو میں ہم سے کہا۔ ”بھائی جان، اس نے ایک مختصر سوال کیا تھا آپ ساری کتھا سنانے کے لیے بیٹھ گئے۔“

مگر ہم نے دیکھا کہ ترک ملاقاتی ہماری باتیں سن کر لطف اندوز ہو رہا تھا۔

بٹ صاحب نے چھیڑا۔ ”آفاقی صاحب، آپ کسی زمانے میں سگار بھی تو پیا کرتے تھے۔“

ہم نے کہا۔ ”وہ تو خوشبو کی وجہ سے۔“

ترک بہت حیران ہوا۔ ”کیا آپ کے ملک میں سگار کی خوشبو یعنی سینٹ بھی ہوتا ہے؟“

ہم نے کہا۔ ”جی نہیں، سگار پینے کے بعد جو خوشبو کمرے میں پھیل جاتی ہے وہ ہمیں بہت اچھی لگتی تھی۔ سگار بھی ہم لطف لینے کے لیے نہیں اس کی خوشبو کی خاطر پیا کرتے تھے۔ ہم نے ہر قسم کے سگار پیے ہیں۔ ہمارے دوست سمجھتے تھے کہ شاید ہمیں سگار پسند ہیں وہ دور دور کے ملکوں سے ہمارے لیے سگار کا تحفہ لاتے تھے مگر ہماری پسندیدہ خوشبو صرف ایک سگار میں ہوتی تھی جو ہالینڈ سے مہنگے داموں امپورٹ کیا جاتا تھا۔“

”کیا سگار پینا آپ کو اچھا لگتا تھا؟“ انہوں نے سوال کیا۔

”بالکل نہیں، سگار کے دھوئیں کے ساتھ ہی ہم سگریٹ والا سلوک ہی کیا کرتے تھے یعنی دھوئیں کے مرغولے بنانا۔ ویسے ہم نے محسوس کیا کہ سگار نوشی کرتے ہوئے انسان بہت بارعب اور معتبر لگتا ہے۔“

اب وہ بیچ بیچ دلچسپی لینے لگے تھے، بولے۔ ”آپ نے زندگی میں کچھ اور نشے بھی کیے ہیں یا نہیں؟“

”جی کیے ہیں۔ ایک بار ہم نے بھنگ پی تھی جو ہمارے عادی دوستوں نے یہ کہہ کر ایک گلاس میں ڈال کر پلا دی تھی کہ گرمی میں ٹھنڈک پہنچاتی ہے۔ اس میں بادام اور چاروں مغز کترتے ہیں جنہیں پیس کر سفید رنگ کا شربت بنایا جاتا ہے۔ تم ایک گلاس پی کر تو دیکھو۔ ہم نے ایک ہی سانس میں گلاس خالی کر دیا۔ واقعی بہت میٹھا اور ٹھنڈا تھا۔“

”اس کا نشہ ہوا؟“

”جی نہیں نشہ تو نہیں ہوا البتہ ہر چیز سست نظر آنے لگی۔ جب ہم کرسی سے اٹھ کر چند قدم لان میں چلے تو یوں لگا جیسے لان بہت گہرائی میں ہے ہم ہر قدم سوچ کر اور بہت احتیاط سے رکھتے تھے۔ جیسے ابھی ہم ایک اور قدم چلے تو کنویں میں گر جائیں گے۔ ہمارے دوست ہمارا تماشا دیکھ کر ہنس رہے تھے۔ آخر ہم لان میں ہی گھاس پر بیٹھ گئے اور سوچنے لگے کہ غالب کو سب لوگ بہت بڑا شاعر کیوں کہتے ہیں؟ دماغ میں عجیب عجیب خیالات آ رہے تھے۔ شاید غالب کا قد بہت لمبا تھا یا وہ بہت لمبی لمبی غزلیں لکھتا تھا۔ کافی دیر تک ہم یہ گتھی سلجھاتے رہے مگر فیصلہ نہ کر سکے یہاں تک کہ وہیں بیٹھے بیٹھے سو گئے۔ ہمارے دوستوں کو ہماری فکر نہیں تھی۔ وہ ہماری حرکتیں دیکھ کر ہنس رہے تھے۔ نہ جانے کتنی دیر تک ہم سوتے رہے۔ کھانے کے وقت سب نے ہمیں جگایا تو یوں لگا جیسے ہم نے کوئی خواب دیکھا تھا۔

ہم نے اپنے دوستوں سے کہا ”آیندہ ہم کبھی بھنگ نہیں پئیں گے۔“

وہ بولے۔ ”ہم بھی کبھی نہیں پلائیں گے۔ دراصل تمہاری بھنگ پینے کی اوقات ہی نہیں ہے۔ کھانے کا پہلا لقمہ توڑا تو پھر ہاتھ ہی نہ روک سکے۔ اس رات شاید ہم تین چار آدمیوں کی خوراک کھا گئے۔ پتا چلا کہ بھنگ پینے کے بعد بھوک بہت لگتی ہے۔ اسی لیے خوشحال بھنگ پینے والوں کی صحت بہت اچھی ہوتی ہے مگر جن غریبوں کو اچھی خوراک نصیب نہیں ہوتی وہ لاغر اور کمزور ہو جاتے ہیں۔

ہماری یہ داستان سب کو بہت پسند آئی اور شاید ان کی معلومات میں بھی اضافہ ہوا۔

کھانا کھاتے ہوئے خان صاحب نے کہا ”آفاقی صاحب، آپ کئی سال تک پائپ بھی تو پیتے رہے ہیں۔ اس کی کیا وجہ تھی؟“

ہم نے بتایا اس کی وجہ بھی پائپ کے تمباکو کی خوشبو تھی۔ یوں تو پائپ کے مختلف قسم کے تمباکو امپورٹ کیے

جاتے ہیں مگر ہم نے ایک تمباکو "ایرن مور" کی خاطر پائپ پینا شروع کیا تھا۔ اس کی خوشبو اتنی اچھی لگی کہ سارا کمرا مہک اٹھا۔ جن دنوں اس کی قلت ہو جاتی تھی ہم بلیک مارکیٹ سے خریدتے تھے۔ ویسے ہم نے محسوس کیا کہ پائپ انسان کی شخصیت میں بہت اضافہ کر دیتا ہے۔ پھر بار بار اس کو صاف کرنے اور سلگانے کا الگ لطف ہے۔ ہم اس زمانے میں جس ملک یا شہر میں جاتے تھے پائپ ضرور خریدتے تھے جس کی وجہ سے ہمارے پاس ایک ذخیرہ جمع ہو گیا تھا۔ لڑکیاں اس کی خوشبو کی تعریف کرتی تھیں۔ لڑکے رشک کرتے تھے کہ اتنے مہنگے اور اتنے زیادہ پائپ جمع کرنا ہر ایک کے بس کی بات نہیں ہے۔ ہم تین چار سال تک پائپ کا دھواں اُڑاتے رہے۔ مزہ تو کیا آتا ہمارا منہ اور حلق خشک ہو جاتا تھا۔ آئے دن ہم گلے کی بیماریوں میں مبتلا رہتے تھے آخر تنگ آ کر ڈاکٹروں کے مشورے پر ہم نے پائپ نوشی ترک کر دی۔ جس چمڑے کے خوبصورت چھوٹے سے بیگ میں پائپ رکھا جاتا ہے اس کو پاؤچ کہا جاتا ہے اور خاصا قیمتی ہوتا ہے۔ اس کو صاف کرنے کے آلات اور دو تین درجن اعلیٰ قسم کے پائپ ہم نے اپنے پائپ پینے والے دوستوں کو بطور تحفہ دے دیے۔ انہوں نے خوش ہو کر ہمیں بہت دعائیں دیں جس کا شاید اثر بھی ہوا لیکن پھر ہم نے کبھی پائپ کو ہاتھ تک نہیں لگایا۔ البتہ ایرن مور تمباکو کی خوشبو آج بھی بہت اچھی لگتی ہے۔ لیکن اب پائپ پینے والے کم ہوتے جا رہے ہیں اس لیے خوشبو بھی سونگھنے میں نہیں آتی۔ دوستو بس ہم نے زندگی میں اتنے ہی نشے کیے ہیں بشرطیکہ آپ انہیں نشہ قرار دیں۔"

ترک نے (جنہوں نے اپنا نام دفاعی بتایا تھا) بتایا کہ اس نے زندگی میں کبھی نشہ نہیں کیا سوائے قہوہ نوشی کے۔

دفاعی صاحب دراصل جلدی میں تھے۔ اپنے گھر کے لیے کچھ مسالا خریدنا تھا۔ بیگم گھر پر انتظار کر رہی تھیں۔ بہت محبت سے رخصت ہوئے۔

"پاکستان پاکستان" کہہ کر ہم سب کو باری باری گلے لگایا اور اپنا ٹیلی فون نمبر دے گئے کہ اگر کوئی خدمت ہو تو ضرور بتایئے گا۔ بعد میں پتا چلا کہ وہ جلدی میں غلط فون نمبر دے گئے تھے یا ہم نے سننے میں غلطی کی تھی۔

مرزا مشرف قہوہ پینے کے بعد تازہ دم ہو چکے تھے لیکن بٹ صاحب کہتے تھے کہ یہ بھی کوئی قہوہ ہے۔ اصل مزہ تو کشمیری چائے میں ہوتا ہے۔ اگر ایک بار ترک کشمیری قہوہ پی لیں تو ترکی قہوہ بھول جائیں۔ ہم نے کہا۔ "بٹ صاحب، اتنا جذباتی ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔ آپ کو سماوار میں پکی ہوئی کشمیری چائے پسند ہے اور یہ بچپن سے اپنے قہوے کے عادی ہیں۔"

بٹ صاحب نے فلسفیانہ انداز میں کہا۔ "ہمیں کوشش کرنی چاہیے کہ اپنے ترک بھائیوں کی بری عادتیں چھڑائیں۔"

خان صاحب اس گفتگو سے بور ہو چکے تھے اور مرزا مشرف بھی۔ مگر مرزا صاحب اخلاقاً اظہار نہیں کر رہے تھے۔

قہوہ خانے سے باہر نکل کر انہوں نے ایک جمائی لی اور بولے۔ "آیئے، اب آپ کو گرینڈ بازار کی سیر کرائیں۔ ترک کہتے ہیں کہ جو استنبول آیا اور اس نے گرینڈ بازار نہیں دیکھا تو سمجھو کہ وہ پیدا ہی نہیں ہوا۔ ہم نے بتایا کہ ہم لاہور والے یہی الفاظ لاہور کو نہ دیکھنے کے بارے میں استعمال کرتے ہیں۔

گرینڈ بازار دیکھنے کا فیصلہ ہو چکا تھا۔ بٹ صاحب بار بار اعتراض کر رہے تھے کہ اگر اس بازار پر چھت ہے تو یہ کون سی انوکھی بات ہے۔ آپ کسی بازار پر بھی چھت بنا دیں ایسا ہی ہو جائے گا۔

مگر جب گرینڈ بازار میں داخل ہوئے تو بٹ صاحب بھی دیکھتے کے دیکھتے رہ گئے۔ واہ! کیا خوب چیز ہے۔

مرزا مشرف نے بتایا کہ دنیا بھر کی ہر چیز اس بازار میں فروخت ہوتی ہے۔ قالین، کپڑا، ملبوسات، جوتے، زیورات، میک اپ سامان غرضیکہ انسانی ضرورت کی ہر چیز اس بازار میں دستیاب ہے۔ بازار اور شاپنگ مال تو ہم نے دنیا میں بہت دیکھے ہیں مگر جو رعب داب، آن بان، شان اور شکوہ یہاں دیکھا وہ کہیں اور نہیں دیکھا۔ دکانیں قدیم تاریخی طرزِ تعمیر کا نمونہ ہیں۔ مختلف تہذیبوں کے نمونے یہاں نظر آ جاتے ہیں۔ یہ تو بتا ہی چکے ہیں کہ اس بازار میں داخل ہونے کے 22 اور باہر جانے کے کل 44 دروازے ہیں۔

بٹ صاحب کہاں ہار ماننے والے تھے بولے۔ "قدیم لاہور کے بھی بارہ دروازے ہیں مگر ان سے آنے اور باہر جانے کا راستہ ایک ہی ہے۔"

ہم نے چپکے سے بٹ صاحب کے کان میں کہا۔ "بس، قدرِ ادب! اس کے آگے کچھ نہ بولیے۔ ہمارے قدیم تاریخی دروازوں کی جو درگت بنائی گئی ہے اس بازار کا کیا مقابلہ۔ یہ تو عالیشان محلات ...

... معلوم ہوتا ہے اور دیکھنے میں اس قدر دلکش کہ لگتا ہے اس کی تعمیر حال ہی میں مکمل ہوئی ہے۔ یہ بازار کیا ہے بھول بھلیاں ہے۔ خصوصاً پہلی بار آنے والے سیاحوں کے لیے۔ وہ گھوم گھوم کر تھک جاتے ہیں اور جب باہر نکلنے لگتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ یہ تو کوئی اور راستہ ہے۔ دراصل یہ بازار در بازار اور دروازوں کا ایک معما ہے۔ مول تول اور بھاؤ تاؤ کا وہی رواج ہے جو ہمارے ملک میں ہے مگر یہ بہت زیادہ بڑھا چڑھا کر قیمتیں نہیں بتاتے۔ اس لیے معمولی بحث کے بعد فیصلہ ہو جاتا ہے۔

گرینڈ بازار کو بازار کہنا اس کی توہین ہے۔ یہ تو ایک الگ ہی شہر معلوم ہوتا ہے۔ تاریخی اور جدید تہذیب یہاں آ کر ایک ہو جاتی ہے۔

ترکی زبان میں اس کو کپالی کارسی بازار کہتے ہیں۔ لفظ بازار ان بے شمار الفاظ میں سے ہے جو ترکی اور اردو میں مشترک ہیں۔ مگر ترک اسے کبھی مارکیٹ یا شاپنگ مال نہیں کہتے۔ ہمیشہ اسے گرینڈ بازار ہی کہتے ہیں۔ اس کو ان کی ضد ... کہہ لیجیے یا قوم پرستی۔ انہیں اپنی ہر چیز سے عشق ہے۔ ہماری آپ کی طرح وہ دوسروں سے مرعوب نہیں ہوتے۔ نہ ہی دوسری تہذیبوں کو اپنے سے برتر سمجھتے ہیں۔ اپنی زبان وہ فخریہ انداز میں بولتے ہیں یہاں تک کہ انگریزی جاننے والے ترک کی بھی یہ کوشش ہوتی ہے کہ کسی اور کی زبان بولنے کی بجائے وہ اپنی زبان بولے۔

ترکی زبان کسی زمانے میں فارسی عربی کے انداز میں لکھی جاتی تھی مگر کمال اتاترک نے جب دشمنوں سے اپنا ملک بزورِ طاقت چھین کر ایک نیا ترکی بنایا تو پرانی بہت سی چیزوں کو ترک کر دیا۔ مثلاً ترکی ٹوپی، یہ ساری دنیا میں ... سے پہنی جاتی تھی مگر اتاترک نے اس کا استعمال ... قرار دے دیا۔ اب تمام ترکی میں کوئی آپ کو ... والی ترکی ٹوپی پہنے نظر نہیں آئے گا۔ اس نے کہا مغربی ... پہنو یا ننگے سر رہو۔ قدیم ترکی لباس کی جگہ مغربی لباس رائج کر دیا۔ ترکی زبان تو آج بھی وہی ہے مگر اس کا رسم الخط بدل دیا گیا ہے۔ اگر ترکی کا کوئی اخبار پڑھیں تو ... الفاظ کے سوا کچھ آپ کی سمجھ میں نہیں آئے گا۔ ترکوں ... اور دوسرے مسلمانوں نے جو سلوک کیا تھا ... کو اس کا شکوہ تھا۔ پانچ سو سال تک دنیا پر ... کرنے والی عثمانیہ سلطنت کو ٹکڑے ٹکڑے کرنے میں ... ہی کا ہاتھ ہے ورنہ عثمانی افواج تو یورپ کو فتح کرتی ہوئی ہنگری تک پہنچ گئی تھیں۔ سلطان مراد تمام یورپ کو فتح کرنے کا خواب دیکھ رہا تھا۔ اور آس پاس کے مسلمان ممالک نے ترکوں کی پیش قدمی روک کر انہیں واپس آنے پر مجبور کر دیا تھا۔ کمال اتاترک کے بارے میں مختلف آراء ہیں کٹر مولویوں اور علما نے اس کو کافر تک قرار دے دیا تھا۔ کمال اتاترک نے اس کے جواب میں قدیم مذہبی رسوم اور انداز ختم کر دیے اور ایک نئے اسلامی نظام کو جنم دیا جس کا اندازہ آپ کو استنبول اور ترکی جا کر ہی ہو سکتا ہے۔ اسلام پسندوں کی ایک بہت بڑی تعداد دل ہی دل میں کمال اتاترک کو برا سمجھتی تھی۔ مگر اس کو اتاترک یعنی قوم کا باپ بھی سمجھنے پر مجبور تھی۔ یہ حقیقت ہے کہ اگر مصطفیٰ کمال نے ہمت و جرأت اور بہادری نہ دکھائی ہوتی تو آج ترکی نام کا کوئی ملک شاید کرۂ ارض پر نہ ہوتا۔

دیکھیے، بات کہاں سے کہاں پہنچ گئی۔ ذکر گرینڈ بازار کا ہو رہا تھا۔ گرینڈ بازار درحقیقت گرینڈ بازار ہے۔ ایک ہی چھت کے نیچے عظیم الشان پُرشکوہ عمارتوں میں سامان کا ڈھیر لگا ہوا ہے۔ کون سی چیز ہے جو یہاں نہیں ملتی۔"

بٹ صاحب بولے۔ "یہ بتایئے کیا یہاں سوئی اور ہاتھی ملتا ہے؟"

وہ بے چارے لاجواب ہو گئے۔

اس بازار میں چار ہزار سے زیادہ وسیع اور بڑی بڑی دکانیں ہیں جو تاریخی عمارتوں میں سجائی گئی ہیں۔ مرزا صاحب بتا رہے تھے کہ یہ بازار پندرہویں صدی میں تعمیر کیا گیا تھا۔

خان صاحب نے پوچھا۔ "بھائی کوئی ایسی دکان بھی بتایئے جو پچاس ساٹھ سال پہلے بنی تھی؟ یہاں کی تو عمارتیں ہی قابلِ دید ہیں اس پر ان کی سجاوٹ۔ یوں محسوس ہوتا ہے جیسے آپ تاریخ کی شاہی راہداریوں میں آ گئے ہیں۔ بازار کیا ایک الگ ہی دنیا ہے۔ بے شمار قہوہ خانے اور ریستوران (وہ بھی تاریخی قسم کی عمارتوں میں) کئی مساجد۔ ترکی میں مسجدوں کی تعداد شاید مصر کے بعد سب سے زیادہ ہے۔ لیکن ان مسجدوں میں ایک ہی وقت میں اذانیں گونجتی ہیں۔ ہماری طرح نہیں کہ پہلی اذان ایک بجے ہوئی تو ڈھائی تین بجے تک اسی نماز کی اذانیں جاری رہتی ہیں۔ اذانوں سے پہلے اور بعد میں ہمارے خطیب اور امام اپنے ذاتی خیالات سے سامعین کو نوازتے ہیں۔ مغربی لباس (یعنی پتلون) پہننے والوں پر لعنت بھیجتے ہیں۔ اس کے بعد

محلے کے شوقین بچوں کو نعت خوانی کا موقع دیتے ہیں۔ اگر آپ کو ہندوستانی فلمی گانے کی جدید ترین اور مقبول ترین دھن سننی ہو تو اس کے بارے میں بھی یہ ننھے نعت خواں کافی معلومات فراہم کر دیتے ہیں۔ یہاں کی مسجدیں خاموش مسجدیں ہیں جو ضرورت کے وقت ہی بولتی ہیں۔ حد تک تو یہ ہے کہ گرینڈ بازار میں ایک پولیس اسٹیشن بھی ہے حالانکہ ہم نے یہاں کبھی لڑائی جھگڑا اور ایک دوسرے کو بلند آواز میں برا بھلا کہتے نہیں سنا۔ سمجھ میں نہیں آیا یہاں اس پولیس کا مصرف کیا ہے۔ یہ بازار کیا ایک تہذیبی مرکز ہے جہاں آپ کو ہر وقت دنیا بھر کے سیاح گھومتے پھرتے نظر آجائیں گے۔ بٹ صاحب کو سیاح خواتین کی اکثریت، فیشن اور بے تکلفانہ ماحول کی وجہ سے یہ بازار اس قدر پسند آیا کہ صبح اٹھ کر ناشتے سے پہلے وہ پوچھتے تھے۔ ”تو پھر ہم چل رہے ہیں آج گرینڈ بازار؟“

خان صاحب ہر روز جواب دیتے۔ ”یار پورا استنبول مغربی سیاحوں سے بھرا پڑا ہے۔ یہ تم نے کیا گرینڈ بازار کی رٹ لگا رکھی ہے۔“

بٹ صاحب کہتے۔ ”بھائی اس بازار کی بات ہی اور ہے۔ مشرقی پس منظر میں مغربی سیاح خواتین کسی اور دنیا کی مخلوق نظر آتی ہیں۔ خان صاحب، کیا حقیقت میں حوریں ایسی ہی ہوتی ہوں گی۔“

”بھائی مجھے تو کبھی جنت میں جانے کا اتفاق نہیں ہوا۔ لیکن اتنا جانتا ہوں کہ وہاں ننگی ٹانگیں اور مغربی لباس پر پابندی ہوگی۔“

خان صاحب کا وقت زیادہ تر ”ٹورسٹ شاپنگ“ میں گزرا۔ یہ انگریزی زبان میں ان کی طرف سے ایک اضافہ ہے جو انہوں نے ”ونڈو شاپنگ“ کے مقابلے میں ایجاد کیا ہے۔ اس بازار کی سڑکیں چوڑی ہیں۔ جگہ جگہ خوبصورت فوارے چلتے رہتے ہیں جو ماحول کے حسن میں مزید اضافہ کرتے ہیں۔ مگر کیا مجال جو کوئی ان فواروں کے حوض میں کوئی چیز پھینکے۔ ہم نے یہاں کوئی نہر یا گندہ فوارہ نہیں دیکھا۔ یہ شاید ہم پاکستانیوں کی قسمت میں ہی ہیں۔

دکاندار انتہائی با اخلاق اور شائستہ ہوتے ہیں۔ مول تول بھی مسکراتے ہوئے کرتے ہیں۔ اسی لیے خریدار کافی چیزیں خرید لیتے ہیں۔ مول تول کے وقت یوں محسوس ہوتا ہے جیسے کہ ذہنی آزمائش کا مقابلہ ہو رہا ہے جو کامیاب ہوتا ہے وہی نفع بھی اٹھاتا ہے۔ سیاحوں کے لیے تو یہ ایک ایسی سیرگاہ ہے جہاں جانے سے کبھی ان کا دل نہیں بھرتا۔ جب کافی چیزیں خرید لیتے ہیں تو انہیں لے جانے کے لیے ہر قسم کے چھوٹے بڑے سوٹ کیس دستیاب ہیں۔ چمڑے کے سوٹ کیس اور دوسری اشیا قیمتی تو ہیں مگر نایاب۔

کسی زمانے میں گرینڈ بازار کی جگہ سرائے ہوا کرتی تھی بلکہ ایک سے زائد سرائے تھیں جہاں تاجروں کے قافلے قیام کرتے تھے۔ آج کی طرح ان سراؤں میں تازہ تندوری روٹیاں بھٹیارنیں بناتی رہتی تھیں۔ گرم گرم روٹیوں کے ساتھ سالن بھی مل جاتا تھا۔ تاجروں کو وقت گزارنے کے لیے تفریح کی ضرورت تھی جس کے لیے قصہ گو اور داستان گو بھی موجود رہتے تھے۔ مسافروں کا جی بہلاتے تھے اور اپنی جیبیں بھر لیتے تھے قصہ گوئی ایک پرانا فن ہے۔ مشرقی ملکوں میں تو اس کی ایک تاریخ ہے۔ مسافروں سے قطع نظر مقامی لوگ بھی قصے کہانیاں سننے کے لیے قصہ گوئی کے شیدائی تھے۔ پشاور کے ایک قدیم تاریخی بازار کا تو نام ہی قصہ خوانی بازار ہے۔ یہ بازار تو آج بھی ہے مگر قصہ سنانے اور سننے والے نہیں رہے۔ لوگوں نے تفریح کے بے شمار دوسرے ذرائع تلاش کر لیے ہیں۔

گرینڈ بازار کی چھت پر جا کر شہر کا نظارہ کرنا بھی ایک عجیب تجربہ ہے۔ رات ہو یا دن کسی بھی مکان کا ملازم آپ کو چھت پر لے جا کر استنبول کی سیر کرا دے گا۔ استنبول یوں تو انتہائی خوبصورت شہر ہے لیکن ہر جگہ سے اس کے حسن و جمال کے کئی پہلو سامنے آتے ہیں۔ کشتی میں باسفورس کی سیر کریں تو اور ہی لطف ہے۔ ساحلی ریستوران میں جائیں تو وہاں سے بھی سامنے سے گزرنے والے ٹریفک اور باسفورس کا حسن انوکھا نظر آتا ہے۔ مرزا اشرف ایک بار ہمیں استنبول کے سب سے بلند باغ میں لے گئے۔ اس کا نام یاد نہیں رہا لیکن یہ انتہائی پُرفضا جگہ ہے۔ جس طرف جا کر دیکھیں ایک نیا استنبول نظر آتا ہے۔ باسفورس اور سمندر تو استنبول کی جان ہے۔

ایک اور تجربہ یہ ہوا کہ اذان کی آواز سن کر نماز پڑھنے کے لیے مسجد میں گئے (جو بازار ہی میں واقع ہے) تو وہاں پانی کا ایک تالاب دیکھا۔ ہمارے بچپن میں وضو کرنے کے لیے ایسے ہی تالاب ہوا کرتے تھے جن کے چاروں طرف بیٹھ کر لوگ وضو کرتے تھے۔ اس تالاب کو دیکھ کر بچپن یاد آگیا مگر اس تالاب کا پانی نیلگوں تھا اور اسے ہر قسم کی کثافت سے بچانے کے لیے تالاب کو شیشے کے ایک

گنبد سے ڈھانپ دیا گیا تھا۔

ساحلِ سمندر کے کچھ حصے ایسے ہیں جہاں مغرب زدہ خواتین یورپ کی طرح دھوپ میں جسم سینکنے اور اس کو سانولا کرنے کے لیے مختصر برائے نام لباس میں اوندھی سیدھی پڑی رہتی ہیں۔ مرزا اشرف نے بتایا کہ ایک ایسا ساحل بھی ہے جہاں خواتین (مقامی اور مغربی سیاح) بالکل برہنہ گھومتی پھرتی ہیں۔ یہاں مردوں کا بھی مجمع ہوتا ہے۔

”بٹ صاحب آپ کے لیے تو جہنم ہی بہتر جگہ ہوگی۔“

بٹ صاحب بولے۔ ”کیسے دوست اور مسلمان ہو۔ ایک مسلمان کو دوزخ میں جانے کی دعا دے رہے ہو۔“

”دیکھو بٹ جی، میں نے جو بھی کہا ہے آپ کی بھلائی کے لیے کہا ہے۔ آپ تو سوچے سمجھے بغیر خوامخواہ غصے میں آگئے۔ دیکھو بٹ، اب اپنے ایمان سے سچ سچ بتانا۔ سمجھو کہ یہ تمہارا حلفیہ بیان ہو رہا ہے۔ بولو، سچ کہو گے۔“

”بالکل! میں نے تو کبھی جھوٹ بولا ہی نہیں۔“

یہ سن کر سب ہنس پڑے۔ ”بٹ صاحب، اس سے بڑا جھوٹ اور کیا ہوگا اب اگر یہ کہو کہ تم نے کبھی سچ نہیں بولا تو سب کو یقین آجائے گا۔“

”بھئی بلاوجہ بحث کرنے کی ضرورت نہیں ہے بٹ صاحب۔ آپ یہ سمجھ لیں کہ آپ اس وقت عدالت میں کھڑے ہیں۔“

”سمجھ لیا۔“ بٹ صاحب نے فوراً اقرار کر لیا۔

”اب اس کتاب پر ہاتھ رکھ کر کے کہو کہ جو کہوں گا سچ کہوں گا۔“

بٹ صاحب کچھ چوکنا ہو گئے۔ ”یہ کتاب کیا ہے۔“

”یہ تو دیوانِ غالب ہے۔“

”مگر تم فرض کر لو کہ یہ ایک مقدس اور پاکیزہ کتاب ہے۔“

”چلو فرض کر لیا۔ اب؟“

”اب یہ بتاؤ کہ تم بھاگ بھاگ کر یورپ کیوں آتے ہو؟“

”کیا فضول سوال ہے۔ ارے بھئی مجھے سیاحت کا شوق ہے اس لیے۔“

”سیاحت کے لیے تو دنیا پڑی ہے۔ افریقی ممالک حسین ہیں۔ تھائی لینڈ ہے۔ برما ہے۔ سری لنکا ہے۔ سنگاپور اور ملائشیا ہے۔ مالدیپ کس قدر خوبصورت جزیرہ ہے۔ مغربی سیاح تو ان ملکوں پر جان دیتے ہیں۔ یورپ کے اتنے خوبصورت ملکوں کو چھوڑ کر وہ مشرقی ملکوں میں جا کر کیوں دھکے کھاتے ہیں؟“

”یہ تو وہی بتا سکتے ہیں۔“

”میں بتاتا ہوں۔ وہ صحیح معنوں میں نظارے دیکھنا چاہتے ہیں مگر آپ صرف گوری گوری میمیں، ان کے نیم برہنہ جسم اور ننگی ٹانگیں دیکھنے کے لیے یورپ دوڑے آتے ہیں۔ کیونکہ یہ ماحول آپ کو اچھا لگتا ہے۔ یہاں کی عورتیں آپ کو پریاں لگتی ہیں۔ آپ انہیں دیکھ کر لاحول بھی پڑھتے رہتے ہیں مگر آپ کی نظریں ان عورتوں پر ہی جمی رہتی ہیں۔ آپ بہانے بہانے سے ان نظاروں سے لطف اٹھاتے ہیں مگر شاید دوسروں کو سنانے کے لیے یا اپنے گناہوں کا بوجھ ہلکا کرنے کے لیے آپ لاحول پڑھتے رہتے ہیں یعنی منہ پہ رام رام اور بغل میں چھری؟“

”توبہ کیجیے۔ آپ لوگ مجھے ہندو کہہ رہے ہیں؟“

”ارے یہ تو ایک محاورہ ہے۔ اب آپ یہ بتائیں کہ

فتی

جمع فتیان۔ اصلی معنی ”نوجوان“ کے ہیں۔ عربی میں اس کے کئی معنی ہو گئے ہیں۔ ایک مفہوم، جو اندلس میں رائج تھا، خاص طور پر قابل ذکر ہے۔ وہاں امیر یا اس کے گھرانے یا کسی صاحب اقتدار صاحب کے ملازم غلام (خواہ وہ خواجہ سرا ہوں یا نہ ہوں) غلمان کہلاتے تھے۔ اور وہ غلام جو شاہی محل میں کسی اعلیٰ منصب پر مامور ہوں انہیں فتی کہا جاتا تھا۔ امرا کے گھرانے کا پورا انتظام دو اعلیٰ ملازموں یا اہلکاروں کے حوالے کر دیا جاتا تھا۔ اندلس کی تاریخ شاہد ہے کہ بعض غلام کو جو بالعموم یورپی اصل کے ہوتے تھے، آزاد کر کے معاشرتی نظام میں بڑے سے بڑے مرتبے دے دیے جاتے ہیں۔ یہ غلام نمایاں سیاسی کردار ادا کرتے رہے یہاں تک کہ وہ اپنے لیے خود مختار ریاستیں قائم کرنے میں بھی کامیاب ہو گئے۔ مراتب میں اس ترقی کا نتیجہ لازمی طور پر عرب امیر گھرانے کے جھگڑوں کی صورت میں برآمد ہوتا تھا اور آپس میں مار دھاڑ شروع ہو جاتی تھی۔

مرسلہ: نثار اختر، پشاور

ہم لوگوں نے آپ کے بارے میں جو اندازہ لگایا ہے وہ صحیح ہے یا غلط؟ دیکھو، یہ نہ بھولنا کہ یہ تمہارا حلفیہ بیان ہے۔"

"بھئی آپ لوگ ٹھیک کہتے ہیں۔"

"تو پھر آپ نے مان لیا کہ آپ مغربی عورتوں کے حسن کے قائل ہیں۔"

"جی ہاں، آپ لوگوں کا اندازہ بالکل درست ہے۔"

خان صاحب بولے۔ "شکر ہے آج آپ کے دل کی بات زبان تک تو آئی۔ اب میں بتاتا ہوں کہ میں جنت کے مقابلے میں دوزخ میں جانے کا مشورہ کیوں دے رہا تھا۔ کیونکہ دوزخ میں آپ کو جیسی میمیں نظر آئیں گی وہ دنیا کی حسین ترین گوری میمیں دوزخ ہی میں ہوں گی۔ مثلاً مارلین مونرو، صوفیہ لورین، الزبتھ ٹیلر، ان کے مقابلے میں جنت کی حوریں تو نہایت سادہ، باپردہ اور پاک باز ہوں گی۔ وہ ان ایکٹریسوں جیسی بے باک اور بے شرم تو نہیں ہوں گی۔"

بٹ صاحب نے فوراً دونوں ہاتھ اٹھا دیے۔ "آپ سب ٹھیک کہتے ہیں مگر میں ایسی حوروں کی جنت ہی کو ترجیح دوں گا۔ میں خود بھی نیک اور پرہیز گار مسلمان بننے کی کوشش کروں گا۔"

ہم نے کہا۔ "تو پھر آپ آج ہی سے نمازی اور پرہیز گار بن جائیے۔"

بٹ صاحب بولے۔ "بھئی آخر انسان ہوں، آہستہ آہستہ ہی بدلوں گا۔ یقین کریں میں ضرور بدلوں گا۔ بدل کر ہی رہوں گا۔"

گرینڈ بازار کی سیر ابھی ختم نہیں ہوئی تھی۔ جب مختلف دکانوں میں خریداری کی غرض سے گئے تو پتا چلا کہ یہاں تو پاکستان سے زیادہ لوٹ مار ہے لیکن کیونکہ یہ دکانداری کا معاملہ ہے اور خریدار کی مرضی سے طے پاتا ہے اس لیے حکومت سرکاری طور پر کچھ بگاڑ نہیں سکتی صرف گاہکوں کو خبردار کرتی رہتی ہے کہ قیمتوں کے بارے میں چند دکانیں گھومنے کے بعد فیصلہ کیجیے گا۔ یہاں نقلی مال بھی ملتا ہے۔ اس کو پہچاننا بھی آپ کا فرض ہے۔

بٹ صاحب بولے۔ "بھائی دو نمبر اور تین نمبر مال تو یہاں بھی ملتا ہے۔ مثال کے طور پر قالین ہی دیکھ لیجیے۔ اصلی اور قیمتی قالین کی پہچان ہر کوئی نہیں کر سکتا۔ اب دکاندار کی مرضی پر ہے کہ آپ سے کیا قیمت طلب کرتا ہے اور بھاؤ تاؤ کے بعد فیصلہ کیا ہوتا ہے۔ خریدار سمجھتا ہے کہ اس نے دکاندار کو بے وقوف بنا دیا اور دکاندار دل ہی دل میں ہنستا ہے کہ کیا احمق گاہک پھنسایا ہے۔" مرزا مشرف نے ایک اور بات بھی ہمیں بتائی تھی۔ ان کا کہنا تھا کہ اکثر دکاندار خریدا ہوا مال آپ کے ہوٹل پہنچانے کی پیشکش کرتے ہیں مگر اس پر کبھی رضامند نہ ہوں ورنہ ہوٹل تک پہنچتے پہنچتے قالین بدل جاتے ہیں اور آپ کے فرشتوں کو بھی علم نہیں ہوتا۔ بعض دکاندار قالینوں کو خوبصورت رنگوں سے نکھار دیتے ہیں مگر کچھ عرصے بعد یہ مصنوعی رنگ ہلکے پڑ جاتے ہیں یا غائب ہو جاتے ہیں۔ قالین کی بُنائی اور اس کے رنگ کو پہچاننا ہر ایک کے بس کی بات نہیں ہوتی۔

بٹ صاحب نے سب باتیں سن کر بحث کی کہ گرینڈ بازار کو صرف دیکھ لینا کافی ہے۔ یہاں خریداری کرنا حماقت ہے۔ یہ جاننا بھی مشکل ہے کہ اون کون سا عمدہ ہوتا ہے۔ ترکی میں ہی نہیں پاکستان، ایران اور دوسرے مشرقی ملکوں میں بھی یہ رواج ہے۔ جب تک قیمتوں میں کمی بیشی کے لیے بحث نہ کر لی جائے نہ دکاندار کو مزہ آتا ہے اور نہ خریدار کو، جہاں تک ترکی موسیقی کا تعلق ہے اس میں مشرقی اور مغربی موسیقی کی آمیزش ہے۔ ترکی کے گانوں میں رومان اور عشق کا عنصر زیادہ ہوتا ہے، ان کی بنیادی کلاسیکی موسیقی میں یونانی اور عربی میوزک کے علاوہ مشرقی موسیقی بھی شامل ہو گئی ہے۔ مصریوں کی طرح ترک بھی موسیقی کے بہت شائق ہوتے ہیں۔ ترکی کے رقص میں ہسپانوی اور خانہ بدوشی رقص بھی شامل ہو گیا ہے۔ لڑکے لڑکیاں اکٹھے ہوں تو ناچ گانے کے دور چلتے رہتے ہیں۔ نے یعنی بنسری یہاں کا پسندیدہ ساز ہے۔ اس میں ایک ڈھول بھی شامل ہوتا ہے۔ قدرم یہاں کا ایک پسندیدہ ساز ہے جو صوفیا سے منسوب ہے۔ اس میں جو بنیادی ساز یعنی ڈھول شامل ہوتا ہے اس چھوٹے سے ڈھول کو قدرم کہا جاتا ہے۔ مگر سچ تو یہ ہے کہ ہمیں مختلف گانوں میں کوئی فرق محسوس نہیں ہوا۔ سننے میں سب ایک جیسے ہی لگے۔ قدرم کے علاوہ رباب بھی ایسا ساز ہے جو ترکی موسیقی میں شامل ہے۔ یہاں بنسری کے علاوہ نفیری بھی سازوں میں شامل ہے۔ فنِ موسیقی کے ساتھ تصوف کا تذکرہ بھی شامل ہو گیا ہے اس لیے بٹ صاحب کی صوفیانہ رگ پھڑک اٹھی اور انہوں نے فیصلہ کیا کہ ہمیں مولانا رومؒ اور حضرت ایوبؓ کا مزار مقدس بھی ضرور دیکھنا چاہیے۔

(جاری ہے)

حاکمِ ہند

طارق عزیز خان

انگریزوں کی آمد سے قبل جنوبی ہند پر قبضہ کرکے اپنی حکومت پرتگال کا سکہ چلانے والے ایک یورپی مہم جو کا مختصر سا تذکرہ۔ اس نے یہ مقام اپنے عزم وحوصلے سے حاصل کیا تھا۔

سلطنتِ برطانیہ سے قبل ہند پر قابض یورپی باشندے کا احوال

وہ ایک سرد رات تھی۔ پرتگال کا تخت مینوئل اول کو مل چکا تھا۔ شہنشاہ افانسو پنجم کا گزشتہ سال 1481ء میں انتقال ہوا تھا۔ اس کے وارث کی حیثیت سے اس سال مینوئل اول نے تخت وتاج سنبھال لیا تھا۔ اس کے مقربِ خاص میں افانسو ڈی البرکیک بھی شامل تھا جو اس وقت اس کے سامنے بیٹھا تھا۔

"اگر اجازت ہو تو میں ایک خیال پیش کرنا چاہتا ہوں۔" افانسو نے مینوئل کی طرف دیکھ کر کہا۔

"میں تمہارے جیسے بہادروں، بیدار مغز افراد کی

قدر کرتا ہوں۔ بلاخوف و جھجک بولو۔" مینوئل نے حوصلہ افزائی کی۔

"میرا مشورہ ہے کہ ہندوستان کے لیے ایک مہم روانہ کی جائے۔"

"مشورہ معقول ہے۔ مہم کی تیاری کے لیے میں واسکو ڈی گاما سے کہہ دیتا ہوں۔ لیکن اس مہم میں تم بھی شریک رہو گے۔" مینوئل نے ہنس کر جواب دیا۔

افانسو ڈی البکر یک 6 اپریل 1506ء کو چھ بحری جہازوں اور ان پر سوار 700 ملاحوں کے ساتھ ہندوستان کے سفر پر روانہ ہوا۔ اس نے شمالی بحر اوقیانوس میں واقع کیپ ورڈے کے جزائر میں قیام کیا اور جولائی میں خط استواء پار کر کے جنوبی بحر اوقیانوس میں داخل ہوا۔ اس کے بحری جہاز راس امید کے گرد گھوم کر بحر ہند میں داخل ہوئے اور انہوں نے 1506ء کے موسم خزاں میں موزمبیق میں لنگر گرائے۔ موزمبیق میں قیام کے دوران ہندوستان سے آنے والے چار مزید بحری جہاز اس کے بیڑے میں شامل ہوگئے۔

افانسو کا بیڑا دسمبر میں بحیرہ عرب میں داخل ہوا۔ اس نے جنوری 1507ء میں صومالیہ سے 240 کلومیٹر مشرق اور یمن سے 350 کلومیٹر جنوب میں واقع سکوٹرا (Socotra) کے جزیرے پر قیام کیا۔ افانسو نے جزیرے پر پرتگال کا پرچم لہرا کر اسے پرتگال کی ملکیت قرار دیا۔ اس نے بحیرہ عرب اور خلیج عدن کے سنگم پر واقع اس جزیرے کی دفاعی اہمیت کے پیشِ نظر وہاں ایک فوجی قلعہ بھی تعمیر کیا۔

سکوٹرا میں قیام کے دوران افانسو نے بحیرہ احمر میں پرتگالی کالونی کی بنیاد رکھنے کے لیے اپنے ایک بحری جہاز کو مغرب میں واقع ایتھوپیا روانہ کیا۔ اس کام سے فارغ ہو کر افانسو نے ٹرسٹاؤ ڈی کن ہا (Tristao de Cunha) کی قیادت میں اپنے دو بحری جہازوں کو مشرق میں ہندوستان روانہ کیا جبکہ خود 7 بحری جہازوں اور 800 ملاحوں کو لے کر شمال کی طرف بڑھا۔ اس نے جولائی 1507ء میں مسقط کو فتح کیا۔ وہ اگست کے دوران خلیج اومان سے ہوتا ہوا خلیج فارس میں داخل ہوا۔ افانسو نے 25 ستمبر کے دن جنوبی ایران کے جزیرے ہرمز (Hormuz) پر حملہ کر کے اسے فتح کیا۔ اس نے جزیرے پر Fort of Our Lady of Victory کے نام سے ایک فوجی قلعہ تعمیر کیا۔ افانسو نے اس قلعے کی تعمیر کے لیے افسر اور ماتحت میں فرق رکھے بغیر اپنے تمام عملے سے کام لیا۔

ہسپانوی جہاز رانوں نے عام مزدوروں کے ساتھ کام کرنے کو اپنی توہین گردانا اور افانسو سے مزید فتوحات کی بجائے ہندوستان روانگی کا مطالبہ کیا۔ اگلے چند ماہ تک ہسپانوی جہاز رانوں کے درمیان تناؤ کی کیفیت رہی، یہاں تک کہ افانسو نے اگست 1508ء میں بحیرۂ عرب میں سفر کا آغاز کیا۔

پرتگالی بیڑا دسمبر کے وسط میں جنوبی ہندوستان کی بندرگاہ کینانور (Cannanore) پہنچا۔ افانسو نے پرتگالی گورنر فرانسسکو ڈی ایل میڈا (Francisco de Almeida) کو بطور گورنر اپنی تقرری کے کاغذات پیش کیے۔ تاہم ایل میڈا نے افانسو کی نئی حیثیت کو تسلیم کرنے سے انکار کر دیا جس کے بعد دونوں پرتگالی افسران کے درمیان کشیدگی عروج پر پہنچ گئی۔ بدقسمتی سے افانسو کے عملے کے بعض سینئر جہاز رانوں نے اس کا ساتھ دینے کی بجائے ایل میڈا سے گٹھ جوڑ کر لیا۔ بدلتے حالات میں افانسو اپنے چند وفادار ساتھیوں کو لے کر کوچین (Cochin) چلا آیا۔ ادھر ایل میڈا کی قیادت میں 3 فروری 1509ء کو مقامی ہندوؤں اور ان کے عرب سرپرستوں کے درمیان گجرات کے ساحل پر قبضے کے لیے جنگ دیو (Battle of Diu) لڑی گئی۔ یہ جنگ کئی معنوں میں اہم تھی۔ ایک طرف پرتگالی تھے تو دوسری طرف مسلمان اور مقامی ہندو۔ گجرات کے ساحل لہو سے سرخ ہوگئے مگر عسکری برتری کی وجہ سے، جدید سامانِ حرب سے لیس ہونے کے باعث میدانِ جنگ پرتگالیوں کے حق میں رہا۔

جنگ سے فرصت ملنے کے بعد ایل میڈا نے جولائی میں ڈیاگو لوپس ڈی سکویرا (Diogo Lopes de Sequeira) کی قیادت میں پرتگالی سفارت کاروں کے ایک وفد کو خلیج بنگال کے مشرق میں واقع سلطنت آف ملاکا روانہ کیا۔ اس سفارتی وفد میں فرڈی ننڈ میگلن اور فرانسسکو سیراؤ کے ساتھ قریب تین درجن پرتگالی جہاز راں شامل تھے۔ یہ مالے کے جزائر (Malay Archipelago) میں قدم رکھنے والی پہلی پرتگالی مہم تھی۔

سفارت کاروں کے ملاکا روانہ ہونے کے بعد ایل میڈا نے افانسو کو پیغام بھجوایا کہ وہ ہندوستان کی گورنری کے حق سے دستبردار ہو کر پرتگال واپس چلا جائے۔ افانسو کے انکار کے بعد ایل میڈا نے اگست 1509ء میں اسے گرفتار کر کے کینانور میں واقع سینٹ اینجلو (St Angelo) کے قلعے میں قید کر دیا۔ افانسو نے اگلے تین ماہ قید تنہائی میں گزارے، یہاں تک کہ نومبر کے آغاز پر پرتگال سے آنے والے 15 بحری جہازوں پر مشتمل بیڑے اور قریب 3000 سپاہیوں پر مشتمل ایک بڑی مہم نے اسے قید سے نجات دلائی۔ 4 نومبر 1509ء کے دن افانسو ڈی البکر یک نے ہندوستان کے دوسرے گورنر کا حلف اٹھایا۔ اس نے ایل میڈا کو اس کے سابقہ رویّے پر معاف کر کے پرتگال جانے کی اجازت دے دی۔

ہندوستان کے گورنر کا عہدہ سنبھالنے کے بعد افانسو نے ساحل مالابار پر پرتگالی قبضے کو مستحکم بنانے پر توجہ دی۔ اس نے 1510ء کے موسم بہار میں 1200 سپاہیوں اور 23 جنگی جہازوں کے ساتھ کالی کٹ اور گوا کی بندرگاہ پر حملہ کر دیا۔ اس نے ایک مختصر جنگ کے بعد ان دونوں اہم تجارتی مراکز کا قبضہ حاصل کیا اور انہیں پرتگال کی نوآبادی بنانے کا باضابطہ اعلان کر دیا۔

افانسو نے گوا کو بحر ہند کے اطراف میں واقع پرتگالی نوآبادیاتی سلطنت کا دارالحکومت بنایا۔ وہاں انتظامیہ کے دفاتر بنائے اور سکّے ڈھالنے کے لیے پہلی ٹکسال قائم کی۔

فروری 1511ء میں سلطنت آف ملاکا سے آنے والے ایک ہندو تاجر نینا چاتو (Nina Chatu) نے افانسو سے ملاقات کر کے ملاکا میں قید پرتگالی جہاز راں روئے ڈی آروجو (Rui de Araujo) کا خط پیش کیا۔ خط میں انکشاف کیا گیا تھا کہ دو سال پہلے ملاکا جانے والے سفارت کاروں کی اکثریت کو مقامی بادشاہ سلطان محمد شاہ نے گرفتار کر کے قید کر لیا تھا۔ آروجو نے پرتگالی گورنر سے درخواست کی کہ وہ ان کی رہائی کے اقدامات کرے۔ خط پڑھنے کے بعد افانسو نے سلطنت آف ملاکا پر حملے کی تیاری شروع کر دی۔ وہ اپریل 1511ء میں 18 بحری جہازوں، 900 پرتگالی اور 200 ہندو سپاہیوں کے ساتھ خلیج بنگال پار کر کے آبنائے ملاکا میں داخل ہوا۔

اس زمانے میں سلطنت آف ملاکا کا شمار ایشیا کی امیر اور طاقتور ریاستوں میں ہوتا تھا۔ ریاست کی فوج 20 ہزار سپاہیوں، پانچ درجن جنگی بحری جہازوں اور 2000 آتش گیر گولے داغنے والی توپوں سے لیس تھی۔ ملاکا کی بندرگاہ بحر ہند کے اطراف میں واقع سب سے بڑی اور مصروف بندرگاہ تھی۔ شہر کی بیشتر عمارتیں قیمتی لکڑی سے بنی ہوئی تھیں۔ سڑکیں چوڑی اور صاف ستھری تھیں جبکہ مقامی بازار میں لگے گرم مسالوں کے ڈھیر تاجروں کی توجہ کا مرکز تھے۔

بندرگاہ کے قریب پہنچنے کے بعد افانسو کو وہاں عربوں، چینیوں اور ہندوستانیوں کے بحری جہازوں کے ساتھ ساتھ مقامی بحریہ کے درجنوں جنگی لنگر انداز دکھائی دیے۔ افانسو نے اپنے ایک وفد کو شاہی محل روانہ کیا اور بادشاہ سے پرتگالیوں کی رہائی کے ساتھ ساتھ سالانہ خراج کی ادائیگی کا مطالبہ کیا۔ سلطان محمد شاہ نے پرتگالیوں کی بحری طاقت کا تمسخر اُڑاتے ہوئے انہیں مشورہ دیا کہ وہ سلطنت آف ملاکا کی حدود سے نکل جائیں۔ افانسو مقامی بادشاہ کی فوجی طاقت سے ذرا بھی مرعوب نہیں ہوا۔ اس نے فوری فیصلہ کرتے ہوئے بندرگاہ پر گولہ باری شروع کر دی اور وہاں کھڑے بحری جہازوں کو آگ لگا دی۔ 25 جولائی 1511ء کے دن دونوں فریقین کے درمیان دوبدو جنگ کا آغاز ہوا۔ پرتگالی فوج کے ایک حصے نے مقامیوں کو لڑائی میں الجھائے رکھا جبکہ افانسو کی قیادت میں سپاہیوں کے ایک گروپ نے 24 اگست کو شہر پر حملہ کر کے بیشتر عمارتوں کو آگ لگا دی۔ یہ حملے اتنے کارگر تھے کہ مقامی اس کے آگے نہ ٹھہر سکے اور نومبر کے وسط تک سلطنت آف ملاکا پر پرتگالیوں کا کنٹرول قائم ہوگیا۔

افانسو ڈی البکر یک نے روئے ڈی آروجو کو ملاکا کے انتظام سے متعلق اہم ذمہ داریاں سونپ دیں۔ اس نے جنوب مشرق میں واقع سماٹرا، جاوا اور بورنیو کے مقامی ہندو راجاؤں اور ہمسایہ ممالک کے ساتھ تعلقات استوار کرنے کے لیے وفد روانہ کیے۔ اس سلسلے میں اکتوبر 1511ء میں ڈورتے فرنانڈز

گبن، ایڈورڈ Gibbon Edward

(1737-1794ء)

مشہور انگریز مورخ۔ لندن کے قریب پٹنی (سرے) میں ایک رئیس گھرانے میں پیدا ہوا۔ ڈیڑھ سال آکسفورڈ اسکول میں گزارنے کے بعد سوئٹزرلینڈ اپنے والد کے ہمراہ گیا اور وہاں پانچ سال رہا۔ تعلیم وہیں مکمل کی۔ جنگ ہفت سالہ میں برطانوی فوج میں کپتان کی حیثیت سے خدمات انجام دیں۔ یورپی ممالک کی سیاحت کے بعد 1768ء میں لندن میں سکونت اختیار کی اور وہیں اپنی مشہور و معروف تاریخ "زوال و سقوطِ سلطنتِ روما" لکھنی شروع کی جس کی تدوین و تصنیف میں بیس سال متواتر شب و روز مشقت کی۔ یہ کتاب 1776ء اور 1788ء کے درمیان چھ جلدوں میں شائع ہوئی۔ تاریخ اور ادب دونوں میدانوں میں یہ تصنیف بڑی بلند پایہ سمجھی جاتی ہے، 1774ء سے 1783ء تک پارلیمنٹ کا رکن بھی رہا۔

مرسلہ: نعمان سرفراز، سلطنت اومان

کی قیادت میں ایک وفد کو سلطنت آف تھائی لینڈ روانہ کیا گیا۔ یہ تھائی لینڈ تک رسائی حاصل کرنے والی پہلی یورپین مہم تھی۔ سلطنت کے داخلی معاملات پر گرفت مضبوط کرنے کے بعد افانسو نے مشرق میں واقع ملوکا کے جزائر کی طرف توجہ مبذول کی جو اس زمانے میں گرم مصالحوں کے جزائر (Spice Island) کے نام سے مشہور تھے۔

درحقیقت پرتگالیوں کی مالے کے جزائر میں آمد کا مقصد گرم مصالحوں کی بین الاقوامی تجارت پر کنٹرول حاصل کرنا تھا۔ افانسو جانتا تھا کہ 1494ء میں ہوئے دنیا کی تقسیم کے معاہدے کے بعد ہسپانوی مہم جو امریکا کو پار کر کے ملوکا کے جزائر تک رسائی کی کوششوں میں مصروف تھے۔ پرتگالیوں کی سلطنت آف ملاکا میں آمد کے وقت تک ہسپانوی اپنے مقصد میں کامیاب نہیں ہوئے تھے، تاہم ان کی طرف سے شروع کی گئی پے در پے مہمات کو دیکھ کر اندازہ ہوتا تھا کہ وہ جلد یا بدیر امریکا کو پار کر کے مغربی بحر (بحر الکاہل) کے راستے ملوکا تک پہنچ جائیں گے۔

سلطنت آف ملاکا پر کنٹرول کے بعد افانسو نے ملوکا تک رسائی کے اقدامات کیے۔ اس کی کوشش تھی کہ وہ ہسپانویوں کی ملوکا میں آمد سے پہلے پہلے مالے کے طول و عرض میں ایک وسیع نوآبادیاتی سلطنت قائم کر لے۔ اپنے مقصد کو حاصل کرنے کے لیے افانسو نے نومبر 1511ء میں پرتگالی مہم جو، انٹونیو ڈی ایبریو کی قیادت میں تین بحری جہازوں کے ایک بیڑے کو ملوکا روانہ کیا۔ ایبریو کے ساتھ اس مہم میں اس کا نائب فرانسسکو سیراؤ بھی شامل تھا۔ سیراؤ پچھلے دو سال سے ملوکا تک رسائی کے لیے بے چین تھا۔ مقامی بادشاہ کی طرف سے گرفتاری سے پہلے اس نے مالے کے جزائر کا ایک تفصیلی نقشہ تیار کر لیا تھا۔ سیراؤ نے ملوکا جانے سے پہلے یہ نقشہ اپنے کزن اور قریبی ساتھی فرڈی نینڈ میگلن کے سپرد کیا۔ اسے ہدایت کی کہ وہ اس نقشے کو پرتگال واپس جا کر مینوئل اول کی خدمت میں پیش کرے۔

میگلن، خلیج بنگال کے راستے پرتگال روانہ ہوا اور سیراؤ نے انٹونیو کے ساتھ ملوکا کی راہ لی۔ پرتگالی بحری جہاز، بحیرہ جاوا سے ہوتے ہوئے 1512ء کے موسم بہار میں بحیرہ بانڈا میں داخل ہوئے۔ انہوں نے ایمبون کے جزیرے پر قیام کیا۔ دونوں بحری جہازوں کے تہ خانوں کو لونگ اور جاوتری سے بھرنے کے بعد ایبریو نے ملاکا واپسی کا سفر شروع کیا جبکہ فرانسسکو سیراؤ اپنے چند ساتھیوں کے ساتھ ایک تجارتی بحری جہاز پر سوار ہو کر شمال میں واقع ٹرنیٹ کے جزیرے پر پہنچ گیا۔ سلطان آف ٹرنیٹ نے پرتگالی وفد کا استقبال کیا اور سیراؤ کو اپنا فوجی مشیر مقرر کر دیا۔

ادھر ملوکا تک رسائی کی مہم روانہ کرنے کے بعد افانسو ڈی البکر یک نے ہندوستان واپسی کی تیاری شروع کی۔ وہ 10 ستمبر 1512ء کو 14 بحری جہازوں کے بیڑے کے ساتھ گوا پہنچا۔ ہندوستان میں چند ماہ کے قیام کے بعد افانسو نے جنوری 1513ء میں جارج ایلوریس کی قیادت میں ایک سفارتی وفد کو جنوبی چین روانہ کیا اور خود فروری کے دوران بحیرۂ عرب میں واقع سکوٹرا کے جزیرے پر پہنچ گیا۔ وہ 1515ء کے وسط میں ایک بار پھر ہندوستان پہنچا۔ جہاں پرتگال سے آئے نئے وائسرائے نے اس کا استقبال کیا۔ نئی انتظامیہ سے افانسو کے تعلقات کچھ زیادہ خوشگوار نہیں رہے۔ وہ پرتگال واپسی کا سوچ رہا تھا کہ 1515ء کے آخر میں اس کا گوا میں انتقال ہو گیا۔

افانسو ڈی البکر یک نے بحر ہند کے اطراف میں سر انجام دی گئی مہمات کے دوران لگ بھگ 50 ہزار کلومیٹر کا سفر طے کیا۔ وہ 1509ء سے 1515ء تک ہندوستان سمیت بحر ہند کے اطراف میں واقع پرتگال کی نوآبادیاتی سلطنت کا وائسرائے رہا۔ دنیا کے مشرقی حصے پر پرتگالیوں کے کنٹرول کو لے کر افانسو کی خدمات کو فراموش نہیں کیا جا سکتا۔ اس کے ہاتھوں سکوٹرا کے جزیرے کی فتح کے بعد رومن انڈیا روٹ کے ذریعے اطالویوں اور عربوں کی تجارتی سرگرمیاں متاثر ہوئیں۔ جنوبی ایران کے جزیرے ہرمز کی فتح کے نتیجے میں خلیج فارس کے داخلی دروازے پر پرتگالی پہرا بیٹھ گیا۔ سلطنت آف ملاکا پر قبضے سے پرتگالیوں کی ملوکا کے جزائر تک رسائی ممکن ہوئی اور آبنائے ملاکا پر کنٹرول قائم ہونے کے بعد یورپ کے گرم مصالحوں کی ترسیل کا نظام پرتگالیوں کے ہاتھ میں آ گیا۔ اختصار کے ساتھ یہ کہا جا سکتا ہے کہ افانسو ڈی البکر یک کی کوششوں کے نتیجے میں 17 ویں صدی کے وسط تک بحر ہند اور اس سے ملحقہ سمندروں میں پرتگالیوں کی اجارہ داری قائم رہی، یہاں تک کہ دنیا کی بندر بانٹ کے لیے سجائے گئے اکھاڑے میں نئے نئے امیدوار کود پڑے۔ افانسو کے حالات زندگی کے بارے میں سب سے بہترین شہادت اس کے بیٹے برا[illegible] البکر یک کی تحریر کردہ سوانح حیات ہے جو 1557ء میں شائع ہوئی۔ وہ 1515ء میں پیوند زمین بن گیا۔

محمد ایاز راهی

عالمِ اسلام نے دنیا کو بے شمار دانشور، سائنسداں اور محقّق کا تحفہ دیا مگر ہم نے بے قدری کی' ان کو بھلادیا۔ بہت کم لوگ ہوں گے جنھوں نے عمر خیام کو صحیح انداز میں جانا۔ عام طور سے لوگ اسے صرف ایک شاعر سمجھتے ہیں لیکن وہ شاعر کم اور سائنسداں زیادہ تھا۔ اسی نے یہ نظریہ پیش کیا تھاکہ سیارہ زمین سورج کے گرد کئی انداز سے چکر لگاتا ہے اور اپنے نظریہ کو ثابت کرنے کے لیے اس نے ایک تقویم بھی مرتب کی تھی۔

ایک بھولے بسرے سائنسداں کا مختصر سا تذکرہ

سائنس انگریزی زبان کا لفظ ہے جس کے معنی اور مفہوم کچھ اس طرح ترتیب پاتی ہے کہ باقاعدہ علم یا [illegible]۔ حقائق یا اصولوں کا علم جو باقاعدہ مطالعہ اور [illegible] سے حاصل ہوتا ہے۔ کسی خاص شعبے کا علم جو حقائق یا صداقتوں سے سروکار رکھتا ہو۔ قاعدگی سے مرتب ہو اور قوانینِ عامہ کے عمل کو ظاہر کرتا ہو۔ خصوصاً طبیعی یا مادّی دنیا کے قوانین اور حقائق کا علم جس کی بنیاد تجربات پر ہو۔ اس علم کے عالم کو سائنٹسٹ کہا جاتا ہے۔ اردو میں سائنٹسٹ کا

مترادف لفظ حکیم ہے۔ آج کی دنیا میں مغرب کے حکماء اور ان کی نت نئی ایجادات کا غلغلہ ہے جو یقیناً سچ پر مبنی ہے، ان کی مسلسل محنت اور قربانیوں سے انکار نہیں کیا جا سکتا مگر اس علم و حکمت کی بنیاد مسلمان حکماء نے ہی رکھی اور باقاعدہ آغاز کیا جس کا اعتراف اہلِ مغرب بھی کرتے ہیں۔ یہ قول بالکل درست ہے کہ مشرق نے حکمت کی شمع روشن کی اور اسے مغرب کے حوالے کر کے خود گہری نیند سو گیا۔ اسی خوابِ خرگوش کا فائدہ اہلِ مغرب نے بھرپور اٹھایا اور انہوں نے اپنے طریق و ایجادات کی فہرست میں مسلمان حکماء کے طریق و ایجادات کو بھی شامل کر لیا۔ ہم سو رہے تھے اس لیے حقیقت کا ادراک نہ ہوا اور اہم نے انہی کی بات، افکار و خیالات کو آمنّا و صدّقنا قبول کر کے انہیں سند بھی دے دی جبکہ حقیقتاً اس کے وارث ہم تھے کیونکہ وہ روحِ علم ہمارے اجداد کی محنتوں مشقتوں کا ثمر تھا۔

یوں تو دنیائے اسلام میں بے شمار علماء و حکماء گزرے ہیں لیکن یہاں ہم صرف ایک کا ذکر کریں گے جس کا نام نامی عمر خیام تھا۔

عمر خیام کا شمار ان مسلمان حکماء اور موجدین میں ہوتا ہے جنہوں نے اپنے کام اور نام سے مشرق و مغرب دونوں کو یکساں طور پر متاثر کیا۔ اس نابغۂ روزگار شخصیت نے جہاں علم و حکمت میں اپنے نام کا سکہ بٹھایا وہیں ساتھ ہی شعر و ادب کی شاخ پر بھی وہ کچھ اس ادا سے چہچہایا کہ اس کی دل نشیں اور طرح دار رباعیوں کا ترجمہ دنیا کی تقریباً تمام زبانوں میں کیا گیا۔ اہلِ ادب نے اسے بے اختیار خراجِ تحسین پیش کیا۔ شاعروں اور ادیبوں نے اپنے محبوب کو عمر خیام کی رباعی سے تشبیہ دی۔

اس فرزندِ مشرق کی عظمت کا اس سے بڑا بیّن ثبوت اور کیا ہوگا کہ ایک طرف تو اس نے حکمت جیسے ٹھوس، خشک اور تحقیقی میدان میں مستند ایجادات سے دنیا کو نوازا تو دوسری طرف دیارِ ادب کی رنگین فضاؤں میں تخلیق و ہنر کے جھلملاتے دیے روشن کیے۔ صدیاں گزر گئیں مگر اس کی مستند ایجادات کی اہمیت آج بھی مسلّم ہے جبکہ شعر و ادب کی خوش بو اور روشنی بھی ماند نہیں پڑی نہ کم ہوئی۔

عمر خیام نے **1019**ء کے لگ بھگ ایران کے شہر نیشاپور میں آنکھیں کھولیں۔ نیشاپور کی وجہ تسمیہ کچھ یوں ہے کہ نہ بمعنی شہر اور شاہ پور ایران کے ایک بادشاہ کے نام سے مرکب ہے یعنی شاہ پور کا بسایا ہوا شہر نیشاپور۔ فیروزہ کی کان بھی اس کی وجہ شہرت ہے۔

عام روایات کے مطابق اس حکیمِ وقت کا نام عمر، لقب غیاث الدین، کنیت ابوالفتح اور تخلص خیام تھا۔ والد کا نام ابراہیم تھا۔ عمر خیام کے بزرگوں کا پیشہ جامہ بافی (کپڑا یا لباس بُننا) تھا مگر پدرِ خیام ابراہیم نے جامہ بافی چھوڑ کر خیمہ دوزی (خیمہ بنانا) اختیار کی اور ابراہیم خیام یا خیامی کے نام سے مشہور ہوا۔ عمر خیام نے اپنا آبائی پیشہ تو نہ اپنایا مگر اسی نسبت سے خیام تخلص رکھا۔ قدرت اسے عالم گیر شہرت اور پہچان کے لیے منتخب کر چکی تھی۔ کہا جاتا ہے کہ عمر خیام، نظام الملک طوسی اور حسن بن صباح لڑکپن میں ایک ہی مکتب کے طالب علم تھے۔ اکٹھے پڑھتے اور رہتے سہتے تھے۔ ایک روز تینوں دوستوں نے آپس میں عہد کیا کہ مستقبل میں جس کسی کو بھی کوئی بڑا عہدہ، امارت یا خوش حالی میسر آئی تو وہ اپنے دیگر دو دوستوں کی دامے درمے قدمے سخنے بھرپور مدد کرے گا۔ حسنِ اتفاق کہ آگے چل کر یہ تینوں دوست نادر روزگار شخصیات ثابت ہوئے اور تینوں نے ہی تاریخ کے اوراق میں جگہ پائی بلکہ جریدۂ عالم پر ان مٹ نقوش چھوڑے۔ ”ثبت است بر جریدۂ عالم دوام ما۔“

نظام الملک طوسی، ترک سلطنت میں سلجوقی بادشاہ سلطان ملک شاہ کا وزیر اعظم بنا۔ بڑا رحم دل، خلیق اور علم دوست آدمی تھا بغداد (دارالسلام) میں مدرسہ نظامیہ کی بنیاد اسی نے رکھی بلکہ اسی نام سے چار اور مدارس کا اجراء کیا جہاں شیخ سعدیؒ جیسے دانا و بینا نے تعلیم پائی۔ عمر خیام نے حقیقت مجاز (حکمت و شاعری) دونوں ہی میں دوام پایا اور دنیا بھر کو اپنے لازوال فن کا اسیر کیا، علم و عمل دونوں میں مثال بنا۔ حسن بن صباح کی ذہانت اور صلاحیتوں نے اپنے مسلک، مسلکِ اسماعیلی کی ترویج کے لیے منفی رخ اختیار کیا اور بڑی بڑی دینی و دنیوی شخصیات اس کا شکار ہو کر قتل ہوئیں۔

خیام کو مبداء فیاض نے حیرت انگیز قوتِ حافظہ اور ذہانت عطا کی تھی سو عالمِ شباب تک پہنچتے پہنچتے فقہ، حدیث، تفسیر، قرات اور تمام علومِ معقول و منقول میں درجہ تبحر حاصل کیا۔ سلجوقی ترک فرماں روا سلطان ملک شاہ نے حکیم عمر خیام کو اپنا ندیم (مصاحبِ خاص) مقرر کیا۔ عمر خیام شاہی دربار کا ایک نغز گو شاعر، بلند پایہ فلسفی، کامیاب طبیب، ماہر ریاضی داں، متبحر عالمِ دین، نامور ستارہ شناس اور سحر کار ہیئت داں تھا۔ اس کی حکمت بھری رصدگاہ تحقیق و تخلیق کا گہوارہ تھی۔ عمر خیام کا بڑا کارنامہ نئی تقویم کی ایجاد ہے جس سے قمری اور شمسی سال میں تطابق پیدا ہوا۔ یہ نئی تقویم تین برس کی مسلسل کڑی محنت کے بعد عمر خیام نے تیار کی۔ اسے زیچ ملک شاہی اور سنِ جلالی کا نام دیا۔ اس تقویم کی خصوصیت یہ تھی کہ ہر تینتیس (33) سال کے بعد شمسی اور قمری برسوں کا فرق دور ہو جاتا تھا۔ وہ اس طرح کہ عمر خیام کی تحقیق کے مطابق شمسی سال تین سو پینسٹھ دن، پانچ ساعت (گھنٹے) اور انچاس دقیقے (منٹس) کا بنتا ہے چنانچہ عمر خیام نے یہ قاعدہ مقرر کیا کہ ہر چوتھے سال ایک دن بڑھا دیا جائے مگر سات برسوں کے بعد آٹھویں برس چوتھے سال کی بجائے پانچویں سال ایک دن بڑھایا جائے اس طرح شمسی اور قمری برسوں کا فرق بتدریج کم ہوتے ہوتے تینتیس سال میں بالکل ختم ہو جاتا ہے۔ واضح رہے کہ یہ آج سے تقریباً ایک ہزار سال پہلے کی بے عیب اور مکمل تحقیق ہے جب آج کی طرح سہولتوں کی بھرمار نہیں تھی۔ بہر حال کسی بڑے واقعے کی بنیاد پر نہ ہونا، سلجوقی ترکوں کا یک دم زوال اور بعد میں نئی نئی تقادیم کی ایجاد نے اس ملک شاہی تقویم کو طاقِ نسیاں بنا دیا۔ مگر اس سے عمر خیام کی عظمت پر کوئی حرف نہیں آیا۔ عمر خیام نے ٹھوس مثالیں دے کر ثابت کیا کہ زمین ایک سیارہ ہے اور گردش کرتی ہے یہ الگ بات ہے کہ اس وقت کے بلند پایہ اذہان بھی اس بات کو نہ سمجھ سکے (مگر جب یہی بات یورپی سائنسدانوں نے کی تو سب کو یقین آ گیا) یہ عجیب اتفاق ہے کہ عمر خیام کو ایک شاعر کی حیثیت سے زیادہ مقبولیت ملی، اس کی خوبصورت اور اعلیٰ رباعیوں نے اقصائے عالم میں دھوم مچا دی۔ روایت ہے کہ خیام سے ایک دفعہ مستی کے عالم میں جامِ شراب ٹوٹ گیا چنانچہ نشے کی کیفیت میں ہی فوراً ایک رباعی کہی۔

ابریق مے مرا شکستی ربا
برمن درِ عیش را بہ بستی ربا
برخاک بریختی مئے لعل مرا
خاکم بہ دہن کہ سخت مستی ربا

جس کا مفہوم یہ ہے ”اے خدا! تو نے میری شراب کا پیالہ توڑ دیا اور عیش کا دروازہ مجھ پہ بند کر دیا۔ میری پیاری شراب کو خاک پر لنڈھا دیا۔ میرے منہ میں خاک، کیا تو بھی مست ہے۔“ خیام کی زبان سے جوں ہی یہ الفاظ نکلے تو اس کا چہرہ سیاہ ہو گیا بعض تذکروں میں ہے کہ گردن ٹیڑھی ہو گئی۔ آئینے میں اپنی صورت دیکھی تو گھبرا کر کہا کہ۔

ناکردہ گناہ در جہاں کیست بگو
آں کس کہ گناہ نہ کرد۔ چوں زیست بگو
من بد کنم۔ تو بد مکافات دہی
پس فرق میانِ من و تو چیست بگو

یعنی۔ اے خدا! یہ تو بتا کہ دنیا میں ایسا کون ہے جس نے گناہ نہ کیا ہو۔ جس نے گناہ ہی نہیں کیا وہ زندہ کیوں کر رہا۔ میں برا کروں تو، تو اس کا بدلہ برا دے۔ پس مجھ میں اور تجھ میں فرق ہی کیا رہ گیا ہے یا مجھ میں اور تجھ میں فرق ہی کیا ہے۔“ چنانچہ قدرت کاملہ کو اس معذرت پر رحم آیا اور خیام کی گردن کی کجی یا چہرے کی سیاہی فی الفور جاتی رہی جس پر خیام نے سجدۂ شکر ادا کیا اور حج بھی کیا۔ کہا جاتا ہے کہ عمر خیام اصفہان جا کر جب اپنے بچپن کے دوست اور ہم مکتب نظام الملک طوسی سے ملا تو وزیرِ مملکت طوسی نے اس کی بڑی عزت افزائی کی۔ طوسی کو اپنا بچپن کا عہد یاد آیا۔ خیام سے پوچھا، آپ کیا چاہتے ہیں؟ خیام نے صرف معمولی وجۂ معاش کی خواہش ظاہر کی۔ اس پر نظام الملک طوسی نے نیشا پور میں بارہ سو روپے سالانہ (ایک سو روپیہ ماہانہ) کی جاگیر مقرر کر دی۔ خیام نے اسی پر ہی قناعت کی مگر سلاطین و امراء

گپتا سلطنت

320ء میں ہندوستان میں چندر گپت نے گپتا خاندان کی بنیاد ڈالی اور اس سلطنت کا آغاز کیا جسے ہندو ادب و فن کا سنہری زمانہ کہا جاتا ہے۔ گپتا خاندان کے عہدِ حکومت میں ہی کالیداس جیسا بلند پایہ شاعر اور ڈراما نویس پیدا ہوا اور اسی دور میں اجنتا کے غاروں میں مصوری کے وہ شاہکار عمل میں آئے جو بیسویں صدی کے نقاد کو بھی ورطۂ حیرت میں ڈال دیتے ہیں۔ گپتا اقتدار کا خاتمہ **540**ء میں ہوا۔ یہ امر بھی قابلِ ذکر ہے کہ سمندر گپت جسے ہندوستانی نپولین کہا جاتا ہے اسی خاندان کا چشم و چراغ تھا۔ **528**ء میں ہن حملہ آوروں کو بھی اسی خاندان کے بادشاہوں نے پنجاب میں شکستِ فاش دی تھی۔

مرسلہ: نگار فراز صدیقی، کوئٹہ

اس سے برابری کا سلوک کرتے تھے۔ شمس الملوک خاقان بخاری خیام کو تخت پر اپنے برابر بٹھاتا تھا۔ ملک شاہ سلجوقی ترک فرماں روا نے خیام کو مصاحبِ خاص کا رتبہ دے رکھا تھا۔ خیام فلسفہ میں بوعلی سینا کا ہم پلہ تھا۔ مذہبی علوم اور فنِ تاریخ و ادب میں اسے امام کی حیثیت حاصل تھی۔ حافظہ اس قدر قوی تھا کہ ایک دفعہ اصفہان میں ایک کتاب نظر سے گزری تو چھ سات بار اس کا مطالعہ کیا واپس نیشا پور آیا تو پوری کتاب زبانی لکھوا دی۔ قرأت اور تفسیر میں بھی ماہر تھا۔ خیام فلسفہ جبر کا قائل اور معتقد تھا۔ اس کے نزدیک صرف حال ہی سب کچھ ہے ماضی اور مستقبل سے کچھ غرض نہیں۔ جو کچھ ہے حال میں ہے۔ کھاؤ، پیو اور خوش رہو۔ عربی کہاوت ہے کہ "الحق مُرٌ" یعنی حق بات تلخ ہوتی ہے۔ خیام کہتا ہے کہ چونکہ شراب کا ذائقہ تلخ ہوتا ہے اس لیے شراب حق ہے۔ جس طرح عربی زبان میں ابونواس شراب کا دلدادہ ہے فارسی میں خیام دورِ جام کا تخچیر ہے مگر خیام کی بادہ خواری رندانہ نہیں حکیمانہ تھی اس کے نزدیک شراب ان شرائط کے ساتھ جائز تھی۔ کس کو پینی چاہیے؟ کتنی پینی چاہیے؟ کن کی صحبت میں پینی چاہیے؟ کب کب پینی چاہیے؟ پھر صاف صاف بتاتا ہے کہ کس طرح پینی چاہیے یعنی "کم کم خورو گہ گہ خورو تنہا مے خور۔"

خیام کی اخلاقی تعلیمات میں ریاکاری سب سے بڑا جرم ہے چاہے وہ کسی بھی شکل میں ہو۔ دنیا کی بے ثباتی اور عبرت انگیزی بلند پایہ اور بزرگ شعرا کا سب سے بڑا موضوع ہے۔ سعدی، حافظ، ناصر خسرو، ابن یمین کی کل کائنات یہی ہے۔ درحقیقت اس مضمون کی ابتدا خیام نے کی اور انتہا تک پہنچایا۔ ادراک حقائق کے ضمن میں خیام بھی اپنے پیش رو حکماء اور علما کا ہم نوا ہے کہ "معلوم شد کہ ہیچ معلوم نہ شد۔"

خیام گو یہ فلسفہ سکھاتا ہے کہ ہم کچھ نہیں جانتے۔ مگر ساتھ ہی معلوم کرنے خواہش اور ترغیب بھی دلاتا ہے۔ خیام زیادہ تر فلسفۂ یونان کا درس دیتا تھا۔ سو لوگ اسے بے دین اور ملحد سمجھتے تھے۔ بالآخر اس کی جان کے درپے ہوئے تو خیام حج پر چلا گیا۔ عمر خیام کو آج تک جس چیز نے زندہ رکھا وہ اس کی اعلیٰ رباعیاں ہی ہیں۔

نغمہ و مے کا یہ طوفانِ طرب کیا کہیے
گھر مرا بن گیا خیام کا گھر آج کی رات
(اسرار الحق مجاز)

فارسی ادب میں عمر خیام کی شاہ کار رباعیاں آج بھی منفرد اور زندہ شہ پاروں کا مقام رکھتی ہیں۔ عمر خیام نے اکثر روایات کے مطابق طویل عمر پائی۔ غالباً 1122ء میں فوت ہوا۔ نیشا پور کے گورستان حیرہ میں مدفن بنا۔ کہا جاتا ہے عمر خیام اپنی وفات کے دن روزے سے تھا اور بوعلی سینا کی کتاب الشفاء کا مطالعہ کر رہا تھا جب وحدت و کثرت کے باب پر پہنچا تو وقفہ کیا اپنے خلالِ دنداں کو کتاب کے صفحوں کے درمیان رکھ دیا۔ معززینِ شہر کو بلا کر وصیت کی۔ عشاء کی نماز پڑھ کر سر سجدے میں رکھا اور مناجات کی۔ "رب العالمین مجھے علم ہے کہ میں نے اپنی لیاقت اور بساط کے مطابق تجھے سمجھا مجھے امید ہے کہ یہی معرفت میرا وسیلۂ مغفرت بن جائے گی۔" اس کے بعد جان، جان آفریں کے سپرد کر دی۔ عمر خیام کی کل تصانیف کی تعداد نظم و نثر میں 16 ہے۔

نظامی عروضی لکھتے ہیں کہ 1112ء میں میرا بلخ جانا ہوا تو وہاں حکیم عمر خیام سے ملاقات کا شرف حاصل ہوا۔ رسمی علیک سلیک کے بعد گفتگو کا سلسلہ شروع ہوا تو حکیم خیام کی عقل و دانش کا سحر حلال مجھے اپنی گرفت میں جکڑتا چلا گیا۔ علم و حکمت کے اَن مول موتی تھے کہ ہر طرف بکھر رہے تھے نکتہ دانیوں کے پھول سے چہار سو کھلتے اور لہلاتے لگ رہے تھے۔ باتوں باتوں میں حکیم خیام نے کہا کہ میری قبر ایسے مقام پر بنے گی کہ ہر سال دو دفعہ درخت اس پر پھول برسائیں گے۔ بہرحال محفل ختم ہوئی تو میں سحر زدہ سا واپس لوٹ آیا۔ کئی دنوں تک اس صحبت کی یاد دل میں چٹکیاں لیتی رہی اور من حکیم خیام کی صحت و زندگی کے لیے دعا گو رہا۔ چند برس بعد میں نیشا پور گیا تو یہ سن کر جگر تھام لیا کہ حکیم خیام انتقال کر چکے ہیں۔ علم و حکمت کا گل زار ایک بار پھر خزاں کی نذر ہو چکا تھا۔ عقل و دانش کا ایک اور چراغ بجھ گیا تھا۔ میں غم سے نڈھال فاتحہ خوانی کے لیے مرحوم کی قبر پر گیا تو دیکھا کہ باغ کی دیوار کے ساتھ ہی قبر ہے اور سرہانے امرود، زرد آلو (خوبانی) کے درخت کھڑے ہیں اور شگوفے جھڑ کر اس قدر ڈھیر ہو گئے ہیں کہ قبر ڈھک گئی ہے۔ مجھے حکیم موصوف کا قول یاد آیا اور بے اختیار آنسو جاری ہو گئے۔ ہاتھ فاتحہ کے لیے اٹھ گئے۔

یورپ میں عمر خیام کے متعلق بہت کچھ لکھا جا چکا ہے کیونکہ خیام کے خیالات اہلِ یورپ سے زیادہ ملتے جلتے ہیں یوں مشرق کی بہ نسبت مغرب نے خیام کی زیادہ عملی قدر کی ہے۔

اس نے ایک آدم خور شیر کا شکار کرنے کے لیے کیسے کیسے حربے استعمال کیے، کیا کیا جتن کیے۔ اس علاقے میں کئی ایک شیر رہائش پذیر تھے ان میں سے صرف آدم خور کا شکار کرنا تھا۔ جو ایک کارِ دشوار تھا۔ وہ اسی کام میں الجھا ہوا تھا کہ ایک نئی بات ہوگئی......

شکار

ایک مختصر سی مگر دلچسپ شکار کتھا

سید احتشام

جو شیر بندھے ہوئے جانوروں کے قریب آنے سے کتراتے ہیں انہیں پھنسانے کے لیے یہ گٹیا والی ترکیب مجھے بڑی اچھی لگی۔ اگر سامنے کی بٹیاں شیر کا ایک آدھ وار سہنے کی صلاحیت رکھتی ہوں اور اندر شکاری چوکنا ہو تو یہ ترکیب کارگر ہونے کے ساتھ ساتھ کافی محفوظ بھی ہے، حالانکہ میرے خیال میں کسی شیر کو آدم خور بنانے میں گولی کا زخم ہی سب سے بڑا سبب ہوتا ہے۔ پھر بھی ہمیشہ یہ بات سچ نہیں ہوتی۔ بھی بوڑھے اور معذور شیر آدم خور نہیں ہو جاتے۔ ایسی کئی مثالیں بھی ملتی ہیں کہ اس عادت کی بنیاد یہ ہوتی ہے کہ شیر کی جھجک کسی بار دور ہو جائے تو وہ آدمی کو آسانی سے لقمہ بنا لیتا ہے۔

سیتے پور میں چند سال پہلے گرمی اپنے شباب پر تھی۔ "آس کی پہاڑی" نامی ایک بڑے سے جنگلی ٹیلے کے قریب بسے ہوئے گاؤں سے ایک آدم خور شیر کی خبر آئی۔ ایک کنبے کے تین افراد بوڑھی ماں، اس کا بیس سالہ جوان بیٹا اور بوڑھی ماں کی جوان بیٹی، لکڑی اکٹھا کرنے جنگل میں گئے تھے۔ ویسے اس علاقے میں پہلے ہی سے شیر کا خوف پھیلا ہوا تھا جس کی وجہ سے لوگ چھوٹی موٹی ٹولی بنا کر ہی جنگل میں جاتے تھے۔ چونکہ لکڑی بیچنا ہی اس بدنصیب کنبے کا واحد ذریعۂ آمدنی تھا لہٰذا وہ لوگ روز وہاں جانے پر مجبور تھے۔

وہ تینوں جنگل میں اِدھر اُدھر لکڑی ڈھونڈنے میں مصروف تھے کہ اچانک ماں اور بیٹے نے چند گز کے فاصلے پر لڑکی کی چیخ سنی اور ادھر دیکھا تو ایک شیر اسے گرا کر اس طرح دبوچ کر جیسے بلی چوہے کو دبوچتی ہے، پیڑوں کے جھنڈ میں لے جانے کو تھا۔ یہ دل دہلا دینے والا منظر دیکھ کر لڑکے نے نہتا ہونے کے باوجود بڑی بہادری سے کام لیا۔ وہ پتھر اٹھا اٹھا کر شیر پر پھینکتا اور زور زور سے چلاتا ہوا اس کے پیچھے بھاگا۔ لڑکی کے بوجھ کی وجہ سے شیر کی رفتار قدرے کم تھی۔ اس نے پلٹ کر لڑکی کو زمین پر چھوڑا اور جھپٹ کر لڑکے کو دبوچ لیا۔ لڑکا پھڑ پھڑا کر وہیں ختم ہو گیا۔ شیر نے پھر لڑکی کو اٹھا لیا اور جنگل میں غائب ہو گیا۔

یہ انتہائی لرزہ خیز واقعہ بوڑھی عورت کی آنکھوں کے سامنے پیش آیا تھا۔ وہ روتی پیٹتی اور چیختی چلاتی ہوئی گاؤں

احمد رضا خان

10 شوال 1272ھ 14 جون 1856ء ۔ 25 صفر 1340ھ 28 اکتوبر 1921ء ۔ اعلیٰ حضرت مولانا احمد رضا خان بریلوی قادری بن مولانا نقی علی خاں بن مولانا رضا علی خاں بن مولانا حافظ کاظم علی خاں بن مولانا شاہ محمد اعظم خاں، ہندوستان کے بہت بڑے عالمِ دین، متبحر فاضل، بلند پایہ صوفی اور شاعر تھے۔ بریلی (اترپردیش) کے محلہ جسولی میں پیدا ہوئے۔ محمد نام رکھا گیا۔ تاریخی نام المختار 1272ھ تجویز ہوا۔ دادا نے احمد رضا نام رکھا، جس میں خود مولانا نے عبدالمصطفیٰ کا اضافہ کیا۔ ان کے معتقدین انہیں اعلیٰ حضرت اور فاضل بریلوی کے نام سے یاد کرتے ہیں۔ مولانا کا خاندان افغانستان کے قبیلہ بڑیچ سے تعلق رکھتا تھا، جو کئی پشتوں تک حکومت مغلیہ میں اعلیٰ عہدوں پر فائز رہا۔ مولانا محمد اعظم خاں امورِ سلطنت سے علیحدہ ہو کر بریلی تشریف لائے اور وہیں اقامت اختیار کی۔ مولانا شاہ رضا علی اپنے دور کے بے مثل عالم اور ولی کامل تھے۔ اسی مذہبی فضا اور پُرتقدس ماحول میں اعلیٰ حضرت نے چار پانچ برس کی عمر میں قرآن مجید ناظرہ ختم کرلیا۔ اردو فارسی کی کتابیں پڑھنے کے بعد میزان منشعب وغیرہ کی تعلیم جناب مرزا غلام قادر بیگ سے حاصل کی، پھر تمام دینیات کی تعلیم اپنے والد ماجد سے مکمل کی۔ 14 شعبان 1286ھ/19 نومبر 1869ء میں تمام علوم دینیہ و عقلیہ مثلاً اصول، کلام، تاریخ، جغرافیہ، ریاضی، منطق اور فلسفہ وغیرہ کی سند حاصل کر کے منصب افتا پر فائز ہوئے۔ 1295ھ/1877ء میں حضرت شاہ آل رسول بلگرامی مارہروی سے سلسلہ قادریہ میں بیعت ہوئے۔ دیگر سلاسل مثلاً چشتیہ، سہروردیہ، نقشبندیہ، علویہ وغیرہ میں دوسرے مشائخ سے اجازت حاصل کی۔ علاوہ ازیں انہوں نے شیخ احمد بن زینی، شیخ عبدالرحمان مکی، دحلان مکی، شیخ حسین بن صالح مکی اور شیخ ابوالحسین احمد النوری سے بھی استفادہ کیا۔ آپ نے بعض علوم میں معاصرین علماء سے اور بعض میں ذاتی مطالعے اور غور و فکر سے کمال پیدا کیا۔ خصوصاً علم ریاضی اور علم نجوم و ہیئت میں ذاتی مطالعے سے دسترس حاصل کی۔ 1296ھ/1878ء میں اعلیٰ حضرت اپنے والد ماجد کے ہمراہ پہلی بار حج بیت اللہ کے لیے تشریف لے گئے۔ قیام مکہ کے دوران میں شافعی عالم شیخ حسین بن صالح ان سے بے حد متاثر ہوئے اور تحسین و تکریم کی۔ اعلیٰ حضرت نے ان کی کتاب ''الجوہرہ'' کی شرح صرف دو روز میں ''النظرۃ الرضیہ فی الیرہ الوضیہ'' کے نام سے لکھ دی۔ 1322ھ/1905ء میں دوبارہ زیارت حرمین شریفین کے لیے گئے۔ اس بار وہاں کے علماء کے لیے ایک مسئلے کا حل کفل الفقیہ کے نام سے تحریر فرمایا۔ اس کے علاوہ ایک اور تالیف ''الدولۃ المکیہ'' بھی لکھی۔ اس میں مسئلہ غیب پر محققانہ بحث ہے۔ انہی تصانیف کی بنا پر بعض علمائے حرمین نے آپ کو ''مجدد امت'' لکھا ہے۔

مرسلہ: نعمان قادری، لاہور

پہنچی اور سارا واقعہ دہرایا۔ گاؤں والے اکٹھا ہو کر جائے وقوعہ کی طرف چل دیے۔ لڑکے کی لہولہان لاش تو آسانی سے مل گئی اور واپس لے آئی گئی لیکن شیر کا سراغ کچھ دور آگے جا کر گھنے جنگل میں گم ہو گیا تھا۔ لہٰذا اُدھر جانے کی کسی میں ہمت نہیں ہوئی۔ اسی رات دکھ اور صدمے سے بوڑھی ماں بھی چل بسی۔

اس علاقے میں پہنچتے ہی ایک اور مسئلہ سامنے آیا۔ ''بانس کی پہاڑی'' میں کئی ایک شیر تھے اور میں ایک ایک کر کے ان سب کو ٹھکانے لگانے کا منصوبہ بنا کر وہاں نہیں گیا تھا۔ اس کا کوئی فائدہ بھی نہیں تھا مگر سوال یہ پیدا ہوتا تھا کہ اس آدم خور کی شناخت کیسے ہو جس نے بھائی اور بہن کی جان لی تھی۔ کافی سوچ بچار کے بعد مجھے ایک ترکیب سوجھی۔ ''بانسکی'' کی تحصیل میں بسی آبادی کے قریب ہی دو پیڑوں کے نیچے دو بچھڑوں کو باندھ دیا گیا اور ان کے پاس ہی انسانی شکل کے دو پتلوں کو پھٹے پرانے کپڑے پہنا کر کھڑا کر دیا گیا۔ اب ان دونوں ہی جگہوں پر جو ایک دوسرے سے میل بھر کے فاصلے پر تھیں، ہر رات شکاریوں کے ذریعے نگرانی کی جانے لگی۔

دو راتوں کے بعد مجھے خبر ملی کہ ایک شیر ان میں سے ایک پتلے کے قریب آ کر تھوڑی دیر اِدھر اُدھر ٹہلنے کے بعد کوئی نقصان پہنچائے بغیر چلا گیا۔ اس کے اگلے دن دوسرے مقام سے خبر آئی کہ ایک شیرنی نے آ کر پہلے جھپٹ کر پتلے کو نیچے گرا دیا اور پھر بھینسے کے بچھڑے کو مار ڈالا۔ مجھے اس مرے ہوئے بچھڑے کے قریب مچان ڈالنے میں تھوڑی بہت وقت ہوئی۔ اس لیے میں نے لگ بھگ تیس فٹ پرے زمین پر چھپ کر بیٹھنے کی ایک جگہ بنائی۔ جہاں سے نشانے کے لیے چاروں طرف کھلا میدان مل سکتا تھا۔ شکاریوں کے ذریعے دی گئی خبر کے مطابق، شیرنی ابھی اس علاقے سے گئی نہیں تھی لہٰذا اپنے شکار کو کھانے کے لیے اس کے لوٹنے کی پوری امید تھی مگر مجھے ڈر تھا کہ اس دوران وہ کہیں کسی اور کو مارنے کی نہ ٹھان لے۔ اس لیے میں نے اس بھینسے کی طرف اسے متوجہ کرنے کے بارے میں سوچا۔ ایک بکری کو لے کر میں تین شکاریوں اور کیپٹن کیبیرا سے ڈی سی کے ساتھ اسی طرف چل دیا جہاں وہ مرا ہوا بھینسا پڑا تھا۔ ہم آتے ہوئے، گاڑی کے آس پاس پھیلے ہوئے کھیتوں اور باغیچوں میں سے ہو کر چلتے اور باتیں کرتے ہوئے چلتے رہے تاکہ راستے میں شیرنی کہیں چھپی بیٹھی ہو تو یہی سمجھے کہ ہم سیدھے سادے دیہاتی ہیں جو اپنے کام سے چلے جا رہے ہیں۔

ہم ایک قطار میں چل رہے تھے۔ میں اور کیپٹن کیبیرا سے ڈی سی آگے تھے اور باقی تینوں شکاری بکری کو لیے پیچھے پیچھے چلے آ رہے تھے۔ میں نے کیپٹن کیبیر سے وعدہ کیا تھا کہ شیر پر پہلی گولی چلانے کا حق انہی کا ہوگا۔ اس لیے جب چلتے چلتے وہ کہنے لگے کہ شیر کے شکار کا یہ ان کا پہلا موقع ہے، تو مجھے اچھا نہیں لگا مگر اس وقت میری نظر اپنے راستے کے دائیں طرف کوئی پچاس فٹ کی دوری پر ایک مصنوعی نہر کی سمت اٹھ گئی اور میں یہ دیکھ کر دنگ رہ گیا کہ جس درندے کی ہمیں تلاش تھی، وہ وہاں موجود تھا۔

گرمی میں شیر نہانے کے بہت شوقین ہوتے ہیں اور شیرنی بھی اپنے آدھے جسم کو پانی میں ڈبوئے کاہلی سے ہماری طرف دیکھ رہی تھی۔ صورتِ حال خاصی نازک تھی اور ایسے میں بہتر یہی تھا کہ اسے نظرانداز کر کے وہاں سے نکل جایا جائے۔ میں کافی اونچے لہجے میں باتیں کرتا ہوا چل رہا تھا لہٰذا آواز بدلے بغیر اسی آواز میں، میں نے اپنے ساتھیوں کو آگاہ کر دیا کہ...... ہوشیار، خبردار...... دائیں طرف پانی میں شیرنی موجود ہے۔ کوئی نہ تو اُدھر دیکھے اور نہ ہی کوئی ایسی ویسی حرکت کرے جس سے کہ اسے اپنے دیکھ لیے جانے کا احساس ہو ورنہ ممکن ہے وہ ہم پر جھپٹ پڑے۔

چنانچہ سبھی نے میری ہدایت پر عمل کیا اور یہ ترکیب کارگر رہی۔ شیرنی نے اپنے آرام میں خلل ڈال کر ہم پر حملہ کرنا یا وہاں سے چلے جانا مناسب نہیں سمجھا مگر بندھی ہوئی بکری کے مسلسل ممیاتے ہوئے چلنے کا اور ہی اثر ہوا۔ اسے شیرنی کے آنکھوں مارے گئے بھینسے کے قریب باندھ کر اور شکاریوں کو اس کے لیے چھوڑے راستے سے واپس بھیج کر ہم اپنی شکارگاہ میں گھسے ہی تھے کہ شیرنی وہاں آ دھمکی اور آتے ہی بکری پر جھپٹ پڑی۔

میں نے دیکھ لیا کہ وہ لنگڑا کر چل رہی تھی۔ شیر کو متوجہ کرنے کے لیے بھیڑ بکری جیسے چھوٹے جانور باندھنے میں ایک نقصان یہ ہوتا ہے کہ ٹھیک سے نشانہ لینے سے پہلے ہی شیر اسے لے کر چلتا بنتا ہے۔ اس لیے میں نے کیپٹن کیبیر کو فوراً گولی چلانے کو کہا۔ بدقسمتی سے ان کا نشانہ چوک گیا۔ شیرنی یکبارگی چونک کر ہوا میں اچھلی اور پلک جھپکتے وہاں سے غائب ہو گئی۔ خیر، ابھی کچھ خاص نہیں بگڑا تھا۔ یہ تو پکی بات تھی کہ گولی شیرنی کو نہیں لگی تھی اور اس کی چال ڈھال سے ظاہر تھا کہ وہ ایسی خاص پھرتیلی بھی نہیں کہ ایسی آباد بستی کو آسانی سے چھوڑ جاتی۔ آدمیوں سے اسے کوئی خاص ڈر یا نفرت نہیں تھی۔ ایسا لگتا تھا کہ وہ انہیں خوراک کا آسان ذریعہ سمجھتی تھی۔ یہ سب دیکھتے ہوئے مجھے لگا کہ ذرا ہوشیاری سے ہانکا کے ذریعے اسے باہر لا کر نشانہ بنانا مشکل نہ ہوگا۔

سب سے اہم بات یہ تھی کہ اب وقت بالکل ضائع نہیں کرنا تھا۔ چنانچہ دوسرے ہی دن صبح بڑے ڈھنگ سے بستی کے قریب سے ہانکا کروایا گیا۔ شیرنی سچ مچ اب بھی وہیں کھیتوں اور باغیچوں کے آس پاس منڈلاتی رہی تھی۔ کچھ ہی دیر کے بعد وہ ہانکا کرنے والوں سے تھوڑا آگے باہر نکلی اور دبے پاؤں چلتی ہوئی کھلی زمین کے اس حصے میں آ گئی جہاں میں اس کا انتظار کر رہا تھا لہٰذا میں نے اسے وہیں ڈھیر کر دیا۔

کھال اتارتے وقت میں نے اس کے جسم کی اچھی طرح جانچ پڑتال کی۔ پہلے کی گولیوں کے کوئی نشان وہاں نہیں تھے مگر اس کے نچلے جبڑے سے میں نے ساہی کا ایک کانٹا نکالا اور ویسا ہی ایک کانٹا اس کے اگلے بائیں پنجے میں سے بھی نکالا۔ پہلے کبھی ساہی کو مارتے وقت یہ دو کانٹے ٹوٹ کر اس کے گوشت میں دھنس گئے تھے اور پک جانے پر ایک سے اس کی چال کی تیزی جاتی رہی تھی اور دوسرے سے اس کے جبڑوں کی گرفت کم ہو گئی تھی، جو بڑے جانوروں کو مارنے میں شیر کا سب سے موثر حربہ ہوتا ہے اور یوں وہ دو کانٹے شیرنی کے جنگلی جانوروں کو چھوڑ کر آدمیوں کے پیچھے لگنے کا باعث بن گئے۔

سراب

راوی : شہبار ملک
تحریر: کاشف زبیر

قسط: 78

وہ پیدائشی مہم جو تھا۔ بلند وبالا پہاڑ، سنگلاخ چٹانیں، برف پوش چوٹیاں اور نگاہ کی حدوں سے آگے کی بلندیاں اسے پیاری تھیں۔ اسے ان میں ایک کشش اور ایک للکارسی ابھرتی محسوس ہوتی کہ آؤ ہمیں دیکھو مسخر کرو اور ہمارے سحر میں مسحور ہو کر اپنا آپ مٹا ڈالو۔ اسے یہ سب حقیقت لگتا مگر کیا واقعی یہ حقیقت تھا یا محض سراب ـــ ایسا سراب جو آنکھوں کے راستے ذہن ودل کو بھٹکاتا ہے، جذبوں کو مہمیز دیتا ہے مگر اسودگی اور اطمینان چھین لیتا ہے۔ سیرابی لمحوں کے فاصلے پر دکھائی دیتی ہے مگر وہ لمحہ حقیقت میں کبھی نہیں آتا۔ اس کی زندگی بھی سرابوں کے ایسے دائروں میں گزری اور گزرتی رہی۔ وقت کے گرداب میں ڈوبتے ہوئے نوجوان کی سنسنی خیز اور ولولہ انگیز داستان حیات۔

بلند حوصلوں اور بے مثال ولولوں سے گندھی ایک تہلکہ خیز کہانی

(گذشتہ اقساط کا خلاصہ)

بابا کا اصرار تھا کہ مجھے کیڈٹ کالج بھیج دیا جائے جبکہ میں آرمی میں جانا نہیں چاہتا تھا۔ میری محبت سویرا میرے بھائی کا مقدر بنا دی گئی تو میں ہمیشہ کے لیے حویلی سے نکل آیا۔ اسی دوران نادر علی سے ٹکراؤ ہو گیا پھر یہ ٹکراؤ ذاتی انا میں بدل گیا۔ ایک طرف مرشد علی، فتح خان اور ڈیوڈ شا جیسے دشمن تھے تو دوسری طرف سفیر، ندیم اور وسیم جیسے جاں نثار دوست۔ پھر ہنگاموں کا ایک طویل سلسلہ شروع ہو گیا جس کی کڑیاں سرحد پار تک چلی گئیں۔ میں دوبارہ وطن لوٹا تو فتح خان سے ٹکراؤ ہو گیا۔ اس کے آدمیوں کو شکست دے کر میں اندرونِ ملک آ گیا۔ آتے وقت میرے ہاتھ حکومت چین کا ایک بریف کیس آ گیا جو شہلا کے ہاتھ لگ گیا۔ شہلا کو راضی کیا کہ وہ مجھے بینک کے لاکر تک پہنچا دے تاکہ میں چائنیز بریف کیس حاصل کر لوں۔ ہم بینک میں سیف سے بریف کیس نکال چکے تھے کہ شہلا نے فتح خان کے آدمیوں کو بلا لیا تھا۔ وہ مجھے یرغمال بنا کر فتح خان کے گھر میں لے آئی۔ فتح خان نے مجھے مجبور کر دیا کہ سویرا کو حاصل کرنے کے لیے مجھے ڈیوڈ شا کے ہیرے تلاش کرنے ہوں گے، میں ہیروں کی تلاش میں نکل پڑا۔ فتح خان، برٹ شا کو لے آیا جو پاگل ہو چکا تھا۔ پھر اس نے میری طرف سے ای میل بھیج کر ایمن کو بھی بلوا لیا۔ برٹ شا نے میرے پستول سے فتح خان کو نشانے پر لیا تھا کہ اس کے آدمی نے برٹ شا کو گولی مار دی۔ مرتے وقت برٹ شا بڑبڑایا "نارتھ...... بکسٹ" دم توڑتے برٹ شا کی آواز صرف میں نے سنی تھی، تھوڑی دیر میں اندازہ ہو گیا کہ فتح خان نے اندازہ لگا لیا ہے کہ اس پوری کارروائی میں میرا ہاتھ ہے، تبھی مائیک سے اعلان ہوا کہ جو بھی ہے، وہ ہاتھ اٹھا کر باہر آ جائے۔ وہ راجا صاحب کے آدمی تھے۔ وہاں سے میں محل میں آیا۔ وہاں ایمن بھی موجود تھی۔ اگلے دن ہم پنڈی جانے کے لیے نکلے۔ راستے میں فتح خان نے گھیر کر بے بس کر دیا اور ایمن کو خودکش جیکٹ پہنا دی جسے اتارنے کی کوشش کی جاتی تو دھماکا ہو جاتا۔ ہم عبداللہ کی کوٹھی میں ٹھہرے تھے اطلاع ملی کہ شہلا کا فون آیا تھا۔ میں شہلا کے گھر کی تلاشی لینے پہنچا تو باہر سے گیس بم پھینک کر مجھے بے ہوش کر دیا گیا۔ ہوش آنے کے بعد میں نے خود کو انڈین آرمی کی تحویل میں پایا مگر میں ان کو ان کی اوقات بتا کر نکل بھاگا۔ جیپ تک پہنچا تھا کہ فتح خان نے گھیر لیا۔ ابھی زیادہ وقت نہیں گزرا تھا کہ کرنل زرو نگی نے ہم دونوں کو پکڑ لیا۔ وہ مجھے پھر سے انڈین آرمی کی تحویل میں دینا چاہتا تھا۔ میں نے کرنل کو زخمی کر کے بساط اپنے حق میں کر لی۔ میں دوستوں کے درمیان آ کر ٹی وی دیکھ رہا تھا کہ ایک خبر نظر آئی کہ ایک کوٹھی میں بم دھماکا۔ کوٹھی نادر علی کی تھی جسے کسی نے تباہ کیا تھا۔ مرشد نے بھائی کو راستے سے ہٹانے کی کوشش کی تھی۔ مجھے شہلا کی تلاش تھی۔ اس لیے نادر کی کوٹھی کی جانب توجہ دی تبھی خبر ملی کہ شہلا کسی صابر نامی شخص سے ملنے جا رہی ہے۔ میں دوستوں کے ساتھ اس کی تلاش میں نکل پڑا۔ مجھ کے ذمے کام یہ لگایا کہ وہ صابر کو پکڑ لیں۔ صابر تو پکڑ میں آ گیا مگر شہلا نکل گئی۔ صابر نے بتایا کہ شہلا کالی کوٹھی میں ملے گی۔ ہم وہاں پہنچے تو شہلا آخری سانسیں لے رہی تھی۔ میں نے فیصلہ کیا کہ سونا وغیرہ کو حویلی بھیج دیا جائے۔ ہیلی کاپٹر ہائر کیا۔ جیسے ہی چوپر بلند ہوا اس پر فائرنگ شروع ہو گئی۔ یہ کام فاضلی کا تھا ہم نے اسے اغوا کر لیا۔ میں عبداللہ سے ملنے جا رہا تھا کہ ڈی ایس پی اکرم چشتی نے مجھے گرفتار کیا اور بے پناہ تشدد کے بعد مرشد کے ہاں پہنچا دیا۔ میں نے مرشد کو یرغمال بنا کر وہاں سے نکلنا چاہا تھا کہ فاضلی نمودار ہوا اور اس نے میرے سر پر وار کر دیا۔ چوٹ کی وجہ سے میرا سر گھوم رہا تھا۔ مجھے جو عقل سے عاری بنانے کا انجکشن لگا تھا وہ بے اثر ثابت ہوا مگر میں نے عقل سے عاری بنے رہنے کی اداکاری شروع کر دی۔ فاضلی نے مجھے اور ایک لیڈی ڈاکٹر کو قید کر لیا تاکہ وہ مجھ پر نظر رکھ سکے۔ میں وہاں سے فرار ہونے لگا تو لیڈی ڈاکٹر ماری گئی۔ میں نے فاضلی کو زخمی کر دیا پھر بھی میرا پیچھا کرتا ہوا آیا تھا کہ کچھ لوگوں نے اس پر فائرنگ کر دی۔ میں کسی طرح سڑک تک پہنچ گیا اور گاڑی لانے کے لیے فون کر دیا۔ پھر ہم نے ساتھیوں کی مدد سے اکرم چشتی کو اغوا کر لیا۔ اسے ہم ایذا دے رہے تھے کہ باہر سے آواز آئی "پولیس"۔ ہم نے خفیہ کیمروں سے پولیس کی پوزیشن دیکھی پھر اکرم چشتی کی آنکھوں اور کان میں کیمیکل ڈال کر چپکا دیا اور وہاں سے نکل گئے۔ پولیس نے نادر اور چشتی کو اس گھر سے برآمد کر لیا راستے میں عبداللہ کے آدمیوں نے پولیس پر حملہ کر کے نادر کو دوبارہ حاصل کر لیا۔ ہم اس گھر سے نکل کر مانسہرہ کی طرف بڑھنے لگے۔ وہاں وسیم کے ایک دوست کے گھر میں ٹھہرے۔ اس دوست کے بیٹے نے ایک خانہ بدوش لڑکی کو پناہ دی تھی وہ لڑکی مہر و تھی۔ وہ ہمیں بریف کیس تک لے گئی مگر وہاں بریف کیس نہ تھا۔ کرنل زرو نگی بریف کیس لے بھاگا تھا۔ ہم اس کا پیچھا کرتے ہوئے چلے تو دیکھا کہ کچھ لوگ ایک گاڑی پر فائرنگ کر رہے ہیں۔ ہم نے حملہ آوروں کو بھگا دیا۔ اس گاڑی سے کرنل زرو نگی ملا۔ وہ زخمی تھا۔ ہم نے بریف کیس لے کر اسے اسپتال پہنچانے کا انتظام کر دیا اور بریف کیس کو ایک گڑھے میں چھپا دیا۔ واپس آیا تو فتح خان نے ہم پر قابو پا لیا۔ پستول کے زور پر وہ مجھے اس گڑھے تک لے گیا مگر میں نے جب گڑھے میں ہاتھ ڈالا تو وہاں بریف کیس نہیں تھا۔ اتنے میں میری امداد کو انٹیلی جنس والے پہنچ گئے۔ انہوں نے فتح خان پر فائرنگ کر دی اور میں نے ان کے ساتھ جا کر بریف کیس حاصل کر لیا۔ وہ بریف کیس لے کر چلے گئے۔ ہم واپس عبداللہ کی کوٹھی پر آ گئے۔ سفیر کو وہی بھیجا تو اسے ائرپورٹ سے پک کر کے آ رہے تھے کہ راستے میں ایک چھوٹا سا ایکسیڈنٹ ہو گیا۔ وہ گاڑی ممتاز حسن نامی سیاست داں کی بیٹی کی تھی۔ میں نے ایک بار اس کی مدد کی تھی وہ زبردستی ہمیں اپنی کوٹھی میں لے آئی۔ وہاں پہنچ کر احساس ہوا کہ ہم قید ہو چکے ہیں۔ ممتاز حسن ہمیں کسی سے ملوانا چاہتا تھا۔ ہیلی کاپٹر پر جو شخص آیا اسے دیکھ کر میں چونک اٹھا۔ وہ میرے بدترین دشمنوں میں سے ایک تھا۔ وہ راج کنور تھا۔ وہ پاکستان میں اس گھر تک کس طرح آیا اس سے میں بہت کچھ سمجھ گیا۔ اس نے مجبور کیا کہ میں ہر روز نصف لیٹر خون اسے دوں۔ بحالتِ مجبوری میں راضی ہو گیا لیکن ایک روز ان کی چالاکی کو پکڑ لیا کہ وہ زیادہ خون نکال رہے تھے۔ میں نے ڈاکٹر پر حملہ کیا تو نرس مجھ سے چمٹ گئی پھر میرے سر پر وار ہوا اور میں بے ہوش ہو گیا۔ ہوش آیا تو میں انڈیا میں تھا۔ بانو بھی اغوا ہو کر پہنچ چکی تھی۔ وہ لوگ ہمیں گاڑی میں بٹھا کر لے جا رہے تھے۔ راستے میں بی ایس ایف والوں نے رکنے کا اشارہ کیا۔ حیات اتر گیا اور کچھ ایسا کہا کہ وہ لوگ واپس چلے گئے۔ مجھے راج کنور کی حویلی میں پہنچایا گیا۔ وہاں اندرونی سازش عروج پر تھی۔ چھوٹے کنور نے سازش کر کے بانو کو اپنے بیڈروم میں بے ہوشی کی حالت میں بلوا لیا اور مجھ سے کہا کہ اگر تم نے اوشا کے ساتھ رات گزار لی تو بانو رہا ہو جائے گی۔ میں نے رامن پر حملہ کر دیا۔ وہ مجھ پر قابو پاتا کہ منشی دل آ گیا اور اس نے رامن کو پستول کے نشانے پر لے کر اپنے ساتھ چلنے کو کہا۔ بانو کو میرے پاس بھیج دیا گیا۔ کئی روز کے بعد مجھے کھانے میں بے ہوشی کی دوا دی گئی جس کا اثر نہیں ہوا۔ نائیک اور رامن اندر آئے۔ میں نے ان پر قابو پا لیا پھر راج کنور پر قابو پایا لیکن جب دروازہ کھولا تو باہر بڑا کنور کھڑا کہہ رہا تھا "شہباز ہتھیار پھینک کر باہر آ جاؤ"

(اب آگے پڑھیں)

میں نے اطمینان سے کہا۔ "اگر میں ایسا نہ کروں تو....؟"

"تب مجبوراً مجھے اپنے آدمیوں سے کہنا پڑے گا۔" بڑے کنور نے سپاٹ لہجے میں کہا۔

"تمہارے آدمی؟" میں نے استہزائیہ انداز میں منشی جی، رامن اور نائیک کو دیکھا۔ "کل تک یہ راج کنور کے جوتے چاٹ رہے تھے اور تمہیں معزول بادشاہ کی طرح قید کر رکھا تھا۔"

"وہ کل کی بات تھی اب صورتِ حال بدل گئی ہے۔"

میں نے افسوس سے سر ہلایا۔ "تم ان لوگوں پر بھروسا کر رہے ہو جو ہمارے سیاست دانوں کی طرح پٹڑی بدلنے کے ماہر ہیں۔ تمہارا کیا خیال ہے اگر راج کنور میرے قبضے سے نکل جائے گا تو یہ دوبارہ تمہیں قید نہیں کرے گا؟"

"یہ بعد کی بات ہے۔" اس نے معمول کے مطابق سپاٹ لہجے میں کہا۔ "بہتر ہو گا تم ہتھیار ڈال کر خود کو راج سمیت میرے حوالے کر دو، میں وعدہ کرتا ہوں چند مہینے بعد تمہیں اس لڑکی سمیت واپس پاکستان بھیج دوں گا۔"

"ہتھیار ڈالنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا ہے۔" میں نے کہا۔ "ہاں ایک کام ہو سکتا ہے تم ہمیں یہاں سے جانے دو۔ ہم ہیلی کاپٹر میں یہاں سے نکل جاتے ہیں اور ہمیں سرحد پار چھوڑ کر راج کنور واپس آ جائے گا اور پھر تم دونوں بھائی آپس میں اپنے معاملات نمٹاتے رہنا۔ جہاں تک میرے خون کا تعلق ہے تو اب اسے بھول جاؤ۔"

"یہ ممکن نہیں ہے۔" اس نے قطعی لہجے میں کہا۔

"تب ممکن ہے۔" میں نے اوشا کو دروازہ بند کرنے کا اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ "اس پر غور کرو، یقین کرو اس مسئلے کا سب سے بہتر حل یہی ہے دوسری صورت میں بہت نقصان اٹھانا پڑے گا۔"

رامن، منشی جی اور نائیک پیچ و تاب کھا رہے تھے ان کا بس نہیں چل رہا تھا کہ وہ مجھے چیر پھاڑ کر رکھ دیں۔ دروازہ بند ہونے سے پہلے میں نے مشورہ دیا۔ "بڑے کنور جی، ایک مخلصانہ مشورہ ہے۔ ان تین افراد سے فوری چھٹکارا حاصل کر لیں۔ یہ آستین کے سانپ ہیں اور آپ پہلے ہی سانپ کے ڈسے ہوئے ہیں۔"

اوشا نے دروازہ بند کر دیا۔ وہ اور بانو ہتھیار بدست پوری طرح تیار تھے۔ خاص طور سے بانو پُرعزم تھی کہ وہ کسی صورت زندہ ان لوگوں کے ہاتھ نہیں آئے گی۔ میں راج کنور کو واپس صوفے تک لایا اور اس پر دھکیل کر کہا۔ "تم نے دیکھا راج کنور بازی کیسے پلٹتی ہے۔ کل تک تمہارے پیچھے دُم ہلانے والے آج بڑے کنور کے ساتھ کھڑے ہیں۔ کیا خیال ہے اگر میں تمہیں بڑے کنور کے حوالے کر دوں؟"

"نہیں۔" وہ کانپ اٹھا تھا اس کی حالت خراب ہو رہی تھی۔ "وہ مجھے معاف نہیں کرے گا۔"

"مطلب کہ وہ بھول گیا ہے تم اس کے بھائی ہو؟"

اس نے سر ہلایا۔ "میں نے اس کا علاج بند کیا اور اسے قید رکھا وہ اس پر مجھے کبھی معاف نہیں کرے گا۔"

"کیا کرے گا، قتل کر دے گا؟"

"اس سے بھی زیادہ۔" راج کنور نے سہمے انداز میں کہا۔ "وہ مجھے اپنے کُتوں کے آگے ڈلوا دے گا۔ تم اس کے نرم لہجے پر مت جاؤ وہ مجھ سے بھی زیادہ سفاک ہے۔"

"اس میں مجھے کوئی شبہ نہیں ہے۔" میں نے اسے تسلی دی۔ "مجھے یقین ہے وہ ایسا ہی کرے گا۔ لیکن کیا اس صورت میں، میں اور تم ایک ہی لیول پر نہیں آ گئے ہیں۔ بلکہ میں اس کے لیے ضروری ہوں اور تمہارا کانٹا وہ جلد از جلد نکال دینا مناسب سمجھے گا۔"

راج کنور نے جواب نہیں دیا لیکن اس کے تاثرات بتا رہے تھے وہ بھی یہی سوچ رہا ہے۔ بانو بھی فکرمند ہو رہی تھی۔ اس نے کہا۔ "اس صورت میں بڑا کنور اس کی پروا کیے بغیر کوئی کارروائی کر سکتا ہے۔"

"وہ نہیں کرے گا رے۔" اوشا بولی۔ "اسے شہباز کا

کرن چاہیے۔"

"یہ ٹھیک کہہ رہی ہے، میں اس کے لیے ضروری ہوں اور اگر مجھے کوئی نقصان ہوا تو اس کے علاج کا امکان ختم ہو جائے گا۔"

"لیکن وہ آپ کو یہاں سے جانے کی اجازت نہیں دے گا۔" بانو نے کہا۔ "اس صورت میں وہ اس کی پروا بھی نہیں کرے گا کہ آپ کو نقصان ہوتا ہے یا نہیں۔"

"تمہاری بات بھی قابلِ غور ہے۔" میں نے کہا۔

"کاش کے ہم رات کو ہی نکل جاتے۔"

"یہ ممکن نہیں ہے۔" راج کنور بولا۔ "میرے پاس صرف دن میں پرواز کا لائسنس ہے اور دوسرے یہ ہیلی کاپٹر رات میں پرواز کے قابل بھی نہیں ہے صرف دن میں ہی اڑ سکتا ہے۔"

میں ظاہر نہیں کر رہا تھا لیکن اندر سے میں تشویش زدہ ہو گیا تھا۔ بڑے کنور نے اچانک راج پاٹ دوبارہ حاصل کر کے میرے ہوتے کام میں رکاوٹ ڈال دی تھی۔ راج کنور پر میں نے اسی لیے قبضہ کیا تھا کہ وہ شاہ تھا مگر دشمن کی قید میں جاتے ہی رعایا نے اسے معزول کر کے معزول شاہ کو قید خانے سے نکال کر دوبارہ تخت پر لا بٹھایا تھا۔ بادشاہ مر گیا.... نیا بادشاہ آ گیا.... بادشاہ زندہ ہے.... تاج و تخت زندہ باد۔ یہ کہانی اس چھوٹی سی ریاست میں بھی دہرائی گئی تھی۔ راج کنور کی حیثیت ختم ہو گئی تھی اس لیے اب یہاں سے بہ حفاظت نکلنے کے لیے اس کا سہارا نہیں لیا جا سکتا تھا۔ اس میں بہت رسک آ جاتا۔ بڑا کنور جس طرح لاؤ لشکر کے ساتھ آیا تھا اس نے واضح پیغام دیا تھا کہ میں راج کنور یا طاقت کے بل پر یہاں سے نہیں نکل سکتا تھا۔ صرف ایک چیز نے بڑے کنور کو فوری ایکشن سے روک دیا تھا کہ میں اس کے علاج کی واحد امید تھا۔ اگر مجھے کوئی نقصان ہوتا تو اسے علاج کے لیے میرا خون نہ ملتا۔

میں سوچنے لگا کہ راج کنور کا ٹرمپ کارڈ اب اتنا کارآمد نہیں رہا تھا لیکن میرے ہاتھ میں یہ ایک چیز تو تھی۔ میں اس سے کس طرح فائدہ اٹھا سکتا تھا اس کا انحصار آنے والے حالات پر تھا۔ راج کنور کا یہ عشرت کدہ کنور پیلس کے عین وسط میں تھا گویا میں اور میرے ساتھی چاروں طرف سے دشمن کی کچھار میں تھے۔ یہاں سے نکلنا آسان نہیں تھا۔ پیلس کے دو ڈھائی سو محافظوں کے ساتھ راج کنور کے پالے بدمعاشوں سے بھی مقابلہ تھا اور ان سب سے لڑ بھڑ کر صرف سپرمین یا کوئی فلمی ہیرو ہی یہاں سے نکل سکتا تھا۔ ایک عام کیا میرے جیسے خاص انسان کے بس کی بات بھی نہیں تھی۔ میری طرح راج کنور بھی حالات پر غور کر رہا تھا اور جیسے جیسے غور کر رہا تھا اس کی حالت بھی خراب ہوتی جا رہی تھی۔ اسے بھی اندازہ ہو گیا تھا اگر بڑے کنور نے اسے قبضے میں کر لیا تو اس کے ساتھ کیا ہو سکتا تھا۔ وہ میرے ساتھ ہی محفوظ تھا۔

عجیب بات تھی کچھ عرصے پہلے میں بڑے کنور کی زندگی کا باعث بن رہا تھا اور یہ راج کنور کو گوارا نہیں تھا اور اب راج کنور میرے پاس تھا اور بڑا کنور اس کے خون کا پیاسا ہو رہا تھا۔ اسے بچانا مجھ پر فرض نہیں تھا لیکن اس پرتعیش قید خانے سے نکلنے کے لیے راج کنور یا بڑے کنور میں سے کسی کا میرے قبضے میں ہونا ضروری تھا۔ کچھ دیر بعد راج کنور نے زبان کھولی۔ "شہباز یہاں میری زندگی کو خطرہ ہے اگر تم مجھے یہاں سے نکال لے جاؤ تو میں وعدہ کرتا ہوں تمہیں سرحد پار پہنچا دوں گا۔"

"غالباً موت کی سرحد کے پار۔" میں نے نیم سنجیدہ انداز میں کہا لیکن میں اس کی بات پر غور کر رہا تھا۔ "تم دونوں بھائی ایک نمبر کے مکار ہو۔"

"نہیں میں سوگند کھاتا ہوں اپنے بچوں کی۔" وہ یقین دلانے لگا۔ "پھر میں تمہارے قبضے میں ہوں گا اگر میں ذرا بھی وعدہ خلافی کروں تو تم مجھے گولی مار دینا۔"

وہ اسی قابل تھا کہ اسے گولی مار دی جائے لیکن فی الحال اس کی زندگی میرے لیے ضروری تھی۔ صبح کے چھ بج رہے تھے اور باہر یقیناً روشنی نمودار ہو گئی ہو گی۔ میں نے مناسب سمجھا کہ ناشتا کر لیا جائے کیونکہ اس کے بعد پھر نہ جانے کب ملے یا نہ ملے۔ کھانے کے لیے وہاں پھل تھے اور فریج میں فلیور ملک موجود تھا۔ ہم نے اس سے ناشتہ کیا۔ راج کنور نے برائے نام کھایا۔ اپنا اقتدار جاتا دیکھ کر اس کی بھوک مر گئی تھی اور اپنی فوتگی کے خوف سے وہ آدھا ہوا جا رہا تھا۔ اس دوران میں اس نے مجھے دو تین بار پیشکش کر دی تھی کہ وہ میری مدد کر سکتا ہے۔ کھانے کے بعد میں نے کہا۔ "راج کنور تم فضول کی پیشکش کر رہے ہو یہاں سے نکلنے کے بعد تو میں خود بھی پاکستان جا سکتا ہوں۔ اصل کام اس پیلس سے نکلنا ہے۔ یہاں سے نکلنے میں تم کیا مدد کر سکتے ہو۔"

راج کنور کے چہرے پر تفکر آمیز تاثرات آ گئے اور وہ سوچ میں پڑ گیا۔ میں اندازہ لگا رہا تھا کہ وہ کیا سوچ رہا ہے یقیناً وہ یہاں سے نکلنے کے کسی راستے سے واقف تھا یا تو وہ اسے استعمال کرنے کے بارے میں سوچ رہا تھا یا پھر اس فکر میں تھا کہ مجھے بتائے یا نہیں۔ اسے مصروف دیکھ کر میں نے مناسب سمجھا کہ اسلحے کا جائزہ لے لوں۔ ایک عدد خودکار رائفل اور اس کے چار اضافی میگزین، جدید ساخت کی چھوٹی شاٹ گن اور اس کے تقریباً سو کارتوس تھے۔ اسی طرح بریٹا اور اعشاریہ اڑتیس کے تین تین اضافی میگزین تھے۔ یوں دیکھا جائے تو اسلحے کے لحاظ سے پوزیشن بری نہیں تھی۔ لیکن اگر ہمیں محدود پیمانے پر اپنا دفاع کرنا پڑتا تو یہ اسلحہ ایک دو درجن مسلح ترین افراد کی فوج سے مقابلہ کرنے کے لیے ناکافی تھا۔ مگر جس وقت میں نے یہ اسلحہ منگوایا تھا اس وقت یہی خیال تھا کہ بس راج کنور کو قابو کرنا ہے اور باقی سب خود قابو رہیں گے۔ پھر ہم تینوں میں صرف میں ہی اسلحہ ڈھنگ سے استعمال کر سکتا تھا۔ بانو اناڑی تھی اور اوشا سے کوئی توقع نہیں کی جا سکتی تھی۔ میں نے راج کنور کی طرف دیکھا۔

"میرا خیال ہے تم نے کافی سوچ لیا ہے اب فیصلہ کر لو کہ ہمیں اس خفیہ راستے سے باہر لے جاؤ گے یا نہیں۔"

وہ حیران ہوا۔ "تم کیسے جانتے ہو؟"

"یہ کوئی مشکل سوال نہیں ہے۔ اس قسم کے محلات میں جہاں دنیا کی آسائشیں ہوں وہاں برا وقت آتے بھی دیر نہیں لگتی ہے اور اسی برے وقت سے بچنے کے لیے یہاں فرار کا خفیہ راستہ رکھا جاتا ہے۔ جب قبائلیوں نے حملہ کیا ہو گا تب بھی تم لوگ اسی راستے سے نکلے ہو گے؟"

اس نے سر ہلایا۔ "لیکن یہ پیلس کے اہم ترین رازوں میں سے ہے اس سے صرف میں اور بڑا کنور واقف ہیں۔"

"کوئی بات نہیں اگر ہم بھی واقف ہو جائیں ویسے بھی اب تمہارا اور بڑے کنور کا راستہ الگ ہے اور اگر قسمت نے یاوری کی اور تم دوبارہ یہاں کے حکمران بن گئے تو خفیہ راستہ بدلوا لینا۔ تمہارے لیے کیا مشکل ہو گا۔"

"خفیہ راستے کے بجائے اپنی فکر کرو۔" بانو نے کہا۔ "اگر بڑے کنور نے ہمارے خلاف طاقت کا استعمال کرنے کا فیصلہ کر لیا تو پھر بھاگ بھی نہیں سکتے۔"

میں نے سر ہلایا۔ "اگر اس نے حملے کے بجائے کوئی اور حربہ استعمال کیا جیسے گیس چھوڑ دی یا وہ سکون سے بیٹھ کر انتظار بھی کر سکتا ہے۔ یہاں ہمارے پاس کھانے کو کیا ہے دو تین دن بعد بھوک خود ہمیں ہتھیار ڈالنے پر مجبور کر دے گی۔"

راج کنور پریشان ہو گیا۔ "دیکھو یہ اتنا آسان نہیں ہے۔"

"خفیہ راستے تک پہنچنا؟"

اس نے سر ہلایا۔ "وہ یہاں سے کچھ دور ہے اول تو ہمیں وہاں تک کوئی جانے نہیں دے گا اور ہم اس تک پہنچ گئے تب بھی ہمارا پیچھا کیا جائے گا اور اگر باہر نکلنے میں کامیاب ہو گئے تب بھی یہ لوگ وہاں پہنچ کر ہمیں روک سکتے ہیں۔"

"تمام مفروضات ٹھیک ہیں لیکن ہمیں یہاں سے نکلنا ہے۔ اب بولو اگر تم راضی نہیں ہو تو......"

"تو تمہارا کیا فائدہ۔" بانو نے اس کے سر سے پستول لگا دیا۔ "کیوں نہ یہاں تمہاری لاش چھوڑ جائیں۔"

راج کنور لرز گیا۔ "میرا یہ مطلب نہیں ہے۔ میں انکار نہیں کر رہا لیکن اس میں بہت زیادہ خطرہ ہے۔"

"تم اس کی پروا مت کرو۔"

"کیسے نہ کروں، مجھے بھی تو تمہارے ساتھ جانا ہو گا میری جان کو بھی خطرہ ہو گا۔" اس نے بلبلا کر کہا۔

"جان کا خطرہ تو یہاں بھی ہے۔" بانو نے کہا۔ "ہم تمہیں زندہ چھوڑ کر نہیں جا سکتے۔ دشمن جتنے کم ہوں اتنا اچھا ہوتا ہے۔"

"تب تم باہر جا کر بھی مجھے مار دو گے۔"

"دشمن تم اس وقت بنو گے جب آزاد ہو گے اور ہمارے ساتھ تم قیدی ہو گے اس لیے دشمن نہیں رہو گے۔ جب آزاد کرنے کا وقت آئے گا تو ہم اپنی حفاظت کا بندوبست کر لیں گے۔"

بانو بڑی ہوشیاری سے اسے قائل کر رہی تھی۔ میں نے بھی زور دیا۔ "راج کنور سوچ میں وقت ضائع مت کرو بعض اوقات وقت کا ضیاع ہی ناکامی کا سبب بن جاتا ہے۔"

اس نے ہتھیار ڈال دیے۔ "ٹھیک ہے میں تیار ہوں آگے جو بھگوان کی مرضی۔"

جیسے ہم کہتے ہیں کہ سب کر کے دیکھ لیا آگے اللہ کی مرضی۔ یعنی پہلے ہم اپنی مرضی کی کوشش کرتے ہیں اور پھر اسے اللہ پر چھوڑتے ہیں اور یہ بھول جاتے ہیں کہ جو ہوتا

ہے وہ ہمیشہ ہی اللہ کی مرضی سے ہوتا ہے۔ وہاں کاغذ کے نام پر چھوٹا نوٹ پیڈ تھا اس لیے ایک صاف سفید کپڑے کا سہارا لیا گیا اور راج کنور نے اس پر پیلس کے اس حصے کا ایک تفصیلی نقشہ بنایا۔ اس نقشے کی مدد سے اس نے سمجھایا کہ ہمیں کہاں جانا تھا۔ یہ جگہ اس عشرت کدے سے کوئی چالیس میٹرز شمال میں تھی۔ اس تک جانے کے لیے ہمیں پہلے ایک ایل شکل کی راہداری سے گزرنا تھا اور جہاں یہ راہداری ختم ہو رہی تھی وہاں سے دائیں طرف مڑنے کے بعد ہم اس جگہ پہنچ سکتے تھے۔ دونوں راہداریاں کھلی تھیں اور ان میں کہیں کوئی آڑ نہیں تھی۔ یہ فاصلہ اصل میں اسّی میٹرز تھا اور اگر ہم پوری رفتار سے کام لیتے تو ایک منٹ سے کم وقت میں وہاں پہنچ سکتے تھے۔

لیکن اس میں سب سے بڑی رکاوٹ نائیک اینڈ رامن اینڈ کمپنی کی صورت میں موجود ہوتی۔ ان کا ہونا اتنا ہی یقینی تھا جتنا اس کمرے کے باہر کنور پیلس کا ہونا۔ وہ بھرپور مزاحمت کرتے۔ دونوں جانب سے گولیوں کا تبادلہ ہوتا۔ ہماری طرف سے اس تبادلے کے لیے صرف تین عدد افراد تھے اور خودکار رائفل صرف ایک تھی جب کہ دوسری طرف تمام ہی افراد خودکار رائفلوں سے مسلح ہوتے۔ یہ ایک یک طرفہ جنگ ہو سکتی تھی۔ جس میں ہمارے بچنے اور بچ کر نکلنے کی گنجائش بہت کم ہوتی۔ راج کنور بھی یہ بات سمجھ رہا تھا اور اسی لیے ہماری مخالفت کر رہا تھا۔ مگر وہ ہمارے آگے بے بس تھا۔ مجھے غور و فکر کرتے پا کر اس نے کہا۔ ”شہباز ایک بار پھر سوچ لو یہ بہت رِسکی ہے۔ وہ ہمیں اس دروازے سے زیادہ دور جانے نہیں دیں گے۔ ہم مارے جائیں گے۔“

میں نے اس کی بات پر غور کیا۔ ”اس صورت میں ان کو دھوکا دے کر کام نکالا جا سکتا ہے۔“

”کیسا دھوکا؟“

”اس بارے میں غور کرنا پڑے گا۔ یہ بتاؤ کہ یہاں ہونے والی گفتگو کہیں اور تو نہیں سنی جا رہی ہے؟“

”نہیں یہاں سب میرے کنٹرول میں ہے اور کوئی دوسرا فرد گفتگو نہیں سن سکتا جب تک میں نہ چاہوں۔“

”اس کی مدد سے؟“ میں نے واکی ٹاکی کی طرف اشارہ کیا۔

وہ مسکرایا۔ ”نہیں وہ سسٹم ایسا ہے کہ تم اسے پکڑ بھی نہیں سکتے۔ وہ میری آواز سے کام کرتا ہے اگر میں ایک خاص لفظ ادا کروں گا تو سسٹم کام کرنے لگے گا اور یہاں کی آوازیں باہر سنائی دیں گی۔“

”جب ہم نے تمہیں قابو کیا تو کیا تم نے ہوش میں آنے کے بعد وہ لفظ ادا کیا تھا؟“

اس نے نفی میں سر ہلایا۔ ”اس کی ضرورت نہیں تھی، نائیک سے ان کو پہلے ہی پتا چل گیا تھا۔“

”ممکن ہے تمہارے علاوہ بھی کسی کو اس سسٹم کا علم ہو۔“

”تب بھی وہ بغیر بولے اسے ایکٹی ویٹ نہیں کر سکتا۔“ راج کنور نے کہا تو میں قائل ہو گیا۔ اگرچہ اس کا رویّہ پہلے بھی تابعدارانہ تھا لیکن جب سے اس نے بڑے کنور کو آزاد دیکھا تھا نہایت شرافت سے پیش آ رہا تھا۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے اس کی سرشت ہی بدل گئی ہے لیکن بین کی حرکت کے ساتھ سانپ کے جھومنے سے اس کی زہرناکی پر کوئی فرق نہیں پڑتا ہے اور نہ اس کے ڈسنے کی جبلت میں تبدیلی آتی ہے۔ میں راج کنور کی طرف سے ہوشیار تھا۔ میں نے اس سے ان راہداریوں کے اطراف میں موجود کمروں اور پیلس کے حصوں کے بارے میں پوچھا۔ راج کنور نے وضاحت کی کہ ان میں سے بیشتر کمرے پیلس والوں کے لیے مخصوص ہیں یعنی وہ چاہیں تو انہیں استعمال کر سکتے ہیں۔ ان میں بیڈ رومز اور نشست گاہیں شامل تھیں۔ ایک کمرا چھوٹا ڈائننگ روم تھا۔ جیسے جیسے راج بتا رہا تھا میں کپڑے کے نقشے پر اضافہ کر رہا تھا۔ کمروں کے مزید دروازے کہاں کہاں کھلتے تھے یہ معلومات بھی اہم تھیں۔ اس سے پتا چلتا کہ کہاں سے دشمنوں کو مزید کمک مل سکتی تھی۔ میرے ذہن میں ایک ممکنہ پلان واضح ہوتا جا رہا تھا۔ لیکن اس پر مزید کام کرنے کی ضرورت تھی۔ جب میں نے راج کنور سے تمام ممکنہ معلومات حاصل کر لیں تو اوشا کو پاس بلایا۔

”تم پیلس کے تمام حصوں سے واقف ہو؟“

”ہاں رے۔“

میں نے اسے نقشہ دکھایا اور پھر سمجھایا کہ ہم کہاں تھے؟ جب وہ سمجھ گئی تو میں نے راج کنور کی دی ہوئی معلومات کا موازنہ اس کی معلومات سے شروع کیا۔ کچھ دیر میں مجھے اندازہ ہو گیا کہ راج کنور نے کہیں غلط بیانی نہیں کی تھی۔ اوشا نے میری طرف دیکھا۔ ”تو یہ کیوں پوچھ رہے ہے؟“

”ہمیں یہاں جانا ہے؟“ میں نے اوشا کو خفیہ راستے کے کمرے کے خانے پر انگلی رکھ کر کہا۔

”پر کیوں، یہاں تو کچھ نہیں ہے رے۔“

”یہاں پیلس سے باہر جانے کا راستہ ہے۔“

اوشا فکر مند ہو گئی۔ ”پر وہ جانے کہاں دیں گے؟“

”ہمیں راستہ بنانا ہوگا اور اس کے لیے خطرہ مول لینا ہوگا۔“ میں نے کہا۔ ”ویسے ہمارے پاس ایک ڈھال تو ہے۔“

راج کنور کا چہرہ سفید پڑ گیا تھا اس نے جلدی سے نفی میں سر ہلایا۔ ”یہ تمہاری غلط فہمی ہے وہ سب سے پہلے مجھے ماریں گے۔ اس کے بعد تم بھی نہیں بچو گے۔“

”میں مذاق کر رہا ہوں، مجھے بھی معلوم ہے بڑا کنور اور اس کے آدمی تمہارے دشمن ہیں اور دوسرے خفیہ راستہ تم ہی کھولو گے اس لیے ہم تمہاری حفاظت کریں گے۔“

”جب تک تم ہمیں دھوکا نہیں دیتے زندہ رہو گے۔“ بانو بولی۔

راج کنور نے رشک سے مجھے دیکھا۔ ”شہباز تم نے ایک سادہ سے ناری کو کیا بنا دیا ہے۔ میں نے آج تک کسی کو اتنی تیزی سے بدلتے نہیں دیکھا ہے۔“

”اس میں میرا نہیں بانو کا کمال ہے۔“ میں نے سنجیدگی سے کہا۔ ”میں نے خود بھی آج تک کسی کو اتنی جلدی خود کو بدلتے نہیں دیکھا۔ کبھی میں بھی ایک عام آدمی تھا اور جب حالات نے مجھے اس ڈگر پر ڈالا تو مجھے خود کو بدلنے میں اس سے کہیں زیادہ وقت لگا تھا۔“

بانو جھینپ گئی۔ ”آپ لوگ میری تعریف ہی کرتے رہیں گے یا یہاں سے نکلنے کا کوئی طریقہ سوچیں گے۔“

”طریقہ تو ہے۔“ میں نے کہا اور بانو کو ایک کونے میں لایا۔ ”ہمیں حکمتِ عملی سے کام لینا ہوگا۔ مار دھاڑ کر کے اس جگہ تک پہنچنا تقریباً ناممکن ہوگا۔“

”کیسی حکمتِ عملی؟“

”پلان یہ ہے کہ میں بڑے کنور سے بات کرتا ہوں، میں اس سے کہوں گا کہ میں اس سے بات کرنا چاہتا ہوں۔ ہم یہاں سے نکلیں گے اور جب خفیہ راستے والے کمرے کے پاس پہنچیں گے تو اپنا راستہ بدل لیں گے۔ اس وقت ہمیں روکنا ذرا مشکل ہو جائے گا۔“

بانو نے نقطہ اٹھایا۔ ”اس میں ایک رسک ہے کہ باہر نکلتے ہی ہم پر حملہ نہ ہو جائے۔“

”اس کا امکان ہے لیکن مجھے امید ہے کہ جب میں بڑے کنور کو مذاکرات کی بنیاد پر ہتھیار ڈالنے کا چارا دوں گا تو وہ اس پر ضرور منہ مارے گا۔ اس کی بھی سب سے بڑی خواہش یہی ہے کہ میں صحیح سالم اس کے ہاتھ آ جاؤں۔“

”ٹھیک ہے جیسے آپ مناسب سمجھیں۔ مجھے کیا کرنا ہوگا؟“

”تمہارا کردار اہم ہے۔ جیسے ہی ہنگامہ شروع ہوگا تم اور اوشا راج کنور کو لے کر اس کمرے تک جاؤ گی اور خفیہ راستہ کھلواؤ گی۔ اس دوران میں، میں بڑے کنور کے لوگوں کو روکوں گا۔“

بانو فکر مند ہو گئی۔ ”لیکن اگر آپ کہیں پھنس گئے یا راج کنور نے کوئی چالاکی دکھائی....؟“

میں اس کے خدشات سمجھ رہا تھا در حقیقت مجھے خود بھی پوری طرح یقین نہیں تھا کہ میں کامیابی سے اس پلان پر عمل کر سکوں گا۔ مشکلات بہت زیادہ تھیں اور کامیابی کا امکان کم تھا۔ ایک دوسرا پلان بھی تھا اس میں بانو اور اوشا یہاں سے نکل جاتیں اور میں خود کو بڑے کنور کے حوالے کر دیتا۔ اس کی کامیابی کا امکان تھا لیکن میں پھر بڑے کنور کے چنگل میں پھنس جاتا اور نہ جانے پھر گلو خلاصی ہوتی بھی یا نہیں۔ میں نے بانو کے سامنے یہ پلان بھی رکھا تو اس نے اسے فوری مسترد کر دیا۔ ”یہ ممکن نہیں ہے ہم سب ساتھ یہاں سے نکلیں گے ورنہ نہیں....“

”یہ بھی ایک آپشن ہے اگر ہم ناکام رہے اور پکڑے گئے تو پھر اسے بھی استعمال کر سکتے ہیں۔“

”پہلے میں شاید یہ بات مان بھی جاتی لیکن اب میں آپ کو چھوڑ کر نہیں جاؤں گی۔“ اس نے ضدی لہجے میں کہا۔

میں نے بحث نہیں کی اور موضوع بدل دیا۔ ”ٹھیک ہے میں بڑے کنور سے بات کر رہا ہوں لیکن اس سے پہلے ہمیں پوری طرح پلان سمجھ لینا چاہیے۔“

راج کنور غور سے ہماری طرف ہی دیکھ رہا تھا اور شاید باتیں سننے کی کوشش بھی کر رہا تھا لیکن میں اور بانو بہت دھیمی آواز میں بات کر رہے تھے۔ میرا خیال تھا کہ اب جو پلان تھا اس سے راج کنور کو بے خبر رکھنا ضروری تھا کیونکہ وہ درمیان میں گڑبڑ کر سکتا تھا۔ ویسے بھی عمل ہم تین افراد نے کرنا تھا اس لیے اس کا بے خبر رہنا ضروری تھا۔ میں نے اسے واش روم کے دروازے کے پاس جانے اور منہ دیوار کی طرف کر کے کھڑے ہونے کا حکم دیا تو اس کا منہ کھلا رہ

گیا۔ "یہ کیوں؟"
میں غرایا۔ "سوال مت کرو جو کہا جا رہا ہے وہ کرو۔"
"اور اچھے بچوں کی طرح دیوار کی طرف منہ کر کے کھڑے ہو جاؤ۔" بانو ہنسی۔ "سمجھ لو آج تمہیں ہوم ورک نہ کرنے پر سزا دی جا رہی ہے۔"
راج کنور خون کے گھونٹ پی کر دیوار کی طرف منہ کر کے کھڑا ہو گیا۔ وہ ہم سے کوئی چھ سات گز کی دوری پر تھا۔ میں نے اوشا، بانو اور اپنے درمیان نقشہ بچھایا اور سرگوشی میں ان کو سمجھانے لگا کہ انہیں کیا کرنا ہے۔ اوشا بھی یہ سن کر پریشان ہو گئی تھی کہ میں پیچھے رہ کر آنے والوں سے نمٹوں گا اور وہ راج کنور کے ہمراہ خفیہ راستہ کھولنے جائیں گی۔ اوشا نے کہا۔ "شہباز تو ساتھ رہ۔"
"میں بھی یہی کہہ رہی ہوں۔" بانو نے اس کی تائید کی۔
"تم دونوں عقل سے سوچو اگر ہم تینوں ہی اس کمرے میں پہنچ گئے تو دشمن باہر تک آجائے گا اور ممکن ہے وہ ہمیں فرار ہونے ہی نہ دے اس لیے راستہ کھلنے تک ان لوگوں کو دور رکھنا ضروری ہے۔"
ان کے تاثرات بتا رہے تھے کہ وہ میری رائے سے متفق نہیں تھیں۔ بانو اب کمزور نہیں تھی اور اوشا تو بذات خود ہلاکت خیز ہتھیار تھی اس کے باوجود وہ میرے بغیر خود کو کمزور اور اکیلا محسوس کر رہی تھیں اور خوفزدہ تھیں۔ میں نے اعشاریہ اڑتیس اوشا کے سپرد کیا۔ یہ استعمال میں آسان تھا اور اس کا جھٹکا بھی ہلکا ہوتا ہے۔ وہ اسے آسانی سے استعمال کر سکتی تھی۔ بریٹا سے بانو نے فائرنگ کی مشق بھی کر لی تھی اور وہ اس کا تیز جھٹکا برداشت کر سکتی تھی۔ پھر خالی ہاتھوں سے بھی راج کنور کو قابو کر سکتی تھی۔ میں نے ان سے کہا۔ "باہر نکلتے ہی تم دونوں راج کنور کے ساتھ رہو گی بلکہ ہو سکے تو اس سے چمٹ جانا۔"
"میں ایسا نہیں کر سکتی۔" بانو نے فوراً انکار کر دیا۔ "اس سے بہتر ہے میں گندے جانور کے ساتھ چمٹ جاؤں۔"
اوشا ہنسی۔ "میں چمٹ جاؤں گی۔ اس کا آکھری سے اچھا چیتے گا۔"
"خدا کے لیے آہستہ بولو۔" میں نے راج کنور کی طرف دیکھا۔ "ابھی سے مرنے مارنے کی باتیں کرو گی تو وہ بدک جائے گا۔"
"آپ فکر نہ کریں ہم یہ کام کر لیں گے۔" بانو نے اس بار حوصلے سے کہا۔
"ایک اہم بات ذہن نشین کر لو۔ راج کنور ہماری ڈھال ہے اس لیے اس کی آڑ میں رہنا لیکن اگر تم لوگ کسی مرحلے پر محسوس کرو کہ پکڑی جاؤ گی تو اسے شوٹ کر دینا۔ اسے زندہ نہیں چھوڑنا ہے۔"
وہ دونوں فکر مند نظر آنے لگیں۔ بانو نے پوچھا۔ "پھر کیا ہوگا؟"
"یہ تو اللہ ہی جانتا ہے۔" میں نے ٹھنڈی سانس لی۔ "بس ایک بات طے ہے ہم زندہ نہ رہیں یا پکڑے جائیں تو اس صورت میں راج کنور کو زندہ نہیں بچنا چاہیے۔ اس جگہ وہی ہمارا سب سے بڑا دشمن ہے۔ وہ آزاد ہو گیا اور اس نے دوبارہ اختیار حاصل کر لیا تو ہمارے ساتھ بد سے بدتر کرنے کی کوشش کرے گا۔"
بانو نے جھرجھری لی۔ "آپ کی بات سن کر میرا دل چاہ رہا ہے کہ اسے ابھی شوٹ کر دوں۔"
"بی بی اتنا جذباتی ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔ اپنا دماغ ٹھنڈا رکھو گی تو ہم یہاں سے سلامتی کے ساتھ نکل سکتے ہیں۔"
اس نے سعادت مندی سے کہا۔ "میں کوشش کروں گی جیسا آپ نے کہا ہے ویسا ہی کروں۔"
"میں بھی۔" اوشا نے جذباتی انداز میں میرا بازو تھام لیا۔ "شہباز اگر میں جیتی رہی تو تیرے نام سے جیوں گی اور مر گئی تو تیرے نام سے مروں گی۔"
"ابھی مرنے کی نہیں جینے کی بات کرو۔" میں نے جھینپ کر کہا۔ اس کا انداز اتنا جذباتی تھا کہ بانو بھی کھسیا گئی۔ لیکن اوشا کو ایسی باتوں کی پروا کبھی نہیں رہی تھی۔ جذبات کے اظہار میں وہ اتنی کھلی ڈلی تھی کہ اپنے باپ کی پروا بھی نہیں کرتی تھی۔ اوشا دکھی ہو گئی۔
"میں سچ کہہ رہی ہوں رے۔"
"میں جانتا ہوں۔" میں نے نرمی سے کہا۔ "لیکن میں تم سب سمیت جینا چاہتا ہوں۔ ہم خودکشی کرنے نہیں جا رہے ہیں۔ اگر موقع آئے کہ ہتھیار ڈالنے کے سوا کوئی چارہ نہ ہو تو ہتھیار ڈال دینا جیسے ابھی ہمیں موقع ملا ہے اس طرح بعد میں بھی ملے گا اصل بات زندہ رہنا ہے۔ بس یہ خیال رہے کہ راج کنور نہ بچے۔"
انہوں نے سر ہلایا تو میں نے ایک بار پھر انہیں ذہن

نشین کرایا کہ کس موقع پر کیا کرنا ہے۔ پلان سادہ تھا۔ میں بڑے کنور سے بات کرتا اور اس کے پاس جانے کی اجازت طلب کرتا۔ وجہ یہ ہوتی کہ میں اس سے مذاکرات کرنا چاہتا ہوں اور اس کے سامنے کچھ شرائط رکھنا چاہتا ہوں۔ وہ مان جاتا تو ہم یہاں سے نکلتے۔ میں بڑے کنور سے کہہ دیتا کہ راستے میں اس کے آدمی نہ آئیں اس لیے امکان تھا کہ اس کا لشکر دور ہٹ جائے گا۔ ایل شکل کی راہداری سے نکلنے کے بعد بڑے کنور کے حصے کی طرف جانے کے لیے ہمیں بائیں طرف مڑنا ہوتا لیکن ہم دائیں طرف مڑ جاتے اور یہاں سے اصل مرحلہ شروع ہوتا۔ امکان تھا کہ بڑے کنور کے آدمی بائیں طرف ہی ہوں گے اور دائیں طرف کسی کا دھیان نہیں جائے گا یا اس طرف ہوئے بھی تو زیادہ نہیں ہوں گے اور ان سے نمٹا جا سکتا تھا۔ میں نے باری باری اوشا اور بانو سے پوچھا کہ انہیں کیا کرنا ہے اور ان کے جوابات سے مطمئن ہو کر میں نے انٹرکام اٹھایا۔ دوسری طرف منشی جی تھے۔
"منشی جی، میں بڑے کنور سے بات کرنا چاہتا ہوں۔"
"آپ مجھے حکم کریں؟" اس نے چاپلوسی سے کہا۔ "ہم بھی آپ کے خدمت گار ہیں۔"
"منشی جی میں یہاں سے جانا چاہتا ہوں آپ اس کا بندوبست کر دیں۔" میں نے کہا تو اسے سانپ سونگھ گیا۔ پھر اس نے کہا۔
"یہ ممکن نہیں ہے شہباز جی۔"
"میں جانتا ہوں اسی لیے بڑے کنور سے بات کرنا چاہتا ہوں۔"
"میں بات کراتا ہوں۔"
کچھ دیر بعد بڑا کنور لائن پر آگیا۔ "شہباز تم نے کیا فیصلہ کیا ہے؟"
"میں نے محسوس کیا ہے کہ میرا اور میرے ساتھیوں کا یہاں سے زندہ نکلنا ممکن نہیں ہے اس لیے میں خود کو آپ کے حوالے کرنا چاہتا ہوں لیکن اس سے پہلے میں آپ سے کچھ شرائط پر بات کروں گا۔ کیا مجھے آپ کے پاس آنے کی اجازت ہے۔"
ایک خدشہ یہ بھی تھا کہ کہیں بڑا کنور خود یہاں آنے کی ضد کرے اس صورت میں پلان فیل ہو جاتا۔ بڑا کنور کچھ دیر خاموش رہا اور پھر اس نے کہا۔ "ٹھیک ہے تم

گردہ (Kidney)

آنتوں کے پیچھے ریڑھ کی ہڈی کے قریب ایک عضو جس کا جوڑا ہوتا ہے۔ انسان کے گردے کی لمبائی 4 انچ اور چوڑائی 1-1/2 انچ ہوتی ہے اور اس کا رنگ سیاہی مائل سرخ ہوتا ہے گردوں کا خاص کام یہ ہے کہ خون میں سے غیر ضروری مادوں (مثلاً نائٹروجن کے مرکبات اور معدنی نمکین چیزوں) کو علیحدہ کریں اور انہیں مثانے میں پہنچا دیں، مثانہ ان مادوں سے پُر ہو کر پھیل جاتا ہے اور پھر پیشاب میں یہ غیر ضروری مادے خارج ہوتے ہیں روزانہ تقریباً 2-3/4 پائنٹ پیشاب انسانی جسم سے خارج ہوتا ہے۔ لیکن گرمیوں میں پسینا آنے کی وجہ سے اس کی مقدار کم اور سردیوں میں زیادہ ہو جاتی ہے۔

گردوں کی صفائی (Dialysis)

ہائی بلڈ پریشر کی وجہ سے مریض جب بے ہوش ہو جاتا ہے تو اسے کم کرنے کے لیے مریض کے گردے صاف کر دیے جاتے ہیں۔ یہ بڑا نازک اور مشکل عمل ہے۔ اس عمل کے ذریعے گردوں کو خالص محلول سے صاف کر کے فاسد اور زہریلا مادہ خارج کر دیا جاتا ہے، جو گردوں کے ناکارہ ہونے کی وجہ سے پیٹ میں جمع ہو جاتا ہے۔ گردوں کی صفائی کے دو طریقے ہیں، ایک خون کی نالیوں کے ذریعے جسے ہیموڈیالیسس کہا جاتا ہے اور دوسرا پیٹ میں سوراخ کر کے کیا جاتا ہے اس عمل کو پیرا ٹونیئل کہتے ہیں۔ ڈیالیسس کے دوران ایک طرف سے تو مریض کے اندر 200 ملی لیٹر پانی جاتا ہے تو دوسری طرف گندا مواد جس میں پیپ وغیرہ بھی شامل ہوتی ہے خارج ہوتا ہے۔ پاکستان میں گردوں کے مخصوص ماہرین نفرالوجسٹس کی شدید کمی ہے اس ضمن میں 1995ء میں نفرالوجسٹس کی پہلی کانفرنس منعقد ہوئی اور پاکستان سوسائٹی آف نفرالوجی کا قیام عمل میں لایا گیا۔ اس وقت ڈاکٹر ادیب رضوی اس ضمن میں بڑی خدمات انجام دے رہے ہیں۔

مرسلہ نہال اختر ہاشمی، لاہور

آجاؤ۔"

"میں راج کنور اور اپنے ساتھیوں سمیت آؤں گا۔" میں نے سکون کا سانس لیتے ہوئے شرط رکھی۔ "کوئی ہم سے ہتھیار نہ مانگے اور نہ راستے میں آئے۔"

"سب کیوں، بس تم آجاؤ۔"

"گستاخی معاف بڑے کنور صاحب، میں چالاک نہیں ہوں لیکن بے وقوف بھی نہیں ہوں۔ میں آپ سے ملنے آؤں اور پیچھے آپ کے کمانڈوز میرے ساتھیوں پر قابو پالیں۔ یہ دو عورتیں بے چاری کیا کرلیں گی۔ اس لیے سب ساتھ آئیں گے، راج کنور بھی ہمارے ساتھ ہوگا اور اگر کوئی گڑبڑ ہوئی تو اس کا پہلا نشانہ یہی بنے گا۔"

"کوئی گڑبڑ نہیں ہوگی۔ لیکن میرے محافظ تمہیں ہتھیار بدست میرے پاس نہیں آنے دیں گے۔"

"میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ مجھ سے آپ کو کوئی نقصان نہیں ہوگا اور آپ سوچیں کہ اس جگہ سوائے آپ کے سب میرے خون کے پیاسے ہیں اگر میں نے آپ کو کوئی نقصان پہنچایا تو مجھے ان لوگوں سے کون بچائے گا۔ میں نے بہت غور کرنے کے بعد آپ پر اعتماد کرنے کا فیصلہ کیا ہے کیونکہ آپ سے میری جان کو کوئی فوری خطرہ نہیں ہے۔ اگر آپ نے میری شرائط مان لیں تو سب پہلے کی طرح ہو جائے گا۔"

بڑا کنور خاموش ہوگیا غالباً وہ اس معاملے پر غور کر رہا تھا۔ وہ اپنے بھائی راج کنور کے مقابلے میں کہیں زیادہ ذہین تھا۔ اس نے اپنا وقت تعلیم حاصل کرنے اور مطالعے میں گزارہ تھا جب کہ راج کنور نے جوان ہوتے ہی عیاشی شروع کردی تھی۔ مجھے خدشہ ہونے لگا کہ کہیں وہ اصل بات نہ بھانپ جائے۔ اتنا وہ بھی سمجھتا تھا کہ راج کنور جان بچانے کے لیے خفیہ راستے کو استعمال کرسکتا ہے۔ لیکن یہ دور کا خیال تھا۔ وہ سوچ سکتا تھا کہ ہم راج کنور کے کہیں زیادہ دشمن تھے اور وہ ہمیں اس خفیہ راستے کے بارے میں بتانے کی حماقت نہیں کرے گا کیونکہ ہم اسے ساتھ لے جائیں گے اور خطرے سے نکلتے ہی اس کا کام تمام کردیں گے۔ میں دھڑکتے دل کے ساتھ اس کے جواب کا منتظر تھا۔ بالآخر اس نے کہا۔ "ٹھیک ہے تم لوگ آسکتے ہو۔"

پہلا مرحلہ طے ہوگیا تھا۔ "میں ایک بار پھر خبردار کر رہا ہوں اگر کوئی گڑبڑ ہوئی تو آپ کو صرف چند لاشیں ملیں گی۔ اپنے آدمیوں سے کہیں کہ وہ بے شک آپ کے کمرے کے باہر مورچے بنالیں لیکن کوئی راستے میں نہ آئے۔"

"کوئی راستے میں نہیں آئے گا۔" بڑے کنور نے مخصوص دھیمے لہجے میں کہا۔ "میں تم سے ایک بار پھر کہہ رہا ہوں خود کو میرے حوالے کردو۔ ایسا نہ ہو کہ تم یہاں سے نکل جاؤ اور پھر خود پلٹ کر میرے پاس آؤ۔"

"ایسا کبھی نہیں ہوگا بڑے کنور۔" میں نے کہا اور انٹرکام رکھ دیا۔ میں نے غور نہیں کیا کہ بڑے کنور نے یہ بات کیوں کہی تھی۔ راج کنور بدستور دیوار کی طرف منہ کیے غالباً نوشتہ دیوار پڑھ رہا تھا۔ میں نے اسلحہ تقسیم کردیا۔ بانو اور اوشا کا لباس ایسا نہیں تھا کہ وہ اضافی میگزین آرام سے رکھ سکتیں۔ بانو نے موٹے سوتی کرتے کے ساتھ جرسی کا ٹراؤزر پہنا ہوا تھا۔ اس کی جیبوں میں میگزین آگئے لیکن وہ بوجھ سے لٹکنے لگی تھیں۔ اوشا کے مختصر لباس میں جیب نام کی کوئی چیز نہیں تھی۔ لیکن اس نے پستول کے میگزین اپنی دھوتی نما چست ساڑی میں سامنے کی طرف اڑس لیے تھے۔ یہ خاصا مشکل کام تھا کیونکہ ساڑی پہلے ہی خاصی نیچے بندھی تھی اگر اوشا مخصوص جسمانی ساخت کی حامل نہ ہوتی تو میگزین کیا ساڑی کا بھی اپنی جگہ رہنا محال ہوتا۔ میں نے اس سے کہا۔ "تمہیں مشکل ہوگی ایسا کرو یہ بانو کو دے دو۔ اگر ضرورت پڑی تو بانو سے لے لینا۔"

اس نے میگزین نکال کر بانو کے حوالے کردیے۔ وہ نرم ٹراؤزر کے لٹکنے سے پہلے ہی پریشان تھی۔ اس نے واش روم کا رخ کیا تاکہ اس کی ڈوری مضبوطی سے باندھ کر آئے۔ سونا اور کرنسی بدستور قالین پر ڈھیر تھے۔ میرے اور بانو کے نزدیک ان کی کوئی اہمیت نہیں تھی۔ البتہ اوشا شروع میں دلچسپی سے اسے دیکھتی رہی لیکن اب وہ بھی اس دولت سے بے نیاز لگ رہی تھی۔ میں نے راج کنور کو یرغمال بناتے ہوئے کچھ اور سوچا تھا۔ میرا ارادہ تھا کہ جب یہاں سے نکلنے لگیں گے تو کنور پیلس کے ملازموں اور گارڈز کو بلا کر یہ سونا اور کرنسی ان میں تقسیم کردوں گا۔ میرا سلطانہ ڈاکو بننے کا کوئی ارادہ نہیں تھا۔ ان غریب لوگوں کے ہاتھ جب اتنی بڑی دولت آتی اور میں اس دولت سمیت انہیں فرار کا مشورہ دیتا تو یقیناً بہت سے اس پر عمل کرتے اور کنوروں کی غلامی پر لعنت بھیج کر یہاں سے نکل بھاگتے۔ کنور خاندان ان ہی لوگوں کے بل بوتے پر اپنی بادشاہت قائم رکھے ہوئے تھا۔ اس لیے وہ پھر کس سے ہمارا راستہ رکواتا۔ چند ایک وفادار کم ہمت ساتھ رہ جاتے تو ان سے نمٹا جاسکتا تھا۔

مگر راج کنور کی اہمیت ختم ہونے کے بعد یہ پلان بھی اپنی موت آپ مرگیا تھا۔ اس لیے میں نے چن کر کرنسی کے ڈھیر سے یورو اور انڈین کرنسی کی کچھ گڈیاں نکالیں۔ انڈین کرنسی پانچ سو اور ہزار کے نوٹوں پر مشتمل تھی۔ جب کہ یورو ہزار کے نوٹ والے تھے۔ میں نے تین گڈیاں اوشا کے سپرد کیں۔ اس نے پوچھا۔ "ان کا کیا کرنا ہے رے؟"

"رکھو، راستے میں کام آئیں گی۔ ان سے ہی بہت سے راستے کھلیں گے۔"

میں نے خود یورو کی تین اور انڈین کرنسی کی دو گڈیاں رکھی تھیں اور اتنی ہی بانو کے سپرد کیں۔ اس نے بے ساختہ کہا۔ "میرا ٹراؤزر پھٹ جائے گا۔ پہلے ہی اتنا بوجھ ہے۔"

"ان کا وزن زیادہ نہیں ہے۔" میں نے تسلی دی تو اس نے بادلِ ناخواستہ انہیں بھی ٹراؤزر میں رکھ لیا۔ میں نے محسوس کیا کہ وہ واقعی مشکل میں تھی۔ اس کا ٹراؤزر نرم جرسی کے کپڑے کا تھا اور یہ بوجھ سے لٹک رہا تھا۔ چھ عدد میگزینز اور پھر رقم کا بھی بوجھ تھا اگر کہیں ہاتھا پائی کی نوبت آتی تو بانو آزادی سے نہیں لڑسکتی تھی۔ میں نے کہا۔ "ایک منٹ! ایک کام ہوسکتا ہے۔"

"وہ کیا؟" اس نے سوالیہ نظروں سے دیکھا۔

گیس والے بیگ پر شانے سے لٹکانے والا الگ سے اسٹرپ لگا ہوا تھا۔ میں اسے اٹھا کر واش روم کی طرف بڑھا تو بانو نے اضطراب سے کہا۔ "یہ آپ کیا کر رہے ہیں؟"

"ابھی بتاتا ہوں۔" میں نے کہا اور واش روم میں آکر دروازہ بند کرلیا پھر چند گہرے سانس لے کر میں نے سانس روک لی اور احتیاط سے شولڈر اسٹرپ بیگ سے الگ کرنے لگا۔ اس کام میں ایک منٹ لگا تھا۔ میں سانس روکے باہر آیا اور واش روم کا دروازہ بند کرکے سانس لی تھی۔ بیگ بھی ساتھ لے آیا تھا۔ میں نے اسٹرپ بانو کے حوالے کی۔ "اسے شرٹ کے نیچے باندھ لو۔ تمام میگزینز اس میں آسانی سے آجائیں گے اور تمہارا مسئلہ حل ہوجائے گا۔"

"یہ ٹھیک ہے۔" وہ خوش ہوکر بولی پھر فوراً فکرمندی سے کہا۔ "لیکن میں واش روم نہیں جاؤں گی مجھے ڈر لگ رہا ہے۔"

میں خود بھی اس کے یا کسی کے واش روم جانے کے حق میں نہیں تھا۔ "ایسا کرتے ہیں میں اور راج کنور دوسری طرف منہ کرتے ہیں تم اوشا کی مدد سے یہ کام کرلو۔"

راج کنور ابھی تک دیوار کے پاس کھڑا تھا میں بھی اس کے پاس جا کر کھڑا ہوگیا۔ اس نے شکوہ کناں لہجے میں کہا۔ "میں نے آج تک ایسی ذلت برداشت نہیں کی۔"

"درست کیونکہ تم دوسروں کو ذلیل کرنے کے عادی ہو۔" میں نے اس کی تائید کی۔ "آج کے دن تم نے بہت کچھ دیکھا ہوگا اور ابھی مزید دیکھو گے۔"

"تم بہت خطرناک کام کرنے جارہے ہو۔" اس نے خشک ہونٹوں پر زبان پھیرتے ہوئے کہا۔ "اگر بڑے کنور نے تمہیں کوئی گارنٹی دی ہے تو اس کے پیچھے کوئی دھوکا ہی ہوگا۔"

"میں نے کبھی کسی کی گارنٹی پر اعتماد نہیں کیا ہے اور نہ ہی اب کروں گا۔ مجھے صرف اللہ اور اپنے زورِ بازو پر اعتماد ہے۔ باقی جو قسمت میں لکھا ہے وہ تو ہوکر رہے گا۔"

"تمہارا کیا پلان ہے؟"

"جلد تمہارے سامنے آجائے گا۔ لیکن راج کنور ایک بات یاد رکھنا یہ ہمارے لیے زندگی اور موت کا مرحلہ ہوگا۔ اس میں یا تو سب پار ہوں گے یا سب ڈوب جائیں گے۔ اس لیے دل میں شرارت کا کوئی خیال ہے تو نکال دو۔ ورنہ سب سے پہلے تم فوت ہوگے۔"

"میں وعدہ کرتا ہوں میں کچھ نہیں کروں گا۔" اس نے گھبرا کر کہا۔

"مجھے تمہارے وعدے کی ضرورت نہیں ہے، میں صرف تمہیں خبردار کر رہا ہوں۔"

بانو اور اوشا نے مل جل کر یہ مشکل کام نمٹایا۔ جب میں نے پلٹ کر دیکھا تو مجھے ہنسی آگئی تھی۔ بانو اب درمیان سے ذرا پھولی سی ہورہی تھی۔ وہ کھسیا گئی۔ "ہنس کیوں رہے ہیں، کیا میں بری لگ رہی ہوں۔"

"نہیں بی بی، میں نے آج تک کسی خاتون کو برا لگتے نہیں دیکھا۔"

اتنی لیے دیئے رہنے والی بانو کو اس سنگین صورت حال میں بھی اس بات کی فکر تھی کہ وہ بری تو نہیں لگ رہی تھی۔ بھاری میگزینز سے نجات ملی تو اس نے اوشا کی رقم بھی اپنے ٹراؤزر کی جیبوں میں رکھ لی تھی۔ پھر اس نے مجھ سے کہا۔ "میں اسے سزا دینا چاہتی ہوں۔" اس کا اشارہ راج کنور کی طرف تھا۔ راج کا چہرہ حسبِ معمول خوف سے سفید پڑ گیا۔ وہ میرے اندازے سے زیادہ بزدل

ثابت ہو رہا تھا۔

''کیوں؟'' اس نے بلبلا کر کہا۔ ''میں تمہارے ساتھ تعاون کر رہا ہوں۔''

''فکر مت کرو میں تمہیں کوئی جسمانی سزا نہیں دے رہی ہوں۔'' بانو نے کہا اور شراب کی ایک بوتل اٹھا کر کرنسی نوٹوں کے ڈھیر پر الٹنے لگی۔

''یہ کیا کر رہی ہو یہاں آگ لگ جائے گی۔'' میں نے کہا۔

''اچھا ہے اس سے ذرا افراتفری پھیلے گی اور ان لوگوں کی توجہ اِدھر بھی ہوگی تو ہمیں اس کا فائدہ ہوگا۔'' بانو بولی۔

میں نے محسوس کیا کہ وہ ٹھیک کہہ رہی تھی۔ راج کنور مزید گھبرا گیا۔ ''بھگوان کے لیے یہ بہت بڑی دولت ہے۔''

''اسی لیے تو آگ لگا رہی ہوں۔'' بانو نے کہا اور لائیٹر جلاتے ہوئے ایک گڈی کو آگ دکھا کر اسے نوٹوں کے ڈھیر پر پھینک دیا۔ اس نے بھک سے آگ پکڑ لی تھی۔ بانو کی اس حرکت سے مجھے خیال آیا کہ جب آگ لگانی ہے تو ٹھیک سے کیوں نہ لگائیں۔ میں نے شراب کی مزید بوتلیں بستر اور پردوں پر خالی کرنا شروع کر دیں۔ راج کنور گھگیا رہا تھا کہ اس طرح پورے پیلس میں آگ لگ جائے گی۔ بانو نے اسے ڈانٹا۔ ''تم اس دولت یا پیلس کی نہیں اپنی فکر کرو۔''

''بالکل، تم زندہ رہو گے تو ہر چیز کی اہمیت ہوگی تم مر گئے تو سب بیکار ہے۔''

وہ روہانسا ہو گیا۔ ''نہیں اس کی سزا میرے بیوی بچوں کو ملے گی۔''

''جو جرم تم نے کیا ہی نہیں ہے اس کی سزا تمہارے بیوی بچوں کو کیسے ملے گی؟''

''تم جانتے نہیں ہو اس دنیا میں سزا صرف کمزور کو ملتی ہے۔'' وہ تلخ لہجے میں بولا۔ ''اب میں کمزور ہوں۔''

''کوئی بات نہیں کل تک تم بھی دوسروں کے ناکردہ گناہوں کی سزا ان کے بیوی بچوں کو دیتے آئے ہو گے آج سمجھ لو پہیا الٹا ہو گیا ہے اور اب تمہارے باری ہے۔'' میں نے کہا اور انٹرکام اٹھا کر بڑے کنور سے رابطہ کرنے کو کہا۔ ابھی نوٹ جل رہے تھے اس لیے زیادہ دھواں نہیں ہوا تھا اور نہ آگ کا شور سنائی دے رہا تھا۔ بڑا کنور لائن پر آیا تو میں نے کہا۔ ''ہم باہر آ رہے ہیں، دومنٹ کے اندر تمہارے تمام آدمی راستے سے ہٹ جائیں۔''

''چلے آؤ تمہارا راستہ کوئی نہیں روکے گا۔''

میں نے انٹرکام رکھ دیا۔ اس دوران میں بانو اور اوشا شراب چھڑکنے کا کام کر رہی تھیں۔ راج کنور بت بنا اپنے عشرت کدے کی آنے والی تباہی کا سوچ رہا تھا۔ اس کا دکھ اس کے چہرے پر عیاں تھا۔ اس کا رویّہ فطری تھا اس نے صرف چیزوں سے محبت کی تھی اور انسان جن سے محبت کرتا ہے ان کی بربادی اسے رلاتی ہے۔ اس نے منہ بند رکھا تھا اسے معلوم تھا کہ احتجاج کا کوئی فائدہ نہیں ہوگا ہم وہی کریں گے جو ہمارا دل کہے گا۔ آخر میں بانو ایک بوتل کو انڈیلتے ہوئے جلتے نوٹوں کے ڈھیر تک لائی اور جیسے ہی شراب نے آگ تک رسائی حاصل کی وہ اس کے سہارے کمرے کی باقی چیزوں کی طرف لپکی تھی۔ نوٹوں سے شعلے بلند ہو رہے تھے۔ اب کمرے میں گرمی، دھوئیں اور حبس کی صورت میں آگ کے اثرات محسوس ہونے لگے تھے۔

''بس اب نکل چلو۔'' میں نے کہا تو اوشا اور بانو نے لپک کر راج کنور کو اپنے نرغے میں لے لیا تھا۔ میں نے دروازہ کھولا اور باہر آیا۔ وہاں کوئی نہیں تھا۔ یہ اچھی بات تھی ورنہ وہ میرے ساتھ نکلنے والا ہلکا سا دھواں بھی دیکھ لیتا۔ وہ تینوں میرے پیچھے آئے اور اوشا نے دروازہ بند کر دیا۔ اب آگ کے اثرات اس وقت دوسروں تک پہنچتے جب یہ بہت بڑھ چکی ہوتی۔ مجھے تعجب ہوا کہ دنیا جہان کی آسائشیں جمع کرنے والوں نے فائر الارم لگانے کی زحمت نہیں کی تھی حالانکہ یہ خوب صورت پیلس ایک بار پہلے بھی آگ کی تباہ کاریوں سے گزر چکا تھا۔ میں آگے تھا۔ میرے ہاتھ میں خود کار رائفل تھی اور شاٹ گن شانے سے لٹک رہی تھی۔ میں دیوار کے ساتھ لگا چل رہا تھا اور وہ تینوں میرے پیچھے تھے۔

راہداری کے اس سرے پر ایک گورکھا گارڈ موجود تھا لیکن اس کی رائفل اس کے شانے سے لٹک رہی تھی۔ میں نے اشارے سے اسے وہاں سے جانے کو کہا تو اس نے سعادت مندی سے حکم کی تعمیل کی تھی۔ اس شکل کی راہداری کے دوسرے حصے میں بھی کوئی نہیں تھا۔ لیکن جب ہم اس راہداری تک پہنچے جس کے بائیں طرف جانے کی صورت میں ہم بڑے کنور کے حضور پہنچ جاتے اور دائیں طرف آزادی کا راستہ تھا تو وہاں رامن تین مسلح گارڈز کے ساتھ موجود تھا۔ اس کی موجودگی میں اگر ہم دائیں طرف جاتے تو وہ یقیناً مزاحمت کرتا۔ میں رک گیا۔ رامن مجھے گھور رہا تھا۔ اس نے اپنے سابق آقائے ولی نعمت کی طرف کوئی توجہ نہیں دی جو ہمارے گھیرے میں تھا۔ ''رامن، بڑے کنور نے کہا تھا کہ کوئی ہمارے راستے میں نہیں آئے گا پھر تمہاری موجودگی کا کیا مطلب ہے؟''

وہ مسکرایا۔ ''میں تمہارا راستہ نہیں روک رہا ہوں لیکن یہاں سے تمہیں ہماری نگرانی میں چلنا ہوگا۔''

میں نے نفی میں سر ہلایا۔ ''یہ طے نہیں ہوا تھا۔ تم لوگ پیچھے ہٹ جاؤ۔''

''اگر میں ایسا نہ کروں تو؟'' رامن نے شرارت سے کہا۔ مجھے خطرہ محسوس ہونے لگا۔ میرا ایک ہاتھ عقب میں تھا میں نے اشارے سے بانو کو پیچھے ہونے کو کہا۔

''تو پھر میں واپس چلا جاؤں گا۔''

''اب واپسی کا کوئی راستہ نہیں ہے۔'' رامن کے لہجے کی شرارت بڑھ گئی۔ ''اگر یقین نہیں آ رہا تو واپس جا کر دیکھ لو۔''

اس کا مطلب تھا کہ بڑے کنور کے آدمیوں نے راج کنور کے عشرت کدے پر قبضہ کر لیا ہوگا۔ لیکن عملی طور پر یہ ممکن نہیں تھا کیونکہ وہاں پہلے ہی آگ کا قبضہ تھا۔ البتہ رامن کو ابھی اس کی اطلاع نہیں ملی تھی۔ ہاں اس کا امکان تھا کہ درمیان میں آنے والے کمروں میں اس کے آدمی چھپے ہوں۔ بانو میرے اشارے کو سمجھتے ہوئے راج کنور سمیت پیچھے ہٹ گئی تھی اور اب وہ رامن اور اس کے آدمیوں کی زد سے باہر تھی۔ میں نے لہجہ بدل کر کہا۔

''رامن! میں آخری بار کہہ رہا ہوں کہ پیچھے ہٹ جاؤ۔''

وہ میرے لہجے سے چوکنا ہو گیا۔ ''تم لڑائی کے موڈ میں لگ رہے ہو۔''

میں نے محسوس کیا کہ جتنی دیر ہو گی ہمارے پھنسنے کا امکان اتنا ہی بڑھتا جائے گا۔ خفیہ راستے والا کمرا یہاں سے چند قدم کے فاصلے پر تھا۔ یہ ناؤ اور نیور والا معاملہ تھا۔ میں نے جسم کو حرکت دیے بغیر اچانک رامن اور اس کے ساتھیوں کی طرف برسٹ مارا۔ میں نے جسم کا نشانہ لیا تھا اور بغیر کسی رعایت کے فائر کیا تھا۔ اس وقت دشمن کو رعایت اپنی خودکشی کے برابر ہو سکتا تھا۔ وہ تیار تھے بوکھلا کر بچنے کی کوشش کی لیکن گولیوں سے زیادہ تیز نہیں ہو سکتے تھے۔ رامن کے سینے پر کم سے کم دو گولیاں لگی تھیں وہ پلٹ کر گرا۔ اس کے ایک ساتھی کی گردن سے گولی پار ہو گئی تھی اور باقی دو بھی نشانہ بنے تھے مگر وہ جوابی کارروائی کے قابل تھے اور انہوں نے کارروائی کی بھی۔ فائرنگ کا شور بے پناہ تھا اس میں کان جھنجھنا گئے تھے۔ میں بر وقت پیچھے آیا فوراً ہی کئی گولیوں نے اس کنارے کو ادھیڑ دیا جس کے پیچھے میں روپوش تھا۔ عقب سے اوشا اور بانو نے ہلکی سی چیخیں ماری تھیں۔ اوشا چلائی۔

''شہباز پیچھے آؤ۔''

''اپنے پیچھے نظر رکھو۔'' میں نے دہاڑ کر کہا۔ ''راج کنور کے پیچھے ہو جاؤ۔''

انہوں نے ایسا ہی کیا۔ میں انتظار کر رہا تھا کہ دوسری طرف سے فائرنگ کا سلسلہ تھمے تو میں آگے کارروائی کروں۔ مگر دونوں بچ جانے والے گارڈز رہ رہ کر برسٹ مار رہے تھے۔ ان کا مقصد مجھے جوابی کارروائی کا موقع نہ دینا تھا۔ میں نے کچھ دیر انتظار کیا اور پھر نیچے بیٹھتے ہوئے صرف رائفل دیوار سے نکال کر ایک برسٹ مارا۔ ایک چیخ سنائی دی اور فائرنگ رک گئی۔ میں نے سماعت پر زور دیا کیونکہ مسلسل گونجتی آوازوں نے کانوں کو وقتی طور پر ناکارہ کر دیا تھا۔ چند لمحے بعد مجھے ایسی آہٹ سنائی دی جیسے کوئی گھسٹ کر فرار ہو رہا ہو۔ میں نے خطرہ مول لے کر جھانکا تو بچ جانے والا گارڈ ایک کمرے میں گھستا دکھائی دیا۔ دو گارڈز کی لاشیں پڑی تھیں لیکن رامن غائب تھا وہ زخمی ہوا تھا اور بھاگ نکلا تھا۔

راہداری خالی تھی۔ بانو نے اوشا کو راج کنور کی نگرانی پر لگا دیا تھا اور خود عقب کی طرف نگرانی کر رہی تھی مگر ابھی تک اس طرف سے کوئی نہیں آیا تھا۔ جیسے ہی میں اس کی طرف متوجہ ہوا، ایک شخص اچانک ایک کمرے سے نکلا اور اس کے ساتھ دھوئیں کا ریلا آیا تھا۔ بانو نے اسے دیکھتے ہی فائر کیا اور وہ سینہ تھام کر واپس کمرے میں جا گرا۔ وہ ایڑیاں رگڑ رہا تھا۔ میں آگے آیا اور کمرے میں جھانکا۔ وہاں اور کوئی نہیں تھا مگر دھوئیں کی موجودگی بتا رہی تھی کہ آگ راج کنور کے عشرت کدے سے خاصی آگے تک پھیل چکی تھی۔ اب اس طرف کسی کے ہونے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ میں نے بانو کے شکار کو واپس کمرے میں دھکیل کر دروازہ بند کر لیا لیکن اتنی سی دیر میں راہداری میں خاصا دھواں آ چکا تھا۔ دروازہ بند ہونے کے باوجود دھوئیں کی مقدار میں کمی نہیں آئی تھی بلکہ یہ چند سیکنڈ میں اور بھی بڑھ گیا تھا تب مجھے

پتا چلا کہ دھواں اصل میں عشرت کدے کی طرف سے آرہا تھا۔ اس کی آگ بے قابو ہوگئی تھی اور آس پاس کے کمروں کو بھی اپنی لپیٹ میں لے رہی تھی۔ شاید دروازہ بھی آگ کی لپیٹ میں آگیا تھا اس لیے دھواں پھیل رہا تھا۔

ایک لمحے کو مجھے ان آٹھ حسین عورتوں کا خیال آیا جو راج کنور کا دل بہلانے کے لیے پورے انڈیا سے منتخب ہوکر آئی تھیں۔ وہ اس عشرت کدے کے بالکل برابر میں تھیں اور آگ نے یقیناً ان کے کمروں کو بھی متاثر کیا ہوگا مگر دوسرے لمحے یہ خیال جھٹک کر میں بانو کی طرف واپس آیا جو اب راہداری کے دوسری طرف کی نگرانی کر رہی تھی۔ اوشا ہوشیاری سے راج کنور کے ساتھ لگی کھڑی تھی۔ مجھے خیال آیا کہ وہ اتنی تجربے کار نہیں تھی اور لڑنا بھڑنا بھی نہیں جانتی تھی۔ راج کنور اس سے پستول چھین لیتا تو بازی پلٹ سکتا تھا۔ اس لیے میں نے پلٹ کر راج کنور کا بازو اپنی گرفت میں لیا اور راہداری کے سرے تک آیا۔ میں نے پوچھا۔ ”خفیہ راستے والا کمرا کون سا ہے؟“

اس نے دائیں طرف دوسرے کمرے کی طرف اشارہ کیا۔ ”اس میں ہے۔“

”بانو اسے لے کر چلو۔“ میں نے بانو سے کہا۔ ”اوشا تم اس کے پیچھے رہوگی اور میں تمہارے پیچھے۔“

بانو نے راج کنور کی پشت سے پستول لگا دیا۔ ”آگے چلو۔“

پہلے مارے جانے کے خیال سے راج کنور پر لرزہ طاری تھا، اس کے قدموں نے آگے بڑھنے سے انکار کر دیا۔ بانو نے اس کے ساتھ بالکل مناسب سلوک کیا۔ ذرا پیچھے ہٹ کر اس نے راج کنور کو لات ماری۔ وہ اس سلوک کے لیے بالکل تیار نہیں تھا اس لیے بے ساختہ آگے جا گرا۔ بانو کے وار میں اتنی قوت تھی کہ وہ تقریباً پہلے دروازے کے پاس جا کر گرا تھا۔ اس کے حلق سے چیخ نکلی اور وہ جلدی سے کھڑا ہو گیا۔ بانو نے اس کے پاس جاتے ہوئے کہا۔ ”آگے چلو ورنہ اسی طرح لاتیں کھاتے رہوگے۔“

مجبوراً وہ آگے بڑھا تھا۔ بانو کے پیچھے اوشا آگئی تھی۔ اس نے دہشت زدہ نظروں سے لاشوں کی طرف دیکھا اور جلدی سے منہ پھیر لیا۔ اب دھواں اس طرف راہداری میں آنے لگا تھا۔ منظر ہلکا سا دھندلا رہا تھا اور اسی دھندلاہٹ کے پار ایک ہیولا نمودار ہوا۔ میں نے بے دریغ فائر کیا اور ہیولا اچھل کر واپس جا گرا تھا۔ دوسری طرف کھلبلی مچی اور کم سے کم دو خود کار رائفلوں سے فائرنگ ہوئی تھی۔ گولیاں اندھا دھند چلائی گئی تھیں مگر ہم بالکل کھلی جگہ تھے جہاں سوائے ایک دوسرے کے کوئی آڑ نہیں تھی۔ گولیاں دیواروں سے لگیں اور کچھ آس پاس سے گزریں معجزانہ طور پر ہم سب ہی بچ گئے تھے۔ بانو اور راج کنور اس کمرے کے دروازے کے سامنے تھے اور اسے کھولنے کی کوشش کر رہے تھے۔ میں اس طرف جھپٹا۔ ”دیر کیوں کر رہے ہو؟“

”دروازہ لاک ہے۔“ راج کنور نے کانپتی آواز میں کہا۔ میں نے ایک لمحہ ضائع کیے بغیر ان دونوں کو پیچھے ہٹایا اور لاک والی جگہ ہلکا سا برسٹ مارا۔ لاک ٹوٹ گیا اور دروازہ کھل گیا۔ میں نے بانو کو اندر جانے کو کہا۔ وہ اندر ہوئی۔ پھر میں نے اوشا کو دھکیل دیا اور راج کنور کو روکے رکھا۔ مجھے خطرہ تھا کہ وہ اندر جا کر کوئی حیران کن کام نہ کر جائے اس لیے میں اسے اس عالم میں بھی اپنے ساتھ لے جانا چاہتا تھا جبکہ راہداری کے سرے پر مسلح افراد موجود تھے۔ ان کی طرف سے دوسری بار فائرنگ کی گئی۔ گولیاں ہمارے آس پاس سے گزری تھیں اب یہاں ٹھہرنا خطرے سے خالی نہیں تھا۔ میں نے راج کنور کو دھکا دیا اور خود بھی اس کے ساتھ اندر داخل ہو گیا۔ وہ کراہتے ہوئے فرش سے اٹھنے کی کوشش کر رہا تھا۔ میں سمجھا کہ شاید اسے گرنے سے چوٹ آئی ہے۔ لیکن اسی لمحے اوشا چلائی۔ ”خون.... اس کا خون نکل رہا ہے۔“

تب میں نے دیکھا کہ اٹھنے کی کوشش کرتے راج کنور کے پہلو سے خون پھوٹ رہا تھا۔ میں نے دروازہ بند کرتے ہوئے اسے سیدھا کیا۔ گولی اس کے دائیں پہلو میں نچلی پسلیوں میں لگی تھی اور میں اندازہ کرنے کی کوشش کر رہا تھا کہ اس نے کتنا نقصان کیا ہوگا۔ اگر گولی سیدھی گئی تھی تو دل تک بھی پہنچ سکتی تھی۔ مگر وہ ہوش میں تھا اور خون بھی اب رک رہا تھا۔ اس کا مطلب تھا کہ کسی اہم عضو یا رگ کو نقصان نہیں ہوا تھا۔ میں نے اسی کی شرٹ کی آستین پھاڑ کر اس کی پٹی بنائی اور زخم پر رکھ کر دوسری آستین سے اس پر پٹی باندھ دی تھی۔ بانو دروازے کے پاس تھی اور وقفے وقفے سے جھری سے باہر جھانک رہی تھی۔ یہ کمرا فرنیچر کے لحاظ سے خالی تھا اور فرش پر دبیز قالین تھا۔ میں نے راج کنور سے کہا۔ ”گولی لگی ہے لیکن خاص نقصان نہیں ہوا ہے۔“

وہ بلبلا کر بولا۔ ”مجھے گولی لگی ہے اور تم کہہ رہے ہو خاص نقصان نہیں ہوا ہے۔“

”مطلب یہ کہ تم مروگے نہیں۔ اب جلدی سے خفیہ راستہ کھولو اس سے پہلے کہ بڑے کنور کے ہرکارے آکر ہمیں سچ مچ فوت کر دیں۔“

”جلدی کرو۔“ بانو بولی۔ ”وہ آگے آرہے ہیں۔“

میں جھپٹ کر دروازے کے پاس آیا اور رائفل باہر نکالتے ہوئے ایک برسٹ مارا۔ یہاں فائرنگ کا شور بے پناہ تھا کیونکہ جگہ بند تھی اور کان جھنجھنا جاتے تھے۔ برسٹ کا شور ختم ہوا تو کسی کے چلانے کی آواز آئی شاید کوئی زخمی ہوا تھا پھر منشی جی کی آواز سنائی دی۔ وہ کہہ رہے تھے۔ ”شہباز جی یہ کیا کر رہے ہیں۔ فائرنگ بند کریں اور آپ باہر آجائیں۔“

”تاکہ تمہارے آدمی مجھے آرام سے شکار کر لیں۔“

”ایسا نہیں ہوگا۔ یہ رامن کی شرارت تھی۔ وہ اب قید خانے میں ہے۔“

”تو کیا تم رامن سے الگ ہو۔“ میں نے کہا اور راج کنور کو اشارہ کیا کہ اب وہ کارروائی شروع کرے۔ وہ اٹھ کر لڑکھڑاتے قدموں سے ایک طرف بڑھا۔ بانو اس کے ساتھ تھی اور اوشا میرے ساتھ کھڑی تھی۔ ”منشی جی تم لوگوں کی بدنیتی شروع سے ظاہر ہوگئی ہے۔ بڑا کنور بھی اپنے بھائی سے مختلف نہیں ہے۔“

”شہباز جی میں نے کہا نا یہ سب رامن کا حرامی پن تھا۔ اسے سزا ملے گی۔ آپ خود سوچیں بڑے کنور کو آپ کے خون کی ضرورت ہے وہ آپ کو کیسے نقصان پہنچانے کا کہہ سکتے ہیں۔“

”تمہارے بڑے کنور کی ایسی کم تیسی۔“ میں نے دل میں سوچا اور بلند آواز سے کہا۔ ”منشی جی حالات آپ کی بات کی گواہی نہیں دے رہے ہیں۔ صرف رامن ہی نہیں اس کے ساتھ تین مسلح گارڈز نے بھی ہم پر فائرنگ کی ہے۔ ان میں سے دو میرے ہاتھ سے مارے گئے۔ پھر ایک دوسرے کمرے میں چھپا ہوا تھا۔“

”آپ نے راج جی کے حصے میں آگ لگا دی۔“ منشی جی نے کہا۔ ”لیکن یہ کوئی مسئلہ نہیں ہے، آپ سامنے آجائیں اور بڑے کنور جی سے بات کر لیں۔“

”اس دھوکا دہی کے بعد یہ ممکن نہیں ہے۔“

منشی جی نے مجھے یاد لانے کے انداز میں کہا۔ ”شہباز جی، آپ اس کمرے میں محصور ہیں اور یہاں سے نکل کر نہیں جا سکتے۔ اس لیے آپ کے لیے بہتر یہی ہے کہ ہتھیار ڈال دیں۔“

”منشی جی اس واقعے کے بعد میں آپ لوگوں پر کیسے اعتماد کروں۔“

”آپ ایک بار کر کے تو دیکھیں۔ کیا پہلے بھی آپ کی ہر بات نہیں مانی گئی۔“ اس نے مکارانہ عاجزی سے کہا۔

راج کنور بانو کی مدد سے قالین ہٹا رہا تھا۔ میں دیکھ نہیں سکتا تھا کہ اس طرف کیا ہے۔ راج کنور نے بانو سے کہا۔ ”اسے کھولنا ہوگا۔“

بانو جھک کر کسی چیز کو اٹھانے کی کوشش کرنے لگی لیکن یہ شاید اس اکیلے کے بس کی بات نہیں تھی۔ اس نے میری طرف دیکھا اور دبے لہجے میں بولی۔ ”آپ آئیں، مجھ اکیلے سے نہیں اٹھ رہا ہے۔“

میں نے اوشا کو نگرانی پر لگایا اور ان دونوں کے پاس آیا۔ قالین کے نیچے فرش پر فولادی چادر بچھی تھی۔ یہ دو بائی دو کے سائز کی تھی اور یقیناً خاصی موٹی اور وزنی تھی ورنہ بانو اسے اٹھا سکتی تھی۔ ایک طرف دو ہینڈل لگے ہوئے تھے لیکن یہ اس طرح چادر کے اندر تھے کہ اوپر ذرا بھی ابھار نہیں تھا۔ راج کنور اپنے زخم کی طرف سے جھکا ہوا کھڑا تھا۔ اس سے مدد کی توقع محال تھی۔ میں نے جھک کر دونوں ہینڈل تھامتے ہوئے اسے اٹھانے کی کوشش کی وہ ذرا اٹھا تھا مگر مجھ سے بھی پورا نہیں اٹھ رہا تھا۔ راج کنور نے کہا۔ ”یہ بہت وزنی ہے دو بہت طاقت ور آدمی مل کر اسے اٹھاتے ہیں۔“

میں نے رائفل اور شاٹ گن اتار کر پاس رکھ لی اور پھر کوشش کی، مگر اس بار بھی تختہ پورا نہیں اٹھا تھا۔ یہ دیکھ کر بانو آگے آئی اور اس نے اٹھے تختے میں ہاتھ پھنسائے۔ جگہ مختصر تھی اس لیے اسے مجھ سے لگ کر ہی یہ کام کرنا پڑ رہا تھا مگر یہ شرمانے کا وقت نہیں تھا۔ اس نے بھی پورا زور لگایا اور ہم نے تختہ الٹ دیا۔ خوش قسمتی سے دوسری طرف دبیز قالین تھا ورنہ اس کے گرنے کا بہت زوردار دھماکا ہونا تھا پھر بھی دھمک ہوئی تھی اور میں فکر مند ہو گیا کہ یہ دھمک باہر تک نہ گئی ہو۔ تختے کے نیچے ایک دروازہ تھا جس پر نمبروں والا تالا لگا ہوا تھا۔ راج کنور نے اس کے پاس بیٹھتے ہوئے اس کا نمبر ملایا۔ میں اس کی طرف دھیان دیے بغیر رائفل اور شاٹ گن اٹھا کر دروازے تک آیا۔ باہر راہداری دور تک سنسان تھی۔ اب دھواں کم ہو گیا تھا اس کا مطلب تھا وہ لوگ آگ پر قابو پا رہے تھے۔ میں نے کہا۔

"ٹھیک ہے منشی جی! میں آپ کی بات مان لیتا ہوں۔ لیکن میری ایک شرط ہے۔"

"کیسی شرط؟" اس نے بیتابی سے پوچھا۔

"رامن کو یہاں لایا جائے اور میرے سامنے گولی ماری جائے تب مجھے یقین آجائے گا کہ بڑے کنور اس سازش میں شامل نہیں تھے۔"

یہ شرط سن کر منشی جی کو سانپ سونگھ گیا۔ انہوں نے کچھ دیر بعد منمناتی آواز میں کہا۔ "شہباز جی یہ تو بہت کڑی سزا ہے۔"

"کڑی سزا۔" میں نے طنز کیا۔ "تم لوگ تو اس سے معمولی باتوں پر اپنے ملازموں کو کتوں کے آگے ڈلوا دیتے ہو اور وہ انہیں چیر پھاڑ کر کھا جاتے ہیں۔ رامن کا جرم اتنا معمولی ہے کیا اور تمہاری اطلاع کے لیے عرض ہے کہ راج کنور کو گولی لگی ہے اور وہ بے ہوش ہے۔ اگر جلد اس کا علاج نہ کیا گیا تو اس کی موت بھی واقع ہو سکتی ہے۔ منشی جی اب فیصلہ کرلو اگر تم نے یا بڑے کنور نے کرنا ہے اس کے لیے تمہارے پاس دس منٹ ہیں۔"

میں منشی جی سے وقت لے رہا تھا۔ محرم راز ہونے کے ناتے اتنا تو وہ جانتے ہوں گے کہ اس کمرے میں پیلس سے باہر جانے والا خفیہ راستہ تھا۔ اس لیے میں اس کی تسلی کے لیے جھوٹ بول رہا تھا۔ دوسرے میں اس طرح وقت لے رہا تھا۔ میرا خیال تھا کہ جتنی دیر میں، میں منشی جی سے بات کروں گا راج کنور تالا کھول لے گا۔ مگر جب میں نے اس کی طرف دیکھا تو وہ پریشان دکھائی دیا۔ تالا نہیں کھلا تھا۔ میں اس کے پاس آیا۔ "کیا بات ہے، تالا کیوں نہیں کھولا اب تک؟"

"پتا نہیں کیا بات ہے میں نمبر ملا رہا ہوں لیکن یہ کھل نہیں رہا۔" اس نے سہمے ہوئے لہجے میں کہا۔

میں نے رائفل کی نال اس کے سر پر رکھ دی۔ "راج کنور لگتا ہے تمہارے دماغ میں کوئی ٹیڑھ آگئی ہے اور مجھے تمہارا دماغ باہر نکالنا پڑے گا۔"

"میں سچ کہہ رہا ہوں اس کا نمبر ڈبل فائیو ڈبل سیون ٹائن فور نائن تھا۔ تم خود دیکھو میں ملا رہا ہوں لیکن یہ کھل نہیں رہا ہے۔"

اس نے ملا کر دکھایا مگر تالا کھلا نہیں تھا۔ یہ عام قسم کا تالا نہیں تھا۔ بلکہ بہت موٹی اسٹیل سے بنا ہوا مضبوط ترین تالا تھا۔ اس کا حلقہ ہی کوئی پون انچ موٹا تھا اور باقی تالا بھی خاصی موٹی چادر سے بنا ہوا تھا بلکہ اسے شاید ایک پیس کی صورت میں ڈھالا گیا تھا۔ ہم اسے گولی مار کر بھی نہیں توڑ سکتے تھے۔ اس پر تو شاید بم کا اثر بھی نہ ہوتا۔

"تم جھوٹ بول رہے ہو؟" میں نے غرا کر کہا اور نال سختی سے اس کے سر سے لگا دی۔ اس کا چہرہ لمحوں میں پسینے میں شرابور ہو گیا تھا۔

"شہباز، مجھے میرے بچوں کی سوگند..... میں سچ کہہ رہا ہوں۔ تم خود سوچو یہاں سب سے زیادہ خطرہ مجھے ہے اور میں کیوں جھوٹ بولوں گا۔"

اگرچہ وہ نہایت مکار دشمن تھا لیکن اس وقت مجھے لگا وہ سچ کہہ رہا ہے۔ البتہ میں نے مزید دھمکانے میں کوئی حرج نہیں سمجھا۔ "تمہارے پاس دس منٹ ہیں اس کے بعد میں تمہارے زخم پر پستول رکھ کر ایک گولی اور ماروں گا۔ باہر والوں کو پتا چل گیا ہے کہ تم زخمی ہو اس لیے کسی کا شک مجھ پر نہیں جائے گا۔"

"تم ایسا نہیں کر سکتے فائر کی آواز ان کے کانوں تک جائے گی۔"

"نہیں ہم اس کے ساتھ ہی باہر کی طرف بھی فائر کریں گے اس لیے کسی کو شک نہیں ہوگا اور اگر ہوتا ہے تو ہوتا رہے۔ جب ہم یہاں سے نہیں نکل سکتے تو ہمارے پاس لڑ کر مرنے کے سوا کوئی اور راستہ نہیں رہے گا اس لیے تم اپنی فکر کرو۔"

اس نے عاجزی سے کہا۔ "سنو کسی نے لاک نمبر بدل دیا ہے اور ایسا صرف بڑا کنور کر سکتا ہے۔"

"یہ میں نہیں جانتا۔" میں نے بے پروائی سے کہا۔ "دس منٹ بعد تمہاری زندگی کا چراغ لازمی گل ہو جائے گا۔"

"میں ..... میں کوشش کرتا ہوں۔" اس نے کہا اس وقت وہ اپنا زخم بھی بھول گیا تھا۔

"اسی میں تمہاری عافیت ہے۔" میں نے سرد لہجے میں کہا اور پلٹ کر دروازے کی طرف آیا۔ راہداری میں جہاں تک نظر جا رہی تھی کوئی نہیں تھا۔ میں سوچ رہا تھا کہ رامن کے سینے پر دو گولیاں لگی تھیں لیکن منشی نے ایسی کوئی بات نہیں کی جس سے پتا چلتا کہ وہ شدید زخمی ہے۔ اس کا مطلب تھا کہ اس نے لباس کے نیچے بلٹ پروف جیکٹ پہن رکھی تھی۔ ایک زمانہ تھا کہ بلٹ پروف جیکٹ بہت خاص چیز سمجھی جاتی تھی اور اہم ترین افراد کے لیے مخصوص تھی یا دولت مند ممالک نے خاص مجرموں سے نمٹنے کے لیے جو ٹاسک

فورس بنا رکھی تھیں ان کے ارکان کو بلٹ پروف جیکٹ فراہم کی جاتی تھی۔ لیکن افغان جنگ کے بعد بہت ساری ایسی چیزیں، آلات اور ہتھیار اب عام لوگوں تک بھی پہنچ گئے ہیں جو پہلے مخصوص سمجھے جاتے تھے۔ اب نجی ادارے بھی بلٹ پروف جیکٹس اور دوسرا سامان تیار کر رہے ہیں اور جب سے دہشت گردی کا مسئلہ اٹھا ہے اس نے سیکیورٹی کو باقاعدہ ایک انڈسٹری بنا دیا ہے۔ اب بھی یہ چیزیں مہنگی ہیں لیکن ناقابلِ حصول نہیں رہی ہیں۔ میرے پاس گھڑی نہیں تھی اور یہاں کسی کے پاس گھڑی نہیں تھی، راج کنور کی گھڑی شاید اس کے عشرت کدے میں رہ گئی تھی۔ وہاں وال کلاک تھی اس لیے گھڑی کا خیال نہیں آیا تھا۔ میرا اندازہ تھا کہ منشی جی کو دی گئی مہلت میں سے پانچ چھ منٹ گزر چکے تھے۔ اوشا بھی ہولی تھی، اس نے آہستہ سے کہا۔

"شہباز یہ منحوس تالا نہ کھلا تو ہمارا کیا ہوگا؟"

"وہی جو منظورِ خدا ہوگا۔" میں نے سرد آہ بھری۔

وہ روہانسی ہونے لگی۔ "تجھے تو کچھ نہیں کہیں گے اور تیری وجہ سے بانو کو بھی چھوڑ دیں گے پر میں ماری جاؤں گی۔"

"اوشا یہاں جو ہوگا سب کے ساتھ ہوگا۔" میں نے نرمی سے کہا۔ "اگر بچے تو سب بچیں گے ورنہ کوئی نہیں۔"

اس کے چہرے پر ذرا رونق آئی۔ "سچ کہہ رہا ہے نا رے، تو ہمیں مرنے کے لیے تو نہیں چھوڑے گا۔"

"تم نے مجھے بہت عرصے سے دیکھا ہوا ہے تم ایسا سمجھتی ہو کہ میں کسی سے کام نکل جانے کے بعد آنکھیں پھیر لینے والا شخص ہوں۔"

اس نے نفی میں سر ہلایا۔ "تو ایسا نہیں ہے پر تو انسان ہے حالات کے آگے بے بس ہو سکتا ہے بس اس سے ڈر لگتا ہے۔"

میں نے سرد آہ بھری۔ "تب مجھے معاف کر دینا۔"

مجھے اور اوشا کو آہستہ آہستہ بات کرتے دیکھ کر بانو ہماری طرف آئی۔ اس نے بھی وہی سوال کیا۔ "کیا اس تالے کو توڑا نہیں جا سکتا ہے؟"

میں نے نفی میں سر ہلایا۔ "اس کی ساخت بتا رہی ہے کہ یہ بہت مضبوط ہے۔ گولی بھی اس کا کچھ نہیں بگاڑ سکتی دوسرے اگر ہم نے فائرنگ کر کے اسے توڑنے کی کوشش کی تو باہر موجود لوگوں کو اس کا علم ہو جائے گا اور وہ پھر اندر آنے کی ہر ممکن کوشش کریں گے۔"

"یہ نہیں کھول پا رہا ہے۔" بانو نے راج کنور کی طرف دیکھا۔ اس کی حالت خراب ہو رہی تھی اور وہ سہارا لے کر بیٹھا ہوا تھا۔ ایک ہاتھ سے وہ مسلسل تالے پر مختلف نمبر ملا کر اسے کھولنے کی کوشش کر رہا تھا۔ میں پلٹ کر اس کے پاس آیا۔

"راج کنور آرام سے.... آرام سے۔"

اس نے وحشت زدہ نظروں سے میری طرف دیکھا۔ "کیسے آرام سے.... دس منٹ پورے ہوتے ہی تم مجھے گولی مار دو گے۔"

وہ سچ مچ دہشت زدہ تھا اور اس کے ہاتھ کانپ رہے تھے۔ میں نے نرمی سے کہا۔ "اس بات کو بھول جاؤ۔ مجھے یقین ہے کہ تالے کا نمبر بڑے کنور نے تبدیل کر دیا ہے۔ اب تم سوچو کہ بڑا کنور کیا نمبر رکھ سکتا ہے۔ وہ تمہارا بھائی ہے تم اس کے مزاج کا اندازہ لگا سکتے ہو۔ عام طور سے انسان پاس ورڈ ٹائپ کی چیز خود سے متعلق رکھتا ہے۔ تاکہ وہ اسے بھول نہ جائے۔ میری بات سمجھ رہے ہو نا؟"

اس نے سر ہلایا اور اس کا چہرہ ذرا نارمل ہوا۔ "سچ کہہ رہے ہو، مجھے نہیں مارو گے؟"

"ہاں کم سے کم اس وجہ سے نہیں ماروں گا کہ تم تالا کھولنے میں کیوں ناکام رہے۔ لیکن اب تم پوری کوشش کرتے رہو۔ تم جانتے ہو بڑا کنور شاید مجھے اور میرے ساتھیوں کو چھوڑ دے لیکن تمہارے ساتھ وہ اچھا نہیں کرے گا۔"

وہ دیوار سے ٹک گیا۔ "میں سمجھتا ہوں.... پانی ...... مجھے پانی مل سکتا ہے؟"

"میں کوشش کرتا ہوں۔" میں نے کہا اور پلٹ کر دروازے تک آیا۔ میں نے منشی جی کو آواز دی۔ "آپ نے کیا سوچا؟"

"میں نے بڑے کنور جی سے کہہ دیا ہے اب وہ فیصلہ کریں گے۔"

"ہمیں پانی اور مرہم پٹی کا سامان چاہیے تم کسی ملازمہ کے ہاتھ بھجوا دو۔"

"ابھی بھجواتا ہوں۔" اس نے کہا۔

"ہو سکے تو درد کش اور اینٹی بایوٹک گولیاں بھی بھیج دو۔"

چند منٹ بعد ایک نیپالی نقوش والی خادمہ منرل واٹر کی پانچ لیٹر والی بوتل، ٹرے میں مرہم پٹی کا سامان اور ادویات بھی لے کر آئی تھی۔ میں نے اسے آگے آنے سے روک دیا۔ میں نہیں چاہتا تھا کہ وہ راج کنور کو تالا کھولنے کی کوشش

کرتے ہوئے دیکھے۔ ”بس یہ یہیں رکھ دو اور واپس جاؤ۔“

اس نے جلدی سے حکم کی تعمیل کی۔ بوتل اور ٹرے نیچے رکھی اور واپس چلی گئی۔ میں نے اوشا سے کہا۔ ”تم اٹھا کر اندر لاؤ۔“

اوشا ڈرتے ڈرتے گئی اور جلدی سے دونوں چیزیں اٹھا کر واپس لے آئی۔ ٹرے میں ایک عدد گلاس بھی تھا۔ میں نے پہلے منرل واٹر کی بوتل کا معائنہ کیا۔ اس میں پانی کا رنگ ویسا ہی نیلگوں شفاف تھا جیسا کہ ہوتا ہے اور بوتل بھی سیل تھی۔ غور سے دیکھنے پر بھی اس میں کہیں کوئی سوراخ ..... دکھائی نہیں دیا تھا۔ حفظِ ماتقدم کے طور پر میں نے پانی کو منہ میں لے کر محسوس کیا لیکن اس میں کسی قسم کا کوئی الگ ذائقہ نہیں تھا یہ صاف ستھرا پانی ہی تھا۔ یہ گھونٹ حلق سے اتار کر میں نے راج کنور کو بوتل تھما دی اور وہ بیتابی سے دو گلاس پی گیا۔ میں نے اسے روکا۔ ”آرام سے، آرام سے..... ابھی اخراج کا مسئلہ پیدا ہو جائے گا۔ یہاں کوئی واش روم نہیں ہے۔“

”یہ تو بڑی مصیبت ہے۔“ بانو بولی۔ ”اگر ہم یہاں زیادہ دیر رہے تو مسئلہ ہو سکتا ہے۔“

”اس کا طریقہ ہے کہ کم سے کم پانی پیو جب تک پیاس شدت نہ اختیار کر جائے۔“ میں نے جواب دیا اور ٹرے میں موجود ادویات کا جائزہ لیا۔ ان میں ایک پیناڈول پین کلر کا تھا اور ایک ہائی پوٹنسی پین کلر کا تھا۔ اس کے ساتھ ایم پنسلین کے اینٹی بایوٹک کیپسول تھے۔ یہ بھی پیک تھے۔ زخم صاف کرنے والا محلول، روئی، زخم پر چھڑکنے والا پاؤڈر، چکنی پٹی، لپیٹنے والی پٹی کا رول اور میڈیکو ٹیپ بھی تھا۔ جب تک گولی زخم میں تھی اسے اینٹی بایوٹک کیپسول دینا بیکار تھا۔ میں نے راج کنور کو ہائی پوٹنسی پین کلر دیں۔ ”یہ کھالو اس سے درد کم ہوگا۔“

اس نے ذرا پیچھے ہٹ کر دیوار سے ٹیک لگائی اور پانی سے دونوں گولیاں نگل لیں۔ ”پتا نہیں یہ دوا ہے یا زہر ہے۔“

”یہ پیک گولیاں ہیں۔“ میں نے اسے تسلی دی۔

وہ تلخ انداز میں مسکرایا۔ ”یہ انڈیا ہے، یہاں سب ممکن ہے دوا کی پیکنگ میں زہر بھی ملتا ہے۔“

میں ہنسا۔ ”یہ تو ہم پاکستانی بھی اپنے ملک کے بارے میں کہتے ہیں۔“

”دونوں ملکوں میں کوئی فرق نہیں ہے۔“ راج کنور نے کہا اور پھر جلدی سے بولا۔ ”میرا اشارہ مذہب اور سماج کی طرف نہیں ہے اس میں تو زمین آسمان کا فرق ہے۔“

”پلیز کیا یہ بات تم ہمارے روشن خیال طبقے کو سمجھا سکتے ہو جسے دونوں ملکوں کے سماج اور شاید مذہب میں بھی کوئی فرق نظر نہیں آتا ہے۔“

راج کنور ہنسا۔ ”انہیں چند مہینے کے لیے انڈیا بھیج دو فرق خود سمجھ میں آجائے گا۔ میرا اشارہ اس بدعنوان نظام کی طرف ہے جو انگریزوں نے تیار کیا تھا اور ہم جیسے لوگ اسے سنبھال کر بیٹھے ہیں۔ کیونکہ اسی میں ہمارا مفاد ہے۔“

میں نے حیرت سے اسے دیکھا۔ ”تم بھی اس قسم کی باتیں سوچ سکتے ہو۔“

اس نے ٹھنڈی سانس لی۔ ”سوچتے سب ہیں لیکن ہم جیسے لوگ سوچوں کو نظر انداز کرتے ہیں جب تک کوئی مصیبت نہ پڑ جائے جو ہمیں سوچنے پر مجبور کرے۔“

”اب سوچنے کے بجائے ذرا کام کرو اور جلد از جلد اس تالے کو کھولو۔“ میں نے کہا تو راج کنور کھسک کر تالے کے پاس آگیا اور پھر سے نمبر ملانا شروع کر دیے تھے۔ آرام اور پین کلر لینے سے چند منٹ میں اس کی حالت خاصی بہتر ہوگئی تھی۔ میرا اندازہ تھا کہ گولی جسم کے اندر نہیں اتری تھی بلکہ شاید پسلیوں میں ہی پھنسی ہوئی تھی۔ میں نے اسے دوبارہ کام کرنے کو کہا۔ اس دوران میں میری نظر پہلی بار اس بیگ پر گئی جس میں زہریلی گیس تھی اور مجھے یاد تھا کہ اسے ہم راج کنور کے عشرت کدے میں چھوڑ آئے تھے۔ میں نے پوچھا۔ ”یہ یہاں کیسے آیا؟“

”میں لائی ہوں۔“ بانو نے کہا۔ ”مجھے خیال آیا کہ یہ بھی اچھا ہتھیار ہو سکتا ہے۔“

”ہاں ہو تو سکتا ہے لیکن تمہیں ڈر نہیں لگا اس سے؟“

”شہباز صاحب، میں نے کچھ عرصے میں دیکھا ہے کہ انسان کتنا ہی ڈرے اور احتیاط کرے موت اپنے وقت پر آتی ہے۔ اس لیے ملنے والے موقع سے فائدہ نہ اٹھانا حماقت ہوگی۔“

”گڈ، اس کا مطلب ہے اب تم زندگی اور موت کی حقیقت سمجھنے لگی ہو۔“

”میں نے ٹھیک کیا نا؟“ وہ خوش ہوگئی شاید اس کا خیال تھا میں اس طرح پوچھے بغیر بیگ لانے پر سرزنش کروں گا۔

”کام کرنے کے بعد کبھی مت سوچا کرو کہ اچھا کیا ہے یا برا کیا ہے یہ بات آنے والا وقت تمہیں خود بتا دے گا۔“ میں نے کہا اور دروازے کی طرف آیا۔ اس کے لاک والا حصہ بیکار ہو گیا تھا لیکن اوپر مضبوط قسم کی چٹخنی لگی تھی، کسی

ہنگامی موقع پر ہم کچھ دیر کے لیے دروازہ بند کر سکتے تھے۔ میں نے منشی جی کو آواز دی۔ ”دس منٹ کی مہلت کب کی ختم ہو چکی ہے۔“

”ذرا صبر کریں۔“ منشی جی نے کہا۔ ”معاملہ بڑے کنور کے پاس ہے۔ انہیں فیصلہ کرنے میں دیر لگ سکتی ہے۔“

”لگتا ہے تم لوگ پھر کوئی چکر چلا رہے ہو، منشی جی یہ آخری موقع ہوگا، میں اس قید سے تنگ آگیا ہوں اپنے ساتھیوں سمیت نکل نہ سکا تو ماروں گا اور مر جاؤں گا لیکن اب تم لوگوں کے ہاتھ نہیں آؤں گا۔“

”میرا نہیں خیال کہ آپ اس قسم کا کوئی کام کریں گے، آپ صبر سے کام لیں۔“

میں صبر سے ہی کام لے رہا تھا اور میرا ارادہ مرنے مارنے کا ہرگز نہیں تھا۔ لیکن دشمن کو دھمکانے میں کیا حرج تھا۔ ”منشی جی صبر بہت ہو گیا اور مجھے لگ رہا ہے کہ تم لوگوں کو اب راج کنور کی زندگی سے زیادہ اس کی موت سے دلچسپی ہے۔“

”ایسا نہیں جی ہمیں ان کی فکر ہے۔“

”کبھی اس کے زخمی اور بے ہوش ہونے کا سن کر تم نے ایک بار بھی اس کی خیریت کا نہیں پوچھا اور نہ اسے طبی مدد دینے کی بات کی۔“

منشی جی کچھ دیر خاموش رہے اور پھر ذرا بدلے ہوئے لہجے میں بولے۔ ”شہباز جی مجھے شبہ ہے کہ راج جی زخمی نہیں۔ وہ ٹھیک ہیں اور کسی خاص مقصد کے تحت آپ کو یہاں لائے ہیں اگر وہ میری بات سن رہے ہیں تو میں بتا دوں کہ اب اس کا کوئی فائدہ نہیں ہوگا۔“

میں سمجھ رہا تھا کہ اس کا اشارہ خفیہ راستے سے فرار کی طرف تھا اور یہ بری خبر تھی کہ اب اسے بھی آگے سے بند کر دیا گیا تھا۔ یقیناً جہاں یہ راستہ نکلتا ہوگا وہاں بڑے کنور نے اپنے آدمی بھیج دیے ہوں گے۔ لیکن بہرحال اس مفروضے پر ہم اپنی جدوجہد ترک نہیں کر سکتے تھے۔ میں نے انجان بن کر کہا۔ ”منشی جی آپ کس مقصد کی بات کر رہے ہیں اور اگر آپ کو یقین نہیں ہے کہ راج کنور زخمی اور بے ہوش ہے تو آپ خود یہاں آکر دیکھ سکتے ہیں۔“

منشی جی ایک بار پھر خاموش ہوئے اور کچھ دیر بعد بولے۔ ”شہباز جی معافی چاہتا ہوں میں نہیں آسکتا لیکن میں کسی کو بھیج دیتا ہوں وہ آکر راج جی کو دیکھ لے۔“

”کوئی اور نہیں صرف آپ۔“ میں نے دوٹوک انداز میں جواب دیا۔ ”اگر آپ راضی ہیں تو آجائیں۔“

مجھے امید تھی کہ منشی جی کو اپنی جان پیاری ہوگی اور وہ کسی صورت یہاں نہیں آئیں گے۔ میری امید پوری ہوئی اور انہوں نے جواب میں چپ سادھ لی۔ میں نے کچھ دیر بعد کہا۔ ”منشی جی اگر راج کنور مر گیا تو اس کی تمام تر ذمے داری بڑے کنور پر ہوگی۔ رامن کو سزا دینے کے معاملے میں جتنی دیر ہوگی میرا شبہ اتنا ہی بڑھتا جائے گا۔ اگر رامن نے یہ سب اپنی مرضی سے کیا ہے تو بڑے کنور کو اسے فوری سزا دے کر دوسرے نمک خواروں کے لیے ایک مثال بنا دینی چاہیے کہ نمک حرامی کے کیا نتائج نکل سکتے ہیں۔“

”بس زیادہ دیر نہیں لگے گی۔“ منشی جی نے کہا۔

اس سے بات کرتے ہوئے اچانک مجھے خیال آیا کہ بڑے کنور کی جی حضوری کرنے والے یہ لوگ کہیں چالاکی سے کام تو نہیں لے رہے ہیں۔ پہلے رامن نے بڑے کنور کی ہدایات کے برخلاف کارروائی کی اور اب منشی جی بھی اس کی پیروی کرتے دکھائی دے رہے تھے۔ بڑا کنور راج کنور کی طرح تمام معاملات اپنے ہاتھ میں نہیں لے سکتا تھا اور وہ اکثر ان ملازموں کا محتاج ہوتا۔ اپنی من مانی کے لیے بڑا کنور ایک آئیڈیل آقا تھا اور وہ فطرت میں بھی راج کنور سے مختلف تھا۔ راج کنور سے غداری کر کے اب وہ کسی صورت اسے زندہ نہیں دیکھنا چاہتے تھے۔ انہیں بجا طور پر خوف تھا کہ راج کنور نے کسی طرح پھر سے راج پاٹ حاصل کر لیا تو سب سے پہلے ان کی شامت آئے گی اور انہیں اپنے کیے کا خمیازہ بھگتنا پڑے گا۔ اس لیے رامن اور منشی جی کی پوری کوشش تھی کہ راج کنور کا پتا صاف کر دیا جائے۔ وہ مر جاتا تو اس کا الزام بعد میں بہ آسانی مجھ پر لگایا جا سکتا تھا۔ جیسے جیسے میں اس مفروضے پر غور کر رہا تھا میرا شک پختہ ہوتا جا رہا تھا کہ منشی جی رامن کے ساتھ مل کر اپنا ہی کھیل کھیل رہے تھے اور بڑا کنور اس سے بے خبر تھا اگر یہ بات درست تھی تو رامن قید نہیں تھا۔

اب اگر راج کنور ہم سمیت زندہ ان کے ہاتھ آجاتا تب بھی امکان یہی تھا کہ وہ اسے مار دیتے اور پھر بڑے کنور کے سامنے اس کا الزام ہم پر یا راج کنور پر رکھ دیتے کہ اس نے مزاحمت کی اور مارا گیا۔ بڑا کنور ان کی بات ماننے پر مجبور ہوتا۔ مگر ساتھ ہی اس کا بھی امکان تھا کہ یہ سب بڑے کنور کے اشارے پر ہو رہا تھا۔ لڑائی کا مقصد راج کنور کو ختم کرنا تھا اور اتفاق کی بات ہے ہم سب میں سے نشانہ بھی

بس وہی بچا ورنہ فائرنگ تو اندھا دھند کی گئی تھی۔ اپنے بارے میں مجھے یقین تھا کہ بڑے کنور نے ہر صورت میری حفاظت کرنے کو کہا ہوگا لیکن منشی جی اور رامن کو اس سے اتفاق نہیں ہوگا وہ راج کنور کے ساتھ میرا پتا بھی صاف کرنا چاہتے ہوں گے۔ اس سے بڑے کنور کی صحت یابی کا امکان بھی ختم ہو جاتا اور بیمار بڑا کنور ان کے رحم و کرم پر آ جاتا اور ان لوگوں کو کھل کر اپنی من مانی کرنے کا موقع ملتا۔ ورنہ وہ صحت مند ہو کر راج کنور کی طرح سب پر حاوی ہو جاتا۔ اپنے شبہے کی تصدیق کے لیے میں نے منشی جی کو آواز دی۔

"منشی جی آپ موجود ہیں؟"

"جی جناب میں یہیں ہوں۔"

"میں بڑے کنور سے بات کرنا چاہتا ہوں۔"

"اس کے لیے آپ کو بڑے کنور کے پاس جانا ہوگا۔" اس نے سادہ مکاری سے کہا یعنی ہمیں اس کمرے سے نکلنا ہوگا۔

"اتنی زحمت کی کیا ضرورت ہے۔" میں نے اسی کے انداز میں مکاری سے جواب دیا۔ "جیسے آپ نے پانی اور دوسری چیزیں بھیجی تھیں اسی طرح ملازمہ کے ہاتھ ایک واکی ٹاکی بھیج دیں میں اس پر بڑے کنور سے بات کرلوں گا۔"

منشی جی گڑبڑا گئے تھے۔ "جی میں دیکھتا ہوں۔"

"اس میں دیکھنے کی کیا بات ہے؟" میں نے مصنوعی حیرت سے کہا۔ "یہ کوئی بڑا مطالبہ تو نہیں ہے، میں نے یہاں گارڈز کے پاس بھی واکی ٹاکی دیکھا ہے۔"

"آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں لیکن اس کے لیے بڑے کنور سے اجازت لینا ہوگی۔"

میں ہنسا۔ "منشی جی آپ مذاق کر رہے ہیں۔ رامن کو مجھے اور میرے ساتھیوں کو مارنے کے لیے بڑے کنور کی اجازت کی ضرورت نہیں تھی لیکن اسے سزا دینے کے لیے بڑے کنور کی اجازت کی ضرورت ضرور ہے۔ کیا آپ نے پانی اور دوسری چیزیں بھیجتے ہوئے بھی بڑے کنور سے اجازت لی تھی۔"

"وہ دوسری بات تھی۔" منشی جی کا لہجہ سپاٹ ہو گیا۔ "اس معاملے میں بڑے کنور سے اجازت لینا ہوگی۔"

میں دروازہ بند کر کے راج کنور کے پاس آیا جو مسلسل تالے پر نئے کمبی نیشن آزما رہا تھا۔ میں نے آہستہ سے کہا۔ "تم نے سنا؟"

اس نے سر ہلایا۔ "میں سمجھ بھی رہا ہوں، یہ بڑے کنور کو استعمال کر رہے ہیں، انہیں خوف ہے کہ میں واپس آ گیا تو انہیں نہیں چھوڑوں گا۔ بڑا کنور میرا دشمن بھی ہو جائے تب بھی وہ مجھے قتل نہیں کرائے گا۔ یہ منشی دل جی اور رامن کی خواہش ہوگی۔"

"اسی لیے وہ واکی ٹاکی دینے کے لیے تیار نہیں ہیں۔"

"ان کا بس چلتا تو یہ وہیں ہمارے خلاف کارروائی کرتے لیکن وہاں انٹر کام سے رابطے کی سہولت تھی۔ یہاں ہمارے پاس کچھ نہیں ہے۔" راج کنور نے مایوسی سے کہا۔

"تمہیں یقین ہے کہ بڑا کنور تمہیں قتل نہیں کرانا چاہتا ہے؟" بانو نے پوچھا وہ کچھ دور دیوار سے ٹیک لگائے بیٹھی تھی۔

"وہ میرا بھائی ہے اور میں اسے اچھی طرح جانتا ہوں۔" راج کنور نے یقین سے کہا۔ "ہم بھائیوں میں وہ بہت بہتر انسان ہے۔ بعض اوقات وہ دوسروں کو بھی معاف کر دیتا ہے۔"

"لیکن یہ اقتدار اور اس کی زندگی کا معاملہ ہے۔"

"اس کے لیے مجھے قتل کرنا ضروری نہیں ہے، اپنی زندگی کی حد تک وہ مجھے یہاں سے بے دخل رکھے گا لیکن اس کے بعد یہ جاگیر اور دولت مجھے اور میری اولاد کو ہی ملے گی۔ یہ پریوار کا معاملہ ہے انسان اپنی ذات پر اپنے پریوار کو ترجیح دیتا ہے۔ مجھے موقع ملتا تو میں بھی اسے نہیں مارتا بس بے بس بنا کر اپنے قبضے میں رکھتا۔"

"تمہارے قبضے میں تو وہ پہلے بھی تھا، تمہیں سب دیکھتے تھے اور عیش کی زندگی بسر کرتے تھے۔"

"ہاں لیکن بڑے کنور کے کان بھرنے والوں کی کمی نہیں ہے۔" اس نے نفرت سے کہا۔ "سب سے آگے تو یہ منشی جی ہے۔"

"لیکن اسی منشی جی کو تم نے بڑے کنور کے خلاف اپنے ساتھ ملا لیا۔"

"یہ بھی اس کی چالاکی تھی، اس نے محسوس کیا کہ اگر میں جاگیر پر قابض ہو گیا تو سب سے پہلے اس کی چھٹی کروں گا اس لیے وہ میرا وفادار بن گیا۔"

"اور جیسے ہی تم قید ہوئے وہ دوبارہ بڑے کنور کی طرف لوٹ گیا۔"

"مجھے شبہ ہے کہ وہ کبھی میرا وفادار تھا۔ وہ ایک منصوبے کے تحت آیا تھا اور یہ بھی ممکن ہے کہ بڑے کنور کی رضامندی سے آیا ہو۔"

"یہ تو طے ہے کہ وہ بڑے کنور کا بھی پورا وفادار نہیں ہے وہ اسے بھی لاعلم رکھ رہا ہے۔"

"شہباز۔" راج کنور نے آہستہ سے کہا۔ "اگر تم نے ہتھیار ڈالنے کا فیصلہ کیا تو میری درخواست ہے مجھے اپنے ہاتھ سے گولی مار دینا، میں ان کتوں کے ہاتھ سے مرنا نہیں چاہتا۔"

"اگرچہ انسان موت و زندگی کے بارے میں بے بس ہے لیکن ایسا موقع آیا تو میں تمہاری درخواست کو مدِ نظر رکھوں گا۔"

راج کنور لاک نمبر ملانے میں لگ گیا۔ یہ بہترین قسم کا کمبی نیشن لاک تھا جس میں اپنی مرضی کا اور کسی بھی عدد کا نمبر بہ طور لاک لگایا جا سکتا تھا۔ یہ بھی ممکن تھا کہ اصل نمبر صرف چار ہندسوں پر مشتمل ہو یا یہ دس نمبروں پر بھی مشتمل ہو سکتا تھا۔ درست نمبر معلوم کرنا تقریباً بھوسے کے ڈھیر سے سوئی تلاش کرنے کے برابر تھا۔ فی الحال آرام کرنے کے سوا اور کوئی کام نہیں تھا اس لیے میں بھی ایک طرف دیوار سے ٹیک لگا کر بیٹھ گیا۔ بانو میرے قریب کھسک آئی اور مجھے معلوم تھا کہ اب سوالات کا سلسلہ شروع ہو جائے گا۔ میں تیار ہو گیا۔ اس نے پہلا سوال کیا۔ "اگر یہ کمبی نیشن لاک نہ کھول سکا تو....؟"

"تب ہم یہاں سے نہیں نکل سکیں گے۔" میں نے سادہ جواب دیا۔ "ہاں کوئی معجزہ ہو جائے تو الگ بات ہوگی۔"

"منشی جی اور رامن اگر بڑے کنور کی مرضی کے خلاف کام کر رہے ہیں تب وہ ہمیں زندہ نہیں پکڑیں گے۔"

"اس کا امکان ہے۔" میں نے سر ہلایا۔ "لیکن وہ کھل کر یہ کام نہیں کر سکتے کیونکہ انہیں بڑے کنور کو جواب دینا ہے اس لیے منشی جی کی کوشش ہے کہ ہم آسانی سے ان کے ہاتھ آ جائیں اور وہ اپنی مرضی سے ہمارا کام تمام کر سکیں۔"

بانو نے جھرجھری لی۔ "آپ اتنی خوفناک باتیں کتنے آرام سے کر رہے ہیں۔"

"یہ سب میرے لیے نیا نہیں ہے بلکہ اب تو تمہیں بھی عادی ہو جانا چاہیے۔"

بانو کچھ سوچ رہی تھی پھر اس نے ہچکچا کر کہا۔ "آپ ... نہیں راج کنور کے ساتھ رامن بھی میرے پیچھے پڑا ... اگر ہم ان کے ہاتھ آ گئے تو....؟"

"اتنی دور کا مت سوچو۔" میں نے نرمی سے ... ابھی ہم پوری طرح بے بس نہیں ہوئے ہیں۔"

"میرے لیے یہ دور کی بات نہیں ہے۔" بانو روہانسی ہو گئی۔ "میں آپ کو بتا دوں اگر ایسا کوئی وقت آیا تو میں زندہ ان لوگوں کے ہاتھ نہیں آؤں، ایک دو کو مار کر مروں گی۔"

"یہ اچھی اسپرٹ ہے لیکن اسے آخر کے لیے بچا کر رکھو۔ جب انسان عزت سے جی نہ سکے تو عزت سے مر جائے۔"

اوشا سامنے دیوار سے کمر لگا کر سیدھی بیٹھی ہوئی تھی۔ اس نے وہی ملازماؤں والا مختصر سا لباس پہن رکھا تھا اور اسے احساس نہیں تھا کہ اس پوز میں وہ کوئی تراشا ہوا مجسمہ لگ رہی تھی۔ وہ ہماری باتیں سن رہی تھی اور اس نے کوئی ردِعمل ظاہر نہیں کیا تھا۔ اس کا چہرہ سپاٹ اور آنکھیں ساکت تھیں بالکل ایسا لگ رہا تھا جیسے کوئی ناگن سکتے کی کیفیت میں ہو۔ بانو نے آہستہ سے کہا۔ "میں نے سیاہ رنگ کی لڑکیوں میں اس سے زیادہ حسین اور پُرکشش لڑکی نہیں دیکھی۔"

"میں نے بھی۔" میں نے اعتراف کیا۔

"اس کے جسم میں جو زہر ہے کیا اسے کسی طریقے سے ختم نہیں کیا جا سکتا تا کہ یہ بھی نارمل زندگی گزار سکے۔"

"میرا خیال ہے میڈیکل سائنس اتنی ترقی کر چکی ہے اور اس کا کوئی نہ کوئی علاج تو ہوگا۔" میں نے جواب دیا اور ساتھ ہی مجھے خیال آیا کہ وہ نارمل ہو گئی تو سیدھا میرا رخ کرے گی۔ اوشا ہماری باتیں سن رہی تھی وہ اٹھ کر ہمارے پاس چلی آئی۔

"تم لوگ میرے بارے میں بات کر رہے ہو نا؟"

"ہاں میں کہہ رہی ہوں کہ اگر کسی طریقے سے تمہارے جسم سے زہر خارج کر دیا جائے تو تم نارمل زندگی کی طرف آ سکتی ہو۔"

"چاہتے تو ہم بھی یہی ہیں رے۔" اس نے حسرت سے مجھے دیکھا۔ "پر باپو کا کہنا تھا کہ ہم ساری عمر وش کے ساتھ رہیں گے۔ اس کا کوئی اُپائے نہیں ہے۔"

"تمہارا باپو جدید میڈیکل سائنس کے بارے میں کچھ نہیں جانتا اس لیے ایسا کہہ رہا تھا۔ اب دنیا میں ہر مرض اور ہر چیز کا علاج ممکن ہے۔ آخر ان کا بھی تو علاج ہوتا ہے جن کو زہریلے سانپ کاٹ لیتے ہیں یا وہ کسی اور طریقے سے زہر کا شکار ہو جاتے ہیں۔ علاج کر کے ان کے جسم سے زہر کے اثرات ختم کر دیے جاتے ہیں۔" میں نے کہا۔

"میں اس بارے میں معلوم کرا چکا ہوں۔" تالے پر جھکے راج کنور نے اچانک کہا۔ "میں نے انڈیا کے ماہر ترین ڈاکٹروں سے بات کی جو زہر کے اثرات ختم کرنے کے ماہر ہیں لیکن ان کا بھی یہی کہنا ہے کہ اوشا کے بدن سے زہر ختم

نہیں ہوگا۔ یہ اس کے سسٹم کا ایک حصہ بن گیا ہے۔"
وہ ٹھیک کہہ رہا تھا جو چیز انسانی سسٹم کا حصہ بن جائے اسے الگ نہیں کیا جا سکتا تھا ایسا کرنے سے انسان مر بھی سکتا ہے۔ اس کی بات سن کر مجھے تعجب ہوا تھا۔ "تم نے کیوں یہ زحمت کی اور وہ بھی ایک معمولی ملازمہ کے لیے۔"
راج کنور نے اس بات کا جواب نہیں دیا۔ وہ سر جھکائے کمبی نیشن ملاتا رہا پھر میں نے اوشا کی طرف دیکھا تو جواب سمجھ میں آگیا۔ راج کنور بھی اس کے حسن سے متاثر تھا لیکن زہر کی وجہ سے وہ بس دور سے دیکھنے پر مجبور تھا۔ اپنی ہوس پوری کرنے کے لیے اس نے اوشا کا زہر ختم کرنے کے لیے ڈاکٹروں سے بات کی تھی اور اسے مایوسی کا سامنا کرنا پڑا تھا۔ اوشا نے ٹھنڈی سانس لی۔ "شہباز ہم کم نصیب ہیں رے کوئی ہمارے لیے کچھ نہیں کر سکتا۔"
"یہ تمہاری سوچ ہے میری سوچ اس سے الگ ہے۔ اس زہر نے تمہاری عزت محفوظ رکھی۔"
"تو جانتا ہے میں ایک سپیرے کی بیٹی ہوں۔" وہ بے پروائی سے بولی۔ "ہم جانتے ہی نہیں کہ عجت کیا ہے رے؟"
"ایسا نہیں ہے ہر انسان صاحبِ عزت ہے اگر اس کی اپنی نظر میں عزت ہو تو۔"
"بھلا آدمی کی دوسرے عجت نہ کریں تو کھد کیسے اپنی عجت کرے؟" اس نے ذرا تعجب سے کہا۔ میں اس نادان ناری کے ساتھ وقت ضائع کر رہا تھا۔ جب کہ مجھے یہ سوچنا چاہیے تھا کہ اس مشکل سے کیسے نکلوں۔ میں نے بانو کی طرف دیکھا تو وہ اپنی ہنسی ضبط کرنے کی کوشش کر رہی تھی۔
"تمہیں کیا ہوا ہے بی بی؟"
"کچھ نہیں شہباز صاحب۔" وہ ذرا شوخی سے بولی۔ "بس ایک خیال آرہا تھا کہ جب آدمی ڈھول گلے میں ڈال لیتا ہے تو اسے بجانا ہی پڑتا ہے۔"
اوشا نے مشکوک نظروں سے اسے دیکھا۔ "تو ہمیں ڈھول کہہ رہی ہے؟"
"بالکل نہیں تم کہاں سے ڈھول ہو گئیں۔ وہ تو بہت موٹے اور بھدے انسان کو کہتے ہیں۔" بانو نے جلدی سے تردید کی۔ "تم تو اسمارٹ ہو۔"
یہ سن کر اوشا دکھی ہوگئی۔ "لگتا ہے تو اب انگریجی میں برا کہہ رہی ہے۔"
میں ہنسا۔ "اسمارٹ کا مطلب ہے چست اور دبلی جیسی کہ تم ہو۔"
"تو سچ کہہ رہا ہے؟" اس نے شک سے پوچھا تو بانو ہنسی تھی۔ اوشا خفا ہوگئی اور اسے باقاعدہ منانا پڑا تھا۔ اس چھوٹی سی کامیڈی نے ہم سب کے تنے اعصاب ذرا ڈھیلے کر دیئے تھے۔ راج کنور ذرا تعجب سے ہمیں دیکھ رہا تھا لیکن اس نے درمیان میں دخل دینے کی کوشش نہیں کی۔ وہ اپنے کام میں لگا ہوا تھا جب تھک جاتا تو کچھ دیر کو سستانے کے لیے رک جاتا اور پھر ہمت آتے ہی دوبارہ کام میں لگ جاتا۔ یہ تو طے تھا کہ وہ اپنی ہمت سے بڑھ کر کوشش کر رہا تھا کیونکہ اس کے جسم میں گولی موجود تھی اور زخم تازہ تھا۔ بے شک پین کلرز نے عارضی طور پر زخم دبا دیا تھا لیکن پھر گولی کا زخم کم تکلیف دہ نہیں ہوتا ہے خاص طور سے جب گولی جسم میں موجود ہو۔ بلکہ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ جب اس کا زہر پھیلتا ہے تو یہ زیادہ تکلیف دینے لگتا ہے۔
لیکن اس کا مطلب یہ نہیں تھا کہ وہ انسان کا بچہ بن کر ہم سے تعاون کے جذبے سے سرشار اس کام میں جتا ہوا تھا۔ یہ برادرِ کلاں اور اس سے زیادہ اپنے سابق نمک خواروں کا خوف تھا جو راج کنور خفیہ راستے کا تالا کھولنے کی کوشش کر رہا تھا۔ پہلے تو مجھے اتنا کھلا ہوا "خفیہ راستہ" دیکھ کر تعجب ہوا تھا۔ بس ایک قالین ہٹاؤ اور دروازہ سامنے آجاتا۔ یہ تالا ہمارے لیے مسئلہ بنا ہوا تھا ورنہ کوئی اور دشمن ہوتا تو بم مار کر یا بہت سارے لوگوں کی مدد سے اس دروازے کو توڑ کر راستہ بنا چکا ہوتا۔ جب کہ میرے خیال میں خفیہ راستہ ایسا ہوگا کہ کوئی دیکھ کر شک نہ کرے کہ یہاں خفیہ راستہ ہو سکتا ہے۔ جیسے کسی آتشدان کے پیچھے یا کسی الماری کے پٹ کے عقب میں۔ جسے خاص طریقے سے کھولا جا سکے جیسے کوئی کل دبا کر یا فرش کی ٹائلوں میں سے کسی مخصوص ٹائل کو دبا کر۔ لیکن لگتا تھا کنور خاندان کو فکشن سے کوئی خاص دلچسپی نہیں تھی۔ وہ دولت مند ضرور تھے لیکن ذرا اجڈ قسم کے۔ مجھے راجا عمر دراز کے محل کے خفیہ راستے کا خیال آیا جس سے میں نے بھی سفر کیا تھا۔ وہ بالکل روایتی جاسوسی کہانیوں والے خفیہ راستے کی طرح تھا۔
میں اٹھ کر فولادی دروازے کے پاس آیا۔ اس کی چادر پوری طرح کنکریٹ سے لگی ہوئی تھی۔ میں نے شاٹ گن کے فولادی دستے سے کنکریٹ بجا کر دیکھا۔ یہ ہر جگہ سے ٹھوس تھا۔ میں نے راج کنور سے پوچھا۔ "اس خفیہ راستے کی تعمیر کب ہوئی؟"
"آج سے کوئی پندرہ سال پہلے۔"
"کس کی نگرانی میں ہوئی تھی؟"
"ظاہر ہے میری نگرانی میں۔"
"اس فولادی دروازے کے قبضے کہاں ہیں۔"
وہ سوچ میں پڑ گیا کیونکہ آدمی جو چیز استعمال کرتا ہے اس کی ساخت پر زیادہ توجہ نہیں دیتا ہے خاص طور سے جو ساخت چھپی ہوئی ہو۔ چند لمحے بعد اس نے کہا۔ "دیکھو یہ اس طرح سے اوپر اٹھتا ہے اس لیے اس کے قبضے اس طرف ہوں گے۔ مگر مجھے ٹھیک سے یاد نہیں ہے کہ قبضے کہاں کہاں لگے ہیں۔"
"ان کی تعداد یاد ہے اور یہ کہ قبضے کنکریٹ میں ہیں یا اس دروازے کا چوکھٹ سمیت فولادی ڈھانچا ہے۔"
"نہیں اس کے قبضے کنکریٹ میں پیوست ہیں۔" اس نے تردید کی تو مجھے دلچسپی محسوس ہوئی۔ "قبضوں کی تعداد یاد نہیں لیکن کم سے کم دو ہوں گے۔"
"اگر یہ کنکریٹ میں پیوست ہے تو اسے توڑا جا سکتا ہے۔"
"لیکن کیسے، اول تو ہمارے پاس اوزار نہیں ہیں اور دوسرے اسے توڑنے کے لیے بہت طاقت درکار ہو گی۔" راج کنور نے مایوسی سے کہا۔
"انسان کوشش کرے تو سب کر سکتا ہے۔" میں نے جواب دیا۔ "تم اپنا کام کرتے رہو۔"
وہ دوبارہ تالے پر جھکتے ہوئے بولا۔ "مجھے تو یہ کھلتا نظر نہیں آرہا، لگتا ہے کم سے کم میرا آخری سے آگیا ہے۔"
میں اس کے پاس سے ہٹا تو بانو نے آہستہ سے کہا۔ "آپ کے ذہن میں کوئی خیال آیا ہے۔"
اس مختصر سے کمرے میں دوسروں سے چھپا کر گفتگو کرنا ممکن نہیں تھا اس لیے میں نے بانو کو چپ رہنے کا اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ "نہیں بس ایسے ہی خیال آیا تھا۔"
ہمیں اس کمرے میں محصور ہوئے دو گھنٹے ہونے والے تھے۔ میرا اندازہ تھا کہ صبح کے دس بج رہے تھے۔ اوشا نے دروازے کی ذمے داری سنبھال لی تھی اور وقفے وقفے سے دروازہ کھول کر باہر جھانکتی تھی۔ کبھی کبھی تھوڑا سا باہر نکل کر بھی دیکھ لیتی۔ میں نے اسے منع کیا کہ باہر نہ نکلے۔ باہر والے شرارت پر آمادہ تھے اور کوئی گولی بھی چلا سکتا تھا اس نے کہا۔
"ہم کب تک ایسے بیٹھے رہیں گے۔"
"جب تک حالات اجازت نہیں دیتے۔"
راج کنور کی حالت بگڑ رہی تھی، تکلیف بڑھنے سے اس کے ماتھے پر بار بار پسینا آرہا تھا حالانکہ اس کمرے میں خنکی تھی۔ وہ ایک بار نمبر ملاتا اور ناکامی کے بعد نڈھال ہو کر پیچھے بیٹھ جاتا تھا۔ جب ہمت آتی تو دوبارہ کوشش کرتا۔ ہر بار اسے پہلے سے زیادہ دیر لگتی تھی۔ میں نے اسے روکا اور پھر زخم سے پٹی ہٹا کر اس کا معائنہ کیا۔ زخم کے آس پاس سوجن نمودار ہو رہی تھی اور رنگ بھی بدل گیا تھا۔ زخم واضح طور پر خراب ہو رہا تھا۔ میں نے اس سے کہا۔ "ذرا حوصلہ کرو میں انگلی سے زخم ٹٹولنے جا رہا ہوں، مجھے لگ رہا ہے گولی اوپر ہی موجود ہے اگر اسے نکال دیا تو تمہیں سکون ملے گا۔"
اس کا چہرہ سفید پڑ گیا اور اس نے کراہتے ہوئے کہا۔ "تم ٹھیک کہہ رہے ہو اب یہاں ایسی تکلیف ہے جیسے اندر انگارا رکھ دیا ہو۔"
"کاش کوئی چاقو ہوتا تو کام آسان ہو جاتا۔"
"چاقو ہے۔" بانو نے چاقو پیش کر کے مجھے حیران کر دیا۔ یہ چھوٹی نوک والی چھری تھی جس سے پھل کاٹا جاتا تھا۔ بانو راج کنور کے عشرت کدے سے آتے ہوئے اسے اٹھا لائی تھی۔ میں نے خوش ہو کر کہا۔
"یہ کیا نا تم نے کام۔"
میں نے لپیٹی جانے والی پٹی کا گولا بنا کر راج کنور کی طرف بڑھا دیا۔ "اسے اپنے منہ میں ٹھونس لو ایک تو آواز نہ نکلے دوسرے کہیں زبان دانتوں تلے آکر نہ کٹ جائے۔"
وہ خوفزدہ تھا لیکن اس نے میری ہدایت پر عمل کیا۔ اس نے ایک ہاتھ سے منہ دبا لیا تھا۔ میں نے پہلے جراثیم کش محلول روئی پر لگا کر اس سے اس کا زخم صاف کیا۔ اس محلول نے اس کے چودہ طبق روشن کر دیئے تھے۔ منہ بند تھا لیکن اس نے ناک سے اتنا واویلا مچایا کہ مجھے خدشہ محسوس ہونے لگا کہ کہیں اس کی آوازیں باہر تک نہ پہنچ جائیں۔....
بہرحال اب اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا تھا۔ میں نے زخم صاف کر کے چاقو بھی اسی محلول سے صاف کیا اور پھر اپنا پاؤں راج کنور کے سینے پر رکھا تاکہ وہ ہل نہ سکے اور چاقو اس کے زخم میں داخل کیا۔ وہ اتنی زور سے تڑپا کہ چاقو ہلا اور زخم خود بڑا ہو گیا۔ فوراً ہی خون بہنے لگا تھا۔ میں نے اس کی پروا کیے بغیر انگلی زخم میں داخل کی اور گولی تلاش کرنے لگا۔
راج کنور تڑپ رہا تھا مگر میرے بوجھ تلے زیادہ نہیں ہل پا رہا تھا۔ انگلی گھماتے ہوئے بالآخر میں نے گولی تلاش

کر لی۔ اس جگہ کا اچھی طرح اندازہ کر کے میں نے چاقو کی نوک اندر داخل کی۔ اس بار بھی راج کنور نے ناک سے شور کیا تھا مگر میں نے پروا کیے بغیر چاقو کی نوک سے گولی نکال ہی لی۔ وہ آخری بار تڑپا اور بے ہوش ہو گیا۔ میں نے افسوس سے کہا۔ ”مجھے معلوم نہیں تھا کہ یہ شخص اتنا کم ہمت ہو گا۔“

خون بہہ رہا تھا۔ میں نے پرانی پٹی کو استعمال کیا اور اس سے زخم دبا کر خون روکتا رہا جب خون رک گیا تو جراثیم کش محلول سے اسے صاف کیا۔ اس پر خشک کرنے والا پاؤڈر چھڑک کر اوپر سے چکنی پٹی رکھ کر ٹیپ سے بند کر دیا۔ پھر روئی سے اپنے خون آلود ہاتھ صاف کیے۔ پانی اس مقصد کے لیے استعمال نہیں کیا جا سکتا تھا۔ گولی نکلنے سے یقیناً راج کنور کی تکلیف میں کمی آئی تھی اس لیے جلد اسے ہوش آ گیا۔ میں نے پانی کے ساتھ دو پین کلرز اور دو اینٹی بایوٹک کیپسول اسے کھلا دیے۔ وہ دیوار سے ٹک کر گہرے گہرے سانس لینے لگا۔ دس منٹ بعد اس کی حالت خاصی بہتر نظر آنے لگی تھی۔ وہ مجھے عجیب سی نظروں سے دیکھ رہا تھا۔ یقیناً وہ سوچ رہا تھا کہ میں اس جیسے دشمن کے لیے اتنی تگ و دو کیوں کر رہا تھا۔ میں نے پوچھا۔

”اب کیسا محسوس کر رہے ہو؟“

”میں ٹھیک ہوں لیکن شہباز میری سمجھ میں تمہارا رویّہ نہیں آ رہا ہے۔“

”کیسا رویّہ؟“

”یہی کہ میں تمہارا بدترین دشمن ہوں اور تم میرے لیے اتنا کر رہے ہو؟“

”میں تمہارے لیے نہیں اپنے لیے کر رہا ہوں اور اس سے پہلے تم جیسے اور بھی کئی بدترین دشمن میرا رویّہ سمجھ نہیں پائے ہیں۔ اس کی بڑی سادہ سی وجہ ہے میں ایک عام انسان ہوں۔ مجھے غصہ بھی آتا ہے اور میں نے بیشمار لوگوں کو اپنے ہاتھ سے مارا ہے لیکن میرے لیے یہ بہت مشکل ہے کہ قابو میں آئے دشمن سے برا سلوک کروں یا صرف اپنی تسکین کے لیے اسے ذلیل کروں۔ اسی طرح میرے لیے یہ بھی ممکن نہیں ہے کہ تمہیں دشمن سمجھ کر علاج سے محروم رکھوں۔ ہاں میں یہ کر سکتا ہوں کہ اگر تم سے مجھے کوئی ناقابلِ تلافی نقصان ہوتا تو میں ایک گولی مار کر تمہیں..... دنیا سے رخصت کر دیتا۔“

”میرے بس میں ہوتا تو.....“

”راج کنور اپنا موازنہ مجھ سے مت کرو۔“ میں نے اسے ٹوک دیا۔ ”میں تم سے بالکل مختلف آدمی ہوں۔“

وہ چپ ہو گیا۔ کچھ دیر بعد سرد آہ بھر کر کہا۔ ”اگر میں بچ گیا تو اس وقت کو یاد رکھوں گا۔“

”یہ تو آنے والا وقت ہی بتائے گا۔“ میں نے کہا اور اٹھ کر دروازے تک آیا۔ منشی جی وہاں موجود تھے میری پکار کے جواب میں بولے۔

”حکم کریں شہباز جی؟“

”منشی جی اتنی تاخیر سے تم لوگوں کی بدنیتی تو واضح ہو گئی ہے۔ اب میں انتظار کر رہا ہوں کہ تم لوگ حرکت میں آؤ تو میں جواب دوں۔“

”آپ بے فکر رہیں یہاں کوئی آپ کے خلاف کچھ نہیں کرے گا۔“

”خوشی سے مر نہ جاتے گر اعتبار ہوتا۔“ میں نے تلخی سے کہا۔ منشی جی اینڈ پارٹی کی بدنیتی تو واضح تھی لیکن میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اگر اس نے کچھ کرنا ہی تھا تو اس میں اتنی تاخیر کیوں کر رہا تھا۔ اسے بہت پہلے اس کمرے پر ہلّا بول دینا چاہیے تھا۔ میرے خیال میں اب ہماری طرف سے کچھ کرنے کا وقت آ گیا تھا۔ میں نے دروازہ اندر سے بند کیا اور راج کنور کے پاس آیا۔ ”یہ بتاؤ اس دروازے کے ساتھ کوئی دھماکا خیز ٹریپ تو نہیں ہے۔“

اس نے نفی میں سر ہلایا۔ ”ایسا کوئی ٹریپ نہیں ہے تم کیوں پوچھ رہے ہو؟“

”میں اس دروازے کو توڑنے جا رہا ہوں۔“

اس نے عجیب نظروں سے مجھے دیکھا۔ ”اسے تو کوئی ہاتھی بھی نہیں توڑ سکتا ہے۔“

”میں ہاتھی نہیں انسان ہوں۔“ میں نے کہا اور اسے بازو سے پکڑ کر اٹھاتے ہوئے کمرے کے دوسرے کونے میں لایا۔ ”یہاں بیٹھو۔“

”شہباز صاحب آپ کیا کرنے جا رہے ہیں۔“ بانو نے پوچھا۔

”بانو تم دروازے کے پاس رہو گی اور اگر کوئی اندر آنے کی کوشش کرے تو اسے بے دریغ شوٹ کر دینا۔“ میں نے اس کا سوال نظرانداز کر کے حکم دیا تو وہ دروازے کے پاس چلی گئی۔ میں نے اوشا کو بھی کونے میں جانے کا حکم دیا۔ میں نے رائفل ایک طرف رکھ دی اور شاٹ گن سنبھالی۔ اس میں ایک وقت میں سات کارتوس آتے تھے اور جو پاؤچ میرے پاس تھا اس میں سو کے قریب کارتوس مزید تھے۔ یہ سب نہایت مہلک بلٹ تھے جو بیس گز کی دوری

تک کسی کو بھی موت کے گھاٹ اتارنے کے لیے کافی ہوتے۔ بازوؤں اور ٹانگوں کے علاوہ یہ کہیں بھی لگتے تو آدمی کا بچنا مشکل تھا۔ میں نے ایک مخصوص زاویے سے کھڑے ہو کر دروازے کے گرد کنکریٹ کی چوکھٹ کا جائزہ لیا۔ پھر اس کے قبضے والے حصے کا معائنہ کیا اور اوشا کو پاس بلایا۔ وہ لپک کر آئی۔

”جی کیا ہے رے؟“

”اوشا روئی سب کو دو اور اپنے کانوں میں بھی ٹھونس لو۔ اس بند کمرے میں دھماکے بہت زیادہ گونجیں گے۔“

اوشا نے ایک پیکٹ پھاڑ کر روئی نکالی اور سب کو دینے لگی۔ مجھے بھی دی جو میں نے گول مول کر کے کانوں میں ٹھونس لی۔ اب میں اور دوسرے دھماکوں کا سامنا کرنے کے لیے تیار تھے۔ میں ایسے زاویے سے کھڑا تھا کہ گولی پلٹ کر میری طرف نہ آئے اور پھر یہ کنکریٹ تھا اس میں گولی ویسے بھی پلٹتی نہیں ہے۔ ہاں دھات کی کوئی چیز ہو اور بہت مضبوط ہو تو گولی ان سے اچٹ کر واپس آ سکتی ہے۔ کانوں میں روئی ٹھونسنے کے باوجود پہلا دھماکا ایسا تھا کہ سیدھا کان کے پردے سے جا ٹکرایا تھا۔ میں بھی اچھل پڑا تھا۔ لیکن مجھے یہ دیکھ کر خوشی ہوئی کہ گولی نے فولادی تختے کے ساتھ کنکریٹ ادھیڑ دیا تھا۔ میں نے دل کڑا کر کے اسی جگہ دوسرا فائر کیا اور اس بار بھی اچھا خاصا کنکریٹ ادھڑا تھا۔ صرف روئی دھماکوں کی آواز روکنے میں ناکام رہی تھی۔ ان تینوں نے کانوں پر ہاتھ بھی رکھ لیے تھے۔ میں نے ایک بار پھر کام شروع کر دیا تھا۔

باہر والوں کو یقیناً اطلاع مل چکی تھی اور اس سے پہلے کہ ان کی طرف سے کوئی جوابی کارروائی ہوتی میں جلد از جلد کنکریٹ میں سوراخ کر لینا چاہتا تھا۔ ہر فائر کے ساتھ کنکریٹ کے ذرّے اُڑتے تھے اور کمرے میں بارود کا دھواں پھیل رہا تھا۔ ہر فائر کے ساتھ میں آنکھیں بند کر لیتا تھا کیونکہ ذرّے اُڑ کر منہ تک بھی آ رہے تھے۔ کوئی ایک درجن فائر کے بعد میں نے اپنی کارگزاری کا جائزہ لیا۔ شاٹ گن کے بلٹس نے کنکریٹ میں سوراخ کر دیے تھے اور اس کی اوپری سطح غائب ہو چکی تھی۔ میں نے بٹ سے کنکریٹ صاف کیا اور اندازہ کرنا چاہا کہ اس کے قبضے کہاں تھے۔ ایک بار قبضے نظر میں آ جاتے تو میں خاص طور سے ان کو نشانہ بنا سکتا تھا۔ بلٹس کی کمی نہیں تھی۔ فائرنگ میں وقفہ آیا تو پتا چلا کہ باہر کوئی چلّا رہا تھا۔ میں نے کانوں سے روئی نکالی۔ آواز منشی جی کی تھی۔ وہ پوچھ رہے تھے کہ میں فائرنگ کیوں کر رہا تھا۔ میں نے جواب دینے کے بجائے دوبارہ کانوں میں روئی ٹھونسی اور ان جگہوں کو نشانہ بنانے لگا جہاں میرے خیال میں دروازے کے قبضے موجود تھے اب تک کنکریٹ میں ان کا نشان نہیں آیا تھا۔

مزید نصف درجن فائر کے بعد مجھے رک جانا پڑا کیونکہ اب کمرے میں بارود کا زہریلا دھواں اتنا زیادہ بھر گیا تھا کہ اس میں سانس لینے سے حلق میں جلن ہو رہی تھی۔ شاٹ گن کے بلٹ میں جس طرح گولی بڑی ہوتی ہے اس طرح اس میں بارود بھی اچھا خاصا بھرا ہوتا ہے۔ میں نے دروازہ کھولا اور پہلے ذرا سا کھول کر باہر جھانکا وہاں کوئی نہیں تھا۔ دروازہ کھلتے ہی دھواں کم ہونے لگا تھا۔ اس کمرے میں وینٹی لیشن سسٹم نہیں تھا لیکن اس سے باہر تو موجود تھا اس لیے دھواں تیزی سے کم ہو رہا تھا۔ منشی جی سخت تشویش زدہ تھے کہ میں کیوں فائر کر رہا تھا۔ میں نے مناسب سمجھا کہ اسے جواب دے لوں۔ ”منشی جی فکر نہ کریں، ایسے فارغ بیٹھا تھا سوچا نشانہ بہتر کر لوں۔“

”شہباز جی آپ فائرنگ بند کریں۔“

”اگر میں ایسا نہ کروں تو.....؟“

”تو آپ کے لیے اچھا نہیں ہو گا۔“ منشی جی نے دھمکی دی۔ ”آپ کس پر فائر کر رہے ہیں؟“

”تمہارے سابق آقا پر نہیں کر رہا ہوں وہ ویسے بھی کچھ دیر کا مہمان ہے۔“

اس دوران میں دھواں تقریباً نکل گیا تھا اس لیے میں نے بانو کی ڈیوٹی دروازے پر لگائی۔ منشی جی پریشان ہو رہے تھے اور کوئی بعید نہیں تھا کہ اپنے کمانڈوز روانہ کر دیتے۔ میں نے بانو سے کہا۔ ”کوئی بھی نظر آئے اس پر فائر کر دینا۔ کسی کو کمرے کے قریب مت آنے دینا۔“

”میں سمجھ گئی لیکن اگر وہ دوسری طرف سے آیا تو؟“

”اوشا بھی مستعد رہے گی۔“ میں نے اوشا کی طرف دیکھا۔ وہ بھی دروازے کے پاس آ گئی اور میں دوبارہ فائرنگ کی مشق کے لیے تیار ہوا۔ اس بار مجھے ایک قبضہ نظر آ گیا تھا اور یہ تقریباً نصف انچ موٹی اور تین انچ چوڑی فولادی پلیٹ پر مشتمل تھا جو نہ جانے کنکریٹ میں کتنا گھسا ہوا تھا۔ میں تاک کر اس کے آس پاس فائر کرنے لگا۔ اب کیونکہ دروازہ کھلا ہوا تھا اس لیے اب دھواں بھی جمع نہیں ہو رہا تھا۔ تین درجن شاٹس مکمل کرنے کے بعد مجھے ہاتھوں

سے جمع ہو جانے والا ملبا ہٹانا پڑا تھا اور یہ دیکھ کر مجھے خوشی ہوئی کہ دونوں قبضے نمایاں ہو گئے تھے۔ ان پر سے کئی انچ تک کنکریٹ صاف ہو گیا تھا اور مزید فائر کے بعد ان کے نکل آنے کا امکان تھا۔ میں وقت ضائع کیے بغیر پھر فائر کرنے لگا۔ مزید ایک درجن فائر کے بعد ایک قبضہ نکل گیا تھا۔ میں نے اسے ہلا کر دیکھا۔ دوسرا ابھی تک اٹکا ہوا تھا۔ میں اس پر فائر کرنے جا رہا تھا کہ بانو نے فائر کیا۔

"کیا ہوا؟" میں نے پوچھا۔

"کوئی اس طرف آیا تھا، میں نے فائر کیا تو واپس بھاگ گیا۔"

"گڈ! اسی طرح محتاط رہو میں کامیابی کے قریب ہوں۔" میں نے کہا اور دوسرے قبضے پر فائر کرنے لگا۔ اسی اثنا میں باہر سے کسی نے ہلکا سا برسٹ مارا، گولیاں دروازے کے سامنے سے گزر گئی تھیں۔ میں نے بانو کو دروازہ بند کرنے کا اشارہ کیا۔ "سب کونوں میں چلے جائیں۔"

"آپ دروازے کے سامنے ہیں۔" بانو نے فکر مندی سے کہا۔ وہ اور اوشا ایک کونے میں چلے گئے تھے۔

"اللہ مالک ہے۔" میں نے کہا اور اس بار قریب سے قبضے پر لگاتار کئی فائر کیے۔ یہ بہت اچھی والی شاٹ گن تھی ورنہ کوئی عام شاٹ گن ہوتی تو اتنی دیر میں اس کی نال جواب دے جاتی۔ اس کی نال بھی دہک رہی تھی اور اسے ہاتھ سے پکڑنا ممکن نہیں تھا۔ مگر یہ اب بھی فائر کر رہی تھی۔ جلد دوسرا قبضہ بھی نکل گیا...... میں نے شاٹ گن نیچے رکھی اور زور لگا کر فولادی تختہ اٹھانے کی کوشش کی۔ کسی قدر دقت کے ساتھ یہ چوکھٹ سے نکل گیا تھا۔ نیچے جانے کے لیے سیڑھیاں نمودار ہوئی تھیں۔ راج کنور جلدی سے اٹھ کر پاس آیا۔ وہ بے خیالی میں یا جان بوجھ کر رائفل اور شاٹ گن کے پاس آ گیا تھا اس لیے میں نے اسے پیچھے دھکیل دیا۔ وہ اس کی پروا کیے بغیر پُرجوش انداز میں بولا۔

"شہباز تم نے ناممکن کو ممکن کر دیا ہے اب نکل چلو اس سے پہلے کہ وہ آ جائیں۔"

میں بھی یہی سوچ رہا تھا۔ اس دوران میں منشی جی کے آدمی دروازے کے پاس آ گئے تھے اور کسی نے ترچھا برسٹ مارا۔ اگر وہ سامنے فائر کرتا تو ہم سامنے ہی کھڑے تھے۔ میں نے جلدی سے رائفل اٹھاتے ہوئے جوابی برسٹ مارا پھر بانو اور اوشا کو اشارہ کیا۔ وہ جلدی سے پاس آ گئیں۔ میں نے آہستہ سے کہا۔ "نیچے اتر جاؤ لیکن پوری طرح محتاط رہنا ہو سکتا ہے نیچے کوئی ہو۔"

پہلے بانو گئی تھی پھر اوشا اتری۔ میں نے اسے پانی کی بوتل پکڑائی۔ راج کنور نے دوائیاں اور دوسرا سامان اپنے پاس رکھ لیا تھا۔ بانو زہریلی گیس والا بیگ یہیں چھوڑ گئی تھی اور اسے دیکھتے ہوئے مجھے ایک خیال آیا۔ وہاں راج کنور کی شرٹ کی استعمال شدہ آستینیں پڑی تھیں۔ میں نے جلدی سے انہیں اٹھا کر پٹیوں کی صورت میں پھاڑا..... پھر اسے ایک ڈوری کی صورت دے کر اسے بیگ کی زپ سے منسلک کر دیا۔ بیگ کی نچلی زپ کھول کر اس میں کنکریٹ کا ملبا بھر دیا اب یہ بھاری ہو گیا تھا اگر میں زپ کھینچتا تو بیگ نہ کھنچا آتا۔ راج کنور بھی نیچے جا چکا تھا۔ اس کے اترتے ہی میں بھی اتر گیا لیکن سیڑھیوں پر رہا۔ نیچے تاریکی تھی۔ میں نے کمرے میں موجود واحد پینل لائٹ پر فائر کیا اور وہ بجھ گئی۔ اب مکمل تاریکی تھی۔ نیچے سے بانو نے کہا۔

"یہ کیا ہے؟"

"آگے جا کر لائٹر روشن کر لو، راج کنور بھی نیچے آ گیا ہے۔" میں نے اسے خبردار کیا۔ وہاں تاریکی تھی اور ہم نہیں جانتے تھے کہ وہاں کیا ٹریپ تھے اور ممکن ہے کوئی ہتھیار بھی ہو۔ راج کنور اچھی طرح جانتا تھا وہ تاریکی میں بھی اپنا کام کر سکتا تھا۔ بانو سمجھ گئی۔ اس نے جلدی سے لائٹر آن کر لیا اور راج کنور کو اپنی نظروں میں کر لیا۔ پھر اس نے دبی آواز میں کہا۔ "آپ کیوں نہیں آ رہے ہیں؟"

"میں کچھ کر رہا ہوں۔ تم لوگ دس پندرہ گز آگے نکل جاؤ۔" میں نے جواب دیا۔ میرے کان آہٹ پر مرکوز تھے۔ باہر سے گارڈز کی آوازیں آ رہی تھیں اور پس منظر میں کہیں منشی جی کی آواز بھی شامل تھی۔ وہ یقیناً ہمیں روکنے کا حکم دے رہے تھے۔ میں چوکھٹ سے کوئی دو فٹ نیچے تھا اس لیے امکان نہیں تھا کہ کوئی آتے ہی مجھے دیکھ لے گا۔ بانو اور اوشا راج کنور کو لے کر دور چلی گئی تھیں اور نیچے تقریباً تاریکی تھی۔ ایک منٹ بعد دروازے پر ایک برسٹ مارا گیا اور پھر کسی نے لات مار کر دروازہ کھولا۔ میں نے سانس روکتے ہوئے تیزی سے ڈوری کھینچی۔ بیگ کی زپ کھلی تھی اور اس کے ساتھ ہی میں نیچے اتر گیا۔ اوپر سے گارڈز کے چلانے کی آوازیں آ رہی تھیں وہ شاید بتا رہے تھے کہ خفیہ راستہ کھلا ہے اور ہم غائب ہو چکے ہیں۔ نیچے آنے پر میں نے خود کو ایک ایسی سرنگ میں پایا جو تقریباً چھ فٹ قطر کی اور تقریباً گول تھی۔ یہ صاف ستھری اور سیمنٹ سے بنی تھی۔

یہاں بو یا گندگی نہیں تھی۔ وہ تینوں آگے تھے۔ اچانک تیز روشنی لہرائی اور بانو کی آواز آئی۔

"شہباز صاحب جلدی کریں۔"

مجھے خود جلدی تھی کیونکہ میں بیگ میں بھری گیس کی اثر انگیزی اور حد سے ناواقف تھا۔ ممکن تھا وہ بہت تیزی سے پھیلنے والی گیس ہو اور اس کا اثر یہاں تک پہنچ جائے۔ میں جلدی سے ان کے پاس پہنچا۔ بانو کے ہاتھ میں ایک چھوٹا سا برقی لیمپ تھا۔ لالٹین کی صورت کے اس لیمپ میں تیز روشنی والے ایل ای ڈی بلب لگے تھے۔ ایسا ہی ایک لیمپ اوشا کے ہاتھ میں تھا اور راج کنور خالی ہاتھ تھا۔ میں نے یہاں آ کر سانس لیا اور پھر انہیں دھکیلتے ہوئے کہا۔ "جلدی..... چلو..... میں نے بیگ کی گیس کھول دی ہے۔"

یہ سن کر راج کنور سب سے زیادہ دہشت زدہ ہوا تھا اس نے کہا۔ "وہ سو فٹ دور تک بھی اثر کرتی ہے۔"

یہ سنتے ہی سب کی رفتار میں تیزی آ گئی تھی اور شاید سب نے ہی سانس روک لی تھی۔ سرنگ سیدھی جا رہی تھی۔ میں نے اوشا سے لے کر لیمپ آن کیا۔ اب یہاں زیادہ روشنی تھی۔ ایک بار میں نے مڑ کر دیکھا تو آخری سرے تک کوئی نظر نہیں آیا تھا۔ گیس نے اثر کیا تھا اور کمرے میں گھسنے والے یقیناً اس کا شکار ہو گئے تھے ورنہ کوئی تو تعاقب میں آتا۔ پیچھے کی طرف سے اطمینان کے بعد میں نے راج کنور سے پوچھا۔ "سرنگ کتنی لمبی ہے؟"

وہ اپنے زخم کی وجہ سے کسی قدر جھک کر چل رہا تھا اس نے جواب دیا۔ "تقریباً ایک کلومیٹر لمبی ہے۔"

میں حیران ہوا تھا۔ ان لوگوں نے خاصی طویل سرنگ بنوائی تھی لیکن وہ بنوا سکتے تھے ان کے پاس دولت اور طاقت تھی۔ "اتنی طویل سرنگ بنوانے کے لیے درجنوں مزدور استعمال کیے ہوں گے پھر اسے خفیہ کیسے رکھا؟"

راج کنور نے اس سوال کا جواب نہیں دیا تھا لیکن جواب واضح تھا۔ جن سے سرنگ کھدوائی تھی ان کو مروا دیا گیا تھا اس لیے سرنگ کا راز راز رہا۔ ایک لمحے کو اشتعال کی لہر آئی اور میرا دل چاہا کہ راج کنور کی گردن مروڑ دوں۔ یہ سفاک لوگ اپنے معمولی سے کاموں پر بھی انسانوں کو اس طرح قربان کر دیتے تھے۔ مگر اس سے پہلے میں اپنے اس خیال پر عمل درآمد کرتا اشتعال کی لہر گزر چکی تھی۔ اب سرنگ [illegible] گھوم رہی تھی۔ یہ علاقہ شاید ریت مٹی والا تھا ورنہ پتھروں اور چٹانوں میں اتنی طویل سرنگ کھودنا بہت مشکل کام ہے جب کہ اسے چھپانا بھی تھا۔ راستے میں ہر سو قدم کے بعد ویسی ہی برقی لالٹینیں لٹکائی ہوئی تھیں جیسی ہمارے پاس تھیں۔ یہاں بجلی کا سسٹم نہیں تھا اس کے متبادل کے طور پر یہ لالٹینیں رکھی ہوئی تھیں۔ ان میں شاید طویل عرصے تک چلنے والی بیٹریاں تھیں۔

پانی کی بوتل اوشا نے اٹھائی ہوئی تھی اور اسلحہ بانو کے پاس تھا۔ میرا اسلحہ میرے ساتھ تھا۔ شاٹ گن کی نال اب بھی گرم تھی اس لیے اسے ہاتھ میں رکھنا پڑ رہا تھا۔ جب ہمیں سفر کرتے ہوئے تقریباً دس منٹ گزر گئے اور میرے خیال میں وہ جگہ قریب آ گئی جہاں یہ سرنگ نکلتی تھی تو میں نے رکنے کا حکم دیا۔ "راج کنور، سرنگ کا دہانہ کتنی دور ہے؟"

"بس کچھ دور ہے۔" اس نے جواب دیا۔

"کیا اسے باہر سے کھولا جا سکتا ہے؟"

"نہیں اسے صرف اندر سے کھولا جا سکتا ہے۔" اس نے انکار کیا۔

"راج کنور بے شک سرنگ تم نے بنوائی ہے لیکن بڑا کنور بھی اس کے بارے میں اچھی طرح جانتا ہے۔ کیا وہ باہر اپنے آدمی نہیں بھیج سکتا ہے؟"

یہ سن کر راج کنور کے چہرے پر ہوائیاں اُڑنے لگی تھیں۔ وہ بھولا ہوا تھا کہ بڑا کنور باہر کے راستے کی نگرانی بھی کروا سکتا ہے۔ ادھر ہم نکلتے اور ادھر پکڑے جاتے یا مارے جاتے۔ راج کنور شاید یہ سوچے ہوئے تھا کہ اب وہ بڑے کنور کی پہنچ سے دور نکل گیا ہے۔ "ایسا ہو سکتا ہے بلکہ ایسا ہی ہو گا۔"

"تم سمجھا سکتے ہو کہ باہر یہ راستہ کہاں نکلتا ہے؟"

"راستہ ایک چٹان میں واقع چھوٹے سے غار سے نکلتا ہے۔ غار بلندی پر ہے اور اس کے پیچھے ایک بلند ہوتا ہوا پہاڑ ہے۔" راج کنور وضاحت کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔

وہ اس معاملے میں اناڑی تھا لیکن میں نے سمجھ لیا اور مایوس ہوا تھا کیونکہ جو صورت بن رہی تھی اس میں غار کا محاصرہ آسانی سے کیا جا سکتا تھا۔ اگر ہم نکلنے کی کوشش کرتے تو مارے جاتے۔ بانو اور اوشا ایک طرف ٹک کر بیٹھ گئی تھیں۔ یہاں کسی قدر گھٹن تھی لیکن اتنی بھی نہیں تھی کہ سانس لینا محال ہو جاتا۔ ایسا لگ رہا تھا کہ ہوا کی آمد و رفت کا انتظام تھا۔ راج کنور سے باہر کی پوزیشن سمجھ کر میں کھڑا ہو گیا۔ میں نے بانو سے کہا۔ "تم دونوں یہیں ٹھہرو اور پیچھے سے ہوشیار رہنا۔"

"کیا اب بھی خطرہ ہے؟"

"بالکل! گیس کا اثر ختم ہوتے ہی وہ دوبارہ پیچھے آئیں گے۔" میں نے کہا۔ ہم جس جگہ رکے تھے یہاں سرنگ میں موڑ تھا۔ بانو اور اوشا اس طرف چلی گئیں۔ میں نے راج کنور کو اشارہ کیا۔ "آگے چلو اور راستہ کھولو۔"

اس نے نفی میں سر ہلایا۔ "نہیں وہ باہر ہوں گے، مجھے دیکھتے ہی گولی مار دیں گے۔"

"میں بھی تمہارے ساتھ ہوں۔" میں نے اسے تسلی دی اور پھر سمجھایا۔ "ہم ساری عمر یہاں تو نہیں رہ سکتے۔ بلکہ دو تین دن بھی نہیں گزار سکتے۔"

اس نے سوچا اور سرد آہ بھر کر بولا۔ "تم ٹھیک کہہ رہے ہو۔"

راج کنور آگے بڑھا، کوئی پچاس فٹ بعد سرنگ کا آخری حصہ آ گیا۔ یہاں بھی سرنگ لوہے کی سیڑھیوں کے ذریعے اوپر جا رہی تھی۔ میں نے روشنی اوپر کی یہاں بھی ایسا ہی ایک فولادی دروازہ نظر آیا جیسا اس سرنگ کے آغاز پر تھا۔ البتہ اس کے نیچے صرف ایک ہینڈل لگا ہوا تھا جسے گھما کر کھولا جا سکتا تھا۔ میں نے خدا کا شکر ادا کیا کہ یہاں تالا نہیں تھا ورنہ اس جگہ تو اسے توڑنا بھی ممکن نہیں تھا۔ صرف ہینڈل گھما کر دروازہ کھولا جا سکتا تھا اور ہم باہر نکل جاتے لیکن یہ اندازہ کرنا دشوار تھا کہ باہر کون سی آفتیں ہماری منتظر ہوں گی۔ میں نے اوشا کو آواز دی وہ آئی تو اسے راج کنور کی نگرانی پر لگا کر میں خود اوپر چڑھا۔ دروازے کا ہینڈل بڑے آرام سے گھوم گیا۔ میں نے رائفل کی نال اوپر کی اور دروازے پر دباؤ ڈالا۔ یہ اوپر کی طرف کھلتا تھا۔ یہ زیادہ وزنی بھی نہیں تھا کیونکہ کسی قدر دقت کے ساتھ اوپر اٹھ گیا۔ لالٹین میں نے دانت سے پکڑ لی تھی۔ لیکن دروازہ کھلتے ہی باہر سے تیز روشنی اندر آئی۔ ایک لمحے کو میری آنکھیں چکا چوند ہو گئی تھیں۔

میں نے دروازہ ذرا نیچے کیا اور جب آنکھیں روشنی کے قابل ہوئیں تو میں نے دوبارہ دروازہ اوپر کیا۔ میرا اندازہ تھا کہ بارہ بجے تھے تو سورج سر پر ہونا چاہیے تھا پھر اس کی روشنی اس غار میں کیسے آ رہی تھی۔ اب تک اس طرف سے نہ تو کسی نے مداخلت کی تھی اور نہ ہی کوئی آہٹ سنائی دی تھی۔ میں آنکھوں کے بجائے کانوں پر زیادہ زور دے رہا تھا۔ کچھ پرندوں کی آوازیں ضرور سنائی دے رہی تھیں لیکن وہ دور تھیں۔ اتنی دیر گھٹی ہوئی سرنگ میں رہنے کے بعد باہر کی تازہ ہوا بہت اچھی لگ رہی تھی۔ اس میں تازگی کے ساتھ پھولوں اور نباتات کی مخصوص مہک بھی تھی۔ میں سن گن لیتا رہا اور جب کوئی مشکوک آواز سنائی نہ دی تو میں نے باہر نکلنے کا فیصلہ کیا اور راج کنور سے کہا۔ "اوپر آؤ۔"

"نہیں۔" وہ لرزتی آواز میں بولا تو میں نے اوشا سے کہا۔

"اوشا اگر یہ میرے باہر نکلنے تک اوپر نہ آئے تو اسے گولی مار دینا۔"

اوشا نے غالباً پستول سیدھا کیا تھا کہ راج کنور کا انکار اقرار میں بدل گیا۔ "میں آ رہا ہوں۔"

میں نے دروازہ پورا کھول دیا اور وہ پیچھے کسی چیز سے جا لگا۔ اب وہ واپس نہیں گر سکتا تھا۔ میں ذرا اوپر ہوا تو سورج کی روشنی براہ راست اندر آنے کی وجہ سمجھ میں آ گئی۔ اس غار کا دہانہ اوپر کے رخ پر تھا۔ یہ اصل میں ایک پوری چٹان تھی جو شاید بارشوں سے کھوکھلی ہو گئی تھی۔ اس میں جابجا ... چھوٹے چھوٹے سوراخ تھے۔ اوپر والے سوراخ کو ان لوگوں نے بڑا اور گول کر کے ہموار کر لیا تھا جب کہ نیچے کے چھوٹے سوراخ برقرار رہنے دیے تھے۔ یہ حشرات الارض جیسے چھپکلیوں اور گرگٹوں کی پناہ گاہ ہونے کے ساتھ ساتھ بارش کے پانی کی نکاسی کا کام بھی کرتے تھے۔ ورنہ بارش کا پانی سرنگ کے دروازے کے اوپر جمع ہو جاتا۔ دروازے کا اوپری حصہ نہایت مہارت سے چٹان کی صورت میں تراشا گیا تھا اور اسے بند کرنے پر شبہ نہیں ہوتا کہ یہاں کوئی الگ سے دروازہ ہے۔

میں نے جن حشرات الارض کا ذکر کیا وہ خاصی تعداد میں یہاں موجود تھے اور میرے باہر آتے ہی وہ افراتفری میں اِدھر اُدھر بھاگ دوڑ کر رہے تھے۔ میں نے شکر ادا کیا کہ میرے ساتھ خواتین نہیں تھیں ورنہ کم سے کم بانو نے چیخیں ماری تھیں۔ ایک بار اس نے واش روم میں چھپکلی دیکھ کر چیخ ماری تو میں پریشان ہو گیا تھا۔ یہاں تو چیخ مارنے کے بہت سے اسباب تھے اور فی الحال آواز نکالنا خطرے سے خالی نہیں تھا۔ میں نے ان سے بچ کر اوپر جاتے ہوئے راج کنور کو باہر آنے کو کہا۔ یہاں سیڑھیوں جیسے اسٹیپ بنا دیے گئے تھے۔ اس لیے کوئی مشکل نہیں ہو رہی تھی۔ ورنہ سیدھی ڈھلان پر تو آدمی پھسل کر واپس آ جاتا۔ ہانپتا کانپتا ہوا راج کنور اوپر آ گیا۔ میں نے آس پاس دیکھا اور ایک تقریباً انسانی سر کے سائز کا پتھر اٹھا کر اسے دہانے سے ذرا اوپر کیا اور فوراً نیچے کر لیا۔ اگر کوئی دور سے نگرانی کر رہا ہو تو اسے لگے گا جیسے کسی نے باہر سر کیا اور پھر اندر کر لیا۔

"یہ کیا کر رہے ہو؟"

"دیکھ رہا ہوں باہر کوئی نگرانی کر رہا ہے یا نہیں۔"

"وہ ہوں گے۔" راج کنور نے یقین سے کہا۔ "ایسا نہیں ہو سکتا کہ بڑا کنور اس جگہ کو خالی چھوڑ دے۔"

دو تین بار پتھر نکالنے کے بعد میں نے اپنے ذاتی سر کا خطرہ مول لیا اور اسی طرح ایک ایک لمحے کے لیے سر اٹھا کر باہر کا جائزہ لیتا رہا۔ چند بار کی جھلک سے ایک تصویر سامنے آئی۔ چٹان کے سامنے ڈھلان کا مشرقی حصہ تھا۔ اس کے پیچھے شمال میں پہاڑ بلند ہو رہا تھا۔ دہانے سے مشرق اور جنوب کا حصہ صاف دکھائی دے رہا تھا اور یہاں چھوٹے درخت اور جھاڑیاں تھیں۔ بڑے درخت کسی زمانے میں ہوتے تھے لیکن اب کاٹ دیے گئے تھے اور ان کے بڑے سائز کے تنے بچے ہوئے تھے جن میں سے بعض سے دوبارہ شاخیں پھوٹ آئی تھیں۔ جابجا بڑے سائز کے پتھر پڑے تھے اور جہاں مٹی تھی وہاں لازمی سبزہ تھا۔ جہاں تک نظر جاتی تھی کوئی نقل و حرکت محسوس نہیں ہو رہی تھی۔ لیکن اس سے یہ سمجھ لینا بے وقوفی تھی کہ وہاں کوئی نہیں تھا۔ میں نے راج کنور سے کہا۔ "ان دونوں کو اوپر بلاؤ۔"

وہ واپس گیا اور اس نے اوشا تک میرا پیغام پہنچایا۔ پہلے اوشا اوپر آئی اور اس نے واجبی سی ڈری ڈری آواز نکالی۔ لیکن بانو کی اوپر آتے ہی گھگی بندھ گئی تھی۔ یہی غنیمت تھا کہ اس نے آسمان سر پر نہیں اٹھا لیا۔ البتہ وہ تقریباً دہانے تک چلی آئی اگر میں اسے نہ روکتا تو وہ شاید باہر بھی نکل جاتی۔ "اتنی جلدی کیا ہے بی بی، ابھی کوئی گولی مار دے گا۔"

"پلیز چلیں یہاں سے۔" اس نے دہشت زدہ نظروں سے چھپکلیوں اور گرگٹوں کو دیکھا۔ "یہاں میرا دم نکل جائے گا۔"

"میرا خیال ہے اور راج کنور کو یقین ہے کہ باہر بڑے کنور کے آدمی ہیں اب بتاؤ وہ ہمارے ساتھ کیا سلوک کریں گے۔"

اس سوال پر بانو ذرا سکون میں آئی تھی۔ چھپکلیاں اور گرگٹ بہرحال جان لیوا نہیں تھے لیکن باہر جو دشمن تھے وہ جان لے لیتے۔ میں نے راج کنور کو حکم دیا کہ وہ سرنگ کا دروازہ بند کر کے اس پر بیٹھ جائے تاکہ کوئی نیچے سے کھولنے کی کوشش کرے تو کامیاب نہ ہو۔ بانو نے کہا۔ "ابھی تک کوئی نہیں آیا تھا۔"

مجھے تعجب ہونے لگا۔ منشی جی اینڈ کمپنی کی طرف سے اتنی خاموشی تعجب انگیز تھی۔ میں نے ذرا خطرہ مول لے کر دہانے سے تھوڑا نکل کر باہر کا جائزہ لیا اور اس بار بھی کوئی نظر نہیں آیا تھا۔ میں سوچ میں پڑ گیا تھا۔ یہ چکر سمجھ سے بالاتر تھا۔ منشی جی اینڈ کمپنی کہاں تو ہماری جان کے دشمن تھے اور کہاں انہوں نے ہمیں آزادی سے نکلنے کا پروانہ عطا کر دیا تھا۔ بانو نے ایک نسبتاً محفوظ گوشہ دریافت کر لیا تھا اور وہاں دبکی ہوئی تھی، اس کی ساری بہادری ہوا ہو گئی تھی۔ البتہ اوشا نے اپنے ابتدائی خوف پر قابو پا لیا اور دلچسپی سے آس پاس دیکھ رہی تھی۔ ایک گرگٹ نے ذرا بے تکلفی دکھائی اور اس کے ہاتھ کے پاس آیا تو اوشا نے اسے اٹھا کر باہر اچھال دیا تھا۔ اس پر بھی بانو نے ہلکی سی ڈری ہوئی آواز نکالی۔

"تمہیں کیا ہوا ہے؟" میں نے اسے ڈانٹا۔ "یہ تمہیں کھا نہیں جائیں گے۔"

"مجھے بچپن سے ان سے ڈر لگتا ہے۔" بانو روہانسی ہو گئی۔

"اب تم بچی نہیں ہو بڑی ہو گئی ہو۔ دل مضبوط کرو۔" اس بار میں نے لہجہ نرم رکھا تھا۔

بانو خاموش ہو گئی پھر اس نے کہا۔ "آپ نے کیا سوچا ہے ہم زیادہ دیر یہاں نہیں بیٹھ سکتے۔"

"میں نے سوچ لیا ہے۔" میں نے کہا۔ "پہلے میں باہر جاؤں گا۔ کسی جگہ پوزیشن لے کر جائزہ لوں گا اور اس کے بعد تم لوگوں کو بلاؤں گا۔ جیسے میں کہوں ویسا ہی کرنا۔"

بانو نے سر ہلایا۔ "راج کنور کا کیا کرنا ہے؟"

"اس کا ابھی سوچا نہیں ہے۔" میں نے اسے ٹال دیا۔ "یہاں ہوشیار رہنا۔"

میں نے شاٹ گن اب شانے پر ٹانگ لی اس کی نال ٹھنڈی پڑ چکی تھی۔ رائفل کا بٹ بغل میں دبا کر میں دہانے سے نکلا اور چٹان سے نیچے اترتے ہوئے نزدیک ایک درخت کے کٹے تنے کے ساتھ دبک گیا۔ میں شمالی ڈھلان اور مغرب کا بھی جائزہ لینا چاہتا تھا۔ سورج سر پر ہونے سے یہ فائدہ تھا کہ یہ پوری جگہ بالکل واضح دکھائی دے رہی تھی اور حیران کن طور پر جہاں تک نظر جاتی تھی کوئی نظر نہیں آ رہا تھا۔ تو کیا منشی جی نے اس طرف کسی کو بھیجا ہی نہیں تھا؟ پوزیشن بدل کر میں نے آس پاس کا جائزہ لیا۔ چند منٹ بعد مجھے یقین آ گیا کہ وہاں کوئی نہیں تھا۔ میں نے بانو کو آواز دی۔ "اوشا کو یہاں بھیج دو۔"

''میں آجاؤں؟'' اس نے پوچھا۔

''میں نے کیا کہا ہے۔'' میرا لہجہ سخت ہو گیا تو بادلِ ناخواستہ بانو نے اوشا کو باہر بھیج دیا۔ وہ مشکل سے نیچے آئی کیونکہ اس نے پاؤں میں گرگابی جیسی چیز پہنی ہوئی تھی۔ بانو کے پاؤں میں کینوس شوز تھے اور اس لحاظ سے وہ بہتر پوزیشن میں تھی۔ اوشا کو ان پہاڑوں پر چلنے میں خاصی دشواری کا سامنا کرنا پڑتا۔ میں نے اوشا کو ایک طرف جانے کا اشارہ کیا اور کہا۔ ''نیچے دیکھتی رہو جیسے ہی کوئی حرکت محسوس ہو یا کوئی نظر آئے تو مجھے خبردار کرنا۔''

اوشا ایک جھاڑی کے ساتھ دبک گئی۔ میں نے راج کنور کو آواز دی۔ ''تم چٹان پر چڑھو اور آس پاس دیکھو۔''

''میں زخمی ہوں۔'' اس نے عذر پیش کیا۔ ''اوپر نہیں چڑھ سکتا۔''

میری طرف سے کسی ردِعمل سے پہلے بانو نے اسے سبق سکھایا۔ اس کے چلّانے کی آواز آئی تھی۔ بانو نے کہا۔ ''اب تم سمجھ گئے ہو گے کہ جو کہا جائے اس پر فوراً عمل کرو تاخیر تمہاری صحت کے لیے نقصان دہ ہے تم جانتے ہو یا....''

راج کنور کراہتا ہوا نمودار ہوا اور اوپر چڑھنے لگا۔ وہ ننگے پاؤں تھا اسے کچھ پہننے کی مہلت ہی نہیں ملی تھی اور ہمیں بھی خیال نہیں آیا تھا کہ راج کنور کو جوتے یا کوئی چپل پہننے کو کہہ دیتے۔ وہ ڈر کے مارے دیوار سے چمٹا ہوا تھا۔ مشکل سے سر اٹھا کر آس پاس دیکھ رہا تھا۔ میں نے دل ہی دل میں اسے برا بھلا کہا۔ لیکن یہ اس کی فطرت تھی وہ بزدل تھا اور زندہ رہنا چاہتا تھا اس لیے موت سے ڈر رہا تھا۔ کسی نہ کسی طرح وہ چٹان پر چڑھ گیا اور اس نے لیٹ کر آس پاس دیکھنا شروع کیا۔ اوشا نیچے دیکھ رہی تھی۔ اس نے ہلکی سی آواز میں کہا۔ ''شہباز.... ادھر دیکھو رے۔''

اوشا ہاتھ سے اشارہ کر رہی تھی۔ میں نے نیچے دیکھا دور چند افراد حرکت کرتے دکھائی دیے۔ وہ اتنی دور تھے کہ ان کی ساخت بھی واضح نہیں ہو رہی تھی بس ایسا لگ رہا تھا جیسے انہوں نے کنور پیلس کے گارڈز کی مخصوص خاکی رنگ کی وردی پہنی ہو۔ اب وقت نہیں تھا میں نے بانو کو آواز دی اور راج کنور کو بھی نیچے آنے کا اشارہ کیا۔ وہ نیچے اتر آیا۔ بانو بھی دہانے سے نکل کر آگئی تھی اور کسی قدر خفا نظر آرہی تھی۔ شاید اس لیے کہ اس کی جان سب سے زیادہ نکل رہی تھی اور میں نے اسے آخر تک غار میں روکے رکھا۔ راج کنور کی حالت بری تھی زخم درد کر رہا تھا اور کراہ رہا تھا۔ میں نے نیچے کی طرف اشارہ کیا۔ ''شاید یہ پیلس کے گارڈز ہیں ان کے آنے سے پہلے ہمیں یہاں سے نکل جانا چاہیے۔''

راج کنور نے غور سے نیچے کی طرف دیکھا اور سر ہلایا۔ ''یہ پیلس کے گارڈز ہی ہیں۔ ان کی شرٹ پر چمک دار دھاتی بٹن ہوتے ہیں، دیکھو دھوپ پڑنے سے یہ بٹن چمک رہے ہیں۔''

وہ درست کہہ رہا تھا واقعی آنے والے افراد کے لباس سے رہ رہ چمک اٹھ رہی تھی۔ میں نے کہا۔ ''سب اوپر کی طرف چلیں۔ بانو تم آگے ہو گی اور اوشا تم سے پیچھے ہو گی۔ راج کنور تم میرے آگے چلو گے۔''

ہم اسی ترتیب سے اوپر کی طرف روانہ ہو گئے۔ کچھ دیر میں ہم چٹان سے آگے نکل گئے تھے۔ میں اب تک حیران تھا کہ منشی جی نے اپنے آدمی یہاں کیوں نہیں بھیجے تھے۔ اس کی اب تک ایک ہی وجہ میرے ذہن میں آئی تھی کہ یہ بڑے کنور کا کام نہیں تھا۔ وہ شاید اپنے کمرے میں تو ویسے بھی اس کی حالت ایسی نہیں تھی کہ وہ اپنے کمرے سے باہر زیادہ دیر رہ سکے۔ میں نے ہمیشہ اسے اپنی آرام کرسی پر بیٹھے ہی دیکھا تھا۔ منشی جی اپنی مرضی چلا رہا تھا اور اسی وجہ سے اس معاملے میں بس اپنے چند اعتماد یافتہ افراد کو شامل کیا ہو گا اور وہ پیلس کے باقی گارڈز سے کام نہیں لے سکا ہو گا۔ شاید اس لیے کہ اس کے پاس اتنے لوگ نہیں تھے کہ وہ یہاں کا محاصرہ بھی کروا سکتا۔ اس کا مطلب تھا کہ وہ اس حوالے سے جھوٹ بول رہا تھا۔ یقیناً کنور پیلس میں شدید قسم کی کھچڑی پک رہی تھی اور میں اس سے بالکل بے خبر تھا۔ راج کنور یقیناً مجھ سے زیادہ جانتا تھا لیکن اس حالت میں بھی میں اس سے توقع نہیں کر سکتا تھا کہ وہ مجھے پیلس کے اندرونی معاملات کے بارے میں بتائے گا۔

بہرحال جو بھی تھا اس وقت میرے حق میں رہا تھا۔ اگر بڑا کنور ٹھیک ہوتا اور نہ کرتا یا دوسرے لفظوں میں منشی جی اور رامن اس کے حق میں نہ ہو جاتے تو مجھے راج کنور کی مدد سے وہاں سے نکلنا پڑتا اور یہ آسان نہیں تھا۔ پیلس کے تمام گارڈز سے نمٹنا ناممکن تھا اور ہمارے پیلس سے نکلتے ہی معاملہ قانون کے ہاتھ میں جا سکتا تھا۔ جس کے بعد میرے لیے انڈیا میں ایک مصیبت اور کھڑی ہو جاتی۔ مگر ملازموں کی سازشوں کی وجہ سے وہ لوگ پوری طرح حرکت میں نہیں آسکے تھے۔ ممکن ہے بعد میں بڑے کنور کو پتا چلا ہو کہ میں راج کنور کو لے کر نکل گیا ہوں اور پھر اس نے آدمی بھیجے

ہوں۔ پیچھے آنے والے بڑے کنور کے بھیجے لوگ تھے۔ سرنگ والے راستے سے ابھی تک کوئی نہیں نکلا تھا۔ شاید چند افراد کے مرنے کے بعد وہ خوفزدہ ہو گئے تھے اور ابھی تک اس طرف سے نکلنے کی ہمت نہیں کر سکے تھے۔ یہ سب میرے لیے قدرت کی طرف سے آسانیاں تھیں۔

جب ہم پیلس والوں کی پہنچ سے دور نکل جاتے تو اس کے بعد سوچا جاتا کہ اب پاکستان کی طرف کیسے نکلا جائے۔ میرے اور بانو کے لیے پہاڑی راستوں پر چلنا آسان ہو رہا تھا کیونکہ ہم دونوں نے کریپ سول والے کینوس شوز پہن رکھے تھے۔ اگرچہ یہ بھی پہاڑوں پر چلنے کے لحاظ سے مثالی نہیں تھے جیسے جوگرز ہوتے ہیں لیکن برے بھی نہیں تھے۔ اوشا مشکل سے چل رہی تھی۔ اس کی نازک گرگابی پیلس کے مخملیں قالینوں اور چکنے فرشوں پر چلنے کے لیے تھی اس کھردرے پتھریلے راستے پر یہ بیکار تھی۔ سب سے زیادہ مشکل میں راج کنور تھا۔ ننگے پاؤں اور پسلیوں کے زخم کے ساتھ اس کے لیے یہاں چلنا بہت دشوار ہو رہا تھا۔ پتھر اس کے پیروں میں لگ رہے تھے اور وہ یقیناً ایسی مشکلوں کا عادی نہیں تھا اس لیے جب کوئی پتھر چبھتا تو بے ساختہ کراہ اٹھتا تھا۔ ہم تقریباً ایک کلو میٹر دور آئے ہوں گے کہ وہ ایک پتھر پر ٹک کر تھکے ہوئے گدھے کی طرح ہانپنے لگا۔ میں نے اسے گھورا۔

''رک کیوں گئے ہو چلتے رہو ہم زیادہ دور نہیں آئے ہیں۔''

''مجھ سے نہیں چلا جا رہا ہے، یہ دیکھو میرے پیروں کا حال۔'' اس نے پاؤں اوپر کیے اس کے تلووں پر جگہ جگہ کٹ لگے ہوئے تھے اور خون کی سرخی جھلک رہی تھی۔ واقعی حالت بری تھی۔

''ٹھیک ہے لیکن ہم رک نہیں سکتے، تم جانتے ہو موت کے ہرکارے پیچھے ہیں اگر انہوں نے آلیا تو ہم شاید بچ نکلیں لیکن تم مارے جاؤ گے اس لیے ہمت کرو اور چلتے رہو۔''

مجبوراً وہ پھر چلنے کے لیے آمادہ ہوا تھا۔ ہمہ وقت نفیس لباس اور بہترین حلیے میں رہنے والے راج کنور کا حلیہ ابتر تھا۔ اس نے سلک جیسے کپڑے کی شرٹ پہنی تھی جس کی دونوں آستینیں غائب ہو چکی تھیں اور نیچے نرم سوتی پاجامہ تھا۔ بال بکھرے ہوئے اور جسم گرد آلود ہو رہا تھا۔ نیلگوں رنگ کی شرٹ پر خون کی سرخی بھی لگی ہوئی تھی۔ اوشا بھی ایسی مشقت کی عادی نہیں تھی۔ وہ ہانپ رہی تھی مگر پوری استقامت سے ہمارا ساتھ دے رہی تھی۔ اس نے اس دوران میں ایک بار بھی رکنے کے لیے نہیں کہا اور نہ ہی تھکن کی شکایت کی۔ وہ بھی سمجھتی تھی کہ ہمارا جلد از جلد دور نکل جانا بہتر تھا۔ میں اور بانو بہتر پوزیشن میں تھے صرف لباس اور جوتوں کے لحاظ سے ہی نہیں بلکہ ہم کہیں زیادہ فٹ بھی تھے اسی لیے اس دشوار ترین راستے پر ایک کلو میٹر کی تیز واک کے بعد بھی ہمارے سانس ہموار تھے۔ دوسرے کلو میٹر کے بعد راج کنور پھر بیٹھ گیا۔ وہ ہانپتے ہوئے رک رک کر بولا۔

''اب.... مجھ سے.... نہیں چلا جا.... رہا۔''

یہاں پانی کی بوتل میں نے لے لی تھی کیونکہ اوشا اس کے وزن کے ساتھ اور مشکل میں پڑ جاتی۔ شاٹ گن بانو کو دے دی تھی۔ میں نے پانی کی بوتل اس کی طرف بڑھائی۔ ''پانی پیو اور کچھ دیر آرام کرو۔''

پانی پی کر اس نے اپنے پیر دیکھے جن کے زخم مزید بڑھ گئے تھے اور کچھ سے تو باقاعدہ خون رس رہا تھا۔ اس نے مایوسی سے کہا۔ ''میں مزید نہیں چل سکوں گا۔''

میں اس کی بات پر دھیان دیے بغیر ایک بلند چٹان پر چڑھا اور پیچھے دیکھا۔ یہاں بلند اور کئی فٹ قطر تنوں والے درخت تھے جو منظر کی راہ میں رکاوٹ بن رہے تھے۔ نیچے لینڈ اسکیپ کلرفل تھی اور اس میں کسی چھوٹی حرکت کرتی چیز کو تلاش کرنا دشوار کام تھا۔ میں نظر جما کر دیکھتا رہا اور کچھ دیر بعد مجھے دائیں طرف ڈھلان پر جہاں سرنگ والی چٹان تھی کچھ حرکت کا احساس ہوا۔ یہاں کچھ لوگ حرکت کر رہے تھے لیکن وہ پہلے سے زیادہ دور تھے اس لیے یہ کہنا دشوار تھا کہ وہ کس طرف جا رہے تھے۔ یہ بات حوصلہ افزا تھی کہ ہم ان سے خاصی دور نکل آئے تھے لیکن ابھی خطرے سے دور بھی نہیں تھے۔ ان کو یہ اندازہ کرنے میں زیادہ دشواری نہیں ہوتی کہ ہم کس طرف گئے تھے اور پھر وہ اسی طرف کا رخ کرتے۔ یہ بہت بلند پہاڑ تھا اور اس کے آخری حصے میں برف بھی دکھائی دے رہی تھی۔ حالانکہ یہ مئی کا وسط تھا شاید سولہ یا سترہ تاریخ تھی۔ میں نیچے آیا۔

''بس اب چلو وہ لوگ سرنگ والی چٹان تک آ گئے ہیں اور اب یقیناً اس طرف آئیں گے۔''

''میں نہیں چل سکتا۔'' راج کنور نے نفی میں سر ہلایا۔

''اس صورت میں، میں تمہاری لاش چھوڑ کر جانا پسند کروں گا۔'' میں نے رائفل کا رخ اس کی طرف کر دیا۔

''تم مجھے گولی مارو گے۔'' راج کنور مسکرانے لگا۔ ''فائر کی آواز ان تک جائے گی اور انہیں پتا چل جائے گا کہ تم کہاں ہو؟''

''ان کا باپ بھی پتا نہیں چلا سکتا، تم پہاڑوں کو مجھ سے زیادہ نہیں جانتے ہو یہاں آواز اس طرح گونجتی ہے کہ سمت کا پتا نہیں چلتا اور دوسرے میں تمہاری گردن بھی توڑ سکتا ہوں اس میں بس اتنی آواز آئے گی کہ تمہارے کان ہی سن سکیں گے۔ بولو اب کیا کہتے ہو؟''

''تم میرے زخم دیکھ رہے ہو۔'' وہ دوبارہ عاجزی پر اتر آیا۔ ''ان کے ساتھ میں زیادہ دور تک نہیں چل سکتا ہوں۔''

''ان زخموں کے ساتھ زندہ رہنا یقیناً بہتر ہے بہ نسبت اپنے ہی آدمیوں کے ہاتھوں مارے جانے سے۔ تمہارے پاس ایک منٹ ہے فیصلہ کرنے کے لیے۔'' میں نے فیصلہ کن لہجے میں کہا۔ ''میں تمہیں دشمنی کرنے کے لیے زندہ نہیں چھوڑ سکتا۔''

''تب تم مجھے بعد میں بھی نہیں چھوڑو گے۔''

''اگر میں اس جگہ سے بحفاظت نکل گیا اور پاکستان پہنچنے کی راہ نظر آئی تو میں تمہیں رہا کر دوں گا۔ اس وقت چھوڑوں گا تو تم میری راہ میں ہر ممکن رکاوٹ کھڑی کرو گے۔''

''میں وعدہ کرتا....'' اس نے جلدی سے کہنا چاہا۔

''وقت پورا ہو گیا ہے۔'' میں نے رائفل اوشا کو پکڑا دی اور اس کی طرف بڑھا۔ میرے عزائم میری صورت پر نظر آ رہے تھے اس لیے وہ جلدی سے کھڑا ہو گیا۔

''ٹھیک ہے میں چل رہا ہوں۔''

''تمہیں اگر گھسٹ کر چلنا پڑے تب بھی تم چلو گے اور اب اسی وقت انکار کرنا جب تم مرنے کا فیصلہ کر چکے ہو۔'' میں نے سخت لہجے میں کہا۔ ''شاید تم میرے نرم رویے سے کسی غلط فہمی میں مبتلا ہو گئے ہو۔ تم صرف میری مجبوری ہو۔''

راج کنور آگے بڑھا تو میں نے اوشا سے رائفل لے لی۔ وہ عجیب نظروں سے مجھے دیکھ رہی تھی۔ ''باپ رے.... تو اس طرح بھی بات کر سکتا ہے رے۔'' اس نے آہستہ سے کہا۔

''میرے ساتھ رہو گی تو اور بھی بہت کچھ جان لو گی۔'' میں نے آہستہ سے کہا۔

''تیرے ساتھ ہی تو رہنا چاہتے ہیں۔'' وہ بولی اور آگے بڑھ گئی۔ بانو ذرا دور تھی لیکن سن رہی تھی۔ اوشا کے آگے جانے پر وہ میرے پاس آئی۔

''یہ آپ سے کچھ زیادہ ہی فری نہیں ہو رہی ہے۔'' اس نے احتیاطاً انگریزی میں کہا۔

"ہو تو رہی ہے۔" میں نے اعتراف کیا۔

"بعد میں آپ کے لیے مشکل نہ بن جائے۔"

"بی بی آسان حالات اور انسان تو عرصہ ہوا مجھے نہیں ملے ہیں، اسے بھی بھگت لوں گا۔" میں نے آگے بڑھتے ہوئے کہا۔ بانو سمجھ گئی کہ میں اس موضوع پر بات نہیں کرنا چاہتا اس لیے اس نے موضوع بدل دیا۔

"شہباز صاحب، ہم مسلسل بلندی کی طرف جا رہے ہیں۔ آپ نے محسوس کیا ہے کہ اس بلندی پر دن کے وقت تیز دھوپ میں بھی سردی لگ رہی ہے۔ رات کو یہاں درجہ حرارت بہت کم ہو جائے گا اور ہم میں سے کوئی سردی سے بچاؤ کا سامان نہیں رکھتا ہے۔"

"یہ تو ہے۔"

"دوسرے ہمیں بالآخر نیچے کا رخ کرنا ہوگا اس لیے جتنا بلندی کی طرف جائیں گے اتنا دور ہوتے جائیں گے۔"

"تب ہمیں کیا کرنا چاہیے؟"

"میرا تو خیال ہے ڈھلان کے متوازی سفر کرنا چاہیے۔" اس نے مشورہ دیا جو معقول بھی تھا اس لیے میں نے قبول کرتے ہوئے فوری رخ بدل لیا۔ بانو خوش ہو گئی اس نے اوشا کو آواز دی اور اسے بتایا کہ اب ہم نے مغرب کی طرف سفر کرنا تھا۔ راج کنور سن رہا تھا اور شاید اس نے ہی سب سے بڑا سکون کا سانس لیا تھا کیونکہ گولی کے زخم اور زخمی پیروں کے ساتھ اوپر چڑھنا اس کے لیے عذاب تھا۔ اب متوازی سفر کی صورت میں مشکل اتنی زیادہ نہیں تھی۔ سورج بلندی سے ہو کر کسی قدر مغرب کی طرف جھک گیا تھا۔ میرا اندازہ تھا ڈیڑھ سے دو بجے کا وقت تھا۔ ہم سب نے صبح ناشتے میں پھل کھائے تھے اور وہ کب کے ہضم ہو چکے تھے۔ پھر اس پہاڑی سفر نے رہی سہی کسر پوری کر دی تھی۔ جب میرے پیٹ میں چوہا ریس جاری تھی تو یقیناً باقی سب کا بھی یہی حال تھا۔ مگر ان پہاڑوں میں ہمارے کھانے کا کوئی سامان نظر نہیں آ رہا تھا۔ بعض مقامات پر اسٹرابیری کے پودے دکھائی دیئے تھے لیکن ان پر پھول تھے اور ابھی اسٹرابیری نہیں آئی تھی۔ بلندی پر پھل ہمیشہ دیر سے پکتا ہے۔

آدھے گھنٹے بعد ہم رک گئے۔ اب پیچھے کوئی نہیں دکھائی دے رہا تھا۔ وہ لوگ بہت پیچھے رہ گئے تھے اور شاید وہ ہمارے فرار کی سمت کا تعین بھی نہیں کر سکے تھے۔ ابتدائی مشکلات کے بعد ہم جتنی آسانی سے نکل آئے تھے اس سے مجھے ایک دو بار شبہ بھی ہوا کہ کہیں اس میں کوئی چکر تو نہیں ہے۔ مگر ہم آزاد تھے اور راج کنور ہمارا قیدی تھا اس لیے میں نے اس شبہے کو ذہن سے جھٹک دیا تھا۔ راج کنور کی حالت مزید ابتر ہو گئی تھی۔ اس کے پیروں تلے چھالے بن کر پھوٹ رہے تھے۔ وہ زمین پر پاؤں رکھتا تو کراہتا تھا اگر اسے جان کا خوف نہ ہوتا تو شاید ساری دنیا کی دولت کے بدلے بھی وہ اس وقت سفر پر آمادہ نہ ہوتا۔ میں نے افسوس سے کہا۔ "اگر تم نے خود پر ذرا بھی سختی کی ہوتی تو تمہیں اتنی مشکل نہ ہوتی۔"

اس نے بھنا کر کہا۔ "مجھے کیا معلوم تھا کہ کبھی ایسا وقت بھی آئے گا۔"

یہاں نزدیک ہی جھاڑی لگی تھی جس کے پتے بڑے اور دبیز تھے۔ راج کنور نے پتے توڑے اور ان کو پیروں پر لپیٹا۔ پھر اس نے درختوں سے لٹکتے بال لے کر ان کو دھاگے کی جگہ استعمال کیا اور کسی قدر کوشش کے بعد اپنے لیے خود ساختہ جوتے بنانے میں کامیاب رہا۔ میں نے اسے مشورہ دیا۔ "یہ جوتے زیادہ دیر نہیں چلیں گے اس لیے ان کا مزید سامان ساتھ لے لو۔"

اس نے ایسا ہی کیا۔ دس منٹ آرام کے بعد ہم دوبارہ چل پڑے۔ میں نے راج کنور سے پوچھا۔ "تمہیں کچھ اندازہ ہے کہ ہم کس سمت جا رہے ہیں اور آگے کیا ملے گا؟"

"آگے تو کچھ نہیں ہے، کسی زمانے میں قبائلیوں کی بستیاں ہوتی تھیں لیکن اب کچھ نہیں ہے۔ ہم نے یہاں جانور چرانے والوں پر بھی پابندی لگا دی۔"

"ہیروں کی کان کی وجہ سے؟"

اس نے سر ہلایا۔ "ابھی وہاں کام شروع نہیں ہوا ہے، سال کے چار مہینے کام ہوتا ہے اس دوران میں موسم بہتر رہتا ہے اس کے بعد کام روک دیا جاتا ہے۔"

مجھے ہیروں سے دلچسپی نہیں تھی اس لیے اسے ٹوک دیا۔ "میں نے پوچھا ہے آگے کیا ملے گا؟"

راج کنور نے سوچا اور سر ہلایا۔ "میرا خیال ہے کچھ دیر بعد ہمیں ایک سڑک ملے گی۔ یہ شمال سے آتی ہے اور اسٹیٹ کے پاس یہی سڑک ہے ہمیں جب شہروں کی طرف جانا ہوتا ہے تو اسی سے سفر کرتے ہیں۔"

"اس علاقے میں یہ ایک ہی سڑک ہے؟"

"نہیں سڑکیں تو اور بھی ہیں لیکن وہ پورے سال سفر کے قابل نہیں رہتی ہیں اور ان کی حالت بھی ٹھیک نہیں ہے ہائی وے کلاس کی یہ واحد سڑک ہے۔"

"اس کا مطلب ہے اس پر ٹریفک رہتا ہے۔"

"صرف بہت زیادہ برف باری کی صورت میں ٹریفک بند ہوتا ہے اور یہاں بہت زیادہ برف سال میں ایک دو بار ہی گرتی ہے۔"

"اس کا مطلب ہے کہ یہاں ٹریفک چل رہا ہوگا۔"

"بالکل۔"

"تب چلو، رات سے پہلے ہم سڑک تک پہنچ گئے تو وہاں سے لفٹ مل سکتی ہے۔"

"اس اسلحے کے ساتھ کوئی لفٹ نہیں دے گا۔" راج کنور نے ہمارے ہتھیاروں کی طرف اشارہ کیا۔

"فکر مت کرو ہمیں لفٹ لینا آتی ہے۔" میں نے کہا اور ہم آگے روانہ ہو گئے۔ اوشا اب بانو کے ساتھ چل رہی تھی اور راج کنور میرے ساتھ تھا۔ بعض مقامات پر بانو اوشا کو اور مجھے راج کنور کو سہارا دینا پڑتا تھا اگرچہ یہ مجھے ناگوار گزرتا تھا۔ راج کنور ان چند افراد میں سے ایک تھا جن سے میں شدید نفرت کرتا تھا اور میں نے فیصلہ کر لیا تھا کہ اگر اس کے چنگل سے نکلنے کا موقع ملا اور وہ میرے قابو میں ہوا تو اسے قتل کر دوں گا۔ وہ ایسا زہریلا ناگ تھا جس کا پھن پہلی فرصت میں کچل دینا ہی مناسب تھا ورنہ وہ آزاد ہوتے ہی آپ کو دوبارہ ڈسنے کی سعی کرے گا۔ ایسے فرد کو قیدی کی حیثیت سے بھی ساتھ رکھنا میرے لیے صبر آزما تھا۔ میں اپنی فطرت کے مطابق اس سے برا سلوک نہیں کر سکتا اور ایک ہی وار میں اسے ختم کرنے کی شدید خواہش پر عمل بھی نہیں کر سکتا تھا۔ اصل بات یہ تھی کہ جب تک اس کا وقت نہیں آجاتا اسے میں یا کوئی بھی ختم نہیں کر سکتا تھا۔

بلندی پر دھوپ تیز تھی اگرچہ موسم خنک تھا مگر ساتھ ہی خشک بھی تھا اور چلنے سے جسم کا پانی پسینے کی صورت میں خارج ہو رہا تھا اس لیے سب کو بار بار پیاس لگ رہی تھی۔ آنے والے ایک گھنٹے میں پانچ لیٹر پانی کی بوتل میں مشکل سے ایک لیٹر پانی بچا تھا۔ اب تک ہمیں پانی کا کوئی چشمہ یا ندی دکھائی نہیں دی تھی جہاں سے پانی لے سکتے اور کھانے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ صبر کے سوا کوئی چارہ بھی نہیں تھا۔ ابھی تک وہ سڑک نہیں آئی تھی جس کا راج کنور نے ذکر کیا تھا اور نہ ہی اس کے آثار دکھائی دیئے تھے۔ لیکن میں نے محسوس کیا کہ اب ہم بلندی سے نشیب کی طرف جا رہے تھے حالانکہ ہم نے نیچے کا رخ نہیں کیا تھا مگر یہاں پہاڑ کی بلندی کم ہو رہی تھی۔ میں نے ایک دو بار راج کنور کے سڑک

گرلز گائیڈ (Girls Guide)

لڑکیوں کا وہ نظام جو اسکاؤٹ لڑکوں کے نظام کے متوازی ہے۔ اس کو 1910ء میں لارڈ بیڈن پاؤل (B.Powell) اور اس کی بہن ایگنس (Agnes) نے مرتب کیا اور یہ تحریک بہت جلد تمام دنیا میں پھیل گئی۔ اس میں 7 سال سے لے کر 21 سال تک کی لڑکیاں بھرتی کی جاتی ہیں اور یہ نظام تین حصوں (براؤنی گائیڈز (7 تا 11 سال)، رینجر گائیڈ (14 تا 20 سال) اور بالغ گائیڈ (21 سال سے اوپر) پر مشتمل ہے.... ان کو اچھا شہری اور مفید رہنما بننے کی تربیت دی جاتی ہے۔ امورِ خانہ داری، انتظامِ خانہ اور ان سے متعلقہ سامان مہیا کرنا خاص طور پر سکھایا جاتا ہے اور بیرونِ خانہ مشاغل اور کیمپ کی زندگی سے بھی روشناس کرایا جاتا ہے اس کے بھی گروپ ہوتے ہیں، جن کے اوپر گروپ ماسٹر اور ڈسٹرکٹ ماسٹر ہوتے ہیں۔ پاکستان میں اس تحریک کا آغاز قائد اعظم محمد علی جناح کے کہنے پر محترمہ فاطمہ جناح کی سرپرستی میں 29 دسمبر 1947ء کو ہوا۔ 1948ء میں سوسائٹی ایکٹ XXI مجریہ 1860ء کے تحت اس کو رجسٹرڈ کروایا گیا۔ بعد ازاں 1960ء میں فیلڈ مارشل محمد ایوب خان، صدر پاکستان کے ایک آرڈی ننس کے ذریعے ایسوی ایشن کو مزید تحفظ فراہم کیا گیا اور حکومت کی جانب سے گرلز گائیڈ ایسوی ایشن کو قومی غیر سرکاری انجمن کا درجہ دیا گیا۔ گرلز گائیڈ تحریک کی بنیاد مذہب پر بھی رکھی گئی ہے اور کسی بھی مذہب کی پیروکار لڑکیاں اس تحریک کی رکن بن سکتی ہیں۔

مرسلہ: نائیلہ انجم، ژوب بلوچستان

فارابی (990-870ء)

ابوالنصر محمد بن محمد بن ترخان نام تھا۔ وہ ترکی النسل عظیم مسلمان فلسفی تھا۔ محمد نامی ایک ترک سپہ سالار کا بیٹا تھا۔ مغربی دنیا میں لاطینی شکل میں ALPHARA BIUS (الفارابیوس) کے نام سے مشہور ہے۔ اپنے وطن ایران کے ترکستان میں تحصیلِ علوم کے بعد قاضی کے عہدے پر مامور کیا گیا۔ فارابی نے عربی زبان قیامِ بغداد کے زمانے میں سیکھی۔ اسی زمانے میں اس نے منطق اور فلسفہ عیسائی فلسفی ابوبشر متا اور نحو ابوبکر بن السراج سے پڑھی۔ اور یوحنا بن حیلان سے بھی درس لیا جو خلیفہ المقتدر کے زمانے کے تنگ خیال پیشوایانِ دین فلسفیوں اور آزاد خیالی کے خلاف اقدامات کرتے رہتے تھے، ان سے فارابی ضرور متاثر ہوا ہوگا، چنانچہ بغداد چھوڑ کر شام چلا گیا۔ فارابی جب بغداد سے شام گیا تو وہ حمدانی خاندان کے امیر سیف الدولہ کے دربار میں حاضر ہوا جو حلب کا حکمران تھا۔۔۔ وہاں اس کی بہت عزت و تکریم ہوئی۔ اس کے باوجود فارابی نے اس امیر سے صرف چار درہم کا روزینہ قبول کیا تھا۔ الغرض فارابی نے سیف الدولہ کے سایۂ عاطفت میں بہت اعتبار اور شرف کی زندگی بسر کی۔ ایک بار وہ امیر کے ہمراہ دمشق گیا اور وہیں اس نے وفات پائی۔ وہ سکون، تنہائی اور عزلت میں بیٹھ کر کام کرنے کا عادی تھا۔ اکثر اوقات باغوں اور باغیچوں میں گشت کیا کرتا اور لوگوں میں ملنے جلنے سے گھبراتا تھا، وہ اپنی ایک نظم میں لکھتا ہے: ”میں اپنے گھر کے گوشۂ تنہائی میں بیٹھ گیا ہوں، کیونکہ میں نے یہ دیکھا کہ زمانہ اپنا سر زانو... پر جھکائے ہوئے ہے۔ صحبت سے کوئی فائدہ نہیں۔ جتنے لوگ بڑے بڑے رتبوں پر فائز ہیں، وہ سب غم واندوہ کا شکار ہیں اور ہر سر کسی نہ کسی درد میں مبتلا ہے۔“ اس نے بغداد، حلب اور دمشق میں، یہاں تک کہ مصر میں بھی ہمیشہ ترکی لباس اور وضع قطع قائم رکھی۔ فارابی کو، جو اسلامی فلسفے کا سب سے پہلا فلسفی ہے، نہ صرف مغرب کی علمی دنیا میں بلکہ مشرق میں بھی وہ شہرت نہیں ملی جو اس کے معنوی شاگرد ابن سینا اور ابن رشد کو حاصل ہے۔ علمی تفکر کا سلسلہ الکندی نے شروع کیا تو حقیقی علم کی بنیاد اسی ترکی الاصل نابغہ نے ڈالی تھی اور اسلامی مکتبِ فلسفہ کی اساس رکھنے کا شرف بھی اسی کو حاصل ہوا۔ فارابی خاص طور پر علم منطق کے ذریعے علم فلسفہ کا مطالعہ کرتا تھا۔ اور اس کے بعد مابعد الطبیعیات پر غور و فکر کرتا تھا۔ فارابی نے ارسطو کی تصانیف کے عربی ترجموں کی جس طرح شرح کی ہے، اس کی بدولت فلسفہ طبعی کی بجائے فلسفہ ذہنی کا آغاز ہوا۔ اسے علم طب سے بھی شغف تھا، مگر اس حد تک نہیں، جتنا ابن سینا اور ابن رشد کو تھا۔ بہرحال فارابی کو سب سے زیادہ دلچسپی مابعد الطبیعیات اور عقلی افکار سے تھی۔ وہ عربی زبان میں مشرقی مکتب فلسفہ کا بانی اور اسلامی فلسفے کا موجد شمار ہوتا ہے۔ اس نے ایسا ہم آہنگ اور مربوط نظامِ فلسفہ پیش کیا ہے کہ اس کے مقابلے میں کوئی اور نظامِ فلسفہ آسانی سے نہیں مل سکتا۔ یہ ہم آہنگی اور ارتباط کا دلدادہ ہونے ہی کا نتیجہ ہے کہ فارابی نے افلاطون اور ارسطو کا عمیق مطالعہ کرنے کے بعد یہ تسلیم کرنے سے انکار کر دیا کہ قدیم یونان کے ان دو فلسفیوں نے دو علیحدہ علیحدہ فلسفیانہ مسلک قائم کیے تھے، بلکہ یہ ثابت کرنے کی کوشش کی کہ نتیجے کے اعتبار سے وہ ایک ہی فلسفیانہ عقیدے کا التزام کرتے تھے۔ چونکہ فارابی نے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ یہ دونوں فلسفے بالکل ایک ہی ہیں، اس لیے مستشرقین نے اسے Syncretist کا خطاب دیا ہے جو حق بجانب ہے۔ چونکہ فارابی اور دیگر مسلمان فلسفیوں کے نزدیک یہ راستہ بہت صحیح اور مناسب ہے اس لیے وہ دوسرے مسلمان مفکرین کی طرح اپنی معلومات کو یکجا کر کے، ایک دوسرے سے مطابقت دینا اور ان میں ایک ہم آہنگی پیدا کرنا چاہتے ہیں۔ چنانچہ فارابی کو بھی مختلف نقطہ ہائے نظر کو یکجا کر کے ایک ”کل“ پیدا کرنے سے بے حد ذوق و انہماک ہے۔ اور اس ترکیبی ذہنیت کا فکر اس کے تمام اصول اور اسلوب میں بہت نمایاں طور پر نظر آتا ہے۔ مختلف نقطہ ہائے نظر کو ایک جگہ جمع کر کے ان سے ایک ”کل“ پیدا کرنے میں فارابی کے احساسِ تاریخی نے بھی اسے بہت مدد دی ہے۔ ہمیں بخوبی علم ہے کہ فارابی نے اپنے سے پہلے کے یونانی فلسفیوں، بالخصوص افلاطون اور ارسطو کی تصانیف کا بغور مطالعہ کیا تھا اور ترتیب اور تجزیے کی باہمی آمیزش سے وہ فلسفی مسلک پیدا کیا تھا، جسے فارابی کا نظریہ اتحادِ عقائد گونا گوں (syncretism) کہا جاتا ہے۔

مرسلہ: نیاز احمد ساہیوال

۔۔۔ کے بارے میں پوچھا تو وہ خود کنفیوز ہو گیا۔ ظاہر ہے اس نے کبھی ان راستوں پر سفر کر کے سڑک تک رسائی حاصل نہیں کی تھی۔ اس لیے وہ صحیح سے بتا نہیں سکتا تھا۔ البتہ اسے یقین تھا کہ سڑک اسی سمت تھی۔

مزید ایک گھنٹے بعد جب سورج واضح طور پر مغرب کی طرف جھک چکا تھا اور اس کی روشنی آنکھوں میں گھس رہی تھی۔ اس لیے بھی شاید سڑک اس وقت نظر آئی جب ہم اس کے پاس پہنچ گئے تھے بلکہ سڑک نہیں اس پر سے گزرنے والا ایک ٹرک دکھائی دیا تھا جس پر خشک بھوسا بھرا ہوا تھا لیکن وہ شمال کی طرف جا رہا تھا۔ بانو اور اوشا خوش ہو گئی تھیں کیونکہ بھوک کا فی الحال کوئی مداوا نہیں تھا۔ لیکن چل چل کر بھی برا حال ہو گیا تھا اور اس سے نجات ملنے کی امید نظر آئی تو وہ خوش ہو رہی تھیں۔ راج کنور دو مرتبہ اپنے ”جوتے“ تبدیل کر چکا تھا اور دونوں بار جوتے پھٹ چکے تھے دوسرے جوتے بھی سڑک تک پہنچتے پہنچتے جواب دے گئے۔ اس لیے وہ بھی خوش تھا کہ اب چلنے کے لیے کم سے کم ہموار سڑک تو ملے گی۔ سڑک کے پاس پہنچ کر سب ایک جگہ نرم سبز گھاس پر ڈھیر ہو گئے۔ میں اور بانو بھی تھک گئے تھے مگر اوشا اور راج کنور بے حال تھے وہ لیٹے تو جیسے نیم بے ہوش ہو گئے تھے۔ میں بیٹھا تھا اور بانو نیم دراز تھی۔ میں نے اس کی طرف دیکھا۔

”کیا حال ہیں؟“

”بھوک لگی ہے اور دل چاہ رہا ہے اچھا سا کھانا ملے اور اس کے بعد نرم بستر مل جائے۔“

”دونوں کا امکان کم ہے۔“ میں نے کہا اور کھڑا ہو گیا۔ ”اگر تم جاگتے رہنے کا وعدہ کرو تو میں ذرا چکر لگا آؤں۔“

”آپ کہاں جا رہے ہیں؟“

”اسی سڑک پر ذرا آگے تک جاؤں گا ممکن ہے کوئی گاڑی مل جائے یا پھر کوئی گھر نظر آ جائے۔ شام قریب ہے اور رات سے پہلے سر چھپانے کا کوئی ٹھکانا مل جائے تو بہتر ہوگا۔“

”ہاں کوئی آبادی یا گھر مل جائے تو وہاں سے کھانا بھی مل جائے گا۔ ہمارے پاس رقم بھی ہے۔“ بانو خوش ہو گئی۔

”رقم تو اتنی ہے کہ ہم فائیو اسٹار کا کھانا بھی افورڈ کر سکتے ہیں لیکن فی الحال کھانے کے لائق کچھ مناسب مل جائے تو یہ بھی غنیمت ہوگا۔“ میں نے روانہ ہوتے ہوئے کہا۔ ”ہوشیار رہنا اور بہتر ہوگا کنارے سے ذرا ہٹ جاؤ تاکہ کوئی اچانک آ جائے تو پکڑے نہ جاؤ۔ اگر کوئی مسئلہ ہو تو چھوٹے پستول سے فائر کرنا اس کی آواز زیادہ دور تک نہیں جاتی ہے لیکن میں سن لوں گا ہاں پیلس کے لوگ آ جائیں تو کوئی رعایت مت کرنا۔“

”ٹھیک ہے۔“

میں جنوب کی طرف بڑھا تھا۔ یہاں بل کھاتی سڑک ایک ٹیلے کے پیچھے غائب ہو رہی تھی۔ میں موڑ تک پہنچا تو سامنے دور تک پہاڑوں کے درمیان نشیب کی طرف جاتی سڑک دکھائی دی۔ یہاں ڈھلان تھی اور کہیں بھی آبادی کے آثار نظر نہیں آ رہے تھے۔ سڑک بھی خالی تھی یعنی دور تک کسی گاڑی کا نام و نشان نظر نہیں آ رہا تھا۔ میں ٹھنڈی سانس لے کر رہ گیا اس کا مطلب تھا کہ ہمیں مزید مارچ کرنا تھا اور فی الحال مارچ کی ہمت مجھ سمیت کسی میں نہیں تھی۔ آگے جانا بیکار تھا، میں تین چار کلومیٹرز چل کر جاتا اور کچھ نہ ملتا تو اتنا ہی واپس آنا پڑتا اس لیے بہتر یہی تھا کہ واپس چلا جائے اور سڑک کے کنارے کسی گاڑی کا انتظار کیا جائے اگر قسمت میں ہوا تو گاڑی مل جائے گی ورنہ رات شاید اسی ویرانے میں بھوکے پیاسے بسر کرنی پڑے گی۔ پیاسے یوں کہ اب پانی بھی ختم ہونے والا تھا اور ان پہاڑوں میں اب تک پانی کا کوئی ذریعہ نظر نہیں آیا تھا حالانکہ ہم شاید دس بارہ کلومیٹرز چلے تھے اور کئی خشک ندی نالوں سے گزرے۔ ابھی اوپر کہیں بارش نہیں ہوئی تھی اس لیے پانی نایاب تھا۔

میں واپس آ رہا تھا کہ شمال کی طرف سے ایک بڑی گاڑی نمودار ہوئی۔ پہلے میں اسے درمیانے سائز کا ٹرک سمجھا تھا۔ اس وقت ہمارے لیے کوئی چھکڑا بھی آ جاتا تو غنیمت تھا یہ تو پھر بھی مشینی سواری تھی۔ وہ خاصی دور تھی اور بہت سست روی سے آ رہی تھی۔ اس لیے مجھے تیز چلنے کی وجہ سے اس کی آمد سے پہلے واپس پہنچنے کا موقع مل گیا۔ بانو نے اس دوران میں راج کنور اور اوشا کو سڑک کے کنارے سے ذرا دور ہٹا لیا تھا۔ اس نے بھی آنے والی گاڑی کو دیکھ لیا تھا اور آنکھوں کے سامنے چھجا بنا کر غور سے دیکھ رہی تھی۔ اس نے اسلحہ ایسی جگہ چھپا دیا جہاں سے وہ خود فوری حاصل کر سکتی تھی لیکن راج کنور سے دور تھا ویسے بھی اوشا اس کی نگرانی کر رہی تھی۔ مجھے دیکھ کر اس نے کہا۔ ”شہباز صاحب ذرا دیکھیے گا یہ انوکھی گاڑی نہیں ہے عام گاڑیوں سے ہٹ کر۔“

گاڑی کا انوکھا پن اس کے نزدیک آنے پر واضح ہوا

تھا۔ یہ اصل میں سفری گھر تھا۔ طاقتور ڈاج پک اپ کے پیچھے تقریباً بارہ فٹ لمبا اور کوئی آٹھ فٹ چوڑا سفری گھر تھا۔ کیونکہ اس کی وجہ سے گاڑی خاصی لمبی اور وزنی ہوگئی تھی اس لیے وہ اس پہاڑی سڑک پر بہت سست روی سے سفر کر رہی تھی۔ یہاں تیز رفتاری کی وجہ سے یہ بے قابو ہوسکتی تھی۔ بانو اور میں نے اپنے ہتھیار چھپا دیئے اور صرف پستول پاس رکھے تھے۔ اوشا کا اعشاریہ اڑتیس کا پستول اب میرے پاس تھا۔ میں نے بانو سے کہا۔ ”ویسے تو امکان نہیں ہے کہ اس گاڑی میں دشمن ہوں گے لیکن پھر بھی پوری طرح ہوشیار رہنا، خطرہ محسوس کرتے ہی رائفل اور شاٹ گن اٹھانے کی کوشش کرنا۔“

گاڑی کے نزدیک آنے سے پہلے ہم سڑک پر آگئے تھے اگر ہم اچانک سڑک پر نمودار ہوتے تو شاید گاڑی والوں کے نزدیک مشکوک ہوجاتے اس لیے ہم ٹہلنے کے انداز میں سڑک پر موجود رہے تھے۔ میں نے بانو سے کہا۔ ”کہانی یہ ہوگی کہ ہماری گاڑی بے قابو ہوکر کھائی میں گر گئی لیکن خوش قسمتی سے ہم جان بچانے میں کامیاب ہوگئے۔ میں اور تم مسٹر اینڈ مسز کمار ہیں۔“

بانو سرخ ہوئی تھی پھر اس نے ان دونوں کی طرف اشارہ کیا۔ ”ان کے بارے میں کیا کہیں گے؟“

”راج کنور کا اصل نام ٹھیک رہے گا اور وہ ہمارا ایک واقف کار ہے۔ دشمن بھی تو واقف کار ہی ہوتا ہے اور اوشا کے لیے ملازمہ کا رول مناسب رہے گا۔“

”وہ مان جائے گی؟“ بانو نے دبے لہجے میں کہا۔

”کیوں نہیں مانے گی؟“

”آپ کے حوالے سے اسے اب بات بات پر اختلاف ہونے لگا ہے۔ میرے ساتھ ہوتی ہے اس لیے ہینڈل کرلیتی ہوں آپ کو نہیں بتاتی۔“

”تم فکر مت کرو اس نے اعتراض کیا تو میں اسے ہینڈل کرلوں گا۔“

گاڑی نزدیک آئی تو ڈاج پک اپ کے کیبن میں مجھے ایک جوڑا نظر آیا۔ مرد ڈرائیونگ سیٹ پر تھا اور عورت اس کے ساتھ بیٹھی تھی۔ میں اور بانو ان کو دیکھتے ہی ہاتھ ہلانے لگے تھے۔ میں نے سوچا تھا کہ اگر انہوں نے رکنے کا عندیہ نہیں دیا تو نزدیک آنے پر میں پستول نکال لوں گا۔ مگر اس کی ضرورت پیش نہیں آئی۔ ہمیں دیکھتے ہی پک اپ کی رفتار کم ہونے لگی۔ نزدیک آکر وہ رکی اور مرد نے کھڑکی سے سر نکال کر پوچھا۔ ”ہیلو.....کوئی مسئلہ ہے؟“

میں اس کی طرف آیا۔ ”مسئلہ سا مسئلہ، ہم دہلی سے یہاں تفریح اور شکار کے لیے آئے تھے، واپسی میں گاڑی حادثے کا شکار ہوگئی اس کے بریک فیل ہوگئے تھے اور ہم بڑی مشکل سے اس سے چھلانگ لگا کر بچ سکے تھے۔“

”اوہ! افسوس ہوا۔“ مرد نے کہا۔ ”سوری، میں نے تعارف نہیں کرایا۔ میں شیام کپور ہوں اور یہ میری پتنی رینا ہے۔ ہم آگرے میں رہتے ہیں۔“

میں نے ہندوؤں کے انداز میں دونوں ہاتھ جوڑے اور اپنا طے شدہ تعارف کرایا۔ شیام اور رینا لہجے سے پڑھے لکھے اور مہذب لگ رہے تھے۔ شکل صورت کے بھی اچھے تھے۔ کپور لوگ اصل میں شمال سے تعلق رکھتے ہیں اور ان کے خدوخال اور رنگ و روپ پٹھانوں جیسا ہوتا ہے۔ جیسے راج کپور فیملی کا تعلق پشاور سے تھا۔ شیام سرخ و سفید تھا لیکن رینا کی رنگت کی ملاحت بتا رہی تھی کہ اس کا تعلق وسطی جنوبی انڈیا سے تھا۔ رینا نیچے اتر آئی۔ اس پر شیام نے اسے گھورا لیکن کچھ کہا نہیں اور مجھ سے پوچھا۔ ”مسٹر وجے کمار میں تمہاری کیا مدد کرسکتا ہوں؟“

”ہمیں آگے کسی معقول جگہ تک لفٹ درکار ہے جہاں ہم کچھ سامان خرید سکیں اور آگے کے لیے ٹرانسپورٹ حاصل کرسکیں۔ حادثے میں سارا سامان بھی برباد ہوگیا۔“

شیام اور رینا نے ہماری کہانی تسلیم کرلی تھی اور شیام مدد پر بھی آمادہ ہوگیا تھا لیکن جب ہماری کہانی میں راج کنور اور اوشا کا اضافہ ہوا تو اچانک ہی شیام کے تاثرات بدل گئے تھے اس نے جلدی سے کہا۔ ”ایک منٹ مسٹر کمار، میں سوری کررہا ہوں۔ میں سمجھا آپ دو افراد ہیں لیکن آپ چار ہیں اس لیے آپ کسی اور سے لفٹ حاصل کرلیں۔“

”اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔“ میں نے اطمینان سے جواب دیا۔ ”آپ کی پک اپ ہی خاصی بڑی ہے اور پیچھے لگے گھر میں تو پورا قبیلہ آسکتا ہے۔“

اس نے نفی میں سر ہلانا جاری رکھا۔ ”میں ایک بار پھر سوری کرتا ہوں۔“

میں نے خوش خلقی سے کہا۔ ”اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا ہم آپ کے ساتھ جانے کا فیصلہ کرچکے ہیں۔“

”تم بدمعاشی کر رہے ہو۔“ شیام کا لہجہ بدل گیا۔ ”ہمیں نہتا اور عام فرد سمجھ رہے ہو۔“ شیام نے کہتے ہوئے پستول نکال لیا اور دروازہ کھول کر نیچے اتر آیا۔ لیکن

اسی لمحے بانو کی آواز آئی۔

”شیام جی کوئی حماقت مت کرنا ورنہ ودھوا ہوجاؤ گے۔“

بانو کے ہاتھ میں شاٹ گن اور اس کا رخ اپنی بیوی کی طرف دیکھ کر شیام دنگ رہ گیا تھا اور جب میں نے اس کے ہاتھ سے پستول لیا تو اس نے قطعی مزاحمت نہیں کی تھی۔ میں نے بانو سے کہا۔ ”ودھوا عورت ہوتی ہے اگر شیام جی کوئی حماقت کرتے تو رینا ودھوا ہوجاتی۔“

بانو نے اپنی غلطی تسلیم کرلی اور پوچھا۔ ”اگر عورت مر جائے تو ہندی میں اس کے شوہر کو کیا کہتے ہیں۔“

”میرا خیال ہے اصل میں مرد کو خوش قسمت ہی کہتے ہیں۔“ میں نے شیام کی تلاشی لی۔ شیام اور رینا اب پریشان تھے۔

”آپ لوگ کون ہیں؟“ رینا نے ہمت کرکے پوچھا۔

”ہم وہی ہیں جو آپ کو بتایا تھا۔“ میں نے شائستگی سے کہا۔ ”لیکن خاتون آپ کے شوہر وہ نظر نہیں آرہے ہیں جو دکھائی دیتے ہیں۔“

”پلیز! میں ان کی طرف سے معافی مانگتی ہوں۔“ رینا نے کہا۔ ”یہ جلد غصے میں آجاتے ہیں۔“

”آپ کو معافی مانگنے کی ضرورت نہیں ہے معافی ہم مانگیں گے جب آپ سے رخصت ہوں گے۔“

شیام عجیب نظروں سے میری طرف دیکھ رہا تھا۔ وہ چونکا۔ ”کیا مطلب؟“

”مطلب یہ کہ ہم تمہارے ساتھ چل رہے ہیں۔“

”زبردستی۔“

میں نے شانے ہلائے۔ ”جو تم چاہے سمجھ لو۔ اگر تم نے سمجھداری سے کام لیا تو تمہیں کوئی نقصان نہیں ہوگا اور اگر تم چاہو تو ہم اس رائڈ کا معاوضہ بھی ادا کریں گے۔“

بانو نے دیکھا کہ صورت حال میرے قابو میں ہے تو وہ اوشا اور راج کنور کو لینے چلی گئی۔ بانو نے رائفل اور شاٹ گن مجھے تھمائی اور پھر وہ تینوں براہ راست سفری ٹریلر میں چلے گئے۔ میں نے رینا سے کہا۔ ”دیوی جی آپ ٹریلر میں جائیں میں آپ کے پتی کے ساتھ بیٹھوں گا۔“

”ان کے ساتھ کیوں؟“

”ان کا غصہ بے قابو ہے اسے قابو میں رکھنے کے لیے۔“ میں نے شیام کی طرف دیکھا تو وہ ہونٹ کاٹ رہا تھا۔ یقیناً اسے خود پر قابو پانے میں خاصی دشواری پیش آ رہی تھی۔ رینا نے اسے دیکھا اور آنکھوں آنکھوں میں صبر کی تلقین کی اور خاموشی سے ٹریلر کی طرف چلی گئی۔ اس کے جاتے ہی شیام نے کہا۔

”تم اچھا نہیں کررہے ہو۔“

”مجھے تسلیم ہے لیکن مجبوری ہے۔“

”اگر تمہاری گاڑی کسی کھائی میں گرگئی ہے تو تم زبردستی دوسروں سے لفٹ لیتے پھرو اس میں مجبوری کہاں سے آگئی؟“ اس کا لہجہ تلخ ہوگیا تھا۔

”مجبوری یہ ہے کہ رات قریب ہے۔ ہمارے پاس نہ کھانے کو ہے اور نہ پینے کو۔ ہمارا واقف کار زخمی ہے اور ہم مدد کے مستحق ہیں۔ تم نے خود انکار کیا اور پھر پستول نکال لیا۔ تم نے خود ہمیں مجبور کیا کہ تمہارے ساتھ زبردستی والا سلوک کریں۔ اب اندر بیٹھو۔“

میں اس سے پہلے پک اپ میں سوار ہوگیا اور ڈیش بورڈ کی تلاشی لی۔ اس کے خانے میں کوئی اور ہتھیار موجود نہیں تھا۔ میں نے شیام کپور سے لیا پستول اپنے پاس رکھ لیا۔ شاٹ گن اور رائفل بھی تھی اور میں یہ سارے ہتھیار اٹھانے پر مجبور تھا۔ میں کچھ زیادہ ہی مسلح تھا۔ بانو کے پاس برنیٹا تھا اور وہی کافی تھا۔ وہاں راج کنور موجود تھا اور میں نہیں چاہتا تھا کہ اسے اتفاق سے ہتھیار حاصل کرنے کا موقع ملے۔ وہ بانو سے آسانی سے پستول نہیں چھین سکتا تھا۔ شیام نے پک اپ اسٹارٹ کی اور آگے بڑھائی۔ اس نے کہا۔ ”یہاں سے تیس کلو میٹرز نیچے ایک چھوٹا قصبہ ہے تم چاہو تو وہاں اتر سکتے ہو۔“

”اس کا فیصلہ ہم بعد میں کریں گے۔“

اس نے چونک کر میری طرف دیکھا۔ ”کیا مطلب! کیا تم اس سے آگے بھی ہمارے ساتھ جانا چاہتے ہو؟“

”میں نے کہا نا اس کا فیصلہ ہم بعد میں کریں گے۔“ میں نے سخت لہجے میں کہا تو وہ چپ ہوگیا۔ کچھ دیر بعد اس نے کہا۔

”سچ بتاؤ تم لوگ کون ہو؟“

”میرا خیال ہے ہم نے بتایا تو ہے۔“

”نہیں تم لوگوں نے غلط کہا تھا۔“

”تم اس چکر میں مت پڑو کہ ہم کون ہیں اپنی توجہ اس پر مرکوز رکھو کہ تم نے اپنی پیاری سی پتنی سمیت زندہ رہنا ہے اور اس کے لیے بہت ضروری ہے کہ تم ہم سے تعاون کرتے رہو۔ میں صرف اتنا اطمینان دلا سکتا ہوں کہ ہم سے تمہاری

جان، مال اور عزت کو کوئی خطرہ نہیں ہے۔"

اچانک ڈیش بورڈ کے سامنے والے حصے میں نصب ریڈیو کھڑکھڑایا اور اس سے بانو کی آواز آئی۔ "یہ میں ہوں، یہاں کھانے پینے کو سب کچھ ہے، میں بہت مزے کا دال چاول کھارہی ہوں، آپ کیا کھائیں گے؟"

شیام نے ریڈیو کا ایک بٹن دبایا اور بولا۔ "تم بات کرسکتے ہو۔"

"جو بھی کھانے کو ہو۔" میں نے کہا۔ "میں اس وقت پورا کچن کھا سکتا ہوں برتنوں سمیت۔"

بانو ہنسی۔ "بس تو دس منٹ رکیں میں کھالوں تو آپ پیچھے آجایئے گا۔"

"یہ شیام جی کچھ فرنٹ ہورہے ہیں اور ممکن ہے تنہائی پاکر بہک جائیں۔ ان کا کیا کرنا ہے؟"

"ان کی تنہائی میں دور کردوں گی۔" بانو نے روانی سے کہا اور پھر اسے احساس ہوا کہ وہ کیا کہہ گئی ہے تو اس نے جلدی سے تصحیح کی۔ "میرا مطلب ہے اسے میں دیکھ لوں گی۔"

میں نے بٹن آف کرکے کہا۔ "تم نے اچھا سسٹم نصب کیا ہوا ہے، کیا یہ صرف اسی گاڑی کی حد تک کام کرتا ہے؟"

"میں الیکٹریکل انجینئر ہوں۔" شیام نے انکشاف کیا۔ "میں نے ایف ایم ریڈیو کے ساتھ ایک مائک نصب کردیا ہے ایسا ہی ایک ریڈیو ٹریلر میں لگا ہوا ہے۔ اکثر رینا ٹریلر میں ہوتی ہے اور اسے رابطہ کرنا ہو تو اس سے بات کرلیتی ہے۔"

میں نے اس کی بات پر غور کیا۔ "اکثر....؟ کیا تم لوگ سفر میں رہتے ہو؟"

"نہیں۔" وہ دھیان سے ایک موڑ کاٹتے ہوئے بولا۔ اس پہاڑی علاقے میں وہ رفتار کو بیس کلومیٹر فی گھنٹا سے اوپر نہیں لے جارہا تھا۔ "گرمیوں کے چند مہینے ہم اس علاقے میں گزارتے ہیں۔ یہاں دولت مندوں نے گھر بنا رکھے ہیں۔ میرا کئی افراد سے کانٹریکٹ ہے۔ میں گرمیوں میں آکر ان کے گھروں میں الیکٹرانکس کی چیزوں اور سیکیورٹی کی مینٹی ننس کرتا ہوں۔ ہماری تفریح بھی ہوجاتی ہے اور کچھ آمدنی بھی ہوجاتی ہے۔"

"شہر میں تم جاب کرتے ہو؟"

"نہیں وہاں بھی میرا اپنا بزنس ہے ایک چھوٹی سی فرم ہے۔ اسی لیے تو دو تین مہینے کے لیے یہاں آسکتا ہوں ورنہ جاب کرنے والا کیسے نکل سکتا ہے۔"

اس نے اچھا سسٹم کیا ہوا تھا یہ ایسے علاقے میں [illegible] کام آتا جہاں موبائل سگنل نہ ہوں۔ دس منٹ بعد بانو نے ریڈیو پر گاڑی روکنے کو کہا۔ شیام نے گاڑی روکی۔ بانو اتر کر آئی اور اس نے میری سیٹ سنبھال لی۔ میں نے روانہ ہونے سے پہلے شیام کو خبردار کیا۔ "کوئی الٹا سیدھا خیال دل میں مت لانا ورنہ یہ تمہیں سیدھا کردے گی۔"

"آپ فکر نہ کریں۔" بانو نے اپنا برٹا نکال کر اس کا معائنہ کیا اور پھر اسے ہاتھ میں رکھا۔ میں ٹریلر میں آیا۔ یہ اچھا خاصا بڑا اور پرتعیش قسم کا ٹریلر تھا۔ ایک طرف بیڈ روم تھا جو عقبی حصے میں تھا۔ درمیان میں کچن اور مختصر سا واش روم تھا اور دوسری طرف لاؤنج تھا۔ یہاں چھوٹے صوفے اور ایک عدد ایل سی ڈی ٹی وی بھی لگا ہوا تھا۔ راج کنور اور اوشا لاؤنج والے حصے میں تھے۔ رینا کچن میں مصروف تھی۔ اس نے دال چاول بنائے تھے اور ساتھ میں آلو کی بھجیا اور اچار بھی تھا۔ میں نے سکون کا سانس لیا ورنہ میں سوچ رہا تھا کہ وہ ہندو تھے اور اگر کوئی ایسی چیز ہوئی جس میں گوشت ہوا اور میں نے کھانے سے انکار کیا تو وہ سمجھ جاتے۔ جب کہ میں اپنا مذہب اور قومیت فی الحال راز میں رکھنا چاہتا تھا۔ سفر میں دال چاول ہی سب سے آسان اور بہترین خوراک ہوتے ہیں۔ اس نے ایک بڑی ٹرے میں سب سجا کر میرے سامنے رکھ دیا اور خوفزدہ نظروں سے اسلحے کی طرف دیکھا۔

میں نے کھانے کا آغاز کیا اور راج کنور کی طرف دیکھا۔ "اب تم آرام سے ہو۔"

"ہاں لیکن ابھی ہم خطرے میں ہیں۔" اس نے دھیمے لہجے میں کہا۔

"وہ کیسے؟"

"اس علاقے سے باہر جانے والی یہ واحد سڑک ہے اور اس پر وہ لوگ موجود ہوں گے؟"

"تمہارا مطلب ہے بڑے کنور کے گرگے؟"

اس نے سپاٹ نظروں سے میری طرف دیکھا۔ "میرا خیال ہے وہ منشی جی اور رامن کے آدمی ہیں۔ تمہاری طرح میرا بھی یہی خیال ہے کہ بڑا کنور بے بس ہوگیا ہے۔ یہ لوگ اسے اپنے مقصد کے لیے استعمال کررہے ہیں۔"

"میں یہ بات سمجھنے سے قاصر ہوں۔ منشی جی محرم راز اور تم لوگوں کے بہت نزدیک سہی لیکن ہے تو ایک ملازم۔ وہ اس طرح سے سازش کیسے کرسکتا ہے؟"

"وہ کرسکتا ہے۔" راج کنور نے بے چینی سے پہلو

بدلا۔ اس نے اپنے زخموں کی دوبارہ مرہم پٹی کرلی تھی اور اس کے پیروں پر بھی پٹیاں لگی ہوئی تھیں۔ شرٹ کا خون بھی ممکنہ حد تک صاف کرلیا تھا یعنی وہ خاصی بہتر حالت میں تھا۔ "تم نہیں جانتے ہو منشی دل جی صرف ہمارا ملازم نہیں ہے وہ کنور خاندان کا ایک حصہ ہے۔"

میں حیران ہوا تھا۔ "وہ بھی کنور ہے؟"

راج کنور نے سر ہلایا۔ "رشتے میں وہ ہمارا چچا لگتا ہے۔"

میں اس کی بات پر غور کررہا تھا۔ یہ نیا انکشاف تھا اس کا مطلب تھا کہ وہ جاگیر کا مالک بھی بن سکتا تھا۔ جب میں نے راج کنور سے پوچھا تو اس نے تصدیق کی۔ "اگر میں اور بڑے کنور نہ رہیں تو وہ اس جاگیر کا مالک بن سکتا ہے۔"

"اس صورت میں بھی جب کہ تمہاری ایک بہن موجود ہے؟"

"ہاں۔" راج کنور نے پھر پہلو بدلا۔ "وہ جاگیر سے پہلے ہی دست بردار ہوچکی ہے۔"

اگرچہ مجھے اس سے کوئی فرق پڑتا تھا کہ یہ جاگیر کس کے پاس جاتی ہے اور کون اس کا مالک بنتا ہے۔ لیکن فی الحال اس سیاست کا مجھ پر سنگین اثر پڑ رہا تھا۔ اگر یہ بات درست تھی تو دونوں کنوروں کے ساتھ میں بھی منشی جی اور رامن کا نمبر ون نشانہ تھا اور وہ مجھے مارنے کی بھی ہر ممکن کوشش کرتے۔ مجھے بھی خطرے کا احساس ہونے لگا۔ میں نے کھانے سے فارغ ہوتے ہی رینا سے ریڈیو طلب کیا۔ اس نے مجھے پرانے موبائل کے سائز کا ریڈیو لاکر دیا اور اس کے فنکشن سمجھائے۔ میں نے کال کی اور شیام سے کہا۔ "اگر آگے کہیں ناکا نظر آئے تو تم فوراً گاڑی روک لو گے ناکے کے پاس نہیں جاؤ گے۔"

"تم پولیس ناکے کی بات کررہے ہو؟" وہ تشویش زدہ ہوگیا۔

"میں ہر قسم کے ناکے کی بات کررہا ہوں جہاں گاڑیوں کو روک کر چیک کیا جارہا ہو۔ بانو تم نظر رکھنا۔"

"ٹھیک ہے۔" اس نے جواب دیا۔ شام کے چھ بج رہے تھے اور سورج پہاڑوں کی طرف جھک چکا تھا۔ شام کے سائے تیزی سے طویل ہورہے تھے۔ کچھ دیر میں اندھیرا ہوجاتا اور اس میں سفر تو کیا جاسکتا تھا لیکن ناکوں پر نظر نہیں رکھی جاسکتی تھی۔ رینا نے چائے بنائی تھی۔ ہمارے شریفانہ رویّے سے اسے حوصلہ ہوا تھا اور اب وہ اتنی خوفزدہ نہیں تھی۔ اس نے اوشا کو ایک شال دے دی تھی کیونکہ رات ہوتے ہی سردی میں اضافہ ہوا تھا۔ اوشا خاموش تھی اور اس نے خود کو میرے سہارے پر چھوڑ دیا تھا۔ اب تک وہ اپنی ہمت سے بڑھ کر میرا اور بانو کا ساتھ دیتی آئی تھی مگر اب اس کی ہمت جواب دے رہی تھی۔ وہ تھکی ہوئی تھی میں نے اس سے کہا۔ "اوشا تم لیٹ جاؤ۔"

"نہیں رے ہم ٹھیک ہیں۔" وہ مسکرائی۔ "ہم تیرے لیے پریشان ہیں۔ منشی جی اچھا آدمی نہیں ہے۔ وہ ان دونوں کنوروں سے زیادہ خطرناک ہے۔"

"تم فکر مت کرو، میں اس سے پہلے بھی ایسے لوگوں سے نمٹتا رہا ہوں اور آگے بھی نمٹ لوں گا۔" میں نے اسے تسلی دی۔ "تم بیڈروم میں چلی جاؤ۔"

اوشا جانا نہیں چاہتی تھی لیکن میرے اصرار پر چلی گئی۔ میں خود بھی چائے نوشی کرتے ہوئے ریلیکس کررہا تھا۔ ٹریلر میں جہاں جہاں کھڑکیاں تھیں وہاں پردے بھی لگے تھے اس لیے اندر کا منظر باہر سے نظر نہیں آتا تھا اور باہر دیکھنے کے لیے بھی پردہ سرکانا پڑتا تھا۔ میں نے لاؤنج کا سامنے والا پردہ سرکا دیا تو پک اپ کے اوپر سے آگے کا منظر دکھائی دینے لگا تھا۔ ٹریلر میں ہم بلندی پر تھے اس لیے زیادہ بہتر دیکھ سکتے تھے۔ شاید اسی لیے مجھے وہ منظر پہلے نظر آگیا جو شیام اور بانو کچھ دیر بعد دیکھتے۔ کچھ آگے ایک جیپ ترچھی کھڑی تھی اور اس نے سڑک بلاک کردی تھی۔ میں نے جھپٹ کر ریڈیو اٹھایا اور بٹن دبا کر کہا۔ "بانو، شیام سے گاڑی رکواؤ آگے سڑک بلاک ہے ایک جیپ کھڑی ہے۔ بانو تم میری بات سن رہی ہو؟"

لیکن دوسری طرف سے خاموشی تھی۔ میرے بار بار پکارنے پر بھی دوسری طرف سے کوئی جواب نہیں آرہا تھا اور ہم سڑک پر کھڑی جیپ کے پاس ہوتے جارہے تھے۔ میرا دل خدشے سے دھڑکنے لگا تھا۔ بانو یا شیام جواب کیوں نہیں دے رہے تھے جب کہ وہ دونوں گاڑی میں دکھائی دے رہے تھے۔ اچانک پک اپ نے بریک لگایا اور میں سنبھلنے کی کوشش کرتے ہوئے لڑھک گیا تھا۔ راج کنور میرے پاس گرا تھا۔ میں سنبھل کر اٹھا تو میں نے دو افراد کو پک اپ کی طرف آتے دیکھا۔ ہیڈ لائٹس کی تیز روشنی میں دونوں صاف دکھائی دے رہے تھے اور ان میں سے ایک رامن تھا۔ اسی لمحے میری نظر راج کنور پر گئی جو شیام کا گر جانے والا پستول اٹھا رہا تھا۔

(جاری ہے)

بیت بازی

قارئین

(ولی محمد، لاڑکانہ کا جواب)

نسیم برلاس..........کراچی

ہر اہلِ دل کے واسطے سقراط کی طرح
لے کر پیالہ زہر کا دنیا کھڑی رہی

فیض لاشاری..........لاڑکانہ

ہم نشیں خستہ خراب آنکھوں سے
دے کے دل کا جواب آنکھوں سے

محمد فاخر..........لڈن وہاڑی

ہر ذرّہ خاکی کو کرن ہم نے بنایا
مٹی کو لہو دے کے چمن ہم نے بنایا

ارشد علی..........سلطنت اومان

ہر شعلہ گر عہد ظلمت انجام سے اپنے ڈرتا ہے
جب ذکرِ سحر محفل میں چھڑا کچھ شمع کی لو تھرا ہی گئی

آصف جاوید..........کراچی

ہر کسی دل میں برائی نہ ٹٹولو یارو
اپنے دامن پہ لگے داغ تو دھولو یارو

ضیاالدین..........خان پور

ہمارے گھر کی دیواروں پہ ناصر
اداسی بال کھولے سو رہی ہے

(عفت سحر کراچی کا جواب)

تانیہ عامر..........لاہور

مجھ کو گونگا سمجھ رہے ہیں لوگ
اب تو کچھ بولنا ضروری ہے

(احمد جاوید، فیصل آباد کا جواب)

نعیم بریں......لاہرو

نگار صبح کو پہنچے سلام مشتاقاں
کہ شب طویل بھی افسردہ بھی سیاہ بھی ہے

وقار وٹو..........لاہور

نہ جانے کتنے چراغوں کا خوں ہوا ہوگا
نہیں ہے سہل کسی دل کو بے وفا کہنا

ڈاکٹر روبینہ، نفیس ثاقب..........بکھر

نمو کا رشتہ عجب ہے کہ زخمِ شاخ کے ساتھ
امید پھول کی صورت میں جلوہ گر ہوگی

(نیاز علی لاہور کا جواب)

نرجس کمال..........خان پور مہر

روح کے نیم وا دریچوں سے
خاموشی جھانکتی ہے جب دیکھو

(افضا احمد مریدکے کا جواب)

نوروز افضال..........فیصل آباد

میرے سینے میں دل نہ رکھتا وہ
ایک پتھر ہی کاش رکھ دیتا

نازی حسن خان..........کوئٹہ

میں تو شرمندہ ہوں اپنے نامہ اعمال سے
کس لیے آئی جہاں میں کیا کیے جاتی ہوں میں

مرزا امین..........کراچی

منزلِ عقلِ جنوں رنگ اُسے ملتی ہے
جس نے اک بار رہِ عشق میں ٹھوکر کھائی

اکرم شیخ..........چنیوٹ

مے خانے کی توہین ہے رندوں کی ہتک ہے
کم ظرف کے ہاتھوں میں اگر جام دیا جائے

محمد واصف..........حاصل پور

متاعِ درد لٹ گئی پہ اے مال کی طرح
لبوں پہ آہ رہ گئی فقط سوال کی طرح

اشرف علی..........ڈی آئی خان

میں فنا ہوگیا افسوس وہ بدلا بھی نہیں
میری چاہت سے بھی کچی رہی نفرت اس کی

(سلیم کامریڈ کھاناں کا جواب)

نائیلہ فرحت..........ملتان

نہیں ہم دو جہاں کے کارخانے کے اگر مالک
ہمارے واسطے پھر یہ سزائے دو جہاں کیوں ہے

زاہد مظہر خان..........کراچی

نظر اٹھاؤ نہ جنبش کرو نہ آہ بھرو
دیا ہے آپ نے کچھ ہم کو ضابطہ ایسا

شمروز خان..........جیکب آباد

نظروں میں ہے مغائرت چہرے پہ بے رخی سی ہے
آج ادا ، ادا تیری غیر سی اجنبی سی ہے

اظفر خان..........میرپور

نہ جانے کون سا آنسو کسی لمحے کیا کہہ دے
ہم اس خیال سے نظریں جھکائے بیٹھے ہیں

(عظمت علی ایم کام سمرسٹہ کا جواب)

زوریز عالم..........حیدرآباد

دل ہے تو کہیں نذر کرو کام تو آئے
سر ہے تو کسی در پہ جھکا کیوں نہیں دیتے

(شاکر عطرے خان ڈیرا مراد جمالی کا جواب)

حسن عالم خان..........حیدرآباد

یوں جنوں بڑھ گیا یوں خرد گھٹ گئی
دل پہ غالب ہوئے جب سے رنج و محن

ارشد آفاقی..........مظفر گڑھ

یہ اور بات کہ میری نظر میں جچ نہ سکے
وگرنہ تم سے حسیں تو نگر نگر میں ہیں

(محمد عقیل چٹھہ حافظ آباد کا جواب)

ندا امتیاز..........حافظ آباد

آرزو جس کی عمر بھر کی تھی
ایسے لمحے وبال گزرے ہیں

احمد جاوید..........سکھر

اپنا ایمان یوں تو کامل ہے
تجھ پہ ہو اعتبار نا ممکن

ندیم احسن..........کراچی

آس پاس کوئی گاؤں نہ دریا اور بدریا چھائی ہے
شام بھی جیسے کسی پرانے سوگ میں ڈوبی آئی ہے

ناصر سید..........کراچی

اے کہ کرنوں سے تری اپنے سیہ خانوں میں
چاند کا نور ستاروں کی چمک باقی ہے

(منظر علی خان لاہور کا جواب)

فراز احسن..........خیرپور میرس

دیر اتنی کہ ستاروں کو سلایا تم نے
اتنی عجلت ہے کہ سورج کو جگا ڈالو گے

ناہید وقار صدیقی..........کراچی

دیپ یادوں کے جلائے رکھنا
اشک پلکوں پہ سجائے رکھنا

(آفاق احمد فیصل آباد کا جواب)

رانا حبیب الرحمٰن..........کوٹ لکھپت

لے کے ڈوبا ہے ہمیں تفرقہ رنگ و نسب
چاہے ہم کچھ بھی نہ ہوتے مگر انساں ہوتے

عقیل تبسم..........لاہور

لوگ مرتے ہیں زندگی کے لیے
زندگی ہے عذاب پھر بھی سحر

بتول..........لاہور

اشک باری ہے آہ وزاری ہے
زندگی کیا ہے بے قراری ہے

نوشین ابرار..........لاہور

آج ملک میں کیوں ہے بھائی بھائی کا دشمن
نفرتیں دلوں میں ہیں تلخیاں بہت سی ہیں

بہزاد علی خان..........کراچی

جذبوں کا سمندر میرے ہونے سے رواں ہے
اے بوڑھی صدی دیکھ میری سوچ جواں ہے

(نرجس علی سید لاہور کا جواب)

احمد علی..........نوشہرو

کسی سے پوچھ لو جا کر وہ اپنا ہو کہ بیگانہ
خوشی میں ساتھ دیتا ہے شریک غم نہیں ہوتا

ثریا زیبا..........کراچی

کس کے آنے کی بات کرتے ہو
ہم کو نسبت ہے صرف اک تم سے

بیت بازی کا اصول ہے جس حرف پر شعر ختم ہو رہا ہے اسی لفظ سے شروع ہونے والا شعر ارسال کریں۔ اکثر قارئین اس اصول کو نظر انداز کر رہے ہیں۔ نتیجتاً ان کے شعر تلف کر دیے جاتے ہیں۔ اس اصول کو مد نظر رکھ کر ہی شعر ارسال کریں۔

علمی آزمائش 95
30 اکتوبر 2013ء

میرے خیال سے اس مرتبہ دریافت کی گئی شخصیت کا نام .... ہے۔

نام: ....

پتا: ....

انعام یافتہ ہونے کی صورت میں مجھے جاسوسی ☐ سسپنس ☐ پاکیزہ ☐ سرگزشت ☐ بھجوایا جائے
کسی ایک پر ☑ کیجیے۔

کوپن کے ہمراہ اپنے جوابات مورخہ 30 اکتوبر 2013ء تک علمی آزمائش 95 پوسٹ بکس نمبر 982 کراچی 74200 پر ارسال کریں۔

علمی آزمائش۔ 95

ادارہ

ماہنامہ سرگزشت کا منفرد انعامی سلسلہ

علمی آزمائش کے اس منفرد سلسلے کے ذریعے آپ کو اپنی معلومات میں اضافے کے ساتھ انعام جیتنے کا موقع بھی ملتا ہے۔ ہر ماہ اس آزمائش میں دیے گئے سوال کا جواب تلاش کرکے ہمیں بھجوائیے۔ درست جواب بھیجنے والے پانچ قارئین کو ماھنامہ سرگزشت، سسپنس ڈائجسٹ، جاسوسی ڈائجسٹ اور ماھنامہ پاکیزہ میں سے ان کی پسند کا کوئی ایک رسالہ ایک سال کے لیے جاری کیا جائے گا۔

ماہنامہ سرگزشت کے قاری ''یک صفحی سرگزشت'' کے عنوان تلے منفرد انداز میں زندگی کے مختلف شعبوں میں نمایاں مقام رکھنے والی کسی معروف شخصیت کا تعارف پڑھتے رہے ہیں۔ اسی طرز پر مرتب کی گئی اس آزمائش میں دریافت کردہ فرد کی شخصیت اور اس کی زندگی کا خاکہ لکھ دیا گیا ہے۔ اس کی مدد سے آپ اس شخصیت کو بوجھنے کی کوشش کریں۔ پڑھیے اور پھر سوچیے کہ اس خاکے کے پیچھے کون چھپا ہوا ہے۔ اس کے بعد جو شخصیت آپ کے ذہن میں ابھرے اسے اس آزمائش کے آخر میں دیے گئے کوپن پر درج کرکے اس طرح سپرد ڈاک کیجیے کہ آپ کا جواب ہمیں 28 اکتوبر 2013ء تک موصول ہو جائے۔ درست جواب دینے والے قارئین انعام کے مستحق قرار پائیں گے۔ تاہم پانچ سے زائد افراد کے جواب درست ہونے کی صورت میں بذریعہ قرعہ اندازی انعام یافتگان کا فیصلہ کیا جائے گا۔

اب پڑھیے اس ماہ کی شخصیت کا مختصر خاکہ

ڈیرا غازی خان کے رہائشی تھے۔ غضب کی شاعری کرتے تھے ایک فلم کے گانے بھی لکھے۔ 7 سے زائد مجموعے مقبول ہوئے۔ وفاقی حکومت نے پرائیڈ آف پرفارمنس بھی دیا۔ دہشت گردی کا شکار ہو کر اجل کو لبیک کہا۔

علمی آزمائش 92 کا جواب

جسٹس ایم آر کیانی **1902**ء میں شاہ پور کوہاٹ میں پیدا ہوئے۔ گورنمنٹ کالج لاہور سے ایم اے کیا اور **1949**ء میں چیف جسٹس بنے غضب کے بذلہ سنج تھے۔ آپ کے خطبات ''افکار پریشاں'' کے نام سے شائع ہوا۔ **15** نومبر **1962**ء کو چاٹگام مشرقی پاکستان کے دورہ میں انتقال ہو گیا۔ آبائی گاؤں شاہ پور میں دفن ہوئے۔

انعام یافتگان

1۔ سعید قائم خانی، حیدرآباد **2**۔ احمد جاوید، کراچی **3**۔ نیاز وٹو، فیصل آباد

4۔ نسیم احمد، لاہور **5**۔ فصاحت لاشاری، سکھر

ان قارئین کے علاوہ جن لوگوں کے جوابات درست تھے۔

کراچی سے احمد توفیق، سعید احمد، ثانیہ احسن، سنجیدہ احمر، امیر الاسلام، محمد فیضان، آفتاب منصور، طارق حبیب، جمیل عثمانی، احسن خان اچکزئی، اختر بلقیس کوکب، انوار علی شاہ، ثناء اللہ بخاری، اختر عباس، نعمت مرزا، جاوید اقبال، اقبال احمد چشتی، منظر خان، نعیم اختر، فیضان انصاری، ڈھوڈا مل، فیض مسیح، اختر حسین۔ لاہور سے نادر شاہ، سلیم درانی،

ثناء اللہ بخاری، شاہینہ بتول، کوکب گردیزی، چوہدری نیاز مسلم خان، فیض ملک، بہادر خان، زینت انصاری، شہباز خان، نذیر مرزا بیگ، ثاقب خان، کمال حسن، ماسٹر فیض محمد، انوار شاہ، مسز نادر شاہ، انور کلیم شاہ، یوسف خان، سلمان زیدی، فلک شیر، ابراہیم شاہ، پہلوان اختر، نگار ملک، فیض الحسن، مرزا یوسف۔ اسلام آباد سے فلک شیر، انعم بٹ، نادر ملک، ذوالقرنین، بلال مصطفی، شریف الحسن شاہ صلاح الدین، اسلم خان، مہر خان، محمد مصطفیٰ، اصغر عباس، نعمت شاہ، شگفتہ ملک، شیخ اسلام، شبیر زیدی، سید محمد متقی، اختر خان اچکزئی، شرف الدین۔ راولپنڈی سے نصرت حسین، افتخار الدین، شاہد خان، ملک نوروز، عدنان سعیدی، راجا سعید، غضنفر عباس، ابرار الحسن، شریف شاہ، صالح الرحمن، نعمان سید عباس جھکری، قاسم جان، انور علی انور، فیاض خان بلبل، مرزا یاسین۔ ملتان سے زین اسلام، زینت خان، قیام الدین، خلیل الرحمن، سعید بخش، شہزاد علی، سلطان شاہ، باقر علی زیدی، نوازش ملتانی، عابدہ کلثوم، زینت جہاں، زینب شفیق، شیریں عدنان، زہیب سلطان، ملک ممتاز مستر۔ پشاور سے کلیم الدین، شیر خان، بشیر فاروقی، مولانا ریاض الحسن، قاسم خان، احمد مجاہد، فقیر خان، قیام خان، مرتضی زیدی، فہیم عباس پہلوی۔ کوئٹہ سے تقی چنگیزی، فرید خان، مستقیم اللہ، مفتی کاظمی، عائشہ بختاور، خاقان عباس، ارباب اچکزئی، فیاض ناصری، شہید حسین۔ جہلم سے نعمت اللہ خان، ابرار شیخ، جاوید محمد خان، محمد سہیل، حلیم اللہ خان، یاسمین، محمد ندیم، کاظم بیگ، ارتضیٰ حسین، مانک چند سندھی، عباس خان۔ منڈی بہاؤ الدین سے زاہد علی، تاثیر حسین۔ حیدرآباد سے نیاز ملکانی، سعید انصاری، فتح خان، منا، ریاض، سبط جعفر خاقانی، انوار علی، عماد یاسر، عدنان ختنائی، افروز جہاں، ثمینہ ملک، جعفر حسین۔ سیالکوٹ سے ندیم ڈڈیال، منظر خان، درویش خان، محمد مظہر، سید محمد میثم رضوی، سبط حسن باقری، اکبر خان۔ سرگودھا سے اظہر یونس، بابو سلام بنگالی، نوید ہاشمی، رانا ظفر اقبال، نوشین فاطمہ، منظر حسین، نصیر عباس، نصرت افروز، کلیم اللہ چغتائی، ارباز خان، خاقان عباسی۔ کوہاٹ سے نسیم شاہ، فدا حسین، امجد خان، ملک سفیر، نیاز ملکانی۔ ڈی آئی خان سے ارشاد حسین جعفری، فہیم الدین، خان محمد خان۔ رحیم یار خان سے فضل عباس، افضال میو، نسیم شاہ ملک فیروز الدین، ارشد محمود، ثنا بتول، محمد سراج الدین، عمر مقصود، ایم اے شاہد، علی عباس، طاہر خادم، فیاض بلوچ، عثمان علی خان، محمود اشرف، نصرت خاتون، نیاز احمد نیازی، سید عدنان، ذاکر علی خادم، راؤ خرم علی، عطیہ نفیس، نورین تبسم، سائرہ ممتاز، شاہانہ زاہد۔ نارووال سے سید جرار حیدر، حاجی خان، عطاالرحمن، ندیم بیگ، مقصود حسین، ملک فیاض، نسرین ملک، شیخ مقصود، عمران امتیاز، افتخار عمران۔ نوشہرا سے عاصم ہاشمی، خالد نسیم میمن، عبدالسنان، ہادی علی قادر خان، نصرت پرویز، نوید علی خان، ظفر بنگش، امجد علی امجد، سراج شیخ۔ اوکاڑہ سے مرزا رسیہ، جاوید آصف، محمد علی، جاوید آصف، محمد عثمان، اشفاق حسن، نیاز احمد، مس کوئل خان، انتظار حسین، فہمیدہ شیخ۔ سیالکوٹ سے رحیم گل، امینہ خان، فواد حسن۔ بہاولنگر سے حفیظ محمد، احمد نسیم، ارشد علی خان، علی خواجہ، عباس احمد، فصیح الدین، نسیم سلطان، فاطمہ حسن، فضل علی۔ گوجرانوالہ فخر الحسن، محمد ابراہیم، جمیل حیدر، آفاق احمد واسطی۔ میرپور خاص سے جمیل حیدر، نقی مصطفیٰ، محمد احمد نسیم، آفاق احمد، محمد عامر۔ حافظ آباد سے چوہدری ممتاز، جاوید اقبال، شجاعت علی، نوید احمد۔ میانوالی سے ولید احمد، سلمان سیفی، فرقان رفیق۔ بہاولپور سے سعادت علی خان، الطاف احمر، راحیل احمد، جمیل خان، فیروز خان، عابد حسین شیخ، نثار عباس دیاتی، عاصم ملک۔ فیصل آباد سے عون محمد، مہرین انجم، نرگس ناز، عمیر یونس، راجا محمد زبیر، الطاف قریشی، رفیع محمد، شمائلہ، عروج اقبال، امجد خان۔ نصیر آباد سے۔ ظفر گڑھ سے ثمینہ ممتاز ارشاد کھوکھر، عائشہ۔

ممالک غیر سے اسلم اشفاق آسی، بریڈ فورڈ (یوکے)۔ حیات محمد وٹو، ٹورنٹو (کینیڈا) ایم اسماعیل، انٹاریو (کینیڈا)، اشفاق احمد، یاسمین ملک، عباس کیانی، العین (یو اے ای)، سلطان محمد (کویت)۔ ناصر خان، ضیاء عباس طوری بنگش، شارجہ (یو اے ای)

میرا بھائی

محترمہ عذرا رسول صاحبہ
میں نے سرگزشت میں شائع ہونے والی بہت سی کہانیاں، واقعات، روداد اور سرگزشت پڑھی ہیں۔ میں اس لیے ان واقعات کو پڑھتی ہوں کہ دوسروں کا درد سامنے آتا ہے۔ اس بار ڈرتے ڈرتے میں بھی اپنی سرگزشت بھیج رہی ہوں گوکہ یہ مکمل طور پر میرے بھائی کی سرگزشت ہے جو اب اس دنیا میں نہیں ہے۔ آخر میں ایک التجا ہے کہ پلیز میرا اصل نام شائع نہ کریں۔

شازی
(کراچی)

مجھے اپنی آنکھوں پر یقین نہیں آیا تھا۔ وہ کامی ہی تھا۔ مجھے لگا جیسے میں خواب دیکھ رہی ہوں۔ وہ کامی کیسے ہوسکتا تھا؟ کامی تو اس وقت غائب ہوگیا تھا جب وہ صرف سولہ سال کا تھا اور میٹرک کا طالب علم تھا۔ آج اس واقعے کو چھ سال گزر چکے تھے۔ بات یہ نہیں تھی کہ مجھے کامی کے ملنے کا یقین نہیں تھا۔ ناقابلِ یقین وہ کام تھا جو کامی نے کیا تھا اور جس کی وجہ سے صرف میں ہی نہیں وہاں موجود بہت سے لوگ متوجہ تھے اور پھر بھاگ کھڑے ہوئے تھے۔ میں اپنے تین سالہ بیٹے شازیب کو اسکول سے لینے جارہی تھی۔ اسی مہینے اسے اسکول میں داخل کرایا تھا۔ صبح جہانزیب اسے اسکول چھوڑ جاتے تھے اور دوپہر میں، میں جاکر لے آتی تھی۔ اسکول زیادہ دور نہیں، نارتھ ناظم آباد کے ایچ بلاک میں ہماری رہائش کے نزدیک ہی تھا۔ میں اس چھوٹے سے بازار سے گزر رہی تھی۔ جب ایک بائیک پر دو افراد ایک دکان کے سامنے رکے۔ حالانکہ ڈبل سواری بند تھی۔ مگر لوگ چھپ چھپا کر اس پابندی کی خلاف ورزی کرتے ہیں اس لیے کسی نے توجہ نہیں دی۔

دو افراد میں سے ایک بائیک پر بیٹھا رہا اس نے ہیلمٹ لگا کر رکھا تھا دوسرا دکان کے اندر گیا۔ یہ موبائل فون شاپ تھی۔ میں سڑک کے دوسری طرف عین دکان کے سامنے تھی جب میں نے فائرنگ کی آواز سنی اور پھر دوسرا دکان سے بھاگتا ہوا باہر آیا۔ اس نے خاکی رنگ کی پتلون اور سرمئی شرٹ پہن رکھی تھی۔ اس کے ہاتھ میں پستول تھا۔ فائرنگ کی آواز کے ساتھ ہی آس پاس افراتفری مچ گئی تھی اور لوگ بھاگ رہے تھے۔ میں بھی بھاگ جانا چاہتی تھی لیکن جب میں نے اسے دیکھا تو میرے قدم وہیں جم گئے تھے۔ وہ کامی تھا میرا اکلوتا بھائی۔ مجھے یقین نہیں آرہا تھا..... وہ بائیک پر بیٹھا اور پھر اس نے میری طرف دیکھا۔ اس کے چہرے پر جو تاثرات آئے تھے ان سے مجھے یقین ہوگیا کہ وہ کامی تھا۔ جس طرح میں نے چھ سال بعد اسے پہچان لیا تھا اسی طرح اس نے بھی مجھے پہچان لیا تھا۔ اس نے اپنے ساتھی سے کچھ کہا لیکن اس نے نفی میں سر ہلایا اور جب تک میں نے تڑپ کر سڑک پر قدم رکھا اس نے بائیک دوڑا دی تھی۔ میں بے ساختہ چلائی۔

''کامی رک جاؤ.....''

یقیناً بائیک چلانے والے نے میری آواز سنی تھی۔ مگر بائیک کی رفتار تیز ہوتی چلی گئی اور میں بے بسی سے کامی کو دور ہوتا دیکھ رہی تھی۔ اس نے مڑ کر مجھے دیکھا اور پھر بائیک گھوم کر مین روڈ کی طرف چلی گئی۔ اچانک مجھے ہوش آیا۔ میں سنسان سڑک پر کھڑی تھی۔ فائرنگ ہوتے ہی سڑک آن واحد میں خالی ہوگئی۔ دکانوں کے شٹر گرا دیے گئے تھے اور لوگ ذیلی گلیوں میں گھس گئے۔ جس کو جہاں پناہ ملی وہاں چھپ گیا۔ پوری سڑک پر صرف میں کھڑی تھی۔ اب ہونا تو یہ چاہیے تھا کہ میں فوری وہاں سے روانہ ہوجاتی لیکن اس کے بجائے میں سڑک پار کرکے دکان کی طرف بڑھی۔ یہ پوش علاقہ تھا اس لیے یہاں دکانیں بھی اعلیٰ معیار کی تھیں۔ شیشوں سے مزین اس دکان کا فرنٹ ڈور بھی شیشے کا تھا اور وہ بند تھا۔ میں نے ڈرتے ڈرتے اندر جھانکا تو کاؤنٹر کے عقب میں ایک شخص زمین پر اوندھے منہ پڑا تھا اس کا صرف سر نظر آرہا تھا اور اس کے آس پاس تیزی سے خون پھیل رہا تھا۔

میں نے بہ مشکل اپنی چیخ روکی۔ کامی نے دکان والے کو شوٹ کردیا مگر کیوں.....؟ اس کا انداز کسی پیشہ ور ٹارگٹ کلر کا تھا۔ وہ اور اس کا ساتھی سب طے کرکے آئے تھے۔ انہوں نے ایک منٹ سے بھی پہلے اپنا کام کیا اور وہاں سے نکل گئے۔ اچانک مجھے احساس ہوا کہ میں کہاں کھڑی تھی۔ پولیس یہاں آسکتی تھی یا کوئی اور آجاتا اور مجھے روک لیتا تو میں مصیبت میں پھنس جاتی۔ میں تیز قدموں سے چل پڑی۔ دو گلیاں کراس کرنے کے بعد میں نے ذرا اطمینان محسوس کیا۔ یہاں چہل پہل تھی۔ اگر لوگوں نے فائرنگ کی آواز سنی بھی تھی تو ان کو پتا نہیں تھا کہ دو گلی پیچھے کیا ہوگیا اور کرنے والا کون ہے۔ یہ بات سوائے میرے کوئی نہیں جانتا تھا۔ میں نے شازیب کو اسکول سے لیا اور گھر کی طرف روانہ ہوگئی۔

☆☆☆

جب میں ذرا بڑی ہوئی تو مجھے شدت سے احساس ہوا کہ میرا کوئی بہن یا بھائی نہیں تھا۔ میں امی سے لڑتی تھی کہ مجھے بھی بہن بھائی لاکر دیں۔ وہ مجھے بہلاتیں کہ ابھی اللہ نے میرے لیے بہن بھائی بنایا نہیں ہے جیسے ہی بنائیں گے دنیا میں بھیج دیں گے۔ امی ابو دونوں کی طرف سے خاصا بڑا خاندان تھا یعنی میرے کئی چچا، پھپھیاں، ماموں اور خالائیں تھیں۔ سب شادی شدہ تھے اور سب کے گھروں میں کئی کئی بچے تھے۔ بس ہمارے ہاں میں اکیلی تھی۔ میں بھی شادی کے پانچ سال بعد پیدا ہوئی تھی۔ اس سے پہلے کئی بار ایسا ہوا کہ امی امید سے ہوئیں اور معاملہ وہیں ختم ہوگیا۔ امی ابو دونوں کو اولاد کی شدید خواہش تھی۔ ابو نے علاج میں کوئی کسر نہیں چھوڑی تھی۔ بالآخر میری باری میں ان کی خواہش پوری ہوئی لیکن جب تک میں دنیا میں نہیں آئی دونوں کو خدشہ لگا رہا تھا کہ میں بھی بچتی ہوں یا نہیں۔ پھر میں بچ گئی تو امی ابو کی خوشی کا اندازہ کیا جاسکتا تھا۔

مجھے پاکر وہ اتنے خوش ہوئے کہ مزید اولاد کا خیال دل میں آیا ہی نہیں۔ مگر جب میں تین چار سال کی ہوئی تو مجھے شدت سے احساس ہونے لگا کہ میں اکیلی ہوں، میرا

کوئی بہن یا بھائی نہیں ہے۔ میں امی سے ضد کرتی کہ مجھے بہن بھائی چاہیے۔ تب امی ابو نے اس بارے میں سوچا۔ خواہش تو ان کی بھی یہی تھی کہ ان کی کئی اولادیں ہوں لیکن وہ ڈرتے تھے کہ کہیں خوشی آتے آتے چھن نہ جائے۔ اولاد کے چھن جانے کا دکھ صرف ماں باپ ہی سمجھ سکتے ہیں۔ مگر پھر میری خوشی کی خاطر انہوں نے دوسرے بچے کا فیصلہ کیا۔ اس بار اللہ نے کرم کیا اور سب آسانی سے ہو گیا...

بہ قول امی کے کامی اتنا شریف بچہ تھا کہ اس نے انہیں کوئی تکلیف نہ ہونے دی۔ اس کی پیدائش بھی بہت آسانی سے ہو گئی تھی۔ وہ صحیح معنوں میں شریف بچہ تھا۔ نہ روتا تھا اور نہ بلاوجہ جاگتا تھا۔ جب تک اٹھا رہتا ہنستا مسکراتا رہتا اور جب لٹاؤ تو سو جاتا تھا۔

کامی کو پا کر میں خوشی سے پاگل ہو گئی تھی۔ اس وقت میں خود پانچ سال کی تھی اور کامی کو گود میں نہیں اٹھا سکتی تھی لیکن میں ہمہ وقت اس کے پاس تو رہ سکتی تھی۔ چند دنوں میں میں اس کی دیکھ بھال کرنا سیکھ گئی تھی۔ اس کے ساتھ کب کیا کرنا ہے، کب اسے فیڈر دینا ہے اور کب اس کی نیپی چینج کرنی ہے اور کس طرح کرنی ہے یہ سب مجھے آ گیا تھا۔ امی میری دیوانگی دیکھ کر ہنستی تھیں اور مجھے کامی کی دوسری ماں کہتیں۔ لیکن جلد میری خوشی پر پانی پھر گیا جب پتا چلا کہ اب مجھے اسکول جانا ہے۔ جب کہ میں کامی کو چھوڑ کر نہیں جانا چاہتی تھی۔ عام طور سے بچے اسکول جاتے ہوئے جتنا روتے دھوتے ہیں میں اس سے زیادہ ہی روئی تھی۔ بہت دنوں بعد جا کر مجھے ذرا قرار آیا تھا۔ لیکن اب بھی یہ ہوتا تھا کہ میں اسکول جاتے جاتے کامی کے پاس بیٹھی اس سے باتیں کر رہی ہوتی تھی یا اس کا کوئی کام کر رہی ہوتی اور امی مجھے زبردستی اسکول وین تک پہنچاتی تھیں۔ پھر اسکول سے آتے ہی سب سے پہلے کامی کے پاس آتی تھی۔ بڑی مشکل سے امی نے مجھے راضی کیا کہ میں پہلے بیگ رکھ کر، یونیفارم بدل کر... منہ ہاتھ دھویا کروں اس کے بعد کامی کے پاس آؤں۔

اسکول میں داخلے کے تین مہینے بعد گرمیوں کی چھٹیاں ہو گئیں اور میں نے یہ سارا وقت کامی کے ساتھ گزارا تھا۔ چھٹیوں کے بعد اسکول جاتے ہوئے پھر مسئلہ ہوا تھا۔ اب کامی بھی ہوشیار ہو گیا تھا۔ اسے معلوم تھا کہ میں کب اسکول سے آتی ہوں۔ وہ میرا منتظر ہوتا تھا اور اس وقت امی اسے سلانے کی کوشش کرتیں تب بھی وہ نہیں سوتا تھا۔ رات کو بھی جب تک میں اس کے ساتھ نہ کھیل لوں وہ سونے کا نام نہیں لیتا تھا۔ اب وہ سال کا ہونے کو آیا تھا۔ وہ بیٹھ جاتا تھا اور کسی چیز کے سہارے کھڑا بھی ہو جاتا لیکن چل نہیں سکتا تھا۔ عام طور سے بچے سال کی عمر میں چلنا شروع کر دیتے ہیں پھر وہ بولتا بھی نہیں تھا اسے صرف پا اور ما کہنا آیا تھا یعنی پاپا اور ماما۔ اب امی ابو کو فکر ہونے لگی تھی۔ وہ ہوشیار تھا، باتیں سمجھتا تھا اور اپنی بات بھی سمجھا دیتا تھا لیکن چلنے اور بولنے کا نام نہیں لے رہا تھا۔ امی ابو نے اسے ڈاکٹر کو دکھایا لیکن اس نے تسلی دی کہ کوئی خاص بات نہیں ہے بعض بچے ذرا تاخیر سے چلنا اور بولنا سیکھتے ہیں۔

دو سال کی عمر میں کامی نے چلنا تو شروع کر دیا تھا مگر بولنے میں ابھی بھی پیچھے تھا اس کی عمر کے بچے پورے جملے بولنا سیکھ جاتے ہیں لیکن وہ ماما اور پاپا سے آگے نہیں بڑھا تھا۔ ایک بار پھر اسے ڈاکٹر کو دکھایا گیا اور ڈاکٹر نے اس کے بعض ٹیسٹ کرائے۔ ان کے نتیجے میں یہ تشویش ناک بات سامنے آئی کہ کامی کے دماغ میں کمی تھی اور یہ کمی اس حصے میں تھی جو انسان کی شخصیت بناتا ہے۔ کمی پیدائشی تھی اور اس کا علاج بھی ممکن نہیں تھا لیکن تھراپی سے اس میں بہتری آ سکتی تھی۔ ڈاکٹر نے کامی کے بارے میں بتایا۔ "یہ ذہین ہے اور جسمانی طور پر بھی کوئی مسئلہ نہیں ہے، بس یہ اپنی شخصیت کو ایکسپریس نہیں کر سکے گا۔ یوں سمجھ لیں کہ یہ شرمیلا اور گھلنے ملنے سے گریز کرنے والا بچہ ہو گا۔ اس کا علاج یہ ہے کہ اسے زیادہ سے زیادہ ایکٹی وٹیز میں شامل کیا جائے۔ دوسرے اسے سہارا دیں اور خود اس کی طرف بڑھیں، اس میں کسی کی طرف بڑھنے کی صلاحیت نہیں ہے۔"

امی، ابو اور میرے لیے یہ اچھی خبر نہیں تھی۔ اگرچہ اس وقت میں صرف سات برس کی تھی لیکن کامی سے بہت قریب تھی اس لیے ڈاکٹر نے اس کے بارے میں جو بتایا وہ میں نے سمجھ لیا تھا اور تب میں نے فیصلہ کیا کہ میں اس کا خیال رکھوں گی۔ میں اسے ہر کام اور کھیل میں شریک رکھوں گی۔ میں نے فیصلہ ہی نہیں کیا بلکہ اس پر عمل بھی شروع کر دیا۔ اسکول سے آنے کے بعد میرا سارا وقت کامی کے لیے مخصوص ہوتا تھا۔ اس وقت میری بھی کئی دوست بن گئی تھیں۔ ان میں سے دو ہماری گلی میں رہتی تھیں اور میرے ساتھ ہی اسکول میں پڑھتی تھیں اس لیے ان سے زیادہ دوستی تھی۔ شام کو وہ میرے گھر آ جاتیں یا میں ان کے گھر چلی جاتی تھی۔ مگر اب میں نے ان کے ساتھ کھیلنا چھوڑ دیا۔ میں نہیں جاتی تھی

وہ آتیں تب بھی میں کامی کے ساتھ لگی رہتی۔ بور ہو کر انہوں نے بھی ملنا جلنا چھوڑ دیا تھا۔ لیکن مجھے کسی کی پروا نہیں تھی۔ میرے لیے دنیا میں سب سے اہم کامی تھا۔

کامی کے لیے کھلونے اور لڑکوں والے کھیلوں کا سامان تھا۔ ابو امی ڈاکٹر کی ہدایت کے مطابق اس کے لیے بہت کچھ لائے تھے جس سے اس کی ذہنی اور جسمانی سرگرمی میں اضافہ ہو۔ میں اس کا ساتھ دیتی بلکہ اسے کھلاتی تھی۔ اسے کرکٹ اچھی لگتی تھی اور مجھے اس کھیل کا قطعی شوق نہیں تھا مگر کامی کی خاطر میں کھیلتی۔ بالنگ کراتی کیونکہ اسے صرف بیٹنگ کرنا پسند تھا۔ اس کے ساتھ فٹ بال اور ہاکی کھیلتی۔ ہمارے گھر پر بڑی سی کھلی چھت تھی ہم شام کو وہیں کھیلا کرتے تھے۔ جب کامی کا کھیل کا موڈ نہیں ہوتا تو میں اسے پڑھاتی تھی۔ ڈاکٹر نے ٹھیک کہا تھا وہ پڑھنے میں تیز تھا اسے جو پڑھایا جاتا وہ اسے ذہن نشین ہو جاتا تھا۔ میری کوششوں سے اس نے ابتدائی کورس جلد مکمل کر لیا۔ اسے مکمل اے بی سی، الف بے پے اور سو تک گنتی آ گئی تھی۔ اسے ڈرائنگ کا شوق تھا اور بغیر کسی کے سکھائے وہ بہت اچھے اسکیچ بنانے لگا تھا۔ اسے رنگوں کا بھی پتا تھا۔

تین سال کی عمر تک وہ بولنے لگا تھا مگر بولتا کم تھا خود سے کوئی بات نہیں کرتا تھا جب کوئی بات کرتا تو جواب دیا کرتا۔ حد یہ کہ امی ابو سے بھی وہ ایسا ہی کرتا تھا۔ خود سے وہ صرف مجھ سے بات کرتا تھا۔ جب وہ پانچ سال کا ہوا تو اسے اسی اسکول میں داخل کرانے کا فیصلہ کیا جہاں میں پڑھتی تھی۔ یہ بہت اچھے درجے کا اسکول تھا جہاں نرسری سے لے کر انٹر تک کی کلاسز ہوتی تھیں۔ فیس خاصی زیادہ تھی لیکن ابو برداشت کر سکتے تھے۔ ابو کی نزدیک ہی ایک بڑی مارکیٹ میں کپڑے کی دکان تھی۔ ہمارا اپنا بڑا سا خوب صورت مکان تھا۔ گاڑی تھی اور وہ سب کچھ تھا جس کی ہمیں خواہش یا ضرورت تھی۔ کامی کو میرے اسکول میں داخل کرانے کا یہ فائدہ ہوا کہ وہ پہلے دن سے خوشی خوشی اسکول گیا۔ کیونکہ اس کا پہلا دن تھا اس لیے ٹیچر نے مجھے اجازت دے دی کہ میں اس کے ساتھ کلاس میں رہوں۔

حیرت انگیز طور پر دوسرے دن خود کامی نے مجھ سے کہا۔ "شازی تم اپنی کلاس میں جاؤ۔"

"تم رہ لو گے۔"

"ہاں۔" اس نے اعتماد سے کہا۔

یوں کامی نے اسکول جانا شروع کر دیا۔ کلاس کے بعد وہ میرے پاس ہوتا تھا۔ میں نے اسے ترغیب دی کہ وہ دوسرے بچوں سے گھلے ملے اور ان کے ساتھ کھیلے مگر وہ میرے ساتھ ہی رہتا تھا۔ کچھ بچوں نے اس سے دوستی کی کوشش کی لیکن اس نے کوئی ردِعمل نہیں دیا اسی طرح کچھ شریر بچے اسے تنگ کرتے تھے اور وہ اس پر بھی کوئی ردِعمل ظاہر نہیں کرتا تھا۔ جب تک میرے ساتھ ہوتا کسی کی جرأت نہیں تھی کہ اسے چھیڑ سکے۔ سب کو معلوم تھا کہ وہ میرا بھائی ہے اور میں اس کے معاملے میں کتنی حساس ہوں۔ اس کے لیے میں ٹیچرز سے لڑ جاتی تھی۔ ایک دن وہ ہاف ٹائم میں کلاس سے باہر آیا تو اس کی آنکھوں میں آنسو لرز رہے تھے اور وہ روہانسا ہو رہا تھا۔ میں بے قرار ہو گئی۔ "کامی کیا ہوا.... کسی نے کچھ کہا ہے؟"

"مس نے مجھے تھپڑ مارا ہے۔" وہ سسک کر بولا۔

"کیوں؟"

"میں نے ان کی بات نہیں سنی تھی۔ انہوں نے مجھ سے کچھ پوچھا تھا؟"

کامی خود میں مگن رہتا تھا۔ اکثر وہ کئی بار پکارے جانے پر متوجہ ہوتا تھا۔ گھر میں اسے مارنے تو کیا اس سے زور سے بات کرنے کا سوال بھی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ بلکہ امی ابو کی اگر لڑائی ہو رہی ہوتی تو کامی کے سامنے وہ چپ ہو جاتے تھے۔ پہلا موقع تھا کہ کسی نے اسے مارا تھا۔ میرا غصے سے برا حال ہو گیا اور میں کامی کو لے کر پرنسپل کے آفس پہنچ گئی۔ میں نے ٹیچر کی شکایت کی اور پرنسپل کو کامی کی کنڈیشن بتائی۔ "یہ عام بچہ نہیں ہے انہوں نے اسے بلاوجہ مارا۔ میں اپنے امی ابو کو بھی لاؤں گی۔"

پرنسپل سمجھدار آدمی تھا اس نے اسی وقت ٹیچر کو بلا لیا اور اسے ڈانٹا۔ ٹیچر نے وعدہ کیا کہ وہ آئندہ کامی کا خیال رکھے گی۔ شکر ہے اس نے اسے انا کا مسئلہ نہیں بنایا اور اسی وقت کامی کو پیار بھی کیا تھا۔ کامی خوش ہو گیا۔ اس واقعے کے بعد دوسرے بچے جو کامی کو چھیڑتے تھے وہ محتاط ہو گئے، کم سے کم میرے سامنے چھیڑنے سے گریز کرتے تھے۔ میں نے کامی سے کہا تھا اگر اسے کوئی تنگ کرے تو وہ مجھے بتائے لیکن کامی عام طور سے ایسا کرنے سے گریز کرتا تھا۔ مجھے خود سے پتا چل جائے تو الگ بات تھی لیکن وہ نہیں بتاتا تھا۔ شاید وہ ڈرتا تھا کہ میں نے ان بچوں کی گوشمالی کی تو وہ انتقاماً اسے زیادہ تنگ کریں گے۔ ایک دن اتفاق سے میں نے دیکھ لیا۔ وہ ہاف ٹائم میں کلاس سے باہر نہیں آیا تو

میں خود اس کی کلاس میں پہنچ گئی۔ وہاں تین چار بچوں نے اسے گھیر رکھا تھا اور اسے دھکے دے رہے تھے۔ ایک سے دھکا کھا کر دوسری طرف آتا تو وہ اسے تیسرے کی طرف دھکا دیتا تھا۔ وہ زیرِ لب احتجاج کر رہا تھا کہ وہ اسے کیوں تنگ کر رہے ہیں لیکن وہ عملی مزاحمت نہیں کر رہا تھا۔ یہ دیکھ کر میرا خون کھول اٹھا اور میں نے سب سے نزدیکی بچے کو ایسا دھکا دیا کہ وہ دیوار سے جا ٹکرایا۔ اس کے بعد باقیوں کی بھی مرمت لگائی اور وہ کلاس سے فرار ہو گئے۔ میں نے غصے سے کامی سے کہا۔ "تم نے انہیں کیوں نہیں مارا۔"

وہ سر جھکا کر کھڑا ہو گیا تو میرا غصہ ٹھنڈا ہونے لگا۔ لڑنا اور مزاحمت کرنا اس کی فطرت ہی نہیں تھی۔ حالانکہ میں اسے سمجھاتی تھی اور اسے کہتی کہ وہ مجھ سے لڑے تاکہ اسے پتا چلے کہ کیسے لڑا جاتا ہے مگر وہ ایسا بھی نہیں کرتا تھا۔ میں خود بچی تھی، اس وقت میری عمر گیارہ بارہ سال تھی مگر میں محسوس کرتی تھی کہ اس تیز اور مکار دنیا میں کامی جیسے سادہ لوگوں کا گزارہ مشکل ہے۔ اس میں چالاکی نام کو نہیں تھی۔ وہ اپنے حق کے لیے آواز بھی نہیں اٹھا سکتا تھا۔ اس میں لڑنے کی ہمت نہیں تھی۔ دنیا میں رہنے اور زندہ رہنے کے لیے انسان کو کچھ نہ کچھ مزاحمت کرنا پڑتی ہے اور وہ ان چیزوں سے بالکل خالی تھا۔ کبھی کبھی یہ خیال مجھے پریشان کرتا تھا کہ جب تک میں اسکول میں تھی اس کی دیکھ بھال کر سکتی تھی لیکن اس کے بعد کیا ہوتا۔ حالانکہ ابھی اس میں بہت وقت پڑا تھا۔ میں چھٹی کلاس میں تھی اور اسکول انٹر تک تھا یعنی جب تک میں انٹر کرتی کامی آٹھویں کلاس میں آ چکا ہوتا۔ شاید اس وقت تک وہ خود کو کسی قدر مضبوط کر لیتا اور اکیلا بھی رہ سکتا لیکن نہ جانے کیوں میرا دل کہتا تھا کہ وہ کبھی تبدیل نہیں ہو گا، وہ ہمیشہ ایسا ہی رہے گا۔ اپنی ذات میں گم اور ہر ایک سے دب جانے والا۔

وقت گزرتا رہا۔ کامی کے بعد ہمارے گھر میں اور کسی فرد کا اضافہ نہیں ہوا، بس ہم دو ہی اپنے ماں باپ کی اولاد تھے اور ان کی زندگی کا محور تھے۔ جیسے جیسے کامی بڑا ہو رہا تھا اپنی عمر کے مطابق سمجھدار ہوتا جا رہا تھا لیکن وہ اس سمجھ کو استعمال نہیں کر پاتا تھا۔ اس کی سمجھ بوجھ کسی کمپیوٹر کی طرح تھی جسے ہمیشہ کوئی دوسرا استعمال کرتا ہے۔ وہ کسی پروگرام پر چلتا ہے اور اپنے طور پر کچھ نہیں کر پاتا۔ ایسا ہی کامی تھا۔ پڑھنے میں تیز تھا کیونکہ اسے ہر بات آسانی سے یاد ہو جاتی تھی۔ امتحان میں وہ ہمیشہ کوئی نہ کوئی پوزیشن حاصل کرتا تھا۔ دس بارہ سال کا ہونے پر بھی اس کا کوئی دوست نہیں تھا۔ وہ گھر سے باہر جاتا نہیں تھا اور جاتا تو کسی سے گھلتا ملتا نہیں تھا۔ ایک آدھ بار دباؤ دینے پر وہ محلے کے لڑکوں سے کھیلنے گیا مگر پھر اس نے باہر جانے اور دوسرے لڑکوں کے ساتھ کھیلنے سے انکار کر دیا۔ جب اسے کوئی کام نہیں کرنا ہوتا تھا تو وہ دم سادھ لیتا اور کسی بات کا جواب نہیں دیتا تھا۔ ایک جگہ بیٹھ جاتا اور وہاں سے حرکت نہیں کرتا تھا۔

اب امی ابو بھی پریشان ہونے لگے تھے کہ وہ آگے کیا کرے گا۔ ماں باپ اور بہن ہمیشہ تو اس کے ساتھ نہیں رہیں گے۔ میری شادی ہو جائے گی اور خدانخواستہ جب امی ابو نہیں رہیں گے تب وہ کیا کرے گا۔ اگر اس کی حالت یہی رہی تو اس دنیا کے ساتھ چلنا بہت مشکل ہو گا۔ ایک موقع پر بات ہو رہی تھی اور امی ابو کامی سے متعلق تشویش کا اظہار کر رہے تھے۔ تو میں نے سوچے سمجھے بغیر مداخلت کی۔ "امی میں کامی کا خیال رکھوں گی۔"

امی نے مجھے دیکھا۔ "شازیہ تمہیں اپنے گھر جانا ہو گا۔"

"میں کہیں نہیں جا رہی، بس میں کامی کے ساتھ رہوں گی۔"

"احمقانہ باتیں مت کرو۔" امی نے ڈانٹا۔ "یہ تمہارا معاملہ نہیں ہے۔"

"کیوں نہیں ہے کامی میرا بھائی ہے اور مجھے اس کی سب سے زیادہ فکر ہے۔"

"بیٹے ہم بھی اس کے ماں باپ ہیں۔" ابو نے نرمی سے کہا۔ "بلکہ تمہارے بھی ہیں اور تم دونوں سے متعلق ہر فیصلہ ہمیں ہی کرنا ہے۔"

امی نے مجھے بعد میں ڈانٹا کہ میں باپ کے سامنے اس طرح بات کر رہی تھی۔ "تمہارے ابو اور مجھے ایسی باتیں بالکل پسند نہیں ہیں۔"

"سوری امی۔" میں نے شرمندگی سے کہا۔ "آپ جانتی ہیں میں کامی سے بہت محبت کرتی ہوں اس لیے بول گئی آئندہ خیال رکھوں گی۔"

ان دنوں میں میٹرک میں تھی اور کامی چھٹی میں آ گیا تھا۔ اب وہ بڑا لگنے لگا تھا اس کا قد نکل آیا تھا اور جسم بھر گیا تھا۔ چہرہ بچپن سے نہایت پُرکشش اور معصوم سا تھا۔ دیکھنے والوں کو اس پر پیار آتا تھا تو ہم گھر والوں کی شیفتگی کا اندازہ کیا جا سکتا تھا۔ اپنی خاموش طبع کے باوجود وہ ہمارے گھر کی رونق

اور ہماری محبتوں کا مرکز تھا۔ ابو دکان سے آتے تو آواز مجھے دیتے لیکن ان کی نظریں کامی کو دیکھ رہی ہوتی تھیں۔ وہ بوسہ میرے سر پر دیتے تھے لیکن ان کی نگاہیں کامی کو چوم رہی ہوتی تھیں۔ یہی حال امی کا تھا۔ جب کامی کے اسکول سے آنے کا وقت ہوتا اور اسے ذرا سی دیر ہو جاتی تو ان کی بے قراری دیکھنے والی ہوتی تھی حالانکہ میں اور کامی وین سے آتے جاتے تھے، اس کے باوجود امی دروازے پر آ کھڑی ہوتی تھیں۔ کامی اور میں ایک ہی کمرے میں سوتے تھے۔ رات کو کئی بار امی آ کر اسے دیکھتیں اس کے اوپر چادر یا کمبل ٹھیک کرتیں، تکیہ درست کرتیں اور اسے پیار کر کے جاتی تھیں۔ جب کہ میرے ساتھ ایسا کبھی نہیں کیا تھا۔

مگر مجھے کامی سے کبھی ہلکا سا حسد بھی محسوس نہیں ہوا بلکہ جب امی ابو اس سے پیار کرتے، اس کے لاڈ اٹھاتے تو مجھے بہت خوشی ہوتی۔ کبھی امی ابو کسی معاملے میں اسے ذرا سا بھی نظر انداز کر جاتے تو میں ان کے سر ہو جاتی کہ انہوں نے اسے کیوں نظر انداز کیا۔ ابو کی خواہش تھی کہ کامی ان کے ساتھ دکان پر جائے اور وہاں بیٹھے۔ تاکہ جب وہ تعلیم مکمل کر لے تو دکان سنبھالنے کی تربیت حاصل کر چکا ہو لیکن کامی کو دکان سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ ابو اسکول کی چھٹیوں میں اسے ساتھ لے جاتے تھے اور وہ ان کے کہنے پر چلا بھی جاتا تھا لیکن صاف پتا چلتا تھا اس کا وہاں دل نہیں لگتا ہے۔ ایک شام ابو اسے چھوڑنے آئے تو غصے میں تھے۔ کامی کے چہرے سے لگ رہا تھا وہ رو کر آیا ہے۔ امی نے پوچھا تو اس نے کہا۔ "ابو نے ڈانٹا ہے میں دکان کا کام سیکھنے پر توجہ نہیں دیتا۔"

"تو بیٹا آپ توجہ دیا کرو آخر آپ کو ہی تو یہ دکان سنبھالنی ہے۔" امی نے پیار سے سمجھایا۔

"مجھے یہ کام نہیں کرنا ہے۔" اس نے انکار کیا۔

امی پریشان ہو گئیں۔ "تو پھر کیا کرو گے؟"

کامی کے پاس اس سوال کا کوئی جواب نہیں تھا اور وہ چپ ہو گیا۔ شام کو ابو آئے تو انہوں نے بھی تیز لہجے میں امی کو بتایا۔ ان کا شکوہ تھا کہ کامی دو سال سے اسکول کی چھٹیوں میں ان کے ساتھ دکان پر جا رہا تھا لیکن اس عرصے میں اس نے کچھ نہیں سیکھا تھا۔ وہ وہاں دکان پر بھی سر جھکائے بیٹھا رہتا۔ کچھ کہا جائے تو کرتا۔ گاہک اس سے کچھ پوچھتے تو خاموش رہتا۔ میں نے کہا۔ "ابو آپ جانتے ہیں وہ دوسروں سے بات نہیں کرتا ہے۔"

"کب تک نہیں کرے گا اور ایسا کب تک چلے گا۔" ابو غصے سے بولے۔ "اسے کہو اپنا رویّہ تبدیل کرے بہت ہو گیا ہے۔"

"ابو مسئلہ اس کے رویّے کا نہیں اس کی کمی کا ہے۔" میں نے رسانیت سے کہا۔ "ڈاکٹر کہہ چکے ہیں اس کی شخصیت کا خانہ خالی ہے اور یہ کمی ساری عمر رہے گی۔ آپ امی اور میں کوشش کر سکتے ہیں، اس سے وہ بہتر ہو گا لیکن اس سے جو توقع آپ کر رہے ہیں وہ ساری عمر پوری نہیں ہو سکے گی۔"

"کیوں نہیں ہو سکے گی۔" ابو کا غصہ دھیما پڑنے لگا۔ وہ دکھی نظر آنے لگے۔ "دوسروں کے اتنے بیٹے ہوتے ہیں، ایک سے بڑھ کر ایک، ہوشیار اور چالاک اور اللہ نے مجھے ایک بیٹا دیا ہے اور وہ بھی....."

"کفرانِ نعمت مت کریں۔" امی نے تڑپ کر کہا۔ "لوگوں کے درجنوں ہوشیار بیٹے ہوں ہمیں ان سے کیا۔ ہمارے لیے تو کامی ہی سب کچھ ہے۔"

ابو اب شرمندہ ہو گئے۔ "تم ٹھیک کہہ رہی ہو، بس کبھی کبھی یہ خیال بہت پریشان کرتا ہے کہ ہمارے بعد اس کا کیا ہو گا؟"

"آپ فکر نہ کریں، اس کے اصل وارث ہم نہیں اللہ ہے اور جب ہم نہیں ہوں گے تب بھی اللہ ہو گا۔" امی نے دانشمندی سے کہا تو ابو کو سکون ہوا تھا۔ انہوں نے کامی کے کمرے میں جا کر اسے پیار بھی کیا تھا۔ پھر انہوں نے دوبارہ کامی کو دکان پر چلنے کے لیے نہیں کہا۔ اس نے اطمینان کا سانس لیا تھا کیونکہ کئی دن بعد وہ خوش نظر آیا تھا اور اس نے امی سے اپنی پسند کی ڈش بنانے کو کہا تھا۔ جیسے جیسے وہ بڑا ہو رہا تھا، باہر کے ماحول سے اس کی گھبراہٹ بڑھ رہی تھی۔ اسکول جانا اس کی مجبوری تھی اور وہ اس کا عادی ہو گیا تھا پھر وہاں میں بھی ہوتی تھی لیکن اس کے علاوہ اسے کہیں اور جانا پڑتا تو اس کی گھبراہٹ دیدنی ہوتی تھی۔ اس کی شدید خواہش ہوتی کہ وہ جلد از جلد گھر واپس آ جائے۔ مارکیٹ، تفریح گاہ یا کسی تقریب میں جانا اس کے لیے بہت مشکل ہوتا تھا۔ بعض اوقات اس کی وجہ سے ہمیں بہت سے کام اور تقریبات ادھوری چھوڑ کر گھر واپس آنا پڑتا تھا۔ ہم کامی کی خاطر یہ سب بھی کرتے تھے۔

میرا اسکول میں آخری سال آیا تو مجھ سے زیادہ کامی فکر مند ہو گیا۔ اس نے مجھ سے کہا۔ "شازی تم چلی جاؤ گی تو

میں اکیلا اسکول آؤں گا۔"

"ہاں اب تم بڑے ہو گئے ہو اور اسکول جا سکتے ہو۔" میں نے اس کی حوصلہ افزائی کی۔ اس نے نفی میں سر ہلایا۔

"اگر تم نہیں ہو گی تو میں بھی اسکول نہیں جاؤں گا۔"

"کیوں؟" میں نے حیرت سے پوچھا۔

"بس میں اسکول نہیں جاؤں گا۔" اس نے اپنے مخصوص لہجے میں کہا تو میں پریشان ہو گئی کیونکہ جب وہ اس طرح بات کرتا تھا تو اس کے بعد وہ اس پر ڈٹ جاتا اور ہمیں اس کی خاموشی کے سامنے ہار ماننا پڑتی تھی۔

"اگر تم اسکول نہیں جاؤ گے تو اپنی تعلیم کیسے مکمل کرو گے؟"

"میں گھر میں پڑھ لوں گا۔"

میں نے امی کو بتایا تو وہ بھی فکر مند ہو گئی تھیں۔ ابو کو بتایا اور پھر کامی سے پوچھا تو وہ اپنی بات پر قائم تھا کہ میرے بغیر اسکول نہیں جائے گا۔ امی ابو نے اسے سمجھانا شروع کیا۔ پھر میں نے بھی بہت بار سمجھایا لیکن اس نے چپ سادھ لی وہ ہماری باتیں سنتا تھا لیکن آگے سے کچھ نہیں کہتا جو اس بات کی نشانی تھی کہ اس نے ہماری بات نہیں مانی ہے، اگر وہ مانتا تو زبان سے کہہ دیتا۔ اسی اثنا میں میرے انٹر فائنل کے امتحانات شروع ہو گئے اور اب مجھے اسکول نہیں جانا تھا۔ کامی پہلے ہی آٹھویں کا امتحان دے کر نویں کلاس میں بیٹھ رہا تھا۔ ابھی اس کا رزلٹ نہیں آیا تھا جس روز میں پہلا پیپر دینے گئی اس روز سے کامی نے اسکول جانا بند کر دیا۔ امی نے اسے اسکول کے لیے اٹھایا اور وہ اٹھ بھی گیا لیکن تیار نہیں ہوا اور نہ ہی اسکول گیا۔ میں پیپر دے کر آئی تو امی نے بتایا۔ شام کو پھر کامی کو بٹھا کر میٹنگ ہوئی اور اسے سمجھایا گیا مگر اس کا وہی رویّہ برقرار تھا۔ میرے تمام پیپرز اسی ٹینشن میں ہوئے۔ جس روز میں نے آخری پیپر دیا تو ابو نے غصے سے کامی کو وارننگ دی کہ وہ کل سے اسکول ضرور جائے گا۔ وہ حسب معمول خاموش رہا۔ اسے کمرے سے بھیج کر میں نے امی ابو سے کہا۔ "وہ نہیں جائے گا۔ آپ دونوں جانتے ہیں اس کا ایک ہی طریقہ ہے۔"

"وہ کیا؟" ابو نے پوچھا۔

"کل سے میں اس کے ساتھ اسکول جاؤں گی۔"

امی ابو میری بات پر حیران رہ گئے۔ "تم جاؤ گی لیکن تم وہاں کیا کرو گی؟"

"بیٹھی رہوں گی جب چھٹی ہو گی تو اس کے ساتھ واپس آجاؤں گی۔"

"اسکول والے اعتراض کریں گے۔" امی نے کہا۔ "اور یہ تو عجیب لگے گا۔"

"عجیب تو لگے گا لیکن اس کے سوا کوئی اور راستہ نہیں ہے۔" میں نے کہا تو امی ابو سوچ میں پڑ گئے پھر ابو نے کہا:

"تمہیں تو اب کالج جانا ہے۔"

"کالج تو چھٹیوں کے بعد ہی جا سکوں گی تب تک کامی کے ساتھ اسکول جاتی ہوں۔ ہو سکتا ہے اس دوران میں وہ مان جائے اور اکیلے اسکول جانے لگے۔"

امی ابو مان گئے اور اگلے روز میں کامی کے ساتھ اسکول گئی۔ اسکول والے حیران ہو گئے تھے۔ جب انہوں نے مجھے کھیل والے حصے میں شیڈ تلے بنچ پر بیٹھے دیکھا۔ کئی ٹیچرز نے آکر مجھ سے پوچھا اور میں نے ان کو بتایا کہ میں وہاں کیوں بیٹھی ہوئی تھی۔ کچھ دیر بعد پرنسپل نے مجھے بلا لیا۔ وہ بھی حیران تھے۔ وہ کامی کے بارے میں اچھی طرح جانتے تھے۔ اس لیے میری بات سمجھنے میں زیادہ دشواری پیش نہیں آئی۔ انہوں نے بھی یہی پوچھا۔ "بیٹے آپ کب تک اس طرح آکر بیٹھتے رہو گے آپ نے آگے کالج میں بھی داخلہ لینا ہے۔"

"جب تک کامی اکیلے پڑھنے پر راضی نہیں ہو جاتا۔"

"میں ٹیچرز سے کہتا ہوں وہ اسے سمجھائیں گی۔"

"لیکن نرمی سے، ذرا سی سختی سے وہ بدک جائے گا۔"

ٹیچرز بھی کامی کو سمجھاتی رہیں اور پھر اس نے دیکھا کہ میں بلاوجہ بیٹھی رہتی ہوں۔ اسی دوران میں گرمیوں کی چھٹیاں آگئیں اور معاملہ اسکول کھلنے تک ٹل گیا۔ گھر میں امی کامی کو سمجھاتی تھیں کہ اب مجھے کالج میں پڑھنا تھا اور اگر میں اس کے ساتھ جاتی رہوں گی تو آگے پڑھنے سے رہ جاؤں گی، مجھے اس کا بہت نقصان ہو گا۔ رفتہ رفتہ کامی پر دباؤ بڑھا اور جب گرمیوں کی چھٹی کے بعد اسکول کھلے اور میں پہلے دن اس کے ساتھ جانے کے لیے تیار ہونے لگی تو اس نے مجھے روک دیا۔ "شازی تم نہیں جاؤ گی۔"

"کیوں کیا تم اسکول نہیں جا رہے؟"

"میں خود جا رہا ہوں۔" اس نے دھیمے لہجے میں کہا۔ "اب میں خود جایا کروں گا۔"

"سچ میں۔" میں خوش ہو گئی لیکن وہ سنجیدہ رہا۔ کچھ دیر میں اس کی وین آگئی اور وہ اسکول چلا گیا۔ امی اس کایا پلٹ پر خوش تھیں۔ ابو دکان کے لیے مال لینے چلے گئے تھے وہ شام کو آئے اور انہیں پتا چلا تو وہ بھی حیران اور خوش ہوئے تھے۔ انہوں نے کامی کو گلے لگایا:

"میرا بیٹا بڑا ہو گیا ہے۔"

کامی اس وقت بھی سنجیدہ رہا تھا۔ مجھے اس کا رویّہ عجیب سا لگا تھا مگر میں نے زیادہ توجہ نہیں دی۔ میں سمجھی کہ اس نے دل کڑا کر کے فیصلہ کیا ہے اور اب کسی قدر پریشان تو ہو گا۔ میں نے کالج میں داخلہ لے لیا تھا اور باقاعدگی سے کالج جانے لگی۔ میں گریجویشن کے بعد ماسٹر بھی کرنا چاہتی تھی اور اس کے لیے گریجویشن میں اچھا گریڈ لازمی تھا۔ میں بہت محنت کر رہی تھی۔ کالج سے آکر گھر میں بھی کئی گھنٹے پڑھتی تھی۔ اس وجہ سے کامی کو اتنا وقت دے نہیں پاتی تھی۔ وہ شکایت نہیں کرتا تھا، اسے عادت نہیں تھی۔ اپنی خوشی یا دکھ ظاہر کرنا اسے آتا ہی نہیں تھا۔ ایسے لوگ عام طور سے نظر انداز کر دیے جاتے ہیں اور فطری طور پر سب سے زیادہ اپنوں سے نظر انداز کیے جاتے ہیں۔ میں بھی اتنی توجہ نہیں دے سکی۔ جب میرے امتحان قریب تھے تو کامی کے نویں کے امتحانات جاری تھے۔ میں اتنی مصروف تھی کہ دن بھر میں بس اس سے چند ایک بار بات ہوتی تھی۔

کامی کے نویں کے پیپرز ہو گئے اور اسکول میں دسویں کی کلاسز شروع ہو گئیں۔ اس روز میں اتفاق سے جلدی اٹھ گئی ورنہ رات دیر تک پڑھنے کی وجہ سے صبح دیر سے آنکھ کھلتی تھی۔ کالج امتحان کی وجہ سے بند ہو گئے تھے۔ اس لیے صبح دیر سے ہی اٹھتی تھی اور اس وقت تک کامی جا چکا ہوتا تھا۔ میں کمرے سے باہر آئی تو وہ ناشتے کی میز پر بیٹھا ہوا تھا۔ امی اس کے سامنے دودھ کا گلاس رکھ رہی تھیں۔ دودھ پیتے ہوئے اس نے میری طرف دیکھا اور مسکرایا تھا۔ میں جواباً مسکرائی۔ امی نے کہا۔ "منہ دھو کر آجاؤ ناشتا کر لو۔"

"میں کچھ دیر سے کروں گی۔" میں نے کامی کے برابر میں بیٹھتے ہوئے کہا اور اس کے بال چھیڑے۔ "ہیرو! آج کل ملتے ہی نہیں ہو۔"

وہ پھر مسکرایا لیکن اس کی آنکھیں اس مسکراہٹ سے خالی تھیں۔ مجھے لگا وہ جیسے اندر سے پریشان ہے۔ اس کی وین نے ہارن دیا تو وہ جلدی سے اٹھا اور بیگ اٹھاتے ہوئے باہر کی طرف بڑھا پھر پلٹ کر میری طرف آیا وہ جھک کر میرے گلے لگا اور آہستہ سے بولا۔ "خدا حافظ !"

"خدا حافظ !" میں نے جواب دیا۔ پھر وہ امی سے بھی اسی طرح گلے لگا اور چلا گیا۔

امی نے حیرت سے کہا۔ "آج تو یہ خود مل کر گیا ہے۔"

وہ ٹھیک کہہ رہی تھیں کیونکہ کامی کو خود ملنا پڑتا تھا۔ امی کی بات سن کر مجھے کچھ ہوا اور میں بھاگتی ہوئی دروازے تک آئی۔ کامی وین میں بیٹھ گیا میں نے چلا کر اسے آواز دی اس نے میری طرف دیکھا تو میں نے ہاتھ ہلایا اس نے بھی جواباً ہاتھ ہلایا اور پھر وین چلی گئی۔ میں نے ذرا آگے ہو کر دیکھا۔ گلی کے کونے پر وین مڑی تو کامی کی آخری جھلک دکھائی دی اور یہ سچ مچ اس کی آخری جھلک بن گئی کیونکہ اس کے بعد وہ غائب ہو گیا اور تمام تر کوشش کے باوجود پھر نہیں ملا تھا۔

☆☆☆

شادی کے بعد دو سال میں سسرال میں سب کے ساتھ رہی اور پھر الگ ہو گئی۔ کیونکہ ساتھ رہنے سے وہی مسائل سر اٹھانے لگے تھے جو جوائنٹ فیملی سسٹم کا خاصہ ہوتے ہیں۔ شروع میں کچھ عرصے بدمزگی رہی تھی لیکن اب تعلقات نارمل ہو گئے تھے۔ میری سسرال اور میکا دونوں نارتھ ناظم آباد میں ہیں اس لیے ہم نے بھی یہیں گھر لے لیا۔ اس دو منزلہ مکان کا اوپری پورشن ہمارے پاس تھا۔ تین کشادہ کمرے تھے جو ہماری ضرورت کے لیے کافی تھے اور پھر چھت بھی ہمارے پاس تھی۔ سب سے بڑھ کر کرایہ مناسب تھا کیونکہ مکان جہانزیب کے ایک دوست کا تھا۔ وہ اپنی فیملی سمیت امریکا جا چکا تھا اور یہ مکان کرائے پر دے دیا تھا۔ بلکہ ایک طرح سے جہانزیب کے ہاتھ میں تھا۔ وہی نیچے والے پورشن اور اپنے حصے کا کرایہ لے کر دوست کے بینک اکاؤنٹ میں جمع کراتے تھے۔ اچھا علاقہ تھا۔ یہاں مہذب اور شریف فیملیاں رہتی تھیں۔ یہی وجہ تھی جہانزیب مجھے اکیلے چھوڑ کر بے فکری سے کام پر چلے جاتے تھے۔ ان کی کلیئرنگ اینڈ فارورڈنگ ایجنسی تھی۔ میرے جیٹھ کے ساتھ شراکت کا بزنس تھا۔ دونوں بھائی مل کر کام کرتے تھے اور باری باری بارہ گھنٹے کام کرتے تھے۔ کیونکہ چوبیس گھنٹے کا کام تھا۔ جہانزیب تیرہ گھنٹے بعد آتے تھے اور کبھی ان کی نائٹ ہوتی تھی۔ مجھے اکیلے رہنا پڑتا تھا۔ شروع میں ڈر لگا تھا لیکن پھر عادت ہو گئی اور اب شازیب بھی بڑا ہو رہا تھا۔

☆☆☆

میں شازیب کو لے کر گھر آئی تو میری حالت عجیب سی ہو رہی تھی۔ میں کپکپا رہی تھی اور دل ڈوب رہا تھا۔ گھر آتے ہی میں پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ اتفاق سے گھر میں اور کوئی نہیں تھا اس لیے مجھے اپنی گھٹن نکالنے کا موقع مل

گیا۔ میں رو رہی تھی اور شازیب بے قرار ہو کر مجھے چپ کرانے کی کوشش کر رہا تھا۔ وہ صرف تین سال کا تھا لیکن سمجھ رہا تھا کہ اس کی ماں کو کوئی تکلیف ہے۔ وہ اپنے ننھے ہاتھوں سے میرے آنسو صاف کر رہا تھا اور اپنی زبان میں مجھے نہ رونے کو کہہ رہا تھا۔ بالآخر میرا دل ہلکا ہوا تو میں خاموش ہوگئی۔ رہ رہ کر میری آنکھوں کے سامنے کامی کا چہرہ آ رہا تھا۔ چھ سال پہلے وہ صحت مند اور گول بھرے چہرہ والا لڑکا تھا۔ اب اس کی صحت گرگئی تھی، چہرہ بھی کمزور ہو گیا تھا۔ اس کے ریشم جیسے گھنے اور کسی قدر بڑھے ہوئے بال اب چھوٹے اور روکھے ہو گئے تھے۔ آنکھوں کے نیچے حلقے تھے اور شیو بڑھی ہوئی تھی۔ مجھے سوچنے کا موقع ملا تو مجھے سب سے پہلے ابو کا خیال آیا میں نے ان کو کال کی۔ "ابو میں نے آج کامی کو دیکھا ہے۔"

"کیا.... کیا کہا تم نے.... کامی...." ابو مضطرب ہو گئے۔

"جی ابو اور میں آپ سے بات کرنا چاہتی ہوں۔ ابو میں نے کامی کو بہت عجیب حال میں دیکھا۔ آپ میرے پاس آ جائیں اور پلیز ابھی کسی کو مت بتائیے گا۔"

"ٹھیک ہے تم نے جہانزیب کو بتایا؟"

"نہیں ابو اس کا فیصلہ بھی آپ سے بات کر کے کروں گی۔"

"میں آ رہا ہوں۔" ابو نے کہا۔ وہ دکان پر تھے۔ پچھلے کئی سالوں میں ان کے کاروبار نے خاصی ترقی کی تھی۔ پہلے دو ملازم تھے اور اب انہوں نے چار ملازم رکھ لیے تھے۔ برابر والی دکان بھی لے کر اپنی دکان بڑھا لی تھی۔ اتفاق سے میرا گھر مارکیٹ سے کچھ ہی دور تھا۔ ابو دس منٹ میں آ گئے۔ اکثر وہ شام کو گھر جاتے ہوئے میرے پاس چکر لگاتے تھے۔ وہ شازیب کو بہت چاہتے تھے اور انہیں شازیب میں کامی کی جھلک نظر آتی تھی اور یہ حقیقت تھی کہ کامی اور شازیب بہت ملتے تھے۔ ابو مضطرب تھے۔ انہوں نے آتے ہی پوچھا۔ "تم نے کامی کو کہاں دیکھا؟"

میں نے ابو کو بتایا کہ میں نے کامی کو کہاں اور کیا کرتے دیکھا تھا تو ان کا چہرہ سفید پڑ گیا۔ وہ ڈوبتے لہجے میں بولے۔ "بیٹا تمہیں دھوکا ہوا ہوگا، کامی بھلا ایسا کام کر سکتا ہے۔ وہ تو کسی چیونٹی کو بھی نہیں مار سکتا تھا۔ ایک انسان کو اور وہ بھی اس طرح سے...."

"ابو میں بھی خود کو یقین دلانے کی کوشش کر رہی ہوں کہ وہ کامی نہیں ہے لیکن یہ سچ ہے وہ کامی ہی تھا۔ میں کامی کو جس طرح جانتی ہوں کسی اور کے کامی ہونے کا دھوکا نہیں کھا سکتی۔"

"میں جانتا ہوں میری بچی۔" ابو بولے۔ "ہم سب میں کامی کو سب سے زیادہ تم ہی جانتی تھیں۔ کیا اس نے تمہیں دیکھا تھا؟"

میں نے سر ہلایا۔ "جی ابو.... اس نے صرف دیکھا نہیں بلکہ مجھے پہچان بھی لیا تھا۔ اس نے اپنے ہیلمٹ پہنے ساتھی سے کچھ کہا لیکن وہ موٹر سائیکل بھگا لے گیا۔ جاتے جاتے بھی کامی مجھے دیکھ رہا تھا۔"

ہم باپ بیٹی کی جذباتی کیفیت اعتدال میں آئی تو ہمیں اس معاملے کے دوسرے پہلوؤں پر غور کرنے کا موقع ملا اور یہ نہایت تشویش ناک تھے۔ ابو نے کہا۔ "کامی اگر کسی جرائم پیشہ گروہ کے ہتھے چڑھ گیا ہے اور وہ اس سے ایسے کام لے رہا ہے تو یہ نہایت تشویش کی بات ہے۔ ہم کسی کو یہ بات بتا بھی نہیں سکتے۔"

"آپ نے ٹھیک کہا ابو.... بلکہ ہم تو پولیس کے پاس بھی نہیں جا سکتے، وہ الٹا ہمیں مجرم بنا دے گی۔"

"بالکل۔" ابو نے سرد آہ بھری۔ "وہ ہمیں تنگ کرے گی اور کامی کا پوچھے گی جب کہ ہمارے پاس بتانے کے لیے کچھ نہیں ہے۔"

"امی بھی اب صبر کر چکی ہیں، اگر ان کو پتا چلا تو ان کے زخم پھر سے ہرے ہو جائیں گے۔"

"میں نے بھی یہی سوچا ہے، یہ بات میرے اور تمہارے درمیان رہے گی۔ تم نے جہانزیب کو بتانے کا فیصلہ کیا ہے؟"

"نہیں.... وہ پیٹ کے ہلکے ہیں اور اپنے بھائی یا گھر والوں کو بتا سکتے ہیں۔" میں نے نفی میں سر ہلایا۔

"بس تو یہ بات ہم دونوں تک رہے گی۔" ابو نے کہا اور شازیب کو گود میں اٹھا لیا جو بہت دیر سے ان کی توجہ حاصل کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ وہ کچھ دیر اس کے ساتھ کھیلتے رہے۔ میں نے چائے بنائی۔ اس کے بعد ابو چلے گئے۔ میں نے ٹی وی لگایا تو اس پر خبر آ رہی تھی۔ دکان دکھائی جا رہی تھی اور ٹی وی رپورٹر وہاں موجود افراد سے انٹرویو کرنے کی کوشش کر رہا تھا لیکن لوگ جان چھڑا رہے تھے اور سب نے انکار کر دیا کہ انہوں نے کچھ نہیں دیکھا اور بس فائرنگ کی آواز سنی تھی۔ رپورٹر کے مطابق دکان کا مالک بھی ا

ایک نوجوان تھا اور ابھی تک یہ معلوم نہیں ہوا تھا کہ اسے کس نے اور کیوں قتل کیا ہے۔ لیکن بظاہر یہ ٹارگٹ کلنگ کی واردات لگ رہی تھی۔ مجھے خیال آیا کہ صرف میں جانتی تھی کہ یہ واردات کس نے کی ہے۔ لیکن اس نے یہ کام کیوں کیا؟ یہ میں بھی نہیں جانتی تھی۔ سچی بات ہے میرے ذہن کے بعید ترین گوشوں میں بھی نہیں تھا کہ میں کامی کو اس روپ میں دیکھوں گی۔

جب وہ غائب ہوا اور ہماری دیوانہ وار تلاش کے باوجود نہیں ملا تو ہم نے یہ سوچ کر صبر کر لیا کہ اسے کوئی اغوا کر کے لے گیا ہے اور اب وہ ہمیں کبھی نہیں ملے گا۔ بعض شواہد سے ظاہر تھا کہ کامی اغوا نہیں ہوا تھا بلکہ خود سے گیا تھا۔ اسکول کی چھٹی پر وین میں آنے کے بجائے وہ کہیں اور چلا گیا۔ اس کے کلاس فیلوز نے اسے اسکول کے گیٹ سے نکلتے دیکھا تھا لیکن اس کے بعد وہ کہاں گیا اور کس کے ساتھ گیا کسی نے نہیں دیکھا تھا۔ ہمیں ایک خدشہ یہ تھا کہ اسے ورغلایا گیا تھا۔ اس کی قوتِ ارادی بہت کمزور تھی، وہ دوسروں کے کہنے پر عمل کرتا تھا۔ گھر والوں سے وہ بعض معاملات میں اڑ بھی جاتا تھا لیکن گھر سے باہر وہ کسی کی بات سے انکار نہیں کرتا تھا۔ خیال تھا کہ کسی نے اسے تاڑ لیا تھا اور پھر کسی مقصد کے تحت اغوا کر لیا۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ ہماری امید ختم ہوتی گئی کہ کامی اب واپس آ سکے گا اور چھ سال گزرنے کے بعد تو یہ امید بالکل ہی ختم ہو گئی تھی۔

لیکن آج کے واقعے نے ثابت کر دیا کہ کامی نہ صرف زندہ تھا بلکہ آزاد بھی گھوم رہا تھا۔ سب سے ناقابلِ یقین بات کہ اس نے بہت مہارت اور صفائی سے ایک آدمی کو قتل کر دیا تھا۔ وہ پیشہ ور قاتل بن گیا تھا۔ جب وہ دکان سے نکل کر بھاگتا ہوا آیا تو اس کے انداز میں عجلت تھی لیکن وہ ذرا بھی خوف زدہ یا پریشان نہیں لگ رہا تھا۔ پھر اس نے مجھے دیکھا اور پہچان لیا لیکن اس میں جذباتی تغیر پیدا نہیں ہوا۔ اس کا انداز ایسا تھا جیسے بہت عرصے بعد کسی جان پہچان والے کو اچانک دیکھ کر ہو سکتا ہے۔ لیکن ہو سکتا ہے یہ میرا خیال ہو۔ وہ موقع بھی ایسا تھا کہ وہ مجھ سے مل نہیں سکتا تھا اور نہ ہی جذباتی ہو سکتا تھا۔ اس کے لیے اس وقت ایک ایک لمحہ قیمتی تھا اور اسے جلدی وہاں سے نکلنا تھا۔ اس کے باوجود اس نے اپنے ساتھی سے کچھ کہا تھا اور اس نے انکار کر کے موٹر سائیکل دوڑا دی تھی۔

اس سارا دن مجھے رہ رہ کر رونا آتا رہا لیکن رات جہانزیب کے آنے سے پہلے میں نے خود کو نارمل کر لیا تھا۔ وہ آج کل دن میں جا رہے تھے۔ صبح سات بجے جاتے اور رات آٹھ بجے تک آ جاتے تھے۔ شازیب نے راز فاش کر دیا کہ مما رو رہی تھیں۔ جہانزیب نے پوچھا تو میں نے بہانہ کر دیا کہ مجھے کامی یاد آیا تھا اس لیے رونا آ گیا۔ جہانزیب ویسے تو بہت اچھے اور سلجھی ہوئی ذہنیت کے آدمی ہیں۔ وہ کسی پر طنز کرنا یا ایسا مذاق بھی پسند نہیں کرتے ہیں جس سے دوسرے کی دل آزاری ہو مگر وہ اپنی سادگی میں ایسی باتیں بھی دوسروں سے کہہ جاتے ہیں جو کہنے والی نہیں ہوتی ہیں اس لیے اگر مجھے کوئی بات اپنے سسرال والوں سے چھپانی ہو تو میں جہانزیب کو بھی نہیں بتاتی ہوں۔ جہانزیب تھکے ہوئے آئے تھے اس لیے کھانا کھا کر اور کچھ دیر کامی کو باہر لے جا کر وہ واپس آئے اور سونے کے لیے لیٹ گئے۔ میں بھی تھکن محسوس کر رہی تھی لیکن آنکھوں میں کوشش کے باوجود نیند نہیں آ رہی تھی۔

اگلے دن میں نے اخبار میں اس واردات کی تفصیل پڑھی۔ ہمارے ہاں روز اخبار آتا تھا۔ ٹی وی پر بس گزشتہ دن ہی خبر چلی تھی اس کے بعد پھر کوئی خبر نہیں آئی۔ البتہ اخبار میں سب تھا۔ دکان کا مالک عرفان احمد نامی شخص تھا اور پولیس کے مطابق اس نے بھتا دینے سے انکار کیا تھا اس پر اسے دھمکیاں مل رہی تھیں اور گزشتہ روز اسے دن دہاڑے اس کی دکان میں قتل کر دیا گیا۔ علاقے کے دوسرے دکان داروں کا کہنا تھا کہ انہیں بھی بھتا دینا پڑتا ہے ورنہ ان کا انجام بھی یہی ہو سکتا تھا۔ عرفان کے بارے میں آس پاس کے دکان داروں کا کہنا تھا کہ وہ اچھا اور شریف آدمی تھا اور اس نے کچھ عرصے پہلے یہ دکان کھولی تھی۔ ابھی اس کا کاروبار جما نہیں تھا اس لیے وہ بھتا دینے سے انکاری تھا اور اسی وجہ سے اسے قتل کیا گیا تھا۔ یہ خبر پڑھتے ہوئے مجھے خیال آیا کہ اگر یہ بھتے کا چکر تھا تو یقیناً کسی گروہ یا پارٹی کا کام تھا اور کامی ان لوگوں کا مہرہ بن گیا تھا۔

گزشتہ کچھ عرصے سے پورے ملک میں قتل و غارت گری کا ایک طوفان آیا ہوا ہے اور لگتا ہے قانون شکن قانون کی نسبت اتنے زیادہ مضبوط ہو چکے ہیں کہ اب انہیں کسی کی پروا نہیں ہے۔ کراچی میں ڈبل سواری پر مستقل پابندی ہوتی ہے اس کے باوجود ٹارگٹ کلرز دن دہاڑے ڈبل سواری کر کے آتے ہیں اور اپنا مطلوبہ آدمی آرام سے قتل کر کے فرار ہو جاتے ہیں۔ کسی کو انہیں روکنے یا پکڑنے کی

توفیق نہیں ہوتی ہے۔ پولیس اور رینجرز بھی بے گناہ اور عام لوگوں کو مارتی یا پکڑتی ہے۔ اخبار میں بتایا گیا تھا کہ واردات والی سڑک کے کونے پر اس وقت ایک پولیس موبائل کھڑی تھی۔ کامی اور اس کا ساتھی اس کے سامنے سے گزر کر گئے تھے مگر انہوں نے انہیں روکنے کی کوئی کوشش نہیں کی۔ گھر سے نکلنے والوں کو پتا نہیں ہوتا تھا کہ وہ شام کو زندہ سلامت گھر واپس آسکیں گے یا نہیں۔ جہانزیب جب تک گھر سے باہر ہوتے میرا دل ہولتا رہتا تھا۔ وہ جس علاقے سے جاتے اور جہاں جاتے تھے وہ سارا حساس علاقہ تھا اور آئے دن یہاں قتل و غارت گری ہوتی رہتی تھی۔

شازیب اور جہانزیب کے جانے کے بعد میں گھر کی صفائی میں لگ گئی۔ کھانا تیار کیا اور کپڑے دھوئے۔ چھوٹا سا گھر تھا اور کام بھی زیادہ نہیں تھا اس لیے جہانزیب کے اصرار کے باوجود میں نے ماسی نہیں رکھی تھی۔ میں خود سارے کام کرتی تھی۔ امی نے شروع سے مجھے کاموں کی عادت ڈالی تھی۔ دس برس کی عمر میں میں نے ذمّے داریاں نبھانا شروع کر دی تھیں۔ پہلے برتن دھوتی اور کچن صاف کرتی تھی۔ رفتہ رفتہ امی نے دوسرے کام بھی سکھائے اور جب میں شادی ہو کر گھر سے رخصت ہوئی تو مجھے سب آتا تھا۔ امی کی دی یہ تربیت اپنے گھر میں کام آئی۔ گیارہ بجے میں گھر سے نکلی۔ شازیب کو لینے کے بعد میرا ارادہ گھر کے لیے کچھ سامان لینے کا تھا۔ اسے اسکول سے لے کر نزدیکی مارکیٹ کا رخ کیا۔ گوشت، سبزی اور دوسرا سامان لیا۔ موسم کسی قدر گرم ہو چلا تھا اس لیے شازیب جلدی گھر چلنے کو کہہ رہا تھا۔ اس کی وجہ سے اور سامان دیکھتے ہوئے میں نے رکشا لے لیا اور کچھ دیر بعد گھر کے سامنے تھی۔ ہمارے پورشن کی سیڑھیاں الگ سے تھیں اور نیچے لوہے کا گیٹ لگا ہوا تھا۔ میں نے لاک کھولا اور سامان اٹھایا تھا کہ ایک اپر پوش شخص تیزی سے آیا اور شازیب کو گود میں اٹھاتے ہوئے سیڑھیاں چڑھ گیا۔ اس کے اپر کا ہڈ سر پر تھا اور اس کا چہرہ بھی نظر نہیں آرہا تھا۔ میں پہلے تو ہکا بکا رہ گئی پھر تڑپ کر بولی۔ ”کون ہو چھوڑو میرے بچے کو۔“

”یہ میں ہوں شازی۔“ اس نے دھیمے لہجے میں کہا اور سیڑھیاں چڑھ کر اوپر چلا گیا۔ میں تڑپ کر اس کے پیچھے آئی۔ اس بار یہ تڑپ شازیب کے لیے نہیں تھی بلکہ کامی کے لیے تھی۔ اپر پوش کامی تھا۔ وہ اتنی دیر میں اندر چلا گیا تھا۔ میں کمرے میں آئی تو اس نے خوفزدہ شازیب کو گود سے اتار دیا تھا اور کمرے کے وسط میں کھڑا تھا۔ میں نے لرزتی آواز میں کہا۔

”کامی..... تم کامی ہو؟“

وہ خاموش کھڑا رہا۔ میں نے کانپتے ہاتھوں سے اس کے اپر کا ہڈ سرکایا۔ اس کا چہرہ نمایاں ہوا تو میں چیخ مار کر اس سے لپٹ گئی۔ اس وقت مجھے اپنا ہوش نہیں رہا تھا۔ مجھے روتا دیکھ کر شازیب بھی رونے لگا تھا پھر میں بے ہوش ہو گئی۔ کامی نے مجھے صوفے پر لٹایا اور تلاش کر کے پانی لایا۔ اس نے میرے منہ پر چھڑکا اور حلق میں بھی ٹپکایا۔ میں جلد ہوش میں آگئی۔ شازیب میرے پہلو سے لگا سسکیاں لے کر رو رہا تھا اور یہ پہلی بار ہوا تھا کہ مجھے اس کے رونے کی پروا بھی نہیں رہی تھی۔ میں پھر کامی سے لپٹ کر رونے لگی اس نے آہستہ سے کہا۔ ”شازی خود کو سنبھالو، میں تھوڑی دیر کے لیے آیا ہوں اور مجھے واپس جانا ہے۔“

میں نے جذباتی ہو کر کہا۔ ”میں تمہیں نہیں جانے دوں گی میں ابھی امی ابو کو کال کرتی ہوں۔“

”نہیں تم کسی کو نہیں بتاؤ گی۔“ اس نے حتمی لہجے میں کہا۔ وہ بہت بدل گیا تھا۔ وہ پہلے کی طرح دھیمے لہجے میں بات کر رہا تھا مگر اب اس کے انداز میں بے چارگی اور خوف نہیں تھا۔ وہ اعتماد سے بات کر رہا تھا اس نے شازیب کی طرف دیکھا۔ ”اسے چپ کراؤ، یہ تمہارا بیٹا ہے نا؟“

مجھے شازیب کا خیال آیا اور میں نے جلدی سے اسے گود میں اٹھاتے ہوئے کہا۔ ”ہاں یہ شازیب ہے، دیکھو بالکل تمہارے جیسا ہے۔“

کامی کچھ دیر اسے غور سے دیکھتا رہا پھر بولا۔ ”ہاں لیکن اسے میرے جیسا نہیں ہونا چاہیے۔“

”تم کیوں جاؤ گے.....؟ اب تک کہاں تھے.....؟ کبھی ہمارا خیال نہیں آیا.....؟ کتنا تڑپے تھے ہم تمہارے لیے..... اب تک تڑپتے ہیں۔“

”مجھے معلوم ہے۔“ اس نے آہستہ سے کہا۔ ”لیکن میں مجبور تھا۔“

اچانک مجھے یاد آیا کہ اس نے قتل کیا تھا۔ ”کامی تو نے اس شخص کو مار دیا..... کیوں مارا اُسے؟“

”میں نہیں جانتا۔“ اس نے کہا تو اس کے لہجے میں ہلکی سی بے چارگی آگئی۔ ”مجھ سے جو کہا جاتا ہے وہ کرتا ہوں۔“

”کون کہتا ہے کامی، تم کسی جرائم پیشہ گروہ کے ہتھے چڑھ گئے ہو۔“

اس نے سر ہلایا۔ ”وہ بہت خطرناک لوگ ہیں۔ مجھ سے اس دن غلطی ہوگئی جو میں نے اپنے ساتھی سے تمہارا ذکر کر دیا۔ وہ لوگ پوچھ رہے تھے کہ کیا تم نے بھی مجھے دیکھا تھا تو میں نے جھوٹ بول دیا کہ نہیں میں نے دیکھا تھا اور پھر ہم وہاں سے نکل گئے تھے۔ پر وہ کسی پر اعتبار کرنے والے لوگ نہیں ہیں اور جس پر شک ہو جائے اُسے.....“

وہ بولتے بولتے خاموش ہو گیا لیکن میں سمجھ گئی تھی وہ کیا کہنا چاہ رہا تھا۔ میں نے کانپتی آواز میں کہا۔ ”پھر تو کیوں یہاں آیا اگر ان کو پتا چل گیا تو وہ تجھے نہیں چھوڑیں گے۔“

”میں نہ آتا اگر مجھے خطرہ نہ ہوتا کہ وہ تمہیں تلاش کر رہے ہوں گے۔ میں تمہیں خبردار کرنے آیا ہوں۔ اب گھر سے مت نکلنا اور اگر نکلو تو نقاب لگا کے جانا۔“

”وہ مجھے گلیوں میں تلاش کر رہے ہیں؟“ مجھے تعجب ہوا۔

”وہ ایسے ہی ہیں ان کے ذرائع بہت وسیع ہیں۔ وہ سب جانتے ہیں۔ مجھے صحیح سے نہیں معلوم ہے لیکن تم محتاط رہنا۔“

”کامی تم کیوں گھر سے گئے۔“ میں پھر رونے لگی۔ ”کیا ہماری کوئی بات بری لگی تھی؟“

”شازی میں تم لوگوں کی دنیا کا آدمی نہیں ہوں۔ میرا وہاں کوئی کام نہیں تھا۔ مجھے معلوم تھا تم لوگوں کے بغیر مجھے لوگوں کا سامنا کرنا پڑا تو میں ناکام ہو جاؤں گا۔“

”مگر یہ گھر چھوڑنے کا جواز نہیں تھا۔ تم ہماری جان تھے۔“

”میں تم لوگوں پر بوجھ تھا اور میں نے بہتر سمجھا کہ اس بوجھ کو اتار دوں۔“ اس نے کہتے ہوئے اپر کا ہڈ اوپر کیا۔ ”اب میں جاؤں گا۔ میں نے جو کہا ہے وہ یاد رکھنا..... بہت احتیاط کرنا..... تمہارا کوئی موبائل نمبر ہے۔“

”ہاں ہے۔“ میں نے اسے اپنا موبائل نمبر دیا۔ وہ اس نے کئی بار زیر لب دہرایا اور اسے یاد ہو گیا۔ وہ کوئی بھی چیز اسی طرح یاد کر لیتا تھا۔ ”اگر کوئی خطرے والی بات ہوئی تو میں کال کروں گا۔ تم فوراً امی ابو کے گھر چلی جانا۔“

میں پریشان ہو گئی۔ ”کامی کیا خطرہ بہت زیادہ ہے۔“

اس نے سر ہلایا۔ ”میں جن لوگوں کے ساتھ ہوں وہ انسان کو انسان نہیں سمجھتے..... اب شاید میں بھی نہیں سمجھتا ہوں۔“

وہ جانے لگا تو میں اس کے پیچھے آئی۔ ”کچھ دیر تو رک جاؤ۔“

”اگر میں نے دیر کی تو مجھے جواب دینا مشکل ہو جائے گا میں بہانہ کر کے نکلا ہوں۔“

”اچھا پھر آؤ گے؟“

”ہاں کوشش کروں گا۔ میرے بارے میں امی ابو یا اپنے شوہر کو مت بتانا۔“

”میں کسی کو نہیں بتاؤں گی۔“

اس نے شازیب کو مجھ سے لے کر پیار کیا اور پھر اسے واپس کر کے سیڑھیاں اتر گیا۔ میں وہیں کھڑی روتی رہی۔ پھر نیچے کے پورشن میں رہنے والی رضیہ باجی نے آواز دی۔ ”شازیہ یہ تمہاری سیڑھیوں پر سامان کس کا پڑا ہے۔“

”میرا ہے باجی ابھی آکر لے رہی ہوں۔“ میں نے کہا اور آنسو صاف کر کے نیچے آئی۔ رضیہ باجی، ان کے شوہر اور تین بچے نیچے والے پورشن میں رہتے تھے۔ مجھے دیکھ کر انہوں نے کہا۔

”مجھے ایسا لگا جیسے اوپر سے کوئی تیزی سے نیچے گیا ہو، میں ڈر گئی کہ کوئی چور نہ ہو۔ باہر آکر دیکھا تو دہلیز پر سامان پڑا تھا۔“

میں زبردستی ہنسی۔ ”کوئی اور کیسے آئے گا میں ہی اوپر آئی تھی۔ شازیب تنگ کر رہا تھا اسے ابھی اسکول سے لائی ہوں۔“

میں سامان اوپر لے گئی۔ شکر ہے رضیہ باجی نے کامی کو نہیں دیکھا ورنہ وہ شک کر سکتی تھیں۔ کامی سے بات کر کے رہا سہا شک بھی دور ہو گیا تھا۔ وہ کامی ہی تھا۔ میرا اندازہ درست نکلا تھا کہ اسے جرائم پیشہ گروہ نے قبضے میں لیا ہوا تھا، وہ بہت ڈرا ہوا اور فکر مند تھا۔ ایک دن پہلے ہی وہ ایک آدمی کو قتل کر چکا تھا۔ میرا معصوم بھولا بھالا بھائی اب ایک ٹارگٹ کلر تھا اس کے باوجود وہ ان لوگوں سے ڈر رہا تھا تو اس سے اندازہ لگایا جا سکتا تھا کہ وہ کتنے خطرناک تھے۔ پھر کامی نے یہ کہہ کر میری تشویش اور بڑھا دی کہ ممکنہ طور پر وہ لوگ اب میری تلاش میں تھے۔ وہ اتنے محتاط تھے کہ اپنے آدمی کا کسی سے تعلق برداشت نہیں کر سکتے تھے۔ اگر وہ میرے گھر تک آجاتے تو یہاں میرے علاوہ میرا بچہ اور میرا شوہر بھی تھا۔ جیسے جیسے میں سوچ رہی تھی میری فکر بڑھتی جا رہی تھی۔ میں سوچوں اور فکروں میں اتنی گم ہوئی کہ شازیب کو کھانا دینا بھول گئی۔ وہ اسکول سے بھوکا آتا تھا اور یونیفارم بدلتے ہی اسے کھانا درکار ہوتا تھا۔ اس نے مجھے ہلایا۔ ”مما بھوک لگی ہے۔“

میں چونکی جلدی سے اس کا لباس تبدیل کیا منہ ہاتھ دھلایا اور پھر کھانا نکالا۔ مجھ سے کھایا نہیں جا رہا تھا مگر شازیب کو کھلا دیا۔ شام تک میں سوچتی رہی کہ اب مجھے کیا کرنا ہے؟ کیونکہ کامی نے مجھے کسی کو بھی بتانے سے منع کیا

تھا۔ مگر مجھے لگ رہا تھا کہ جو مسئلہ درپیش تھا اس سے میں اکیلے نہیں نمٹ سکتی تھی۔ اول کامی مل گیا تھا مگر وہ جرائم پیشہ لوگوں کے چنگل میں تھا۔ اسے نکالنا یا بچانا تھا۔ دوسرے ان لوگوں سے مجھے اور میرے گھر کو بھی خطرہ لاحق ہو گیا تھا اور مجھے اس کا بھی کوئی حل نکالنا تھا۔ یہ دونوں کام میرے بس سے باہر تھے۔ مجھے ابو اور جہانزیب کو اس بارے میں بتانا ہی تھا اور شام تک میں نے فیصلہ کر لیا کہ پہلے مجھے ابو سے بات کرنی چاہیے۔ ابو سمجھدار تھے اور وہ ہر صورت میرا فیور کرتے اور کامی کو بھی بچانے کی کوشش کرتے۔ جب کہ جہانزیب پہلے اپنے گھر کی فکر کرتے، انہیں کامی سے وہ لگاؤ نہیں ہو سکتا تھا جو ابو کو یا مجھے تھا۔ میں نے ابو کو کال کی اور انہیں مختصراً کامی کی آمد کا بتا کر آنے کو کہا۔

ابو خود بھی بے تاب ہو گئے تھے میرے فون کے پندرہ منٹ کے اندر وہ میرے گھر پر تھے اور انہوں نے آتے ہی پوچھا۔ ”کامی کب آیا تھا....؟ کیسا تھا....؟ کیا کہہ رہا تھا....؟ رکا کیوں نہیں؟“

”آرام سے ابو میں سب بتاتی ہوں۔“ میں نے انہیں پانی پیش کیا اور پھر آہستہ آہستہ سب بتایا۔ وہ خاموشی سے سنتے رہے۔ خاص طور سے جب کامی کا اعتراف بتایا کہ وہ قاتل بن گیا تھا اور دوسروں کے کہنے پر قتل کرتا تھا تو ابو کا چہرہ صدمے سے سفید پڑ گیا۔ میری بات سن کر وہ کچھ دیر خاموش رہے پھر انہوں نے کہا:

”کامی نے تمہیں یہ سب کسی دوسرے کو بتانے سے منع کیا تھا؟“

”جی ابو لیکن یہ بات ایسی تھی کہ میں کسی کو بتائے بغیر نہیں رہ سکتی تھی اور سب سے مناسب آدمی آپ ہی ہیں، جہانزیب سے بات کرتے ہوئے مجھے ڈر لگ رہا ہے۔“

”تم نے ٹھیک کیا جو مجھے بتا دیا۔“ ابو نے ٹھنڈی سانس لی۔ ”جہانزیب کو مت بتانا اور میرا خیال ہے اب کامی تم سے فون پر رابطہ کرے گا اسے منع کر دینا کہ یہاں نہ آئے۔“

”میں اسے منع نہیں کر سکتی۔“ میں نے تڑپ کر کہا۔

”تم اس سے کہنا کہ مجھ سے رابطہ کرے اور بہت احتیاط کرے۔“ ابو بولے۔ ”بیٹا یہ عام معاملہ نہیں ہے۔ کامی جن لوگوں کے چنگل میں پھنس گیا ہے وہ بہت سفاک ہوتے ہیں۔ ان کا کام ہی لوگوں کو قتل کرنا ہے۔ کامی ہماری زندگی سے نکل چکا ہے۔“

”ایسا نہ کہیں ابو۔“ میں رو دی تھی۔

”یہ حقیقت ہے میری بچی، ذہنی طور پر وہ پہلے ہی ہم سے دور ہو گیا تھا ورنہ اس طرح گھر چھوڑ کر کیوں جاتا۔“

”اسے ورغلایا ہو گا۔ آپ جانتے ہیں وہ باہر جانے والا لڑکا ہی نہیں تھا۔“

”تم ٹھیک کہہ رہی ہو لیکن اب وہ ایک قاتل ہے، تم خود سوچو اگر وہ ان لوگوں کے چنگل سے نکل بھی جاتا ہے تب بھی قانون سے تو نہیں بچ سکے گا۔ اس کا ہم میں سے کسی سے رابطہ کرنا ہمارے لیے بہت بڑا خطرہ ہے۔ مجھے اپنی جان کی پروا نہیں ہے لیکن تمہیں یا تمہاری ماں کو کچھ ہو تو مجھ سے برداشت نہیں ہو گا۔“

میں سمجھ رہی تھی ابو ٹھیک کہہ رہے تھے۔ میں کامی سے دیوانہ وار پیار کرتی تھی اور کرتی ہوں لیکن میرے لیے اولین ترجیح میرا بچہ اور میرا شوہر تھا۔ ان پر ذرا سی آنچ آئے مجھے برداشت نہیں تھا۔ میں نے ابو سے کہا۔ ”لیکن اگر کامی خود سے آ گیا؟“

”اول تو مجھے امید ہے اب وہ خود نہیں آئے گا وہ بھی اس خطرے کو سمجھتا ہے۔ اس کے باوجود وہ آ گیا تو تم اسے یہاں آنے سے منع کرو گی۔ ہاں وہ آنا چاہے تو میرے پاس آ جائے لیکن گھر پر نہیں۔“

میں پھر رو دی تھی۔ اتنے برسوں بعد کامی ملا تھا۔ ایک وقت تھا کہ وہ کچھ دیر کے لیے نظروں سے اوجھل ہو جاتا تو ہم سب بے قرار ہو جاتے تھے اور آج ہم چاہ رہے تھے کہ وہ ہمارے پاس نہ آئے۔ جہانزیب کے آنے کا وقت ہو رہا تھا اس لیے ابو مجھے رازداری کی تلقین کر کے چلے گئے۔ میں نے بڑی مشکل سے جہانزیب کے آنے تک خود کو نارمل کیا تھا اس کے باوجود انہیں شک ہو گیا تھا اور وہ پوچھنے لگے کہ میں روئی تھی۔ میں نے پھر بہانہ کیا کہ میری طبیعت ٹھیک نہیں، سر میں درد ہے اس لیے ایسی صورت ہو رہی ہے۔ جہانزیب مطمئن ہو گئے۔ میں نے بتایا کہ وہ سادہ مزاج شخص ہیں۔ مجھ سے محبت کرتے ہیں اس لیے میری ہر بات پر یقین کرتے ہیں۔ اگر میں انہیں کامی کے بارے میں بتا دیتی تو اس سے ان کی محبت اور اعتماد میں فرق نہیں آتا لیکن گھر کے ماحول میں ایک تناؤ آ جاتا اور میں نہیں چاہتی تھی کہ ایسا ہو۔ اسی لیے ممکن حد تک اس بات کو چھپانے کا فیصلہ کیا۔

کامی غیر متوقع سامنے آیا تھا۔ اس کے انداز سے لگ رہا تھا کہ وہ اس دوران میں اسی شہر میں رہا تھا۔ لیکن اس نے یہ نہیں بتایا کہ وہ کس طرح گھر سے نکلا؟ اس نے ہم سے رابطہ کیوں نہیں کیا؟ اور واپس کیوں نہیں آیا؟ کیا حالات تھے؟ جنہوں نے ایک معصوم فطرت لڑکے کو قاتل بنا دیا تھا۔ میں یہ سب جاننا چاہتی تھی اور صرف کامی بتا سکتا تھا کہ اس پر کیا گزری تھی۔ میں خطرے کے باوجود بے تابی سے اس کی طرف سے رابطے کا انتظار کرنے لگی۔ جب میرے موبائل کی بیل بجتی تو میں بھاگ کر اس امید پر دیکھتی کہ شاید کامی کی کال ہو۔ جب کال بیل بجتی تو میرا دل دھڑک اٹھتا تھا کہ شاید کامی آیا ہے۔ مگر اس دن کے بعد کئی دن اور پھر کئی ہفتے گزر گئے کامی نے رابطہ نہیں کیا۔ جب کامی نے مجھے خبردار کیا تھا تو میں محتاط ہو گئی تھی۔ میں برقع یا عبایا نہیں لیتی ہوں البتہ باہر جاتے ہوئے چادر لیتی ہوں مگر منہ کھلا ہوتا ہے۔ اب میں منہ بھی ڈھک لیتی تھی۔ باہر بھی کم جانے لگی تھی۔ البتہ شازیب کو لینے جانا پڑتا تھا تو اس کے لیے میں نے بازار والا راستہ چھوڑ دیا دوسرے راستے سے جاتی جو گلیوں کے درمیان سے گزرتا تھا۔

ابو تقریباً ہر روز کال کر کے پوچھتے تھے کہ کامی نے رابطہ کیا یا نہیں۔ جیسے جیسے وقت گزر رہا تھا خطرے کا احساس کم اور کامی کے لیے بے تابی بڑھ رہی تھی۔ تیسرے ہفتے سے میں دوبارہ بازار والے راستے سے جانے لگی کہ شاید وہاں پھر کامی نظر آئے۔ مگر اس پہلی ملاقات کو ایک مہینا ہو گیا اور کامی نے پھر رابطہ نہیں کیا۔ اب میں مایوس ہونے لگی تھی۔ شاید اسے موقع نہیں مل رہا تھا یا پھر اس پر پابندی لگا دی گئی تھی۔ وہ ہماری بہتری کے لیے ہم سے دور ہو گیا تھا۔ ہر روز اسے یاد کر کے میری آنکھیں اشکبار ہوتی تھیں۔ ابو تیسرے چوتھے دن آتے تو ہم باپ بیٹی مل کر ایک دوسرے کا بوجھ ہلکا کر لیتے تھے۔ ابو نے بتایا کہ آج کل امی بھی کامی کو بہت یاد کرتی ہیں اور رونے لگتی ہیں۔ وہ ماں تھیں شاید ان کی چھٹی حس نے کامی کے بارے میں اشارہ دیا تھا۔ وہ ابو سے کہتیں کہ وہ پھر کامی کو تلاش کرنے کی کوشش کریں۔ ابو انہیں سمجھا کر چپ ہو جاتے تھے۔ وہ امی کو حقیقت بتا بھی نہیں سکتے تھے۔

ان دنوں جہانزیب کی نائٹ شفٹ تھی۔ وہ سات بجے جاتے تو صبح سات بجے آتے تھے۔ جہانزیب کے جانے کے بعد میں نے شازیب کو کھانا کھلایا اور اسے لے کر ٹی وی کے آگے آ بیٹھی۔ خبریں آ رہی تھیں۔ ہیڈ لائنز میں ایک خبر نے مجھے چونکا دیا۔ پولیس نے ایک کارروائی کے دوران چند ٹارگٹ کلرز کو گرفتار کیا تھا۔ ایک مکان پر چھاپے میں چار افراد پکڑے گئے تھے اور وہاں سے بھاری مقدار میں اسلحہ بھی برآمد ہوا تھا۔ ان چار افراد کو منہ پر کپڑا ڈال کر میڈیا کے سامنے پیش کیا۔ میرا دل دھڑک اٹھا کیونکہ ان میں سے ایک نے ویسی ہی خاکی رنگ کی پتلون پہن رکھی تھی جیسی کامی نے اس دن پہنی تھی جب اس نے دکان والے کو مارا تھا۔ قد و قامت بھی ویسا ہی لگ رہا تھا۔ میں نے جلدی سے ابو کو کال کی وہ گھر جا رہے تھے۔ ابو رات آٹھ بجے تک اٹھ جاتے تھے پھر دکان ان کے ملازم دیکھتے تھے۔ وہ بھی گیارہ بارہ بجے بند کر کے چلے جاتے تھے۔

”کیا ہوا شازی؟“ ابو نے میرا ہیجان محسوس کر کے کہا۔ ”کامی کی کوئی خبر ہے۔“

”جی ابو۔“ میں نے انہیں ٹی وی خبر کے بارے میں بتایا۔ وہ پریشان ہو گئے۔

”یہ بہت برا ہوا۔“

”لیکن ابو کامی ان لوگوں کے چنگل سے تو نکل آئے گا۔“ میں نے امید سے کہا۔

”مگر پولیس اسے کہاں چھوڑے گی، عدالت اسے سزا سنا دے گی۔“ ابو بولے۔

”ابو پلیز آپ کوئی اچھا وکیل کریں جو اسے چھڑا لے۔“ میں نے التجا کی۔ ”ایک بار وہ آزاد ہو جائے تو اسے کہیں دور بھی بھیج سکتے ہیں۔“

”اب بھی تو وہ ہم سے دور ہی ہے۔“ ابو نے آہستہ سے کہا۔ ”خیر میں دیکھتا ہوں۔“

مجھے ابو کے انداز سے لگا کہ وہ شاید کچھ نہ کریں لیکن وہ اسی رات اس تھانے گئے جہاں ٹارگٹ کلرز حوالات میں تھے۔ ایک اخباری رپورٹر سے ابو کی اچھی سلام دعا تھی وہ انہیں ساتھ لے گئے۔ پولیس اسٹیشن میں ان لوگوں کو بڑی سخت نگرانی میں رکھا گیا تھا اور بڑی مشکل سے ابو کو اجازت ملی کہ وہ صرف ایک نظر دیکھ سکتے ہیں۔ ابو نے پولیس والوں سے کہا کہ ممکن ہے ان ٹارگٹ کلرز میں ان کا گمشدہ بیٹا بھی ہو۔ کامی واقعی ان میں تھا۔ وہ چاروں ایک ہی لاک اپ میں تھے اور ابو کو انہیں اس طرح دکھایا گیا کہ انہیں بھی پتا نہیں چلا تھا۔ ابو نے کامی کو پہچان لیا۔ وہ اس کی گمشدگی کے کیس کی مکمل فائل لے کر گئے تھے۔ اس میں کامی کے بارے میں ایف آئی آر سے لے کر اسے تلاش کرنے کے لیے جو کوششیں کی گئی تھیں اور اشتہارات دیے تھے ان سب کی تفصیل موجود تھی۔ پولیس نے تسلیم کیا کہ وہ گم شدہ کامی تھا

لیکن وہاں کے انچارج ڈی ایس پی نے کہا۔ ”سلمان صاحب اس سے کیا فرق پڑتا ہے۔ وہ ایک مجرم ہے اور اب تک اس نے قتل کی کئی وارداتوں کا اعتراف کرلیا ہے۔“

”وہ ذہنی طور پر کمزور ہے۔“

”یہ سب عدالت میں بتائیے گا۔“ ڈی ایس پی نے دوٹوک انداز میں کہا۔ وہ ابو کی بات سننے کو تیار ہی نہیں تھا۔ اس نے کہا کہ اتنا بھی اس نے ابو کے ساتھ آنے والے صحافی کی وجہ سے کر دیا تھا ورنہ یہ بہت حساس کیس تھا اور ملزمان سے کسی کو ملنے کی اجازت نہیں ہے۔ رپورٹر نے ابو کو مشورہ دیا کہ وہ فوراً کوئی وکیل کریں اور پھر وہ سب دیکھ لے گا۔ دکان دار ہونے کی وجہ سے ابو کا حلقہ احباب وسیع تھا۔ ان کے کئی وکیل واقف کار بھی تھے۔ ابو نے ایک وکیل سے بات کی اور وہ کامی کا کیس لینے کو تیار ہوگیا۔ یہ سب ابو نے مجھے تیسرے دن بتایا۔ ”ابھی میں نے تمہاری ماں کو بھی نہیں بتایا ہے۔ کیا تم یہ سب جہانزیب کو بتاؤ گی۔“

”اب تو بتانا پڑے گا ابو۔“ میں نے کہا۔ ”لیکن انہیں کامی کے ملنے اور اس دن واردات والی بات نہیں بتا سکتی۔“

”میرا مشورہ ہے جب بتانا ہے تو سب بتا دو، میاں بیوی میں اعتماد کا رشتہ مضبوط ہونا چاہیے۔“

”وہ بہت اچھے ہیں لیکن مجھے ڈر لگتا ہے۔“

”تم جیسے مناسب سمجھو بات کرلو۔“

میں نے جہانزیب سے بات کی اور انہیں ڈرتے ڈرتے سب بتا دیا۔ پہلے ان کا موڈ خراب ہوا تھا کہ میں نے اب تک یہ سب ان سے چھپایا تھا لیکن پھر میری مجبوری سمجھ کر ان کا موڈ ٹھیک ہوگیا۔ میں نے ان سے کہا کہ یہ بات کسی سے نہیں کہنی ہے کیونکہ صرف مجھے اور ابو کو پتا ہے اور وہ تیسرے فرد ہیں جنہیں یہ بات معلوم ہوئی ہے۔ جہانزیب نے کہا۔ ”تم فکر مت کرو میں سمجھتا ہوں۔ میں ابو سے بھی بات کرتا ہوں اگر انہیں میری کسی مدد کی ضرورت ہو۔“

”یہ اچھا رہے گا۔“ میں نے خوش ہو کر کہا۔

جہانزیب نے ابو سے بات کی لیکن ابو نے انہیں اس معاملے سے الگ رہنے کو کہا۔ ”بیٹا مجھے اب اندازہ ہو رہا ہے کہ کامی کن لوگوں کے ہاتھ میں تھا وہ بہت خطرناک لوگ ہیں اور ہمیں بہت محتاط رہنے کی ضرورت ہے۔ میں بھی سامنے آنے سے گریز کرتا ہوں سارے معاملات وکیل دیکھ رہا ہے۔“

جہانزیب کو بھی یہی خدشہ تھا۔ انہوں نے مجھ سے کہا۔ ”ابو نے ٹھیک مشورہ دیا ہے۔ میں سوچ رہا ہوں کہ ابھی شازیب کو اسکول سے روک لوں تم بھی گھر سے کم نکلو کرو۔“

”اور آپ.... آپ کو تو روز جانا ہوتا ہے۔“

”دیکھو، میری مجبوری ہے۔“ وہ بولے۔ ”لیکن میں بھی احتیاط کروں گا۔“

جہانزیب سے بات کرنے کے تیسرے دن ابو نے مجھے کال کی وہ بہت پریشان لگ رہے تھے۔ ”شازی مجھے ایک اجنبی نمبر سے کال آئی ہے اور کال کرنے والے نے دھمکی دی ہے کہ میں کامی کے کیس سے لاتعلق ہو جاؤں۔“

میں بھی پریشان ہوگئی۔ ”یہ کیسے ہوسکتا ہے اور وہ کیا کہہ رہا تھا۔“

”وہ کہہ رہا تھا کہ کامی اب ان کا آدمی ہے، وہ خود اسے رہا کرا لیں گے اور اگر میں نے اپنا وکیل کیس سے نہیں ہٹایا تو....“

”تو کیا ابو....؟“

”تو میرے ساتھ اور میرے گھر والوں کے ساتھ کچھ بھی ہوسکتا ہے۔ اس نے تمہارے حوالے سے بھی دھمکی دی ہے۔“

”تب آپ کیا کریں گے؟“

”میرے پاس کیس سے دست بردار ہونے کے سوا اور کوئی راستہ نہیں ہے۔ میں تم سب کی جان کا رسک نہیں لے سکتا۔“

”تب کامی کا کیا ہوگا؟“

”اس کا اللہ مالک ہے۔“ ابو نے سرد آہ بھری۔ ”بیٹا یہ بہت سفاک لوگ ہیں ہم ان کا مقابلہ نہیں کر سکتے۔“

اگلے دن ابو نے اپنے وکیل کو کیس سے دست بردار ہونے کا کہہ دیا۔ ابھی تک کامی اور اس کے ساتھی ریمانڈ پر پولیس کے پاس تھے اور چند دن بعد انہیں عدالت میں پیش کیا جانا تھا۔ میں کامی کو دیکھنے اور اس سے ملنے کے لیے تڑپ رہی تھی۔ میں نے سوچا کہ کامی کو عدالت میں جا کر دیکھ لوں گی مگر مجھے معلوم تھا کہ ابو یا جہانزیب مجھے اس کی اجازت نہیں دیں گے۔ جس دن کامی اور اس کے ساتھیوں کی عدالت میں پیشی تھی اس سے ایک دن قبل مجھے خیال آیا کہ میں خاموشی سے جا کر بھی تو کامی کو دیکھ سکتی تھی۔ شازیب کو امی کے پاس چھوڑ کر چلی جاتی اور چند گھنٹے میں واپس آجاتی۔ مجھے یہ خیال اچھا لگا۔ میں نے رضیہ باجی سے ان کا عبایا مانگ لیا۔ عبایا اور نقاب میں کسی کو کیا پتا چلتا کہ میں کون ہوں۔ اگلے روز جہانزیب کام پر گئے تو میں نے شازیب کو تیار کیا۔ اسے بتایا کہ آج نانا ابو کے گھر جانا ہے تو وہ خوش ہو گیا تھا۔ میں نے امی کو کال کر دی کہ میں شازیب کو چھوڑنے آ رہی ہوں مجھے شاپنگ کے لیے جانا تھا۔ رکشا کر کے میں امی کے گھر تک گئی اور شازیب کو وہاں چھوڑ کر اسی رکشے میں سٹی کورٹ کی طرف روانہ ہوگئی۔

مجھے معلوم تھا کہ قیدیوں کو دوپہر تک ہی پیش کیا جاتا ہے اس لیے مجھے امید تھی کہ کامی کو بھی گیارہ بارہ بجے تک وہاں لایا جائے گا اور میں اسے دیکھ لوں گی۔ سٹی کورٹ پہلی بار آئی تھی اور گھبرائی ہوئی تھی لیکن ایک شخص نے میری رہنمائی کی اور بتایا کہ پولیس کسٹڈی میں موجود ملزمان کو کہاں لایا جاتا ہے۔ میں وہیں گیٹ کے پاس کھڑی ہو گئی۔ اتفاق سے وہاں کئی اور عبایا پوش عورتیں تھیں --- جو آنے جانے والوں سے بھیک مانگ رہی تھیں۔ جن کے عزیز رشتے دار گرفتار ہوتے یا جن کے مقدمے چل رہے ہوتے تھے وہ ان عورتوں کو کچھ نہ کچھ دے رہے تھے۔ شاید لوگ مجھے بھی ان عورتوں میں سے ایک سمجھ رہے تھے اور مجھے شرم آ رہی تھی مگر دل کڑا کر کے وہاں کھڑی رہی۔ میں نو بجے ہی وہاں پہنچ گئی تھی۔ دس بجے اور پھر گیارہ بھی بج گئے۔ ابھی تک کامی اور اس کے ساتھی نہیں لائے گئے تھے جب کہ دوسرے ملزموں کی آمد کا سلسلہ جاری تھا بلکہ بعض تو اب واپس بھی جانے لگے تھے۔

پھر ایک پولیس بکتر بند گاڑی آ کر رکی اور اس سے چند پولیس والے اترے۔ انہوں نے بکتر بند سے چار افراد کو اتارا اُن کے چہرے پر غلاف چڑھے ہوئے تھے۔ ان میں سے ایک یقیناً کامی تھا۔ میرا دل تڑپ اٹھا تھا۔ میں کامی کو دیکھنے آئی تھی اور اس کا چہرہ ڈھکا ہوا تھا۔ مجھے خیال آیا کہ عدالت میں اس کے چہرے سے غلاف اتار لیا جائے گا تب میں اسے دیکھ سکوں گی۔ اس امید پر میں ان لوگوں کے پیچھے پیچھے عدالت کے کمرے تک پہنچ گئی۔ میری توقع پوری ہوئی اور جج کے سامنے ان لوگوں کے منہ سے غلاف اتار دیئے گئے۔ کامی ان چند ہفتوں میں بہت کمزور ہو گیا تھا۔ اس کا چہرہ ستا ہوا تھا اور آنکھوں کے گرد حلقے نمایاں تھے۔ ایسا لگ رہا تھا کہ اس پر تشدد کیا جاتا تھا۔ پولیس نے جج کو بتایا کہ ابھی تفتیش جاری ہے اس لیے مزید ریمانڈ دیا

گرینیڈا Grenada

ونڈوارڈ جزائر (غرب الہند) کے جنوب میں کیریبین کا ایک جزیرہ اور پارلیمانی مملکت۔ رقبہ: 133 مربع میل یا 338 مربع کلومیٹر۔ آبادی: (نیگرو 53 فیصد، مخلوط 42 فیصد، سفید فام ایک فیصد، دیگر 4 فیصد)۔ دارالحکومت: سینٹ جارجز۔ زبان: انگریزی۔ مذہب: مسیحی۔ سکہ: ایسٹ کیریبین ڈالر۔ مقننہ دو ایوانوں ایوانِ نمائندگان (15 ارکان) اور سینیٹ (13 ارکان) پر مشتمل ہے۔ تقریباً سارا علاقہ کوہستانی ہے۔ معیشت کا انحصار زراعت پر ہے۔ ناریل، کیلا اور چینی اہم برآمدی اشیا ہیں۔ ملکی ضرورت کے لیے چاول اور مکئی کاشت کی جاتی ہے۔ ساحل پر گیس اور تیل کے ذخائر دریافت ہوئے ہیں۔

گرینیڈا کے اصل باشندے آرواک انڈین تھے جنہیں کولمبس کے یہاں آنے (1498ء) کے فوراً بعد آدم خور انڈینوں (کرب) نے یہاں سے مار بھگایا۔ 1609ء میں یہاں انگریزوں نے قدم جمانے کی کوشش کی، لیکن فرانسیسیوں نے ان کی یہ کوشش ناکام بنا دی۔ 1650ء سے 1762ء تک یہ علاقہ فرانسیسیوں کے زیرِ تسلط رہا۔ اس کے بعد انگریزوں کے زیرِ نگیں آ گیا اور تقریباً دو سو سال تک انہی کے قبضے میں رہا، سوائے ایک مختصر عرصے کے (1779-83) جب امریکی انقلاب کے دوران، فرانسیسیوں نے انگریزوں پر غلبہ حاصل کر لیا تھا۔ 1833ء میں یہاں غلامی ممنوع قرار دے دی گئی۔ 1974ء میں انگریزوں نے اسے آزاد کر دیا اور یہ ملک اقوام متحدہ کا ممبر بن گیا۔

مرسلہ: زرین فیاض، کراچی

جائے۔ جج نے وارننگ کے ساتھ مزید دس دن کا ریمانڈ دے دیا۔ پولیس والوں نے دوبارہ کامی اور اس کے ساتھیوں کے چہرے ڈھک دیئے اور انہیں باہر لے جانے لگے۔

میں پیچھے تھی۔ ابھی وہ گیٹ کے پاس کھڑی بکتر بند کے نزدیک پہنچے تھے کہ ایک دھماکا ہوا اور پھر فائرنگ ہونے لگی۔ لوگ بدحواس ہو کر بھاگے۔ میں نے دیکھا کہ گیٹ کے آس پاس دھواں پھیلا ہوا تھا۔ مجھے ڈر لگا لیکن میں بھاگی نہیں اور ایک ستون کی آڑ میں ہو گئی۔ فائرنگ بس ایک منٹ ہوئی اور رک گئی۔ اس دوران میں دھواں بھی کم ہو گیا تھا۔ پولیس والے آ گئے تھے۔ یہ سب وہاں ہوا تھا جہاں کامی اور اس کے ساتھی تھے۔ میں بے قرار تھی کیونکہ اب ان میں سے کوئی نظر نہیں آ رہا تھا۔ پولیس والے لوگوں سے پیچھے ہونے کو کہہ رہے تھے اور لوگ دیکھنے کے لیے آگے بڑھتے جا رہے تھے۔ مشکل سے میں اس ہجوم سے راستہ بناتی آگے آئی تو بکتر بند کے پاس دو افراد پڑے تھے، پتا نہیں مر گئے تھے یا زخمی تھے لیکن ان کے کپڑے خون آلود تھے۔ یہ دونوں کامی کے ساتھی تھے۔ ان کے چہرے سے غلاف ہٹ گئے تھے۔ کامی نظر نہیں آ رہا تھا۔ میں نے آس پاس دیکھا۔ پھر آگے جا کر بکتر بند میں بھی جھانک لیا۔ ایک پولیس والے نے مجھ سے کہا۔

"بی بی کہاں گھسی آ رہی ہو، یہاں سے جاؤ، اِدھر خطرہ ہے۔"

"کیا ہوا ہے بھائی۔"

"دہشت گردوں نے حملہ کیا تھا اپنے ساتھی چھڑانے کے لیے۔ وہی مارے گئے۔"

"لیکن یہ تو چار تھے۔"

"دو بھاگ گئے ہیں۔"

کامی وہاں نہیں تھا اس لیے میں پیچھے ہٹ گئی۔ دونوں مرنے والوں کی لاشیں ہٹا دی گئیں اور پولیس آس پاس گاڑیوں کی تلاشی لے رہی تھی۔ یہ سوچ کر میرا دل تیزی سے دھڑکنے لگا کہ کامی بھاگ گیا تھا یا اس کے ساتھی اسے آزاد کرا کے لے گئے تھے۔ میں بھی وہاں سے نکل گئی۔ کچھ دور آ کر رکشا لیا اور امی کے گھر آ گئی۔ امی نے شاپنگ کا پوچھا تو میں نے بہانہ کیا کہ مجھے کچھ پسند ہی نہیں آیا۔ کچھ دیر رک کر میں شازیب کو لے کر گھر آ گئی۔ مجھے خیال آیا کہ شاید کامی اب میرے پاس آئے۔ ٹی وی میں اس بارے میں خبر آ رہی تھی اور اس سے بھی تصدیق ہوئی کہ حملہ آوروں نے پہلے دھوئیں کا بم مارا اور پھر فائرنگ کی جس سے دو ملزم مارے گئے اور دو فرار ہیں۔ پولیس کا کہنا ہے کہ حملہ آور اصل میں ملزمان کو ہی مارنے آئے تھے۔ کیونکہ اس واقعے میں اور کوئی شخص ہلاک یا زخمی نہیں ہوا تھا۔ شاید حملہ آور بچ جانے والے دو افراد کو ساتھ لے گئے۔ یہ سن کر میں پریشان ہو گئی۔ اگر کامی کے گروہ والے ان سب کو مارنے آئے تھے اور کامی کو لے گئے تھے تو اب اس کی جان خطرے میں تھی۔ میں سوچ رہی تھی کہ ابو سے بات کروں کہ میرے موبائل کی بیل بجی۔ اجنبی نمبر تھا۔ کامی سے ملنے سے پہلے میں اجنبی نمبر سے آنے والی کال ریسیو نہیں کرتی تھی۔ بعض اوقات لوگ تنگ کرنے کے لیے کال کرتے ہیں اور کسی لڑکی یا عورت کی آواز سن لیں تو اس نمبر پر مسلسل کال کرتے ہیں مگر جب کامی کو نمبر دیا تو اس کے بعد میں اجنبی نمبرز کی کال بھی ریسیو کر لیتی تھی۔

"ہیلو کون ہے۔"

"شازی میں ہوں کامی۔" دوسری طرف سے کامی کی کمزور سی آواز آئی۔ میں تڑپ گئی تھی۔

"کامی تم کہاں ہو.....؟ تم ٹھیک تو ہو نا؟"

"میں ٹھیک ہوں۔" اس نے کہا۔ "لیکن شازی تم سب خطرے میں ہو۔ تم شازیب اور جہانزیب بھائی کے ساتھ کہیں اور چلی جاؤ۔ امی ابو سے بھی کہو کہ کچھ دن کے لیے کہیں اور چلے جائیں۔"

"ہمیں کن سے خطرہ ہے؟"

"ان ہی لوگوں سے جن کے لیے میں کام کرتا ہوں، پکڑے جانے پر ہم ان کے لیے خطرہ بن گئے تھے۔ ان کی نشاندہی کر سکتے ہیں۔ انہوں نے آج حملہ کیا، میرے دو ساتھی مارے گئے لیکن میں اور میرا ایک ساتھی بچ کر فرار ہو گئے اب ہم ایک جگہ چھپے ہوئے ہیں۔ وہ میری تلاش میں تمہارے اور امی ابو کے گھر آ سکتے ہیں اور کچھ بھی کر سکتے ہیں تم لوگ فوراً نکل جاؤ ابو سے کہو دکان کچھ دن کے لیے بند کر دیں۔ وہ سب کے بارے میں جانتے ہیں۔"

میں کامی سے پوچھنا چاہتی تھی کہ وہ کہاں ہے لیکن اس نے کہا۔ "شازی ایک ایک لمحہ قیمتی ہے تم شازیب کو لے کر گھر سے نکل جاؤ اور پھر ابو سے رابطہ کرو۔"

کامی کے لہجے سے مجھے بھی خطرے کا احساس ہوا اور میں نے جلدی سے شازیب اور اپنا پرس لیا۔ باہر نکل کر رکشا لیا اور پھر ابو کو کال کی۔ میں نے ان سے کہا۔ "ابو کامی کی کال آئی تھی ایمرجنسی ہے آپ فوراً گھر پہنچیں میں بھی وہاں آ رہی ہوں۔"

جب میں گھر پہنچی تو ابو بھی آ گئے۔ میں نے جلدی سے انہیں کامی کے بارے میں بتایا۔ یہ سن کر امی کی حالت خراب ہو گئی کہ کامی نے ہم سے رابطہ کیا تھا۔ میں نے انہیں پانی دیا۔ "امی ہوش کریں ہم سب خطرے میں ہیں۔"

"تم لوگ تیار ہو جاؤ ہم یہاں سے جا رہے ہیں۔" ابو نے کہا۔

"کہاں ابو؟"

"میرے ایک دوست کا فلیٹ ہے۔ وہ دبئی میں ہوتا ہے اس کی چابی میرے پاس ہے۔ جلدی کرو۔"

مختصر سامان لے کر ہم نکل آئے۔ ابو نے موبائل پر اپنے ملازموں سے دکان بند کر کے گھر جانے کو کہا۔ میں نے جہانزیب کو کال کر کے صورتِ حال سے آگاہ کیا۔ ابو نے انہیں فلیٹ کا پتا سمجھا دیا تھا۔ انہوں نے کہا کہ وہ وہیں آ رہے ہیں۔ یہ فلیٹ ایک پوش علاقے میں تھا اور یہاں پڑوسی کو پڑوسی کی فکر نہیں ہوتی اس لیے کسی نے ہماری آمد کا نوٹس نہیں لیا۔ فلیٹ کے گارڈز ابو کو پہچانتے تھے۔ فلیٹ فرنش تھا سوائے خوراک اور ہمارے ذاتی سامان کے یہاں سب کچھ تھا۔ جب تک جہانزیب نہیں آئے مجھے دھڑکا لگا رہا تھا۔ وہ سخت پریشان تھے لیکن جب انہیں کامی کی کال کے بارے میں بتایا تو وہ بھی متفق ہو گئے کہ ہم نے ٹھیک فیصلہ کیا۔ اپنی زندگی کی بنیاد پر ایک فیصد رسک بھی زیادہ ہوتا ہے۔ کامی نے جس نمبر سے کال کی تھی وہ میں نے ابو کو دے دیا انہوں نے اس پر کال کی لیکن نمبر بند جا رہا تھا۔ ڈرتے ہوئے میں نے سٹی کورٹ جانے اور وہاں پیش آنے والے واقعے کا ذکر بھی کیا تھا۔ ابو اور جہانزیب خفا تو ہوئے تھے مگر انہوں نے زیادہ کچھ کہا نہیں۔ ابو کے مشورے پر جہانزیب نے اپنے بھائی کو کال کر کے کچھ دن کام پر نہ آنے کا کہہ دیا۔ وہ کھل کر انہیں بتا تو نہیں سکتے تھے لیکن ڈھکے چھپے انداز میں محتاط رہنے کا مشورہ دیا۔ جہانزیب نے مجھ سے کہا۔ "بندرگاہ کا علاقہ محفوظ ہے۔"

ابو کچھ دیر بعد کھانے اور بعض دوسری چیزیں لینے چلے گئے۔ واپس آ کر انہوں نے پھر کامی کو کال کی۔ فون بند جا رہا تھا وہ مسلسل کوشش کرتے رہے۔ جب انہوں نے تھک کر موبائل رکھ دیا تو کچھ دیر بعد اسی نمبر سے کال آئی۔ ابو نے جلدی سے کال ریسیو کی۔ میں اور امی بھی ان کے پاس آ گئے تھے خاص طور سے امی کامی کی آواز سننے کے لیے بے چین تھیں۔

"کامی....." ابو نے کہا۔

"ابو....." کامی کی رندھی آواز آئی۔

"کامی....." امی نے چیخ ماری۔ انہوں نے ابو سے موبائل لے لیا۔ "کامی کہاں ہے تو..... کہاں چلا گیا تھا۔" امی دہاڑیں مار کر رونے لگیں۔ بہ مشکل ابو نے انہیں چپ کرایا۔ کامی بھی مسلسل ان سے چپ ہونے کو کہہ رہا تھا۔ پھر اس نے کہا:

"میرے پاس زیادہ وقت نہیں ہے، میری بات سنیں۔"

ہم سب سہم گئے ابو نے ہمت کر کے پوچھا۔ "کیوں وقت نہیں ہے؟"

"ابو وہ مجھے تلاش کر رہے ہیں اور میں ان کو مل گیا تو....." کامی کہتے کہتے رک گیا۔ "آپ لوگ جہاں ہیں وہ جگہ محفوظ ہے؟"

"ہاں یہ جگہ محفوظ ہے۔"

"بس تو یہیں رہیں۔" کامی نے کہا۔ "کم سے کم دو تین دن کوئی باہر نہ نکلے۔"

"کامی تو کیوں گھر سے چلا گیا تھا؟"

وہ کچھ دیر خاموش رہا پھر اس نے کہا۔ "امی میں آپ لوگوں کی محبتوں کے باوجود خود کو اکیلا اور سب سے الگ محسوس کرتا تھا۔ پھر اسکول کے باہر میری ایک شخص سے ملاقات ہوئی۔ مجھے نہیں معلوم کہ وہ کون تھا لیکن اس نے مجھ سے بالکل نارمل انداز میں بات کی اور میں اس سے متاثر ہو گیا۔ لوگ مجھ سے ہمدردی رکھتے تھے یا پھر تنگ کرتے تھے، کسی نے آج تک نارمل بات نہیں کی تھی۔ اس نے مجھے ساتھ چلنے کو کہا اور میں راضی ہو گیا۔ اس نے کہا کہ میں اب دوبارہ واپس نہیں جاؤں گا۔ میں نے اس کی بات مان لی۔ امی، ابو اور شازی میں سب کے لیے ذمے داری تھا اور کسی کی ذمے داری نہیں اٹھا سکتا تھا اس لیے میں نے بہتر سمجھا کہ آپ لوگوں کی زندگی سے نکل جاؤں۔"

ابو نے پوچھا۔ "وہ آدمی اسی کا گروہ کا تھا؟"

"ہاں..... یہاں میرے جیسے کئی تھے جو اپنے گھروں میں بھی اجنبی تھے۔ وہ آدمی بعد میں مر گیا۔ اسے پولیس نے مار دیا تھا۔"

"یہ لوگ تم سے قتل کرواتے تھے۔"

کامی کچھ دیر کے لیے چپ ہوا پھر اس نے کہا۔ "ابو آپ یہ سب مت پوچھیں آپ کو اور دکھ ہوگا۔ میں ایک مشین ہوں جسے دوسرے لوگ چلاتے ہیں۔"

"کامی تم آجاؤ میں تمہاری حفاظت کروں گا تمہیں ملک سے باہر نکال دوں گا۔"

"نہیں ابو جب تک یہ لوگ ہیں میں اور آپ محفوظ نہیں ہیں۔" کامی نے انکار کردیا۔ "آپ مجھے بھول جائیں، میں ویسے بھی آپ لوگوں کی زندگی سے نکل چکا ہوں۔"

"ایسا مت کہہ کامی۔" امی بولیں۔ "اللہ تجھے جیتا رکھے.....تو واپس آجا۔"

"یہ ممکن ہوتا تو میں چھ سال پہلے واپس آجاتا لیکن مجھے بتادیا گیا تھا کہ اگر میں بھاگا تو شاید میں بچ جاؤں لیکن میرے گھر والے نہیں بچیں گے۔ ہماری نگرانی ہوتی تھی۔ یہ پیشہ ور قاتل گروہ ہے، مجھ جیسے لڑکوں سے کام لیتے ہیں۔ جب ہم پکڑے گئے تو انہوں نے ہمیں مارنے کی کوشش کی۔ میری زندگی تھی جو بچ گیا۔ شاید مجھے کوئی اہم... کام کرنا ہے۔ اچھا میں پھر کال کروں گا۔" اس نے کہتے ہوئے کال بند کردی اور موبائل بھی بند کردیا کیونکہ ابو نے فوراً نمبر ملایا تو وہ بند جارہا تھا۔ کامی سے بات کرکے ہمیں کچھ تسلی بھی ہوئی لیکن اس کی باتیں سن کر ہمارے خدشات مزید بڑھ گئے تھے۔ پچھلے کچھ عرصے سے سن رہے تھے کہ شہر میں بہت سے پیشہ ور قاتل بھی سرگرم عمل ہیں جو رقم کے بدلے کسی کو بھی ماردیتے ہیں۔ یہ بھی ایسا ہی کوئی گروہ لگ رہا تھا۔ کامی نے منع کیا تھا اس لیے اب کوئی باہر نہیں جارہا تھا۔ مجھے مشکل تھی کہ شازیب کے دو تین جوڑے تھے لیکن گزارہ ہورہا تھا۔ یہاں ٹی وی تھا وقت گزاری کے لیے ٹی وی دیکھتے تھے۔ خاص طور سے نیوز چینل کیونکہ سب کے ذہن میں تھا کہ اگر کامی کے حوالے سے کوئی خاص بات ہوئی تو وہ ٹی وی پر ضرور آئے گی۔

دوسرے دن شام کے وقت کامی کی کال آئی اور اس بار میرے نمبر پر آئی۔ اس نے کہا۔ "شازی میں تم لوگوں سے بات کرنا چاہتا ہوں امی ابو کہاں ہیں؟"

امی ابو بھی تھے۔ کامی نے ہم سب سے بہت دیر تک باتیں کیں۔ وہ بچپن کی یادیں شیئر کرتا رہا اور بار بار ہم سے کہتا رہا کہ ہم اسے معاف کردیں۔ جب وہ امی سے بات کر رہا تھا تو میں ابو کو ایک طرف لے گئی۔ "مجھے لگ رہا ہے کامی کے ذہن میں کوئی خاص بات ہے وہ تبھی اس طرح بات کر رہا ہے۔"

"مجھے بھی یہی خدشہ ہے۔" ابو بولے۔ "لیکن ہم کیا کرسکتے ہیں۔"

کامی نے جہانزیب سے بھی بات کی اور پھر شازیب سے بھی، آخر میں جب میرے پاس موبائل آیا تو میں وہاں سے ہٹ گئی اور کامی سے کہا۔ "تم اس طرح کیوں بات کر رہے ہو؟"

"کس طرح؟"

"جیسے.....جیسے آخری بار بات کر رہے ہو۔" میری آواز بھرا گئی۔

"شازی میں تم سے جھوٹ نہیں بول سکتا۔ شاید میں آخری بار بات کر رہا ہوں۔ ہوسکتا ہے کل تک میں اس دنیا میں نہ رہوں۔"

"ایسا نہ کہو۔" میں نے تڑپ کر کہا۔

"شازی اپنا بہت سا خیال رکھنا اور میری مغفرت کی دعا کرنا میں بہت گناہ گار انسان ہوں۔"

"کامی پلیز....." میں رودی تھی لیکن اس نے کال بند کردی اور حسب معمول سیل آف کردیا۔ میں شدت سے رو دی تھی۔ امی بھی رونے لگی تھیں۔ ابو کے تاثرات بھی ایسے تھے جیسے جوان بیٹے کا جنازہ تیار ہو۔ گھر کی فضا ماتمی ہوگئی تھی۔ اس رات شاید ہی کسی کو نیند آئی ہو سوائے شازیب کے۔ میں روتی رہی اور جہانزیب مجھے چپ کراتے رہے۔ اگلی صبح ہم سب ٹی وی کے سامنے بیٹھے تھے لیکن خبر دوپہر میں آئی۔ پولیس کے مطابق شہر کے ایک گھر میں فائرنگ کے واقعے میں پانچ افراد ہلاک ہوئے ان میں سے دو وہ ملزمان تھے جو سٹی کورٹ سے فرار ہوئے تھے۔ خبر میں ہلاک ہونے والوں کی لاشیں نہیں دکھائی گئی تھیں لیکن ہم جانتے تھے کہ ان میں کامی بھی شامل تھا۔ بعد میں پتا چلا کہ کامی اور اس کے ساتھی نے ان تین افراد کو ماردیا جو اس قاتل گروہ کے سرغنہ تھے اور ان کی جوابی فائرنگ سے وہ دونوں بھی مارے گئے۔ کامی نے اپنی جان دے کر ہمارے سروں پر لٹکی تلوار ہٹادی۔ چھ سال بعد ہمیں کامی مل گیا لیکن لاش کی صورت میں۔ ہم بہت روئے دھوئے مگر پھر قرار آگیا۔ ہمیں کم سے کم یہ تو معلوم تھا کہ کامی اب کہاں ہے۔ اس کی یاد آئے تو اس کی قبر پر تو جاسکتے ہیں۔

بوجھ

جناب مدیر سرگزشت

تسلیم!

میں ایک ریٹائرڈ جیلر ہوں۔ برسوں قبل جب میں آن ڈیوٹی تھا تو میری جیل میں ایک سزائے موت کا قیدی آیا تھا۔ بہت معصوم۔ اتنے برسوں بعد بھی مجھے وہ قیدی یاد ہے۔ اس کا چہرہ نظروں میں ہے۔ واقعی کیا وہ بے قصور تھا، یہ راز آپ کو آخر میں ہی معلوم ہوگا۔ میں اتنے دنوں بعد اس واقعہ کو قلمبند کررہا ہوں لیکن ایسا لگ رہا ہے جیسے کل کا واقعہ ہو۔

انیس الرحمن
(میرپور آزاد کشمیر)

رات کا پہلا پہر تھا، ہر طرف سناٹے کا راج تھا۔ گھڑیال نے گیارہ کا گجر بجایا تو میں اپنے دفتر سے اٹھ گیا۔ میرے قدم اس بیرک کی طرف اٹھ رہے تھے جس میں نفیس کو رکھا گیا تھا، وہ اسم بامسمیٰ تھا۔ نہایت نفیس اور شستہ زبان بولنے والا۔ اس کا بیرک سب سے الگ تھلگ تھا۔ میں دھیرے دھیرے اسی طرف بڑھتا جارہا تھا۔ مختلف جگہ ڈیوٹی پر تعینات سپاہی کھڑے تھے جو مجھے دیکھ کر الرٹ ہوجاتے تھے۔ سلام کا جواب دیتے ہوئے میں اس مخصوص بیرک کی

طرف بڑھتا جارہا تھا۔ اس بیرک کے سامنے پہنچ کر میں کھڑا ہوگیا۔ نظر گھما کر سلاخوں کے پار دیکھا۔ وہ بستر پر سر جھکائے بیٹھا ہوا کسی گہری سوچ میں گم تھا۔ میں نے کھنکھار کر اسے متوجہ کیا۔ اس نے سر اٹھا کر میری طرف دیکھا۔ اس کے ہونٹوں پر پھیکی سی مسکراہٹ بکھر گئی، میں نے اسے آواز دی" کیسے ہو نفیس؟"

"جی بہتر ہوں۔"

"سگریٹ پیو گے۔"

"تھینکس، میں نے کبھی نہیں پی۔" اس نے بیٹھتے ہوئے کہا۔ "تھینکس میری بیوی کا تکیہ کلام تھا۔"

"اچھا...... شاید شکریہ کہنے کی اس کی عادت ہوگی۔ یہ ایک اچھی عادت ہے۔"

"جی ہاں، وہ بات بات پر تھینکس کہتی تھی۔" نفیس نے سرشار لہجے میں بتایا۔ اس کا لہجہ چغلی کھا رہا تھا کہ وہ اپنی بیوی سے بہت محبت کرتا تھا۔

"اچھا نفیس یہ بتاؤ کچھ کھانے کا دل ہے، بولو کیا کھاؤ گے؟"

"کیا میری پھانسی کا آرڈر آگیا ہے؟" اس نے چونک کر پوچھا۔

"کیس عدالت میں ہے مجھے کیا خبر۔" میں نے نظریں چرا کر کہا۔ "تم نے یہ سوال کیوں پوچھا۔"

"آپ نے خواہش کا جو پوچھا۔" اس کے ہونٹوں پر طنزیہ مسکراہٹ پھیل گئی تھی۔ شاید نہیں یقیناً وہ بات کی تہ تک پہنچ گیا تھا۔

"تم نے بتایا نہیں، کیا کھانا چاہتے ہو؟" میں نے نظریں چراتے ہوئے کہا۔

"آپ نے پوچھ ہی لیا تو نجی کھلا دیں۔" وہ مسکرا کر بولا۔

مسکراتے وقت اس کے ہونٹوں پر نسوانی کھنچاؤ سا پیدا ہو جاتا جو کچھ عجیب سا لگتا، مرد پر مردانگی کی چھاپ ہی بہتر لگتی ہے۔ جب سے وہ میری جیل میں آیا ہے وہ پابندی سے نائی کے پاس جاتا ہے۔ شاید کلین شیو رہنا اسے بہت پسند تھا۔ عام قیدیوں کو یہ سہولت نہیں دی جاتی لیکن اس کے ساتھ میں نے رعایت کی تھی۔ ایک مہینا پہلے نائی سے کہہ دیا تھا کہ وہ اس کی فرمائش پوری کر دیا کرے۔ صبح ہی صبح نائی اس کے بیرک میں آجاتا۔ اس کی شیونگ کے بعد ہی نائی کسی دوسری طرف جاتا تھا۔ اس وقت بھی صبح کی شیو کا تازہ پن نظر آرہا تھا۔ میں نے اس کے چہرے پر نظریں جما کر کہا" یخنی ابھی منگوا دوں، کوئی خاص دکان؟ جہاں کی نجی زیادہ پسند ہے؟"

"جی نہیں، بس نجی ہو، یہی کافی ہے۔" وہ بولا۔ "دراصل نجی میری بیوی کو بہت پسند تھی۔" اس نے پھر قہقہہ لگایا۔ بات بات پر اس کا قہقہہ لگانا مجھے عجیب سا لگتا تھا۔ میں سمجھ رہا تھا کہ یہ قہقہے کھوکھلے ہیں۔ وہ زبردستی قہقہہ لگاتا ہے مگر میں اسے روکنا بھی نہیں چاہتا تھا کیونکہ میں سمجھ رہا تھا کہ وہ ہنسی کے پردے میں اپنا غم چھپانا چاہتا ہے۔ وہ اسی سعی میں مصروف تھا۔ قہقہے کی گونج ختم ہوئی تو وہ سلاخوں کے مزید نزدیک آگیا اور بولا۔ "جانتے ہیں میری بیوی نجی کیوں پسند کرتی تھی؟"

"کیوں؟"

"ایک بار میں نے سوال کیا تھا بلکہ باتوں کے جواب میں کہا تھا کہ تمہیں نجی کیوں پسند ہے تو وہ بولی تھی، جنت میں نجی تو ملے گی نہیں، کیوں کہ نجی کے لیے جانور کو ذبح کیا جانا ضروری ہے اور جنت میں کسی کو ذبح کیا نہیں جاسکتا۔ اس لیے میں زندگی میں زیادہ سے زیادہ نجی کھا لینا چاہتی ہوں۔" اس نے پھر قہقہہ لگایا۔

"گویا تم بھی اسی لیے نجی کھانا چاہتے ہو۔" میں نے بھی ہنس کر جواباً کہا۔

"یہ بات بھی ہے اور دوسری بات یہ ہے کہ نجی کھانے سے جسم گرم رہتا ہے۔ یہ بات بھی میری بیوی نائلہ نے کہی تھی۔" اس نے پھر قہقہہ لگایا۔

"ہاں یہ بات تو ہے کہ نجی جسم میں گرمی پیدا کرتی ہے۔"

"جسم کی گرمی پر ایک واقعہ یاد آگیا۔ گو کہ یہ واقعہ کچھ شرمناک ہے مگر سنا دیتا ہوں۔" اس نے کچھ شوخ لہجے میں کہا۔

میں سمجھ رہا تھا کہ وہ ذہن میں پیدا ہونے والے ہیجان سے بچنے کے لیے ایسی باتیں کر رہا ہے۔ قہقہے میں خود کو چھپا رہا ہے۔ میں خود بھی یہی چاہتا تھا اس لیے اسے زیادہ سے زیادہ موقع دے رہا تھا۔ اس لیے کہا۔ "ہاں تم کوئی واقعہ سنا رہے تھے۔"

"جی، یہ واقعہ میری سہاگ رات کا ہے، میں ٹھہرا کراچی کا بندہ۔ شادی ہوئی شیخوپورہ کی لڑکی سے۔ دراصل نائلہ میرے دور کی رشتے دار تھی۔ اماں نے پسند کیا اور مجھے ہاں کرنی پڑی۔ برات کراچی سے گئی تھی اس لیے پہلی رات کا انتظام وہیں کیا گیا تھا۔ وہ سردی کا موسم تھا اور میں ٹھہرا

کراچی والا۔ جہاں سردی بس احساس کرانے کو آتی ہے کہ سردی کا احساس کرنا ہو تو دسمبر جنوری میں آئسکریم کھا کر کمبل اوڑھ لو۔ گویا کراچی کے پروردہ کے لیے شیخوپورہ کی سردی، میں کانپنے لگا تھا۔ اس حالت میں مجھے دلہن کے پاس بھیجا گیا۔ میں سکڑا سمٹا اس کے سامنے پہنچا اور بیڈ پر بیٹھتے ہی پوچھا۔ "کیا شیخوپورہ والے بغیر کمبل کے رات گزارتے ہیں؟" میری بات پر دلہن نے مسکرا دیا پھر اٹھ کر بیڈ کے نیچے سے کمبل نکالا اور مجھے دیتے ہوئے بولی" میری سہیلیوں نے یہ حرکت کی ہے۔ ان کا کہنا تھا کہ اگر کراچی والے نے کمبل کی فرمائش نہیں کی اور رات گزار لی تو سمجھ لینا اس میں بہت گرمی ہے سردی سہنے کی گرمی۔ اس کا اندازہ لگانے کا یہ آسان طریقہ ہے۔ تو جناب میں اپنے سیدھے پن میں پہلے ہی امتحان میں فیل ہوگیا تھا۔" وہ بات ختم کرکے مسکرانے لگا تھا۔

میں نے نرم لہجے میں اجازت لی اور اپنے دفتر کی طرف چل پڑا۔ رات میں ہی اس کے تمام کام نمٹانے تھے۔ کاغذات مکمل کرنے تھے۔ میں اپنے کمرے میں پہنچ کر اس کی فائل دیکھنے لگا تبھی ایک بات نظر آگئی جس کے متعلق پوچھنے دوبارہ اس کے پاس آنا پڑا۔ وہ اسی طرح فرش پر پالتی مارے بیٹھا تھا۔ مجھے دیکھتے ہی اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ آگئی۔ وہ مسکراتے ہوئے بولا۔ "گویا میرا شک مکمل ہے کہ میرے لیے پھانسی کا حکم نامہ جاری ہو چکا ہے۔"

"یہ بات کیوں ذہن پر بٹھالی ہے۔ جو حکم نامہ جاری ہوگا اسے تعمیل کرنا میری مجبوری ہے۔ حکم نامہ آئے گا تو میں تمہیں بتا دوں گا۔"

"میری بیوی کی بھی یہی عادت تھی کہ وہ ہر بات کھل کر نہیں بتاتی تھی۔ جب میں پوچھتا تو کہتی۔ "بتا دوں گی۔"

"تم اپنی بیوی سے بہت محبت کرتے تھے؟"

"جی ہاں بہت محبت کرتا تھا۔" کہہ کر وہ دیوار کو گھورنے لگا جیسے دیوار پر اس کی بیوی کی تصویر چسپاں ہو پھر وہ گہری سانس لے کر بولا۔ "اسی بیوی کے قتل کا الزام مجھ پر لگا ہے۔ اسی الزام کے تحت مجھے پھانسی دی جائے گی۔"

میں نے اس کے غمزدہ چہرے پر نظریں جما کر پوچھا۔ "تم اتنے وثوق سے کیسے کہہ سکتے ہو کہ تمہیں پھانسی ہوگی۔"

"حالات و واقعات یہی بتاتے ہیں۔ نچلی عدالت نے بھی میرے ساتھ انصاف نہیں کیا، یہی کچھ اعلیٰ عدالت بھی کرے گی۔ قانون ثبوت کی عینک سے انصاف تلاش کرتا ہے اور وکیل نے میرے خلاف ثبوت کا پہاڑ کھڑا کر دیا ہے۔ پورے دو سال ہوگئے۔ اس عرصے میں کتنے سارے واقعات سامنے آئے۔ میں دم بخود ہوں کہ لوگ ایک چہرے پر کتنے چہرے سجائے رکھتے ہیں۔ کیوں احسان فراموشی پر آمادہ ہو جاتے ہیں۔"

"کس نے احسان فراموشی کی؟" میں پوچھے بغیر نہ رہ سکا۔

"آخری پیشی پر مخالف وکیل نے جو گواہ پیش کیا تھا میں اس کے متعلق بتا رہا ہوں۔" اس نے دکھی لہجے میں کہا۔

"وہ کون تھا؟" میں نے پوچھا۔ دراصل میں اس کو موقع دینا چاہتا تھا کہ وہ اپنے دل کی ہر بات بتا دے۔ اس کے دل میں کوئی بات رہ نہ جائے۔

اس نے اسی غمزدہ لہجے میں بتانا شروع کیا۔ "مجھے جب کٹہرے میں پہنچایا گیا تو مخالف وکیل نے پہلا سوال کیا، کیا یہ بات صحیح ہے کہ آپ کے گھر جمیلہ آتی تھی۔ میں نے اثبات میں سر ہلایا تو وہ بولا۔ اس کی عمر کیا ہوگی۔ جواباً میں نے کہا کہ یہی کوئی چودہ پندرہ سال، سولہ بھی ہو سکتی ہے۔ میرے جواب پر وکیل نے مسکراتے ہوئے کہا۔ گویا وہ کھلتی ہوئی کلی ہے۔ اسی وجہ سے آپ کے گھر میں میاں بیوی میں جھگڑا ہوا کرتا تھا۔

میں اس کا مفہوم سمجھ گیا تھا۔ وہ ایک رکیک الزام لگا رہا تھا۔ میرے اندر غصے کی لہر اٹھ رہی تھی مگر یہ موقع نہیں تھا۔ اگر غصے میں آجاتا تو بات مزید بڑھ جاتی اسی لیے اپنے لہجے کو نرم بنا کر میں نے جواب دیا۔ "ایسا کون سا گھر ہے جہاں میاں بیوی میں تکرار نہیں ہوتی لیکن اس تکرار کا آپ غلط مطلب لے رہے ہو۔ میری بیوی میری زندگی تھی۔ میں اسے بہت چاہتا تھا اسی لیے وہ کبھی کبھی کچھ زیادہ ہی بول جاتی تھی مگر میں اس کی بات کا برا نہیں مناتا تھا۔ نہایت رسان سے بول کر اس کے غصے کو ٹھنڈا کر دیا کرتا تھا۔"

میرے جواب پر وکیل نے کہا۔ "کیا یہ بات صحیح ہے کہ آپ کی بیوی اسے پسند نہیں کرتی تھی اور نوکری سے نکالنے کی بات کرتی تھی۔"

اس کی اس بات پر مجھے یاد آگیا کہ اس واردات سے دو دن پہلے کی بات ہے۔ میری بیوی نے ناخوشگوار لہجے میں کہا تھا کہ وہ جمیلہ کو نوکری سے نکالنا چاہتی ہے۔ دوسری ماسی ڈھونڈ رہی ہے۔ میں نے پوچھا تھا کہ وہ ایسا کیوں سوچ

رہی ہے تو اس نے کہا تھا کہ مجھے اس کے چال چلن پر شبہ ہے۔ وہ گھنٹے گھنٹے بھر چوکیدار کے کمرے میں گھسی رہتی ہے۔ اس پر میں نے کہا تھا، تو کیا ہوا۔ وقت گزاری کے لیے گپیں لگانے جاتی ہوگی۔ بچی ہے اتنی چھوٹی چھوٹی باتوں کو نظر انداز کرنا ہی بہتر ہوگا۔

''او جہہ اپنی ہے۔'' میری بیوی نے منہ ٹیڑھا کر کے کہا۔ ''بچی نہیں، بچی حرافہ ہے۔''

وہ بضد تھی کہ اسے نکال دیا جائے اور میں نہیں چاہتا تھا کہ کسی کے پیٹ پر لات پڑے، اس بات پر کافی دیر بحث ہوتی رہی۔ میں نے سمجھانے کے لیے کہا بھی کہ چوکیدار کا کیبن اتنا بڑا نہیں ہے کہ کوئی غلط بات سوچی جائے مگر اس کی رٹ تھی کہ جمیلہ جب بھی واپس آتی ہے اس کے جسم سے بگلا سگریٹ کی ناگوار بو آتی ہے۔ یہ بو ہی اس کا جرم ثابت کرنے کو کافی ہے۔

اس دن کے بعد بھی وہ کئی بار لڑی کہ آخر آپ کو اس لڑکی سے اتنی ہمدردی کیوں ہے اور میرا ایک ہی جواب تھا کہ انسانی ہمدردی۔''

وہ اپنی بات ختم کر کے خاموش ہوگیا۔

اس کی باتوں کا انداز بہت پیارا تھا۔ وہ ٹھہر ٹھہر کر نپے تلے انداز میں بولتا تھا اور اس کی یہی بات مجھے پسند تھی۔ کاش اس سے میری ملاقات یہاں نہ ہوئی ہوتی۔ بہ حیثیت قیدی نہ ملا ہوتا تو میں اسے دوست بنالیتا۔ خوب باتیں کرتا۔ یوں بھی میں یار باش آدمی کہلاتا ہوں۔ میرے بہت سے دوست ہیں جن کے ساتھ بیٹھ کر میں گھنٹوں باتیں کرتا ہوں۔ خود بولتا کم ہوں لیکن دوسروں کو بولنے کا موقع زیادہ دیتا ہوں۔ یہی میری عادت ہے۔ اس طرح دوسروں کا تجربہ پورا پورا خود میں سلب کر لیتا ہوں۔ ایک یہی نہیں، کئی اور قیدیوں سے بھی میں اسی طرح گھل مل کر باتیں کرتا ہوں۔ جیل میں آنے والے زیادہ تر قیدی محبت کے بھوکے ہوتے ہیں اس لیے وہ میرے سامنے اپنی پوری زندگی کھول کر رکھ دیتے ہیں۔ اپنا تمام درد بیان کر دیتے ہیں۔ جیسے یہ اپنی ایک ایک بات بیان کرتا جا رہا ہے۔ میں نے اس کے چہرے پر سے نظر ہٹا کر کہا۔ ''بگلا کی بو تو مجھے بھی سخت ناپسند ہے۔ ہر سگریٹ کی بو مجھے پسند نہیں۔ اس اردلی کو بھی میں ناپسند کرتا ہوں جو مجھے ملا ہے کیونکہ وہ چین اسموکر ہے۔ دن بھر میں بگلا سگریٹ کی کئی ڈبی پیتا ہے۔ آخری پیشی پر کیا ہوا جس کی وجہ سے انسانیت پر سے تمہارا اعتماد متزلزل ہوا۔ اگر مناسب سمجھو تو یہ بھی بتا دو۔''

''اجی صاحب ہونا کیا تھا۔ اس دن جب مجھے کٹہرے میں کھڑا کیا گیا تو مخالف وکیل نے ایک رکیک الزام لگا دیا کہ آپ اور آپ کی بیوی کے درمیان تکرار ہوتی تھی اور اس کی وجہ جمیلہ تھی۔ وہ چودہ پندرہ سال کی بچی۔ یہ کوئی نئی بات نہیں ہے، اکثر گھروں میں غربت کا فائدہ اٹھانے کے لیے گھر کے مرد ماسیوں کی بچیوں پر ہاتھ صاف کرتے رہتے ہیں۔ آپ بھی اسی تاک میں تھے اور آپ کی راہ میں آپ کی بیوی آگئی۔''

''جی نہیں، یہ غلط ہے۔'' میں نے چیخ کر کہا تھا۔

''پھر حقیقت کیا ہے۔ اس روز کیا ہوا تھا کھل کر بتائیں۔'' وکیل نے طنزیہ ہنسی ہنستے ہوئے کہا۔ کسی نے سچ کہا ہے کہ پیدا ہوا وکیل تو شیطان نے کہا، لو آج ہم بھی صاحب اولاد ہوگئے۔ واقعی وہ وکیل شیطان کی اولاد تھا۔ اس نے الزامات کی بوچھاڑ کر دی تھی۔ میں جتنا خود کو بچانے کی کوشش کر رہا تھا وہ اسی قدر تیزی سے مجھے دلدل میں کھینچ رہا تھا۔ اس کے سوال کا جواب دینے کے لیے میں اس دن کے واقعات یاد کر رہا تھا کہ اس نے زوردار آواز میں کہا۔ ''نئی کہانی بنا رہے ہیں۔ کچھ بھی کر لیں، لیکن حقیقت کو جھٹلا نہیں سکتے۔ آپ نے جرم کیا ہے۔ ایک گھناؤنا جرم آپ مجرم ہیں۔''

اس کی اس بات پر میرے وکیل نے کھڑے ہو کر کہا۔ ''اپنی بات کو کسی کے منہ سے کہلوانا صحیح نہیں ہے۔ میرے قابل دوست کو اپنے جرح کا انداز بدلنا ہوگا۔''

مخالف وکیل نے میرے وکیل کی بات پر مسکرا کر کہا۔ ''تو یہ جواب دینے میں اتنی دیر کیوں کر رہے ہیں۔'' اس تابڑ توڑ حملے سے گھبرا کر میں نے جلدی سے کہا۔ ''اس دن میں دفتر میں کام نمٹا رہا تھا کہ بیوی کا فون آیا، فوراً آ جائیں۔ اس بے وقت کے بلاوے پر میں نے پوچھا۔ کوئی خاص بات، ایسی کیا بات ہوگئی۔ تمہارے لہجے سے ایسا لگ رہا ہے کہ تم کافی غصے میں ہو۔''

''بس میں نے کہہ دیا نا، جلدی آ جائیں۔'' یہ کہہ کر اس نے فون رکھ دیا۔ وہ کوئی بھی بات کھل کر کہتی ہی نہیں تھی۔ ہر بات کو چھپا لیتی تھی یا بہت بعد میں بتاتی تھی۔ اس کی اس عادت سے میں پریشان رہتا تھا۔ فون آ چکا تھا۔ لہجے میں بھی کچھ خاص تبدیلی محسوس ہوئی تھی اسی لیے میں نے دفتر سے چھٹی لی اور گھر کی طرف روانہ ہوگیا۔''

''اور گھر پہنچ کر آپ نے کام دکھا دیا۔'' مخالف وکیل نے پھر زبانی حملہ کر دیا۔

میں نے خود پر ضبط کر کے جواب دیا۔ ''جب میں گھر پہنچا تو باہر کا گیٹ کھلا ہوا تھا۔ چوکیدار اپنے کیبن میں موجود نہیں تھا۔ اکثر وہ نکڑ کی دکان سے سگریٹ لینے چلا جاتا تھا۔ دکان زیادہ دور نہیں تھی اس لیے دروازہ کھلا چھوڑ جاتا تھا۔ اس لیے میں نے توجہ نہیں دی اور اندر داخل ہوگیا۔ برآمدے کا مرکزی دروازہ بھی کھلا ہوا تھا جبکہ میری بیوی کی عادت تھی کہ وہ اندر والے دروازے کو بند رکھتی تھی۔ اتنی اہم بات کی جانب بھی میں نے توجہ نہ دی اور اندر داخل ہوگیا۔ اندر پہنچ کر میں نے نائلہ کو آواز دی مگر اس نے جواب نہیں دیا۔ پھر میں نے جمیلہ کو آواز دی۔ وہ بھی غائب تھی۔ میں نائلہ کو آواز دیتا ہوا ڈرائنگ روم سے ڈائننگ اور پھر بیڈ روم میں آ گیا مگر وہ نظر نہ آئی۔ میں نے باتھ روم میں بھی جھانک کر دیکھ لیا وہ وہاں بھی نہ تھی۔ باتھ روم خالی پڑا تھا۔ تب میں کچن کی طرف بڑھا۔ نائلہ کچن میں ہوتی تھی تو ہانڈی کی خوشبو ڈائننگ روم میں پھیلی رہتی اور میری آواز بھی بہ آسانی سن لیتی اس لیے میں نے ادھر توجہ نہیں دی تھی مگر جب کہیں نظر نہ آئی تو میں اس طرف چل پڑا۔ کچن میں جھانکتے ہی میری اوپر کی سانس اوپر اور نیچے کی نیچے رہ گئی۔ وہ فرش پر چت پڑی تھی۔ اس کا گلا کٹا ہوا تھا۔ یہ دیکھ کر میرے ہوش اڑ گئے۔'' میں نے اتنا ہی کہا تھا کہ مخالف وکیل نے کھڑے ہو کر جملہ پورا کیا۔

''اور آپ خوفزدہ ہو کر گھر سے بھاگ نکلے...... یہی ناں؟''

''جی ہاں۔'' میں نے اثبات میں گردن ہلا کر کہا۔

''آپ ایک تعلیم یافتہ، باشعور، ایک اونچے عہدے پر فائز جوان ہیں۔ قانون کا علم بھی رکھتے ہیں۔ ایسی حالت میں لوگ دوسروں کو مدد کے لیے بلاتے ہیں لیکن آپ نے ایسا نہیں کیا۔ آپ بنگلے سے نکل کر سیدھے.... انٹر سٹی بس اسٹاپ کے ہوٹل میں جا بیٹھے، کیوں؟''

اس کے اس سوال پر میں نے نیچی آواز میں کہا۔ ''دراصل میرا ذہن الجھ گیا تھا۔ میں کیا کروں یہ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا، اسی لیے.... ہوٹل کے خاموش ماحول میں بیٹھا سوچ رہا تھا کہ مجھے کیا کرنا چاہیے۔''

''آپ سوچ رہے تھے۔'' مخالف وکیل نے الزام لگایا... ''کس طرح ... بیوی کی لاش سے پیچھا چھڑاؤں، کہاں لے جا کر پھینکوں۔''

فارسی

900ء-987ء

اصل نام ابو علی الحسن بن علی تھا۔ چوتھی صدی ہجری کا ایک ممتاز نحوی۔ بغداد میں ابن السراج، الزجاج اور دوسرے نحویوں سے تحصیل علم کی۔ بغداد ہی میں وفات پائی۔ اسے اعتزال سے متہم کیا جاتا تھا اور یہ واقعہ ہے کہ اس نے محمد علی الجبائی، المعتزلی کی تفسیر کی شرح لکھی۔ جو ''التتبع'' کے نام سے موسوم تھی اور اب معدوم ہو چکی ہے۔ الفارسی کی تصانیف میں اہم ترین ''الایضاح فی النحو''، علم نحو میں اونچے درجے کی کتاب ہے۔ جس کا ''تکملہ'' اس سے بھی زیادہ مشکل ہے۔

مرسلہ: صدیقہ بیگم کراچی

اس الزام کا جواب ثبوت سے دیا جا سکتا تھا جو میرے پاس نہیں تھا۔ ازل سے میں ڈرپوک اور الجھ جانے والا جو ہوں اسی لیے میں خاموش تھا کہ مخالف وکیل نے کہا۔ ''می لارڈ اب میں اس قتل کی ایک اہم گواہ کو پیش کرنے کی اجازت چاہوں گا۔''

اجازت ملتے ہی اس نے گواہ کو کٹہرے میں لا کر کھڑا کر دیا۔ اسے دیکھ کر مجھے کچھ حوصلہ ملا کیونکہ وہ جمیلہ تھی جس کی ہمدردی میں، میں نائلہ سے لڑا کرتا تھا۔ وکیل نے میری طرف اشارہ کر کے اس سے پوچھا ''جمیلہ کیا تم اسے جانتی ہو۔'' تو وہ بولی ''جی ہاں، میں ان کے گھر میں کام کرتی تھی۔''

وکیل نے کہا۔ ''کیا یہ صحیح ہے کہ تمہاری وجہ سے یہ اپنی بیوی سے لڑا کرتے تھے۔''

وہ بولی ''جی ہاں، بی بی جی مجھے نوکری سے نکالنا چاہتی تھیں مگر صاحب جی انکاری تھے۔ وہ بی بی جی کو سمجھاتے تھے کہ ایسا نہ کرو۔''

جمیلہ کی بات ختم ہوتے ہی وکیل نے کہا.... ''می لارڈ! ان دونوں کے درمیان جو رشتہ جنم لے چکا تھا وہ نائلہ کیا کوئی بھی بیوی برداشت نہیں کر سکتی اسی لیے دونوں میں فساد برپا ہوتا۔''

اس بات پر میرے وکیل نے کھڑے ہو کر کہا ''کسی کی ہمدردی میں بولنا جرم تو نہیں ہے، میرا موکل ایک سیدھا

سادہ، رحم دل اور اصول پرست شخص ہے اسی لیے وہ نہیں چاہتا تھا کہ کسی کی لگی لگائی نوکری کو چھینے۔"

"نہیں جناب! مخالف وکیل نے کہا۔ "دراصل ملزم کو دوسری لڑکی تلاش کرنے میں دقت ہوتی اسی لیے وہ ایسا نہیں کرنا چاہتا تھا۔"

"یہ الزام ہے۔" میں تقریباً چیخ پڑا تھا کہ مخالف وکیل نے مجھ سے کہا:

"سچ بتاؤ کیا یہ صحیح نہیں ہے کہ جیسے ہی بیگم صاحبہ بازار جاتیں بلکہ صاحب خود مشورہ دے کر اسے بھیجتے پھر جیسے ہی وہ باہر نکلتی صاحب تمہیں اپنے کمرے میں بلا لیتے تھے۔"

میں اس کا جواب سننے کے لیے ہمہ تن گوش تھا کہ وہ بولی۔ "جی ہاں... میرے نہ کرنے کے باوجود۔" اس کا جواب سن کر میں سکتے کی کیفیت میں آ گیا۔ جمیلہ سے ایسے جھوٹ کی توقع نہیں تھی۔ میں تو اس کی غربت پر ترس کھا کر اس کی ہر ممکن مدد کرتا رہتا تھا۔ نائلہ سے چھپا کر وقتاً فوقتاً اسے پیسے بھی دیا کرتا تھا۔ جب اور جتنا مانگتی میں فوراً دے دیا کرتا تھا پھر بھی اس نے ایسا جھوٹ بولا۔ اس کی بات سن کر جج نے عدالت برخاست کردی کہ اگلی پیشی پر فیصلہ سنایا جائے گا۔ میں نے ہوا کا رخ پہچان لیا تھا۔ سمجھ گیا تھا کہ پھانسی کا پھندا میرا مقدر بن چکا ہے۔ اسی لیے میں بے صبری سے اس وقت کا انتظار کر رہا ہوں جب میں اس مکار دنیا سے کوچ کر جاؤں۔"

نفیس کی باتوں سے لگ رہا تھا کہ وہ سچ بول رہا ہے۔ اس کا لہجہ بہت کچھ کہہ رہا تھا مگر یہ بھی حقیقت ہے کہ پھانسی کے مجرم آخر وقت تک خود کو بے قصور کہتے رہتے ہیں۔ یہ اور بات ہے کہ جب جلاد کالا نقاب چہرے پر چڑھا دیتا ہے تب وہی مجرم چیخ چیخ کر کہتا ہے کہ اے اللہ میرے گناہ معاف کردے۔ میں نے یہ جرم غلطی سے کیا، شیطان کے بہکاوے میں آ کر کیا ہے۔ اس لیے میں نے اس کی بات کو اہمیت نہ دی اور اس کے بیرک سے لوٹ آیا۔

مجھے معلوم تھا۔ اس کے ساتھ اچھا خاصا وقت گزار چکا ہوں۔ رات آخری حصے میں داخل ہو چکی ہے۔ اب سے کچھ دیر بعد مجھے پھر اسی بیرک میں آنا ہے۔ اس لیے سونے کے بجائے دفتر کی طرف آ گیا۔ اردلی بھی جاگ رہا تھا اسے چائے بنانے کا کہہ کر میں پھر سے نفیس کی فائل کا مطالعہ کرنے لگا۔ اس کی فائل سے یہ بات پتا چل چکی تھی کہ اس کا اس دنیا میں کوئی نہیں ہے۔ ایک ماں تھی جو ایک سال پہلے فوت ہو چکی تھی۔ اب جو کچھ بھی کرنا تھا جیل انتظامیہ کو ہی کرنا تھا۔ میں نے فائل بند کر کے فائل فیتہ باندھا اور سر کو کرسی سے لگا کر اسی کے بارے میں سوچنے لگا۔ میرے اردگرد اتنے سارے قیدی تھے مگر پتا نہیں کیوں نفیس سے ایک انسیت سی محسوس کرنے لگا تھا۔ اسی لیے میں آج کی رات اس کے ساتھ گزار رہا تھا۔ شاید وہ بھی سمجھ چکا تھا اسی لیے جاگ رہا تھا۔

فجر کی اذان سے ذرا پہلے مولوی صاحب آ گئے۔ میں نے انہیں کہا کہ وہ جا کر نفیس کو غسل وغیرہ میں مدد دیں پھر نماز پڑھوا دیں۔

وہ اس کے بیرک کی طرف چلے گئے۔ میں دفتر میں بیٹھا گھڑی کی سوئیوں کی طرف دیکھتا رہا تھا۔ وقت گزرتا جا رہا تھا۔ نماز پڑھ کر میں بھی نفیس کے بیرک میں پہنچ گیا۔

وہ پُرسکون تھا۔ زیرِ لب کچھ پڑھ رہا تھا۔ میں نے ساتھ آئے دونوں سپاہیوں کو اشارہ کیا۔ انہوں نے بیرک کا تالا کھولا۔ اسے باہر نکالا۔ اس نے مجھ سے مصافحہ کیا پھر کہا۔ "سر میں رات میں ہی سمجھ گیا تھا پھر بھی آپ کا شکریہ کہ آپ نے میرا خیال رکھا۔ اگر بروزِ حشر ملاقات ہوئی تو بھی شکریہ ادا کرتے ہوئے ہی پائیں گے۔" پھر اس نے آگے کی سمت قدم اٹھا دیا۔ "میں بے قصور ہوں پھر بھی سب کا قصور معاف کیا۔"

میں بھی اس کے ساتھ مرے مرے قدموں سے چل پڑا۔ جلاد نے تختہ تیار کرلیا ہوگا۔ بس کچھ دیر کی بات ہے۔ یہ قصہ اختتام پذیر ہو جائے گا۔ میں سوچ میں گم اس کے ساتھ چلا جا رہا تھا کہ وہ میرے دفتر کے سامنے رک گیا۔ اس نے کھڑے ہو کر زور زور سے سانس کھینچی پھر رک کر بولا۔ "سر، یہ بو کیسی ہے؟"

میں نے بھی فضا میں زور سے سانس کھینچی پھر کہا۔ "یہ بگلا سگریٹ کی بو ہے۔"

اس نے حیرت سے اِدھر اُدھر دیکھتے ہوئے کہا۔ "یہی...... بالکل یہی بو تھی، نائلہ کے کپڑوں سے یہی بو آ رہی تھی۔"

میرے اندر کچھ چھن سے ہوا، بات کی تہ تک میں پہنچ گیا تھا مگر میں مجبور تھا۔ عدالت کے حکم کو رد نہیں کرسکتا تھا۔ اب اپیل کا وقت بھی تو نہیں تھا۔

اجالا

محترمہ عذرا رسول
السلام علیکم!
میں خود اپنے حالات زندگی کو کہانی کی شکل میں لکھ کر بھیج رہی ہوں۔ یہ ان مردوں کے لیے سبق ہے جو بیوی کے دکھ درد کو سمجھ نہیں سکتے۔ یا وہ لوگ جو بیوی کی تنخواہ پر عیش کرنا چاہتے ہیں۔ اگر میں نے اس جانب توجہ نہ دی ہوتی تو میرا شوہر بھی ایسا ہی ہوتا۔

شاہدہ
(سرگودھا)

پہلے سے کسی کا اندازہ ہی کہاں ہو پاتا ہے۔
انجم کا رشتہ میری اماں کی ایک جاننے والی لے کر آئی تھیں۔ "بہت اچھا لڑکا ہے۔ بہت اچھے خاندان کا۔ اس کا باپ ایک سرکاری آفیسر ہے۔"

اس وقت اماں کے پاس میں بھی بیٹھی ہوئی اس عورت کی باتیں سن رہی تھی۔ "خالہ، یہ بتائیں وہ کرتے کیا ہیں؟" میں نے پوچھا۔
"کسی اچھے دفتر میں ہے۔" عورت نے بتایا۔ "اچھی

تنخواہ ہے۔ چار لوگوں میں عزت ہے۔ پڑھا لکھا ہے۔ صورت شکل بھی اچھی ہے۔ ارے ہاں، میں تو اس کی تصویر بھی لے کر آئی ہوں۔"

خالہ نے اپنے بیگ سے ایک پوسٹ کارڈ تصویر نکال کر ہمارے سامنے کردی۔ لڑکا واقعی اچھا تھا۔ ہینڈسم۔ خوبصورت۔ سلیقے سے سنوارے ہوئے بال اور چمکتی ہوئی آنکھیں۔

"یہ تو واقعی بہت اچھا ہے۔" اماں نے تعریف کی۔ پھر مجھ سے مخاطب ہوئیں۔ "شاہدہ، ذرا تم بھی دیکھ لو۔"

"میں نے دیکھ لیا ہے اماں۔" میں نے گردن جھکالی تھی۔ "اگر آپ کو پسند ہے تو پھر ٹھیک ہی ہے۔"

"یہ کہو نا کہ تم کو بھی پسند آگیا ہے۔" اماں مسکرا کر بولیں۔

"اماں، ویسے تو ٹھیک ہی ہے۔ لیکن بات آگے بڑھانے سے پہلے میں اس سے ایک بار ملوں گی۔" میں نے اپنی وہ شرط بتادی جو میں شروع سے کہتی آئی تھی۔

"ہاں ہاں کیوں نہیں۔" خالہ چہک کر بولیں۔ "ہاتھ کنگن کو آرسی کیا ہے۔ جب کہو اس کو لے کر آجاؤں۔"

"تو پھر کل شام کو لے آؤ۔" اماں نے کہا۔

"ٹھیک ہے، کل شام کو لے آؤں گی۔" خالہ نے بتایا۔

میں ان دونوں کے پاس سے اٹھ کر اپنے کمرے میں آگئی۔ سنگھار میز کے سامنے جس کا آئینہ مجھے بتا رہا تھا کہ میں کتنی خوبصورت ہوں۔

پورا خاندان تو کیا پورا محلہ مجھے دیکھ کر آہیں بھرا کرتا تھا۔ خدا نے بہت موہنی صورت دی تھی۔ خاندان کے نہ جانے کتنے لڑکے میرے پانے کی حسرت میں تھے۔ لیکن میں نے کبھی کسی کے بارے میں نہیں سوچا تھا۔ وہ عام طور پر ناکارہ قسم کے لڑکے تھے جو اپنے وقت کی بربادی کے علاوہ کچھ نہیں جانتے تھے اور ان کی صورتیں بھی واجبی ہی تھیں۔ ان میں کوئی بھی ایسا نہیں تھا جس کو میں اپنی زندگی کا ساتھی بنا سکتی۔

لہٰذا وہی ہوا جو ان حالات میں ہوا کرتا ہے۔ میرے بارے میں طرح طرح کی باتیں مشہور ہوگئیں یا کہی جانے لگیں کہ پتا نہیں اپنے آپ کو کیا سمجھتی ہے۔ ایک نمبر کی مغرور ہے۔ ارے خدا نے صورت شکل اچھی کیا دے دی کہ زمین پر پاؤں ہی نہیں ٹکتے۔ وغیرہ وغیرہ۔

لیکن مجھے ایسی باتوں کی پروا نہیں تھی۔ میں نے تو لفٹ کا بورڈ لگا رکھا تھا۔ میرا شروع سے ایک فیصلہ تھا کہ میں کسی سے عشق وغیرہ کے چکر میں نہیں پڑوں گی۔ بلکہ سیدھے سیدھے شادی کرلوں گی لیکن سوچ سمجھ کر لڑکے کو دیکھ کر۔ میرے خاندان کی لڑکیاں اور میرے کالج کی دوست کہا کرتیں۔ "یار شاہدہ، تو ماڈلنگ کی طرف کیوں نہیں دھیان دیتی۔"

"وہ کس لیے؟"

"وہ اس لیے کہ تو اگر اس فیلڈ میں آئی نا تو اچھے اچھوں کی چھٹی کردے گی۔ ارے فی الحال ہمارے یہاں تیرے مقابلے کا کوئی نظر نہیں آتا۔"

"ارے بھائی، میں ان چکروں میں نہیں پڑنا چاہتی۔" میں کہا کرتی۔ "جس طرح ہو رہا ہے وہی صحیح ہے۔"

"لگتا ہے ابا اور بھائیوں کی طرف سے کوئی پابندی ہوگی۔"

"نہیں، ان کی طرف سے بھی کوئی پابندی نہیں ہے بلکہ ہر طرح کی آزادی ہے۔ انہیں مجھ پر پورا بھروسا ہے۔ وہ جانتے ہیں کہ میں کبھی بہک نہیں سکتی۔ میرا مزاج ہی ایسا نہیں ہے۔"

میرے ارادے کی مضبوطی سے سب ہی واقف تھے۔ اسی لیے جب اسلم سے میرا رشتہ آیا اور میں نے اس سے ملنے کی شرط عائد کردی تو کسی کو بھی اعتراض نہیں ہوا۔

اسلم دوسری شام کو ہمارے گھر آگیا تھا۔ خالہ ہی اسے لے کر آئی تھیں۔ ابا اور دوسرے گھر والے اس سے بہت دیر باتیں کرتے رہے پھر مجھ سے کہا گیا کہ میں اس سے ملنے چلی جاؤں۔

میں یہ تو جانتی تھی کہ وہ مجھے دیکھتے ہی پسند کرلے گا۔ دیکھنا یہ تھا کہ میں اسے پسند کرتی ہوں یا نہیں اور میں نے اسے پہلی ہی نظر میں پسند کرلیا تھا۔

وہ مجھے دیکھ کر کھڑا ہوگیا۔ اس کی ہائٹ بھی بہت اچھی تھی۔ وہ تصویر میں جتنا اچھا لگ رہا تھا سامنے اور زیادہ اچھا تھا۔ ہم کچھ دیر تک اسی طرح ایک دوسرے کے سامنے کھڑے رہے۔

پھر خود اس نے کہا۔ "کیا خیال ہے محترمہ، ہمیں بیٹھنا چاہیے یا اسی طرح کھڑے رہیں گے۔"

اس جملے سے اس کے مزاج کی شگفتگی کا بھی اندازہ ہوگیا تھا۔ میں بھی مسکراتے ہوئے بولی۔ "میرا خیال ہے کہ ہم بیٹھ ہی جاتے ہیں۔"

وہ ہنس پڑا۔ اس کے ساتھ میں بھی ہنس پڑی تھی۔ مختصر یہ کہ ہم دونوں نے ہی ایک دوسرے کو پسند کرلیا تھا۔ وہ

میرے معیار پر پورا اتر رہا تھا اور میں اس کے معیار پر۔

اس کے جانے کے بعد جب گھر والوں نے مجھ سے پوچھا تو میں نے ہاں کردی۔

اس طرح میں اسلم سے شادی کرکے اس کے گھر آگئی۔ اس کا گھر بہت اچھا تھا۔ کم از کم میرے گھر سے بہت بڑا اور قیمتی فرنیچرز سے سجا ہوا۔

خدا نے ان لوگوں کو بہت کچھ دے رکھا تھا۔ مجھے اپنی قسمت پر رشک آرہا تھا۔ ہمارا ولیمہ بھی بہت دھوم دھام سے ہوا تھا۔

ایک مہینا تو یوں ہی ہنستے بولتے اور انجوائے کرتے ہوئے گزر گیا تھا۔ مجھے پہلا شاک ایک مہینے کے بعد لگا تھا جب اسلم کی ایک کزن ہمارے کمرے میں آئی تھی۔ اس وقت اسلم کہیں باہر گیا ہوا تھا۔

☆☆☆

اسلم کی اس کزن کا نام دانیہ تھا۔ وہ اس کی پھوپی کی بیٹی تھی۔

"آؤ دانیہ، آؤ۔" میں نے اس کا استقبال کیا۔ "معاف کرنا، کمرا اس وقت الٹ پلٹ ہو رہا ہے۔"

"شاہدہ، میں کمرا دیکھنے نہیں آئی۔" اس نے کہا۔ "تم سے کچھ ضروری باتیں کرنی ہیں۔ اسلم اور تمہاری شادی سے پہلے تم سے ملاقات کا موقع ہی نہیں ملا۔"

"خیریت تو ہے۔" میں نے غور سے اس کی طرف دیکھا۔ "چلو، پہلے بیٹھ جاؤ۔ بیٹھ کر بات کرتے ہیں۔"

وہ بیٹھ گئی۔ "شاہدہ۔ ایک بات بتاؤ، آخر تم نے کیا دیکھ کر اسلم سے شادی کی ہے؟" اس نے پوچھا۔

"کیوں؟" میں ٹھٹک گئی۔ "کیا خرابی ہے اسلم میں۔"

"اس کی خرابیاں ابھی تم کو نظر نہیں آرہیں۔ وقت گزرنے کے ساتھ پتا چلیں گی۔" اس نے کہا۔

"چلو، کچھ تو بتادو۔"

"شاید تم کو یقین نہ آئے۔ وہ ایک نمبر کا ناکارہ اور بےحس انسان ہے۔" اس نے بتایا۔ "تم اسے حرام خور قسم کا شخص سمجھ سکتی ہو۔ ماموں جان کو اس کی شادی ہی نہیں کرنی تھی۔ انہوں نے خوامخواہ تمہیں جہنم میں جھونک دیا ہے۔"

میں سمجھ گئی کہ مسئلہ کیا ہوسکتا ہے۔ ہوسکتا ہے کہ اس لڑکی نے کبھی اسلم پر ڈورے ڈالے ہوں۔ یا اس سے شادی کی خواہش کی ہو اور اسلم کے انکار پر وہ اس کے خلاف باتیں کررہی ہو۔

"تم یہ سمجھ رہی ہوگی کہ شاید میں جیلس ہوں۔" اس نے وہی کہا جو اس وقت میرے ذہن میں تھا۔ "لیکن تم یقین کرو ایسی کوئی بات نہیں ہے۔ تم کو میرا یقین نہ ہو تو خاندان کی کسی بھی لڑکی سے پوچھ لو۔ وہ یہی بتائے گی۔"

"دیکھو دانیہ، بات یہ ہے کہ اول تو ابھی تک میرے سامنے ایسا کچھ نہیں ہوا ہے کہ مجھے تمہاری بات کا یقین آجائے۔ اور دوسری بات یہ ہے کہ فرض کرو کہ وہ اگر ایسا ہے بھی تو اب تو کچھ نہیں ہوسکتا نا۔ اب تو میں اس سے شادی کرچکی ہوں۔"

"مرضی ہے تمہاری۔" دانیہ تلخی سے بولی۔ "میرا کام تمہیں سمجھانا تھا۔ وہ میں نے سمجھا دیا ہے۔"

"لیکن دیر سے سمجھا رہی ہو نا۔ اب تو کچھ نہیں ہوسکتا۔"

"ٹھیک ہے۔" اس نے ایک گہری سانس لی۔ "اب خود ہی پتا چل جائے گا۔"

"چلو، اگر تم یہ کہہ رہی ہو تو پھر وہ جاب کرتا ہے۔ اس کے پاس گاڑی ہے۔ اب اور کیا چاہیے۔" میں نے کہا۔

"تمہاری اطلاع کے لیے بتادوں کہ وہ گاڑی جو اس کے استعمال میں ہے ماموں جان کے ایک دوست کی ہے جو ابھی باہر گیا ہوا ہے۔ واپس آتے ہی وہ اپنی گاڑی واپس لے لے گا۔ اور تم جاب کی بات کررہی ہو نا تو اسلم نے زندگی میں کبھی کوئی جاب نہیں کی۔"

"تو پھر روز دفتر کیوں جاتے ہیں۔"

"دفتر نہیں جاتا، آوارہ گردی کرنے جاتا ہے، اپنے دوستوں کے ساتھ۔" دانیہ نے کہا۔ "بس دیکھتی رہو۔ کچھ دنوں کے بعد حقیقت سامنے آہی جائے گی۔"

میں نے اس کی بات پر دھیان ہی نہیں دیا۔ وہ جو کچھ کہہ رہی تھی حقیقت اس کے خلاف دکھائی دے رہی تھی۔ اس کا باپ یعنی میرے سسر ایک معقول آدمی تھے۔ سرکاری ملازم تھے۔ میری ساس ایک سمجھدار خاتون تھیں۔ خود اسلم بہت اچھا تھا۔ اپنا بڑا گھر تھا۔ دو گاڑیاں تھیں۔ ایک اسلم کی اور ایک میرے سسر کی۔ گھر میں خوشحالی تھی۔ اب اور کیا دیکھنا تھا مجھے۔ یہ اس قسم کی حاسد لڑکیاں تو اسی قسم کی باتیں کرتی ہیں۔

بہرحال میں نے اسلم سے دانیہ کی کوئی بات نہیں کی۔

یہ شادی کے ڈیڑھ مہینے بعد کی بات ہے۔ میں نے اسلم سے کہا۔ "اسلم، کیا بات ہے، تم دفتر اتنی دیر سے کیوں

جاتے ہو۔"

میں نے یہ بات نوٹ کرلی تھی کہ اسلم دیر سے سو کر اٹھتا۔ آرام آرام سے تیار ہوتا اور ناشتا وغیرہ کر کے گیارہ بجے کے قریب گھر سے نکلتا تھا۔

"جانِ من شکر کرو کہ میں اپنے دل پہ جبر کر کے چلا بھی جاتا ہوں۔" وہ ایک انگڑائی لیتے ہوئے بولا۔ "ورنہ کس کم بخت کا دل چاہتا ہے کہ تمہیں چھوڑ کر جائے۔"

"بی سیریس یار۔" میں نے کہا۔ "زندگی میں ذمے داریاں بھی ہوتی ہیں۔ تم کل سے نو بجے گھر سے نکل جایا کروگے۔"

"یار، میں نے دفتر والوں سے بات کرلی ہے کہ نئی نئی شادی ہوئی ہے۔ کچھ دن اسی طرح چلنے دیں۔"

"بس اب ہوچکا۔ اب ہمیں پریکٹیکل ہوجانا چاہیے۔"

"جو حکم سرکار۔"

میرے کہنے پر وہ اگلے دن سے نو بجے گھر سے نکلنے لگا۔ میں اسے صبح اٹھاتی۔ واش روم بھیجتی اس کے لیے کمرے میں ہی ناشتا لے کر آجاتی اور ٹھیک ساڑھے آٹھ بجے اسے کمرے سے نکال دیتی۔

ایک دن میرے سسر حبیب صاحب نے مجھ سے پوچھا۔ "شاہدہ یہ اسلم آج کل سویرے سویرے کہاں جانے لگا ہے؟"

"آفس جاتے ہیں ابو۔" میں نے بتایا۔

"آفس؟" وہ چونک اٹھے۔ پھر جلدی سے بولے۔ "میرا مطلب ہے پہلے تو دیر سے جایا کرتا تھا۔"

"ہاں۔ لیکن اب میں بول بول کر وقت پر بھیج دیا کرتی ہوں۔"

"چلو، یہ تو اچھا ہے۔" سسر صاحب بول کر خاموش ہوگئے۔

انہوں نے کہہ تو دیا تھا لیکن نہ جانے کیوں مجھے ان کا انداز اور ان کا لہجہ ان نیچرل لگا تھا۔ انہیں اس بات پر حیرت ہوئی تھی کہ وہ آفس جانے لگا ہے۔

اسی رات کو میں نے اسلم سے کہا۔ "اسلم تم سے ایک بات کرنی ہے۔"

"کیوں نہیں، ضرور کرو۔"

"میں تمہارے دفتر جانا چاہتی ہوں۔"

"کیا!" وہ گڑبڑا گیا۔ "میرے دفتر! وہ کیوں؟"

"یوں ہی۔ خواہش ہوتی ہے نا کہ شوہر کے دفتر کو دیکھا جائے۔ اس کے دوستوں سے ملا جائے۔"

"کوئی ضرورت نہیں۔ کلیرنگ فارورڈنگ کا دفتر ہے۔ وہاں بس یوں ہی سے لوگ ہوتے ہیں۔ تم وہاں جا کر کیا کروگی؟"

میں خاموش ہوگئی۔ ویسے میرے دل میں کھٹکا سا شروع تو ہوہی چکا تھا پھر ایک دن میں نے اتفاق سے جب دونوں باپ بیٹے کی باتیں سنیں تو سب کچھ واضح ہوگیا۔

ان لوگوں کا یہ خیال تھا کہ میں کمرے میں سو رہی ہوں جبکہ میں جاگ رہی تھی..... وہ دونوں لاؤنج میں تھے۔ ان کی آوازیں مجھ تک آرہی تھیں۔

حبیب صاحب اپنے بیٹے سے کہہ رہے تھے۔ "افسوس ہے۔ ہم نے یہ سمجھا تھا کہ شادی کے بعد تم سدھر جاؤ گے۔ تمہاری عادتیں بدل جائیں گی۔ نحوستیں ختم ہوجائیں گی۔ لیکن تم روز بہ روز ناکارہ ہوتے جارہے ہو۔ آخر میں کب تک تمہارا خرچ اٹھاؤں۔ کب تک ہم تمہارے لیے جھوٹ بولتے رہیں کہ تم کہیں کام کرتے ہو۔ شرم آنی چاہیے تمہیں۔"

پھر اسلم کی آواز آئی۔ "ابو میں کام کی کوشش تو کرتا ہوں۔"

"خاک کوشش کرتے ہو۔ تین جگہ تمہیں انٹرویو کے لیے بھیجا گیا اور تم تینوں جگہ نہیں گئے۔ آخر چاہتے کیا ہو تم۔"

پھر ان دونوں کے درمیان خدا جانے کیا کچھ ہوتا رہا۔ میں تو کچھ سن ہی نہیں رہی تھی۔ میرا ذہن سن ہوگیا تھا۔ تو اسلم ایک ناکارہ اور بے کار انسان تھا۔

بے چاری دانیہ اس کے بارے میں سچ ہی بتا رہی تھی۔ لیکن اب کیا ہوسکتا تھا۔ اب تو میں اس سے شادی کرچکی تھی۔ میرے خدا! اتنا ہینڈسم اور پڑھا لکھا نظر آنے والا انسان اور ایسا ناکارہ۔ کام چور!

بہت دیر بعد جب وہ گردن جھکائے کمرے میں داخل ہوا تو میں ایک فیصلہ کرچکی تھی۔ میں نے اس سے کہا۔ "اسلم۔ تم بہت دنوں سے ٹال رہے ہو نا کہ میں تمہارے دفتر نہیں جاسکتی۔ لیکن کل میں تمہارے ساتھ چلوں گی۔"

"آخر یہ کیسی ضد ہے۔ کیا کروگی میرے ساتھ جا کر۔"

"صرف یہ دیکھنا چاہتی ہوں کہ تم کس حد تک جھوٹ بول سکتے ہو۔" میں نے کہا۔

"کیا مطلب۔"

"میں نے تمہاری اور ابو کی باتیں سن لی ہیں۔" میں نے کہا۔ "خدا کے لیے مجھ سے کچھ مت چھپاؤ۔ کیا کرتے ہو تم؟"

اس کی ایسی حالت تھی جیسے چوری کرتے ہوئے رنگے ہاتھوں پکڑا گیا ہو۔ کچھ دیر بعد وہ ایک گہری سانس لے کر بستر پر بیٹھ گیا۔ "ٹھیک ہے شاہدہ، تمہیں معلوم ہوجانا چاہیے۔ آخر کب تک چھپا رہے گا۔"

"تو پھر بتاؤ۔ کیا چکر ہے۔"

"شاہدہ، میری کوئی جاب نہیں ہے۔" اس نے اعتراف کرلیا۔ "میں تمہارے ڈر سے صبح اٹھ کر گھر سے نکل جایا کرتا ہوں۔ اور اِدھر اُدھر وقت گزار کر واپس آجاتا ہوں۔"

"اور تم جو مجھے پیسے دیتے ہو؟" میں نے حیرت سے پوچھا۔

"وہ تو میں ابو سے لے کر دیتا ہوں۔" اس نے بتایا۔

میں سن ہوکر رہ گئی۔ عورت اپنے شوہر کی کمائی کی خواہش کرتی ہے۔ وہ چاہتی ہے کہ وہ سوائے اپنے شوہر کے کسی اور کی طرف نہ دیکھے۔ یہ قانونِ قدرت ہے۔ ہماری شریعت بھی یہی کہتی ہے۔ اور یہاں یہ حال تھا کہ میرا سسر میرے اور میرے شوہر کے اخراجات پورے کررہا تھا۔

"ایک بات بتاؤ، کیا تم نے زندگی میں کبھی کوئی جاب نہیں کی ہے۔" میں نے سرد لہجے میں پوچھا۔

"نہیں یار، ایسا بھی نہیں ہے۔ میں ایک دو جگہ جاب کرچکا ہوں لیکن مزہ نہیں آیا۔ وہ دونوں جاب میرے لائق نہیں تھیں۔"

"اب ایک بات اور بتادو۔ تم نے تو ایم بی اے کر رکھا ہے۔ پھر تمہیں اچھی جاب کیوں نہیں ملتی۔"

"شاہدہ، اب جبکہ میں تم سے سچ بول ہی رہا ہوں تو یہ بھی بتادوں کہ میں نے صرف بی اے کیا ہے۔" اس نے بتایا۔

"کیا؟" یہ میرے لیے دوسرا شاک تھا۔ "یعنی تمہاری تعلیم بھی مکمل نہیں ہے۔"

"ہاں یار۔" وہ میری طرف دیکھتے ہوئے بولا۔ "میرا مزاج ہی ایسا تھا کہ مجھے پڑھائی وڑھائی سے کبھی دلچسپی ہی نہیں رہی۔"

☆☆☆

میں اب اپنی ساس اور سسر کے سامنے جاتے ہوئے بھی کترانے لگی تھی۔

شرمندگی کا احساس ہوتا تھا۔ یہ سوچ کر آنکھوں میں آنسو آجاتے کہ میں ایک ناکارہ شخص کی بیوی ہوں اور میرا خرچ میرا سسر برداشت کررہا ہے۔ شوہر کا کوئی حصہ نہیں ہے۔ ایک طرح سے ہم ان کے ٹکڑوں پر پل رہے تھے۔ یہ ایک عجب گھناؤنا احساس تھا۔

اسلم کا یہ حال تھا کہ اب چونکہ کچھ چھپانے کو نہیں رہا تھا اس لیے وہ دن کے دو تین بجے تک سویا ہی رہتا۔ پھر اٹھ کر اپنے دوستوں کے پاس چلا جاتا اور نہ جانے کہاں کہاں کی خاک چھان کر واپس آجاتا۔

میں اس سے بول بول کر تھک گئی کہ خدا کے لیے کوئی جاب تلاش کرلو..... ہر بار وہ یہی جواب دیتا کہ وہ صرف بی اے ہے۔ کیا وہ گھاس کھودے گا، آج کل صرف بی اے کو پوچھتا کون ہے۔

"تو پھر تم کیا چاہتے ہو؟"

"اپنے معیار کے مطابق کوئی کام۔ اور تم دیکھ لینا، ایک نہ ایک دن ایسا ضرور ہوگا۔ اس وقت تمہیں عیش کروادوں گا۔"

"خدا جانے وہ دن کب آئے گا۔ میں تمہارے ماں باپ کے یہاں رہتے اور ان کا کھاتے ہوئے اپنے آپ کو چور سمجھنے لگی ہوں۔"

"ارے سب چلتا ہے۔"

"نہیں چلتا۔ یہ بہت حساس معاملہ ہوا کرتا ہے۔"

"اگر ایسا ہی ہے تو جاؤ، تم خود بھی پڑھی لکھی ہو۔ جا کر کوئی جاب کرلو۔"

"لیکن میں نے اس لیے تو شادی نہیں کی تھی کہ تم گھر میں رہو اور میں باہر کمانے کے لیے جاؤں۔"

میری اس بات کا بھی اس پر کوئی اثر نہیں ہوا۔ وہ منہ پھلا کر بیٹھ گیا۔.. اور میں سوچتی رہ گئی کہ میرے خدا آخر مجھے یہ کس جرم کی سزا مل رہی ہے۔

وہ کون سی منحوس گھڑی تھی جب میں نے اس کو پسند کیا تھا۔

ایک شام جب وہ کہیں سے لوٹ کر آیا تو بہت خوش تھا۔ "شاہدہ، اب سب ٹھیک ہونے والا ہے۔" اس نے کہا۔ "تنویر نے کہا ہے کہ ایک سال میں ہمارے پاس اپنا سب کچھ ہوجائے گا۔"

"کون تنویر؟"

"ماڈلنگ ایجنسی کا مالک۔"

"کیا کہہ رہے ہو تم؟ کون سی ماڈلنگ ایجنسی؟"

پھر اس نے جو کچھ بتایا وہ بہت شرمناک تھا۔ "یار، میرا ایک جاننے والا ایک ماڈلنگ ایجنسی کا مالک ہے۔ اس نے جب تمہاری تصویریں دیکھیں تو خوشی سے اچھل پڑا۔ کہنے لگا کہ یہ چہرہ تو ماڈلنگ کی دنیا میں ہنگامہ مچادے گا۔"

"اس نے میری تصویریں کہاں سے دیکھ لیں۔"
"میں نے اسے شادی کا البم دکھایا تھا۔" اسلم نے بتایا۔ "میں تم سے چھپا کر لے گیا تھا۔"
"میرے خدا! تم کیسے شوہر ہو۔ تمہیں کسی غیر کو شادی کی البم دکھاتے ہوئے شرم نہیں آئی۔" میں غصے سے بھڑک اٹھی تھی۔ "شرم کرو۔ تم اپنی بیوی سے ماڈلنگ کرواؤ گے۔"
"یار، آج کل اچھے اچھے گھرانوں کی لڑکیاں اس فیلڈ میں آرہی ہیں۔" اس نے کہا۔ "ذرا سی محنت سے ہزاروں مل جاتے ہیں۔ پھر تم کو کس بات کا خطرہ۔ تنویر خود اپنی نگرانی میں ماڈلنگ کروائے گا۔"
"اب تمہاری ذہنیت پر سوائے افسوس کے اور میں کیا کرسکتی ہوں۔"
"یار، کم از کم ایک بار تنویر سے چل کر مل تو لو۔" اس نے کہا۔ "اس کی باتیں تو سن لو۔ اگر اطمینان ہوجائے تو ٹھیک ہے ورنہ پھر انکار کردینا۔"
"ٹھیک ہے۔ میں امی ابو سے پہلے بات کرلیتی ہوں۔"
"نہیں۔ نہیں، ان سے کچھ مت کہنا۔ خوامخواہ ہنگامہ کریں گے۔ اب ہمیں تو اپنی زندگی گزارنی ہے نا۔ ہم ان کے سہارے پر تو نہیں رہ سکتے نا۔"
"واہ...!" میں طنزیہ مسکرادی۔ "کیا بات ہے تمہاری۔ والدین کے سہارے زندگی نہیں گزار سکتے۔ لیکن بیوی کے سہارے گزار سکتے ہو۔"
میرا خیال ہے کہ اگر اس کی جگہ کوئی اور شوہر ہوتا تو شاید اس طعنے کو سن کر وہ غیرت میں ضرور آجاتا۔ لیکن وہ صرف مسکرا کر رہ گیا تھا۔ اور سب چلتا ہے، چلتا ہے کہتا رہا تھا۔
بہرحال ایک دن وہ مجھے تنویر کی ماڈلنگ ایجنسی لے گیا۔ وہ ایک بڑی ایجنسی تھی۔ تنویر کے کمرے میں ماڈلز لڑکیوں کی تقریباً نیم عریاں تصاویر لگی ہوئی تھیں۔
مجھے دیکھ کر تنویر کی آنکھوں میں چمک سی آگئی۔ اسلم مجھے خاص طور پر تیار کروا کے لے گیا تھا۔ میں نے بہت سادہ سا میک اپ کیا ہوا تھا لیکن مجھے یقین ہے کہ اس میک اپ میں بھی میں بہت سی ماڈلز سے بہت بہتر دکھائی دے رہی ہوں گی۔
"آئیں بھابی آئیں۔" تنویر اپنی کرسی سے کھڑا ہوگیا۔ "تشریف رکھیں۔"
ہم دونوں اس کے سامنے بیٹھ گئے۔
اس کی نگاہیں میرے چہرے سے ہٹنے کا نام نہیں لے رہی تھیں۔ بالآخر اس کہا۔ "بھابی، خوش آمدید! ماڈلنگ کی دنیا آپ کے انتظار میں ہے۔"
"لیکن مجھے تو اس دنیا سے کوئی دلچسپی نہیں ہے۔"
"دلچسپی پیدا کریں۔ کیونکہ آج کل یہ بہت بڑی انڈسٹری ہے۔" اس نے کہا۔ "اس میں ہزاروں نہیں بلکہ لاکھوں ملتے ہیں۔"
اس سے پہلے کہ میں اسے کوئی جواب دے پاتی اسلم بول پڑا۔ "بھائی تنویر، اب تم ہی شاہدہ کے لیے کوئی راستہ پیدا کرو۔"
"ارے ان کے لیے تو راستے ہی راستے ہیں۔" تنویر نے کہا۔ "پہلے یہ تو ہاں کردیں۔"
میں نے اسلم کی طرف دیکھا۔ وہ اشارہ کررہا تھا کہ میں ہاں کردوں۔ انکار نہ کروں۔ میں نے اپنی آنکھیں بند کرلیں۔ سوچتی رہی، سوچتی رہی۔ پھر ایک فیصلہ کرہی لیا۔ "ٹھیک ہے۔ میں تیار ہوں۔"

☆☆☆

اس کے بعد صرف چار مہینے۔
میں چار مہینوں بعد کی داستان آگے بڑھا رہی ہوں۔ کیونکہ اب ساری تفصیلات لکھنے کا کوئی فائدہ نہیں۔
بس یہ سمجھ لیں کہ ان چار مہینوں میں بہت کچھ ہوگیا۔ تنویر نے میرا فوٹوسیشن کروادیا۔ اس فیلڈ سے وابستہ لوگ یہ اچھی طرح جانتے ہیں کہ کسی لڑکی کا فوٹوسیشن کیا ہوتا ہے۔ اسے کس طرح کیمرے کے سامنے بے باک ہونا پڑتا ہے۔ کیسے کیسے ڈریسز استعمال کرنے ہوتے ہیں۔
یہ سب ہوگیا۔ اس کے بعد میرا پہلا کمرشل ہوا۔ جس کے لیے بیس ہزار روپے ملے۔ اگرچہ یہ زیادہ رقم نہیں تھی لیکن کامیابیوں کا ایک دروازہ کھل گیا تھا۔
اور میری ہر کامیابی اسلم کے لیے خوش خبری لے کر آیا کرتی۔ اور میرا دل خون کے آنسو روتا رہتا۔ جب دوسرے کمرشل کی رقم ایک لاکھ ملی تو اسلم نے اپنے ماں باپ کا گھر چھوڑدیا۔ کیونکہ وہ لوگ کسی نہ کسی مرحلے پر ضرور ہنگامہ کرتے (یا شاید کچھ بھی نہ کرتے)
اسلم نے کرائے پر ایک فلیٹ لے لیا تھا۔ میں ایک بار پھر یاد دلادوں کہ یہ تمام مراحل صرف چار مہینوں میں طے ہوئے تھے۔
چوتھے یا پانچویں کمرشل کے بعد میری ڈیمانڈ ہر طرف ہونے لگی تھی۔ ہر برانڈ کی یہی خواہش ہوتی کہ اپنے کمرشل کے لیے مجھے استعمال کرے۔
میری انکم بھی لاکھوں تک پہنچ چکی تھی۔ اب تو ہمارے پاس ایک چھوٹی سی گاڑی بھی تھی۔ سب کچھ تھا ہمارے پاس۔ لیکن میرا سکون رخصت ہوچکا تھا۔
اسلم کو دیکھ دیکھ کر میں خون کے آنسو رویا کرتی۔ اس شخص کی بے حسی یا دوسرے معنوں میں بے غیرتی حد سے زیادہ بڑھ چکی تھی۔
اسے اس بات کی کوئی پروا نہیں ہوتی کہ میں کس وقت جاتی ہوں اور میری واپسی کس وقت ہوتی ہے.... میں باہر کس کے ساتھ ہوتی ہوں۔ کیا کرتی ہوں۔
دوسرے مہذب معنوں میں وہ ایک دلال بن کر رہ گیا تھا۔ ایک کتے کی طرح میرے آگے پیچھے دم ہلاتا پھرتا۔ کیونکہ میری کمائی سے اس کی ہر خواہش پوری ہونے لگی تھی۔
اس کے پاس گاڑی تھی۔ اچھے کپڑے تھے۔ جیب میں ہر وقت پیسے بھرے رہتے، جو میں اسے خرچ کے طور پر دیا کرتی۔ بس اسے اور کیا چاہیے تھا۔
وہ دن چڑھے تک سوتا رہتا۔
ہم نے گھریلو کاموں کے لیے دو دو ملازمائیں رکھ لی تھیں جو گھر کے سارے کام کردیا کرتیں۔ وہ جب سو کر اٹھتا تو اسے اپنے کپڑوں سے لے کر ہر چیز تیار ملتی۔
میں نے اب اس سے اصرار کرنا چھوڑدیا تھا۔ احساس ہوگیا تھا کہ اس کی فطرت بدل نہیں سکتی۔ اس نے اپنے آپ کو زنگ لگالیا ہے اور یہ زنگ اس وقت تک نہیں اتر سکتا جب تک اسے کوئی بڑا شاک نہ لگے۔
اسے پروا ہی نہیں ہوتی تھی کہ میں کہاں اور کس کے ساتھ جارہی ہوں اور کیوں جارہی ہوں۔
میں اس سے صرف اتنا کہتی۔ "سنو، میں فلاں شخص کے ساتھ کہیں جارہی ہوں۔ تم گھر کے سارے کام کروالینا۔"
"اوکے میڈم!" وہ بہت فرمانبرداری سے کہتا۔ "لیکن واپسی کب تک ہوگی۔"
"کچھ کہہ نہیں سکتی۔ ہوسکتا ہے رات دیر ہوجائے۔"
"چلو کوئی بات نہیں۔ لیکن" وہ اپنا سر کھجانے لگتا۔
میں سمجھ جاتی کہ اسے پیسوں کی ضرورت ہوگی۔ میں اس کے ہاتھ پر تین چار ہزار رکھ دیتی۔ اور وہ لمبی تان کر سوجاتا تھا۔
جہاں تک میرا سوال ہے کہ میں کیا کرتی تھی۔ تو کچھ بھی نہیں۔ زیادہ تر تو اپنے کام ہی سے جایا کرتی اور جب کوئی کام نہیں ہوتا تو اپنی کسی پرانی دوست کے یہاں جاکر بیٹھ جاتی۔
میری ایک پرانی دوست تھی غزالہ۔ اس کی بھی شادی ہوچکی تھی اور وہ اپنے شوہر انور کے ساتھ ایک اچھی زندگی گزار رہی تھی۔
دونوں میاں بیوی میرے ہمدرد تھے۔ غزالہ کا تو یہ کہنا تھا کہ میں ایسے ناکارہ انسان سے چھٹکارا ہی پالوں تو اچھا ہے۔ کیونکہ میرے سامنے ایک شاندار مستقبل ہے۔ میں ماڈلنگ کے ذریعے اچھے پیسے حاصل کررہی ہوں، پھر اسلم جیسے بے کار انسان کی بیساکھی کی کیا ضرورت ہے۔
لیکن اس کا شوہر انور اس تجویز کے خلاف تھا۔ وہ کہا کرتا۔ "ایسا مت کرنا۔ اس معاشرے میں عورت کی عزت شوہر کے نام سے وابستہ ہوتی ہے۔ چاہے وہ جیسا بھی ہو۔ اس کا سہارا لینا ضروری ہوتا ہے۔ اکیلی عورت کٹی پتنگ کی طرح ڈولتی رہتی ہے۔"
"تو پھر شاہدہ کیا کرے۔" غزالہ پوچھتی۔ "جب خود وہ شخص ہی بے حس اور بے شرم بنا بیٹھا ہے تو یہ بے چاری کیا کرے۔"
"شاہدہ تم یہ بتاؤ، تم آج کل جو کچھ کررہی ہو یعنی ماڈلنگ وغیرہ۔ تو کیا تم اندر سے خوش ہو۔ تم نے اس ماحول اور اس زندگی کو قبول کرلیا ہے۔"
"بالکل نہیں۔" میں نے مضبوط لہجے میں جواب دیا۔ "میں نے کبھی دل سے قبول نہیں کیا۔"
"تو بس ٹھیک ہے۔ جب تمہارا ضمیر مطمئن نہیں ہے تو خدا تمہارے لیے کوئی نہ کوئی راستہ ضرور نکال دے گا۔"
"آخر کب۔"
"کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا ہے شاہدہ کہ ہم جس گتھی کو مہینوں نہیں سلجھا پاتے وہ ایک لمحے میں حل ہوجاتی ہے۔ ایک لمحہ ہوتا ہے، ایک چنگاری، ایک روشنی۔ پھر سب ٹھیک ہوجاتا ہے۔"

☆☆☆

حالات اور خراب ہوتے چلے گئے۔
ایک بار تنویر ہمارے گھر آیا۔ خود میں نے اسے چائے پر بلایا تھا۔ اسلم بھی موجود تھا۔ یہاں یہ بتادینا ضروری ہے کہ تنویر میری کامیابیوں سے بہت خوش تھا۔ کیونکہ مجھے اس طرح آگے بڑھانے میں اسی کا ہاتھ تھا۔ وہ

ایک دوبار دبی زبان میں مجھ سے کہہ بھی چکا تھا۔

''ارے بھابی، آپ نے بھی کس ناکارہ انسان سے شادی کررکھی ہے۔''

''تو پھر کیا کروں۔''

''آپ کے سامنے راستے ہی راستے ہیں۔ چھوڑیں اس کو۔ کوئی بھی آپ کو اپنانے کے لیے تیار ہوجائے گا۔''

میں جانتی تھی کہ اس کوئی سے اس کی کیا مراد ہے۔ وہ کیا چاہتا ہے۔ لیکن میں نے کبھی اس کی حوصلہ افزائی نہیں کی تھی۔ میں اب بھی اسلم ہی سے وابستہ رہنا چاہتی تھی۔

شاید حالات بدل جائیں۔

ہم نے ابھی تک بچوں کی پلاننگ نہیں کی تھی۔ حالانکہ اسلم چاہتا تھا کہ ایک دو بچے ضرور ہوجائیں۔ اس کی نیت بھی مجھ پر واضح تھی۔

اولاد ہونے کی صورت میں میں بانڈ ہوکر رہ جاتی۔ پھر اسی کی ہو رہتی۔ جبکہ شاید اسے یہ خطرہ ہوگیا تھا کہ سونے کی چڑیا کہیں اس کے ہاتھ سے نہ نکل جائے۔

لیکن میں اس کی خواہش کے باوجود اولاد سے کترایا کرتی۔

پھر ایک شام کو تنویر ہمارے گھر آگیا۔ میں نے اسے چائے پر بلایا تھا۔ اس دن میں نے اسلم کو دو کوڑی کا کرکے رکھ دیا۔ یہ نہیں کہ میں نے اس سے کچھ کہا ہو۔ بلکہ تنویر کے سامنے اس سے ایسا سلوک کرتی رہی۔ جیسے وہ شوہر نہیں میرا ملازم ہو۔

''جاؤ اسلم، ہم دونوں کے لیے چائے بنا کرلے آؤ۔''

اور وہ خود ہی چائے بنانے چلا گیا۔

''اسلم، تنویر کو ٹھنڈا پانی نہیں چاہیے، مکس کرکے لاکردو۔''

وہ پانی لینے چلا جاتا اور میں اس دوران تنویر سے باتیں کرتی رہتی۔ ہم ایک دوسرے کے ساتھ تقریباً چپک کر بیٹھے ہوئے تھے اور اسلم سامنے والے صوفے پر بیٹھا مسکرا مسکرا کر ہماری طرف دیکھے جارہا تھا۔

آخر یہ صورتِ حال رنگ لے ہی آئی۔

کب تک۔ ایک عورت آخر کب تک برداشت کرسکتی ہے۔ ایک شام میری دوست غزالہ کا شوہر انور جب مجھ سے ملنے آیا تو بہت سے فیصلے ایک ساتھ ہوگئے۔

اس شام بھی میں انور کے ساتھ بیٹھی رہی۔ میں نے اسلم سے چائے بنوائی تھی اور وہ سامنے والے صوفے پر بیٹھا مسکرا مسکرا کر ہماری طرف دیکھ رہا تھا۔

اور میں نے اپنا سر انور کے شانے سے لگا دیا۔

پہلی بار ایسا ہوا تھا کہ میرا سر کسی اور کے شانے سے لگا ہو۔ میں نے کسی اور کو خود کے اتنا قریب کیا ہو۔ میں نے دیکھا کہ ایک لمحے کے لیے اسلم کا رنگ پھیکا پڑ گیا تھا۔

وہ ایک جھٹکے سے اٹھا اور کمرے سے باہر چلا گیا۔

نہ جانے اس کے دل میں کیا تھا۔ یا تو وہ ہم دونوں کو مل بیٹھنے کا موقع دینا چاہتا تھا یا پھر کوئی اور بات تھی۔ اس کا اندازہ اس وقت ہوا جب وہ ایک چھرا لیے تیزی سے کمرے میں داخل ہوا۔

''ذلیل کمینے!'' وہ گالیاں بکتا ہوا ہماری طرف لپکا۔

میں نے اس کے راستے میں فوری طور پر اپنی ٹانگ اڑادی۔ وہ لڑکھڑا کر گرا اور انور نے بڑی پھرتی سے اس کے ہاتھ سے چھرا چھین لیا۔

''بے وقوف انسان! کیا کررہے ہو تم؟'' انور نے کہا۔

''وہی جو مجھے کرنا چاہیے۔ میں تو اس کمینی کا خون کردوں گا۔''

''ہوش میں آؤ۔ کس بات کا غصہ آرہا ہے تمہیں۔ کیا ایک بہن اپنے بھائی کے کندھے پر سر نہیں رکھ سکتی۔''

''بھائی بہن؟''

''ہاں، بے وقوف انسان! ہم نے تمہاری غیرت کو جگانے کے لیے یہ ناٹک کیا تھا۔'' انور نے بتایا۔

''کیا، تم سچ کہہ رہے ہو؟''

''ہاں، انور سچ کہہ رہے ہیں۔'' میں بھی پھٹ پڑی۔ ''اب تک کیوں سوئے ہوئے تھے۔ مجھے تماشا کیوں بنا رکھا تھا تم نے۔ کہاں گئی تھی تمہاری غیرت؟ بتاؤ۔ کہاں مرگئی تھی۔''

میں پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

☆☆☆

اب ایک گھر ہے بہت چھوٹا سا۔ صرف دو کمرے ہیں۔ لیکن میں اس چار دیواری کے اندر بہت خوش ہوں۔ میں نے ماڈلنگ وغیرہ سب چھوڑ دیا ہے۔ اسلم نے ایک عام سی نوکری کرلی ہے۔ پیسے زیادہ نہیں ملتے لیکن ہم دونوں ایک پُرسکون زندگی گزار رہے ہیں۔

ایک لمحے میں ایک چنگاری روشن ہوئی اور اس نے ہر طرف اجالا کردیا۔

بے لباس

جناب اعلیٰ
السلام علیکم!
اس دنیا میں کیسے کیسے لوگ ہیں۔ کس کس طرح ایک دوسرے کے کام آتے ہیں اسی کا خلاصہ ہے یہ روداد جو میرے ہی محلے کی ہے۔ امید ہے آپ کو بھی پسند آئے گی۔
عاصم
(فیصل آباد)

میں نے اس نوجوان کو ایک شاپنگ پلازہ میں دیکھا تھا۔

وہ کپڑے کی دکان پر تھا اور اس کے ساتھ ایک عورت بھی تھی۔ یہ کوئی ایسی خاص بات نہیں تھی کہ مجھے اس میں دلچسپی محسوس ہوتی۔ خاص بات اس شخص کی گفتگو تھی۔ وہ دکاندار سے کہہ رہا تھا۔ ''بھائی میرے، مجھے اس کی پروا نہیں ہے کہ یہ سوٹ کتنا قیمتی ہے۔ اصل بات پسند کی ہے۔ اگر میری بیوی کو پسند آجائے تو میں ہر قیمت پر خرید لوں گا۔''

یہ ایک نئی بات تھی۔

کیونکہ عام طور پر ہوتا یہ ہے کہ شوہر حضرات اس بات پر ناراض ہوتے رہتے ہیں کہ ان کی بیویاں مہنگے سوٹ خرید رہی ہیں۔ جبکہ بیویوں کو اس بات کا احساس ہی نہیں ہوتا کہ ان کے شوہروں پر کیا گزر رہی ہے؟

یہاں معاملہ برعکس تھا۔ یعنی وہ شخص مہنگا سوٹ دلوانے کی ضد کر رہا تھا اور اس کی بیوی اسے منع کر رہی تھی۔ میں نے اسی لیے اس میں دلچسپی لی تھی۔

وہ پیسے والا بھی دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ خود اس کے جسم پر عام سا لباس تھا۔ پیروں میں جوتے بھی بس یوں ہی معمولی سے تھے۔ بہ ظاہر وہ کسی فیکٹری میں کام کرنے والا شخص دکھائی دیتا تھا۔

اس کی یہ دریا دلی مجھے اچھی لگی تھی۔ لیکن میں کب تک وہاں کھڑا رہ سکتا تھا۔ لہٰذا دو چار باتیں سن کر آگے بڑھ گیا۔ میں نے دوسرے دن دفتر میں جب اپنے ایک دوست سے تذکرہ کیا تو اس نے کہا۔ ”اب تم مجھ سے ایک بات کی شرط لگا لو۔“

”کیسی شرط؟“

”وہ عورت اس کی بیوی نہیں محبوبہ ہوگی۔“

”نہیں بھائی، اس کی بیوی معلوم ہوتی تھی۔“ میں نے کہا۔

”محبوباؤں کے سینگ تو نہیں ہوتے کہ الگ سے پہچانی جائیں۔ تمہیں یہاں کے لوگوں کی ذہنیت نہیں معلوم۔ وہ محبوباؤں پر تو سب کچھ لٹا دیں گے لیکن بیویوں پر خرچ کرتے ہوئے جان نکلتی ہے۔ وہ اس کی محبوبہ ہوگی۔“

”میں نہیں مانتا۔“ میں نے کہا۔ ”کیونکہ بیوی اور محبوبہ کے انداز میں بہت فرق ہوتا ہے۔“

”پہلے ہوتا تھا۔ آج کل تو محبوبہ بیوی سے زیادہ اپنا حق جتاتی ہے۔“

بہرحال یہ بحث بغیر کسی نتیجے پر پہنچے ختم ہوگئی تھی اور یہ کوئی ایسی بات بھی نہیں تھی کہ میں اسے یاد رکھتا۔ ذہن سے یہ واقعہ محو ہو گیا تھا۔

پھر ایک دن وہی نوجوان مجھے اپنی بلڈنگ کی سیڑھیوں سے اترتا ہوا دکھائی دے گیا۔ اس کے ہاتھ میں اوزاروں کا ایک بکس تھا۔ ظاہر ہے کہ وہ مجھے نہیں پہچان سکتا تھا۔ اسی لیے وہ مجھ پر دھیان دیے بغیر آگے بڑھ گیا تھا۔

دوسرے دن وہ پھر دکھائی دیا۔ اس بار وہی عورت اس کے ساتھ تھی۔ جس کو میں نے پہلی بار دیکھا تھا۔ اس عورت نے بہت قیمتی لباس پہن رکھا تھا۔ بہت خوبصورت اور بہت قیمتی۔ جبکہ اس شخص کے جسم پر وہی ایک عام سا لباس تھا۔

وہ دونوں سیڑھیاں چڑھتے ہوئے اوپر جا رہے تھے۔

میں نے گیٹ پر کھڑے چوکیدار سے اس کے بارے میں دریافت کیا۔ ”یہ آدمی کون ہے۔ اس کو پہلے تو نہیں دیکھا۔“

”یہ نیا کرایہ دار ہے صاحب۔“ چوکیدار نے بتایا۔

”اور کرتا کیا ہے؟“

”پلمبر ہے صاحب۔“ چوکیدار نے بتایا۔ ”بہت ہوشیار کاریگر ہے۔“

”اوہ۔۔!“ میں ایک گہری سانس لے کر رہ گیا تھا۔ کیسا پلمبر تھا جو اپنی بیوی کو اتنے قیمتی لباس پہنایا کرتا۔ پلمبر وغیرہ کی آمدنی ہی کتنی ہوتی ہے۔ ویسے اس کے بارے میں میرا یہ خیال درست ثابت ہوا تھا کہ اس کا تعلق مزدور طبقے سے ہے۔

اس کے بعد بھی کئی بار میں نے اس عورت کو دیکھا۔ کبھی وہ اپنے شوہر کے ساتھ دکھائی دیتی تھی اور کبھی اکیلی۔ اور ہر بار میں نے اسے خوبصورت اور قیمتی کپڑوں میں دیکھا۔

اتنا ہی نہیں بلکہ اکثر اس کے شوہر کو قریب مارکیٹ سے اس کے لیے سوٹ کی خریداری کرتے ہوئے بھی دیکھا کرتا تھا۔ ایسا لگتا تھا جیسے اس شخص کو اپنی بیوی کی ڈریسنگ کا جنون ہے۔

حالانکہ وہ بے چاری ایک عام سی سیدھی سادی عورت تھی۔ سانولا رنگ، لیکن چہرے پُرکشش۔ اور یہ کشش اس کی اداس آنکھوں کی وجہ سے تھی۔

بہت اداس اور خوبصورت آنکھیں تھیں اس کی۔ جیسے ان آنکھوں میں ہزاروں دکھ پوشیدہ ہوں۔ مجھے انسان کے پورے سراپے میں آنکھوں سے بہت دلچسپی رہی ہے۔

خدا نے نہ جانے کیسی کیسی آنکھیں بنادی ہیں۔ بولتی ہوئی آنکھیں، خاموش آنکھیں، جھیل کی طرح گہری آنکھیں، اداس اور بھید رکھنے والی آنکھیں اور بے رحم آنکھیں۔ انسان کی پوری شخصیت ان آنکھوں میں سمٹ آتی ہے۔

ایک دن میرے واش روم کے نلکوں وغیرہ میں کچھ خرابی ہوگئی۔ میں نے اس چوکیدار سے اس پلمبر کا پوچھا۔ ”خان صاحب، وہ جو پلمبر نیا کرایہ دار ہے، وہ کس نمبر میں ہے۔“

”کیا ہوا صاحب، خیر تو ہے؟“

”غسل خانے کے نلکے خراب ہو گئے ہیں۔“ میں نے بتایا۔

”وہ بی گیارہ میں ہے صاحب اور ابھی ابھی اوپر گیا ہے۔ اس کا نام حمید ہے صاحب۔“

میں نے فلیٹ کے دروازے پر دستک دی۔ اس کی بیوی دروازے پر آئی تھی۔۔۔۔ میں یہ دیکھ کر حیران رہ گیا تھا کہ اس وقت بھی اس کے جسم پر ایک بہت قیمتی لباس تھا۔

”جی فرمائیں، کس سے ملنا ہے۔“ اس نے پوچھا۔

”حمید صاحب سے۔ آپ کے شوہر ہیں نا۔“

”جی ہاں۔“ اس نے گردن ہلاتے ہوئے اندر کی طرف دیکھا اور آواز لگائی۔ ”حمید کوئی صاحب ملنے کے لیے آئے ہیں۔“

حمید دروازے پر آگیا۔ اس نے چونکہ دو چار مرتبہ مجھے دیکھ رکھا تھا۔ اسی لیے اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ نمودار ہوئی۔ ”جی فرمائیں جناب۔“

”میں نے سنا ہے کہ آپ پلمبرنگ کا کام جانتے ہیں؟“

”جی جناب۔ اپنا تو کام ہی یہی ہے۔“ اس کا لہجہ بہت شائستہ تھا۔ پڑھا لکھا معلوم ہوتا تھا۔ ”کوئی پرابلم ہوگئی ہے کیا؟“

”جی ہاں۔ آپ آکر دیکھ لیں۔“

”آپ اپنا فلیٹ نمبر بتا دیں۔ میں ابھی حاضر ہوتا ہوں۔“

دس منٹ بعد وہ اوزاروں کا بکس لیے آگیا تھا۔

وہ جب تک واش روم میں کام کرتا رہا، میں چائے بنانے میں مصروف رہا تھا۔ اور جب وہ کام ختم کر کے جانے لگا تو میں نے اس سے کہا۔ ”اس طرح نہیں چائے پی کر جانا۔“

”ارے صاحب، آپ نے کیوں زحمت کر دی۔“

”اس وقت میں خود بھی چائے پیتا ہوں۔“ میں نے کہا۔ ”اب اکیلے تو نہیں پی سکتا تھا نا۔“

”جی شکریہ۔“ وہ سامنے والے صوفے پر بیٹھ گیا تھا۔

”آدمی اکیلا ہو تو اس کے ساتھ بہت مسائل ہوا کرتے ہیں۔“ میں نے یوں ہی بات آگے بڑھائی۔

”مجھے بھی احساس ہے جناب۔ کیونکہ میں بھی برسوں اکیلا رہا ہوں۔“ اس نے کہا۔ ”ویسے آپ کے گھر کے لوگ۔۔!“

”ہاں ہاں سب ہیں لیکن دوسرے شہر میں ہیں۔ میں تو یہاں جاب کی وجہ سے ہوں۔“

”چلیں جناب، خدا کا شکر ادا کریں۔ جبکہ ہم تو بالکل اکیلے ہیں، نہ تو میرا کوئی ہے اور نہ میری بیوی کا۔“ اس نے بتایا۔ ”اسی لیے ہم دونوں ایک دوسرے کے سب کچھ ہیں۔“

میں نے جب اس کی مزدوری دینی چاہی تو اس نے لینے سے انکار کر دیا تھا۔ ”ارے نہیں صاحب، آپ تو میرے پڑوسی ہیں۔ آپ سے پیسے کس طرح لے سکتا ہوں۔“

”اسی لیے تو دے رہا ہوں۔“ میں خوش دلی سے بولا۔ ”پڑوسی کو پڑوسی کا خیال کرنا چاہیے۔“

اور جب وہ جانے لگا تو میں نے اس سے کہا۔ ”اب میں تم سے ایک درخواست کرنا چاہتا ہوں۔“

”مجھ سے؟“ وہ حیران رہ گیا تھا۔ ”ارے صاحب حکم دیں۔“

”تم فرصت میں میرے پاس آجایا کرو۔ اکیلا ہوں نا۔ بور ہوتا رہتا ہوں۔“

”ارے صاحب، یہ ایسی کون سی بات ہے۔ ضرور آیا کروں گا۔“

یہ سب کچھ میرا تجسس تھا۔ حالانکہ یہ بھی ایسی کوئی خاص بات نہیں تھی۔ اگر کوئی شخص اپنی بیوی کو اچھے کپڑے پہنا رہا ہے تو اس سے میرا کیا تعلق ہو سکتا تھا۔

بس ایک تجسس تھا جس نے اس بات پر اکسایا تھا کہ میں اس کا سبب معلوم کروں۔

بہرحال اس سے اچھی خاصی دوستی سی ہوگئی تھی۔ وہ عموماً رات کے وقت اپنے کام سے نمٹ کر میرے پاس آجاتا۔ چائے بنائی جاتی، گپ شپ ہوا کرتی۔

ایک بار اس نے اپنے گھر بلایا۔ اس کی بیوی نے مچھلی بنائی تھی۔ اس کے ہاتھ میں واقعی بہت لذت تھی۔ ہم بہت خوش گوار ماحول میں کھاتے رہے تھے۔

کھانے کے دوران اس نے کہا۔ ”میں آپ کو ایک مزے کی بات بتاؤں عاصم صاحب۔“

”ضرور بتاؤ۔“

”میں حمید ہوں۔ اور میری بیوی کا نام حمیدہ ہے۔“

”یہ تو واقعی بہت خوبصورت اتفاق ہے۔“

”اس سے یہ بھی پتا چلتا ہے کہ خدا نے ہم دونوں کو ایک دوسرے ہی کے لیے بنایا ہے۔“ وہ مسکراتے ہوئے بولا۔ ”کیوں حمیدہ۔“

وہ مسکرا کر رہ گئی۔ ویسے بھی وہ ایک کم گو عورت تھی۔

دو چار مہینے گزر گئے۔

اس دوران حمیدہ کے لیے حمید کی شاپنگ کا سلسلہ جاری رہا۔ ایک سے ایک سوٹ۔ قیمتی خوبصورت۔ اور حمیدہ میرے اندازے کے مطابق دن میں کم از کم چار پانچ مرتبہ لباس بدلا کرتی تھی۔

ایک دن میں نے حمید سے پوچھ ہی لیا۔ ''یار حمید، کپڑوں کے معاملے میں تمہاری پسند بہت زبردست ہے۔ بھابی کے لیے کیسے کیسے سوٹ لے کر آتے ہو۔''

''جی بھائی صاحب، ایک یہی تو میری حسرت ہے۔ یہی ایک شوق ہے۔ اگر میرے بس میں ہو تو میں دنیا بھر کے قیمتی ڈریسز اس کے لیے خرید لوں۔ لیکن مجبور ہوں۔''

''اس کے باوجود میں یہ دیکھتا ہوں کہ تم ان کے لباس کا بہت خیال رکھتے ہو۔'' میں نے کہا۔

''اس کی ایک کہانی ہے بھائی صاحب۔'' اس نے کہا۔ ''بہت عجیب۔ اب آپ سے کیا چھپانا۔ آپ کو میں کسی دن آرام سے بتاؤں گا۔''

پھر ایک رات میرے فلیٹ میں بیٹھ کر اس نے پوری کہانی سنا دی تھی۔

''بہت عجیب دن گزارے ہیں صاحب۔ بس محنت کیے جاؤ۔۔ اور پیٹ کا دوزخ بھرتے رہو۔ اس کے علاوہ کوئی خوشی نہیں۔ وہ تو خدا بھلا کرے نصیر استاد کا۔ جس نے مجھے پلمبرنگ کا کام سکھا دیا۔ ورنہ یا تو بھوک سے مرجاتا یا بھیک مانگنے لگتا۔ خیر، بھیک تو نہیں مانگ سکتا تھا کیونکہ یہ میری فطرت میں نہیں ہے۔ لیکن بھوکا ضرور مر جاتا۔''

''لیکن تم تو پڑھے لکھے معلوم ہوتے ہو۔''

''جی ہاں، تھوڑا بہت پڑھ لکھ لیا ہے۔'' اس نے بتایا۔ ''کس طرح۔ یہ الگ کہانی ہے۔ خیر تو پہلے میں جس فلیٹ میں رہا کرتا تھا۔ وہ بہت خستہ سی عمارت میں تھا۔ لکڑی کی سیڑھیاں تھیں۔ ایک کوریڈور میں کئی فلیٹ تھے۔ چھوٹے چھوٹے تنگ و تاریک۔ جن میں نہ تو ہوا تھی نہ روشنی۔ اور نہ ہی کسی قسم کی خوشی۔''

وہ بہت سلیقے سے اپنی کہانی سنا رہا تھا۔ اس کے تنگ و تاریک فلیٹ کا پورا نقشہ میری نگاہوں کے سامنے آ گیا تھا۔

''میں عام طور پر رات دیر سے واپس آیا کرتا۔ کبھی ایک بجے، کبھی دو بجے۔ بس یوں ہی آوارہ گردی کرتا رہتا۔ یا اپنے جیسے دوستوں کے ساتھ سستے سے ہوٹل میں بیٹھ جایا کرتا۔ اکیلا تھا نا۔ اس لیے کون یہ پوچھتا کہ اتنی رات کو واپس کیوں آ رہے ہو۔''

ایک رات میں واپس آیا تو سیڑھیاں چڑھتے ہوئے میں نے کسی عورت کے رونے کی آوازیں سنیں۔ جیسے کوئی عورت انتہائی بے بسی کی حالت میں آہستہ آہستہ رو رہی ہو۔

کوریڈور میں اندھیرا سا تھا۔ اسی لیے مجھے کچھ ڈر بھی محسوس ہوا۔ نہ جانے کون تھی۔ کیا بات تھی۔ پھر میں اس پر سے توجہ ہٹا کر سیڑھیاں چڑھتا ہوا اوپر آ گیا۔

ویسے ہی رات بھر اس کے بارے میں سوچتا رہا۔ کون تھی وہ۔ اس طرح کیوں رو رہی تھی۔ دوسری صبح اٹھا تو کچھ بھی نہیں تھا۔ سب کچھ اپنی جگہ پر نارمل سا تھا۔

دوسری رات کچھ نہیں ہوا۔ تیسری رات پھر رونے کی آواز آئی۔ اس کے ساتھ ہی ایک عورت دکھائی دی جو ایک فلیٹ کے دروازے کے پاس ٹیک لگائے بیٹھی تھی۔

میں یہ بتا چکا ہوں کہ اس جگہ اندھیرا تھا۔ اسی لیے وہ عورت پوری طرح دکھائی نہیں دی تھی۔ پہلے کی طرح میں اسے نظر انداز کرتا ہوا اوپر آ گیا۔

اس رات مجھے اس رونے والی کی طرف سے واقعی بہت تشویش ہو رہی تھی۔ آخر وہ کون تھی۔ کیوں رویا کرتی تھی۔ سب سے بڑی بات یہ تھی کہ میں اس پھڈے میں مداخلت بھی نہیں کر سکتا تھا۔ نہ جانے کیا معاملہ تھا۔ یہاں تو نیکی بھی گلے پڑ جاتی ہے۔

لیکن میں نے یہ سوچ لیا تھا کہ میں اس عورت کو دیکھوں گا ضرور کیونکہ اندھیرے میں صرف اس کا خاکہ سا دکھائی دیتا تھا۔ اسی لیے میں نے ایک چھوٹی سی ٹارچ خرید کر جیب میں رکھ لی۔

تیسری رات کچھ بھی نہیں ہوا۔ لیکن چوتھی رات پھر وہی آواز۔ اس وقت رات کے دو بجے ہوں گے جب میں اپنے فلیٹ واپس آیا تھا۔

میں نے اس کی سسکیاں سنتے ہی جیب سے ٹارچ نکال کر اس کی روشنی اس عورت پر ڈالی اور کانپ کر رہ گیا۔ وہ ٹارچ میرے ہاتھ سے چھوٹ کر گر پڑی تھی۔

''کیوں؟ کیا خاص بات تھی اس عورت میں؟'' میں نے پوچھا۔

''اس کے بدن پر لباس نام کی کوئی چیز نہیں تھی۔'' حمید نے بتایا۔ ''بالکل برہنہ جو دیوار کے ساتھ اکڑوں بیٹھے روئے جا رہی تھی۔ آپ خود سوچ سکتے ہیں اس وقت میری کیا حالت ہوئی ہوگی۔ کیسے کیسے خیالات میرے دل میں آئے ہوں گے۔ یہ تو ایک حیرت انگیز بات تھی۔ میں کچھ دیر

تک کھڑا سوچتا رہا۔ اس عورت نے بھی میری موجودگی محسوس کر لی تھی۔ پھر میں اس پر ٹارچ کی روشنی بھی ڈال چکا تھا۔ اسی لیے وہ روتے روتے بالکل خاموش ہو گئی تھی۔

پھر میں ہمت کر کے اس کے پاس پہنچ گیا۔ مجھے قریب دیکھ کر اس نے اپنے آپ کو سمیٹنے کی کوشش کی۔ وہ یقیناً بہت خوفزدہ تھی۔

''گھبراؤ نہیں۔'' میں نے دھیرے سے کہا۔ ''کون ہو تم؟ اور اس حال میں یہاں کیوں بیٹھی رہتی ہو؟''

''ایک بے بس عورت ہوں۔'' وہ دھیرے سے بولی۔

''یہ لو، یہ میرے فلیٹ کی چابی۔'' میں نے کہا۔ ''اس وقت یہاں اندھیرا ہے۔ تم اوپر میرے فلیٹ میں چلی جاؤ، وہاں کوئی نہیں ہے۔ میرے کپڑے رکھے ہوئے ہیں، تم وہ پہن لو، یا کوئی چادر لپیٹ لو۔''

کچھ دیر سوچتے رہنے کے بعد اس نے میرے ہاتھ سے چابی لی۔۔ اور اندھیرے میں سیڑھیوں کی طرف رینگ گئی۔ میں اس کے ساتھ نہیں گیا تھا۔ تھوڑی دیر بعد وہ میری چادر لپیٹے نیچے آ گئی تھی۔ اس نے اپنے آپ کو پوری طرح چھپا رکھا تھا۔ ''بہت بہت شکریہ آپ کا۔'' اس نے کہا۔

''تم کہاں رہتی ہو؟'' میں نے پوچھا۔

''اسی فلیٹ میں۔'' اس نے بتایا۔

''کیا؟'' میں حیران رہ گیا تھا۔ ''اس فلیٹ میں۔۔۔ اور تم اس طرح باہر۔''

''وہ۔۔ وہ میرا شوہر۔'' وہ بولتے بولتے چپ ہو گئی تھی۔

''کیا، تمہارا شوہر۔ وہ بھی یہیں رہتا ہے۔''

''ہاں۔ وہی تو یہ سب کرتا ہے۔'' اس نے بتایا۔ ''مجھے مارتا ہے اور میرے کپڑے اتار کر باہر کھڑا کر دیتا ہے۔''

بس صاحب، اتنا سننا تھا کہ میرا تو دماغ ہی گھوم گیا۔ کیا بے غیرت شوہر تھا۔ ''کیا کرتا ہے تمہارا شوہر۔''

''وہ مزار پر چادریں بیچتا ہے۔'' اس نے بتایا۔ ''نشہ کرتا ہے اور نشے کے بعد میری یہ حالت کر دیتا ہے۔ صرف اس لیے کہ اس دنیا میں میرا کوئی نہیں ہے۔''

''تم مت گھبراؤ، اب میں ہوں تمہارا۔''

صاحب، اس وقت مجھ پر جنونی کیفیت طاری ہو گئی تھی۔ میں نے اس فلیٹ پر زور زور سے دستک دینی شروع کر دی۔ کچھ دیر بعد اس کا وہ منحوس شوہر آنکھیں ملتا ہوا باہر نکلا۔ وہ دیکھنے ہی سے غلیظ انسان معلوم ہوتا تھا۔

میں تو اس وقت بالکل ہی پاگل ہو رہا تھا۔ میں نے اسے مارنا شروع کر دیا۔ ٹھوکریں۔ گھونسے۔ ذرا سی دیر میں اسے پھاڑ کر رکھ دیا۔ اس بلڈنگ میں اور بھی لوگ تھے۔ وہ یہ ہنگامہ سن کر وہاں چلے آئے تھے۔

اس دوران اس کی بیوی ایک طرف کھڑی ہو کر روتی رہی تھی۔ لوگوں نے جب صورتِ حال معلوم کی تو میں نے بتا دیا کہ یہ کم بخت اپنی بیوی کے ساتھ کیا سلوک کرتا ہے۔

یہ اتفاق تھا کہ اس بلڈنگ کی دو چار عورتوں کو بھی یہ بات معلوم تھی۔ انہوں نے فوراً تصدیق کر دی۔ اتنا سننا تھا

کہ دوسرے لوگ بھی بپھر اٹھے۔ سب یہ کہہ رہے تھے کہ یہ پولیس کیس ہے۔ اس کم بخت کو پولیس کے حوالے کردیا جائے۔ لیکن میں نے کیا نہیں۔ اس کی سزا یہ ہے کہ یہ ابھی اور اسی وقت سب کے سامنے اپنی بیوی کو طلاق دے اور اس فلیٹ سے دفع ہوجائے۔

وہ شخص صرف اپنی بیوی کے لیے ظالم تھا۔ ویسے وہ بزدل انسان تھا۔ نشے نے اس کی حالت اور خراب کر رکھی تھی۔ خیر تو میں نے فوری طور پر اس عورت کو اس منحوس شخص سے طلاق دلوادی۔

اب سوال یہ تھا کہ اس عورت کا کیا ہو۔ کیونکہ وہ بتا چکی تھی کہ اس دنیا میں اس کا کوئی بھی نہیں ہے۔ اس پر میں نے لوگوں سے کہا کہ اگر انہیں کوئی اعتراض نہ ہو تو میں اس عورت کو اپنی بہن بنا کر اپنے ساتھ رکھنا چاہتا ہوں۔

آپ یقین کریں جناب کہ جب میں نے یہ بات کی تو وہ عورت میرا بھائی کہہ کر مجھے لپٹ کر رونے لگی تھی۔ دیکھنے والوں کی آنکھوں میں بھی آنسو آگئے تھے۔"

اس کی کہانی کے دوران میں یہ سمجھنے لگا تھا کہ شاید وہ مظلوم عورت اس کی یہی بیوی حمیدہ ہوگی۔ لیکن وہ یہ کہہ رہا تھا کہ اس نے اس عورت کو اپنی بہن بنالیا تھا۔ یعنی اس کہانی کا اب یہ ایک نیا رخ تھا۔

"تو بھائی صاحب، میں اس عورت کو اپنے یہاں لے آیا۔ نسرین نام تھا اس کا... اور اس نے بھی بہن ہونے کا حق ادا کردیا۔ میری اتنی خدمت کی کہ میں بتا نہیں سکتا۔ پوری بلڈنگ ہم دونوں کے اس بھائی بہن والے پیار پر فخر کیا کرتی تھی۔ کیونکہ ہم مثالی بن گئے تھے۔"

پھر چھ مہینے کے بعد اس کی طبیعت خراب رہنے لگی۔ ڈاکٹروں نے اسے ٹی بی بتایا تھا۔"

"اوہ۔" میں نے ایک گہری سانس لی۔ "بے چاری! اتنے دکھ برداشت کرنے کے بعد یہی ہوسکتا تھا۔"

"جی بھائی صاحب۔ اس کے منحوس شوہر نے اسے اتنے دکھ دیئے تھے کہ وہ ٹی بی کی مریضہ ہوگئی تھی۔" اس نے بتایا۔ "میرے بس میں جو کچھ تھا وہ میں نے کیا۔ اس کا علاج کراتا رہا۔ اس کی صرف ایک خواہش تھی کہ میں شادی کرلوں۔ ہر بہن کی طرح وہ بھی اپنے بھائی کا سہرا دیکھنا چاہتی تھی۔ میرے حالات ایسے نہیں تھے کہ میں شادی کرتا لیکن اس کی ضد نے مجبور کردیا تھا۔ میں نے اس سے کہا کہ وہ خود میرے لیے کوئی رشتہ تلاش کرے اور اس نے حمیدہ کو تلاش کرلیا۔"

"تو تمہاری یہ شادی تمہاری اس بہن نے کروائی ہے۔"

"جی ہاں بھائی صاحب، حمیدہ بھی بے سہارا ہے۔ اس کا آگے پیچھے کوئی بھی نہیں ہے۔ لیکن انتہائی شریف اور مہذب لڑکی ہے۔ اسی لیے میں نے اس سے شادی کرلی۔ اور اب آپ دیکھ ہی رہے ہیں کہ ہم کتنے سکون کی زندگی گزار رہے ہیں۔"

"تمہاری کہانی سمجھ میں تو آگئی لیکن ایک بات سمجھ میں نہیں آئی۔ وہ کپڑے۔ آخر تم اس کے کپڑوں پر اتنا کیوں خرچ کرتے ہو؟"

"یہ تو مرنے والی کی آخری خواہش تھی بھائی صاحب!" اس نے بتایا۔

"مرنے والی کی؟"

"جی ہاں، میری وہ بہن بیماری کا بوجھ برداشت نہیں کرسکی اور مرگئی۔ اس کے جنازے میں پوری بلڈنگ کے لوگ شریک ہوئے تھے۔ کیونکہ سب کو اس کے بارے میں سب کچھ معلوم ہوچکا تھا۔"

"وہ تو ٹھیک ہے لیکن میں ڈریسز کے بارے میں پوچھ رہا ہوں۔"

"اس نے یہ کہا تھا کہ دیکھو حمیدہ بھی میری طرح بے سہارا ہے۔ خدا کے لیے تم اسے کپڑوں سے محروم مت کرنا۔ بس صاحب، وہ دن ہے اور آج کا دن۔ میں نے حمیدہ کو اتنے کپڑے دلادیے ہیں کہ اگر یہ پورے محلے میں بھی بانٹ دے تو بھی اس کے پاس کوئی کمی نہ ہو۔"

میں ایک گہری سانس لے کر رہ گیا۔ اب یہ معما حل ہوگیا تھا۔

وہ پلمبر، ایک معمولی مزدور جس کے پاس بہت بڑا دل تھا۔ وہ عورت جس نے اپنے بے غیرت شوہر کے مظالم سہے تھے... اور بہن ہونے کا حق ادا کردیا تھا۔ اور ایک حمیدہ کی بیوی... جو اس کا ساتھ نبھائے جارہی تھی۔ یہ ہمارے معاشرے کے بہت بڑے کردار تھے۔ اور زندگی کی کہانیاں ان ہی کرداروں سے وجود میں آتی ہیں۔ ہمارا کیا ہے، ہم تو صرف قلم چلاتے ہیں۔ اور اپنے آپ کو بہت عظیم سمجھتے ہیں، جبکہ ہم کچھ بھی نہیں ہیں۔

عشق ناکام

جناب ایڈیٹر ماہنامہ سرگزشت

آداب ونیاز!

میں عمر کی اس منزل پر ہوں کہ نہ جانے کب بلاوا آجائے۔ مجھے پڑھنے کا بہت شوق ہے لیکن پہلی بار لکھنے کی کوشش کی ہے۔ گوکہ یہ میری اپنی سرگزشت نہیں ہے مگر اس سرگزشت کا ایک اہم کردار میں بھی ہوں اسی لیے اتنی تفصیل سے واقعات سنارہی ہوں۔ گوکہ رقیہ اور طارق سے بچھڑے زمانہ گزرچکا ہے لیکن ان دونوں کی یادیں ذہن ودل کو آج بھی برماتی ہیں۔

حامدہ
(لاہور)

ہمارے موجودہ معاشرے میں اسلامی اقدار کی جانب سے غفلت بلکہ دانستہ ان کی پامالی اور متعدد غیر اخلاقی عوامل وعناصر کی دخل درانداز ی نے ایک ایسا ماحول پیدا کردیا ہے جس میں بہت سے نوجوان لڑکے اور لڑکیاں اپنی جذباتیت کے ہاتھوں عقل وہوش سے بے بہرہ ہوکر ایسی راہوں پر چل پڑتے ہیں جو اکثر وبیشتر انہیں کسی ایسی تباہی سے دوچار کردیتی ہیں جن کا مداوا ساری زندگی کے پچھتاوے سے بھی نہیں ہوسکتا۔ افسوس کی بات یہ ہے کہ

دوسروں کی بربادی سے سبق اور عبرت حاصل کرنے کے بجائے نوجوان ذہن اس خوش فہمی میں مبتلا رہتے ہیں کہ جو اوروں کے ساتھ ہوا وہ ان کے ساتھ نہیں ہوگا۔ بلاشبہ کبھی کبھی ایسا نہیں بھی ہوتا لیکن سوال یہ ہے کہ ایسی آزمائش میں خود کو ڈالا ہی کیوں جائے جس میں پار لگنے سے کہیں زیادہ ڈوب جانے کا خطرہ رہتا ہے۔

میرا نام حامدہ ہے اور میں آج ایک ایسی خوش فہم لڑکی کی داستانِ حیات تحریر کررہی ہوں جس نے اپنی زندگی کے سبق خود سیکھنے کی کوشش کی تھی۔ اگرچہ اس آپ بیتی میں تھوڑا بہت کردار میرا بھی رہا ہے لیکن بنیادی طور پر میری حیثیت ایک راوی کی ہے اس لیے میں اپنی طرف سے کسی تنقید و تبصرے کے بغیر ان حالات و واقعات کو رقم کرنے کی کوشش کروں گی جو کسی نہ کسی طرح میرے علم میں آئے۔ کہانی کی ترتیب قائم رکھنے کے لیے یہ بھی ضروری ہے کہ واقعات کو اسی اعتبار سے بیان کیا جائے جس ترتیب سے وہ پیش آئے خواہ ان کا علم مجھے بعد میں کسی دوسرے ہی موقع پر ہوا ہو۔

جہاں تک خود میرے اپنے تعارف کی بات ہے تو صرف اتنا ہی کہہ دینا کافی ہے کہ میرا تعلق ایک متوسط خاندان سے تھا۔ بھائی بہن اور دوسرے عزیز و اقارب بھی تھے اور اب بھی ہیں۔ میری شادی بھی ایک شریف اور متوسط خاندان میں ہوئی۔ سسرال دوسرے شہر میں تھی اس لیے مجھے اپنا آبائی گھر ہی نہیں شہر بھی چھوڑنا پڑا۔ آٹھ نو سال بہت اچھی طرح گزرے جس کے دوران میں دو بیٹوں کی ماں بھی بن گئی۔ مگر پھر اس کے بعد آزمائش اور امتحان کا ایک طویل دور شروع ہوا۔ شوہر سول انجینئر تھے۔ اپنے فرائض کی ادائیگی کے سلسلے میں ایک زیرِ تعمیر عمارت کا معائنہ کرنے گئے جو تجارتی کمپنی بلڈنگ تعمیر کرارہی تھی اس نے انتہائی ناقص میٹریل استعمال کیا تھا۔ میرے شوہر معائنہ میں مصروف تھے کہ ایک دن قبل پڑی ہوئی چھت مع اپنے ستونوں کے زمیں بوس ہوگئی۔ جو چار آدمی ملبے کے نیچے دب کر جاں بحق ہوئے ان میں میرے شوہر بھی شامل تھے۔ ان کے ساتھ چھوڑ جانے کے بعد میں نے کن حالات میں زندگی گزاری اور کس طرح اپنے دونوں بیٹوں کو ضروری تعلیم و تربیت فراہم کی وہ ایک الگ داستان ہے۔ بہرحال خدا کا شکر ہے کہ اس نے استقامت سے جدوجہد کا پھل عطا کیا۔ میرے دونوں بیٹے آگے پیچھے بیرونی ممالک میں اچھی سروس پر لگ گئے۔ جس زمانے کا میں ذکر کرنے لگی ہوں تب میں اپنے گھر میں تنہا رہتی تھی۔ ساس سسر کا انتقال بھی ہوچکا تھا۔ والد فوت ہوگئے تھے۔ والدہ حیات تھیں۔ مگر ظاہر ہے کہ وہ اور بھائی بہن دوسرے شہر میں تھے۔ دیگر سسرالی عزیزوں سے کوئی خاص تعلقات نہیں تھے۔

پڑوس میں دو کمروں، ایک برآمدے اور ایک صحن کا چھوٹا سا مکان تھا جس میں آٹھ دس مہینے سے ایک شریف و پاکیزہ کردار نوجوان طارق رہتا تھا۔ وہ ایک مقامی کمپنی میں اسٹینوگرافر تھا اور ایک طریقہ سے ملازمت کرنے شہر آیا تھا۔ اتفاق کی بات تھی کہ اس کی صورت اور قد و قامت میرے چھوٹے بیٹے محمود سے بہت ملتی تھی۔ بیٹوں کی عدم موجودگی مجھے خاصا اداس رکھتی تھی۔ طارق کو دیکھا تو یوں محسوس ہوا جیسے میرا محمود آگیا ہے۔ ایک دن میں نے خود ہی اس سے بات کی اور اس کی سادہ مزاجی اور پُرخلوص باتوں سے بیحد متاثر ہوئی۔ اس نے بتایا کہ اس کے والد ایک چھوٹے سے کاشتکار ہیں۔ وہ ان کا اکلوتا بیٹا ہے جبکہ اس کی چار بہنیں ہیں۔ گھر کا خرچ کھیتی باڑی سے بمشکل پورا ہوتا ہے۔ والد کو اس کی تعلیم کی بھی کوئی فکر نہیں تھی مگر اسے پڑھنے کا شوق تھا۔ اپنے شوق اور محنت سے اس نے پہلے میٹرک اور پھر ایف اے پاس کیا۔ تب تک دو بہنوں کی شادی کے سلسلے میں اس کے والد کافی مقروض ہوگئے تھے۔ مجبوراً اسے مزید تعلیم کو ادھورا چھوڑ کر ملازمت تلاش کرنا پڑی۔ ایک ہمدرد کے مشورے سے ٹائپنگ اور شارٹ ہینڈ کا کورس پاس کرلیا۔ اسی اضافی قابلیت کی وجہ سے اسے ملازمت کے لیے زیادہ ٹھوکریں نہیں کھانا پڑیں۔ اب وہ اپنی نصف سے زیادہ تنخواہ اپنے گھر منی آڈر کردیتا ہے اور باقی رقم سے اپنا گزارہ کرنے کی کوشش کرتا ہے۔

یہ معلوم کرکے کہ وہ اپنے محدود بجٹ کی وجہ سے سستے ہوٹلوں اور ریستورانوں میں سستے قسم کا کھانا کھانے پر مجبور ہے میں نے اسے بڑے اصرار سے اپنے ہاں کھانے اور ناشتے کا انتظام کرنے پر آمادہ کرلیا۔ اگرچہ مجھے اس کے دیے ہوئے پیسوں سے کوئی فرق نہیں پڑتا تھا لیکن جب اس نے مصمم لہجے میں یہ کہا کہ وہ میرے گھر کھانا اور ناشتا صرف اسی صورت میں قبول کرسکتا ہے جب میں اس سے کم سے کم اتنی رقم ضرور لوں جو وہ کھانے اور ناشتے پر صرف کرتا ہے تو میں نے اس کی بھلائی کے خیال سے منظور کرلیا۔ اور پھر جیسے جیسے دن گزرتے گئے وہ مجھے اپنے بیٹوں ہی کی طرح عزیز

اور پیارا ہوگیا۔

طارق کی تیسری بہن کی بات بھی طے ہوچکی تھی۔ لڑکے والے جلدی کررہے تھے اور طارق کی ماں اسے ہر خط میں جلد سے جلد چھٹی لے کر آنے کی تاکید کررہی تھیں مگر طارق کی مجبوری یہ تھی کہ وہ ملازمت کا سال پورا ہونے سے قبل دو تین ہفتہ کی اکٹھی چھٹی نہیں لے سکتا تھا۔ پھر طارق کی والدہ کے ایک خط سے معلوم ہوا کہ انہوں نے طارق کے لیے بھی ایک لڑکی دیکھ لی ہے اور چاہتی ہیں کہ بیٹی اور بیٹے کی شادی کے فرض سے ساتھ ہی فارغ ہوجائیں۔ مگر طارق کا خیال تھا کہ جب تک چوتھی بہن کی بھی شادی نہ ہوجائے اور لیا ہوا تمام قرض نہ اتر جائے وہ اپنی شادی کے بارے میں نہ سوچے۔ مجھے اس کے خیال سے اتفاق تھا۔ شادی کے بعد بیوی کو ساتھ رکھنے کا تو کوئی مسئلہ نہیں تھا کہ مکان موجود ہی تھا مگر ایک فرد کے اضافے سے اخراجات اور ذمے داریوں میں اضافہ لازمی تھا اور یوں بچت کی وہ رقم متاثر ہوسکتی تھی جو طارق بڑی پابندی سے ہر ماہ اپنے والد کو بھجوا رہا تھا۔ اور رقم میں کمی قرض کی ادائیگی کی مدت میں اضافہ کا موجب بنتی جو طارق کو کسی حال میں منظور نہیں تھا۔ وہ جلد از جلد اس بوجھ سے نجات حاصل کرنا چاہتا تھا۔ اس لیے اس نے اپنی ماں کو..... لکھ دیا تھا کہ سردست وہ اس کی شادی کے بارے میں نہ سوچیں مگر مجھے ایک ماں کے جذبات کا اندازہ تھا۔ سوچتی تھی کہ یہاں سے تو طارق نے انکار لکھ دیا ہے مگر اپنے گھر پہنچ کر وہ ماں باپ کے اصرار کے مقابلے میں بھی اپنے فیصلے پر ثابت قدم رہ سکتا ہے اس کا امکان کم تھا۔ بہرحال جب بہن کی تاریخ ٹھہر گئی اور طارق کی چھٹیاں بھی واجب ہوگئیں تب وہ بیس دن کی رخصت لے کر اپنے گھر روانہ ہوگیا۔

☆☆☆

طارق کے تذکرے کو اس مقام پر چھوڑ کر میں اس لڑکی کی کہانی کا آغاز کرتی ہوں جس کی آپ بیتی میرے قلم اٹھانے کی محرک بنی ہے۔ اس لڑکی کا نام رقیہ تھا۔ اس کے والدین ایک چھوٹے سے شہر میں رہتے تھے۔ غریب اور تنگدست طبقہ سے تعلق تھا۔ والد ایک سرکاری دفتر میں چپراسی تھے۔ رقیہ ان کی پہلی اولاد تھی۔ جب تک کنبہ تین چار افراد تک محدود رہا تب تک تو کسی نہ کسی طرح کام چلتا رہا مگر مسلسل تیسری بیٹی کی پیدائش کے بعد بیٹے کی شدید تمنا رکھنے کے باوجود رقیہ کے والدین کو سوچنا پڑا کیونکہ موجودہ آمدنی میں مزید کسی اضافے کی گنجائش نہیں تھی اگرچہ تینوں بہنوں کی پیدائش میں دو اور تین سال سے کم وقفہ نہیں تھا۔ پھر جب تیسری بیٹی اس قابل ہوئی کہ ماں کے بغیر چند گھنٹے گزار سکے اور بھوک لگے تو دودھ کے علاوہ کچھ اور بھی کھاپی سکے تو رقیہ کی والدہ نے بھی ایک بچوں کے اسکول میں بطور خادمہ کے ملازمت کرلی۔ تب رقیہ کی عمر تقریباً گیارہ برس کی تھی اور وہ اس قابل ہوچکی تھی کہ ماں باپ..... کی عدم موجودگی میں گھر کو اور بہنوں کو سنبھال سکے۔ اس اضافی آمدنی کا گھر کی مجموعی صورتِ حال پر اچھا اثر ہوا۔ رقیہ نے اردو قاعدہ اور تیسری جماعت تک کی کتابیں گھر پر ہی پڑھ لی تھیں۔ کچھ آسودگی آئی تو اس نے ماں سے ضد کرکے ایک دوسری شفٹ والے اسکول میں داخلہ لے لیا۔ اس کی ماں اپنی ڈیوٹی سے فارغ ہوکر ایک بجے تک گھر آجاتی تھی اس لیے اس کے آنے کے بعد رقیہ کو اسکول جانے میں کوئی دشواری نہیں تھی۔

اس طرح... سات سال بیت گئے۔ رقیہ نے میٹرک کرلیا۔ گھر کے حالات کچھ بہتر ہوئے تو والدین کی دلی خواہش پھر جاگ اٹھی اور اس مرتبہ قسمت نے بھی ان کا ساتھ دیا تیسری بہن کی پیدائش کے تقریباً دس سال بعد بالآخر رقیہ کا ایک بھائی آہی گیا۔ رقیہ کی ماں کو اپنی ملازمت چھوڑنا پڑی لیکن بیٹا ہونے کی خوشی اتنی زیادہ تھی کہ آمدنی کم ہوجانے کا نقصان برداشت کرلیا گیا۔ مگر اس صورتِ حال سے رقیہ کی تعلیم رک گئی اور وہ میٹرک فرسٹ ڈویژن میں پاس کرنے کے باوجود کالج میں داخلہ نہیں لے سکی۔ اگرچہ ماں نے اسے تسلی دی تھی کہ بیٹا دو تین سال کا ہوجائے گا تو وہ پھر کسی اسکول میں ملازمت کرلے گی اور رقیہ کو کالج میں داخلہ دلوادے گی۔ لیکن تقدیر کو کچھ اور ہی منظور تھا۔ ان دو تین برسوں میں حالات نے ایک ایسی کروٹ بدلی کہ رقیہ کی زندگی کا رخ ہی تبدیل ہوگیا۔

رقیہ بہت خوبصورت لڑکی تھی۔ متناسب جسم اور قد و قامت نے اسے اور زیادہ دلکش بنادیا تھا۔ محلے کا ایک اوباش نوجوان بشیر اس کے پیچھے لگ گیا۔ وہ شکل و صورت کا اچھا تھا اور اس نے اپنی بداعمالیوں کے سلسلے میں اتنی احتیاط رکھی تھی کہ محلے میں بہت کم لوگ اس کی آوارگی اور غیر اخلاقی و غیر قانونی حرکتوں سے واقف تھے۔ خوش لباس بھی تھا تعلیم اگرچہ سات آٹھ جماعتوں سے زیادہ نہیں تھی مگر ذہین اور چالاک تھا اور چہرے مہرے سے خاصا تعلیم یافتہ معلوم ہوتا

تھا۔ اس نے رقیہ کو اپنے جال میں پھانسنے کے لیے کافی صبر و تحمل سے کام لیا۔ پہلے بات چیت کی کوئی کوشش کیے بغیر کئی ماہ تک گھر سے اسکول اور اسکول سے گھر تک بڑی خاموشی سے اس کا تعاقب کرتا رہا۔ یوں رقیہ کے ذہن اور تصور میں اپنی ایک خاص جگہ بنالی۔ پھر جب رقیہ اس کے تعاقب کی عادی بلکہ ایک طرح سے منتظر رہنے لگی تو اس نے اگلا قدم اٹھایا۔ ایک دن ایک کاپی خریدی اس میں اپنا خط لکھا اور رقیہ کو اس بہانے سے دے دی کہ شاید اس کی کتابوں کا پیوں میں سے یہ کاپی گر گئی ہے۔ چلتے راستے میں بشیر کے یوں مخاطب ہونے سے رقیہ گھبرا گئی اور اس نے اسی گھبراہٹ میں بات کو کم اور مختصر کرنے کے لیے شکریہ ادا کرتے ہوئے کاپی لے لی۔

یوں ان دونوں کی خط و کتابت کا آغاز ہوا۔ ایک ماہ کے اندر بشیر نے رقیہ کو نہ صرف اپنی چاہت میں مبتلا کرلیا بلکہ ایک دوبار اسکول سے واپسی پر ملاقاتیں بھی کرلیں۔ وہ جانتا تھا کہ رقیہ غریب گھر کی لڑکی ہے اس لیے وہ ہمیشہ اسے اپنے دولت مند ہونے اور اس دولت کے سہارے رقیہ کو خوشگوار اور سہانی زندگی کے خواب دکھاتا رہتا تھا کہ رقیہ سے شادی کر لینے کے بعد وہ کس طرح دنیا بھر کی راحتیں اور عیش و آرام اس کے قدموں پر ڈھیر کردے گا۔ اس نے رقیہ کو یہ یقین بھی دلا دیا کہ نہ اس کے والدین اور نہ رقیہ کے ماں باپ ان کو شادی کرنے کی اجازت دیں گے کیونکہ رقیہ کے ماں باپ کی غریبی ان کے ایک ہونے کے راستے میں سب سے بڑی رکاوٹ ہے اور پھر بہت محتاط انداز میں رفتہ رفتہ اسے گھر چھوڑ کر اپنے ساتھ بھاگ چلنے پر آمادہ کرلیا۔

سیدھی سادی ناتجربہ کار رقیہ جسے بشیر نے قیمتی تحائف دے کر اپنی دولت مندی کا یقین اور اپنے محبت میں مستقل مزاج اور ثابت قدم ہونے کا اعتماد دلا دیا تھا۔ ہر قسم کے نتائج سے آنکھیں بند کر کے ایک رات چند جوڑے کپڑے اور چاندی کے ایک دو زیورات لے کر بشیر کے ساتھ بظاہر ایک نامعلوم منزل کی جانب روانہ ہوگئی۔ اپنے نزدیک وہ بشیر کے ساتھ ایک ایسے شہر میں جارہی تھی جہاں بشیر کا ایک دولت مند دوست بہت بڑا کاروبار کرتا تھا۔ بشیر نے اسے یقین دلایا تھا کہ وہ اپنے ساتھ کم سے کم پچاس ہزار روپے لے کر جائے گا۔ اپنے دوست کے ساتھ بزنس میں پارٹنر شپ کرلے گا۔ گھر کا انتظام اس نے پہلے ہی کرلیا ہے۔ پہنچنے کے دوسرے دن وہ شادی کرلیں گے اور پھر دوست کے ساتھ کاروبار میں شراکت سے جو آمدنی ہوگی وہ بہت عیش و آرام سے ان کی گزر اوقات کے لیے کافی ہوگی۔

☆☆☆

حیرت کا پہلا ہلکا سا جھٹکا رقیہ کو اس وقت لگا جب بشیر نے حسبِ وعدہ اسے کسی کرائے پر لیے ہوئے مکان کے بجائے اپنے دوست وحید کے گھر ٹھہرایا۔ یہ بارہ تیرہ کمروں پر مشتمل ایک دومنزلہ مکان تھا جس میں کئی خوبصورت لڑکیاں اور اپنی صورت سے ہی سخت گیر اور چالباز نظر آنے والے دو تین مرد مقیم تھے جن میں سے ایک کا نام وحید تھا اور وہ ان سب کا سرگروہ معلوم ہوتا تھا۔ پہلی رات رقیہ کو بڑے آرام سے ایک الگ کمرے میں رکھا گیا! اگلی صبح بشیر اس کے پاس آیا اور کہا کہ وہ واپس گھر جارہا ہے تاکہ محلے میں کسی کو یہ شبہ نہ ہو سکے کہ رقیہ اس کے ساتھ بھاگی ہے۔ دو چار دن میں بات کچھ ٹھنڈی بھی پڑ جائے گی اور یہ بھی معلوم ہوجائے گا کہ رقیہ کے ماں باپ نے بیٹی کے غائب ہونے پر کوئی قانونی کارروائی ضروری سمجھی ہے یا نہیں۔ اس جانب سے اطمینان حاصل کرنے پر بشیر دوبارہ آجائے گا اور تب وہ دونوں شادی کرلیں گے۔ اس کی غیر حاضری میں وحید جو کہ اس کا قابلِ اعتماد دوست ہے اس کے آرام و آسائش کا پورا خیال رکھے گا۔۔ اور رقیہ کو بھی چاہیے کہ وہ اپنی اور بشیر کی سلامتی کے خیال سے وحید کو ناراض ہونے کا موقع نہ دے۔

رقیہ والدین کے گھر سے نکل کر مجبور ہو چکی تھی کہ بشیر جو کچھ کہہ رہا ہے اس کو سچ مانے اور اس کی مرضی کے مطابق عمل کرے۔ یوں بشیر اسے وحید کے حوالے کر کے چلا گیا۔

ایک دو دن میں ہی۔ سرِ شام سے رات گئے تک ہونے والی پُراسرار سرگرمیوں سے رقیہ کو اندازہ ہو گیا کہ اپنی ناسمجھی اور بشیر پر اندھے اعتماد نے اسے کہاں پہنچا دیا ہے۔ اور جب ایک ادھیڑ عمر بھاری جسم والی خرانٹ عورت نے اسے بتایا کہ بشیر نے اسے دس ہزار روپے کے عوض وحید کے ہاتھ فروخت کردیا ہے تو رقیہ کو اپنی تباہی صاف نظر آنے لگی۔

اب وہ پچھتا رہی تھی کہ جذبات کے اندھے پن میں کتنی سنگین غلطی کر بیٹھی ہے۔ اس دوران اسے دو تین لڑکیوں سے بھی ملنے کا اتفاق ہوا جنہوں نے بتایا کہ وحید ایک ہائی کلاس جسم فروشی کا اڈا چلا رہا ہے۔ اس کے گاہکوں میں اعلیٰ طبقے کے افراد شامل ہیں۔ جو اپنی عیاشی پر سیکڑوں کیا ہزاروں روپے خرچ کر سکتے ہیں۔ اسی لیے وحید ان سے ایک کمرے کا کرایہ ایک ہزار سے پندرہ ہزار روپے تک وصول کرتا ہے۔

بشیر نے تعلقات کے آغاز سے وحید کے گھر لانے تک رقیہ کے ساتھ کوئی غیر اخلاقی حرکت نہیں کی تھی اور اسی بات نے رقیہ کو اس کے خلوص پر اندھا اعتماد کرنے پر مجبور کردیا تھا مگر یہاں آکر اسے معلوم ہوا کہ اس میں بشیر کی نیت کی پاکبازی کا کوئی ہاتھ نہیں تھا۔ وحید کی لازمی شرط تھی کہ اس کے پاس لائی جانے والی لڑکی ہر اعتبار سے اچھوتی ہو تاکہ وہ اس کے پہلے گاہک سے ہی خرچ کی گئی رقم سے زیادہ وصول کر سکے۔ ان لڑکیوں نے یہ بھی بتایا کہ وہ خود بھی کم و بیش رقیہ جیسے حالات کے تحت ہی اس مکان تک پہنچی ہیں۔ ابھی ہفتہ عشرہ وحید رقیہ کو تنگ نہیں کرے گا۔ اس دوران وہ ادھیڑ عمر دلالہ برابر لیکچر پلاتی رہے گی کہ اس طرزِ زندگی کو اپنانے میں رقیہ کا کتنا فائدہ اور مزاحمت کرنے میں کتنے خطرات ہیں۔ پھر جب وہ تقدیر کا لکھا سمجھ کر اس ماحول سے مانوس ہوجائے گی تو کسی رات اس کا سودا بھی کرلیا جائے گا۔

رقیہ جن حالات میں پھنس چکی تھی ان سے نجات حاصل کرنے کی کوئی صورت نظر نہیں آرہی تھی۔ اس نے اس قید سے بھاگنے کے بارے میں بھی سوچا۔ لیکن وحید کی نگرانی کا نظام اتنا کڑا تھا کہ کوئی لڑکی اوپر سے نیچے یا نیچے سے اوپر بھی نہیں جاسکتی تھی، مکان سے باہر قدم نکالنا تو دور کی بات تھی۔ اگر کبھی کوئی گاہک کسی لڑکی کو اپنے ساتھ لے جانا چاہتا تھا تو اس کے لیے دگنی فیس تھی اور ایک خاص خفیہ راستہ استعمال کیا جاتا تھا جو ایک سرنگ کی صورت میں چلتے ہوئے مکان سے کچھ فاصلے پر ایک گلی میں کھلتا تھا۔ گاہک کو لڑکی اسی گلی میں مل جاتی تھی اور واپسی میں جو صبح کے چار بجے تک ہونا لازمی تھی، گاہک لڑکی کو اسی گلی میں چھوڑ جاتا تھا۔ ظاہری طور پر وحید نے اس مکان کو ایک کاروباری بلڈنگ بنا رکھا تھا جس میں مختلف کمپنیوں کے دفاتر تھے۔ جن کے بورڈ بھی لگے ہوئے تھے۔ مگر حقیقت میں یہ تمام کمپنیاں فرضی تھیں۔ جن کا نام کے ایک بورڈ کے علاوہ کوئی وجود نہیں تھا۔ یہی وجہ تھی کہ مقامی پولیس کو بھی وحید کے خفیہ کاروبار کے بارے میں کوئی خاص معلومات نہیں تھیں۔ کبھی کوئی بات افواہ کی صورت میں باہر نکلی بھی تو وحید کے سرپرستوں نے پولیس کو کارروائی کرنے سے روک دیا پھر بھی وحید نے دور اندیشی کے خیال سے (اس خفیہ راستہ کے علاوہ) مکان کے عقبی حصے میں دو تین دروازے بنوا رکھے تھے اور تمام لڑکیوں کو تاکید کردی گئی تھی کہ وہ کسی خطرے کی صورت میں ان دروازوں سے نکل کر بھاگ جائیں۔

اب یہ اتفاق تھا یا قدرت کو رقیہ کی عزت بچانا مقصود تھی کہ اس علاقہ کے پولیس اسٹیشن میں ایک نیا ایس ایچ او آیا اور اس نے اہلِ محلّہ کی جانب سے کچھ گمنام خطوط موصول ہونے پر پوشیدہ طور پر تحقیقات کی۔ اس کے کچھ شکوک و شبہات بڑھے۔ اور اس نے ٹھوس ثبوت حاصل کرنے کے لیے سادہ لباس میں فرضی گاہک بھیجنے اور عین وقت پر چھاپا مارنے کا فیصلہ کرلیا۔

☆☆☆

تقریباً دس دن کے بعد اس دلالہ عورت نے جسے سب لڑکیاں میڈم کہا کرتی تھیں رقیہ کو بالکل صاف اور دوٹوک الفاظ میں بتایا کہ ایک خوبصورت اور نوجوان رئیس زادے نے اسے پسند کرلیا ہے وہ آج کی رات اس کا مہمان ہوگا۔۔۔۔ رقیہ کو کوئی ایسی بات نہیں کرنا چاہیے کہ وحید کو گھی نکالنے کے لیے اپنی انگلیاں ٹیڑھی کرنا پڑیں۔ اس سے پہلے یہ۔۔۔ میڈم تقریباً روزانہ رقیہ کو لیکچر پلاتی رہی تھی کہ بشیر نے اس کے اعتماد کو دھوکا دیا ہے اور وہ ایک مرد تھا۔ تمام مرد اسی کی طرح بے وفا اور ہوس کے غلام ہوتے ہیں۔ کہیں یہ ہوس دولت کی ہوتی ہے اور کہیں شباب کی۔ رقیہ کو تمام مردوں سے انتقام لینا چاہیے اور وہ انتقام اسی طرح لیا جاسکتا ہے کہ انہیں اس دولت و ثروت سے محروم کردیا جائے جس کے بل پر وہ عورتوں کو اپنا جی بہلانے کا ایک کھلونا سمجھتے ہیں۔

رقیہ اپنی مجبوری و بے بسی اچھی طرح جاننے کے باوجود میڈم کے دلائل سے متفق نہیں تھی۔ وہ اپنے آپ کو بچانا چاہتی تھی مگر عملی مزاحمت کرنے کا اس میں حوصلہ نہیں تھا۔ پھر اس نے مختلف لڑکیوں سے کچھ ایسی مثالیں بھی سنی تھیں کہ اگر کبھی کسی ضدی اور سرکش لڑکی نے وحید کا حکم ماننے سے انکار کیا تو اس پر کیا گزری۔ اپنے بچاؤ کے لیے اس کا واحد سہارا وہ دعائیں تھیں جو وہ نماز پڑھ کر مانگتی تھی یا پھر ایک موہوم سی امید کہ وہ اپنے گاہک کے قدموں پر گر کر اس سے التجا کرے گی کہ وہ اسے برباد نہ کرے۔ اسے چاہتا ہے تو اسے اس جگہ سے نکال کر لے جائے اور باقاعدہ شادی کرلے۔ اس کا خیال تھا کہ شاید اس طرح کسی کے دل میں اس کے لیے رحم اور ہمدردی کا جذبہ پیدا ہوجائے اور وہ بے عزت ہونے سے بچ جائے۔

سہ پہر سے رقیہ کا سنگھار شروع کردیا گیا تھا اور وہ خاموشی سے تمام وہ کام کرتی چلی جارہی تھی جو میڈم چاہتی

تھی نو بجے تک وہ کسی نئی نویلی دلہن کی طرح سجا بنا کر تیار کردی گئی تھی۔ پھر اسے جس خاص کمرے میں لے جایا گیا وہ بھی اپنی سجاوٹ میں کسی حجلہ عروسی سے کم نہیں لگ رہا تھا۔ رقیہ دھڑکتے دل کے ساتھ انجانے قدموں کی آہٹ کی منتظر تھی اور اپنا حوصلہ بنائے رکھنے کے لیے وہ دل ہی دل میں وہ باتیں دہرا رہی تھی جو اس نے اپنے گاہک کے دل میں جذبۂ ہمدردی کو بیدار کرنے کے لیے سوچی تھیں۔ اچانک ایک شور سا اٹھا۔ باہر راہداری میں بھاگتے قدموں کی آوازیں اور لڑکیوں کی دبی دبی چیخیں سنائی دینے لگیں۔ اس نے دروازہ کھول کر جھانکا۔

ایک بھاگتی ہوئی لڑکی نے اسے دیکھا اور چیخ کر بولی۔ ''پولیس نے فرضی گاہک کے بھیس میں چھاپا مارا ہے۔ اپنی جان بچاؤ۔ عقبی دروازے سے بھاگ نکلو ورنہ پولیس کے ہاتھ لگ گئیں تو تمہیں بھی جسم فروشی کے جرم میں گرفتار کرلیا جائے گا۔''

''مجھے نہیں معلوم کہ عقبی دروازہ کہاں ہے۔'' رقیہ نے گھبرا کر جواب دیا۔

''تب میرے پیچھے چلی آؤ۔'' لڑکی نے قدم بڑھاتے ہوئے کہا۔

غنیمت تھا کہ سنگار کرنے والی نے اس کے لیے جو لباس پسند کیا تھا وہ شلوار اور قمیص پر مشتمل تھا اگر کہیں اس نے غرارہ پہنا دیا ہوتا۔ جو اس کے لیے بھیجے گئے ملبوسات میں شامل تھا تو رقیہ کو بھاگنے میں بڑی مشکل پیش آتی۔ وہ اس لڑکی کے پیچھے دوڑتی چلی گئی۔ بالائی منزل کا زینہ طے کرکے نیچے آئی۔ اس وقت تک وہاں پولیس کہیں پہنچی تھی۔ البتہ بہت سے حواس باختہ نوجوان لڑکے اور لڑکیاں، جن میں سے کئی پورا لباس بھی نہیں پہنے تھے' مختلف اطراف میں بھاگ رہے تھے۔ رقیہ نے دیکھا کہ بھاگنے والوں میں وحید کے کئی ساتھی بھی شامل ہیں۔ وہ اسی لڑکی سے چند قدم پیچھے بھاگتے ہوئے ایک عقبی دروازے سے نکل کر مکان سے باہر آگئی۔

''اب میرا پیچھا چھوڑو'' لڑکی بولی۔ ''اور جس طرف منہ اٹھے بھاگتی چلی جاؤ۔ کسی کے ساتھ لگنے کی کوشش مت کرنا اس صورت میں پکڑے جانے کا امکان زیادہ ہوگا۔''

رقیہ نے کچھ نہ سمجھتے ہوئے سر ہلایا اور ایک قریبی گلی میں گھوم گئی۔ اسے کچھ اندازہ نہیں تھا اور نہ اس وقت ذہن یہ سوچنے کے قابل تھا کہ وہ کہاں جا رہی ہے یا کہاں جائے۔ وہ تو اپنے اور پولیس کے درمیان زیادہ سے زیادہ فاصلہ پیدا کرنے کے لیے بس بھاگتی چلی جا رہی تھی۔ اچانک گلی سے نکل کر مین روڈ پر آتے ہوئے وہ کسی سے ٹکرائی۔ اس کے منہ سے ایک دبی چیخ نکلی اور وہ سڑک پر گرنے لگی تھی کہ ایک مضبوط ہاتھ نے اس کا بازو تھام لیا۔

☆☆☆

انسپکٹر سعید کی سرکردگی میں پولیس کا چھاپا اگرچہ پوری طرح کامیاب نہیں رہا تھا۔ مکان میں موجود اکثر لڑکیاں اور گاہک عقبی دروازوں سے فرار ہوگئے تھے۔ مگر پھر بھی اس نے کئی جوڑوں کو ناگفتہ بہ حالت میں کمروں سے برآمد کرلیا تھا۔ وحید اور اس کا ایک ساتھی بھی پکڑے گئے مگر بیشتر خفیہ راستے سے بھاگ نکلے تھے۔ پولیس کی بنیادی غلطی یہ تھی کہ اس نے مکان کے جغرافیہ اور گرد و پیش کے بارے میں کوئی فکر نہیں کی۔ بہت کم نفری کے ساتھ چھاپا مارا۔ اس لیے عقبی دروازوں کے بارے میں معلوم ہوجانے کے باوجود انسپکٹر سعید بھاگنے والوں کو پکڑنے میں ناکام رہا پھر بھی اسے خوشی تھی کہ کئی ٹھوس ثبوت اس کے ہاتھ لگنے کے علاوہ وحید بھی گرفتار ہوچکا تھا جس کے متعلق اسے ابتدائی بیانات سے ہی معلوم ہوگیا کہ وہ اس اڈے کا کرتا دھرتا ہے۔ اسے یقین تھا کہ وحید سے اسے بھاگ جانے والوں کے بارے میں بھی تفصیلی معلومات حاصل ہوجائیں گی اور جلد یا بدیر وہ اس کے باقی ساتھیوں کو پکڑنے میں کامیاب ہوجائے گا۔

☆☆☆

طارق بہن کی شادی سے فارغ ہوکر رات کو منزل پر پہنچنے والی ٹرین سے واپس آیا تھا۔ اسٹیشن سے گھر تک کا فاصلہ کافی تھا اس نے رکشا کرنے کی کوشش کی مگر رات ہونے کی وجہ سے ہر رکشا والے نے اتنے زیادہ کرائے کا مطالبہ کیا کہ طارق نے پیدل جانے کا فیصلہ کرلیا۔ وہ بڑی کوشش کے بعد بالآخر اپنی ماں کو یہ بات سمجھانے میں کامیاب ہوگیا تھا کہ سردست صرف بہن کی شادی ہی کردی جائے۔ پھر جب چوتھی بہن کا نمبر آئے گا تب وہ اپنی شادی کے بارے میں بھی غور کرے گا اور ممکن ہوا تو دونوں شادیاں ایک ساتھ ہی ہوجائیں گی۔

وہ ایک ہاتھ میں چھوٹے سائز کا اٹیچی کیس لٹکائے چلا جا رہا تھا کہ قریبی گلی سے کوئی اندھا دھند بھاگتے ہوئے

نکلا اور اس سے ٹکرا گیا۔ ٹکرانے والے کو غور سے دیکھنے سے پہلے ہی طارق کو اس کے منہ سے نکلنے والی چیخ سے اندازہ ہوگیا کہ وہ کوئی لڑکی ہے۔ اس نے پھرتی سے ہاتھ بڑھا کر اس کا بازو پکڑ کر سنبھالتے ہوئے گرنے سے بچالیا۔ بجلی کا کھمبا قریب ہی تھا اس کی روشنی میں طارق نے لڑکی کے خوبصورت لباس اور حسین چہرے کے میک اپ کو غور سے دیکھا تو اسے یوں لگا جیسے کوئی لڑکی اپنی مرضی کے خلاف شادی سے بچنے کے لیے گھر سے بھاگ نکلی ہے۔

بلاشبہ یہ رقیہ ہی تھی جو یوں طارق سے ٹکرا گئی تھی۔ اس نے سنبھلتے ہوئے طارق کے چہرے پر نگاہ ڈالی اور اس کی نظروں میں حیرت کے ساتھ ہمدردی کا تاثر محسوس کرکے جلدی سے بولی۔

''کچھ غنڈے میرا پیچھا کر رہے ہیں۔ خدا کے لیے میری مدد کیجیے۔''

طارق نے گلی میں جھانک کر دیکھا۔ وہ اسے دور تک سنسان نظر آئی۔

''وہاں تو کوئی نہیں ہے۔'' اس نے تسلی آمیز لہجے میں کہا۔

مگر رقیہ کا خیال تھا کہ وہ اپنے پیچھے کسی کے قدموں کی آوازیں سنتی رہی ہے اور یہ خیال کچھ غلط بھی نہیں تھا۔ وحید کا ایک ساتھی بھی اسی گلی میں داخل ہوا تھا۔ اس نے اپنے آگے ایک لڑکی کو زرق برق لباس میں بھاگتے دیکھا تو اندازہ کرلیا کہ وہ رقیہ ہی ہوسکتی ہے کیونکہ نئی لڑکیوں میں اس رات صرف اسی کا سودا ہوا تھا وہ نہیں چاہتا تھا کہ یہ شہری چڑیا... پولیس کے ہاتھ لگ جائے یا از خود کہیں فرار ہوجائے۔ وہ اسے نگاہ میں رکھے ہوئے تھا تاکہ خطرے کے مقام سے دور نکل آنے کے بعد وہ رقیہ کو پکڑ کر وحید کے کسی دوسرے محفوظ اڈے پر پہنچا دے مگر اسے ایک نوجوان سے باتیں کرتے دیکھ کر رک گیا اور پھر جیسے ہی طارق نے پلٹ کر گلی کی طرف دیکھا وہ اس کی نظر سے بچنے کے لیے ایک مکان کی آڑ میں ہوگیا۔

''شاید وہ آپ کو دیکھ کر چھپ گئے ہیں۔'' رقیہ بولی۔ ''پلیز میری مدد کریں۔ مجھے کسی محفوظ جگہ پہنچا دیں۔''

طارق کو کچھ حیرت ہوئی۔ ان حالات میں کوئی بھی لڑکی یہی کہتی کہ اسے اس کے گھر پہنچا دیں۔ یہ کیسی لڑکی ہے جو کسی اور محفوظ جگہ جانا چاہتی ہے۔ کیا اس کا اپنا گھر اس کے لیے محفوظ نہیں ہے۔ وہ یہ سوچ ہی رہا تھا کہ گلی میں کافی فاصلے پر کچھ آوازیں سنائی دیں۔ شاید کچھ اور افراد بھی پولیس سے بچنے کی کوشش میں اس گلی کا رخ کر رہے تھے۔

''یہاں رکنا مناسب نہیں'' طارق نے ان آوازوں کو لڑکی کے بیان کی تصدیق خیال کیا'' آپ میرے ساتھ چلیں۔ راستے میں کوئی رکشا یا ٹیکسی مل گئی تو اسے روک کر آپ جہاں جانا چاہیں گی میں آپ کو پہنچا دوں گا۔''

وہ دونوں نسبتاً تیز قدموں سے آگے بڑھے۔ کچھ دور جاکر طارق نے پلٹ کر دیکھا۔ اسے تین آدمی گلی سے نکل کر روڈ پر آتے نظر آئے۔ مگر وہ ٹھہرنے کے بجائے مخالف سمت میں بھاگتے چلے گئے۔

''اب آپ کو پریشان ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔'' اس نے کہا۔ ''جو غنڈے آپ کا پیچھا کر رہے تھے وہ دوسری جانب چلے گئے ہیں۔''

رقیہ نے پلٹ کر دیکھا مگر کوئی جواب نہیں دیا۔ خطرے سے دور نکل آنے پر اب وہ یہ سوچ رہی تھی کہ اس اجنبی شہر میں رات کے وقت وہ کہاں جائے گی۔ اسے کہاں پناہ مل سکتی ہے۔ جہاں وہ پولیس سے بھی بچی رہے اور وحید سے بھی، ان ہی چند لمحوں میں اس کے دل میں آپ سے آپ طارق پر اعتماد بڑھتا جا رہا تھا۔ مگر وہ اسے اپنے بارے میں حقیقت بتائے بغیر کیسے مدد کی درخواست کرسکے گی۔

''میرا نام طارق ہے۔ آپ کا نام کیا ہے؟'' طارق نے اسے خاموش پاکر کہا۔

''رقیہ'' جواب ملا۔

''میں یہاں ایک کمپنی میں ملازم ہوں۔ گھر والے ایک قصبہ میں رہتے ہیں۔ میری بہن کی شادی تھی۔ چھٹی لے کر گھر گیا تھا اب واپس آرہا ہوں۔'' طارق کا خیال تھا کہ اس جواب میں رقیہ بھی اپنے بارے میں کچھ بتائے گی مگر وہ خاموش رہی۔

''اگر کچھ غنڈے آپ کا پیچھا کر رہے'' چند لمحہ انتظار کرکے وہ پھر بولا۔ ''تو بہتر ہوگا کہ آپ پولیس میں رپورٹ درج کرا دیں۔ آگے کچھ فاصلے پر ایک پولیس اسٹیشن بھی ہے۔''

''نہیں۔'' رقیہ نے گھبرا کر کہا۔ ''میں پولیس میں رپورٹ کرنا نہیں چاہتی۔''

''تب پھر اپنے گھر کا پتا بتائیں تاکہ میں آپ کو وہاں پہنچا دوں۔''

''میرا کوئی گھر نہیں ہے۔'' آخر رقیہ کو بتانا پڑا۔

"پھر آپ اس وقت رات میں کہاں سے آرہی تھیں اور وہ بھی ایسے لباس میں جیسے کسی تقریب میں گئی ہوں۔"

"اگر میں آپ کو اپنے بارے میں سب کچھ سچ سچ بتادوں۔" رقیہ نے ایک گہری سانس لی "تو کیا آپ وعدہ کرتے ہیں کہ میری مدد کریں گے اور یہ باتیں کسی اور کو نہیں بتائیں گے۔"

"دیکھیے آپ اچانک ہی میرے راستہ میں آگئی ہیں۔" طارق نے سنجیدگی سے کہا۔ "مزید یہ کہ آپ ایک خوبصورت نوجوان لڑکی ہیں۔ آپ کی جگہ کوئی مرد ہوتا تو شاید میں بلا تامل وعدہ کرلیتا لیکن جب تک آپ کے جملہ حالات کا مجھے علم نہ ہو میں آپ سے کوئی وعدہ نہیں کرسکتا۔ کون کہہ سکتا ہے کہ اس وعدے کی مجھے کیا قیمت ادا کرنا پڑے۔"

"میں ایک گھریلو سیدھی سادی کم عقل لڑکی ہوں۔" رقیہ نے جواب دیا۔ "زندگی کے بارے میں میرا تجربہ بہت محدود ہے اور جو ہے وہ بھی مردوں کے بارے میں کسی اچھے تاثر کی گنجائش پیدا نہیں کرتا۔ لیکن نہ معلوم کیوں میرے اندر سے کوئی آواز کہہ رہی ہے کہ میں آپ پر اعتماد کرسکتی ہوں۔ میں آپ کو اپنی کہانی سناتی ہوں۔ پھر یہ آپ پر منحصر ہے کہ آپ میری مدد کرنا پسند کرتے ہیں یا نہیں۔"

رقیہ نے بہت مختصر الفاظ میں...... کافی ہچکچاتے ہوئے...... بشیر سے واقفیت پھر محبت پھر اس کے ساتھ گھر سے بھاگنے سے لے کر وحید کے اڈے پر پہنچنے اور پھر وہاں آج کی رات اپنے سودے اور پولیس کے اچانک چھاپے تک پوری روداد سنادی "میں نے گھر سے بھاگ کے جو حماقت کی تھی" اس نے آخر میں کہا۔ "اس کی سزا مجھے مل رہی ہے۔ مگر خدا کا لاکھ لاکھ شکر و احسان ہے کہ اس نے ابھی تک میری عزت کو محفوظ رکھا ہے۔ مگر اب میرے لیے دو طرفہ خطرہ ہے۔ ایک جانب وحید اور اس کے ساتھی میری تلاش کریں گے دوسری طرف میں پولیس سے بھی مدد نہیں لے سکتی کہ وحید کے اڈے پر میری موجودگی کے بارے میں معلوم ہوتے ہی پولیس مجھے بھی گرفتار کرلے گی۔ ان حالات میں، میں کہاں جاؤں، کیا کروں، میری کچھ سمجھ میں نہیں آرہا ہے۔"

طارق نے گہرے تاسف اور بڑھتی ہوئی فکر و تشویش کے ساتھ رقیہ کی کہانی سنی۔

"کیا آپ اپنے گھر واپس نہیں جاسکتیں۔" اس نے پوچھا۔

"والدین اور بھائی بہنوں کے سامنے کیا منہ لے کر جاؤں گی... اور ہمت کرکے چلی بھی جاؤں تو کون یقین کرے گا کہ گھر سے پندرہ بیس دن غائب رہنے اور ایک جسم فروشی کے اڈے پر رکھے جانے کے باوجود میں پاکباز واپس آئی ہوں۔ میرا فرار اور گمشدگی، ممکن ہے وقت گزرنے کے ساتھ ان کے زخم بھر دے۔ لیکن گھر میں میری موجودگی ان کے سینے پر مونگ دلنے اور ایک مستقل ذلت اور رسوائی کا سبب بنی رہے گی۔"

"یہ مسئلہ عجلت میں کوئی فیصلہ کرنے کا نہیں ہے۔" طارق نے سوچتے ہوئے کہا۔ "اس پر اچھی طرح غور کرنا پڑے گا۔ دوسری طرف آپ کے لیے ایک پناہ گاہ کی فوری ضرورت ہے۔ میں اپنے گھر میں اکیلا نہ رہتا ہوتا تو آپ کو وہاں ٹھہرنے کی پیشکش کرتا۔ لیکن اب اگر میں آپ کو اپنے گھر لے چلوں تو محلے والوں اور خاص طور سے حامدہ آنٹی کو کیا بتاؤں گا کہ آپ کون ہیں۔"

"یہ حامدہ آنٹی کون ہیں۔" رقیہ نے پوچھا۔

"میرے پڑوس میں رہتی ہیں۔ بہت ہی مخلص، ہمدرد اور محبت کرنے والی خاتون ہیں، میرے کھانے پینے کا انتظام انہوں نے اپنے ذمے لے رکھا ہے۔ اگرچہ میں کھانے اور ناشتے کے نام پر ایک حقیری رقم انہیں دیتا ہوں مگر مجھے احساس ہے کہ جس طرح کا کھانا مجھے ملتا ہے وہ اس سے دگنی رقم کا متقاضی ہے مگر میری مجبوری یہ ہے کہ میں موجودہ حالات میں اس سے زیادہ دے نہیں سکتا۔ اسی سے تم ان کے خلوص کا اندازہ کرسکتی ہو۔"

رقیہ نے کوئی جواب نہیں دیا۔ طارق بھی خاموش ہوگیا۔ کچھ فاصلہ رہی خاموشی میں طے ہوا۔

"میرا خیال ہے کہ آنٹی کو رازدار بنائے بغیر کام نہیں بنے گا۔" آخر طارق نے کہا۔ "مجھے تمہارے تمام حالات انہیں بتانا پڑیں گے شاید وہ کوئی مناسب حل تجویز کرسکیں۔"

لیکن طارق کو معلوم نہیں تھا کہ رقیہ کو اس کے ساتھ اس سج دھج کے ساتھ آتے دیکھ کر ہی قدرتی طور پر کسی غلط فہمی کا شکار ہوجاؤں گی... اور یہ غلط فہمی نہ صرف میرے بلکہ ان کے دلوں میں بھی ایک ایسے جذبے کو پیدا کرنے میں معاون بنے گی جس کے نتیجے میں حالات ایک بالکل نئی صورت اختیار کرلیں گے۔

☆☆☆

طارق مجھے اپنی واپسی کی ممکنہ تاریخ بتا کر گیا تھا۔ اس لیے اس رات میں اس کی واپسی کی نہ صرف منتظر تھی بلکہ اس کے لیے کھانے میں کچھ ایسی چیزیں بھی پکا کر رکھی تھیں جو طارق کو بہت پسند تھیں۔ اسے رکشا سے ایک خوبصورت لڑکی کے ساتھ اترتے دیکھ کر مجھے قدرے حیرت ہوئی مگر صرف تھوڑی دیر کے لیے۔ فوراً ہی میرے ذہن میں یہ خیال ابھرا کہ طارق کے والدین نے اس کے انکار کے باوجود اپنی من مانی کرتے ہوئے اس کی بھی شادی کردی۔ اس لڑکی کا شوخ بھڑکدار لباس اور چہرے کی سجاوٹ بھی اس خیال کی تائید کررہی تھی۔ لیکن مجھے یہ سوچ کر حیرت و افسوس ضرور ہوا کہ طارق جو مشرقی تہذیب و تمدن کا دلدادہ تھا ایک دم سے اتنا ترقی پسند بن گیا کہ اپنی دلہن کو ایسے لباس میں بغیر برقع کے لے کر آیا ہے۔

بہرحال میں ان دونوں کے استقبال کے لیے آگے بڑھی۔ طارق رکشا والے کو کرایہ دے کر اٹیچی کیس اٹھائے گھوما ہی تھا کہ میں ان کے قریب پہنچ گئی۔

"تو آخرکار تم نے شادی کرہی لی۔" میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔

طارق نے چونک کر پہلے میری طرف اور پھر کن انکھیوں سے اس لڑکی کی طرف دیکھا۔ مگر شاید سڑک پر کچھ کہنا مناسب نہ سمجھتے ہوئے میری بات نظر انداز کرکے لڑکی سے مخاطب ہوا۔

"رقیہ، یہ ہیں حامدہ آنٹی جن کا ذکر میں نے تم سے راستے میں کیا تھا۔"

رقیہ نے بھی کچھ حیرت زدہ شرمائے ہوئے انداز میں مجھے سلام کیا۔ میں نے اس کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے سلام کا جواب اور پھر دعائیں دیں۔

"دلہن تو بہت خوبصورت لائے ہو۔" میں نے پھر طارق کو مخاطب کیا۔

"آیئے گھر میں چلیں۔" طارق نے جلدی سے کہا اور آگے بڑھ کر اپنے مکان کے دروازے میں لگا ہوا قفل کھولا۔

ہم آگے پیچھے چلتے ہوئے گھر میں داخل ہوئے۔ طارق نے بجلی کا بٹن دبا کر کمرے میں روشنی کی اور پھر میری طرف دیکھ کر بڑے سنجیدہ لہجے میں کہا۔

"آپ کو غلط فہمی ہوئی ہے آنٹی! ابھی میری شادی نہیں ہوئی۔ لیکن مجھے خیال ہی نہیں آیا تھا کہ حالات کے پیش نظر آپ رقیہ کو میرے ساتھ دیکھ کر قدرتی طور پر یہی سوچیں گی۔ بہرحال یہ میری بیوی نہیں ہیں، ایک پریشان حال مصیبت زدہ لڑکی ہے جس سے ابھی راستے میں میری ملاقات ہوئی ہے۔"

اور پھر اس نے رقیہ کے اتفاقاً ملنے کے علاوہ وہ تمام حالات بھی کہہ سنائے جو اسے رقیہ کی زبانی معلوم ہوئے تھے "میں انہیں اس لیے اپنے ساتھ لے آیا کہ اول تو یہ اس شہر میں بالکل اجنبی ہیں اور پھر جن حالات میں گرفتار ہیں ان میں مجھے اس کے علاوہ کوئی چارۂ کار نظر نہیں آیا کہ میں انہیں اپنے ساتھ گھر لے آؤں اور پھر آپ سے مشورہ کروں کہ ہم کس طرح ان کی مدد کرسکتے ہیں۔"

میں نے غور سے رقیہ کی طرف دیکھا جو خاموشی سے آنسو بہا رہی تھی۔ مجھے اس کے چہرے سے معصومیت اور شرافت جھانکتی محسوس ہوئی اور مجھے یقین ہوگیا کہ اس نے طارق کو اپنے بارے میں جو کچھ بھی بتایا ہے وہ غلط نہیں ہے۔

"تم نے وہی کیا جو ایک شریف انسان کو کرنا چاہیے تھا۔" میں نے جواب دیا۔ "لیکن اب ہم اس کے لیے کیا کریں یہ سوال بہت ٹیڑھا ہے۔ ہر پہلو پر غور کرنا پڑے گا۔"

"کیا آپ رقیہ کو اپنے گھر میں نہیں رکھ سکتیں۔" طارق نے پوچھا۔

"مگر کس حیثیت سے" میں نے جواب دیا۔ "میں اس محلے میں اتنے عرصے سے رہ رہی ہوں کہ محلے والے میرے تمام حالات سے واقف ہیں۔ رقیہ کو اپنے عزیز یا کسی رشتے دار کی بہن یا بیٹی ظاہر کروں گی تو کسی کو یقین نہیں آئے گا۔ سب جانتے ہیں کہ سسرال والوں سے میرا کوئی تعلق نہیں ہے اور میکے میں کوئی ایسا عزیز نہیں جس کی کوئی لڑکی میرے پاس مستقل قیام کے لیے آسکے۔"

"کہہ تو آپ ٹھیک رہی ہیں۔" طارق نے سوچتے ہوئے کہا۔ "مگر پھر کیا کیا جائے۔"

اتنی دیر میں میرے ذہن میں ایک نیا خیال ابھرا۔

"تم رقیہ کو اپنے گھر میں رکھ سکتے ہو۔" میں نے خفیف تبسم کے ساتھ کہا۔

"کیا" طارق چونکا، مگر لوگ......"

"لوگ وہی سمجھیں گے جو کچھ دیر قبل میں نے سمجھا تھا۔" میں نے جواب دیا "میں سوچ رہی ہوں کہ تقدیر نے بلاوجہ ہی تم دونوں کو نہیں ملایا ہے۔ رقیہ ایک شریف گھر کی لڑکی ہے۔ ناتجربہ کاری میں اس سے ایک غلطی ضرور ہوگئی

مگر خدا کا شکر ہے کہ اس غلطی سے کچھ زیادہ نقصان نہیں ہوا۔ اسے اس وقت سہارے کی ضرورت ہے۔ تم اگر اس سے شادی کرلو تو یہ ایک بہت ہی بڑی نیکی ہوگی۔ مگر ظاہر ہے کہ ایسا کوئی فیصلہ زبردستی مسلط نہیں کیا جاسکتا۔ جب تک تم دونوں اس پر دل سے آمادہ نہ ہو تب تک اس پر عمل کرنا ممکن نہیں۔ لیکن اس عذر کی آڑ میں سردست رقیہ کو تمہارے گھر میں پناہ مل سکتی ہے اور کسی کو شک وشبہ کیا کچھ کہنے سننے کی گنجائش بھی نہیں ہوگی۔ پھر ایک ساتھ رہتے ہوئے اگر کچھ دن کے بعد ایک دوسرے کو اچھی طرح سمجھ اور پرکھ لینے کے بعد تم شادی کے فیصلے تک پہنچو تو میں پوشیدہ طریقے سے اپنی کسی ملنے والی کے گھر جاکر قاضی صاحب کو بلا کر نکاح بھی پڑھوا دوں گی۔"

"مگر میرے والدین......"

"انہیں آمادہ کرنا تمہارا کام ہوگا۔" میں نے کہا۔ "تم ان کے جس قدر کام آرہے ہو مجھے امید ہے کہ تمہارے والدین تمہاری پسند سے اختلاف نہیں کریں گے۔ مگر یہ سب بہت بعد کی باتیں ہیں۔ سردست اس تجویز سے ہمیں رقیہ کو پناہ دینا مقصود ہے۔ پھر کچھ مدت کے بعد ممکن ہے کوئی دوسرا حل سمجھ میں آجائے۔ یا اگر تم لوگ شادی نہ کرنا چاہو یا تمہارے والدین آمادہ نہ ہوں تب پھر دوبارہ غور کرلیں گے کہ اب آیندہ کیا کیا جائے۔ ممکن ہے میں رقیہ کے لیے کوئی دوسرا اچھا رشتہ تلاش کرلوں۔ یا پھر تم رقیہ کے شہر جاکر اس کے والدین سے مل کر تمام حالات بتاؤ اور انہیں آمادہ کرلو کہ وہ اپنی بیٹی کو واپس قبول کرلیں۔ اور بھی کئی طریقے سوچے جاسکتے ہیں۔ مگر فوری طور پر میری عقل میں اس سے بہتر اور کوئی حل نہیں آرہا ہے۔ البتہ اتنی بات ضرور ہے کہ تم دونوں ایک گھر میں دن ورات ساتھ رہو گے اس لیے محتاط رہنا ہوگا کہ کسی بھی جانب سے کوئی غلط قدم نہ اٹھایا جائے۔"

☆☆☆

اور پھر ویسا ہی کیا گیا جیسا کہ میں نے طارق اور رقیہ کو مشورہ دیا تھا اگرچہ اس وقت مجھے بھی معلوم نہیں تھا کہ حالات جلد ہی ایک نئی کروٹ بدلیں گے۔ ایسی کروٹ کہ ایک دوسرے کو پسند کرنے کے باوجود ان دونوں کے راستے میں ایسی نادیدہ رکاوٹ پیدا ہوجائے گی جسے دور کرنا ہم میں سے کسی کے لیے بھی ممکن نہ ہوگا۔ پاس پڑوس اور محلے والوں نے رقیہ کو طارق کی بیوی کی حیثیت سے بلا تامل قبول کرلیا۔ کئی پڑوسی جانتے تھے کہ بہن کی شادی کے ساتھ والدین اس کی بھی شادی کرنا چاہتے ہیں۔ اس لیے کسی کو یقین دلانے کے لیے اس سے زیادہ کچھ کہنے کی ضرورت نہیں پڑی کہ یہ رقیہ ہے۔ طارق کی دلہن۔

ایک ہی دن گزرا تھا کہ شام کے وقت ایک صورت سے ہی غنڈہ نظر آنے والا آدمی طارق سے ملنے اس کے گھر آیا۔

"میں وحید دادا کا آدمی ہوں" اس نے کہا۔ "اور اس لیے کہ شاید تم وحید دادا کو جانتے نہ ہو یہ بتانا چاہتا ہوں کہ کوئی شخص ان کے حکم کی خلاف ورزی کرکے زندہ نہیں رہ سکتا۔ کل رات تم ایک لڑکی کو اپنے گھر لائے ہو۔ وہ وحید دادا کی ملکیت ہے۔ سردست دادا پولیس کی حراست میں ہیں مگر بہت جلد ضمانت پر چھوٹ جائیں گے۔ انہیں معلوم ہے کہ لڑکی تمہارے گھر ہے اور ان کا خیال ہے کہ موجودہ حالات میں وہ تمہارے گھر میں زیادہ محفوظ ہے اس لیے اسے دادا کی امانت جان کر حفاظت سے اپنے پاس رکھو، دادا رہا ہونے پر خود اسے آکر لے جائیں گے اور ہاں، خبردار جو تم نے اس لڑکی کو ہاتھ لگایا یا اس معاملے کو پولیس تک لے جانے کی کوشش کی۔ دونوں صورتوں میں تم زندہ نہیں رہو گے۔"

"وہ لڑکی اب میری پناہ میں ہے۔" طارق نے حوصلے سے جواب دیا۔ "تمہارا دادا اسے جسم فروشی پر مجبور کرنا چاہتا ہے مگر وہ ایک شریف لڑکی ہے۔ اس بے عزتی سے مرجانا زیادہ پسند کرتی ہے۔ آخر تم لوگ اس کا پیچھا چھوڑ کیوں نہیں دیتے۔ تمہارے لیے ایک لڑکی کی کمی بیشی سے کیا فرق پڑے گا۔"

"میں تم سے بحث کرنے نہیں آیا۔ دادا کا حکم سنانے آیا تھا وہ سنادیا۔" اس آدمی نے سخت لہجے میں کہا "میں چاہوں تو اس وقت ہی تمہیں ختم کرکے لڑکی کو لے جاسکتا ہوں مگر دادا کا حکم نہیں ہے۔ تمہیں میرا مخلصانہ مشورہ ہے کہ دادا کے حکم کے خلاف عمل کرنے کے بارے میں سوچنا بھی مت۔ ورنہ ان کا غصہ صرف تمہیں ہی نہیں تمہارے تمام خاندان کو بھی تباہ کرسکتا ہے۔ دادا کے ہاتھ بہت لمبے ہیں اور آج تک کوئی ان کی مرضی کے خلاف چل کر سزا سے نہیں بچ سکا ہے۔"

میں اور رقیہ بھی دوسرے کمرے میں اس آدمی کی باتیں سن رہی تھیں۔ جب وہ چلا گیا تو رقیہ نے افسردہ اور مایوس لہجے میں طارق سے کہا۔ "آپ میری وجہ سے بلاوجہ کسی

مصیبت میں نہ پڑیں۔ وحید بہت بڑا بدمعاش ہے۔ بڑے اثر ورسوخ کا مالک ہے۔ میری وجہ سے آپ اس سے دشمنی مول نہ لیں۔ جو میرے نصیب میں لکھا ہے وہ تو پیش آکر ہی رہے گا۔"

"مگر وحید کو یہ پتا کیسے چلا کہ رقیہ یہاں ہے۔" میں نے حیرت سے کہا۔

"ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے اس کے کسی ساتھی نے رقیہ کو میرے ساتھ باتیں کرتے دیکھ لیا تھا۔" طارق نے جواب دیا۔ "پھر اس نے ہمارا پیچھا کرکے معلوم کرلیا کہ میں رقیہ کو یہاں لایا ہوں۔ مگر سوال یہ ہے کہ اب کیا کیا جائے۔ میں اتنی آسانی سے رقیہ کو ان بدمعاشوں کے حوالے نہیں کروں گا۔"

"مگر آپ کر بھی کیا سکتے ہیں۔" رقیہ بولی۔ "پولیس سے مدد لینے جائیں گے تو وہ مجھے بھی گرفتار کرلے گی اور پھر ممکن ہے آپ سے بھی بازپرس کی جائے کہ حالات سے واقف ہونے کے بعد بھی آپ نے پولیس سے رابطہ قائم کیوں نہیں کیا۔"

"قبل از مرگ واویلا کرنے سے کوئی فائدہ نہیں۔" میں نے کہا۔ "جب سے اس علاقے میں نیا ایس ایچ او آیا ہے پولیس بڑی مستعد ہوگئی ہے۔ مجھے امید نہیں کہ وہ وحید کو آسانی سے ضمانت پر رہا ہونے دے گا۔ اور جب تک وحید رہا نہ ہو رقیہ کو کوئی خطرہ نہیں ہے۔ اس دوران ہم رقیہ کو بچانے کی کوئی ایسی ترکیب سوچنے کی کوشش کریں گے جس سے رقیہ بھی محفوظ رہے اور تم پر بھی کوئی آنچ نہ آئے۔"

"ایسی کیا ترکیب ہوسکتی ہے۔" طارق نے سوال کیا۔

"مثلاً یہی ہوسکتا ہے کہ میں رقیہ کو اپنے کسی جاننے والے کے گھر بھیج دوں۔" میں نے سوچتے ہوئے کہا۔ "اور جب وحید آئے تو تم اس سے یہ کہہ دو کہ رقیہ تمہاری اور اس کے آدمی کے درمیان ہونے والی باتیں سن کر ڈر گئی اور تمہاری لاعلمی میں گھر سے چلی گئی۔"

"اول تو وحید یقین نہیں کرے گا۔" رقیہ نے کہا۔ "دوسرے آپ لوگوں کے لیے پھر وہی سوال پیدا ہوگا کہ آپ کیا کہہ کر مجھے کسی کے گھر میں رکھیں گی۔"

یہ دشواری واقعی ایک بڑی رکاوٹ تھی۔ میں کوئی جواب نہیں دے سکی۔

"اگر نیا ایس ایچ او ایسا ہی فرض شناس پولیس آفیسر ہے۔" طارق بولا۔ "تو میں اس سے ملاقات کرکے اور تمام حالات بیان کرکے مدد کی درخواست کرسکتا ہوں۔ ممکن ہے وہ ایک شریف لڑکی کو رسوائی سے بچانے کے لیے رقیہ کو شامل تفتیش نہ کرے اور کوئی ایسی ترکیب بھی بتادے کہ ہم وحید کی انتقامی کارروائی سے محفوظ ہوجائیں۔"

"ہاں یہ ممکن ہے۔" میں نے کچھ جوش کے ساتھ کہا۔ "بشرطیکہ وحید یا اس کے ساتھیوں کو یہ علم نہ ہونے پائے کہ تم نے پولیس سے رابطہ قائم کیا ہے۔"

"وحید کو کیسے معلوم ہوسکتا ہے۔" طارق نے کہا۔

"جب اس نے دھمکی دی ہے کہ پولیس سے مدد مت لینا تو اس کا انتظام بھی کیا ہوگا کہ تم کوئی ایسی حرکت کرو تو اسے پتا چل جائے۔ میرا مطلب ہے کہ یہ کوئی غیر ممکن بات نہ ہوگی کہ اس کا کوئی آدمی تمہارے گھر کی نگرانی کررہا ہو۔"

عجیب وغریب صورتِ حال تھی جس سے نجات کا کوئی پہلو نظر نہیں آرہا تھا مگر ظاہر تھا کہ اس پریشانی کو اوڑھ کر روزانہ کے معمولات بند نہیں کیے جاسکتے تھے۔ یہ ہی سوچا کہ بچاؤ کے بارے میں غور کرتے رہیں گے سردست تو کوئی خطرہ لاحق نہیں ہے اس لیے غیر ضروری طور پر پریشان ہونے سے کوئی فائدہ نہیں۔

☆☆☆

ایک ہفتے سے زیادہ دن گزر گئے اور وحید نے طارق کے گھر کا رخ نہیں کیا۔ اس مدت میں بہت کچھ سوچنے کے بعد بھی پولیس سے مدد لینے کے علاوہ کوئی معقول حل ہماری سمجھ میں نہیں آیا۔ مگر جیسے جیسے دن گزرتے جارہے تھے ایک موہوم سی امید دل میں پیدا ہونے لگی تھی کہ اپنے تمام تر اثر ورسوخ کے باوجود اس مرتبہ وحید کا تعلق جس پولیس آفیسر سے پڑا ہے وہ اسے آسانی سے چھوڑنے والا نہیں معلوم ہوتا۔ اس لیے ممکن ہے وحید ضمانت پر رہا نہ ہوسکے اور یوں اس سے ہماری جان بچی رہے۔

لیکن تقدیر میں جو لکھا ہوتا ہے وہ پورا ہوکر ہی رہتا ہے۔ دسویں روز وحید رات کو آہی دھمکا۔ طارق نے اس کو بہت سمجھانے کی کوشش کی۔ خوشامد بھی کی مگر وحید کا ایک ہی جواب تھا کہ رقیہ اس کا بزنس ہے، وہ اس سے ہزاروں نہیں لاکھوں کمانے کی توقع رکھتا ہے۔ مزید یہ کہ اب تک وہ اس کی ذات پر پندرہ بیس ہزار روپے خرچ بھی کرچکا ہے۔ اگر طارق کو اس کی ذات سے اتنی ہی دلچسپی ہے تو کم سے کم دو لاکھ روپے ادا کردے اور رقیہ کو اپنے پاس رکھ لے۔ ظاہر تھا

کہ طارق اتنی بڑی رقم کہاں سے لاسکتا تھا۔ میرے بینک اکاؤنٹ میں بھی ساٹھ ستر ہزار سے زیادہ بیلنس کہیں تھا۔ دوسری طرف رقیہ اپنی وجہ سے طارق کو کسی قربانی یا ایثار کے لیے مجبور کرنا نہیں چاہتی تھی۔ اتنے دن ساتھ رہنے کی وجہ سے وہ دونوں ایک دوسرے سے بے حد محبت کرنے لگے تھے اور یہ محبت ہی رقیہ کو طارق سے دست بردار ہونے اور طارق کو رقیہ کے لیے اپنی جان پر بھی کھیل جانے پر مجبور کررہی تھی۔ لیکن رقیہ کی ایک دلیل کا طارق کے پاس بھی کوئی جواب نہیں تھا۔ اس کا کہنا تھا کہ طارق اپنی ذات سے تنہا نہیں ہے۔ اس کی سلامتی سے اس کے والدین اور ایک بہن کا مستقبل وابستہ ہے اور وہ یعنی رقیہ اس بات کی اجازت نہیں دے سکتی کہ طارق اس کی ایک جان کے لیے نہ صرف خود کی بلکہ اپنے خاندان کی تباہی کو بھی دعوت دے۔

جب وحید کسی طرح آمادہ نہیں ہوا تو رقیہ نے اس سے کہا۔ ”میں تمہارے ساتھ چلنے اور جو کچھ میرے نصیب میں لکھا ہے اس کا سامنا کرنے کے لیے تیار ہوں۔ لیکن تمہیں تھوڑی سی مدد کرنا ہوگی۔“

”وہ کیا۔“ وحید نے پوچھا۔

”پڑوسی اور اہلِ محلہ مجھے طارق صاحب کی بیوی خیال کرتے ہیں۔“ رقیہ نے جواب دیا۔ ”اگرچہ خدا گواہ ہے کہ ایک گھر کی چھت کے نیچے رہتے ہوئے بھی طارق صاحب نے مجھ سے نگاہ ملا کر بات بھی نہیں کی۔ میں آج بھی اسی طرح ہوں جس طرح تمہارے اڈے سے نکلی تھی۔ اب اگر میں اچانک رات کی تاریکی میں تمہارے ساتھ چل دوں گی تو طارق صاحب محلے والوں کو کیا جواب دیں گے اور اتنے دن ان کی پناہ میں رہنے کا اتنا حق تو بنتا ہے کہ تم ان کی عزت پر حرف نہ آنے دو۔“

”آخر تم کیا چاہتی ہو۔“ وحید نے کچھ نرم پڑتے ہوئے پوچھا۔

”میں چاہتی ہوں کہ تم آج کے بجائے مجھے دو تین دن کے بعد لے جاؤ۔“ رقیہ نے کہا۔ ”ہم پڑوسیوں سے کہہ دیں گے کہ میں اپنے میکے جارہی ہوں۔ پھر طارق صاحب مجھے اپنے ساتھ اسٹیشن لے جائیں گے۔ تم وہاں آجانا اور پھر جہاں چاہو اپنے ساتھ لے جانا۔“

”اس میں کوئی چالاکی تو نہیں ہے۔“ وحید نے رقیہ کو گھورتے ہوئے سوال کیا۔

”ہم تم سے چالاکی کیسے کرسکتے ہیں۔ اگر کرنا ہوتی تو دس دن کے اندر کوئی ترکیب سوچتے۔ جب اتنے دن کچھ نہ کرسکے تو اب دو تین روز میں کیا کرلیں گے۔“

”اچھی بات ہے۔“ آخر وحید مان گیا۔ ”میں تمہیں دو دن کی مہلت دے سکتا ہوں اس سے زیادہ نہیں۔“

”مجھے منظور ہے۔ آج سے تیسرے دن تم مجھے اسٹیشن سے اپنے ساتھ لے جاسکتے ہو۔“

”کس وقت“ وحید نے پوچھا۔

رقیہ نے طارق کی طرف دیکھا۔

”ایک ٹرین صبح دس بجے جاتی ہے اور دوسری سہ پہر چار بجے۔“ طارق نے جواب دیا۔

”ٹھیک ہے تم چار بجے رقیہ کو لے کر اسٹیشن پہنچ جانا۔“ وحید نے کہا اور چلا گیا۔

اس کے جانے کے بعد ہم تینوں نے......

...... ایک بار پھر اس مصیبت سے بچنے کا کوئی طریقہ سوچنے کی کوشش کی۔ مگر ہماری سمجھ میں کوئی حل نہیں آرہا تھا۔ اچانک طارق بولا۔

”اب پولیس سے مدد لینے کے علاوہ کوئی چارہ نہیں ہے۔ میں نے معلوم کیا تھا علاقے کے ایس ایچ او کا نام انسپکٹر سعید ہے۔ وحید کے خلاف کیس کا چارج ان ہی کے پاس ہے۔ مجھے یہ بھی پتا چلا ہے کہ وہ بہت ہمدرد مخلص اور ایماندار پولیس آفیسر ہیں۔ اگر میں ان سے مل کر سارے حالات بیان کروں تو امید ہے کہ وہ رقیہ کو بچانے کے لیے ہماری پوری مدد کریں گے۔“

یہ ایک خطرناک اقدام تھا مگر اب اس کے سوا کوئی چارہ بھی نہیں تھا۔ میں اور طارق اسی دن پولیس اسٹیشن جاکر انسپکٹر سعید سے ملے اور رازداری کا وعدہ لے کر تمام حالات انہیں بتادیے۔ ہماری زبانی تمام واقعات سن کر اور یہ جان کر کے کہ وحید رقیہ کو لینے اسٹیشن آئے گا انسپکٹر سعید بہت جوش میں بھر گئے۔

”کچھ بڑے لوگ اس کی پشت پناہی کررہے ہیں۔ انہوں نے اس کی پیروی کے لیے بہت بڑا وکیل کیا ہے اور روپیا پانی کی طرح بہایا جارہا ہے۔ میری تمام کوشش کے باوجود ہائی کورٹ نے اس کی ضمانت منظور کرلی۔ اگرچہ ضمانت کے لیے اسے بہت بڑی رقم ادا کرنا پڑی۔ اب اگر ضمانت پر رہائی کے دوران وہ پھر ویسا ہی جرم کرتا ہے جس کے الزام میں اس پر مقدمہ چلایا جارہا ہے تو نہ صرف اس کی ضمانت منسوخ ہوجائے گی اور...... میں اسے دوبارہ گرفتار

کرسکوں گا بلکہ پھر اس کے خلاف ہمارا مقدمہ بھی بہت مضبوط ہوجائے گا۔“

”لیکن اس طرح تو رقیہ کو بھی آپ تفتیش میں شامل کرلیں گے اور وہ بدنام ہوجائے گی۔“ طارق نے اعتراض کیا۔

”اس کے بغیر کوئی چارہ نہیں ہے۔“ انسپکٹر سعید نے جواب دیا۔ ”مگر آپ گھبرائیں نہیں رقیہ کو گرفتار نہیں کیا جائے گا۔ وحید کے اڈے سے پکڑی جانے والی کئی لڑکیاں شریف گھرانوں سے تعلق رکھتی تھیں اور ان سے زبردستی جسم فروشی کرائی جارہی تھی ہم نے ان سب کو رہا کردیا ہے۔ وہ صرف گواہ کی حیثیت سے پیش ہوں گی۔ اس کے علاوہ میں کوشش کروں گا کہ اخبارات میں رقیہ کا نام اور تصویر نہ آنے پائے۔

ان حالات میں یہ وعدہ بھی غنیمت تھا ہمیں اسی پر اکتفا کرنا پڑا۔ پولیس اسٹیشن سے واپسی پر ہماری صرف ایک ہی خواہش تھی کہ پروردگار کی رحمت سے یہ تمام معاملہ اس طرح بنتا جائے کہ رقیہ کو کم سے کم رسوائی کا سامنا کرنا پڑے۔

☆☆☆

ہمیں انسپکٹر سعید نے بتایا تھا کہ مقررہ دن اسٹیشن پر بھاری تعداد میں سادہ لباس پولیس موجود ہوگی اور وہ اس وقت تک دخل نہیں دے گی جب تک رقیہ طارق کے ساتھ ہوگی۔ پھر جیسے ہی وحید طارق سے رقیہ کو لے کر روانہ ہوگا اسے چاروں طرف سے گھیر کر گرفتار کرلیا جائے گا۔ یہ اندیشہ ضرور تھا کہ وہ مسلح ہو اور بھاگنے یا مقابلہ کرنے کی کوشش کرے مگر انسپکٹر سعید کا خیال تھا کہ وہ اپنا مقدمہ مزید بگاڑنے کے لیے کوئی خطرناک حرکت نہیں کرے گا۔

آخر تیسرا دن بھی آگیا۔ میں نے پاس پڑوس والوں سے پہلے ہی کہہ دیا تھا کہ رقیہ کچھ دنوں کے لیے اپنے میکے جارہی ہے۔ اور اپنی ایک ملنے والی سے بات کرکے جو کافی فاصلہ پر ایک دوسرے علاقہ میں رہتی تھیں یہ انتظام بھی کرلیا تھا کہ وحید کے گرفتار ہونے کے بعد ہم رقیہ کو اسٹیشن سے ان کے گھر لے جائیں گے جہاں رقیہ کو مقدمہ کا فیصلہ ہونے تک رکھا جائے گا۔ لوگوں نے طارق کی شادی کی خبر کی طرح اس بات پر بھی یقین کرلیا۔ آخر رقیہ ان کے خیال میں نو بیاہی دلہن تھی اور ایک دم سے والدین سے لمبی مدت کے لیے الگ نہیں رکھی جاسکتی تھی اس لیے اتنی جلدی اس کی واپسی پر کسی کو بھی حیرت نہیں ہوئی۔

مقررہ وقت پر میں اور طارق رقیہ کو ساتھ لے کر ٹیکسی میں اسٹیشن روانہ ہوگئے۔ ٹیکسی سے اتر کر پلیٹ فارم پر پہنچے۔ میں نے خوب غور سے چاروں طرف دیکھا۔ مگر نہ اسٹیشن کی عمارت کے باہر اور نہ پلیٹ فارم پر کوئی خاص گہما گہمی نظر نہیں آئی۔ اگر پولیس واقعی موجود تھی تو انسپکٹر سعید نے اسے بڑی ہوشیاری سے چھپایا تھا۔ ہم لوگ تقریباً پونے چار بجے پہنچ گئے تھے۔ بظاہر وحید بھی کہیں نظر نہیں آرہا تھا مگر ابھی پندرہ منٹ باقی تھے اور وہ کسی بھی لمحہ کسی طرف سے نمودار ہوسکتا تھا۔ ٹرین کے بارے میں معلوم ہوا کہ آدھا گھنٹا لیٹ ہے۔ ہم گیٹ سے کافی فاصلہ پر ایک جانب کھڑے ہوگئے۔ رقیہ کو میں نے ایک برقع فراہم کردیا تھا اور وہ نقاب چہرے پر ڈالے طارق کے داہنی جانب کھڑی تھی۔

ابھی چار بجنے میں پانچ منٹ تھے کہ وحید خدا جانے کس طرف سے نکل کر اچانک ہمارے سامنے آکھڑا ہوا۔

”آؤ چلو۔“ اس نے رقیہ سے کہا۔

”ایک بار پھر سوچ لو وحید“ طارق نے کہا۔ ”اگر تم رقیہ کو چھوڑ دو تو ہم دونوں تمہارے ساری زندگی احسان مند رہیں گے۔“

”اب بحث سے کوئی فائدہ نہیں۔“ وحید نے سخت لہجے میں جواب دیا۔ ”میں تم سے کہہ چکا ہوں کہ رقیہ کی قیمت دو لاکھ روپے ہے رقم ادا کردو اور اسے واپس لے جاؤ۔“

”میں اتنی رقم ایک وقت میں ادا نہیں کرسکتا۔“ طارق نے کہا۔ ”البتہ ایک ہزار روپے ماہانہ دے سکتا ہوں۔“

”کمال کرتے ہو۔“ وحید مسکرایا۔ ”اس طرح دو لاکھ کی ادائیگی کے لیے دو سو مہینے درکار ہوں گے یعنی سولہ سترہ سال۔“

”تم لاکھوں کروڑوں روپے کما چکے ہوگے کیا ایک غریب اور شریف لڑکی پر رحم بھی نہیں کرسکتے۔“

”میں بزنس کرتا ہوں، خیرات نہیں۔“ وحید نے ہاتھ بڑھا کر رقیہ کا بازو پکڑ لیا۔ ”چلو قدم بڑھاؤ۔“

طارق نے ایک گہری سانس لی۔

”اچھا رقیہ خدا حافظ۔“ وہ بولا۔ ”خدا تمہاری حفاظت کرے۔ اگر تمہاری بدنامی اور رسوائی کا خیال نہ ہوتا تو میں جان پر کھیل جاتا مگر تمہیں یوں جانے نہ دیتا۔ مگر میں خدا کی رحمت سے مایوس نہیں ہوں جو ایک مرتبہ تمہیں وحید کے چنگل سے رہائی دلا سکتا ہے وہ دوبارہ بھی کوئی معجزہ دکھا سکتا ہے۔“

وحید نے ایک ہلکا قہقہہ لگایا۔
”وہ ایک اتفاق تھا طارق صاحب۔“ اس نے کہا۔
”اور اتفاقات بار بار نہیں ہوتے۔“
طارق خاموش رہا۔ رقیہ جیسے بہ جبر وحید کے ساتھ چل دی۔ رقیہ اور طارق کے دل پر اس وقت جو کچھ گزر رہی ہوگی اس کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔ میرے اپنے دل کی کیفیت یہ تھی کہ اندر ہی اندر ڈوبتا چلا جا رہا تھا۔ اگرچہ یقین تھا کہ انسپکٹر سعید رقیہ کو اس آسانی سے نہیں لے جانے دے گا۔ لیکن ایک عجیب طرح کی گھبراہٹ محسوس ہو رہی تھی۔ دل کسی نامعلوم خطرے سے سہما جا رہا تھا۔ لگ رہا تھا کہ کوئی طوفان اٹھنے والا ہے۔ میری اور طارق کی نظریں وحید پر جمی ہوئی تھیں اور ابھی وحید چند قدم ہی آگے بڑھا تھا کہ ٹھیک اسی طرح جس طرح وہ اچانک ہمارے سامنے آ کھڑا ہوا تھا نہ جانے کہاں سے انسپکٹر سعید اپنی یونیفارم میں نمودار ہوا اور وحید کا راستہ روک لیا۔ ”یہ تمہارے ساتھ کون ہے۔“ اس نے سخت لہجے میں پوچھا۔
وحید یوں ایک دم سے انسپکٹر سعید کو اپنے سامنے دیکھ کر گھبرا گیا۔ مگر فوراً ہی سنبھل کر بولا۔ ”یہ میری کزن ہیں انسپکٹر صاحب، ہم لوگ کچھ عزیزوں کو خدا حافظ کہنے کے لیے آئے تھے۔“
”یہ جھوٹ بولتا ہے انسپکٹر صاحب۔“ اچانک رقیہ برقعے کا نقاب الٹ کر چیخی۔ ”اس نے مجھے ایک بدمعاش سے خریدا ہے جو مجھے میرے گھر سے اغوا کر کے لایا تھا اور اب یہ مجھ سے جسم فروشی کرانا چاہتا ہے۔“
رقیہ کا یہ کہنا تھا کہ وحید نے تیزی سے اپنی جیب میں ہاتھ ڈال کر ریوالور نکال لیا اور یکے بعد دیگرے رقیہ پر دو گولیاں چلائیں۔ رقیہ نے ایک چیخ ماری اور اپنا سینہ پکڑے پلیٹ فارم پر ڈھیر ہوگئی۔ وحید نے ایک جست لگائی اور گیٹ کی طرف بھاگا۔ میں اور طارق رقیہ کو سنبھالنے لپکے۔ انسپکٹر سعید نے بھی ریوالور نکال لیا اور ساتھ ہی پورے ریلوے اسٹیشن پر جیسے ایک ہنگامہ مچ گیا۔
”رک جاؤ وحید ورنہ میں گولی ماردوں گا۔“ انسپکٹر سعید نے للکارا۔
مگر وحید تیزی سے بھاگا چلا جا رہا تھا۔ انسپکٹر سعید نے نشانہ لیتے ہوئے فائر کیا۔ گولی وحید کی ٹانگ میں لگی وہ گرنے لگا تو اس نے پلٹ کر انسپکٹر سعید پر گولی چلائی۔ مگر نشانہ خطا گیا۔ انسپکٹر سعید نے دوسرا اور پھر تیسرا فائر کیا۔
دونوں گولیاں وحید کے جسم میں پیوست ہوگئیں اور وہ پلیٹ فارم پر گر کر بے حس و حرکت ہوگیا۔
میں اور طارق رقیہ کے قریب پہنچے مگر وہ ہمارے پہنچنے سے پہلے ہی ختم ہو چکی تھی۔ دوسری طرف وحید بھی زندہ نہیں بچا تھا۔ میں اور طارق جیسے ایک سکتے کے عالم میں رقیہ کے سرہانے بیٹھے اس کے بے نقاب چہرے کو دیکھ رہے تھے۔ جو بالکل ایسا معلوم ہو رہا تھا جیسے کوئی بھٹکا ہوا مسافر پُرپیچ راہوں کے خم سے تھک کر کچھ دیر آرام کرنے کے لیے ٹھہر گیا ہو۔
☆☆☆
رقیہ کی داستانِ حیات ختم ہوگئی۔ لیکن اس کی المناک موت کے صدمے نے طارق کو بھی زندہ درگور کر دیا تھا۔ وہ اس کے بعد سال بھر تک وہاں رہا لیکن میں نے کبھی اس کے چہرے پر مسکراہٹ نہیں دیکھی۔ پھر اس نے بتایا کہ اس کی چوتھی بہن کی شادی بھی طے ہو چکی ہے۔ وہ ایک ہفتہ کی چھٹی لے کر بظاہر اپنی بہن کی شادی کرنے گیا تھا مگر اس کے بعد پھر کبھی واپس نہیں آیا۔ میں نے اس کے والدین کے گھر کے پتے پر کئی خطوط لکھے۔ بہ مشکل ایک کا جواب موصول ہوا۔ جو اس کی ماں نے کسی سے لکھوا کر بھیجا تھا۔ اس خط کے مطابق طارق کی چوتھی بہن کی شادی بھی بخیر و خوبی ہوگئی تھی۔ اس کے والدین خود اس کی شادی بھی طے کر چکے تھے مگر طارق آمادہ نہیں تھا۔ والدین نے اس کے انکار سے تنگ آ کر اس بات پر رضامندی کا اظہار کیا کہ اگر طارق شادی نہیں کرنا چاہتا تھا تو سرِدست نکاح کر لے۔ رخصتی اس وقت ہوگی جب وہ چاہے گا۔ اس پہ طارق خاموش ہوگیا اور اس کے والدین نے اس خاموشی کو آمادگی سمجھتے ہوئے اس کی روانگی کی تاریخ سے ایک دن پہلے نکاح کرنے کا فیصلہ کرلیا۔ مگر طارق نکاح کے روز صبح سے جو گھر سے نکلا تو پھر پلٹ کر نہیں آیا۔ والدین نے اس کے تمام دوستوں، ملنے والوں اور آس پاس کے علاقوں میں ہر جگہ تلاش کرایا مگر اس کا کہیں کوئی سراغ نہیں ملا۔
بس یہ آخری اطلاع تھی جو مجھے طارق کے بارے میں ملی۔ اب اس واقعہ کو برسوں بیت چکے ہیں۔ مجھے کچھ معلوم نہیں کہ آیا طارق پھر دوبارہ اپنے گھر واپس لوٹا یا نہیں۔ جہاں تک میرا تعلق ہے تو طارق اور رقیہ دونوں ہی میرے لیے ایک ایسی یاد بن کر رہ گئے ہیں کہ جب بھی ان کا خیال آتا ہے تو آنکھیں آپ سے آپ بھیگ جاتی ہیں۔

مجرم کون

محترم مدیر اعلیٰ سرگزشت ڈائجسٹ
السلام علیکم!
یوں تو میں افسانے، کہانیاں ہی لکھتی ہوں لیکن اس بار میں اپنی ایک قریبی سہیلی کی آپ بیتی کے ساتھ حاضر ہوئی ہوں۔ میری سہیلی کی شرط تھی کہ اس کا نام نہ دیا جائے اس لیے نام تبدیل کردیا ہے۔ یہ سرگزشت صرف ذائقہ کی خاطر نہ پڑھیں، بہت بڑا سبق ہے اس لیے ضرور شائع کریں تاکہ معاشرہ جس رخ پر بڑھ رہا ہے اس میں سدھار آجائے۔

راحت وفا
(لاہور)

جس دن امی جان نے مجھے یہ کہا کہ شام کو چند مہمان آئیں گے تم ذرا اچھے کپڑے پہن لینا تب مجھے احساس ہوا کہ اب اس گھر سے رخصت ہونے کا وقت آنے والا ہے اور پھر ایسا ہی ہوا۔
میرے لیے آنے والا پہلا ہی رشتہ قبول کرلیا گیا۔ میں ایک سال سے بی۔ اے کر کے فارغ تھی۔ آگے پڑھنے کا مجھے کوئی شوق بھی نہیں تھا۔ گھر والوں نے بھی اصرار نہیں کیا اور ان کا ارادہ یہی تھا کہ مناسب رشتہ دیکھ کر مجھے

سسرال بھیج دیا جائے۔

میرے لیے جو رشتہ آیا تھا وہ لڑکا ایک پرائیویٹ فرم میں اچھے عہدے پر تھا۔ آفس کی طرف سے گاڑی بھی ملی ہوئی تھی۔ تنخواہ بھی پُرکشش تھی۔ اپنے والدین کا اکلوتا بیٹا تھا۔ ماں فوت ہوچکی تھی۔ صرف دونوں باپ بیٹا ہی تھے۔

☆☆☆

میں تیار ہوکر چائے لے کر ڈرائنگ روم میں آئی۔ میری نظریں جھکی ہوئی تھیں۔

''اِدھر آؤ بیٹی، میرے پاس بیٹھو۔'' ایک نرم سی آواز سن کر میں نے سامنے دیکھا۔ ایک ادھیڑ عمر آدمی سامنے بیٹھا مسکرا رہا تھا۔

گورا چٹا، خوبصورت آدمی تھا جو اپنی عمر سے بہت کم دکھائی دیتا تھا۔ اس کے قریب ہی ایک نوجوان جو کہ اس آدمی کا ہمشکل تھا بیٹھا تھا اور بہت پُرشوق نظروں سے میری طرف دیکھ رہا تھا۔ میں جھجک کر وہیں کھڑی ہوگئی۔

''اِدھر آؤ بیٹی۔'' اس آدمی کے دوبارہ کہنے پر میں اس کے پاس صوفے پر بیٹھ گئی۔

''ماشاء اللہ! بہت پیاری بچی ہے۔'' انہوں نے میرے سر پر ہاتھ رکھ کر کہا اور ابو سے کہنے لگے۔ ''آج سے آپ کی بیٹی ہماری ہوئی۔ میں انکار نہیں سنوں گا۔''

پھر وہ مجھ سے چھوٹی چھوٹی باتیں پوچھتے رہے۔ ان کا لہجہ بہت شفیق اور مہربان تھا۔ میں بہت متاثر ہوئی اور پھر اسی دن میرا رشتہ پکا کردیا گیا۔

☆☆☆

میرے شوہر کا نام فیصل بٹ تھا اور سسر کا نام وقار بٹ۔ وقار انکل فوج سے ریٹائرڈ تھے۔ شاید اسی لیے چاق وچوبند اور اسمارٹ لگتے تھے۔ وہ فیصل کے والد نہیں بڑے بھائی لگتے تھے۔ رشتہ ہونے کے چھ ماہ بعد میری شادی ہوگئی۔ میرے والدین نے اپنی حیثیت کے مطابق مجھے بہترین جہیز دیا حالانکہ وقار انکل ساتھ ساتھ منع کرتے رہے تھے۔ شادی بھی دھوم دھام سے ہوئی اور میں اپنے والدین کے گھر سے رخصت ہوکر سسرال آگئی۔ میرا استقبال بہت شان سے ہوا۔ ولیمہ بھی نہایت شاندار تھا اور ایک مشہور ہوٹل میں تھا۔

ولیمے کے اگلے ہی دن ہم ہنی مون کے لیے نکل گئے۔ مری، سوات، کاغان ہر جگہ فیصل کے ساتھ اور حسین ہوگئی تھی۔ فیصل بے حد محبت کرنے والے اور کیئرنگ شوہر تھے۔ وہ تو میرے دیوانے ہوگئے تھے۔ میں بھی خوبصورت تھی مگر فیصل کی محبت نے مجھے اور حسین بنادیا تھا۔ انہوں نے ڈھیروں شاپنگ کروائی۔ کسی نازک چیز کی طرح وہ مجھے سنبھالتے تھے۔ میں تو اپنی قسمت پر رشک کرتی تھی۔ پندرہ دن کے بعد ہم واپس آئے۔ ہم لوگ رات کو گھر پہنچے تھے۔ انکل سے مل کر ہم سوگئے۔ صبح انکل نے بیڈروم کے دروازے پر دستک دے کر ہمیں اٹھایا۔

میں جلدی سے اٹھی۔ غسل وغیرہ سے فارغ ہوکر باہر آئی تو سامنے ڈرائنگ ٹیبل پر ناشتا سجائے وہ ہمارے منتظر تھے۔ میں دل ہی دل میں شرمندہ ہوگئی۔ وہ بے چارے ہمارے لیے کتنی تکلیف اٹھا رہے تھے۔

''ایم سوری انکل! آج اٹھنے میں دیر ہوگئی۔ کل سے آپ کو ناشتا وقت پر ملے گا۔'' میں نے کہا۔

''نہیں بیٹی! ابھی تم نئی نویلی دلہن ہو۔ خوب گھومو پھرو، دعوتیں اڑاؤ، بعد میں سب کچھ تم نے ہی تو دیکھنا ہے۔'' انہوں نے شفقت سے کہا۔ فیصل بھی آگئے تو ہم تینوں نے ناشتا کیا۔

''بیٹی، اب تم اپنے والدین اور بہن بھائیوں سے مل آؤ۔ وہ اداس ہورہے ہوں گے۔ اور کچھ تحائف بھی لائی ہو ان کے لیے یا اس کنجوس نے تمہیں شاپنگ ہی نہیں کرائی۔'' وہ مسکرا کر فیصل کو دیکھ رہے تھے۔

''ابوجی! آپ کی بہو نے تو میری خوب جیب خالی کرائی ہے۔'' فیصل نے جواب دیا۔

امی ابو اور گھر والوں سے مل کر میں لوٹ آئی۔ اگلے چند دن دعوتوں میں گزرے اور اس طرح ایک ماہ گزر گیا۔ فیصل کی چھٹی ختم ہوگئی اور میں نے گھر سنبھال لیا۔ فیصل نے آفس جانا شروع کردیا۔

وقار انکل اپنی ڈائٹ اور صحت کا بہت خیال رکھتے تھے۔ ہمارے اٹھنے سے پہلے وہ واک کرکے آچکے ہوتے اور اپنے لیے جوس نکال کر پی لیتے تھے۔ اس کے بعد وہ دوبارہ اپنے کمرے میں چلے جاتے۔ میں فیصل اور اپنے لیے ناشتا بناتی۔ انہیں تیاری میں مدد دیتی۔ وہ چلے جاتے تو وقار انکل کمرے سے باہر آجاتے۔ میں ان کے لیے ناشتا بناتی اور وہ ناشتا کرتے، میں صرف ان کے ساتھ چائے پیتی تھی۔ کچھ دیر ہم دونوں باتیں کرتے۔ اخبار پڑھتے پھر وہ ٹی وی کے سامنے بیٹھ جاتے۔ میں صفائی کرتی۔ برتن وغیرہ دھو کر دوپہر کے کھانے کی تیاری کرتی۔ وہ بھی میرا ہاتھ بٹاتے تھے۔ وہ باتیں بہت اچھی کرتے تھے۔ ان کی معلومات حیرت انگیز تھیں۔ ہر موضوع پر انہیں عبور حاصل تھا۔

دوپہر کو چونکہ ہم دونوں ہی ہوتے تھے۔ اس لیے ہلکا پھلکا کھانا کھاتے تھے اور رات کو کھانے پر اہتمام ہوتا تھا۔ دوپہر کے کھانے کے بعد میں اپنے کمرے میں آکر سوجاتی یا کچھ نہ کچھ کام کرتی رہتی۔ فیصل کے آنے سے پہلے ہلکا پھلکا تیار ہوتی اور باہر آجاتی۔ انکل بھی اپنے کمرے سے آجاتے۔ شام کی چائے ہم تینوں ساتھ پی کر انکل دوستوں سے ملنے ملانے اور واک کے لیے نکل جاتے۔ ہمارا کوئی پروگرام ہوتا تو باہر چلے جاتے ورنہ فیصل سے باتیں کرتے کرتے میں کھانا بنالیتی۔

رات کا کھانا نو بجے ہم تینوں ساتھ کھاتے۔ میں اور فیصل چہل قدمی کے لیے باہر چلے جاتے اور کچھ دیر بعد گھر آکر اپنے بیڈروم میں سونے کے لیے چلے جاتے۔ چھٹی والا دن میں اور فیصل ایک ساتھ باہر گھومنے، امی کی طرف جانے یا پھر کھانا باہر کھانے میں گزارتے تھے۔ میری زندگی بہت خوبصورت تھی۔ میں رشک کرتی تھی اپنی قسمت پر۔ قدر دان شوہر، شفقت اور محبت لٹانے والا سسر۔ کوئی مالی تنگی نہیں، میں اپنے گھر کی مالک تھی۔ کسی ملکہ کی طرح خوش باش، جس کی ہر بات پر دوسرے سر تسلیم خم کرتے ہوں۔ میرے ماں باپ شکر کرتے تھے کہ ان کی بیٹی اپنے گھر میں اتنی سکھی تھی۔

☆☆☆

میری شادی کو ایک سال ہونے والا تھا۔ وقار انکل نے پہلے ہی کہہ دیا تھا کہ وہ شادی کی سالگرہ دھوم دھام سے منائیں گے۔ ابھی تک مجھے ماں بننے کی خوش خبری نہیں ملی تھی۔ ہمیں اس بات کا کوئی احساس بھی نہیں تھا۔ فیصل تو کہتے تھے کچھ عرصہ گھوم پھر لیں۔ زندگی کو انجوائے کرلیں اور ایک دوسرے کا ساتھ بھرپور طریقے سے محسوس کرلیں تب بچے کے بارے میں سوچیں گے۔ مجھے بھی کوئی فکر نہیں تھی۔

زندگی سکون سے رواں دواں تھی۔ فیصل اپنے والد کے معاملے میں بہت حساس تھے۔ ان کا کہنا تھا کہ ابو نے امی کی وفات کے بعد صرف میری پرورش کی خاطر دوسری شادی نہیں کی۔ حالانکہ ابھی تک عورتیں ان سے شادی کے لیے دلچسپی رکھتی تھیں اس لیے انہیں احساس نہ ہوا مگر میری شادی کے بعد وہ تنہا ہوگئے ہیں۔ میں خود بھی انکل کا بہت خیال رکھتی تھی۔ ایک بیٹی کی طرح ان کا خیال کرتی۔ ان کی خوراک کا، لباس کا دھیان رکھتی۔

گھر کے کام سے فارغ ہوکر اکثر ٹی وی دیکھتے تھے۔ کوئی نہ کوئی فلم روزانہ ہم دونوں دیکھتے اس پر تبصرہ کرتے۔ ساتھ ساتھ میں کوئی نہ کوئی کام کرتی رہتی۔ وہ بھی میری مدد کرنے کی کوشش کرتے تھے اور مجھے ڈھیروں دعائیں دیتے تھے۔

جب بھی میں میکے سے آتی، میرا ماتھا چوم کر استقبال کرتے، ان کی تنہائی کے خیال سے میں رات نہ رکتی۔ غرضیکہ میں اپنے فرائض پوری طرح انجام دے رہی تھی کہ ہماری شادی کی سالگرہ کا دن آگیا۔

انکل نے بڑے پیمانے پر پارٹی کا انتظام کر رکھا تھا۔ میرے گھر والے بھی شامل تھے۔ میں اپنے کمرے میں تیار ہورہی تھی۔ فیصل نے شادی کی سالگرہ پر مجھے سبز اور سرخ رنگ کی انڈین ساڑی لاکر دی تھی جس کے ساتھ گولڈ کا خوبصورت سیٹ بھی تھا۔ ان کا کہنا تھا کہ مجھے دلہن لگنا چاہیے۔ اس لیے کہ آج تجدید شادی کی رات ہے۔

میں نے ساڑی استری کرکے بیڈ پر پھیلائی اور بلاؤز اور پیٹی کوٹ پہن کر میک اپ کرنے لگی۔ میرا ارادہ تھا کہ میک اپ اور ہیئر اسٹائل بنا کر ساڑی پہن لوں گی ابھی بال تھوڑے سے گیلے تھے۔ میں ڈریسنگ ٹیبل کے سامنے کھڑی تھی اور چہرے پر کریم لگا رہی تھی۔

''بیٹی فیصل کہاں ہے۔'' مجھے انکل کی آواز سنائی دی اس سے پہلے کہ میں کچھ بولتی وہ بیڈروم کا دروازہ کھول کر اندر آگئے۔ میں ایک دم مڑی، وہ مجھے اس حالت میں دیکھ کر شرمندہ ہوگئے اور تیزی سے باہر نکل گئے۔ میں خود بھی شرمسار کھڑی تھی۔ چند لمحے میں اسی احساس میں گھری رہی کہ فیصل آگئے۔ مہمان آنا شروع ہوگئے تھے۔ تھوڑی دیر بعد میں سب بھول کر تیار ہوگئی۔ پارٹی بے حد شاندار تھی۔ انکل نے ہم دونوں کو پچاس ہزار کا چیک دیا تھا کہ ہم اپنی مرضی کا گفٹ خرید لیں۔

سب مہمان ہم دونوں کی جوڑی پر رشک کررہے تھے۔ اگلی صبح چھٹی تھی۔ ہم دونوں بہت رات تک جاگتے رہے تھے۔ اس لیے صبح دیر تک سوئے۔ میری آنکھ کھلی تو گیارہ بج رہے تھے۔ میں اٹھ کر باہر چلی آئی۔ فیصل ابھی سو رہے تھے۔

وقار انکل ڈائننگ ٹیبل پر بیٹھے تھے۔ سامنے ناشتا پڑا

تھا مگر وہ کسی گہری سوچ میں گم تھے۔
"السلام علیکم انکل!" میں نے سلام کیا تو وہ چونک پڑے۔
"آؤ بیٹی' میں نے تمہارا انتظار کیے بغیر ناشتا شروع کرلیا۔ میں نے سوچا تم دونوں لیٹ اٹھو گے۔" انہوں نے مسکرا کر کہا۔
"کوئی بات نہیں۔" میں نے ہنس کر جواب دیا۔
"آپ کی چائے ٹھنڈی ہورہی ہے میں آپ کے لیے تازہ چائے لاتی ہوں۔" میں اپنے اور انکل کے لیے چائے لائی اور وہیں بیٹھ کر چائے پینے لگی۔
حسب معمول اِدھر اُدھر کی باتیں ہونے لگیں میں نے محسوس کیا کہ وہ کچھ خاموش سے تھے۔ شاید کل کی پارٹی میں تھک گئے ہیں میں نے سوچا۔ ناشتے کے بعد وہ باہر چلے گئے۔ فیصل اٹھے تو ہم دونوں نے ساتھ ناشتا کیا۔ پھر تحائف کھول کھول کر دیکھنے لگے۔ سب لوگوں نے بہت خوبصورت تحائف دیئے تھے۔ میں بہت خوش تھی۔
چند دن اور گزر گئے، میں محسوس کررہی تھی کہ انکل چپ رہنے لگے ہیں۔ نہ تو میرے ساتھ بیٹھ کر ٹی وی دیکھتے نہ پہلے جیسی بے تکلفی سے باتیں کرتے۔ میں نے فیصل سے ذکر کیا۔ انہوں نے انکل سے روٹین چیک اپ کے لیے اصرار کیا جو وہ کروا آئے۔ ڈاکٹر کے مطابق سب کچھ نارمل تھا پھر وہ خود بخود ٹھیک ہوگئے مگر ایک بات میں نے اکثر نوٹ کی کہ جب بھی اچانک کوئی کام کرتے کرتے میں ان کی طرف متوجہ ہوتی تو وہ بڑے غور سے میری طرف دیکھ رہے ہوتے تھے۔ ان کی نظروں میں عجیب سی چمک ہوتی تھی۔
میں گھر میں کام کاج کرتے ہوئے اور باورچی خانے میں بہت کم دوپٹا لیتی تھی، اگر لیا بھی ہوتا تو بے پروائی سے کندھے پر پڑا رہتا تھا۔ ایک دوپہر میں فرش دھو رہی تھی۔ کافی دنوں سے سوچ رہی تھی کہ گھر کی مکمل صفائی کرلوں۔ آج شروع کی اور جب کمروں کے فرش دھو رہی تھی تو مجھے لگا جیسے کوئی مجھے گھور رہا ہے۔ انکل اپنے کمرے میں تھے۔ میں نے اپنا وہم سمجھا اور تیزی سے فرش دھونے لگی۔ میرے سارے کپڑے گیلے ہوکر جسم سے چپٹ گئے تھے۔ لان کا سوٹ پانی پانی ہورہا تھا۔ آہٹ پر میں ایک دم سیدھی ہوئی تو دیکھا کہ انکل اپنے کمرے کے دروازے پر کھڑے تھے اور ان کی نظریں میرے وجود پر تھیں۔ مجھے متوجہ دیکھ کر تیزی سے کمرے میں چلے گئے۔ پہلی بار عجیب سے خوف کی ایک لہر میرے سارے وجود میں دوڑ گئی۔ میرا وہم میرا وہ خیال جسے میں سوچنا نہیں چاہتی تھی وہ ٹھیک ہی تھا۔ انکل تبدیل ہوچکے تھے۔ ان کی نظریں ایک باپ کی نظریں نہیں رہی تھیں۔
میں تو جیسے مرنے والی ہوگئی۔ یا خدا! میں کیا کروں۔ میں سوچتی رہی۔ پھر جلدی سے کام ختم کیا اور اپنے کمرے میں آگئی۔ اس دوپہر میں نے کھانا نہیں بنایا۔ اپنے بیڈ پر بیٹھی سوچتی رہی۔ پتا نہیں کتنا وقت گزر گیا۔ اچانک انکل اندر چلے آئے "تمہاری طبیعت ٹھیک ہے نا۔ آج کھانا نہیں بنایا۔" وہ بے تکلفی سے میرے قریب بیٹھ گئے۔ میں نے قریب پڑا دوپٹا اٹھا کر کندھوں پر ڈال لیا۔
"بس طبیعت سست سی ہے۔ اس لیے کھانا نہ بنا سکی۔" میں اٹھنے لگی۔
"ارے بخار تو نہیں ہے۔" وہ میرا ہاتھ پکڑ کر بولے۔ مجھے لگا جیسے کسی انگارے نے چھولیا ہوا۔
"میں ٹھیک ہوں۔ آئیں میں کھانا بناتی ہوں۔" میں ہاتھ چھڑا کر باہر آگئی اور باورچی خانے میں جاکر پانی پینے لگی، میرا دل کانپ رہا تھا۔
"کھانا رہنے دو میں باہر سے کچھ کھالوں گا۔" انکل کی آواز آئی اور وہ گھر سے باہر چلے گئے۔ میں وہیں بیٹھ کر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ میری خوشیوں بھری زندگی کو کسی حاسد کی نظر لگ گئی تھی۔
رات کو فیصل آئے تو میں نے امی کے گھر جانے کی ضد کی۔ وہ میری پریشان شکل دیکھ کر کچھ بھی کہے بغیر مجھے امی کی طرف چھوڑ گئے۔ چار دن میں وہاں رہی۔ فیصل کا فون آتا، آجاؤ، میں اداس ہوں۔ ابو بھی بہت مس کررہے ہیں۔ میں انہیں کیا بتاتی، میں تو اپنی ماں کو بھی نہ بتا سکی۔ کون یقین کرے گا میری اس بات پر۔ کیا فیصل اپنے باپ کے خلاف کوئی بات سنے گا؟ کیا لوگ یقین کریں گے میرے گھر والے تو انکل کی محبت کو میری خوش نصیبی سمجھتے تھے۔ ان سے کیا کہتی، اس خوف نے میری بھوک پیاس اڑا دی۔
پانچویں دن فیصل خود مجھے لینے آگئے۔ امی کا کہنا تھا کہ زیادہ دیر شوہر کو اکیلا نہیں چھوڑتے۔ میں سہمی ہوئی واپس آئی۔ دروازہ انکل نے کھولا۔ فیصل گاڑی کھڑی کرنے لگے۔ میں گاڑی سے نکل کر اندر کی طرف بڑھی۔
"ارے میری بیٹی اتنے دن بعد آئی ہے ہم تو اداس

ہوگئے تھے۔'' انکل نے آگے بڑھ کر مجھے تھام لیا۔ فیصل گاڑی کھڑی کرکے وہیں آگئے اور مسکراتی نظروں سے ہمیں دیکھنے لگے۔ انکل نے دونوں بازوؤں میں مجھے تھام کر سینے سے لگالیا اور میرا چہرہ ہاتھوں میں لے کر ماتھا چومنے لگے۔ پہلے بھی وہ میری پیشانی پر پیار کیا کرتے تھے مگر اس پیار میں ہوس نہیں تھی۔

فیصل اندر چلے گئے۔ میں نے اپنا آپ چھڑانے کی کوشش کی۔ میرے وجود میں آگ بھڑک اٹھی۔ میں تیزی سے اپنا آپ چھڑا کر اپنے کمرے میں آگئی۔ فیصل کپڑے تبدیل کرنے لگے تھے۔ ان کے سینے سے لگ کر میں پھوٹ پھوٹ کر رو دی۔ ''جب اتنی اداس تھیں تو بتایا کیوں نہیں، میں لینے آجاتا۔'' فیصل نے کہا اور مجھے چپ کرانے لگے۔

میری زندگی اجیرن ہوکر رہ گئی تھی۔ انکل کو جب اس بات کا احساس ہوگیا کہ میں ان کی نیت بھانپ گئی ہوں تو وہ کھل کر سامنے آگئے۔ میں نے ان کے ساتھ ناشتا کرنا چھوڑ دیا تھا۔ اب میں فیصل کے ساتھ ہی ناشتا کرلیتی اور اپنے کمرے میں آجاتی اور ان کا ناشتا بنا کر ٹیبل پر رکھ دیتی۔ وہ باہر چلے جاتے تو گھر کا کام جلدی جلدی کرکے کھانا بنالیتی۔ اب میں نے گھر میں کام کاج کرتے ہوئے بھی دوپٹا پھیلا کر لینا شروع کردیا تھا اور ان کے ساتھ بیٹھ کر کیبل بھی نہ دیکھتی۔ کھانا بنا کر اپنا کھانا لے کر بیڈروم میں آجاتی۔ اب وہ میرے گریز کو سمجھ گئے تھے اس لیے ذو معنی جملے بولنے لگے تھے۔ میں دوپہر کو بھی اپنا بیڈروم اندر سے لاک کرلیتی تھی۔

رات کو کھانا تینوں ساتھ کھاتے تھے۔ فیصل کے سامنے وہ میرے بہت ناز اٹھاتے۔ فیصل خوش ہوتا کہ بہو اور سسر میں اتنی محبت ہے مگر میں اندر ہی اندر کڑھتی رہتی۔ میں نفسیاتی مریض بنتی جارہی تھی۔

اس رات مجھے بخار ہوگیا۔ سردیوں کے دن تھے۔ فیصل نے مجھے صبح اٹھنے سے منع کردیا اور خود ہی ناشتا بنا کر کرلیا۔ مجھے پراٹھا موا دے کر دفتر چلے گئے۔ مجھے بخار میں غنودگی طاری تھی کہ اچانک مجھے اپنے چہرے پر کسی کے ہاتھ کا لمس محسوس ہوا۔ میں نے آنکھیں کھولیں تو انکل مجھ پر جھکے ہوئے تھے۔ میں تڑپ کر اٹھ بیٹھی۔

''طبیعت خراب ہے تمہاری۔'' وہ ہمدردی سے بولے۔ ''فیصل مجھے کہہ گیا تھا کہ میں تمہیں ڈاکٹر کے پاس لے جاؤں۔''

''میں ٹھیک ہوں۔'' یہ کہہ کر میں واش روم میں چلی گئی۔ بہت دیر تک وہیں بیٹھی رہی۔ پھر ڈرتے ڈرتے دروازہ کھول کر باہر دیکھا تو وہ کمرے میں نہیں تھے۔ میں نے بھاگ کر دروازہ اندر سے لاک کرلیا۔ دوپہر تک بند کمرے میں بیٹھی رہی۔ شاید انکل نے ہی فیصل کو فون کرکے بلایا تھا۔ وہ گھبرائے ہوئے آئے اور مجھے ڈاکٹر کے پاس لے گئے۔

اگلے دو دن فیصل گھر پر رہے۔ میرا بخار ٹھیک تھا۔ کمزوری بہت ہوگئی تھی۔ فیصل میرا بہت خیال رکھ رہے تھے مگر ذہنی پریشانی اور خوف نے میری ساری رنگت خراب کردی تھی۔

تیسرے دن فیصل آفس گئے تو چند گھنٹوں کے بعد واپس آگئے۔ کہنے لگے مجھے کمپنی کے ایک کام کے سلسلے میں فورا فیصل آباد جانا ہے۔ کل شام تک آجاؤں گا۔ میں پریشان ہوگئی۔ میں نے فیصل سے کہا۔ ''مجھے امی کی طرف چھوڑ دیں۔''

''ابو کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔ انہیں اکیلے چھوڑنا اچھا نہیں لگے گا ان کا بی پی بہت ہائی ہوگیا ہے۔ بتارہے تھے رات جاگتے رہے ہیں۔ میں بھی یہاں نہیں ہوں گا اور تم بھی چلی جاؤ گی تو وہ کیا سوچیں گے۔''

میں خاموش ہوگئی۔ فیصل کا بریف کیس تیار کیا۔ وقار انکل کو جب فیصل نے اپنے جانے کا بتایا ہوگا تو وہ سمجھ گئے تھے کہ میں ضرور میکے چلی جاؤں گی۔ اسی لیے بیمار ہونے کا بہانہ کردیا۔ ''یا خدا میری مدد فرمانا۔'' میں نے دعا مانگی۔

فیصل کے جانے کے بعد میں نے کھانا بنایا۔ انکل کے لیے کھچڑی پکائی۔ وہ کمرے میں لیٹے رہے تھے۔ باہر نہیں آئے تھے۔ میں نے ٹرے میں کھانا رکھ کر ان کے کمرے میں دے دیا۔ انہوں نے خاموشی سے کھانا کھالیا۔ پھر ڈاکٹر کے پاس جانے کا کہہ کر باہر چلے گئے۔

آج ان کا رویہ بہت سنجیدہ تھا۔ شاید غلطی کا احساس ہوگیا تھا۔ بہر حال میں نے رات کا کھانا جلدی کھالیا۔ انکل نے دوا کھائی اور کمرے میں چلے گئے۔ جاتے ہوئے کہہ گئے کہ میں آرام کروں گا۔ کوئی کام ہو تو بتا دینا۔ اب تم بھی آرام کرو۔ ان کا لہجہ پہلے جیسا مشفق تھا۔ میرے دل کو ذرا سی ڈھارس بندھی۔ شاید خدا کو میری بے بسی پر رحم آگیا ہے۔

☆☆☆

میں اپنے بیڈروم میں کافی دیر ٹی وی دیکھتی رہی۔ نیند نہیں آرہی تھی۔ کمرا میں نے اندر سے لاک کر رکھا تھا۔ رات ... بجے کا ٹائم تھا جب دروازے پر زور سے دستک ہوئی۔ میرا دل اچھل کر حلق میں آگیا۔ میں نے درواہ نہیں کھولا۔

''دروازہ کھولو سدرا میں ہوں وقار۔'' انکل کی آواز سنائی دی۔ میں تھر تھر کانپنے لگی۔ یا خدا میری حفاظت کرنا۔ اس شیطان سے بچانا۔ میں رونے لگی۔

''خدا کے لیے دروازہ کھولو۔ میری طبیعت بہت خراب ہے۔'' اس بار انہوں نے التجا کی، لہجے میں بھی شدید درد تھا۔ ''میرا بلڈ پریشر بہت بڑھ گیا ہے دروازہ کھولو!'' میں مشکل میں پڑگئی۔ کہیں واقعی طبیعت خراب نہ ہوگئی ہو۔ میں نے سوچا۔ مجھے دیکھنا چاہیے۔ اگر کچھ ہوگیا تو فیصل کو کیا جواب دوں گی۔ مگر نہیں۔ یہ بہروپیا ہے ڈراما کررہا ہے صرف دروازہ کھلوانے کے لیے۔ میرے دماغ نے کہا۔ میں دروازہ کھولتے کھولتے رہ گئی۔

پھر زور زور سے دروازہ بجا۔ ''مجھے ہارٹ اٹیک ہورہا ہے سدرا بیٹی، خدا کے لیے...'' ایک دردبھری کراہ سنائی دی۔ میں نے تیزی سے اٹھ کر دروازہ کھولا۔ وہ سامنے کھڑے تھے۔

''کیا ہوا انکل۔'' میں نے ان کے قریب جاکر پوچھا۔ ''میں ڈاکٹر کو بلاؤں۔''

انہوں نے ایک دم مجھے پکڑلیا۔

میں نے انہیں زور سے دھکا دے دیا۔ وہ کسی کھلونے کی طرح لڑھکتے ہوئے سیڑھیوں سے نیچے چلے گئے۔ میں ششدر سی کھڑی تھی۔ پھر مجھے ہوش آیا کہ یہ میں نے کیا کردیا۔ میں تیزی سے نیچے اتری۔ نیچے جاکر دیکھا کہ وہ اپنے ہی خون میں لت پت پڑے تھے۔ آسمان ہلا دینے والی چیخیں میرے منہ سے نکلیں۔ پتا نہیں میں کب تک چیختی رہی۔ آس پاس کے گھروں کے دروازے کھڑکیاں کھلنے لگیں اور پھر میں بے ہوش ہوگئی۔

مجھے ہوش آیا تو ان کا جنازہ تیار تھا۔ فیصل اور میرے گھر والے آچکے تھے۔ پتا نہیں کس نے فیصل کو اطلاع کی تھی۔ فیصل سے لپٹ کر میں دھاڑیں مار مار کر رونے لگی۔ وہ اپنا غم بھول کر مجھے سنبھالنے لگ گئے۔ پھر مجھے ہوش نہ رہا۔ اگلے دن میں ہوش میں آئی تو انکل کو ان کی آخری آرام گاہ تک پہنچا دیا گیا تھا۔ فیصل کا صدمے سے برا حال تھا۔ اکلوتے بیٹے تھے، ماں کے بعد انکل ہی ان کا دنیا میں واحد اپنا رشتہ تھا۔ وہ تو جیسے پاگل ہوگئے تھے۔ میں ہاسپٹل میں تھی۔ ڈاکٹروں کے مطابق میری ذہنی حالت ٹھیک نہیں تھی۔ شدید صدمے نے میرے دماغ کو متاثر کیا تھا۔ میں بالکل خاموش ہوگئی تھی۔ امی مجھے اپنے گھر لے آئی تھیں فیصل بھی میرے ساتھ تھے۔ چند دن بعد میری حالت سنبھلنے لگی تو پتا چلا کہ جب میں چیخ رہی تھی تو اردگرد کے لوگوں نے آوازیں سنیں اور دروازہ کھٹکھٹایا۔ مجھے ہوش نہیں تھا۔ دیوار پھلانگ کر دو نوجوانوں نے اندر سے دروازہ کھولا اور انکل کی لاش دیکھ کر فیصل کو فون کیا۔ انہوں نے آکر میرے گھر والوں کو بلایا تھا۔ میں ساری بات سن کر چپ رہی۔

انکل کی موت کو ایک ماہ ہوچلا تھا۔ میں ابھی تک امی کے گھر میں ہی تھی۔ مجھے اپنے گھر سے خوف آتا تھا۔ ایک دن طبیعت خراب ہونے پر امی مجھے قریبی کلینک لے گئیں تو پتا چلا کہ میں ماں بننے والی ہوں۔ اس خوش خبری نے جیسے ماحول کو ایک دم تبدیل کردیا۔ میں اور فیصل بہت خوش تھے۔ میں اپنے گھر چلی آئی۔ فیصل کو اکیلے رہنے میں پریشانی ہورہی تھی۔

دن گزرتے رہے مگر میں اب بھی خوش نہیں تھی۔ ایک شخص کو قتل کرنے کا احساس میرے دل و دماغ پر حاوی رہنے لگا۔ کیونکہ میری سہیلی نورین جو ڈاکٹر ہے اس نے بتایا کہ جب دل کا دورہ پڑتا ہے تو انسان جس شے کو پکڑتا ہے تو بہت مضبوطی سے جکڑلیتا ہے۔ گویا میں نے مغالطے میں انکل کو سیڑھیوں سے دھکا دیا تھا۔ یہ صرف میں جانتی تھی۔ میں قاتل تھی۔ مجھے ہر جگہ انکل نظر آتے تھے۔

چھ ماہ گزر گئے۔ فیصل پریشان تھے کہ میری صحت گرتی جارہی ہے۔ ڈاکٹر میری بیماری سمجھنے سے قاصر تھے۔ فیصل کی محبت دیکھتی تو پچھتاوا ہوتا کہ ان کے باپ کو جدا کرنے کا سبب بنی تھی۔

ایک دن امی کی طرف آئی ہوئی تھی۔ دوپہر کو لیٹی تھی کہ قریب پڑا ایک میگزین اٹھا کر دیکھنے لگی۔ میری بہن کو رسالے پڑھنے کا شوق تھا۔ پڑھتے ہوئے اچانک میری نظر ایک ”روحانی مشورے“ کے کالم پر پڑی۔ جہاں ایک شفیق بزرگ کی تصویر تھی جو روحانی طریقے سے مختلف بیماریوں اور مسائل کو حل کرتے تھے۔ حل بتایا کرتے تھے میں نے چند لمحے سوچا پھر رسالے سے ٹیلی فون نمبر لے کر فون کیا۔ ان بزرگ نے فون ریسیو کیا۔ میں نے ان سے کہا کہ میں ان سے ملنا چاہتی ہوں اور ایک بے حد ضروری مسئلے پر بات کرنا چاہتی ہوں۔ انہوں نے مجھے رسالے کے آفس میں آنے کی دعوت دی۔ میں نے اگلے دن دوپہر کا وقت طے کرلیا۔

اگلے دن میں امی سے ضروری شاپنگ کا کہہ کر رسالے کے آفس چلی آئی۔ چپراسی نے مجھے ان کے کمرے میں پہنچادیا۔ میں نے اپنا سارا جسم اور چہرہ آنکھیں چھوڑ کر بڑی سی چادر میں چھپایا ہوا تھا۔

مجھے دیکھ کر وہ کھڑے ہوگئے۔ مجھے سامنے پڑی کرسی پر بیٹھنے کو کہا۔ وہ بہت ہی شفیق اور نورانی صورت والے باریش بزرگ تھے۔

”جی فرمایئے بیٹی، آپ کیا کہنا چاہتی ہیں۔“ انہوں نے بڑے نرم لہجے میں پوچھا۔ میں نے ہمت جمع کی اور انہیں سارا واقعہ شروع سے سنادیا۔ وہ خاموشی سے نظریں نیچی کیے سنتے رہے۔ ساری بات ختم ہونے کے بعد میں جیسے تھک سی گئی۔ انہوں نے پانی کا گلاس میرے سامنے رکھا، میں پانی پینے لگی۔ جب کچھ دیر بعد میں ریلیکس ہوگئی تو وہ بولے۔

”بیٹی! میں نے تمہارا کہا ہوا ایک ایک لفظ بہت غور سے سنا ہے۔ اس سارے واقعے میں قصور صرف تمہارا نہیں ہے، اور بھی لوگ قصوروار ہیں۔ سب سے پہلی بات یہ کہ اسلام نے جو پابندیاں یا حدود ہم پر لاگو کی ہیں، جب ہم ان سے روگردانی کرتے ہیں تو مشکلات میں پھنستے چلے جاتے ہیں۔ تم ایک مسلمان گھرانے میں پیدا ہوئیں مگر تمہارے والدین نے تمہیں یہ تربیت نہیں دی کہ بزرگوں کے سامنے کس طرح رہنا چاہیے۔ اسلام میں دیور، جیٹھ، سسر کو نامحرم رشتوں میں رکھا گیا ہے۔ تمہاری ساس اور نند بھی نہیں تھیں اور تم بے تکلفانہ سسر سے باتیں بھی کرتی تھیں اور بے پردہ بلکہ دوپٹے کے بغیر ان کے آس پاس پھرتی رہتی تھیں۔ شیطان تو انسان کو بہکانے کے بہانے ڈھونڈتا ہے۔

تم ان کے ساتھ بیٹھ کر فلمیں بھی دیکھتی تھیں۔ ہنسی مذاق بھی کرتی تھیں۔ وہ تنہا زندگی گزار رہے تھے۔ عورت کے بغیر رہ رہے تھے۔ تم نے ان کے جذبات کو بھڑکانے کا کام کیا۔ بے شک دانستہ نہیں مگر نادانستہ تم ان کے اندر شیطان جگانے کا باعث بنی تھیں۔

قصوروار تمہارا شوہر بھی ہے، جس نے تمہیں نہیں سمجھایا کہ اس کے والد کے ساتھ کس انداز میں پیش آنا چاہیے۔ اس روز تم اگر بیڈروم کا دروازہ بند کرکے تیار ہورہی ہوتیں تو شاید یہ سارا واقعہ پیش ہی نہ آتا۔

بیٹی، ہم مسلمان ہیں، مجھے یاد ہے کہ میری والدہ میرے دادا جان سے باقاعدہ پردہ کیا کرتی تھیں اور جب وہ بالکل بینائی سے محروم ہوگئے تو تب بھی انہوں نے پردہ نہیں چھوڑا۔

بیٹی ماڈرن بننے کے چکر میں ہم شیطان سے قریب ہوتے جارہے ہیں۔ قصور تمہارے سسر کا بھی ہے جنہوں نے بیٹی کی طرح نہیں سمجھا تمہیں۔ ورنہ وہ پہلے دن کہہ دیتے کہ بیٹی سر ڈھانپا کرو۔ اور پھر خود بھی مناسب فاصلہ رکھتے۔ بے تکلفی سے گریز کرتے۔ ایک بزرگ کی حیثیت سے رہتے تو یہ سب نہ ہوتا۔

جاؤ بیٹی، سجدے میں گر کر اپنے گناہوں کی معافی مانگو اور اپنے لیے سکونِ دل کی دعا کرو۔ وہ معاف کرنے والا مہربان ہے مگر ایک بات یاد رکھنا اپنی آنے والی نسل کو اسلامی اقدار کے مطابق زندگی بسر کرنا سکھانا اسی میں بھلائی ہے۔ اس بات کا ذکر کبھی بھی کسی سے نہ کرنا۔“

میں نے ان بزرگ کا بہت شکریہ ادا کیا اور گھر لوٹ آئی۔

اس کے بعد میں نے چادر کو اپنے جسم سے الگ نہیں ہونے دیا۔ بلکہ گھر سے باہر جاتے ہوئے پردہ کرنے لگی۔ رو رو کر سجدوں میں خدا سے معافی اور سکونِ قلب مانگتی رہی۔ خدا نے مجھے بیٹے سے نوازا اور میرا دل ٹھہرنے لگا۔ بیٹے کے بعد بیٹی آئی میں نے اپنے بچوں کو دینی تعلیم اور اقدار کے سانچے میں ڈھالا۔

اس واقعے کو تیس سال کا عرصہ گزر چکا ہے۔ دو سال پہلے فیصل مجھے چھوڑ کر چلے گئے۔ اور تب میں نے فیصلہ کیا کہ اپنی کہانی لوگوں کے سامنے لاؤں گی کہ شاید اسے پڑھ کر کوئی اس حادثے سے بچ جائے اور اپنی غلطی کی پہچان کرلیں۔ وگرنہ بہت دیر ہوجاتی ہے اور ہمیں حادثے کے بعد عبرت حاصل ہوتی ہے۔ کاش پہلے ہم سمجھ جائیں!

ناکام ڈاکا

محترم مدیر

السلام علیکم!

اس بار میں ایک ایسی روداد لے کر حاضر ہوا ہوں جس کا میں گواہ تو نہیں لیکن سنا تھا۔ اسی خبر کو میں نے اپنے انداز میں لکھنے کی کوشش کی ہے۔ امید ہے قارئین کو بھی پسند آئے گی کیونکہ ذائقہ بدلنے کے لیے کبھی کبھی اپنے انداز سے ہٹ کر بھی کچھ نہ کچھ لکھنا چاہیے۔

منظر امام

(کراچی)

مجھے کالے خان پر غصہ آرہا تھا۔

کم بخت نے نہ جانے کس قسم کے ناکارہ لوگ میرے پاس لاکر جمع کردیے تھے۔

ان میں سے ایک فضل دین تھا جس کے دونوں ہاتھ کانپ رہے تھے اور اس کی بینائی بھی کمزور معلوم ہورہی تھی۔ اس کا اندازہ اس وقت ہی ہوگیا تھا جب میں نے مصافحہ کے لیے اس کی طرف ہاتھ بڑھایا اور وہ اپنا ہاتھ دوسری طرف کرکے زور زور سے ہلا ہلا کر آپ سے مل کر

بہت خوشی ہوئی بولتا رہا تھا۔

میں کالے خان کا ہاتھ تھام کر اسے ایک طرف لے آیا۔ ”بے وقوف۔ یہ تم کس کو لے آئے ہو، یہ بندہ میرے کس کام آسکتا ہے۔“

”باس۔ یہ بہت زبردست ڈرائیور ہے۔“ کالے خان نے بتایا۔ ”آندھی اور طوفان کی رفتار سے گاڑی چلاتا ہے۔“

”اور آندھی اور طوفان کی طرح گاڑی کو ٹکرا بھی دیتا ہوگا۔“ میں جل کر بولا۔

”نہیں باس۔ چالیس سال سے ڈرائیونگ کر رہا ہے۔ صرف دو حادثے کیے ہیں۔ ایک بار تین بندے مار دیے تھے۔ دوسری بار خود مرتے مرتے بچا تھا۔“

”اور تیسری بار ہمیں مار دے گا۔“

”ایسا نہیں ہوگا باس۔ اس کی میں گارنٹی لیتا ہوں۔“

”اس کی تو آنکھیں بھی کمزور معلوم ہوتی ہیں۔“ میں نے کہا۔

”صرف موتیا اترا ہوا ہے۔“ کالے خان نے بتایا۔ ”ڈاکٹروں نے آپریشن کے لیے کہا تھا لیکن صرف ہمارے مشن کے لیے اس نے آپریشن ملتوی کرا رکھا ہے۔“

”اور وہ، وہ دوسرا۔“ میں نے کالے خان کے علاقے ہی کے ایک اور آدمی کی طرف اشارہ کیا۔ ”وہ لانبا چوڑا بندہ تھا۔ وہ دیکھنے ہی سے خونخوار معلوم ہو رہا تھا۔ وہ کس مرض کی دوا ہے۔“

”اس کا نام ہلاکو ہے باس۔“ کالے خان نے بتایا۔ ”بہترین نشانہ باز، گولی تو اس طرح مار دیتا ہے جس طرح لوگ گالیاں مار دیتے ہیں۔ بس ایک کمزوری ہے کہ ذرا اونچا سنتا ہے۔“

”کتنا اونچا۔“ میں نے پریشان ہو کر پوچھا۔

”زیادہ نہیں باس۔ بس تھوڑا چیخنا پڑے گا۔“ کالے خان نے کہا۔ ”دیکھنے میں جتنا خونخوار لگتا ہے اندر سے انتہائی رحم دل ہے۔ گولیاں مار کر مرنے والے کی مغفرت کی دعائیں مانگتا رہتا ہے۔“

”اور وہ تیسرا۔“ میں نے تیسرے کے بارے میں پوچھا جس کی صورت ڈاکٹر فومانچو جیسی معلوم ہو رہی تھی۔ لمبی سی ڈاڑھی جیسے گلہری کی دم لٹک رہی ہو۔ ”یہ کس کام کا ہے۔“

”اس کا نام بالم ہے باس۔“ کالے خان نے بتایا۔ ”یہ بہت زبردست کاریگر ہے۔ تالے کھولنے میں اس کا جواب ہی نہیں ہے۔ بڑے سے بڑے تالے اور تجوریاں ایک اشارے میں کھول دیتا ہے۔ آٹھ بار جیل جا چکا ہے۔“

”واہ۔ کیسی ٹیم جمع کر دی ہے تم نے۔“

”آپ ان سے کام تو لیں باس۔“ کالے خان نے کہا۔ ”سب سے اچھی بات یہ ہے کہ یہ تینوں بہت ہی صابر اور شاکر قسم کے بندے ہیں۔ آپ ان کے حصے کے طور پر جو بھی دیں گے۔ یہ لے لیں گے۔ کوئی گند نہیں کریں گے۔“

”ان کو بتا دیا ہے نا کہ کیا کرنا ہے؟“ میں نے پوچھا۔

”ہاں باس۔ انہیں معلوم ہے کہ ہمیں بینک لوٹنا ہے۔“ کالے خان نے کہا۔

میری پلاننگ یہی تھی۔ ایک بینک لوٹنا۔ یہ بینک ہمارے فلیٹ کے کچھ ہی فاصلے پر تھا۔ اس میں لوگوں کی آمد و رفت ابھی کم ہی تھی۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ وہ ایک نئے بینک کی نئی شاخ تھی۔

اس کے دروازے پر صرف ایک چوکیدار بیٹھا رہتا۔ اس کے ہاتھ میں نہ جانے کس زمانے کی گن ہوتی تھی۔ اس کے علاوہ بینک کا عملہ بھی بہت مختصر سا تھا۔

صرف پانچ آدمی تھے۔ ان میں سے بھی دو عورتیں تھیں۔ اس عملے کو بہت آسانی سے قابو میں کیا جا سکتا تھا۔ پلاننگ یہ تھی کہ کالے خان اپنی گاڑی لے کر آئے گا۔ ہم سبھوں کے چہروں پر نقابیں ہوں گی۔

گاڑی بینک کے کچھ فاصلے پر روکی جائے گی۔ سب سے پہلے میں آگے بڑھوں گا اور اس چوکیدار سے کچھ پوچھوں گا۔ اس کے بعد ہلاکو پیچھے سے آ کر اسے قابو میں کر لے گا۔ ہم اس کو یرغمال بنا کر بینک میں داخل ہو جائیں گے۔ پھر کالے خان، ہلاکو اور بالم بھی بینک میں داخل ہو جائیں گے۔

ہم میں سے کسی کے پاس بھی اصلی اسلحہ نہیں ہوگا۔ ڈرانے کے لیے کھلونا پستولوں سے کام لیا جائے گا تا کہ کیس سیریس نہ ہو پائے۔

پھر اس کے بعد وہی سب کچھ ہونا تھا جو فلموں وغیرہ میں دکھایا جاتا ہے۔ ہم بینک لوٹ کر فضل دین کے ساتھ بیٹھ جاتے اور وہ گاڑی لے کر نکل لیتا۔

ہم سب مختلف مقامات پر اتر جاتے۔ صرف میں ایک لمبا چکر کاٹ کر اپنے فلیٹ کی طرف آتا اور رقم کے بیگ

میرے ہی پاس ہوتے۔ جنہیں میں کہیں چھپا کر رکھ دیتا۔ دو تین دنوں کے بعد سب جمع ہوتے اور رقم کی تقسیم ہو جاتی۔ لیکن اس شرط کے ساتھ کہ کم از کم دو مہینوں تک اس میں سے کوئی خرچ نہیں کرے گا۔

سیدھی سادی پلاننگ تھی۔

ہم نے منگل کا دن مقرر کیا تھا۔ ایک نجومی نے یہ بتایا تھا کہ اس قسم کے کاموں کے لیے منگل کا دن بہت مبارک ہوا کرتا ہے۔

ہم منگل کے دن ایک جگہ جمع ہو گئے۔ یہ جگہ میرے فلیٹ کے علاوہ اور کہاں ہو سکتی تھی۔ میں اس وقت خود کو باس بلکہ بگ باس ہی محسوس کر رہا تھا۔

میں نے ان سبھوں میں نقابیں تقسیم کرتے ہوئے کہا۔ ”وقت ہونے والا ہے۔ تم لوگ اپنی اپنی نقاب پہن لو۔ ہم یہاں سے پیدل ہی جائیں گے کیونکہ بینک زیادہ دور نہیں ہے۔“

”وہ تو ٹھیک ہے باس لیکن جب ہم سب نقابیں پہن کر ایک ساتھ باہر نکلیں گے تو مجمع ہمارے پیچھے پڑ جائے گا۔ بچے تک تالیاں بجاتے ہوئے نعرے لگاتے ہمارے ساتھ چل پڑیں گے۔“ کالے خان نے کہا۔

”ہاں کالے خان یہ بات تو ہے۔“ بات میری سمجھ میں آ گئی تھی۔ ”تو پھر کیا کیا جائے، نقابوں کا استعمال تو ضروری ہے، اچھے خاصے پیسے خرچ ہوئے ہیں۔“

”باس چونکہ تم نے پہلے کبھی بینک نہیں لوٹا اس لیے طریقہ نہیں معلوم۔“ تالے توڑنے والے بالم نے کہا۔ ”طریقہ یہ ہوتا ہے کہ بینک کے دروازے پر نقاب لگا لیتے ہیں۔“

”ہاں یہ بھی ٹھیک ہے۔“ میں نے گردن ہلائی۔ پھر ہلاکو کی طرف دیکھا۔ ”ہلاکو تم تیار ہو نا۔“ میں نے پوچھا۔

”نہیں باس، میں بالکل بیمار نہیں ہوں۔“ ہلاکو نے کہا۔ ”بس پرسوں تک کھانسی تھی۔ اب بالکل ٹھیک ہے۔“

”لعنت ہو، ابے میں بیمار نہیں، تیار پوچھ رہا ہوں، تیار، تیار۔“

”نہیں باس۔ اتنی بڑی مہم ہے۔ اتنا جوش ہے، پھر کس بات کی بے زاری۔ میں بالکل بھی بے زار نہیں ہوں۔“

”ابے یہ تم کس کو لے آئے ہو۔“ میں نے کالے خان کی طرف دیکھا۔ ”یہ آدمی تو میرا دماغ خراب کر دے گا۔“

”باس۔ میں نے بتایا تھا نا کہ یہ آدمی ذرا اونچا سنتا ہے۔“ کالے خان نے کہا۔

”اب اور کتنا اونچا۔ کیا میں پہاڑ پر چڑھ کر آواز دوں اس کو۔“

”فکر نہ کریں باس۔ اس کا علاج ہے میرے پاس۔“ کالے خان نے بتایا۔

”اور وہ کیا علاج ہے۔“

”بھونپو۔“

”کیسا بھونپو؟“

”ویسا ہی جیسا منجن بیچنے والے استعمال کرتے ہیں۔“ اس نے بتایا۔ ”میں نے اس کے لیے پہلے ہی سے ایک بھونپو خرید رکھا ہے۔ ہم وہ بھونپو اپنے ساتھ لے کر چلیں گے۔“

میں نے دل ہی دل میں کالے خان کو گالیاں دیتے ہوئے نقاب کی تقسیم شروع کر دی۔ پہلی نقاب کالے خان کو دی اور دوسری جب فضل دین کو دینے لگا تو اس نے ہوا میں ہاتھ چلانا شروع کر دیا۔

”اس کو کیا ہو گیا؟“ میں نے حیرت سے پوچھا۔

”کچھ نہیں باس۔ اس کا موتیا تنگ کر رہا ہوگا۔ اس لیے اس کو آپ کا ہاتھ دکھائی نہیں دے رہا ہے۔“ کالے خان نے بتایا۔

”کالے خان۔ خدا تم سے سمجھے۔ اس شخص کو میرا ہاتھ تک تو دکھائی نہیں دے رہا۔ یہ تو ہم سب کو گاڑی سمیت جہنم میں پہنچا دے گا۔“

”کچھ نہیں ہوگا باس۔ گاڑی چلاتے ہوئے اس کی ساری حسیں کام کرنے لگتی ہیں۔ اس وقت یہ دوسروں سے زیادہ ہی دیکھنے لگتا ہے۔“

مجھے اپنی اس مہم کے آثار اچھے نہیں دکھائی دے رہے تھے۔ لیکن اب کیا ہو سکتا تھا۔ اب تو پھنس ہی چکا تھا۔

”چلو۔ اب تم بالم کی خوبی بتا دو۔“ میں نے کالے خان سے پوچھا۔

”یہ تو بالکل ٹھیک ہے باس۔“ کالے خان نے کہا۔ ”دنیا بھر کے تالے منٹوں میں کھول لیتا ہے۔ بڑی بڑی تجوریاں اس کے سامنے کوئی حیثیت نہیں رکھتیں۔ بس صرف اتنا ہے کہ اس کو کاندھوں پر اٹھا کر لے چلنا ہوگا۔“

”کاندھوں پر اٹھا کر۔“ میں شاید بے ہوش ہی ہو چلا تھا۔ ”کیوں کاندھوں پر کیوں۔“

”یہ بے چارہ چل نہیں سکتا نا۔ اسی لیے۔“ کالے خان نے بتایا۔

اس بار دل چاہا کہ کم بخت اس کالے خان کا گلا ہی دبا دوں۔ ”کالے خان!“ میں نے اپنے غصے پر قابو پاتے ہوئے پوچھا۔ ”ہم بینک میں ڈاکا ڈالنے جا رہے ہیں یا معذوروں کا اسکول کھول رہے ہیں۔“

”فکر نہ کریں باس۔ اس میں سے کوئی بھی آپ کے لیے بوجھ نہیں بنے گا۔ سوائے بالم کے کیونکہ بالم کو آپ ہی کے کندھوں پر سوار ہونا ہے۔“

”کیا پاگل ہو گئے ہو؟“ اس بار میں پھٹ ہی پڑا تھا۔ ”میں اس شخص کو اپنے کاندھوں پر بیٹھا کر ڈاکا ڈالنے جاؤں گا۔“

”یہ تو مجبوری ہے باس۔ کیونکہ اس کی ناک بہت اونچی ہے۔ یہ باس سے کم کے کاندھوں پر سوار نہیں ہوتا۔“

”دیکھو کالے خان۔ ہمیں بینک لوٹنا ہے۔ کوئی سرکس کا کھیل نہیں دکھانا۔“ میں نے کہا۔ ”تم مجھے کن چکروں میں پھنسا رہے ہو۔ مجھے ایسی ٹیم نہیں چاہیے۔ لے جاؤ ان لوگوں کو۔“

”باس۔ اب تو سب کچھ ہو چکا ہے۔“ کالے خان گڑبڑا کر بولا۔ ”اب ہم پیچھے ہٹے تو ڈاکوؤں کی آنے والی نسلیں ہمارا مذاق اڑائیں گی۔“

”اور اگر ہم اسی حال میں ڈاکا ڈالنے پہنچ گئے تو موجودہ نسل مذاق اڑائے گی۔“

”ایسا کچھ نہیں ہوگا باس۔“ کالے خان نے یقین دلایا۔ ”میرا دل کہہ رہا ہے کہ ہم ضرور کامیاب ہوں گے۔“

اب میں بھی پیچھے نہیں ہٹ سکتا تھا۔ کم بخت بہت بری پوزیشن ہو گئی تھی۔ نہ جائے رفتن نہ پائے ماندن والا معاملہ تھا۔ بہرحال ہوا یہ کہ اس چکر میں بینک کھلنے کا وقت ہو گیا۔

ہماری پلاننگ کے مطابق ہمیں ٹھیک گیارہ بجے بینک میں داخل ہونا تھا۔ یعنی کھلنے کے دو گھنٹوں بعد۔ میں نے اندازہ لگایا تھا کہ اس بینک میں گیارہ سے ایک تک لوگوں کی آمد و رفت کم ہوا کرتی تھی۔ البتہ شام کے وقت تھوڑا رش ہو جاتا تھا۔

ایک بار پھر سب نے پلاننگ دہرائی۔ ہمیں کیا کرنا ہے۔ کس طرح کرنا ہے، وغیرہ وغیرہ۔ اس وقت فضل دین کی چیخ سنائی دی۔ جو کچھ دکھانے کے لیے ہمیں کھڑکی کے پاس بلا رہا تھا۔ وہ بہت دیر سے کھڑکی کے پاس ہی کھڑا ہوا تھا۔

ہم سب جلدی سے کھڑکی کے پاس پہنچ گئے۔ حالانکہ بلاکو نے بالم کی آواز نہیں سنی تھی۔ اس کے باوجود ہماری افراتفری دیکھ کر وہ بھی کھڑکی کے پاس پہنچ گیا۔

نیچے سڑک پر ایک حیرت انگیز منظر تھا۔

سیکڑوں لوگ اپنے ہاتھوں میں بلے کارڈز اٹھائے چل رہے تھے جن پر طرح طرح کے نعرے لکھے ہوئے تھے۔ اور ایک بینر آل پاکستان کلرکس ایسوسی ایشن کا تھا۔

یعنی کلرکوں نے اپنے مطالبات منوانے کے لیے جلوس نکالا تھا اور اس جلوس کی سب سے حیرت انگیز بات یہ تھی کہ زیادہ تر لوگ نقاب پوش تھے۔

ایک بینر پر جو لکھا ہوا تھا اس سے سمجھ میں آ گیا تھا کہ یہ سب نقاب پوش کیوں ہیں۔ اس پر لکھا تھا۔ ”ہم سفید پوش لوگ شرمندگی سے اپنا چہرہ نہیں دکھا سکتے۔ ہم نے اپنا چہرہ چھپا لیا ہے، اور اپنے دکھ سامنے کر دیے ہیں۔“

”باس۔ یہ بہت اچھا موقع ہے۔“ کالے خان نے کہا۔

”کس بات کا موقع۔“

”ہم بھی نقابیں باندھ کر ان میں شامل ہو جاتے ہیں۔“ کالے خان نے مشورہ دیا۔ ”اور بینک کے قریب آتے ہی بینک میں داخل ہو جائیں گے۔ کسی کو پتا بھی نہیں چلے گا کہ ہم نے نقابیں کیوں باندھ رکھی ہیں۔“

”ویری گڈ، یہ بہت اچھا آئیڈیا ہے۔“

”تو پھر اٹھاؤ بالم کو اپنے کاندھوں پر۔“

”کالے خان کیوں نہ اس کم بخت کو یہیں چھوڑ دیا جائے۔“

”نہیں باس۔ پھر بینک میں داخل ہونے کا فائدہ کیا ہوگا۔“ کالے خان نے کہا۔ ”ہم وہاں تفریح کے لیے تو نہیں جا رہے۔“

مرتا کیا نہ کرتا۔ مجھے اس بالم خان کو اپنے کندھوں پر اٹھانا ہی پڑا۔ میرے ہی ہاتھ میں بھونپو بھی تھا۔ یہ بھونپو اس بہرے بلاکو کو مخاطب کرنے، اسے آواز دینے کے لیے تھا۔

سب سے آگے میں تھا۔ میرے کاندھوں پر بالم تھا۔ اس کے بعد کالے خان، پھر وہ دونوں اور سب ہی نقاب پوش تھے۔ کالے خان کی یہ بات بالکل درست تھی کہ چونکہ پورا مجمع ہی نقاب پوشوں کا ہے۔ اس لیے کوئی خاص طور پر ہماری طرف دھیان نہیں دے گا۔

اور واقعی کوئی بھی دھیان نہیں دے رہا تھا۔ یعنی خاص طور پر ہماری طرف۔ کیونکہ ہم بھی احتجاج کرنے والوں ہی کا ایک حصہ بن گئے تھے۔

لیکن یہ صورتحال زیادہ دیر برقرار نہیں رہ سکی۔ کیونکہ کچھ لوگ اس کم بخت بالم کی وجہ سے ہماری طرف متوجہ ہو گئے تھے۔ وہ واحد آدمی تھا جو کسی کے کاندھوں پر سوار تھا۔ یعنی ایک نقاب پوش کے اوپر دوسرا نقاب پوش۔

اچانک ایک نقاب پوش نے ہماری طرف اشارہ کیا۔ ”دیکھا۔ یہ ہے جذبہ۔ ہمارا ایک کلرک بھائی اپنے ایک معذور کلرک بھائی کو اپنے کاندھوں پر بٹھا کر لایا ہے۔“

پھر ایک نے نعرہ لگایا۔ ”کلرکوں کا اتحاد۔“

دوسرے نے زندہ باد کہا۔ پھر ایک نے میری طرف اشارہ کیا۔ ”بھائیو۔ ہمارا یہ جاں نثار کلرک بھائی اپنے ساتھ ایک بھونپو بھی لے کر آیا ہے۔ شاید یہ ہم سے کچھ کہنا چاہتا ہے۔“

آس پاس کے نقاب پوش کلرک زور زور سے تالیاں بجانے لگے۔ میں اس صورتحال پر بوکھلا کر رہ گیا تھا۔ لوگوں نے شاید مجھے کلرکس ایسوسی ایشن کا کوئی اہم عہدیدار ہی سمجھ لیا تھا۔ اس لیے وہ سب کے سب میرے گرد جمع ہو گئے تھے۔ عجیب مضحکہ خیز صورتحال تھی۔ میرے چاروں طرف نقاب پوش تھے اور اس بھیڑ میں پتا ہی نہیں چل رہا تھا کہ میرے اپنے ساتھی کہاں ہیں۔

ہمیں جس بینک میں ڈاکا ڈالنا تھا وہ بھی سامنے ہی تھا لیکن میں تو بہت بری طرح پھنس چکا تھا۔ بہرحال میں نے بھونپو ہاتھ میں لے کر تقریر شروع کر دی۔ وہ مفلوج بالم بدستور میرے کاندھوں پر سوار تھا۔ میرا خیال ہے کہ کسی لیڈر نے ایسی حماقت انگیز چویشن میں کبھی تقریر نہیں کی ہوگی۔

بہرحال میں نے بولنا شروع کر دیا۔ ”میرے مظلوم کلرک بھائیو۔ میں جانتا ہوں کہ تمہارے ساتھ کیا گزر رہی ہے۔ تم کتنے اداس ہو۔ تمہارے گھروں کے چولہے تک ٹھنڈے ہو چکے ہیں۔ تمہاری بیویاں تک تمہاری مفلسی کی وجہ سے گھروں سے بھاگنے کو تیار ہیں۔ یہ سب کچھ ہو رہا ہے۔ لیکن ظالم بے رحم اور بے درد حکمرانوں کو تمہاری حالت پر رحم تک نہیں آتا۔ شرم نہیں آتی۔ ان لوگوں کو۔ میرے کلرک بھائیو۔ یہ تمہیں مار دینا چاہتے ہیں۔ تمہیں مار دینا چاہتے ہیں۔“

زور زور سے تالیاں بجنے لگیں۔ اس وقت میں نے محسوس کیا کہ شاید میرے لیے یہ لائن بہت مناسب رہے گی۔ میں بہت اچھا سیاست دان بن سکتا تھا۔ میری لیڈرانہ صلاحیت اس وقت سامنے آ رہی تھی۔ میں نے پورے ہجوم کو پرجوش کر دیا تھا۔ لوگوں کو یہ تو نہیں معلوم تھا کہ میں کون ہوں اور میرا نام کیا ہے۔ اس لیے وہ کچھ اس قسم کے نعرے لگا رہے تھے۔ ”ہمارا نقاب پوش بھائی۔ زندہ باد، زندہ باد، ہمارا گمنام بھائی زندہ باد، زندہ باد۔“

فخ

ایک وادی کا نام جو مکہ معظمہ سے کچھ زیادہ دور نہیں اور جہاں 8 ذوالحج 169ھ/11 جون 786ء کو حسین بن علی بن الحسن متعدد علویوں کے ساتھ شہید ہوئے لہٰذا یوم کربلا کی طرح شیعہ یوم فخ کو بھی سوگ کا دن مناتے ہیں۔ ان کی شہادت سے کچھ عرصہ قبل اہلِ مدینہ نے حسین مذکور کی بیعت کر لی تھی اور جب وہ اپنے چند حامیوں کو ساتھ لیے مکے جا رہے تھے تو فخ میں عباسی لشکر کا سامنا ہو گیا، جس نے ان کی مٹھی بھر جماعت کو منتشر کر کے انہیں شہید کر دیا۔ وہ اور ان کے ہمراہی جس مقام پر شہید اور مدفون ہوئے اور جسے باب الشہدا کہتے ہیں، اہلِ مکہ کے نزدیک متبرک سمجھا جاتا ہے چنانچہ 14 صفر کو ہر سال ان کا ایک اجتماع ہوتا تھا۔ فخ کے قتلِ عام سے بچنے والوں میں ایک ادریس بن عبداللہ بن حسن علوی بھی تھے، جو المغرب چلے گئے اور وہاں انہوں نے بنو ادریس کی بنیاد رکھی۔

مرسلہ: نثار اختر، پشاور

فدائی

وہ شخص جو کسی جذبے کے تحت کسی نیک مقصد کے لیے اپنی جان کا نذرانہ پیش کرے اس سے مراد ”دلیر نڈر بے باک“ جان نثار، سورما اور جری، بھی لیا جاتا ہے۔ عربی لفظ فداوی سے بگڑ کر فدائی ہو گیا ہے۔ الجزائر میں فداوی اسے کہتے ہیں جو بہادری کے کارناموں کی داستان بیان کرے اور ایسی داستان کو فداویہ کہتے ہیں۔ یہ نام اسمٰعیلیوں اور بالخصوص ان کو ملتا تھا جو کسی کو راہ سے ہٹانے کے لیے قتل پر مامور کیے جاتے تھے۔ انقلاب ایران کے دوران میں شروع میں فدائی وہ لوگ کہلاتے تھے جو جمہوریت پسند جماعت کے حامی تھے مگر بعد میں عام حریت پسند اور دستور کے حامی بھی فدائی کہلانے لگے۔ شیخ زادہ لاہچی جسے شاہ اسماعیل صفوی نے سفیر بنا کر محمد خان شیبانی کے پاس بھیجا تھا فدائی تخلص کرتا تھا۔ محمد شاہ قاچار کا منظورِ نظر شاعر سید مرزا سعید اردستانی (جو اصفہان کا رہنے والا تھا) بھی فدائی تخلص کرتا تھا۔

مرسلہ: راحیلہ نیاز، لاہور

میری سرشاری شاید اور کچھ دیر جاری رہتی لیکن ہوا یہ کہ اس وقت پولیس نے ہم پر دھاوا بول دیا۔ پولیس والے لاٹھیاں برساتے ہوئے ہم پر حملہ آور ہوگئے تھے۔

بدقسمتی یہ تھی کہ ہمارے ارد گرد جو لوگ تھے وہ پولیس کو دیکھ کر ادھر ادھر فرار ہوگئے تھے۔ میرے کاندھوں پر سوار بالم نے مجھے دو ہتھڑ مارنا شروع کردیا تھا۔ ”ارے باس، بھاگو، بھاگو، ورنہ پھنس جائیں گے۔“

میں نے سوچا کہ اس کم بخت بالم کو نیچے گرا کر وہاں سے بھاگ لوں لیکن میں بھاگ بھی نہیں سکا۔ پولیس نے مجھے پکڑ لیا تھا۔ صرف مجھے نہیں بلکہ میرے ساتھ وہ بالم بھی پکڑا گیا تھا۔

عجیب صورتحال تھی۔ پولیس کی موبائل میں صرف میں تھا اور وہ بالم تھا جسے اب میرے کاندھوں سے اتار کر موبائل میں ایک طرف بٹھا دیا گیا تھا۔

تماشا یہ تھا کہ گرفتار ہونے والا صرف میں تھا۔ شاید پولیس نے یہی مناسب سمجھا ہوگا کہ اس جلوس کے لیڈر کو گرفتار کرلیا جائے اور بدقسمتی سے میں ہی انہیں لیڈر معلوم ہوا تھا۔

بہرحال ہم دونوں کو موبائل کے ذریعے پولیس اسٹیشن پہنچا دیا گیا۔ اگر معاملہ صرف کلرکوں کے جلوس ہی کا ہوتا تو کوئی بات نہیں تھی۔ وہاں پہنچتے ہی صورتحال کچھ اور ہوگئی تھی۔

پولیس کے خوف سے بالم نے شور مچانا شروع کردیا۔ ”خدا کے لیے ہمیں چھوڑ دو ہمارا کلرکوں اور ان کے جلوس وغیرہ سے کوئی تعلق نہیں ہے۔“

”اگر تعلق نہیں ہے تو پھر تم دونوں نے یہ نقابیں کیوں لگا رکھی ہیں۔“ ایس ایچ او نے پوچھا۔

”جناب ہم دونوں تو بینک لوٹنے کے چکر میں نکلے تھے۔“ بالم نے اگل دیا۔

”کیا؟ بینک لوٹنے۔“ ایس ایچ او سنبھل کر بیٹھ گیا تھا۔ ”کیا بکواس کررہے ہو؟“

”یہ بکواس نہیں ہے جناب عالی، یہ سچ ہے۔“

”خاموش رہو۔“ میں نے بالم کو ڈانٹنے کی کوشش کی۔

”نہیں باس۔ بتانے دو مجھے۔“ بالم نے کہا۔ ”میں اب الٹے سیدھے چکروں میں نہیں پڑوں گا۔ میں تو کسی اور کام سے تمہارے پاس آیا تھا۔ یہ تم نے مجھے کہاں پھنسا دیا ہے۔“

”بتا۔ کس کام سے گیا تھا۔“ ایس ایچ او نے پوچھا۔

میں یہ کہنا بھول گیا کہ موبائل میں بیٹھنے کے بعد ہی ہم دونوں کی نقابیں اتار دی گئی تھیں۔

بالم نے پھر پوری کہانی سنا دی کہ کس طرح کالے خان اسے باس کے پاس لے آیا تھا (باس سے اس کا اشارہ میری ہی طرف تھا) اس کے علاوہ ہلا کو اور فضل دین بھی اس مہم میں شامل تھے اور باس نے پوری پلاننگ تیار کی تھی۔ وغیرہ وغیرہ۔

”لیکن تم لوگ ڈاکا ڈالنے کے بجائے کلرکوں کے جلوس میں کیسے پھنس گئے تھے۔“ ایس ایچ او نے پوچھا۔

”یہ ہماری بدقسمتی ہے جناب۔“ بالم نے بتایا۔ ”یہ باس کا آئیڈیا تھا کہ سب کے چہرے پر نقابیں ہوں گی۔ اب ہمیں کیا معلوم تھا کہ نیچے جو کلرکوں کا جلوس جارہا ہے وہ بھی نقاب پوش ہے۔ بس جناب ہم اس چکر میں پھنس گئے۔“

”اب تو بتا باس۔“ ایس ایچ او نے میری طرف دیکھا۔ ”تو وہاں تقریر کیوں کرنے لگا تھا۔“

”قسمت کی خرابی۔ اور کیا کہہ سکتا ہوں۔“ میں نے کہا۔ ”میرے ہاتھ میں بھونپو تھا اور یہ کم بخت میرے کاندھوں پر سوار تھا۔ تو ان لوگوں نے مجھے کوئی مہان لیڈر سمجھ کر تقریر کی فرمائش شروع کردی۔ مرتا کیا نہ کرتا جناب۔ اپنی جان چھڑانے کے لیے مجھے تقریر کرنی پڑگئی۔ یہ اتفاق تھا کہ میری تقریر کچھ زیادہ ہی پرجوش ہوگئی جس کے نتیجے میں پولیس نے اس جلوس پر ہلا بول دیا اور میں یہاں تھانے میں آپ کے سامنے ہوں۔ شاید اس کو کہتے ہیں کھایا نہ پیا گلاس توڑا بارہ آنے۔“

میرا یہ احوال سن کر ایس ایچ او کے ساتھ ساتھ اس کمرے میں موجود دوسرے پولیس والے بھی زور زور سے ہنسنے لگے تھے۔

کسی بھی ڈاکے کی ایسی کہانی ان پولیس والوں نے کبھی نہیں سنی ہوگی۔ بہرحال قصہ مختصر یہ کہ چونکہ ہم نے بینک لوٹنے کی پلاننگ کی تھی۔ ایک بہت بڑا جرم کرنے جارہے تھے۔ یہ اور بات ہے کہ اپنی حماقت سے ہم وہ جرم نہیں کرپائے۔ لیکن ہماری کوشش تو یہی تھی۔

لہٰذا اسی بنیاد پر ہمیں عدالت نے ایک ایک سال کی سزا سنا دی۔ کالے خان، ہلا کو اور فضل دین کو بھی گرفتار کرلیا گیا تھا۔

اور میں اپنی یہ درد بھری انوکھی داستان جیل ہی میں بیٹھ کر تحریر کررہا ہوں۔

میں نے کبھی اپنے شوہر سے بے وفائی نہیں کی۔ میں ایک شریف خاندان کی شریف لڑکی ہوں۔ اسی لیے کبھی بھی بے وفائی کا تصور ہی نہیں کرسکتی۔ اس کے باوجود جب مسلسل شک کیا جائے، بے وفائی کے طعنے دیے جائیں تو پھر......؟

اس وقت ہمارے یہاں کی لڑکی صرف ایک کام کرسکتی ہے۔ اپنی قسمت پر آنسو بہانے بیٹھ جاتی ہے۔ خود بھی روتی ہے اور اپنے ماں باپ کو بھی رلاتی رہتی ہے۔

میں نے بھی کچھ دنوں تک ایسا ہی کیا۔ لیکن عالیہ سے ملاقات کے بعد صورت حال ہی بدل گئی۔

عالیہ میری دوست تھی۔ ہم کالج میں ایک ساتھ ہوا کرتے تھے۔ پھر وہ شادی کرکے ملک سے باہر چلی گئی۔ کچھ دنوں تک تو اس کی خیریت معلوم ہوتی رہی۔ پھر آہستہ آہستہ یہ سلسلہ کم ہوتا چلا گیا۔ پھر بالکل ہی ختم ہوگیا۔

اس دن جب اچانک ایک مارکیٹ میں اس سے ملاقات ہوئی تو یادوں کے دریچے کھلتے چلے گئے۔ اس کے ساتھ ایک ہینڈسم سا شخص بھی تھا جو اس کا شوہر ہی ہوسکتا تھا۔

عالیہ نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ”عمیر ایسا کرو، تم چلے جاؤ۔ مجھے میری پرانی دوست مل گئی ہے۔ ہم کچھ دیر ہوٹل میں گزاریں گے۔“

”ضرور۔“ عمیر نام کے اس شخص نے مسکرا کر اپنی گردن کو جھٹکا اور ایک طرف چلا گیا۔

میں اور عالیہ قریب ہی کے ایک ریستوران میں آ کر بیٹھ گئے تھے۔

صبر

محترم ومکرم مدیر اعلیٰ

سلام مسنون!

عورت کا سب سے بڑا ہتھیار ہے صبر۔ اس کا اندازہ آپ کو میری سرگزشت سے بخوبی ہوجائے گا۔ اگر میں نے صبر سے کام نہ لیا ہوتا تو میرا گھر بھی تباہ ہوجاتا جس طرح میری دوست عالیہ کا ہوا۔

حرا

(اسلام آباد)

عالیہ میں اتنے دنوں کے بعد بھی کوئی تبدیلی نہیں ہوئی تھی۔ وہ پہلے کی طرح شگفتہ اور شاداب تھی۔

ہم نے چائے وغیرہ کا آرڈر دینے کے بعد باتیں شروع کردیں۔

”یار، تمہارا شوہر تو اچھا خاصا ہینڈسم انسان ہے۔“ میں نے کہا۔

”ہاں۔ لیکن یہ میرا شوہر نہیں ہے۔“ عالیہ نے بتایا۔

”تو پھر یہ کون ہے۔“

”میرا محبوب۔“ اس نے اطمینان سے جواب دیا۔ ”میرے شوہر کا نام عاصم ہے اور یہ عمیر ہے۔“

”میں نہیں سمجھی۔ کیا شوہر سے علیحدگی ہوچکی ہے۔“

”نہیں، وہ بھی ساتھ ہے۔ بلکہ میں اس کے ساتھ ہوں۔“ اس نے بتایا۔ ”ایک بات بتاؤ۔ کیا شوہر کے ہوتے ہوئے عورت کسی اور سے محبت نہیں کرسکتی۔“

”یار... ہمارے یہاں یہ سب نہیں ہوتا ہے۔“ میں نے کہا۔ تم چونکہ یورپ میں رہ کر آئی ہو۔ اسی لیے تم نے وہاں کے طریقے اختیار کرلیے ہیں۔“

”اب تم میری باتوں کے جواب دو۔ کیا ہمارے یہاں کے شوہروں کو اس بات کا حق ہے کہ وہ اپنی بیوی کی زندگی اجاڑ دیں۔ اس کا جینا حرام کردیں۔ اس کو ہر وقت شک کی نگاہ سے دیکھیں۔ وہ وفادار رہو اس کے باوجود اس پر بے وفائی کے الزام لگاتے رہیں۔ بتاؤ کیا اسے کوئی حق پہنچتا ہے۔“

”تو کیا تمہارا شوہر ایسا کرتا تھا۔“

”ہاں۔ اس نے میری زندگی عذاب کر رکھی ہے۔“ اس نے بتایا۔ ”عورت کب تک برداشت کرسکتی ہے۔ میں نے سوچا کہ جب وفا کرتے ہوئے بے وفائی کے طعنے برداشت کرنے ہیں تو بے وفائی کرکے دکھا دیتی ہوں۔ اس کے بعد میں نے عمیر سے دوستی کرلی اور اب بڑے سکون میں ہوں۔ وہ مجھ پر شک کرتا ہے تو کرتا رہے۔ کیونکہ میں اب واقعی بے وفا ہوچکی ہوں۔ لعنت ہو ایسے لوگوں پر۔“

مجھے ایسا لگا جیسے عالیہ میری ہی کہانی سنا رہی ہے۔ میرے ساتھ بھی تو یہی سب کچھ تھا۔ میرا شوہر پرویز میرے ساتھ ایسا ہی سلوک کرتا تھا۔ تمام تر وفاداریوں کے بدلے اسے اپنے بارے میں ہمیشہ شک ہی میں دیکھا تھا۔ اس نے بھی میری زندگی عذاب بنا کر رکھ دی تھی۔

عالیہ عاصم کے بارے میں مسلسل بتا رہی تھی اور اس کی زندگی کا ہر موڑ مجھے اپنی زندگی کا دکھائی دے رہا تھا۔

شاید دنیا بھر کی ہر اس عورت کی کہانی ایک ہی جیسی ہوتی ہے جس کا شوہر اسے بے وفا سمجھتا ہے۔

ایک ہی جیسا سلوک۔ ایک ہی جیسا رویّہ۔ ایک ہی انداز۔ فرق یہ ہے کہ ننانوے فیصد عورتیں اپنے نصیبوں کو رودھو کر خاموش ہوجاتی ہیں جبکہ ایک فیصد عالیہ جیسی ہی ہوتی ہیں جو ایسے شدید ردِعمل کا اظہار کر گزرتی ہیں۔

”ایک بات بتاؤ۔ کیا تمہارے شوہر کو عمیر کے بارے میں نہیں معلوم۔“ میں نے پوچھا۔

”نہیں، وہ ابھی نہیں جانتا۔“ اس نے کہا۔ ”لیکن جس دن اسے معلوم ہوا۔ اس دن شاید قیامت ہی آجائے گی اور میں ذہنی طور پر اس قیامت کے لیے تیار ہوں۔“

”لیکن یہ کوئی اچھی بات تو نہیں ہوگی۔“

”اب چاہے وہ اچھی ہو یا بری۔“ وہ منہ بنا کر بولی۔ ”کیا آنسو صرف عورت ہی کی قسمت میں لکھ دیے گئے ہیں۔ کیا مردوں کو رونا اور فریاد کرنا نہیں چاہیے۔ کیا انہیں انگاروں پر نہیں لوٹنا چاہیے۔“

”اب میں تمہیں ایک بات بتاؤں۔“

”ضرور بتاؤ۔“

”بالکل یہی سب کچھ میرے ساتھ بھی ہے۔“ میں نے بتایا۔ ”میرا شوہر پرویز اسی قسم کا انسان ہے۔ اس نے بھی شک کر کر کے مجھے ذہنی طور پر برباد کرکے رکھ دیا ہے۔ میں نفسیاتی مریض بن کر رہ گئی ہوں۔“

”تو پھر تم نے اس کا علاج نہیں ڈھونڈا۔“ عالیہ نے پوچھا۔

”نہیں۔ اگر تمہارا مقصد علاج سے وہی ہے جو تم کر رہی ہو تو یہ اپنے بس کا روگ نہیں ہے۔ میں یہ سب نہیں کرسکتی۔“

”تو پھر زندگی بھر سسکتی اور آنسو بہاتی رہو۔“ عالیہ نے کہا۔ ”بے وقوف لڑکی! ایسے مردوں کو منہ توڑ جواب دینے کا بس یہی طریقہ ہے۔ اگر بے وفا کہہ رہے ہیں نا تو دکھا دو بے وفائی کرکے۔ جب بدنام ہی ہو رہی ہو تو پھر اچھی طرح ہو جاؤ۔ گناہ بے لذت کا کوئی فائدہ نہیں ہوتا۔“

”تمہاری باتوں نے میرا دماغ خراب کردیا ہے۔“ میں نے کہا۔ ”اب میں چلتی ہوں۔ ورنہ......“

”ورنہ تمہارے شوہر صاحب تم پر کسی تازہ بے وفائی کا الزام لگادیں گے۔“ عالیہ شرارت آمیز لہجے میں بولی۔

”ایک بات بتاؤ۔ کیا ایسا کرتے ہوئے تمہارا ضمیر ملامت نہیں کرتا۔“ میں نے پوچھا۔

”کیا کہنے ہیں تمہارے۔ کیا ضمیر ٹائپ کی چیز صرف

عورتوں کے لیے رہ گئی ہے؟ خدا نے مردوں کو اس سے نجات دے دی ہے۔ میری جان، شروع شروع میں ہچکچاہٹ ہوا کرتی تھی۔ پھر آہستہ آہستہ میں نے سمجھوتا کرلیا۔ جہنم میں جائے سب کچھ۔ جب کم بخت شوہر کو میری پروا نہیں ہے تو میں کیوں کروں۔“

اس نے مجھے اپنا موبائل نمبر دیتے ہوئے کہا۔ ”میں اس نمبر پر ملتی ہوں۔ جب مجھ سے ملنا چاہو یا مشورہ وغیرہ لینا ہو تو فوراً رابطہ کرلینا۔“

گھر آکر میں عالیہ ہی کے بارے میں سوچتی رہی۔ وہ پہلے کیا تھی اور اب کیا ہوچکی تھی۔ شاید اسی کو تنگ آمد بجنگ آمد کہا جاتا ہے۔

عورت جیسی وفادار اور خدمت گزار مخلوق جب پلٹ کر وار کرتی ہے تو یہ وار کتنا کاری ہوجاتا ہے۔ میں گھر پہنچی تو میرا شوہر پرویز پہلے سے موجود تھا۔ اس کے تیور اسی طرح چڑھے ہوئے تھے۔ اس کی آنکھوں میں بے اعتباری کے رنگ تھے۔

”کہاں سے آرہی ہو۔“ اس نے میری طرف گھورتے ہوئے پوچھا۔

پرویز کے حوالے سے ایک بات بتانا ضروری سمجھتی ہوں کہ اس کا غصہ انتہائی ٹھنڈا ہوتا تھا یعنی وہ چیختا چلاتا نہیں تھا اور نہ ہی کسی قسم کا جھگڑا کرتا تھا۔ بلکہ انتہائی نرم ہوکر بات کرتا۔ اس کا لہجہ اور اس کی طنز بھری باتیں ہی بدن میں آگ لگا دیا کرتیں۔ جی چاہتا کہ یا تو اس کو ماردوں یا خود مر جاؤں۔

آپ نے میٹھی چھری تو سنی ہوگی تو یہ شخص میرے لیے میٹھی چھری ہی جیسا تھا۔

”میں اپنی ایک دوست کے پاس گئی تھی۔“ میں نے بتایا۔

”اپنی دوست... یا اپنے دوست۔“ پرویز نے سنسنی خیز انداز میں کہا پھر جلدی سے بولا۔ ”چلو کوئی بات نہیں۔ دوست تو دوست ہی ہوتا ہے۔ اس کے ساتھ بھی وقت گزارنا ضروری ہوتا ہے۔“

ایک بار پھر اس نے اپنی باتوں سے میرے بدن میں آگ لگادی تھی اور اسی وقت میں نے یہ فیصلہ کرلیا کہ میں اس شخص کو عالیہ بن کر دکھاؤں گی۔

میرے لیے اب یہی بہتر تھا کہ عالیہ کی طرح ہوجاؤں۔ آخر کہاں تک تڑپتی اور آنسو بہاتی رہوں۔ عالیہ کی باتیں میرے ذہن میں گونج رہی تھیں۔ کیا عورت صرف آنسو بہانے کے لیے پیدا کی گئی ہے۔ کیا اس کا یہی مقدر رہ گیا ہے کہ وہ ایسی باتیں سنے اور خاموش ہوکر بیٹھ جائے۔

لیکن سوال یہ تھا کہ میں یہ سب کیسے کرتی۔ میں نے تو شادی سے پہلے بھی اس قسم کا کوئی قدم نہیں اٹھایا تھا اور شادی کے بعد تو سوچا بھی نہیں جاسکتا تھا لیکن سوچنے پر مجبور ہوگئی تھی۔

میں کس سے یہ کہتی کہ میں اسے اپنا محبوب سمجھنے لگی ہوں یا وہ مجھ سے دوستی کرلے۔ ایک بات یہ بھی تھی کہ وہ ایسا نہیں ہونا چاہیے تھا جو بعد میں میرے گلے پڑ جاتا۔ جو مجھے بلیک میل کرنے کی پوزیشن میں آجاتا۔

ایسا کون ہوسکتا تھا؟

کیا اس کے لیے عالیہ سے مشورہ کیا جائے؟ لیکن نہیں۔ میں عالیہ کو تو بتانا بھی نہیں چاہتی تھی ورنہ وہ میرا مذاق اڑانے لگتی۔ کیونکہ میں نے اس کو یہ کام کرنے پر برا بھلا کہا تھا اور اب خود اسی کے راستے پر چلنے کی تیاریاں کر رہی تھی۔

پھر یہ ہوا کہ ایک شخص مجھے مل گیا۔

وہ ایک نفیس قسم کا انسان تھا۔ اور اس کا نام بھی نفیس ہی تھا۔ اس سے میری ملاقات غزلوں کی ایک محفل میں ہوئی تھی۔ میں کبھی کبھی اپنی سہیلی رفعت کے ساتھ اس کی سوسائٹی کے فنکشن میں چلی جایا کرتی تھی۔ مہینے میں ایک بار وہ سوسائٹی اس قسم کی ایکٹیویٹی کیا کرتی۔

غزلوں کی اسی محفل میں رفعت نے نفیس سے میرا تعارف کرایا تھا۔ مجھے پہلی نظر میں وہ شخص اچھا لگا۔ وہ ایک مہذب انسان تھا۔

نہ جانے کیوں مجھے شروع ہی سے مہذب قسم کے لوگ بہت پسند ہیں۔ چاہے وہ پیسے والے ہوں یا غریب ہوں، تجارت کرتے ہوں یا ملازمت کرتے ہوں۔ ان کا مہذب ہونا میرے لیے پسندیدگی کی شرط تھی۔ مہذب لوگوں کی باتیں، ان کے انداز اور ان کی آنکھوں کی حرکات یہ بتا دیا کرتی کہ وہ مہذب ہیں۔

میں اور نفیس ہوٹل کے لاؤنج میں جا کر بیٹھ گئے۔ رفعت ہمارا تعارف کرا کے ایک طرف چلی گئی تھی۔ نفیس نے مجھے کافی کی آفر کی تو میں اس کے ساتھ ہوٹل کے لاؤنج میں آگئی۔

ہمارے درمیان اِدھر اُدھر کی باتیں ہونے لگیں۔ میری توقع کے عین مطابق وہ ایک شائستہ شخص ثابت ہو رہا تھا۔ باتوں باتوں میں اس نے یہ انکشاف کیا کہ اس کی گھریلو زندگی بہت تلخ ہے۔

”میری بیوی میرے مزاج کو نہیں سمجھتی۔“ وہ کہہ رہا تھا۔ ”شادی کے لیے ذہنی ہم آہنگی بہت ضروری ہے۔ اگر یہ نہ ہو تو زندگی تلخ ہوجاتی ہے۔“

"نفیس صاحب، پھر آپ جیسے ذی شعور انسان نے ایسی شادی کیوں کرلی؟" میں نے پوچھا۔

"اس لیے کے بعض رشتوں کی مجبوریاں ہمارے راستے میں آجاتی ہیں۔" اس نے کہا۔ "ہم احترام اور محبت میں انکار نہیں کرپاتے۔ پھر یہ ہوتا ہے کہ وہ بزرگ تو قبر کے اندر چلے جاتے ہیں اور ہم قبر کے باہر ایک اور قبر میں ہوتے ہیں۔ زندگی افسوس کرتے اور روتے ہوئے گزر جاتی ہے۔"

"میرا خیال ہے کہ کسی مرد کو تو ایسی مجبوری کے الفاظ نہیں بولنے چاہئیں۔" میں نے کہا۔

"یہی تو پرابلم ہے کہ مرد کو عام طور پر مضبوط سمجھا جاتا ہے۔ لیکن وہ اپنے اندرونی کھوکھلے پن اور کمزوری کو اپنے لہجے اور رویّے کی مصنوعی مضبوطی سے چھپانے کی کوشش کرتا رہتا ہے۔ میں بھی ایسا ہی ایک شخص ہوں۔"

اس نے چونکہ مجھے پہلی ہی ملاقات میں اپنی گھریلو زندگی کے بارے میں بہت کچھ بتادیا تھا۔ اسی لیے کافی کی چسکیوں کے درمیان میں بھی اسے بہت کچھ بتاتی چلی گئی۔

شوہر کا رویّہ۔ شک کی عادت۔ بے وفائی کے طعنے۔ میں نے اسے سب کچھ بتا دیا تھا۔

"چلیں۔" میرے خاموش ہوجانے کے بعد اس نے ایک گہری سانس لی۔ "یعنی اس وقت ہم دونوں تقریباً ایک ہی کشتی میں سوار ہیں۔"

"یہ آپ نے سچ کہا۔ کشتی ایک ہے، سمندر بھی ایک ہے لیکن کنارے مختلف ہیں۔"

"کنارے بھی ایک ہوسکتے ہیں۔" وہ میری آنکھوں میں جھانکتا ہوا بولا۔

اس وقت میں واقعی لڑکھڑانے لگی تھی۔ سب کچھ پہلی دفعہ ہورہا تھا۔ اچانک میں نے ایک عورت کو دیکھا جو لاؤنج میں داخل ہوئی اور اِدھر اُدھر دیکھنے لگی۔

وہ ایک نازک خوبصورت سی عورت تھی۔

"ایکسکیوزمی۔" نفیس نے مجھ سے کہا۔ "یہ میری بیوی ہے۔ مجھے تلاش کرتی ہوئی یہاں تک پہنچ گئی۔ میں ابھی اسے رخصت کرکے آتا ہوں۔"

نفیس اٹھ کر اپنی بیوی کی طرف چلا گیا۔ ان دونوں کے درمیان کچھ باتیں ہوتی رہیں پھر دونوں ایک طرف چلے گئے۔

میں کچھ دیر انتظار کے بعد کافی کا بل ادا کرکے فنکشن والے ہال میں آگئی۔ فنکشن ختم ہوچکا تھا۔ میری دوست رفعت شاید مجھ ہی کو تلاش کرتی پھر رہی تھی۔ "یار، تم کہاں غائب ہوگئی تھیں۔"

"میں تمہارے نفیس صاحب کے ساتھ کافی پینے چلی گئی تھی۔" میں نے بتایا۔ "ویسے یار نفیس صاحب کی زندگی تو بہت ڈسٹرب معلوم ہوتی ہے۔"

"ڈسٹرب! وہ کیوں؟"

میں نے اسے بتادیا کہ نفیس کے ساتھ کیا پرابلم ہے۔

"سب بکواس ہے۔" رفعت نے کہا۔ "میں اس کی بیوی کو بہت اچھی طرح جانتی ہوں۔ نفیس تو اس کا نام ہے، لیکن نفاست اس کی بیوی میں پائی جاتی ہے۔ وہ بہت اچھی عورت ہے۔"

"تو پھر نفیس ایسا کیوں کہہ رہے تھے۔"

"میری جان تم ابھی تک مرد کی فطرت کو نہیں سمجھ سکیں۔ وہ اگر اپنی بیوی کے خلاف زہر نہ اگلے تو دوسری عورت اس کی طرف کیوں متوجہ ہو۔ یہ لوگ عورتوں کی ہمدردیاں اسی طرح حاصل کرکے انہیں برباد کردیتے ہیں۔"

"میرے خدا...!" میں نے ایک گہری سانس لی۔ "میں بھی نہ جانے کیوں اس کی باتوں میں آنے لگی تھی۔ شاید پرویز کے رویّے کی وجہ سے۔"

رفعت کو پرویز اور میرے درمیان ہونے والے معاملات کا پتا تھا۔

"بے وقوف لڑکی! اپنے آپ کو سنبھالو۔" رفعت نے کہا۔ "انتقام اور بدلے کے چکر میں برباد ہوکر رہ جاؤ گی۔ تمہاری دوست عالیہ نے تمہیں بہت غلط مشورہ دیا ہے۔ ہمارے یہاں ایسا نہیں ہوتا کہ عورت اپنے شوہر سے ناراض ہوکر کسی عاشق کی تلاش میں نکل جائے۔"

"تو پھر کیا کروں میں۔"

"خدا نے تمہیں ایک بہت طاقت ور ہتھیار دیا ہے اور وہ ہے صبر۔ صبر کرو۔ اور دیکھو کیا ہوتا ہے۔ تم یقین کرو سب کچھ بدل جائے گا۔"

اور واقعی اب سب کچھ بدل چکا ہے۔

اب ہمارے تین بچے ہیں۔ پرویز کی شک کرنے کی عادت بھی ختم ہوگئی ہے.... میں یہ سوچتی ہوں کہ اگر میں عالیہ کی باتوں میں آجاتی تو میرا کیا ہوتا۔

ہوسکتا ہے کہ یہ پالیسی یورپ کی ہو۔ لیکن یہ پالیسی ہماری نہیں ہے۔ میں تو اپنی بہنوں کو یہی مشورہ دیتی ہوں کہ اگر ان کے ساتھ اس قسم کی کوئی پرابلم ہو تو ایک ہتھیار سنبھال لیں۔ اور وہ ہے صبر۔

منّت

جناب معراج رسول
السلام علیکم!
لوگ بغیر سوچے سمجھے منّت مان لیا کرتے ہیں جس کا نتیجہ خطرناک بھی نکل سکتا ہے، انسان اپنے خود ساختہ گرداب میں بھی پھنس سکتا ہے۔ زیر نظر واقعہ ایک ایسے ہی مسئلہ پر مبنی ہے جو یقیناً آپ کو بھی پسند آئے گا

محمد کمال
(کراچی)

مکان مجھے پہلی نظر میں پسند آگیا تھا۔

تین کمروں کا مکان تھا۔ ایک منزلہ۔ خوبصورت سا۔

دالان کے آگے ایک چھوٹا سا لان تھا۔ گرچہ وہ لان اس وقت اجاڑ اور بے ترتیب ہورہا تھا لیکن اس کو اچھا بنایا جاسکتا تھا۔

اسٹیٹ ایجنٹ نے اس مکان کی تعریف میں آسمان زمین کے قلابے ملادیے تھے۔ "ارے جناب، اگر آپ کو پورے نارتھ میں ایسا مکان اتنے کم کرائے پر مل جائے تو میں

اپنا کام چھوڑ دوں۔"

مکان واقعی اچھا تھا۔ اور کرایہ بھی حیرت انگیز طور پر بہت کم۔ مہینا صرف پانچ ہزار روپے۔

وہ ٹھیک کہتا تھا۔ اتنے کم کرائے پر ایسا مکان مل ہی نہیں سکتا تھا۔ تین کمرے، ہوادار، اور ہر ایک کے ساتھ باتھ روم۔ کچن بھی بہت کھلا ہوا۔

میرے لیے وہ مکان بہت مناسب تھا۔

میں اکیلا تھا۔ ایک دفتر میں ملازمت کرنے والا۔ والدین کہیں اور تھے۔ کراچی جاب کے سلسلے میں آیا تھا۔ پھر یہیں کا ہو کر رہ گیا۔ کیونکہ اس شہر کی اپنی ایک کشش ہے جو ایک بار باندھ لے تو پھر کہیں جانے نہیں دیتی۔

سب سے بڑا مسئلہ رہائش کا تھا۔

کمپنی کی طرف سے مجھے گاڑی تو دے دی گئی تھی لیکن رہنے کا مسئلہ اٹکا ہوا تھا۔ میرے ذہن میں کرائے کی رینج پندرہ سے بیس ہزار تھی۔ لیکن جب ایسا مکان پانچ ہزار میں مل رہا تھا تو پھر اور کیا چاہیے تھا؟

"جناب، اور اس مکان کے ساتھ کوئی جھنجٹ بھی نہیں ہے۔" ایجنٹ نے بتایا۔

"کیسا جھنجٹ؟"

"یہی مالک مکان کا۔ وہ بے چارہ ملک سے باہر ہے۔ آپ کو کرائے کی رقم اس کے اکاؤنٹ میں جمع کرانی ہوگی۔ بس آپ کا کام ختم۔ پھر آپ عیش کریں۔"

"پانی وغیرہ کی پرابلم۔"

"ارے نہیں صاحب، اس علاقے میں پانی وغیرہ کی کوئی پرابلم نہیں ہے۔" اس نے کہا۔ "اور نہ ہی دوسری مصیبتیں ہیں۔ پُرسکون علاقہ ہے۔ کوئی ڈسٹرب کرنے والا نہیں ہے۔"

میں نے تو مکان کو دیکھتے ہی پلاننگ کرلی تھی۔ ایک کمرا میری خواب گاہ کے طور پر استعمال ہوتا تھا۔ دوسرا کمرا مہمانوں کے لیے۔ اگر کوئی آیا تو...... اور تیسرا کمرا میری لائبریری کے طور پر۔

مجھے پڑھنے کا بھی شوق رہا ہے۔ اسی لیے میرے پاس بے شمار کتابیں ہیں۔ ایک کمرا کتابوں کے لیے مخصوص ہو جاتا۔ یعنی وہ مکان ہر لحاظ سے مناسب تھا۔

میں نے ایجنٹ سے فوری طور پر ہاں کر دی۔ بلکہ اس کو ایک سال کا کرایہ ایڈوانس کے طور پر بھی دے دیا تھا۔

ان دنوں میں اپنے ایک دور کے رشتے دار کے یہاں مقیم تھا۔ ان کے گھر میں بظاہر تو تکلیف نہیں تھی لیکن کسی کے یہاں کب تک رہا جاسکتا ہے۔

میں نے ان کا شکریہ ادا کرتے ہوئے اپنا سامان (کتابیں وغیرہ) سمیٹا اور اس نئے مکان میں شفٹ ہو گیا۔ اسی دن میں نے بازار جا کر ضرورت کی بہت سی چیزیں خرید لیں۔ اور سوزوکی پر لدوا کر نئے گھر کی طرف آ گیا۔

جیسا میں بتا چکا ہوں کہ اس مکان میں ایک چھوٹا سا لان تھا اور باہر لوہے کا گیٹ تھا جس کے بعد وہ لان آتا تھا۔ لان کے بعد اصل مکان شروع ہوتا تھا۔

وہ لڑکی مکان کے گیٹ ہی پر کھڑی ہوئی تھی۔ میں نے اس کی طرف کوئی دھیان نہیں دیا۔ البتہ جب اس کو دیکھا تو ایک جھٹکا لگا تھا۔

وہ بہت خوبصورت لڑکی تھی۔ اندازے کے مطابق عمر بائیس سال سے زیادہ نہیں ہوگی۔ بہت خوبصورت اور اسمارٹ۔ میں شاید اس کی طرف دھیان ہی دیئے رکھتا۔ لیکن سوزوکی والے کی آواز نے چونکا دیا۔ وہ مجھ سے سامان اتروانے کی بات کر رہا تھا۔ بہرحال میں نے سوزوکی سے سامان اتروانا شروع کر دیا۔

اس دوران وہ لڑکی کسی طرف جا چکی تھی۔ ایک مزدور بھی ساتھ آیا تھا۔ اس مزدور نے سارا سامان اندر پہنچا دیا۔ سوزوکی والے کو فارغ کرنے کے بعد میں نے اپنے سامان کا جائزہ لیا۔

سامان دیکھ دیکھ کر ہمت جواب دینے لگی تھی۔ میں اکیلا کس طرح سب کچھ سیٹ کر سکتا تھا۔ بہرحال یہ میرا اپنا کام تھا اور مجھ ہی کو کرنا تھا۔

میں نے پہلے کرسیاں اٹھا کر اندر رکھیں۔ اسی دوران کسی نے گیٹ پر دستک دی۔ لوہے کے گیٹ کی آواز گونج کر رہ گئی تھی۔ میں نے گیٹ کھولا تو وہی لڑکی سامنے کھڑی تھی۔

میرے لیے اس کو دوبارہ دیکھنا ایک خوشگوار حیرت کی طرح تھا۔

"کیا میں آپ کی کوئی مدد کر سکتی ہوں۔" اس لڑکی نے پوچھا۔

"آ...... آپ میری مدد کریں گی۔"

"ہاں، پڑوسی ہونے کے ناتے یہ میرا فرض بنتا ہے۔" اس لڑکی نے کہا۔ "آپ کے پاس اچھا خاصا سامان ہے اور آپ اکیلے ہیں۔ ان کو سیٹ کرنا آپ کے لیے مشکل ہوگا۔"

"وہ تو ہے۔ لیکن میں آپ کو زحمت نہیں دے سکتا۔"

"ارے زحمت کیسی۔ کام کرنا تو میری ہابی ہے۔" اس نے کہا۔ "اب یہ بتائیں کیا آپ کے پاس جھاڑو ہے۔"

"جھاڑو! نہیں، وہ تو میں لانا ہی بھول گیا۔"

"پہلے آپ کو وہی لانا تھا۔ تاکہ گھر کا حلیہ درست ہو سکے۔ خیر، وہ تو میں گھر سے لے آؤں گی۔ آپ دو چار ڈسٹ بن لے کر آ جائیں۔"

"آپ کیوں خوامخواہ اتنی زحمت کریں گی۔" مجھے کچھ شرمندگی سی ہونے لگی تھی۔

"کوئی زحمت نہیں۔ آپ دکان جائیں۔ بلکہ ایسا کریں دو جھاڑو بھی لیتے ہی آئیں۔ ایک پھول جھاڑو۔ دوسری تنکوں والی۔"

اس وقت مجھے حیرت بھی تھی اور بے پناہ خوشی بھی۔ اس لڑکی سے میرا کوئی تعلق نہیں تھا۔ میں تو اس کا نام بھی نہیں جانتا تھا اور وہ کتنی اپنائیت سے میرا کام کرنے کو تیار تھی۔

یہ سب مجھے حیران بھی کر رہا تھا اور بہت اچھا بھی لگ رہا تھا۔ ایک مانوس سا احساس۔ ایک ایسا رشتہ جس کو ابھی کوئی نام نہیں دیا جا سکتا تھا۔

میں اس کا شکریہ ادا کرتا ہوا اس کی طلب کی ہوئی چیزیں لینے دکان کی طرف چلا گیا۔ کچھ دیر بعد واپس آیا تو وہ میری کتابوں کا معائنہ کر رہی تھی۔

"بہت کتابیں ہیں آپ کے پاس۔" اس نے میری طرف دیکھا۔

"ہاں، زندگی میں بس یہی شوق رکھا ہے۔" میں نے دونوں جھاڑو اور ڈسٹ بن وغیرہ ایک طرف رکھ دیے۔

"بہت اچھا شوق ہے۔" وہ مسکرا دی۔ "اب آپ کچھ دیر کے لیے یہاں سے چلے جائیں۔ تاکہ میں اطمینان سے آپ کے گھر کی صفائی کر سکوں۔"

"دیکھیں، آپ میرے لیے اجنبی ہیں۔ آپ سے کام کرواتے ہوئے مجھے اچھا نہیں لگ رہا۔ میں تو آپ کا نام بھی نہیں جانتا ہوں۔"

"تو اس میں کون سی مشکل بات ہے۔" وہ ہنس پڑی۔ "میرا نام ہانی ہے اور آپ کا نام کمال حسن ہے۔"

"کیا!" میں بری طرح چونک اٹھا۔ "آپ کو میرا نام کیسے معلوم ہوا؟"

"محترم! آپ نے اپنی ہر کتاب پر اپنا نام لکھا ہوا ہے۔" اس نے ایک کتاب اٹھا کر میرے سامنے کر دی۔ "یہ آپ ہی کی کتاب اور آپ ہی کا نام ہے نا۔"

"ہاں۔" میں ہنس پڑا۔ "اس کا تو میں نے دھیان ہی نہیں دیا تھا۔"

"اب شاید آپ دوسرا سوال یہ کریں گے کہ میں کہاں رہتی ہوں۔ تو میں پہلے بتا چکی ہوں کہ میں آپ کی پڑوسن ہوں۔"

"میں نے اپنی پوری زندگی میں آپ جیسی پڑوسن نہیں دیکھی ہوگی۔" میں نے ہنس کر کہا۔

وہ بھی ہنس پڑی۔ "کمال صاحب! اب تو آپ مجھے دیکھتے ہی رہیں گے۔ کیونکہ میں اتنی آسانی سے جان چھوڑنے والی نہیں ہوں۔"

"ارے صاحب، آپ جیسی پڑوسن سے کون کم بخت جان چھڑوانا چاہے گا۔"

"بس، اب آپ باہر تشریف لے جائیں اور آدھے گھنٹے بعد آ جایئے گا۔"

"ایک بات بتائیں۔ کیا آپ کے گھر والوں کو معلوم ہے کہ آپ یہاں ہیں۔" میں نے پوچھا۔ "کیا وہ پریشان نہیں ہوں گے۔"

"آپ ان کی فکر نہ کریں۔ سب کو معلوم ہے کہ میں کہاں ہوں۔"

"چلو، مان لیا۔ لیکن تم مجھے باہر کیوں بھیج رہی ہو۔ مجھے تو تمہارا ہاتھ بٹانا چاہیے۔ کیونکہ یہ کام میرا ہے۔"

"مرد ایسے کام کرتے ہوئے اچھے نہیں لگتے۔" اس نے کہا۔ "آپ جائیں، مجھے سنبھالنے دیں۔"

اس کے اصرار پر میں اس محلے میں قائم چائے کے ایک ہوٹل میں آ کر بیٹھ گیا۔ کیا لڑکی تھی۔ اس میں غضب بلا کی اپنائیت تھی۔ شاید کوئی اپنا بھی اس طرح کے خلوص کا مظاہرہ نہیں کرتا ہوگا۔

میں آدھے گھنٹے جب ہوٹل میں گزار کر گھر واپس پہنچا تو وہ گیٹ پر ہی کھڑی تھی۔ مجھے دیکھ کر بول اٹھی۔ "جائیں جناب، دیکھ لیں یہ پورا گھر صاف بھی ہو گیا ہے اور آپ کا سامان بھی سیٹ ہو چکا ہے سوائے کتابوں کے۔"

یقین نہیں آ رہا تھا کہ اس نے اتنی جلدی سب کچھ کر لیا ہوگا۔ لیکن واقعی گھر کی تو حالت ہی بدل گئی تھی۔ میں جس وقت حیران ہو کر یہ سب کچھ دیکھ رہا تھا، اس وقت وہ میرے ساتھ ہی کھڑی تھی۔

"ہانی تم نے یہ سب کیسے کر لیا۔" میں نے حیران

ہو کر پوچھا۔

"جناب! میں کوئی جن نہیں ہوں جس نے اکیلے یہ سب کرلیا ہوگا۔"

"تو پھر؟"

"میں نے اپنی مدد کے لیے اپنے گھر سے دو تین بندوں کو بلوالیا تھا۔" اس نے بتایا۔ "یہ بتائیں کیسا لگ رہا ہے۔"

"بہت زبردست! بالکل وہی سیٹنگ ہے جو میں کرسکتا تھا۔ ہانی، تمہارا بہت بہت شکریہ۔"

"ارے اس میں شکریے کی کیا بات ہے۔ چلیں، اب مجھے اجازت دیں۔ میں نہانے جارہی ہوں۔"

وہ اجازت لے کر چلی گئی اور میں اپنی کتابوں کی طرف متوجہ ہوگیا۔ اس لڑکی نے کتابوں کے شیلف تک لگوادیے تھے۔ اب میرا کام صرف یہ تھا کہ میں سلیقے کے ساتھ ان کتابوں کو سجادوں۔

اسی محنت میں شام ہوگئی۔

اس نے کچن تک سیٹ کردیا تھا۔ مجھے دوپہر اور رات کا کھانا تو باہر جاکر کھانا تھا لیکن ناشتا خود تیار کرنا تھا۔ اسی لیے ناشتے اور چائے کا سامان لے آیا تھا۔

میں کچن میں جاکر چائے بناکر لان میں لے آیا جو ابھی بے ترتیب تو تھا لیکن وہاں بیٹھ کر شام کی چائے پی جاسکتی تھی۔ چائے پینے کے دوران بھی مجھے اس لڑکی کا خیال آتا رہا کہ کتنی اچھی لڑکی ہے۔ کتنی ہمدرد، کتنی مخلص اور کس طرح کام آنے والی۔

اب وہ نہ جانے کب آتی۔ لیکن اتنا یقین تھا کہ وہ آتی رہا کرے گی۔ میں یہ نہیں جانتا تھا کہ وہ پڑوس کے کس گھر میں رہتی ہے۔ اس نے گھر کی نشاندہی نہیں کی تھی۔

اس رات میں نے ایک ہوٹل میں ہی کھانا کھایا تھا۔

یہ اتفاق تھا کہ اس علاقے میں ایک فوڈ اسٹریٹ بھی تھی جہاں ہر قسم کی ڈشز مل جایا کرتیں۔ میں کھانے کے بعد بہت دیر تک اِدھر اُدھر ٹہلتا رہا۔ پھر گھر واپس آگیا۔

آدمی اکیلا ہو تو پھر اسے گھر لوٹنے کی زیادہ جلدی نہیں ہوتی۔ تقریباً گیارہ بجے واپس آیا تھا اور گیٹ کے اندر آتے ہی کسی گڑبڑ کا احساس ہونے لگا تھا۔

مجھے اچھی طرح یاد تھا۔ گھر سے نکلتے ہوئے میں نے سارے بلب بجھادیے تھے۔ پھر بھی ایک کمرے میں روشنی ہورہی تھی اور یہ وہی کمرا تھا جسے میں نے اپنی لائبریری بنایا تھا۔

اتفاق سے اس کمرے کی کھڑکی باہر لان کی طرف کھلتی تھی۔ میں نے آہٹ پیدا کیے بغیر جاکر دیکھا۔ وہی لڑکی ہانی کمرے میں موجود تھی۔ وہ کوئی کتاب دیکھ رہی تھی۔

میں چابی کی مدد سے مکان میں داخل ہوگیا۔ لائبریری میں باقاعدہ روشنی ہورہی تھی۔ میں جب کمرے میں پہنچا تو ہانی نے میرے قدموں کی آہٹ سن کر اپنی گردن اٹھادی۔

وہ اس وقت اور بھی خوبصورت دکھائی دے رہی تھی۔ اس نے بہت خوبصورت ڈریسنگ کر رکھی تھی۔ اس کی خوبصورت آنکھوں میں ستارے سے جگمگا رہے تھے۔

میں اسے دیکھ کر یہ بھول ہی گیا کہ اسے پُراسرار طور پر اپنی لائبریری میں بیٹھا دیکھ کر مجھے کتنی حیرت ہوئی ہے۔ اس سے پہلے کہ میں اس سے کچھ کہتا وہ خود ہی بول پڑی۔ "آگئے واپس۔ میرا خیال ہے کہ رات کا کھانا کھانے گئے ہوں گے۔"

"ہاں ہانی۔" میں نے ایک گہری سانس لی۔ "میں ہوٹل چلا گیا تھا۔"

"تو مجھ سے کہہ دیا ہوتا۔ میں اپنے گھر سے لے کر آجاتی۔"

"ارے نہیں، تمہیں کیا تکلیف دیتا۔ تم نے میرے لیے جتنا کیا ہے وہی بہت ہے۔"

"آپ نے یہ نہیں پوچھا کہ میں اس کمرے میں کیسے آگئی۔"

"ہاں، میں یہ پوچھنے والا تھا۔ چلو تم ہی بتادو۔" میں نے کہا۔

"جناب عالی آپ کی یہ کھڑکی کھلی ہوئی تھی۔" اس نے کھڑکی کی طرف اشارہ کیا۔ "میں بہت دیر تک گیٹ بجاتی رہی تھی پھر دیوار کود کر اندر لان میں آگئی۔"

"دیوار کود کر؟"

"جی ہاں، اسی لیے خاندان والے مجھے ٹام بوائے کہہ کر پکارتے ہیں۔" وہ ہنس پڑی۔ "پھر کھڑکی کے ذریعے آپ کے گھر میں داخل ہوئی۔ آپ کو تلاش کیا، پھر اس کمرے میں آکر کتابیں دیکھنے لگی۔"

"واقعی تم کمال کی لڑکی ہو۔"

"آپ ایک نظر دیکھ لیں، میں نے آپ کی کوئی چیز چرا تو نہیں لی۔"

دل چاہا کہ اس سے کہہ دوں کہ تم نے تو میرا دل ہی

چرالیا ہے۔ لیکن میں اس کے مزاج کو بہت حد تک سمجھ گیا تھا۔ اس قسم کا بے باک رویہ رکھنے والی اور بولڈ قسم کی لڑکیاں کردار کی بہت مضبوط ہوتی ہیں۔

جبکہ اپنے آپ کو سمیٹ کر رہنے والی لڑکیاں جذبات کے بھنور میں یا کسی سے مرعوب ہوکر اس کے ساتھ ہی بہہ جایا کرتی ہیں۔ میں اس کا تجزیہ کرنے میں لگا ہوا تھا۔

بہت سے لوگ ایڈونچر پسند کرتے ہیں۔ نت نئی ایکٹیوٹی کرنا ان کا مشغلہ ہوا کرتا ہے۔ وہ مجھے خود بتا چکی تھی کہ خاندان والے اسے ٹام بوائے کے نام سے یاد کرتے ہیں۔

تو ٹام بوائے کی حیثیت سے اس نے کیا کیا شرارتیں نہیں کی ہوں گی۔

"کیا بات ہے، آپ کیا سوچنے لگے۔" اس نے مجھے مخاطب کیا۔

"کچھ نہیں، بس تمہارے بارے میں سوچ رہا تھا۔" میں چونک کر بولا۔

"چلیں اب آپ آرام کریں۔ میں چلتی ہوں۔" اس نے کہا۔ "لیکن اطمینان رکھیں، میں صحیح راستے سے جاؤں گی۔" وہ میرے ذہن پر اپنے گہرے نقوش ڈال کر مسکراتی ہوئی چلی گئی۔

اس کی آمد میرے لیے اتنی خوش گوار تھی کہ میں ترنگ میں آگیا تھا۔ اس کے جانے کے بعد یاد آیا کہ میں تو اس سے یہ پوچھنا ہی بھول گیا کہ وہ پڑوس کے کس مکان میں رہتی ہے۔

خیر اگلی بار سہی۔

اس کے بعد دو دن گزر گئے۔ وہ نہیں آئی۔ شاید وہ ہوا کے ایسے جھونکے کی طرح تھی جو اپنی مرضی سے آتا اور گزر جاتا ہے۔ اس کو قید نہیں کیا جاسکتا۔

لیکن اس کے نہ آنے سے ایک کمی سی ضرور محسوس ہونے لگی تھی۔ جیسے کوئی قیمتی چیز گم ہوگئی ہو۔ میں نے سوچا بھی کہ کسی بہانے اس کے گھر جاکر اس کی خیریت معلوم کرلوں۔

لیکن کون سا گھر۔ اس نے تو واضح طور پر کوئی نشاندہی نہیں کی تھی۔ پھر میں کس کس دروازے پر دستک دے کر کہتا کہ مجھے ہانی سے ملنا ہے۔

تیسرے دن میرے ساتھ ایک عجیب واقعہ ہوا۔ میں ہوٹل سے رات کا کھانا کھاکر گھر کی طرف آرہا تھا۔ ہوٹل آنے جانے کے لیے میں گاڑی استعمال نہیں کرتا، پیدل ہی جایا کرتا تھا۔ تو جب میں واپس آرہا تھا تو ایک ملنگ ٹائپ انسان نے میرا راستہ روک لیا۔ اس کی آنکھیں چمکدار تھیں۔ چہرے پر ہلکی ہلکی ڈاڑھی۔ لانبا قد اور صحت مند جسم۔ اس نے میرے سامنے آکر اپنا ہاتھ پھیلادیا۔ "لا، دے دے مجھے۔ تیرا بھلا ہوگا۔"

میں نے اپنی جیب سے کچھ نوٹ نکال کر اس کے ہاتھ پہ رکھ دیے جن کو اس نے جھٹک کر گرادیا۔ "کیا بھکاری سمجھ رکھا ہے مجھے۔ میرے پاس تجھ سے زیادہ پیسے ہیں۔"

"تو پھر بابا کیا مانگ رہے ہو۔"

"جو تیرے پاس ہے۔" اس نے کہا۔ "دنیا کا سب سے بڑا خزانہ تیرے پاس ہے۔ وہی میری جھولی میں ڈال دے۔"

"میرے پاس تو ایسا کچھ بھی نہیں ہے۔"

"جھوٹ مت بول۔ جا گھر جا۔ دیکھ تلاش کر۔ وہ تیرے گھر میں ہے۔ لا دے دے مجھے۔"

وہ پتا نہیں کیا کیا بولتا رہا۔ میں اس کی بات سنی ان سنی کرکے آگے بڑھ گیا۔ ان باتوں کی اہمیت ہی کیا تھی۔ مجذوب کی بڑ تھی۔

میں گھر پہنچا تو وہ گیٹ پر ہی موجود تھی۔ اس بار بھی اس نے بہت خوبصورت لباس پہن رکھا تھا۔ "دیکھ لیں جناب۔" وہ مسکرا کر بولی۔ "میں اس بار شرافت کے ساتھ گیٹ پر کھڑی ہوئی ہوں۔ دیوار پھاند کر اندر نہیں گئی۔"

"ہاں، یہ تو ہے۔" میں بھی مسکرادیا۔

ہم دونوں اندر آگئے۔ وہ میرے ساتھ لگ کر چل رہی تھی۔ اس کے جسم سے اٹھنے والی خوشبو نے مجھے بے خود سا کردیا تھا۔

ہم لائبریری میں آکر بیٹھ گئے۔ "خدا کی بندی! تم دو دنوں کے لیے کہاں غائب ہوگئی تھیں۔" میں نے پوچھا۔

"اوہ! کیا آپ کو میری کمی محسوس ہوئی تھی۔" اس نے پوچھا۔

"بہت زیادہ۔" میں نے کہا۔

"چلیں کسی کو تو میرا احساس ہوا۔ اور ہاں... وہ ملنگ آپ سے کیا کہہ رہا تھا۔" اس نے پوچھا۔

"ملنگ؟" میں نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔ "تمہیں کیسے معلوم؟"

"جناب، میں اس وقت سامنے سے ہی گزر رہی

تھی۔'' اس نے بتایا۔ ''مجھے یہی دیکھ کر حیرت ہوئی تھی کہ آپ کسی ملنگ سے باتیں کررہے ہیں۔ کیا کہہ رہا تھا وہ؟''

''پتا نہیں، کچھ عجیب سی ڈیمانڈ کررہا تھا کہ تیرے پاس دنیا کی سب سے قیمتی چیز ہے۔ وہ مجھے دے دے۔ میں نے اس کو پیسے دینے چاہے لیکن اس نے لینے سے انکار کردیا۔ بس یہی کہہ رہا تھا مجھے وہ خزانہ چاہیے جو تیرے پاس ہے۔''

''تو پھر آپ نے کیا کہا؟''

''کہنا کیا ہے۔ میرے پاس ہے کیا جو اس کو دے سکوں۔'' میں نے کہا۔ ''خیر چھوڑو، تم یہ بتاؤ کہ تمہارا ایک گراؤنڈ کیا ہے۔ مجھے ابھی تک تمہارے بارے میں کچھ بھی معلوم نہیں ہوسکا ہے۔''

''جلدی کیا ہے، سب معلوم ہوجائے گا۔'' اس نے کہا۔ ''میں اب چلتی ہوں، پھر آؤں گی۔ اور ہاں، ایک بات بتادوں۔ آپ کسی ملنگ وغیرہ کی باتوں میں مت آجایئے گا۔ یہ لوگ ایک نمبر کے فراڈ ہوتے ہیں۔''

''اطمینان رکھو، میں اتنا بے وقوف نہیں ہوں۔ ہاں، میں ایک بات پوچھنا تو بھول ہی جاتا ہوں۔ پڑوس میں تمہارا گھر کہاں ہے۔''

''آپ کے مکان سے چوتھا۔'' اس نے بتایا۔ ''لیکن خدا کے لیے میری تلاش میں وہاں مت پہنچ جایئے گا۔ میں چھپ چھپ کر آپ سے ملنے آتی ہوں۔''

''ہاں ہاں، مجھے احساس ہے اس کا۔'' میں نے جواب دیا۔ اس وقت میں اتنا خوش تھا کہ اس کا اظہار نہیں کرسکتا۔ وہ مجھ سے چھپ کر ملنے آتی تھی۔ کوئی یوں ہی تو نہیں آیا کرتا۔

''اچھا، اب میں چلتی ہوں۔''

وہ اجازت لے کر چلی گئی۔ میں ایک سرشاری کے عالم میں وہیں بیٹھا رہ گیا تھا۔

پھر اچانک میں نے کسی کی چیخ سنی۔ زوردار چیخ۔ ایک مردانہ چیخ۔ ایسا لگا جیسے کوئی میرے گیٹ ہی پر چیخا ہو۔ اس چیخ کے ساتھ کچھ بھاگتے دوڑتے قدموں کی آوازیں اور بہت سے لوگوں کا شور۔ میں گھبرا کر گھر سے باہر آگیا۔

گیٹ سے کچھ فاصلے پر کوئی اوندھے منہ زمین پر گرا ہوا تھا۔ حالانکہ اس کی صرف پشت دکھائی دے رہی تھی۔ لیکن اسے پہچاننے میں کوئی دشواری نہیں ہوئی تھی۔ یہ وہی ملنگ تھا اور شاید مرچکا تھا۔

اس کی لاش کے گرد محلے کے لوگ کھڑے ہوئے تھے۔ میں ان میں سے کسی کو پہچانتا نہیں تھا۔ ''کیا ہوا بھائی۔'' میں نے ایک صاحب سے دریافت کیا۔

''پتا نہیں۔ میں اپنے گھر میں تھا کہ ایک چیخ سنائی دی۔ گھبرا کر گھر سے باہر آیا تو یہ سامنے تھا۔''

☆☆☆

میرے گیٹ کے سامنے ہی اس ملنگ کی موت ایک معما بن کر رہ گئی تھی۔

محلے والوں نے پولیس کو بھی اطلاع دے دی تھی۔ پولیس والے بھی آگئے تھے اور معمول کے مطابق تفتیش میں مبتلا تھے۔ اس کے جسم پر زخم کا کوئی نشان نہیں تھا۔ خیال یہی کیا جارہا تھا کہ بے چارہ اس طرف سے گزر رہا ہوگا کہ ہارٹ فیل ہوگیا۔ یا اسی قسم کی کوئی اور بات ہوئی ہوگی۔

محلے کا کوئی بھی شخص اس ملنگ کو نہیں جانتا تھا۔ میں نے بھی پولیس سے یہ بات چھپالی تھی کہ یہ شخص کچھ دیر پہلے مجھ سے کچھ مانگ رہا تھا۔

میں اگر اس قسم کی کوئی بات بتاتا تو پولیس میرے ہی پیچھے پڑجاتی۔ اسی لیے میں نے بھی انکار کردیا۔ ایمبولینس آگئی اور اس کی لاش اسپتال روانہ کردی گئی۔

محلے والے اپنے اپنے طور پر تبصرے کررہے تھے۔ نہ جانے کیوں مجھے اس ملنگ کی موت غیر فطری یا غیر قدرتی معلوم ہورہی تھی۔ حالانکہ میرے پاس ذہن میں پیدا ہونے والے اس سوال کا کوئی جواز نہیں تھا۔ اس کے باوجود کچھ ایسا ہی احساس ہورہا تھا۔ وہ رات جاگتے اور سوچتے ہوئے گزر گئی تھی۔

وہ ملنگ تو مجھ سے کسی قیمتی چیز کا مطالبہ کررہا تھا اور خود اپنی سب سے قیمتی شے یعنی جان سے ہاتھ دھو بیٹھا تھا۔ کیوں؟ میری اس سے ملاقات تو کہیں اور ہوئی تھی۔ پھر اسے میرے ہی گیٹ پر موت کیوں آئی تھی۔ کیا وہ میرا تعاقب کرتا رہا تھا۔ اگر ایسا تھا تو اور حیرت کی بات تھی۔ میرے پاس ایسی کون سی چیز تھی جس کی طلب اسے یہاں تک لے آئی تھی۔ بہرحال دوسری صبح معمول کے مطابق تھی۔

کس کو یاد رہتا کہ کوئی ملنگ اس گلی میں آکر دم توڑ گیا تھا۔

دو چار دن گزر گئے۔ اس دوران وہ لڑکی ہانی بھی میرے پاس نہیں آئی اور نہ ہی میں نے اس کے بارے میں کسی سے کچھ پوچھنے کی ضرورت محسوس کی۔

اس نے اپنا گھر تو بتادیا تھا لیکن میرے پاس اس کے گھر تک جانے کا کوئی جواز نہیں تھا۔ لیکن ایک شام وہ مجھے اچانک دکھائی دے گئی۔

میں اپنی گاڑی ڈرائیو کرتا ہوا جارہا تھا کہ میں نے ایک جگہ ہانی کو دیکھا۔ وہ ایک ٹیکسی رکوا کر اس میں بیٹھ رہی تھی۔ میں نے اسے آواز دینی چاہی لیکن وہ ٹیکسی میں بیٹھ چکی تھی اور میرے پہنچنے تک روانہ ہوگئی۔

وہ گھر کی طرف نہیں جارہی تھی کیونکہ محلے کا رخ کسی اور طرف تھا اور ٹیکسی مخالف سمت میں جارہی تھی۔ میں نے سوچا کیا واسطہ ہے میرا۔ کہیں جارہی ہوگی۔ پھر بھی نہ جانے کیوں میں نے اپنی گاڑی ٹیکسی کے پیچھے لگادی۔

مجھے یہ دیکھ کر حیرت ہوئی تھی کہ ٹیکسی کا رخ ہائی وے کی طرف تھا۔ یعنی ویرانے کی طرف۔ اب اس کو روکنا ضروری ہوگیا تھا۔ آخر کیوں وہ کہاں جارہی تھی؟

میں نے اپنی گاڑی کی رفتار تیز کرکے اس ٹیکسی کو اوورٹیک کرلیا۔ لیکن ٹیکسی میں تو ڈرائیور کے سوا کوئی بھی نہیں تھا۔ یہ کیسے ہوسکتا تھا۔ میں نے تو خود اسے اس ٹیکسی میں بیٹھتے ہوئے دیکھا تھا۔ پھر وہ راستے سے کہاں غائب ہوگئی تھی۔

میں نے اپنی گاڑی ٹیکسی سے کچھ آگے جاکر روک لی اور ہاتھ ہلا کر ٹیکسی کو رکنے کا اشارہ کیا۔ ڈرائیور نے بھی ایک سائیڈ میں گاڑی روک لی تھی۔

میں نے اس سے پوچھا۔ ''بھائی تمہاری ٹیکسی میں ایک لڑکی بیٹھی تھی۔ وہ کہاں چلی گئی۔''

''وہ پسنجر تھا ایک سگنل پر اتر گیا تھا صاحب۔'' ڈرائیور نے بتایا۔ ''کوئی چکر ہے کیا۔''

میں اسے جواب دیے بغیر اپنی گاڑی میں آکر بیٹھ گیا۔ ٹیکسی ڈرائیور مجھے حیرت سے دیکھتا ہوا ٹیکسی کو بڑھا لے گیا تھا۔

میری سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ ہانی اچانک غائب کہاں ہوگئی تھی۔

میں بور ہوکر واپس آگیا۔ میرا ہی قصور تھا۔ کیا ضرورت تھی اس طرح اس کا تعاقب کرنے کی۔ اور جب میں گھر پہنچا تو حیرت انگیز طور پر ہانی گیٹ پر ہی موجود تھی۔ اس سے پہلے کہ میں اس سے کچھ کہہ سکتا، اس نے بولنا شروع کردیا۔ ''کمال کے آدمی ہیں آپ۔ اچانک کہاں چلے گئے تھے۔''

''کیا مطلب۔''

گدھ (Valture)

چیل کی قسم کا بہت بڑا پرندہ، جو گلا سڑا گوشت اور مردار کھاتا ہے اس کے سر پر پر نہیں ہوتے، چنانچہ وہ مردہ جانور کے گوشت کے اندر اپنا سر گھسیڑتا ہے، تو اس کے پر لتھڑنے نہیں پاتے۔ گدھ تین قسم کے ہوتے ہیں۔

راج گدھ، سفید پشت گدھ اور سفید گدھ۔

راج گدھ ایک بڑا جسیم پرندہ ہے۔ اس کی لمبائی ڈھائی فٹ کے قریب ہوتی ہے، گویا وہ چیل سے دگنے ڈیل ڈول کا ہوتا ہے۔ یہ گدھ پاکستان میں بہت کم پایا جاتا ہے لیکن کبھی کبھی نظر آتا ہے۔ اس جانور کا قد اونچا اور رنگ سیاہ ہوتا ہے۔ بڑا پیٹو جانور ہے۔ مردار کے گوشت سے اپنے پیٹ کو ناکوں ناک بھر لیتا ہے اور زمین پر سیدھا بیٹھ جاتا ہے اس کے اردگرد چیلیں اور گدھ بیٹھے رہتے ہیں، جو گویا اس راجا کا دربار ہے۔ اس کی چھاتی سفید اور جسم کے دونوں طرف بھی سفید داغ ہوتے ہیں۔ جب تک یہ پیٹ نہ بھر لے مردار پر دوسرے جانوروں کو قریب نہیں آنے دیتا۔

سفید پشت گدھ پاکستان میں عام ہے۔ جنوری میں بچے انڈوں سے نکلتے ہیں، لیکن عموماً ایک ہی انڈا ہوتا ہے۔ اس کی پیٹھ کا نچلا حصہ نمایاں طور پر سفید ہوتا ہے باقی جسم خاکستری بلکہ سیاہ ہوتا ہے۔ اس کی پیٹھ کا سفید رنگ بازوؤں کے آخری سرے تک چلا گیا ہے۔ جب اُڑتا ہے تو یہ سفید حصہ اوپر کی طرف ہوجاتا ہے۔

سفید گدھ جس کو مصری گدھ بھی کہتے ہیں، مذکورہ بالا ہر دو گدھوں سے چھوٹا ہوتا ہے۔ اس کی لمبائی دو فٹ تک ہوتی ہے اور چال بطخ کی طرح۔ اُڑتا ہوا دور سے خوبصورت معلوم ہوتا ہے لیکن پاس سے بھدا اور ناگوار نظر آتا ہے۔ ٹانگوں اور چہرے پر بال نہیں ہوتے چونچ کا سرا خم دار ہوتا ہے۔ ٹانگیں، چہرہ اور چونچ زرد رنگ کے ہوتے ہیں۔ بازوؤں کے سرے چوڑے اور کالے ہوتے ہیں اور جسم کے باقی حصے پر میلے سے سفید پر ہوتے ہیں۔ سفید گدھ اُڑتے وقت اپنے پاؤں اور ٹانگیں سکیڑ لیتے ہیں مگر جب زمین پر بیٹھنا چاہتے ہیں تو کچھ دیر پہلے ٹانگوں کو ڈھیلا چھوڑ دیتے ہیں اور نیچے لٹکا دیتے ہیں اس طرح وہ بہ آسانی نیچے آجاتے ہیں۔

مرسلہ: احمد شاہ، حیدرآباد

"ارے جناب! میں نے آپ کی گاڑی دیکھ لی تھی۔ میں ایک ٹیکسی میں تھی۔ میں نے سوچا کہ ٹیکسی سے اتر کر کیوں نہ آپ کے ساتھ ہی بیٹھ جاؤں۔ پھر ساتھ ہی گھر چلیں گے۔ میں ایک سگنل پر اتر گئی تھی۔ اب جو گاڑی کو دیکھتی ہوں تو اس کا کہیں پتا نہیں۔"

"اوہ۔" میں ایک گہری سانس لے کر رہ گیا۔ شاید ٹیکسی اور گاڑی کے درمیان دوسری گاڑیاں حائل ہوگئی ہوں گی۔ اسی لیے میں اسے دیکھ نہیں سکا تھا۔

"ہاں، چھوڑو۔ تم یہ بتاؤ تم اچانک کہاں غائب ہو جاتی ہو۔"

"چلیں، اندر تو چلیں۔ اب کیا گیٹ پر ہی رہیں گے۔"

ہم اندر آگئے۔

ہمارے لیے سب سے بہترین جگہ وہ کمرا تھا جسے میں لائبریری کے طور پر استعمال کیا کرتا۔ ہانی اور میں عام طور پر وہیں بیٹھا کرتے تھے۔

اس وقت بھی ہم وہیں آکر بیٹھ گئے۔ میں نے محسوس کیا کہ ہانی اس وقت کچھ خاموش تھی ورنہ عام طور پر وہ چہکتی رہتی تھی۔

میں نے جب اس سے پوچھا تو اس نے بتایا۔ "کمال صاحب، مجھے کچھ دنوں کے لیے جانا ہے۔"

"کہاں جانا ہے۔" میں نے پوچھا۔

"اپنے رشتے داروں کے پاس۔" اس نے بتایا۔ "سال میں ایک بار مجھے ضرور جانا ہوتا ہے۔"

"لیکن کیوں۔"

"ہے کچھ ایسی بات۔ میں بتا نہیں سکتی۔" اس نے کہا۔

"چلو، یہ تمہارا ذاتی معاملہ ہوگا لیکن اس میں پریشانی کیا ہے۔ تم ہمیشہ کے لیے تو نہیں جا رہی ہو۔"

"کون جانے۔" اس نے ایک گہری سانس لی۔ پھر اپنے آپ کو سنبھال کر کہنے لگی۔ "خود سوچیں، میں اپنے گھر کو چھوڑ کر ہمیشہ کے لیے کہاں جا سکتی ہوں۔"

"پھر کیا پریشانی ہے۔ واپس تو آ ہی جاؤ گی۔"

"پریشانی اس بات کی ہے کہ اتنے دنوں تک آپ سے نہیں مل سکوں گی۔" اس نے کہا۔

اور میرا دل دھڑک اٹھا۔ ہانی جیسی خوبصورت لڑکی مجھ سے ایسی بات کر رہی تھی۔ اس سادہ سے جملے میں بہت کچھ چھپا ہوا تھا۔ وہ مجھ سے دور نہیں جانا چاہتی تھی کہ اسے میری کمی محسوس ہوتی۔ شاید میں اس کے لیے اہمیت اختیار کرتا جا رہا تھا۔

میرے لیے اتنا ہی بہت تھا۔ اس نے گویا ایک طرح سے مجھ سے اپنی محبت کا اقرار کر لیا تھا۔ اس نے یہ بتا دیا تھا کہ میں اس کے لیے خاص اہمیت رکھتا ہوں۔

اب تو میرا بھی یہی حال ہو گیا تھا۔ وہ جب نہیں ملا کرتی تو اس کی کمی محسوس ہونے لگتی تھی۔ کسی چیز کے کم ہو جانے جیسا احساس ہونے لگتا تھا۔

اس کی پریشانی دیکھ کر میں نے گفتگو کا موضوع بدلتے ہوئے پوچھا۔ "کیا تم جانتی ہو کہ میں نے تم سے جس ملنگ کی بات کی تھی وہ ملنگ میرے گیٹ کے سامنے مردہ پایا گیا تھا۔"

"ہاں جانتی ہوں میں۔ یہ بات تو پورے محلے کو معلوم ہے۔" اس نے کہا۔ "ایسے لوگ اسی طرح اپنے انجام کو پہنچتے ہیں۔"

"کیا مطلب۔" میں نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔

"مطلب یہ کہ وہ ملنگ اپنی کسی الٹی سیدھی حرکت سے ہی مرا ہوگا۔ کون جانے اس کے دل میں کیا تھا۔ وہ آپ کا پیچھا کرتا ہوا یہاں تک کیوں آیا تھا۔ خیر چھوڑیں۔ میں یہ کہہ رہی ہوں کہ میرے جانے کے بعد آپ اپنا خیال رکھیے گا۔ اور کسی الٹے سیدھے ملنگ کی باتوں میں نہیں آیئے گا۔"

"تم کب جا رہی ہو۔" میں نے پوچھا۔

"آج ہی۔ اب شاید کچھ دنوں تک میں آپ کو دکھائی نہ دوں۔"

ہم اور کچھ دیر باتیں کرتے رہے۔ اس کے بعد وہ اٹھ کر چلی گئی۔ وہ ایک خلا چھوڑ گئی تھی۔ سناٹا سا محسوس ہونے لگا تھا۔

بعض تعلقات ایسے بھی ہوتے ہیں کہ بدن میں ویرانیوں کی فصلیں بو کر رخصت ہو جاتے ہیں۔ اور وہ نہ ملیں یا... ان کا چہرہ دکھائی نہ دے تو رگوں میں کانٹے اتر جاتے ہیں۔

اب ہانی کے ساتھ میرا ایسا ہی معاملہ تھا۔ میں شاید اس کے بغیر رہ نہیں سکتا تھا۔ ویسے تو یہ ایک عام سا جملہ ہے جو دنیا کے بے شمار مرد بے شمار عورتوں سے کہتے ہوں گے لیکن یہ جملہ میرے لیے سب سے بڑی سچائی بن گیا تھا۔

میں دفتر سے اسی لیے تیز رفتاری کے ساتھ گاڑی دوڑاتا ہوا آتا کہ شاید وہ گیٹ پر کھڑی ہوئی ہو یا پہلے کی طرح دیوار پھاند کر لائبریری میں جا کر بیٹھ گئی ہو۔ لیکن ایسی کوئی بات نہیں تھی۔

ایسا نہیں ہو سکا۔ وہ بہت دنوں تک دکھائی نہیں دی۔

اور ایک دن میں بے قرار ہو کر ہزار اندیشوں اور دشواریوں کے باوجود جب اس کے گھر جانے والا تھا تو وہ مجھے دکھائی دے گئی۔

میں اس وقت دفتر سے جلدی اس کے گھر جانے کے ارادے سے آیا تھا کہ ایک سگنل پر وہ ایک ٹیکسی میں بیٹھی دکھائی دے گئی۔ اس کی ٹیکسی میری گاڑی کے برابر آکر رکی تھی۔

میں نے اسے مخاطب کرنے کی کوشش کی لیکن وہ دوسری طرف دیکھ رہی تھی اور اس سے پہلے کہ میں اسے متوجہ کرنے کے لیے کچھ اور کرتا۔ سگنل سبز ہو گیا اور اس کی ٹیکسی آگے بڑھ گئی۔

میں اس کے ٹیکسی کو پکڑ لیتا۔ فاصلہ ہی کتنا تھا لیکن ایک حیرت انگیز بات ہوئی۔ میری گاڑی نے گرین سگنل کو دیکھ کر آگے بڑھنا ہی شروع کیا تھا کہ وہی ملنگ میری گاڑی کے سامنے آکر کھڑا ہو گیا۔

وہی ملنگ جس نے میرا راستہ روک کر مجھ سے مطالبہ کیا تھا کہ میں اسے اپنی سب سے قیمتی چیز دے دوں۔ جو میرے گیٹ کے سامنے مرا تھا۔ جس کی لاش میں نے خود اپنی آنکھوں سے دیکھی تھی۔ جس کے بارے میں ڈاکٹرز نے کہا تھا کہ اس کا ہارٹ فیل ہو گیا ہے۔ وہ زندہ میرے سامنے موجود تھا۔

میں اسے شناخت کرنے میں کوئی غلطی نہیں کر سکتا تھا۔ یہ بالکل وہی تھا۔ وہی لباس، وہی چمکدار آنکھیں جو مجھ پر مرکوز تھیں۔ سب کچھ وہی۔

میں بری طرح خوفزدہ ہو گیا۔ اسٹیئرنگ مجھ سے سنبھالا نہیں جا رہا تھا۔ میں نے اپنی گاڑی فٹ پاتھ سے ٹکرا دی تھی۔ اس دوران پیچھے والی گاڑیوں کے ہارن بجے جا رہے تھے۔

میں اس بری طرح بوکھلایا ہوا تھا کہ میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ مجھے کیا کرنا چاہیے۔ میں نے دیکھا کہ وہ ملنگ طنزیہ انداز میں ہنستا ہوا ایک طرف چلا گیا تھا۔

ٹریفک پولیس کا اہلکار میرے پاس آکر کھڑا ہو گیا۔ "بھائی صاحب، لائسنس نکالیں۔" اس نے کہا۔

"بھائی، میں اس وقت ایمرجنسی میں ہوں۔" میں نے کہا۔ "میرے پاس سارے کاغذات ہیں لیکن اس وقت دکھا نہیں سکتا۔ مجھے جلدی ہے۔"

لیکن بے سود۔ اسے کاغذات دکھانے ہی پڑے۔ اس دوران وہ ٹیکسی نگاہوں سے اوجھل ہو چکی تھی۔ اور وہ ملنگ بھی کہیں غائب ہو چکا تھا۔

بڑی مشکلوں سے میں نے اس پولیس والے کو مطمئن کیا۔ گاڑی ریورس کی اور پھر اپنے گھر کی طرف چل پڑا۔ گاڑی کا اگلا حصہ اچھا خاصا ڈیمج ہو گیا تھا۔

اس وقت میرا دھیان نہ تو ہانی کی طرف تھا اور نہ ہی گاڑی کے نقصان کی طرف۔ میرا دھیان اس ملنگ میں اٹکا ہوا تھا۔

وہ میرے سامنے آکر مجھے ذہنی خلفشار میں مبتلا کر گیا تھا۔ ایک مرے ہوئے انسان کو زندہ دیکھ لینا کتنا بھیانک تجربہ ہو سکتا ہے اس کا اندازہ مجھے اس وقت ہو رہا تھا۔

میرے اعصاب کام نہیں کر رہے تھے۔ ایسا لگ رہا تھا کہ میں شاید گاڑی کسی چیز سے ٹکرا دوں گا۔ لیکن خدا کا شکر ہے کہ بہ حفاظت گھر پہنچنے میں کامیاب ہو گیا تھا۔

اور وہ گیٹ پر موجود تھی۔ پہلے کی طرح۔ چونکہ کئی دنوں کے بعد دکھائی دی تھی۔ اس لیے میں اپنے ساتھ آنے والے واقعات ذرا سی دیر کے لیے بھول ہی گیا تھا۔

میں گاڑی ایک طرف کھڑی کر کے اس کے پاس آگیا۔ اس دن بھی وہ بہت خوبصورت اور زندگی سے بھرپور دکھائی دے رہی تھی۔

"خدا کی پناہ! یہ تم اچانک غائب کہاں ہو جاتی ہو۔ پھر اچانک دکھائی دینے لگتی ہو۔ آج بھی تم ٹیکسی میں جا رہی تھیں۔ میں تمہیں آواز دے رہا تھا لیکن تم نے سنا ہی نہیں۔"

"ہو سکتا ہے کہ میرا دھیان کسی اور طرف ہو۔" اس نے کہا۔ پھر گاڑی کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔ "آپ کی گاڑی کو کیا ہوا۔ کیا ٹکرا گئی تھی۔"

اور مجھے یاد آگیا کہ یہ سب اس ملنگ کی وجہ سے ہوا تھا۔

"آؤ، اندر آؤ۔ میں تمہیں ایک عجیب بات بتانا چاہتا ہوں۔"

ہم لائبریری میں آکر بیٹھ گئے۔ "ہانی۔ میں نے اس ملنگ کو زندہ دیکھا ہے جو میرے گیٹ کے سامنے مر گیا تھا۔"

"ضرور دیکھا ہوگا۔" اس نے کہا۔ "کیونکہ وہ ملنگ مرا کہاں تھا۔"

"کیا!" میں نے حیرت سے اس کی طرف دیکھا۔ "کیا کہہ رہی ہو؟"

"ہاں۔ میرے ماموں اس ہاسپٹل میں ڈاکٹر ہیں جہاں ملنگ کو اٹھا کر لے گئے تھے۔ انہوں نے بتایا ہے کہ ملنگ مرا نہیں تھا۔ بلکہ اسے سکتہ ہو گیا تھا اور سکتے کی کبھی حالت وہی ہوتی ہے جو موت کی ہوتی ہے۔"

"اوہ خدا...!" میں نے ایک گہری سانس لی۔ "میری الجھن دور ہو گئی۔ ورنہ میں تو سوچ سوچ کر پاگل ہوا جا رہا تھا۔"

"اپنے اعصاب کو اپنے اختیار میں رکھا کریں کمال صاحب۔" اس نے کہا۔ "ہو سکتا ہے کہ آپ کو بہت کچھ دیکھنا پڑے، بہت کچھ سننا پڑے۔ کیونکہ اس دنیا میں تماشے تو ہر آن لگے ہوئے ہیں۔ نہ جانے کیا کیا ہوتا رہتا ہے۔ اسی لیے ہر حادثے ہر واقعے پر اپنے آپ کو پریشان کر دینا اچھا نہیں ہے۔ مضبوط رہنا چاہیے۔"

"اوہو، آج تو تم فلسفیوں جیسی باتیں کر رہی ہو۔"

"زندگی کا ایک رخ دکھانے کی کوشش کر رہی ہوں۔" اس نے کہا۔

"تم بتاؤ، تم اپنے رشتے داروں کے پاس سے کب واپس آئیں۔" میں نے پوچھا۔

"کل رات ہی آئی ہوں۔" اس نے بتایا۔ "اور کچھ دنوں کے بعد پھر چلی جاؤں گی۔"

"اب کہاں جاؤ گی۔"

"یہ نہیں بتا سکتی۔ اور نہ ہی یہ بتا سکتی ہوں کہ میری واپسی کب ہو گی۔"

"یہ کیا بات ہوئی۔ ہانی! میں تم سے سچ کہہ رہا ہوں۔ مجھ سے اب تمہاری دوری برداشت نہیں ہوتی۔"

"جانتی ہوں میں۔" وہ مسکرا دی۔ "اب صرف ایک کام ہو سکتا ہے کہ میں آپ کو بھی اپنے ساتھ لے چلوں۔"

اسی دوران اچانک دروازے پر دستک ہونے لگی۔

ہم دونوں چونک پڑے تھے۔ ہانی کچھ زیادہ پریشان ہو گئی تھی۔ "تم کیوں پریشان ہو رہی ہو، میں دیکھ کر آتا ہوں۔"

اور جب میں گیٹ پر پہنچا تو وہی ملنگ سامنے کھڑا تھا۔

سچ تو یہ ہے کہ اس کو دیکھ کر میں خوفزدہ ہو گیا تھا۔ وہ تو کسی بلا کی طرح پیچھے پڑ گیا تھا۔ کون تھا وہ۔ کیا چاہتا تھا؟ چونکہ میں اس وقت اپنے گھر میں تھا۔ اپنا محلّہ تھا۔ ہر طرف اپنے لوگ تھے۔ اسی لیے میں نے سوچ لیا کہ اس کے ساتھ سختی سے پیش آؤں گا۔

"کیا بات ہے، کیا چاہتے ہو؟" میں نے غصے سے پوچھا۔

"پہلے بھی بتا چکا ہوں کہ جو خزانہ تیرے پاس ہے وہ ہمیں دے دے۔" اس نے کہا۔ "ورنہ یاد رکھ بہت نقصان میں رہے گا۔"

"جاؤ... جاؤ یہاں سے۔" میں غصے سے بولا۔ "پاگل ہو گئے ہو۔ میرے پاس کوئی خزانہ نہیں ہے۔"

"ایک بار اور سوچ لے۔ اسے ہمارے ساتھ تو جانا ہی ہے۔" اس نے کہا۔ "تو کہاں تک اس کی حفاظت کرے گا۔"

"کیا بے وقوفی کی بات ہے۔ میں کس کی حفاظت کر رہا ہوں۔"

"مرضی ہے تیری تو نہ مان۔ لیکن یاد رکھ، اگلی بار میں خالی ہاتھ نہیں جاؤں گا۔"

وہ نہ جانے کیا کیا بولتا ہوا چلا گیا۔ میں نے گیٹ بند کیا اور لائبریری میں واپس آ گیا۔ ہانی پریشانی کے عالم میں میرا انتظار کر رہی تھی۔ "وہ کیا کہہ رہا تھا۔ میں نے اس کی آواز سنی تھی۔ بتاؤ کیا کہہ رہا تھا؟"

"کچھ الٹی سیدھی بات کر رہا تھا۔ وہی خزانے والی کہ میں اس کے حوالے کر دوں۔ آخر کیا ہے میرے پاس۔ وہ مجھ سے کیا چاہتا ہے۔"

ہانی نے ایک گہری سانس لی۔ "کمال صاحب! وہ میرے لیے کہہ رہا تھا۔" اس نے بتایا۔

"کیا......؟ تمہارے لیے۔"

"ہاں، وہ خزانہ میں ہی ہوں۔" اس نے کہا۔ "جو اتفاق سے آپ کے پاس آ گیا ہے۔"

"کیوں ایسی بات کر رہی ہو۔"

"میں ٹھیک کہہ رہی ہوں کمال صاحب۔" وہ آہستہ آہستہ بول رہی تھی۔ "وہ خزانہ میں ہوں۔ یہ ایک حیرت انگیز کہانی ہے۔ یہ کہانی کچے عقیدوں کی ہے، توہمات کی ہے اور اب میں اس سے نجات چاہتی ہوں۔ آزادی چاہتی ہوں۔ آپ کے پاس جو ملنگ آتا ہے وہ ایک ہیجڑا ہے۔"

"ہیجڑا؟" میں اور بھی حیران ہو گیا تھا۔

"جی ہاں۔ ویسے وہ معلوم نہیں ہوتا۔ اور ان لوگوں میں اس ملنگ جیسے اور بھی بہت ہیں۔ ان کا بہت احترام کیا جاتا ہے کیونکہ یہ خیر و برکت کی دعائیں کیا کرتے ہیں۔ عملیات کرتے ہیں۔"

"یہ سب تو ٹھیک ہے لیکن تم سے کیا تعلق؟" میں نے پوچھا۔

"وہی کہانی تو میں آپ کو سنانا چاہتی ہوں۔" ہانی نے کہا "... اب آپ سنیں اور سوچیں کہ انسان کیسا توہم پرست ہوتا جا رہا ہے اور کتنی آسانی سے کوئی ایسا وعدہ کر لیتا ہے جس کو پورا کرنا اس کے اختیار میں نہیں ہوتا۔"

☆☆☆

میرے والدین کی تین اولادیں پیدا ہونے کے کچھ دنوں کے بعد ہی مر چکی تھیں۔ میں پیدا ہونے والی تھی لیکن میرے والدین میری طرف سے مایوس تھے۔ ان کا خیال تھا کہ میرا بھی وہی ہو گا جو مجھ سے پہلے کی اولادوں کا ہو چکا ہے۔ تیسرے مہینے میں ابا نے اماں کا نام ایک اسپتال میں لکھوا دیا تھا۔

ایک شام میرے والدین ہاسپٹل سے واپس آ رہے تھے کہ گیٹ ہی پر ایک ملنگ انہیں مل گیا۔ میں نہیں جانتی کہ یہ وہی ملنگ تھا یا کوئی اور تھا۔ بہرحال اس نے دونوں کا راستہ روک کر کہا۔ "بتاؤ کیا چاہتے ہو تم دونوں۔ زندہ دیکھنا ہے یا پہلے جیسا تماشا دیکھنا ہے۔"

اس کی یہ بات سن کر دونوں دہل سے گئے تھے۔ خاص طور پر اماں تو لرزنے لگی تھیں۔ انہوں نے فوراً اس کے سامنے ہاتھ جوڑ دیے۔ "بابا! جب آپ سب جانتے ہیں تو دعا کریں کہ آنے والی اولاد زندہ رہے۔"

"رہے گی زندہ رہے گی لیکن ایک شرط ہے۔" ملنگ نے کہا۔

"بتائیں بابا! کیا شرط ہے؟" اس بار ابا نے پوچھا تھا۔

"شرط یہ ہے کہ منت مان لو اب جو اولاد ہو گی وہ اس کے نام پر ہمیں دے دو گے۔" ملنگ نے کہا۔ "اس کے بعد کی ساری اولادیں لمبی عمریں پائیں گی۔ سب خوش اور تندرست رہیں گی۔ بس پہلی اولاد ہمیں دے دے۔"

"واہ! میں اپنی اولاد کیوں دینے لگی۔" اماں بھڑک اٹھیں۔ "تم کو دینے کا مطلب تو یہی ہوا کہ اسے جیتے جی مار دیا۔"

"ٹھیک ہے تو پھر جا، ایک اور مردے کو جنم دے۔" ملنگ غصے سے بولا اور پھنکارتا ہوا ایک طرف چلا گیا۔

وہ ملنگ دراصل ہیجڑوں کا گرو تھا۔ ان کے یہاں روایتیں اسی طرح چلتی ہیں۔ یہ ہر حال میں اپنی منت اٹھا کر لے جاتے ہیں۔

میرے والدین کو بھی یہ بات معلوم تھی۔ اسی لیے وہ بہت پریشان رہنے لگے تھے۔

والدین نے کسی سے مشورہ کیا اور ہم نے اپنا گھر چھوڑ دیا۔ محلّہ چھوڑ دیا۔ بلکہ شہر بھی یعنی راولپنڈی سے کراچی آ کر آباد ہو گئے۔

یہاں آ کر والد صاحب نے اپنی دکان کر لی۔ پھر میری پیدائش ہوئی اور میں بڑی ہوتی گئی۔ میرے بعد دو بھائی اور بھی ہوئے۔ وہ سب بھی بالکل ٹھیک ہیں اور امریکا میں سیٹل ہیں۔

کئی برس بیت گئے۔ میں جوان ہو کر آپ کے سامنے بیٹھی ہوں۔ پھر ایک دن ایک ملنگ اچانک کالج جاتے ہوئے میرے راستے میں آ گیا۔

اس نے کہا۔ "اب تو تجھے ہمارے ساتھ چلنا ہی ہو گا۔ بہت چھپا کر رکھا تھا تجھے۔ لیکن ہم سے بچ کر کہاں جائے گی۔"

اس کی باتیں میری سمجھ میں نہیں آئیں۔ کیونکہ میرے والدین نے مجھے اس بارے میں کچھ نہیں بتایا تھا۔ اس لیے میں نے خوفزدہ ہو کر ایک طرف دوڑ لگا دی۔

گھر آ کر جب اماں ابا کو بتایا تو وہ بھی بہت بری طرح بوکھلا گئے۔ اماں نے تو باقاعدہ رونا دھونا شروع کر دیا تھا۔ "ہائے، ان کم بختوں نے ابھی تک پیچھا نہیں چھوڑا۔"

میں نے پوچھا۔ "اماں، سچ سچ بتائیں کیا چکر ہے۔ کس نے پیچھا نہیں چھوڑا کون تھا وہ ملنگ؟"

اس پر اماں نے مجھے اس ملنگ کے حوالے سے ساری کہانی سنا دی کہ ابا نے تو بس یوں ہی وعدہ کر لیا تھا۔ انہیں کیا معلوم تھا کہ وہ لوگ پیچھا ہی پکڑ لیں گے۔

مجھے یہ سن کر بہت دکھ ہوا کہ ابا نے اپنی دوسری اولادوں کو محفوظ اور سلامت رکھنے کے لیے ایک طرح سے میری قربانی ہی دے دی تھی۔

میں بہت اداس ہو گئی تھی۔ نہ جانے کیسے کیسے خیالات میرے ذہن میں آنے لگے تھے۔ پھر یہ بھی سوچا کہ یہ والدین ہی تو ہیں جنہوں نے مجھے بچانے کے لیے اپنا شہر چھوڑ دیا اور کراچی آ کر آباد ہو گئے۔

بہرحال اس کے بعد یہ ہوا کہ میں نے کالج وغیرہ جانا بھی چھوڑ دیا۔ اپنے گھر یا اپنے محلے تک محدود ہو کر رہ گئی۔"

''اب ایک بات بتاؤ۔ جب تم اپنے گھر اور اپنے محلے تک محدود ہو گئی تھیں تو پھر ٹیکسیوں پر تمہارا سفر کیا معنی رکھتا ہے۔'' میں نے پوچھا۔ ''اس لیے کہ خود میں تمہیں کئی بار دیکھ چکا ہوں۔''

''ہاں۔'' اس نے ایک گہری سانس لی۔ کچھ دیر تک خاموش رہنے کے بعد بولی۔ ''میں بابا امان کی تلاش میں جایا کرتی ہوں۔''

اب اس کی کہانی میں یہ نیا کردار آ گیا تھا۔ بابا امان۔

''اور یہ بابا امان کون ہیں۔'' میں نے پوچھا۔

''کمال صاحب! یہ دنیا بہت پُراسرار ہے۔'' اس نے کہا۔ ''یہاں ایسے ایسے بھید ہیں کہ کوئی نہیں جان پاتا۔ بابا امان بھی مجھے اچانک ملے تھے۔ یہ اس ملنگ سے ملنے کے بعد کا واقعہ ہے۔ ایک شاندار نورانی صورت بزرگ۔ جن کو دیکھتے ہی یہ احساس ہو جاتا ہے کہ وہ اللہ کے خاص بندے ہیں۔

ہم لوگ اس ملنگ سے خوفزدہ تو تھے لیکن اس وقت تک میرا کالج آنا جانا ختم نہیں ہوا تھا۔ میں بس اسٹاپ پر تھی کہ بابا امان کسی طرف سے وہاں آ گئے۔ وہ میرے پاس آ کر کھڑے ہو گئے اور آپ یقین جانیں، ان کو دیکھ کر مجھے وحشت نہیں ہوئی۔ بلکہ ایک طرح کا سکون ملنے لگا، اچھا لگا۔ اطمینان کا احساس ہوا۔ انہوں نے میری طرف دیکھ کر فرمایا۔ ''جا، اپنی جان چھڑانی ہے تو محبت کر۔ ایسی محبت جو حوصلہ دے دے۔ جو تجھ میں اتنی طاقت پیدا کر دے کہ کوئی ملنگ تیرا کچھ نہ بگاڑ سکے۔''

میں ان کی بات سن کر چونک پڑی۔ ''بابا! آپ... آپ میرے بارے میں کیا جانتے ہیں۔''

''سب کچھ۔'' بابا نے میرے سر پر ہاتھ رکھ دیا۔ ''بیٹی، محبت تجھے طاقت دے دے گی۔ تو کل اپنے ماں باپ کو لے کر پاپوش نگر کے قبرستان کی طرف آ جا۔ وہاں سے کہیں اور چلنا ہوگا، میری کٹیا تک۔ وہاں میں تم لوگوں کو سب کچھ سمجھا دوں گا۔ ورنہ وہ بلائیں تیرا پیچھا نہیں چھوڑیں گی۔''

بابا امان کا اس طرح میرے سر پر ہاتھ رکھنا اور بیٹا کہنا بہت اچھا لگا تھا۔ دل میں ایک ڈھارس سی بندھنے لگی تھی بہرحال میں نے گھر آ کر اپنے والدین کو یہ سب بتا دیا۔

ان کو تو خود اس قسم کے کسی سہارے کی ضرورت تھی۔ اسی لیے وہ بابا امان سے ملنے کے لیے تیار ہو گئے۔ بابا امان پاپوش نگر کے قبرستان کے گیٹ پر موجود تھے۔

ایک ٹیکسی بھی کھڑی تھی۔ ہم اسی ٹیکسی میں بیٹھ گئے اور ٹیکسی والے کو شاید معلوم تھا کہ کس طرف جانا ہے۔ لہٰذا بغیر بتائے ٹیکسی چل پڑی۔ اس کا رخ ہائی وے کی طرف تھا۔

''اوہ، تو میں نے ٹھیک ہی تمہیں دیکھا تھا۔ اور تمہارا پیچھا کیا تھا۔'' میں نے کہا۔ ''لیکن تم ٹیکسی سے اچانک کہاں غائب ہو گئی تھیں۔

''میں غائب نہیں ہوئی تھی۔ اسی ٹیکسی میں سیٹوں کے درمیان دبکی ہوئی تھی۔ بہرحال قصہ مختصر یہ کہ ہم بابا امان کی کٹیا میں پہنچ گئے۔ یہ ویرانے میں بنا ہوا ایک کمرا تھا۔ یہاں ضرورت کی ہر چیز موجود تھی۔ اس ویرانے میں اور بھی کچھ لوگ تھے جو بابا امان سے ملنے آئے تھے۔ یہاں بابا امان نے بتایا کہ ان ہیجڑوں کے ایک گرو ہوا کرتے تھے، محبت شاہ۔ محبت شاہ کا سب ہی احترام کیا کرتے تھے۔

کہا جاتا ہے کہ وہ محبت میں ناکام ہو کر اس گروہ میں شامل ہو گئے تھے جہاں انہوں نے بے پناہ ریاضتیں کیں اور اپنا ایک مقام بنا لیا۔

ان کی روایت یہ رہی ہے کہ کسی بھی خاندان کو دعائیں دے کر اس کی پہلی اولاد طلب کر لیتے ہیں۔ اس کی پرورش کرتے ہیں.. اور اگر وہ لڑکا ہوا تو اس کے ساتھ کسی لڑکی کو لا کر اس کی پرورش کی جاتی ہے۔ اور لڑکی ہوئی تو اس کے ساتھ کسی لڑکے کو منسلک کر دیا جاتا ہے۔ چونکہ دونوں بچپن سے ایک دوسرے کے ساتھ رہتے ہیں۔ اسی لیے دونوں کے درمیان انسیت پیدا ہو جاتی ہے۔ پھر دونوں کی شادی طے کر دی جاتی ہے۔ اور عین شادی کے موقع پر دونوں میں سے کسی ایک کو مار دیا جاتا ہے تاکہ دل میں جدائی کا کانٹا چبھ جائے۔''

''خدایا۔'' ہم تو یہ سن کر کانپ گئے تھے۔ ''کیوں ایسا کیوں ہوتا ہے۔''

''تاکہ بڑے گرو محبت شاہ کی محبت میں ناکامی کی داستان زندہ رہے۔ یہ سلسلہ چلتا رہے۔ یہ سمجھو کہ یہ سب ان کی یاد میں کیا جاتا ہے۔''

''بہت عجیب رسم ہے۔''

''ہاں، بہت عجیب اور بہت ظالمانہ۔'' بابا امان نے کہا۔ ''اس کے بعد اس رہ جانے والے لڑکے یا لڑکی کو اپنا گرو مان لیا جاتا ہے۔ وہ بے چارہ یا بے چاری ان کی قید

میں زندگی گزار دیتی ہے۔ اس کے لیے دنیا بھر کی آسائشیں ہوتی ہیں۔ ایک طرح سے اس کی پوجا کی جاتی ہے۔ بے پناہ احترام اور عقیدت کے ساتھ رکھا جاتا ہے۔

بہت دنوں سے ان کے یہاں اس قسم کی کوئی رسم نہیں ہو سکی تھی۔ کسی نے اپنی پہلی اولاد ان کے حوالے نہیں کی تھی۔ پھر ایک بچہ مل گیا جو اسی طرح ان کے حوالے کیا گیا تھا۔ لیکن اس کے لیے اب ایک لڑکی کی ضرورت تھی۔ وہ لڑکی مل جاتی تو دونوں کے درمیان محبت پیدا کی جاتی اور یہ موقع تمہارے والدین نے دے دیا۔ عام طور پر ایسا نہیں ہوتا۔ لوگ وعدہ کر کے اپنی پہلی اولاد ان کے حوالے کر دیتے ہیں لیکن تمہارے والدین تمہیں لے کر فرار ہو گئے۔ یہ بات ان کو کس طرح گوارا ہوتی۔ اس لیے وہ پیچھا کرتے رہے اور آخر کار تم لوگوں تک پہنچ گئے۔''

ہم سب بابا امان کی یہ باتیں سن کر حیران رہ گئے تھے۔

''اب کیا ہوگا حضرت۔'' میرے ابا نے پوچھا۔ ''اب اس کو کس طرح بچایا جائے۔''

''اس کا صرف ایک طریقہ ہے۔ محبت۔'' بابا امان نے بتایا۔ ''اس لڑکی کو کسی سے محبت کرنا ہوگی یا شادی کرنی ہوگی۔ یہ معلوم ہونے کے بعد وہ پیچھا چھوڑ دیتے ہیں۔ کیونکہ ان کے خیال میں وہ لڑکی یا لڑکا داغدار ہو چکا ہوتا ہے۔ ان کے کام کا نہیں رہتا۔''

''شاید اسی لیے آپ نے مجھ سے یہ فرمایا تھا کہ محبت تلاش کر۔''

''ہاں اسی لیے۔'' بابا امان نے اپنی گردن ہلائی۔ ''ایک بات اور ہے۔ ان کا یہ بھی عقیدہ ہے کہ اگر وہ لڑکی یا لڑکا اپنی خوشی سے اپنی محبت سے دستبردار ہو جائے تو پھر ان کے خیال میں وہ دوبارہ دھل دھلا کر پاک ہو جاتا ہے۔''

''اب میں سمجھا۔'' میں بول پڑا۔

''سمجھ گئے نا۔'' ہانی نے کہا۔ ''اسی لیے وہ بار بار تم سے مطالبہ کرتا رہا کہ تم اپنی سب سے قیمتی چیز اس کے حوالے کر دو اور وہ قیمتی چیز میں تھی۔''

''لیکن ہمارے درمیان ایسا کون سا رشتہ تھا؟'' میں نے پوچھا۔

جہاں تک اس بات کا سوال ہے تو میری سمجھ میں یہ آتا ہے کہ وہ لوگ ہمارا سراغ پا کر یہاں تک آ گئے اور انہوں نے میری نگرانی شروع کر دی۔ انہوں نے مجھے آپ سے باتیں کرتے اور آپ کے گھر میں آتے جاتے دیکھ لیا ہوگا۔ یعنی ان کے خیال میں، میں آزاد نہیں رہی تھی۔ اسی لیے وہ ملنگ یہ چاہتا تھا کہ آپ مجھے محبت کی قید سے آزاد کر دیں۔''

''پھر وہی بات۔ ہم دونوں کے درمیان کچھ ہے ایسا رشتہ؟''

''یہ تو ہم کہہ رہے ہیں نا۔ وہ تو ایسا ہی سمجھتے ہوں گے۔''

''ایک بات اور بھی ہے۔ انہیں یہ کیسے معلوم کہ فلاں عورت کے ساتھ پرابلم ہے۔ اور وہ پریشان ہو کر اپنی پہلی اولاد منت کے طور پر ان کے حوالے کر دے گی۔''

''میرے ابا نے بابا امان سے یہی سوال پوچھا تھا۔ انہوں نے بتایا کہ کچھ لوگوں کے پاس قدرت کی طرف سے

کچھ ایسی قوت آجاتی ہے جو انسانی عقل میں نہیں آتی۔ اس کی تین شکلیں ہوا کرتی ہیں۔ نمبر ایک یہ کہ قدرت نے خود عطا کردی ہو۔ نمبر دو، بے پناہ محنت اور ریاضت کے ذریعے۔ اور نمبر تین یہ کہ جب وہ کسی ایک نعمت سے محروم ہوجاتے ہیں تو قدرت بدلے میں انہیں کچھ اور دے دیتی ہے۔ جیسے کوئی نابینا ہوجائے تو اس کی حسیں بے دار ہوجاتی ہیں اور چونکہ یہ لوگ مردانہ یا زنانہ صلاحیتوں سے محروم ہوتے ہیں۔ اسی لیے قدرت انہیں دوسری طاقتیں دے دیتی ہے۔"

"ہاں، یہ تو جیسے سمجھ میں آتی ہے۔" میں نے کہا۔ "اس کے بعد کیا ہوا۔"

"بابا امان نے فرمایا کہ فوری طور پر میری شادی ہوجانی چاہیے۔ کیونکہ ان لوگوں سے پیچھا چھڑانے کا یہی طریقہ ہے۔ ہم ان کا شکریہ ادا کرکے واپس آگئے۔"

"اس کے بعد ایک دن آپ مجھے محلے میں دکھائی دے گئے۔ آپ ہمارے پڑوس میں آئے تھے۔ آپ کا سامان اتارا جارہا تھا۔ خاص طور پر کتابیں۔ جن کو دیکھ کر میں بہت مرعوب سی ہوگئی تھی۔ کیونکہ مجھے بھی لکھنے پڑھنے کا شوق رہا ہے۔"

"اس کے بعد تم نے سوچا کہ کیوں نہ اسی بندے سے دوستی شروع کردی جائے۔ ان لوگوں کو دکھانے کے لیے۔"

"ہاں۔ یہی بات میرے ذہن میں تھی۔" وہ مسکرادی۔ "میں پُراسرار طور پر آپ سے ملتی رہی۔ کبھی کھڑکی کے ذریعے۔ کبھی دیوار پھاند کر۔ مقصد یہ تھا کہ آپ تجسس میں مبتلا ہوجائیں... اور..."

"تو ایسا کہو نہ کہ یہ ایک طرح کی پری پلاننگ محبت ہے۔"

"ہاں۔ پہلے ایسا ہی تھا۔" اس نے کہا۔ "لیکن اب... اب تو میں مجبور ہوگئی ہوں۔"

"اور وہ تمہارا ٹیکسی میں ویرانے کی طرف جانا۔ وہ کیا تھا۔"

"میں اسی طرح کئی بار بابا امان کے پاس اسی ٹیکسی میں جاچکی ہوں۔" اس نے بتایا۔ "وہ ٹیکسی والا بابا امان کا معتقد ہے۔ میں جب بھی سکون کی دعائیں لینے کے لیے بابا کے پاس جانا چاہوں، پاپوش کے قبرستان تک پہنچ جاتی ہوں۔ جہاں وہ ٹیکسی والا مل جاتا ہے اور وہ مجھے اپنے ساتھ لے جاتا ہے۔"

"اگر ایسی بات تھی تو تم مجھے دیکھ کر چھپ کیوں جاتی تھیں۔"

"میں نہیں چاہتی تھی کہ وقت سے پہلے آپ کو یہ سب معلوم ہو۔" اس نے کہا۔

"میں تو تم کو کوئی جن بھوت سمجھنے لگا تھا۔"

"ہاں۔" وہ ہنس پڑی۔ "میں نے خود کو پیش ہی اس انداز سے کیا تھا۔"

"تو اب یہ کہانی کہاں تک پہنچ چکی ہے۔" میں نے پوچھا۔

"شاید بہت دور تک۔" ہانی دھیرے سے بولی۔ "شروع شروع میں تو صرف یہ مقصد تھا کہ میں کسی طرح ان کم بختوں کو یہ یقین دلانے میں کامیاب ہوجاؤں کہ میں اب محبت یا شادی کے ہاتھوں بقول ان کے داغ دار ہوچکی ہوں۔ لیکن اب، اب میں بغیر کسی خوف یا اندیشوں کے یہ اعتراف کررہی ہوں کہ میں اب شاید اپنی منزل تک پہنچ چکی ہوں۔"

"ہاں ہانی۔" میں نے اس کے ہاتھ پہ اپنا ہاتھ رکھ دیا۔ "قدرت شاید اسی لیے مجھ کو اس محلے میں لائی تھی۔ شاید اسی لیے یہ مکان مجھے پسند آیا تھا جس کو کوئی دوسرا نہیں لے رہا تھا۔

"اب سوال پھر وہی ہے کہ وہ لوگ کس طرح میرا پیچھا چھوڑیں گے۔" ہانی نے کہا۔

"اگر ہم کسی کو بھی یہ سب سنائیں تو شاید وہ اس پر یقین ہی نہ کرے۔" میں اس کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔ "اس دور میں بھی اس قسم کے لوگ ہوتے ہیں اور اس طرح کی منت مانگی جاتی ہیں۔"

"اور اس کے بعد ایک بھیانک خواب جیسا سلسلہ شروع ہوجاتا ہے۔" ہانی نے کہا۔ "ویسے میرے ذہن میں ایک بات آرہی ہے۔ کیوں نا ہم دونوں ہی بابا امان کے پاس جاکر انہیں یہ بتادیں کہ ہم نے ایک دوسرے کو پسند کرلیا ہے۔ شاید وہ ہمارے لیے کوئی راستہ نکال لیں۔"

"فوراً چلو۔ کیونکہ پہلے تمہارا اس جنجال سے نکلنا ضروری ہے۔"

"لیکن اس سے پہلے میں یہ چاہوں گی کہ آپ میرے گھر والوں سے مل لیں۔" اس نے کہا۔ "میں آپ کا تذکرہ ان سے کرچکی ہوں اور وہ خود آپ سے ملنا چاہتے ہیں۔"

"چلو، میں تیار ہوں۔"

یہ پہلا موقع تھا کہ میں ہانی کے گھر میں داخل ہوا تھا۔ اس کے والدین مہذب لوگ تھے۔ ہانی چونکہ میرے بارے میں سب کچھ بتا چکی تھی۔ اسی لیے انہوں نے بہت گرم جوشی سے میرا استقبال کیا تھا۔

ہم ڈرائنگ روم میں آکر بیٹھ گئے تھے۔

''بیٹا' ہانی نے شاید اپنے بارے میں تمہیں سب کچھ بتا دیا ہوگا۔'' اس کی ماں نے کہا۔ ''یوں سمجھ لو کہ ایک سایہ اس کے ساتھ ہے۔ ہر وقت اس کی طرف سے خطرہ لگا رہتا ہے۔''

''جی ہاں' اس نے سب کچھ بتا دیا ہے۔ کیا ایسا نہیں ہوسکتا کہ ان کے خلاف پولیس میں رپورٹ کرا دی جائے۔'' میں نے کہا۔

''یہی تو پرابلم ہے کہ ہم کس کے خلاف رپورٹ کروائیں۔'' ہانی کے والدین کہا۔ ''ہمیں نہ تو کسی کا نام معلوم ہے اور نہ کسی کا ٹھکانا۔ اس کے علاوہ اس قسم کے واقعات سے نمٹنا پولیس کے بس کی بات نہیں ہوتی۔ یہ ایسے معاملات ہیں جن سے اللہ کا کوئی نیک بندہ ہی نجات دلا سکتا ہے۔ جیسے بابا امان ہیں۔''

''ابا! کیوں نہ ہم بابا امان کے پاس چلیں۔'' ہانی نے کہا۔

''ہاں۔ احتیاط کے لیے ان کے پاس جانا ہی ہوگا۔''

''اس کام میں دیر نہیں کرنی چاہیے۔'' ہانی کی ماں بول پڑی۔ ''ہمیں آج ہی جانا چاہیے۔''

''اور ان کے پاس جانے کا صرف ایک ہی طریقہ ہے۔ وہ ٹیکسی والا۔ وہی ہمیں اپنے ساتھ لے جاتا ہے۔''

''ابا تو پھر چلیں اس کے پاس۔ ہوسکتا ہے کہ وہ مل ہی جائے۔ اور آج کمال صاحب بھی ہمارے ساتھ ہیں۔ پھر موقع ملے یا نہ ملے۔''

جب اس بات پر اتفاق ہوگیا تو ہم سب پاپوش نگر کے قبرستان کی طرف روانہ ہوگئے۔ وہ ٹیکسی والا اپنی جگہ موجود تھا۔ مجھے تو وہ بھی کوئی بزرگ ہی معلوم ہو رہا تھا۔

اس نے ہم لوگوں کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ''بابا امان تو چلے گئے۔''

''چلے گئے۔ کہاں؟'' ہم سب ایک دم پریشان ہوگئے تھے۔

''مرشد صاحب کا کوئی ایک ٹھکانا نہیں ہے۔ نہ جانے کہاں تشریف لے گئے ہوں گے۔''

''میرے خدا! اب کیا ہوگا۔''

''ہاں' وہ آپ لوگوں کے لیے ایک خط دے گئے ہیں۔'' اس نے بتایا۔ ''آپ لوگ مرشد کے پاس جانے کے لیے چونکہ ٹیکسی میں آتے تھے۔ اسی لیے میں آپ لوگوں کا گھر نہیں دیکھ پایا تھا ورنہ یہ خط گھر پہنچا دیتا۔''

''کہاں ہے خط۔'' ہانی کے ابا نے بے قراری سے پوچھا۔

ڈرائیور نے ڈیش بورڈ سے ایک لفافہ نکال کر دے دیا۔ ہانی کے ابا نے وہ خط وہیں پڑھنا شروع کر دیا تھا۔ وہ خط ہانی کے ابا ہی کے نام تھا۔ بابا صاحب نے لکھا تھا۔ ''آغاز ہے اس کے نام سے جو نہایت رحم کرنے والا اور بے نیاز ہے۔

یہ آقا کا رحم ہی تھا جس نے مجھ جیسے فقیر کو تمہاری پریشانیاں دور کرنے کا وسیلہ بنا دیا اور تمہاری صاحب زادی کی طرف میری رہنمائی فرما دی۔

دیکھو' میں نے عارضی طور پر اس طوفان کو روک رکھا ہے... جو بہت تیزی سے تمہاری طرف آرہا تھا۔ لیکن کب تک۔ میری بھی کچھ حدود ہیں۔ اگر تم اس طوفان سے ہمیشہ کے لیے محفوظ ہونا چاہتے ہو تو بغیر کسی تاخیر کے اپنی صاحب زادی کی شادی کر دو۔ تاکہ یہ ان کی نگاہوں میں مکروہ ہو جائے۔ اور وہ اس کا دھیان چھوڑ دیں۔ بس اس طوفان سے بچنے کا یہی ایک طریقہ ہے۔

اور ہاں۔ ایک بات یاد رکھو کہ یہ جو منت ہوتی ہے۔ یہ ایک طرح کا وعدہ ہوتا ہے۔ چاہے اللہ سے کیا جائے یا اس کے بندوں سے۔ اور اسے پورا کرنا ہر حال میں ضروری ہوتا ہے۔ اگر نہ ہو تو پریشانیاں ہوتی ہیں جیسے تمہیں ہو رہی ہیں۔

اسی لیے سمجھدار لوگ کبھی الٹی سیدی منتیں نہیں مانتے۔ ایسی خرافات سے دور رہتے ہیں۔ آیندہ کوئی منت اور کوئی وعدہ کرو تو صرف اپنے اللہ سے۔ بس مجھے اتنا ہی کہنا تھا۔''

بابا کے اس خط نے ہم سبھوں کی آنکھیں کھول دی تھیں۔

خدا نے ہانی کے ساتھ بہت کرم کیا تھا۔ ورنہ وہ اس وقت میری بیوی ہونے کے بجائے نہ جانے کہاں ہوتی۔ کس حال میں ہوتی۔

یہ عجیب کہانی اسی لیے تحریر کر رہا ہوں کہ پڑھنے والے اس قسم کے معاملات میں محتاط ہو جائیں۔